ماہنامہ

مدیر: عظیم الدین احمد

دائرہ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست



| جلد ۳ | جنوری سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر ۳ |
|---|---|---|







| چندہ سالانہ | للعہ | فی پرچہ | ۶/ |
|---|---|---|---|

۴ بنیک روڈ۔ یونیورسٹی بلڈنگس
الہ آباد۔ ۳ر جنوری

# ایک خط

محترمی۔ تسلیم

میں نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو آپ کی تصنیف "اردو شاعری پر ایک نظر" اور پروفیسر فیض احمد کے مجموعۂ کلام "نقش فریادی" و "نئے زاویئے" مرتبہ کرشن چندر صاحب پر جو گفتگو لکھنؤ سے نشر کی تھی اسکی دوسری نقل اپنے پاس نہیں رکھی۔ اس لئے معاصر میں شایع ہونے کے لئے بجائے اُس کے یہ خط حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپکی کتاب کو نکلے اگرچہ کچھ مدت ہو چکی لیکن اُسے پڑھنے کی نوبت اب آئی۔ میں آپ کی کتاب کو بغور پڑھنے کے بعد سمجھا کہ کیوں تمام اُردو شعرا اور شعر پرست آپ کی کتاب سے شاکی ہیں۔ سب کو یہ احساس ہوا کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے ہیں" لیکن سنجیدگی اور کاوش سے لکھی ہوئی ایک کتاب کا جواب شکوہ و شکایت سے نہیں دیا جا سکتا۔ لطف یہ ہے کہ اُردو کا جو شاعر جس قسم کا ہے وہ اپنی یا اپنی قسم کی شاعری پر آپ کی نکتہ چینی سے کچھ چیں بجبیں ہے لیکن آپ کی کتاب کے دوسرے حصّوں سے غالبًا خوش ہے۔ غزل پرست لوگ صنف غزل کے خلاف آپ کی دلیلوں سے کچھ پریشان ہیں تو مرثیہ، مثنوی، اور دور حاضر کی مسلسل اردو نظموں پر آپ کی سخت مگر بے لاگ تنقید سے خوش ہیں۔ جو نظم کے طرفدار ہیں وہ نظموں پر آپ کی تنقید سے ناخوش اور غزل پر آپ کی تنقید سے خوش ہیں۔ آپ کی کتاب کیا شایع ہوئی کوئی اچھا شگوفہ چھوٹا۔ میں تو اسے آپ کی کتاب کی کامیابی سمجھتا ہوں

خیر ابتک تو میں نے دنیاء ادب میں جو کچھ دیکھے سے آپ کی کتاب پر بھی اسی کا ذکر کیا ہے رہا میں اور میری رائے تو میں آپ کو پہلے ہی یہ بتا دوں کہ ہر صنف سخن کے متعلق اور ہر صنف میں ہمارے شعراء قدیم و جدید کے کارناموں کے متعلق آپ کے بیانات نہایت سنجیدہ مدلّل اور مفصل ہیں۔ آپ نے پوری پوری مثالیں دے کر اپنے نتائج مرتب کئے ہیں۔ اور یہ نہیں کیا کہ "بس ہاں تو ہاں، نہیں تو نہیں"۔ آپ کی کتاب کا ایک نہایت اہم حصّہ غزل اور اس کے عناصر ترکیبی سے متعلق ہے۔ پہلے تو غزل پر فارسی کے اثر کو جو آپنے خطرناک بلکہ مہلک بتایا ہے اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ اثر جب بے سلیقہ طور پر لیا گیا تو اس کا نتیجہ برا ہوا اور جب باسلیقہ طور پر یہ اثر لیا گیا تو اس کا نتیجہ سو فی صدی اچھا ہوا۔ ہماری اردو شاعری یا کسی زبان کی شاعری

نئی ہی نہیں ہے۔ غزل الیکٹرک ٹرین ہے جو ایک ہی رفتار سے چلتی ہے۔ میں نے مجنوں گورکھپوری
سے ایکبار کہا تھا کہ (The Ghazal is a series of climaxes) یعنی
غزل انتہاؤں کا سلسلہ ہے۔ اخیر میں صرف یہ کہوں گا کہ میں آپکے اس خیال سے متفق ہوں کہ
ایک عرصہ کے لئے غزل کو اب آرام لینا چاہئے اور آئندہ بھی ہماری شاعری میں غزل کو وہی
جگہ ملنی چاہئے جو مثلاً شیکسپیر، ملٹن، ورڈسورتھ اور کیٹس کے کلام میں اُن کے سانیٹوں کو
ملی ہے۔ آئندہ یہی ہوگا کہ اگر پچاس شعر نظمیں کہیں گے تو ایک شاعر اچھی سے اچھی غزلیں کہے۔

انیس و دبیر کے مرثیوں کے بارے میں جو آپ کے خیالات ہیں دس پندرہ برس سے
وہی میرے بھی خیالات ہیں۔ اگر کوئی تنگ نظری اور شدت جذبات کا شکار نہ ہو تو آپکے اعتراضات
اُسے یقیناً بہت وزنی نظر آئیں گے۔ میری رائے میں آپنے یہاں حق تنقید پورا پورا ادا کیا ہے۔
لیکن آپنے اُردو کے دوسرے مرثیوں کا نہ جانے کیوں نہیں ذکر کیا جیسے حالی کا مرثیۂ غالب،
نوبت رائے نظر کا مرثیہ جو انھوں نے اپنے ایک عزیز کی وفات پر لکھا تھا۔ چکبست کے وہ
مشہور مرثیئے جو انھوں نے گوکھلے، تلک، گنگا پرشاد ورما کی موت پر لکھے تھے۔ اس سلسلے میں
میں یہ بھی بتادوں کہ اگرچہ بہ حیثیت مجموعی چکبست کا مرتبہ انیس سے یقیناً کم ہے لیکن چکبست کے
مختصر مرثیئے زور بیان اور حسن بیان میں انیس سے بڑھ گئے ہیں اور ان کی عیوب سے بھی پاک
ہیں جنکا ذکر آپ نے انیس اور دبیر کے سلسلہ میں کیا ہے۔ حالی اور چکبست کے مرثیوں میں
کردار نگاری بھی ایک قابل توجہ حد تک ہے۔ جو باتیں غالب کے لئے حالی نے کہیں ہیں وہ
اُردو کے کسی شاعر کے بارے میں نہیں کہی جاسکتیں اور چکبست نے بھی گوکھلے اور تلک اور
گنگا پرشاد کی انفرادی صفات کو چمکایا ہے۔ اس سے زیادہ کردار نگاری مرثیوں میں ہوتی ہی
نہیں۔ ملٹن کے لیسیڈس، شیلی کے اڈونیس اور ٹینیسن کے ان میموریم میں بھی اس سے زیادہ کردار
نگاری نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں حالی اور چکبست کے مراثی کو انگریزی کے عظیم الشان
مرثیوں کا رتبہ دے رہا ہوں۔ لیکن حالی اور چکبست کے مرثیئے بہت بلند ادبی کارنامے ہیں انیس
اور دبیر کے مرثیئے چونکہ محض مرثیئے نہیں ہیں بلکہ رزمیہ نظمیں ہیں اس لئے ان کے یہاں جو کردار نگاری
کی کمزوریاں آپ نے بتائی ہیں اور جن کمزوریوں کے باعث ان کے مرثیئے، رامائن، مہابھارت، کالیداس
اور دیگر ڈراما نویسوں کے کارناموں سے نیز ہومر ورجل، فردوسی، دانتے، ملٹن اور شیکسپیر کے کارناموں
سے بہت کم ٹھہرتے ہیں اس رائے میں ہر انصاف پسند آدمی آپکے متفق ہوگا۔ واقعی نزول
میں انتشار اور عدم تسلسل کی شکایت کے بجائے واقعات کربلا متعلق مرثیوں کے پلاٹ

اور دیگر لوازمات کی شکایت زیادہ مناسب ہے۔

آزاد، حالی، اسمٰعیل، شبلی وغیرہ کے بارے میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ طوالت کے خوف سے اور کچھ نہ کہہ کر صرف یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بغیر ان کے کارناموں کے کیا ہم اقبال، چکبست جوش وغیرہ کا تصور کر سکتے ہیں۔ کیا شیکسپیر کے پہلے جو شیکسپیر کے پیش رو تھے اُن کے بغیر شیکسپیر کا تصور ممکن ہے؟ آپ کی یہ رائے بھی امیر مینائی اور داغ کی شاعری کے ادھاؤ ھند مداحوں کے شایان شان ہے لیکن آپ کے شایانِ شان نہیں کہ حالی کا مسدس شاعرانہ خوبیوں سے خالی ہے۔ کیا آپ بھی اس کی ظاہری سادگی اور بے رنگی کا دھوکا کھا گئے؟ انگریزی ادب کی تاریخ میں پوپ کے دور کے بعد جو رومانیت کی بغاوت (*Romantic Revolt*) ہوئی تو اس بغاوت کے قبل گولڈسمتھ۔ کوپر۔ گرے۔ ٹامسن۔ کالنس وغیرہ جو درمیانی *Transitional* شعر لکھے جاتے ہیں کیا ان کا کوئی تعلق رومانیت کی بغاوت سے نہیں؟ امیر اور داغ کی شاعری جب کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اس وقت جو بغاوت حالی نے کی جو اجتہاد آزاد نے کیا اس سے زبردست بغاوت کا تصور ممکن بھی ہے۔

اقبال کے کلام کا صرف ایک حصہ ایک مخصوص ملت ایک محدود جماعت کے لئے ہے لیکن زندگی، کائنات، وجود کے رموز، مقصد حیات کے متعلق جو حکم اقبال نے لگائے ہیں ان کے کلام کا وہ حصہ دنیا کے بلند ترین شاعری سے ہم آہنگ ہے۔ محض معانی کے لحاظ سے نہیں بلکہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے بھی اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال اور جوش کی نظموں میں ابتدا، ترقی اور انتہا کی وہ مثالیں نہیں ہیں جو ورڈسورتھ۔ شیلی۔ کولرج کیٹس کی ان نظموں میں ہیں جنھیں اوڈز *odes*، کہتے ہیں اور ان کی دیگر نظموں میں بھی۔ آپ کے اس اعتراض سے میں متفق ہوں اور اس اعتراض سے بھی کہ جوش اور ان کے مقلدوں کی کئی نظمیں بہت طولانی ہیں اور غزل نما ہیں۔ لیکن ہمارے ادب میں کچھ ایسی جذباتی نظمیں اگر ہوں جن میں منطقی تسلسل اور استدلال نہ سہی پھر بھی جذباتی تسلسل و ہم آہنگی ہو تو میں اس میں ہرج نہیں سمجھتا جیسے رابرٹ برنس کی وہ نظم جس کا آغاز یوں ہوتا ہے: *My love is like a red, red rose*

پھر بھی انگریزی اوڈ کے قسم کی چیزیں یا انگریزی نظموں کی طرح وہ چیزیں جن میں اٹھان، چڑھاؤ اور اُتار ہو ایسے نظموں کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کی کتاب مرتب ہونے کے بعد ادھر اردو میں کچھ ایسی نظمیں میری نظر سے گذری ہیں جن میں ابتدا، ترقی اور انتہا کا تسلسل نظر آتا ہے نقش فریادی میں دو تین نظمیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی۔ مسعود اختر جمال کے مختصر مجموعہ کلام میں "آسمان" نامی نظم اور کچھ اور نظموں میں یہ بات آپ کو ملے گی۔ سلام مچھلی شہری کی کچھ نظموں

ہیں بھی تدریج اور سلسلہ چڑھاؤ اور اتار آپ کو ملے گا۔ علی سردار جعفری کی نئی نظموں میں بھی یہ تعمیری صفت آپ کو ملے گی۔

ترقی پسند ادب کے متعلق جو باتیں آپنے کہی ہیں ان میں کچھ باتیں اپنی جگہ درست ہوتے ہوئے بھی جو مجموعی اثر آپ کی کتاب کے اس حصہ کا پڑتا ہے وہ کچھ گمراہ کن ہے۔ یہ سچ ہے کہ شیلی کی نظم (Prometheus unbound) کی طرح کوئی چیز ابھی ظہور میں نہیں آئی (اور خود شیلی کی باغیانہ نظموں کو اکثر نقادوں نے تشنۂ تکمیل بتایا ہی) پھر بھی بیداری اور بغاوت کے ابتدائی نعروں کے بعد خاموش غور و فکر مطالعہ اور مشاہدہ کا دور ترقی پسند ادب میں شروع ہو چلا ہے۔ لیکن آپ نہ جانیں کس غم و غصّہ سے متاثر ہیں کہ نہ تو آپ دورِ حاضر میں کسی ایسے ترقی پسند ادب کی ضرورت محسوس کرتے معلوم ہوتے ہیں جو قطعاً سرمایہ داری اور ملوکیت اور سرمایہ داروں کی بین الاقوامی سازشوں اور ان کے ان تصادمِ مفادات کا راز طشت از بام کرے جس کے سبب کروڑوں معصوم انسان مارے جا رہے ہیں اور جن کی بدولت لاکھوں لٹے مردوں عورتوں اور بچوں کی زندگی جہنم بن گئی ہے۔ اور نہ تو آپ کوئی امید ہی ایسے ادب کے ادنما ہونے کی ظاہر کرتے۔ [illegible] کی بھی حد ہوتی ہے۔ بھلا آج دنیا میں کہیں بھی سرمایہ داری اور ملوکیت کی حمایت میں نظم کہنا ممکن ہے۔ آج دنیا میں کون شاعر ہے جو سرمایہ داری یا ملوکیت کی حمایت میں شاعری کے خوبصورت نمونے پیش کرے۔ آپ کی کتاب کے اس حصّہ میں جو اصولی بحث ہے اس میں مجھے یہی کمی نظر آئی یعنی مستقل اور دائمی مرکزی اور عالمگیر جذبات کو تقاضائے وقت کا ہم آہنگ بنانے کے اہم اصول پر آپ کی نظر نہ گئی۔ بقول امرسن ہر زمانہ کو اپنا نیا ادبی شاہ کار پیدا کرنا چاہیئے۔

(Every age must produce its own classics) خیر یہ بحث طلبی ہے اور اسے یہیں چھوڑ دی جائے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمارے باغی شاعروں میں رومانیت زیادہ ہے اور اصلیت کم۔ بجا۔ لیکن اس ہیجانی اور بحرانی دور کی رفتار کتنی تیز ہے۔ ہر بغاوت کے آغاز میں رومانیت غالب رہتی ہے۔ شیلی کی ابتدائی نظموں کو دیکھئے۔ بائرن کی ابتدائی نظموں کو دیکھئے۔ ہمارے باغی شعرا نے کس طوفانی [illegible] آنکھیں کھولی ہیں۔ خود ان کی زندگی کیا کیا ہچکولے کھا رہی ہے۔ ایسی صورت میں انھیں اس کا وقت دینا چاہیئے کہ وہ توازن اور سکون حاصل کر سکیں اور اب

توازن، تناسب، سکون۔ اعتدال کے صفات ترقی پسند ادب میں رونما ہو چلے ہیں جو کلاسیکی ادب کے صفات ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد کی انگریزی شاعری دیکھیے کن پریشان خیالیوں کی وہ شکار ہے۔ اس کی دکھ بھری آواز میں کتنا انتشار ہے۔ پھر ہمارے نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے ماحول اور ان کی آزمائشوں کو سمجھنے کی کوشش ہم آپ کیوں نہ کریں۔

کلیم الدین صاحب ادبی جنبش سے میں جو اشارات نہاں ہوتے ہیں وقت اکثر انھیں جھٹلا دیتا ہے۔ پھر بھی سمجھ بوجھ کر آپ کی یہ تصنیف اگر ہمارے ملک کے ادب پرست پڑھیں تو یقیناً ہمارے ادب کو آپ کی کتاب سے بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ ہر اہل نظر کو خواہ وہ آپ سے اتفاق کرے یا اختلاف آپ کی کوششوں کی سچے دل سے داد دینا چاہیے۔

نیاز کیش

فراق۔ گورکھپوری

# اقبال

اقبال کی شاعری تین ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور غزل سے شروع ہوتا ہے اور فطری اور وطنی شاعری پر ختم ہوتا ہے۔ اقبال نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ پہلے دور کی صرف ابتدا میں وہ غزلیں کہتے تھے۔ اور اسی دور میں انہوں نے داغ سے اصلاح بھی لی۔ اس دور کی غزلوں میں زیادہ تر داغ کا رنگ ہے۔ لیکن کہیں کہیں اقبال کی شخصیت بھی جھلک جاتی ہے۔ فطری نظموں میں نظم ہمالہ بہت مقبول ہوئی۔ اقبال فطرتاً زبردست محب وطن واقع ہوئے تھے۔ اور اس وجہ سے وہ بہت جلد وطنی شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ حب وطن پر انہوں نے چند بہترین نظمیں لکھیں، جن کا جواب ہندوستان کی ساری وطنی شاعری میں اب تک نہیں ہوسکا۔ مثلاً ترانہ ہندی، میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے، اور نیا شوالہ وغیرہ۔

دوسرا دور:۔ اسی اثنا میں اقبال کو یورپ جانے کا اتفاق ہوا اور بعض اسلامی ممالک کی سیاحت بھی کی جس سے ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھکر ان کا دل اسلامی درد سے لبریز ہوگیا، اور ان کی شاعری کا رُخ اسلامی معاملات اور اسلامی ممالک کی طرف پھر گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال کے دل سے جذبہ وطن دوستی مفقود ہوگیا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ جب انہوں نے ہندوستان آکر اپنی وطنی شاعری کو صدا بصحرا پایا اور اس ملک کے اندر ہندوستانیوں کے اتحاد کا خواب جو دیکھا تھا اسکی تعبیر کہیں نظر نہ آئی تو ان کو اس ملک اور اہل ملک سے سخت مایوسی ہوئی اور ان کی شاعری کا سارا زور مسلمانوں کی بہبودی اور اصلاح میں صرف ہونے لگا۔ "شکوہ" "جواب شکوہ" "تصویر درد" "شمع و شاعر" اس دور کی ابتدائی چیزیں ہیں اور "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" اس دور کی تکمیل کرتی ہیں۔

اقبال کے دل میں حب وطن کے ساتھ ساتھ آزادی کا جذبہ بھی نہایت زبردست تھا لیکن ہندوستانیوں کی ذہنیت کو دیکھکر وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس ملک کے لوگوں میں اسقدر تنگ خیالی اور خود غرضی ہے کہ وہ نہ کبھی متحد ہوسکتے ہیں اور نہ آزادی حاصل کرسکتے ہیں۔ اب اقبال نے اپنی نظر ہندوستان سے باہر دیگر ممالک ایشیا و افریقہ کی طرف اٹھائی اور تمام حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ تنہا ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی

آزادی کی یہ صورت یہ ہے کہ سارا ایشیا اور افریقہ یورپ کی شہنشاہیت سے آزاد ہو۔ ایشیا اور افریقہ کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ان براعظموں میں پھر اسلامی آزاد سلطنتیں جیسے پہلے کبھی قائم تھیں، قائم ہوجائیں۔ غرض اقبال نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی آزادی وابستہ ہے۔ زمانہ ہی اس کو ثابت کرے گا کہ یہ نظریہ صحیح تھا یا غلط۔

تیسرا دور:۔ اب اقبال کی شاعری نے بین الاقوامی رنگ اختیار کیا۔ اس بین الاقوامی شاعری کے لئے ہندوستانی زبان ناکافی تھی۔ ایشیا کے اکثر حصوں میں فارسی زبان بھی وہی حیثیت رکھتی ہے جو یوروپی ممالک میں فرنچ زبان۔ اس لئے اقبال کو اسکی ضرورت پیش آئی کہ وہ فارسی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنائیں، چنانچہ انھوں نے فارسی میں ایک دیوان "پیام مشرق" گوئٹے کے جواب میں لکھا۔

اقبال شاعر ہونے کے علاوہ قدرتی طور پر فلسفی بھی تھا اور اس کا فلسفہ نہایت مشکل اور عمیق تھا اردو زبان اپنی ترقیوں کے باوجود اس فلسفے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ غالباً فارسی اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ چنانچہ اپنے مشہور فلسفۂ خودی پر اقبال نے دو فارسی مثنویاں اسرار خودی اور رموز بیخودی لکھیں۔ پھر فارسی نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ زبور عجم کے نام سے شایع کیا۔ اور ڈانٹے کی مشہور کتاب ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy) کے انداز پر فارسی میں ایک بہترین تصنیف جو اقبال کے فلسفہ اور شاعری کے امتزاج کی معراج معلوم ہوتی ہے "جاوید نامہ" کے نام سے شایع کی۔ اس دور میں اگرچہ اردو کی شاعری کم ہوگئی تھی لیکن کچھ کچھ مشغلہ اس کا بھی رہا اور اخیر میں دو نہایت معتبر اور مہتم بالشان اردو نظموں کے مجموعے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد جو چند فارسی اردو نظمیں اقبال نے تصنیف کیں ان کا مجموعہ ان کے انتقال کے بعد "ارمغان حجاز" کے نام سے شائع ہوا۔

اس دور میں اقبال کی شاعری انتہائی کمال کو پہونچ گئی تھی اور وہ ہر جگہ فلسفۂ حکمت سے دست و گریبان نظر آتی ہے۔ اقبال اب اس سطح پر تھا جہاں اس کو نہ ملکی شاعر کہہ سکتے ہیں اور نہ "ملی شاعر" بلکہ وہ صرف شاعر انسانیت نظر آتا ہے اور اس کا موضوع اور مخاطب تمام عالم انسانیت ہے۔ لیکن عام انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ اس کا دل ملک اور ملت کی محبت سے خالی نہیں ہے۔ اس کا دل اہل ایشیا کی غلامی اور ہندوستانیوں کی بدحالی اور رسوائی پر بہت دکھتا ہے۔ لیکن اس کی حالت ایک حاذق طبیب کی سی ہے

جسکا کام مرثیہ پڑھنا اور آنسو بہانا نہیں ہے بلکہ مرض کی تشخیص کرنا اور علاج تجویز کرنا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ٹیگور سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ اسی عہد میں اقبال نے وہ مشہور نظم لکھی جسکا عنوان "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے اور جس میں اس نے ممالک مشرق کی تمام قوموں کو مخاطب کرکے انہیں ترقی اور آزادی کی راہ بتائی ہے۔

اقبال کی شاعری میں جتنی تعلیم اور جتنا فلسفہ ملتا ہے، اتنا ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ فلسفہ اقبال کے کلام میں اسی طرح رچا ہوا ہے جس طرح اس کا جوش وطنی، غیرت ملی اور حب انسانیت۔ اقبال کا فلسفہ نہایت عمیق ہے۔ اس کے بعض حصے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کا بنیادی اصول خودی ہے جس کا دوسرا رخ بیخودی ہے۔ بہ ظاہر تصوف کے اصول بیخودی اور فنائیت سے تناقض معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اہل تصوف کے یہاں بیخودی سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنے نفس کو بھول جائے اور اپنی ہستی مٹا کر وجود مطلق میں فنا ہو جائے یہی فنا فی اللہ کا مقام ہے جس میں معرفت الٰہی سے پہلے معرفت نفس کی ضرورت ہوتی ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ لیکن اہل تصوف نے بیخودی پر اسقدر زور دیا کہ نفس انسانی جو سرچشمہ عبدیت اور صفات ملکوتیت کا حامل ہے بالکل پست اور بیکار ہو گیا اور رفتہ رفتہ وہ ان تمام اعمال صالحہ اور مقاصد عالیہ سے محروم ہو گیا جنکے لئے وہ اس عالم مادی میں بھیجا گیا تھا۔ اقبال کا اصول خودی بھی معرفت نفس ہی سے متعلق ہے۔ بعض کوتاہ بینوں کے نزدیک اس اصول کا مقتضا کبر و غرور، انانیت اور نفسانیت ہے۔ اقبال کا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ اقبال خودی سے یہ مراد لیتا ہے کہ جو شخص اپنی معرفت نفس سے غافل ہے اس پر اس نفس کی حقیقت اسکی روحانیت، اسکی شرافت، اسکی قوت اور اسکی وسعت واضح کی جائے، اور اس سے وہ عظیم الشان کام لئے جائیں اور وہ اہم فرائض انجام دلائے جائیں جو خلافت الٰہی اور امانت عظمیٰ کی صورت میں اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ اقبال ہمہ وست کا قائل ہے کہ نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ وجود انسانی کو اپنی ہستی کا قائم رکھنا اور وجود مطلق میں فنا نہ ہونے دینا مشیت الٰہی اور منشائے تخلیق کے عین مطابق ہے اس کے خیال میں انسان کا اپنی ہستی کا فنا کر دینا، ان تمام شرف اور صفات حسنہ سے محروم ہو جانا ہے جنکی تحصیل و تکمیل منشائے انسانیت ہے۔ غرض تکمیل انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور کسی دوسری ہستی میں مدغم نہ ہونے دے۔ اہل تصوف کے

نزدیک منشائے تخلیق یہی ہے کہ انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دے۔ فلسفۂ اقبال اور فلسفۂ تصوف میں یہی بنیادی فرق ہے۔

اقبال کے یہاں اصول خودی کے ساتھ اصول بیخودی کا ہے۔ مگر یہ اہل تصوف کی بیخودی نہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک فرد مطلق کی حیثیت سے دوسرے اس جماعت کا رکن ہونے کی حیثیت سے جس کا وہ ایک فرد ہے۔ جس طرح ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھے اسی طرح رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہستی کو جماعت میں محو کر دے۔ اور جماعتی کاموں میں وہ اپنے ذاتی کاموں سے بالکل بے نیاز اور بے پروا ہو جائے۔ یہی وہ اصول بیخودی ہے جس کی تعلیم اقبال دیتا ہے۔ یہیں اس انسانی محبت کی بنیاد پڑتی ہے جس نے اقبال کی شاعری کو انسانیت عظمیٰ کی اعلیٰ ترین منزل پر پہونچا دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال فنا فی اللہ کے بجائے فنا فی العبد کی شراب سے سرشار نظر آتا ہے۔

"میں ان کا بندہ بنوں گا جنکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا"

اقبال کی تعلیم کا نصب العین انسان کامل ہے اور اقبال کے نزدیک ہر آدمی کو نصب العین پیش نظر رکھنا چاہئے۔ چونکہ بہت کم آدمی ایسے ہونگے جو اس منزل مقصود تک پہونچ سکیں اس لئے حقیقت میں عام انسانوں کو اسکی ضرورت ہوگی کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کریں جو کمال انسانیت کا نمونہ ہو اور جب وہ مل جائے تو اسکی رہنمائی میں اعلےٰ مدارج انسانیت کی طرف ترقی کریں۔ اس لئے کہ بغیر ایسے شخص کی مدد کے یہ کام محال ہے۔ اس قسم کے کامل انسان اولیا اور انبیا ہوتے ہیں۔

بعض نقادوں کے خیال میں اقبال نے مرد کامل کا نظریہ نیطشے کے فلسفۂ فوق البشر (Superman) سے اخذ کیا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مسئلہ میں اقبال کو نیطشے کا خوشہ چیں قرار دیا جائے۔ ہمارے یہاں جب انسان کامل کا تخیل موجود ہے اور جس کا سب سے اکمل نمونۂ انسانیت ہم جناب رسالت مآب صلعم کو مانتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال کے نظریہ کی نسبت جرمن فلسفہ کی طرف کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کے فلسفہ پر جا بجا یوروپی فلسفہ کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں نہیں۔ اقبال پر نیطشے کے بجائے برگسون کا زیادہ اثر ہے۔ اقبال قوت حیات [illegible] اسکی عالمگیری، اس کے ظہور، اس کے امکانات اور اسکی قوت تخلیق کا شدت سے قائل ہے اور اسکو مادی قوانین سے ہر طرح آزاد سمجھتا ہے۔ اور یہی برگسون کے فلسفہ کا ماحصل ہے۔

جسکا کام مرثیہ پڑھنا اور آنسو بہانا نہیں ہے بلکہ مرض کی تشخیص کرنا اور علاج تجویز کرنا ہے۔
یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ٹیگور سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ اسی عہد میں اقبال نے
وہ مشہور نظم لکھی جسکا عنوان "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے اور جس میں اس نے ممالک
مشرق کی تمام قوموں کو مخاطب کرکے انہیں ترقی اور آزادی کی راہ بتائی ہے۔
اقبال کی شاعری میں جتنی تعلیم اور جتنا فلسفہ ملتا ہے، اتنا ہندوستان کے
کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ فلسفہ اقبال کے کلام میں اسی طرح رچا ہوا ہے جس طرح
اس کا جوش دینی، غیرت ملی اور حب انسانیت۔ اقبال کا فلسفہ نہایت عمیق ہے۔ اس کے
بعض حصے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کا بنیادی اصول خودی ہے جس کا دوسرا
رُخ بیخودی ہے۔ یہ بظاہر تصوف کے اصول بیخودی اور فنائیت سے متناقض معلوم ہوتا ہے
لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اہل تصوف کے یہاں بیخودی سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنے
نفس کو بھول جائے اور اپنی ہستی مٹا کر وجود مطلق میں فنا ہو جائے یہی فنا فی اللہ کا مقام
جسمیں معرفت الٰہی سے پہلے معرفت نفس کی ضرورت ہوتی ہے من عرف نفسہ فقد
عرف ربہ۔ لیکن اہل تصوف نے بیخودی پر اسقدر زور دیا کہ نفس انسانی جو شرف
عبدیت اور صفات ملکوتیت کا حامل ہے بالکل پست، سست اور بیکار ہو گیا اور رفتہ رفتہ
وہ ان تمام اعمال صالحہ اور مقاصد عالیہ سے محروم ہو گیا۔ جنکے لئے وہ اس عالم مادی میں بھیجا
گیا تھا اقبال کا اصول خودی بھی معرفت نفس ہی سے متعلق ہے۔ بعض کوتاہ بینوں کے نزدیک
اس اصول کا مقتضا کبر و غرور، انانیت اور نفسانیت ہے۔ اقبال کا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ اقبال
خودی سے یہ مراد لیتا ہے کہ جو شخص اپنی معرفت نفس سے غافل ہے اس پر اس نفس کی حقیقت
اسکی روحانیت، اسکی شرافت، اسکی قوت اور اسکی وسعت واضح کی جائے، اور
اس سے وہ عظیم الشان کام لئے جائیں اور وہ اہم فرائض انجام دلائے جائیں جو خلافت الٰہی
اور امانت عظمیٰ کی صورت میں اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ اقبال ہمہ وست کا
قائل ہے کہ نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ وجود انسانی کو اپنی ہستی کا
قائم رکھنا اور وجود مطلق میں فنا نہ ہونے دینا مشیت الٰہی اور منشائے تخلیق کے عین مطابق ہے
اس کے خیال میں انسان کا اپنی ہستی کا فنا کر دینا، ان تمام شرف اور صفات حسنہ سے محروم
ہو جانا ہے جنکی تحصیل و تکمیل تمنائے انسانیت ہے۔ غرض تکمیل انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ
وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور کسی دوسری ہستی میں مدغم نہ ہونے دے۔ اہل تصوف کے

نزدیک منشائے تخلیق یہی ہے کہ انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کردے۔ فلسفہ اقبال اور فلسفۂ تصوف میں یہی بنیادی فرق ہے۔

اقبال کے یہاں اصول خودی کے ساتھ اصول بیخودی ہے، مگر یہ اہل تصوف کی بیخودی نہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک فرد مطلق کی حیثیت سے دوسرے اس جماعت کا رکن ہونے کی حیثیت سے جسکا وہ ایک فرد ہے۔ جس طرح ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھے اسی طرح رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہستی کو جماعت میں محو کردے، اور جماعتی کاموں میں وہ اپنے ذاتی کاموں سے بالکل بے نیاز اور بے پروا ہو جائے۔ یہی وہ اصول بیخودی ہے جسکی تعلیم اقبال دیتا ہے یہیں اس انسانی محبت کی بنیاد پڑتی ہے جس نے اقبال کی شاعری کو انسانیت عظمیٰ کی اعلیٰ ترین منزل پر پہونچا دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال فنا فی اللہ کے بجائے فنا فی العبد کی شراب میں سرشار نظر آتا ہے:-

"میں ان کا بندہ بنوں گا جنکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا"

اقبال کی تعلیم کا نصب العین انسان کامل ہے اور اقبال کے نزدیک ہر آدمی کو نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ بہت کم آدمی ایسے ہونگے جو اس منزل مقصود تک پہونچ سکیں اسلئے حقیقت میں عام انسانوں کو اسکی ضرورت ہوگی کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کریں جو کمال انسانیت کا نمونہ ہو اور جب وہ مل جائے تو اسکی رہنمائی میں اعلےٰ مدارج انسانیت کی طرف ترقی کریں۔ اس لئے کہ بغیر ایسے شخص کی مدد کے یہ کام محال ہے۔ اس قسم کے کامل انسان اولیاء اور انبیا ہوتے ہیں۔

بعض نقادوں کے خیال میں اقبال نے مرد کامل کا نظریہ نیطشے کے فلسفۂ فوق البشر (superman) سے اخذ کیا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مسئلہ میں اقبال کو نیطشے کا خوشہ چیں قرار دیا جائے۔ ہمارے یہاں جب انسان کامل کا تخیل موجود ہے اور جس کا سب سے اکمل نمونہ انسانیت ہم جناب رسالت مآبؐ کو مانتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اقبال کے نظریہ کی نسبت جرمن فلسفہ کی طرف کریں اس میں شک نہیں کہ اقبال کے فلسفہ پر جابجا یوروپی فلسفہ کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں نہیں۔ اقبال پر نیطشے کے بجائے برگسوں کا زیادہ اثر ہے۔ اقبال "قوت حیات" (élan vital) اسکی عالمگیری، اس کے ظہور اُس کے ممکنات اور اسکی قوت تخلیق کا شدت سے قائل ہے اور اسکو مادی قوانین سے ہر طرح آزاد سمجھتا ہے۔ اور یہی برگسوں کے فلسفہ کا ماحصل ہے۔

اقبال پر یورپی فلسفیوں سے زیادہ اسلامی فلسفیوں کا بالخصوص مولانا روم کا اثر ہے اور اقبال کو خود مولانا روم کی خوشہ چینی اور پیروی کا اعتراف ہے ۵

بیا کہ از سخن پیر روم آوردم
مے کہن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی ست

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایران وہی تبریز ہے ساقی

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر کلیمانہ یا جذب کلیمانہ

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اقبال نہ صرف مفکر اور فلسفی ہے بلکہ وہ ایک بہت بڑا معلم اور مصلح ہے۔ اقبال کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خود بھی اپنے مصلح قوم اور مجدد وقت ہونے کا احساس تھا۔

شکست کشتیٔ ادراک مرشدان کہن ___ خوشا کسے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا

مرا سبو کچہ غنیمت ہے اس زمانہ میں ___ کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری ___ کہ خاک راہ کو میں نے بنایا رازِ الوندی

اقبال کی تعلیم کے موٹے موٹے اصول یہ ہیں کہ انسان کی ہستی نہ صرف اس لئے ہے کہ وہ اپنے نفس کی معرفت اور اس کے ذریعے سے خدا کی معرفت حاصل کرے بلکہ وہ اس عالم مادی میں اپنا صحیح مقام بنائے اور اس میں تصرف کامل کی قوت حاصل کرے۔ اس کے چھپے ہوئے رازوں اور قوتوں کو دریافت کرے اور ان سے کام لے کر انسان کی زندگی کو ارتقار کی منازل طے کرائے اور جسمانی اور روحانی ترقیوں کو دوش بدوش رکھ کر اپنے کو انسانیت کی اس منزل تک پہونچائے جسے صحیح معنوں میں انسانیت عظمیٰ یا خلافت الٰہی کہتے ہیں اور اس دنیا سے فسق و فجور، زشت کاری، بداعمالی، فتنہ و فساد کو ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر وہ صفات جمیلہ اور وہ اخلاق حسنہ پیدا کرے جس سے یہ راہ آسان اور سہل

مقصود قریب تر ہو جائے ان میں سب سے مقدم بلند نظری، وسیع المشربی، محبت انسانی، عزم وارادہ کی پختگی، اعمال صالحہ کا تواتر اور استقلال ہے۔ ان تمام چیزوں کے قیام کے لئے اس ذہنی کیفیت کی ضرورت ہے جسے یقین کامل یا ایمان کہتے ہیں۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یہ انسان کبھی سخت ہوتا ہے، کبھی نرم، کبھی تیز رَو ہوتا ہے، کبھی سست رفتار۔ میدان رزم میں اس کے اندر فولاد کی سختی پائی جاتی ہے تو بزم محبت میں حریر و اطلس کی نرمی

گذر جا بنکے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اس ذہنیت، اس ایمان و ایقان، اس ارادہ و عمل کے لئے ضرورت ہے کہ انسان کا نقطۂ نظر رجائی اور اس کا مستقبل امید افزا ہو۔ رجائیت اقبال کی تعلیم کا نمایاں پہلو ہے۔ اقبال عام مشرقی شعرا کے خلاف قنوطیت سے کوسوں دور، اور امید تفاول کا سب سے بڑا معلم ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اسی کے ساتھ ساتھ ایسے حوصلہ مند اور اولوالعزم انسان کو سخت جفاکش، محنتی اور خطروں کا مقابلہ کرنے والا ہونا چاہئے۔ اس مضمون پر بھی اقبال کی تعلیم نہایت پر اثر اور ولولہ انگیز ہے۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

بکیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است ——— سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

انہیں مقامات میں اقبال سبکساری ساحل کے بجائے دریا میں کود پڑنے، طوفان سے مقابلہ کرنے نہنگ واژدہا سے زور آزمائی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز ——— کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

یہیں اقبال اس فلسفۂ مداہنت و آسان طلبی کی سخت مخالفت کرتا ہے جسکی تعلیم ہے زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز، اور کہتا ہے کہ اگر ساری دنیا، سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو تو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو.

بلکہ اپنی کوشش سے زمانے کو اپنے موافق بنا لو یا اُسے توڑ پھوڑ کر ایک نئے زمانہ اور ایک نئی دنیا کی تخلیق کرو:

حدیث بیخبراں ہے کہ با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

گویند جہاں من آیا بتو می سازد — گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اقبال یوروپی سیاست کا سخت مخالف ہے۔ اس کے خیال میں یورپ کی سیاست شیطانی سیاست بلکہ اس سے بھی ایک درجہ بڑھی ہوئی ہے۔ شیطان کی زبان سے درگاہ خداوندی میں وہ یہ عرضداشت پیش کرتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

اقبال کے خیال میں اُسکی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں سلطنت اور دین کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہاں سیاست کے اندر سے نیکی اور اخلاق کا عنصر غائب ہوگیا اور اس میدان میں ہر قسم کی عیاری و مکاری' فریب و غدر جائز سمجھا جانے لگا۔ بلکہ جس قدر پر فریب سیاست ہو اسیقدر وہ کامیاب سیاست سمجھی جاتی ہے۔ اقبال تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کی طرح حکومت اور سیاست کی بنیاد بھی اخلاق حسنہ پر رکھنا چاہتا ہے۔ اسکی نظریں جب تاریخ عالم کا جائزہ لیتی ہیں تو اُسے صرف ایک جگہ وہ سیاست نظر آتی ہے جسکا وہ داعی ہے اور وہ عہد نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانے کی سیاست ہے۔ اس لئے اقبال پھر اسی طرز حکومت کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔

اقبال یوروپی تمدن کا بھی سخت مخالف ہے۔ اس کے خیال میں۔ چونکہ اس تمدن کی بنیاد مادیت اور لامذہبیت پر ہے اس لئے یہ تمدن ساری دنیا کی برائیوں کا مخزن اور منبع ہوگیا ہے۔

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اقبال کے خیال میں اس تمدن کی بنیادیں بہت کمزور ہیں اور یہ دنیا میں صرف چند روز کا مہمان ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

اقبال یورپ کے نظام معاشیات و اقتصادیات کا بھی سخت دشمن ہے۔ یورپ کی اقتصادیات کی بنیادیں سرمایہ داری پر ہیں' وہ سرمایہ داری جس میں دین اور مذہب نیکی اور اخلاق انسانی محبت اور ہمدردی کی کوئی جگہ نہیں۔ جس میں جاندار انسانوں کو ان کی جائز روزی سے محروم رکھکر لوہے کی مشین سے ان کا کام لیا جاتا ہے۔ جس میں عقل کی نیرنگیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں لیکن دل اور دل کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے نہ صرف اس نظام معیشت کی مخالفت کی ہے بلکہ

اس کے خلاف نہایت شد و مد سے نعرۂ انقلاب بلند کیا ہے اور اعلان بغاوت کیا ہے

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب ۔۔۔ از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب اے انقلاب

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ۔۔۔ حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت ۔۔۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ۔۔۔ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ۔۔۔ دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

سیاسیات، مدنیات، اور اقتصادیات باہمدگر اس طرح وابستہ ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اقبال ان سبھوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور عہد حاضر کے نظام سیاست، نظام معیشت اور نظام تمدن کو روح انسانیت سے خالی پاکر ان کو درہم برہم کر دینا چاہتا ہے، اور ان کی جگہ پر اسلامی تمدن اسلامی حکومت اور اسلامی نظام معیشت کو واپس لانا چاہتا ہے نہ اسلئے کہ اقبال مسلمان ہے اور اپنے مذہب کی خوبیوں پر اسے اعتقادِ کامل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ حالات حاضرہ کے مطالعہ اور بہت سے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ اس دور کی سیاسی، معاشی اور تمدنی خرابیوں اور فسادکی اصلاح کا واحد ذریعہ اگر ہو سکتا ہے تو اسلامی تمدن، اسلامی طرز حکومت اور اسلامی نظام معیشت ہے۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں صرف چند نام ایسے نظر آتے ہیں جن کے سروں پر صاحب طرز ہونے کا طرۂ امتیاز ہے۔ اقبال کی ہستی ان سبھوں میں ممتاز ترین ہے۔ اقبال کی شاعری، اردو شاعری کے میدان میں سب سے الگ نظر آتی ہے۔ اقبال کسی کا متبع اور مقلد نہیں ہے، ہاں اقبال کے بہت سے مقلد اور پیرو پیدا ہو گئے ہیں۔ دور جدید کے شعرا میں ننانوے فی صدی ایسے ہیں جو اقبال سے کسی نہ کسی طرح اثر پذیر ہوئے ہیں اور ان میں جو ممتاز تر ہیں وہی زیادہ متاثر بھی ہیں۔ اُردو شاعری میں اقبال کو بلا تکلف ایک نئے دبستان کا موجد کہا جا سکتا ہے۔

اقبال کی اُردو شاعری میں بعض معائب ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے اقبال کشمیری النسل اور پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اُردو زبان ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ اس پر انہوں نے اکتساباً عبور حاصل کیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی قدرت کے ساتھ لکھنے لگے تھے۔ لیکن اُردو زبان پر جو عبور ایک اہل زبان کو ہوتا ہے انہیں حاصل نہ ہو سکا اور ان کی زبان میں کبھی کبھی خامیاں اور غلطیاں نظر آتی ہیں

جس کا انہیں خود اعتراف ہے

نہ زبان کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر ہیں      کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

زبان کی کمزوریوں سے قطع نظر کرکے اقبال کا کلام صوری اور معنوی محاسن سے مالا مال ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اقبال کے ابتدائی کلام میں جس کا زیادہ حصّہ بانگ درا میں محفوظ ہے شعریت غالب ہے اور ان کے آخری کلام میں جو بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں ہے فلسفیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ لیکن آخر دور میں بھی اقبال نے شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قدرت بیان اور پختگی ترکیب شعریت اور فلسفیت دونوں چیزوں پر غالب آگئی ہے۔ اور ان عناصر سے انھوں نے جہاں پر جس طرح چاہا کام لیا ہے۔ اس دور میں اقبال کا فن انتہائے کمال کو پہونچ گیا ہے اور اُردو کیا دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے چند شاعر ایسے ملیں گے جو اس خصوص میں اقبال کے ہمسر نظر آئیں گے مشکل سے مشکل فلسفیانہ نکات اور نازک شاعرانہ لطائف اس سہولت، بے تکلفی اور بے ساختگی سے اقبال کے قلم سے ٹپکتے نظر آتے ہیں جیسے سطح حریر پر سچے موتی لڑھک رہے ہوں۔ بلاغت کلام کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے جنہیں فن کی اصلاح میں سہل ممتنع کہتے ہیں اقبال کے آخری دور کے کلام میں اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملیں۔ مثال کے طور پر بال جبریل میں جو ساقی نامہ ہے وہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری صرف غزل گوئی یا نظم نویسی ہی نہیں ہے بلکہ شعریت و ادبیت، فلسفہ و حکمت، اخلاق و مذہب تعلیم و اصلاح، ارشاد و ہدایت کا ایک بے مثل مجموعہ ہے تو ہمیں بلا تامل اس مقولہ کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال کو اس دور انحطاط کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے ہر صاحب فن کو اخیر عمر میں واسطہ پڑتا ہے اور جس سے اس کا فن روبہ زوال ہو جاتا ہے۔ اقبال کا فن ابھی کمال کی حد میں پہنچا ہی تھا اور اس میں عروج شباب کے رس اور قوت حیات کی پختگی کی باہم آمیزش سے ایک عجیب رعنائی پیدا ہو گئی تھی کہ موت کے فرشتہ نے اس فنکار کے ہاتھ سے قلم چھین لیا، اور اس کے فن میں انحطاط کا داغ نہیں لگنے دیا۔

حافظ شمس الدّین احمد

# ستی

یہ تپش، یہ ہر طرف جنگل کے سینے کی بھڑاس
پتیوں پر گرد اور شاخوں میں خم، سبزہ اُداس

ذرّے ذرّے میں جہنم کے جلے دل کا اثر
تیز جھونکے جس طرح سیّال امواج شرر

آتشیں کرنوں سے مرجھائی ہوئی رستوں کی گھانس
حبس ایسا، شہر میں بنسی ہو چپ جنگل میں بانس

یہ تپش کا زور، یہ شمشان بھومی کا سماں
کھنچ رہی ہو خود بخود تصویر انجام جہاں

خامشی ایسی کہ جنگل کی فضا گونجی ہوئی
کاخ ہستی میں شکستوں کی صدا گونجی ہوئی

اک جواں ارتھی کے ہیں چاروں طرف کچھ آدمی
جھک رہی ہو موت کے در پر جبینِ زندگی

باپ کے چہرے سے ہیں غم کے تاثر آشکار
بال بکھرائے ہوئے ہمشیر اور ماں سوگوار

اِک طرف بیوی کہ جیسے آندھیوں میں اک دیا
آملا جس کا قضا کے راستے سے راستا

ظلمتِ غم کندنی چہرے پہ ہے چھائی ہوئی
سرخوشی کی لو ہوائے غم سے تھرائی ہوئی

موت سے شوہر کی تنظیمِ سکوں زیر و زبر
دھوپ کی تیزی کا جیسے لاجونتی پر اثر

ڈوبتی امید مٹتیں حسرتیں، بجھتا سہاگ
جیسے "آسا" میں کبھی مل جائیں "دیپک" اور "بہاگ"

آنکھ حیرت کا مرقع، خشک لب، ساکت زباں
سنگِ لرزاں میں شرر لیتے ہوئے انگڑائیاں

وہ اٹھی غمگین بیوہ، وہ بڑھی چہرے کی یاس
وہ محبت کی پجارن آگئی ارتھی کے پاس

جل کے مرنے کے ارادے سے تمنا جی گئی
مسکرائی اور کیسر کا پیالہ پی گئی

نیم وا آنکھوں کے در اور دل کی دھڑکن تیز تر
رکھ لیا زانو پہ ہنس کر بے سکت شوہر کا سر

لکڑیاں چن کر چتا میں آگ دلوائی گئی
ساتھ ہی مردہ کے زندہ لاش جلوائی گئی

دو اثر اک غم کے دونوں کی نرالی شان ہے
جل رہی ہو ساتھ بیوی، ماں کھڑی حیران ہے،

کہہ رہی ہے آگ کچھ فطرت عجب انساں کی ہے
یہ ہو بیوی کی محبت وہ محبت ماں کی ہے

راج بلدیو راج

# محشرِ خیال

میں مسرور چلا جا رہا تھا۔ رفتار کبھی دھیمی کبھی تیز ہو جاتی۔ راہ میں جا بجا سنگریزے چال میں ناہمواری پیدا کر دیتے۔ سطح پتھریلی تھی، سنگلاخ زمین کا نشیب و فراز اور اونچی اونچی چٹانیں افق کی حسین سرخی میں بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ دریا کی روانی میں ایک پرسکون خموشی تھی، مشرق کی زنگارنگی اور نیلے آسمان کا عکس دیودار کے گنجان درختوں کے نیچے پانی کی لہروں میں قوسِ قزح بنا رہا تھا۔ ندی کی روانی کا زیر و بم ننھی منّی چڑیوں کا لطیف نغمہ اور بادِ صبا کی سرمست اٹکھیلیاں موسیقی کا اک راگ تھی جسے قدرت کے کرشموں نے منزلِ تکمیل تک پہونچا دیا تھا۔

کچھ دور کے بعد راستہ مڑا اور سامنے ایک حسین وادی نظر آئی، سبزی اور شادابی، ہرے ہرے گیہوں کے پودے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں لہلہا رہے تھے۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی کہرے کے دھندلکے میں شبنم کے قطروں پر پڑ رہی تھی۔ اور کبھی ہوا کا غیر متوقع جھونکا ان نازک موتیوں کو بکھرا دیتا۔

اب میں کھیت کی ایک تنگ آڑ پر جلدی جلدی چل رہا تھا۔ دونوں جانب گیہوں کے پودے میرے پاؤں چوم رہے تھے۔ راستہ شبنم نے تر کر رکھا تھا اس لیے اکثر پھسل جانے کا اندیشہ ہوتا میری چھڑی بھیگ چکی تھی اور میں خود بھی برابر اسی شبنم سے غسل کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ہلکے سُروں میں کچھ گنگنانے بھی لگتا۔ میرے تخیلات میں رنگینیاں تھیں، مری رفتار میں توانائی تھی۔ چہرے پر تبسّم اور فیروزمندی کے اثرات نمایاں تھے۔ میں تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔

میری آنکھوں میں غرور کا نشہ تھا اور میں حسین تصورات کی رنگین دنیا میں محو تھا۔ تخیلات کی فسوں کاریوں کی رَو میں بہتا جا رہا تھا۔ عالمِ تجرد میں امید و بیم کی بے پناہ شوخیاں دل میں امنگوں کا تلاطم پیدا کر رہی تھیں —— عزت، دولت، عورت —— حیاتِ مستقبل کا ایک خاکہ آنکھوں کے سامنے تھا، دلفریب خواب کے پردے یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے تھے اور ایک مبہم سی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی، میں فرطِ مسرت سے مسکراتا۔ مری آنکھیں چمکنے لگتیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ فطرت بیخودی سے متبسم ہے

اب آفتاب قدرے بلند ہو چکا تھا، کہرے چھٹ چکے تھے۔ شبنم کے قطروں پر

آفتاب اب قدرے حدت سے ضیا باری کر رہا تھا۔ کھیتوں میں اب زردی پھیل رہی تھی میں ان ملائم اور نازک پودوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا تیز جا رہا تھا۔ پودے میرے ہاتھ کے وزن سے جھک جاتے اور پھر کھڑے ہو جاتے۔ نہ معلوم کیوں میرے ہاتھوں میں گدگدی سی محسوس ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی کے گیسوئے عنبریں پر ہجوم شوق نے دست درازی کا مرتکب کر دیا ہے مجھے احساس گناہ ہو رہا تھا۔

میں بہت دور نکل آیا، یہاں دریا کا خم تھا اور ایک حسین عالم سکوت۔ اس دلفریب تنہائی کی آغوش میں ایک سفید مکان نظر آیا۔ میری مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ ضیائے لہر کی گود میں براق عمارت، ریت کی ذروں کی چمک اور دیوار کے درختوں کی حسین قطار آنکھوں کو ذوق حسن بخش رہی تھیں۔ مکان ایک سطح مرتفع پر واقع تھا، اردگرد پھل والے درخت تھے جن کی شاخیں دریا کی جانب آہستہ آہستہ جھک کر سطح آب کو چوم رہی تھیں۔ بنفشہ کے پھولوں میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ لاثانی موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ عمارت میں ایک والہانہ کشش تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا ہی دولتکدہ ہے۔ میرے قبضہ و اقتدار میں ہے میں یہیں رہتا ہوں اور وہ یہیں رہتی ہے ۔۔ وہی وہی امنگوں کے مانند حسین، میری مرکز خیال

میں دروازہ تک پہونچ چکا تھا۔ میری رفتار میں مطلق جھجک نہ تھی۔ "برائے فروخت" ۔۔ میں اچھل پڑا۔ یہ الفاظ ایک سیاہ تختہ پر لٹکے نظر آئے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مکان کسی نے مجھے بخش دیا ۔۔ "برائے فروخت" ۔۔ یہ الفاظ بار بار میری زبان پر آ رہے تھے۔ "ہاں تب تو یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ ہر شخص خرید سکتا ہے۔" میں جانتا تھا کہ میں اُسے خرید نہیں سکتا، مگر مجھے یقین تھا کہ یہ میری ملکیت ہے اور کسی کی نہیں۔ کسی کی ہو، ہے تو فروخت ہی کے لئے۔

سامنے کا باغ پر فضا تھا۔ راستہ کی دونوں جانب سفید گلاب کی روش تھی، کچھ دور دور پر چمپا کے پودے نصب تھے۔ روش کے پیچھے انجیر کے چوڑے پتوں والے درخت اور اسی قطار میں لوکاٹ کے پتوں سے لدے اشجار بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ فصل پر برف پوش پہاڑ زمردیں رنگ کا ایک لامتناہی سلسلہ بنائے کھڑے تھے۔ ندی اب بھی نیچے کنکروں سے کھیل رہی تھی۔

میں نے دستک دی اور قدرے منتظر رہا۔ پھر زنجیر ہلائی اور فوراً ہی دروازہ میں حرکت ہوئی۔ ایک ضعیفہ کوتاہ قامت سنیاسیوں کے لباس میں نکلی۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا اور چال میں نقاہت مجھے دفعتہً خیال آیا

کہ اسے میں جانتا ہوں۔

"پہلے تم برنالی کی نشیبی وادی میں رہتی تھی" میں نے دریافت کیا

"نہیں" اس نے جواب دیا "میں اراس کی رہنے والی ہوں، کیا آپ مکان دیکھنے کی غرض سے تشریف لائے ہیں" اس کی آواز متانت اور لہجہ میں سنجیدگی تھی۔

میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی آرائش میں مجھے ایک بہم گیر انس معلوم ہو رہا تھا۔ سب چیزیں نظر آشنا، میز پر ایک حسین سبز رنگ کا گلدستہ، فرش پر نارنگی اور قرمزی رنگ کی قالین، گدے والی منڈھی ہوئی کرسیاں اور صوفے نہایت قرینے سے رکھے تھے، سامنے کی اونچی اونچی کھڑکیاں کھلی تھیں ان میں سبز شیشے جڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی میں سے ندی کی بہاریں نظر آ رہی تھیں، کارنس پر سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے مجسمے، کچھ اطالوی دوشیزاؤں کی نیم عریاں تصویریں اور چند شیشے کے گلدان جن میں نیلکنٹھ اور ہاربل کے حسین پھول دھرے تھے۔ تیسرے گلدان کے بائیں جانب کارڈ سائز کی ایک تصویر تھی۔ میری آنکھیں از خود رفتہ وہیں جم گئیں اور چند لمحہ تک میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ مجھ میں اور اس میں بہت دن کی شناسائی ہے۔ حافظہ مجھے جھٹلا رہا تھا۔ یادداشت مجھے ملامت کر رہی تھی۔

میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ اس کی خاموش تصویر میں حیرت انگیز جاذبیت تھی۔ اس کی نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں، اس کی معصوم صورت مجھے دعوت محبت دے رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کائنات جنبش میں ہے۔ اس کے لب متبسم تھے، مجھے پہچان رہی تھی وہ وہی تھی جو مجھے اکثر کچی نیند میں چونکا دیا کرتی۔ ہاں وہی — جس کی نیم باز آنکھوں میں شراب شباب کی شوخیاں رقص کرتی تھیں، — یقینی یہ وہی تھی جس کے سنہرے ریشمی گیسوؤں سے اکثر میرے ہاتھ مس کر جاتے اور میرے تمام جسم میں بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی۔

"یہ ... یہ کون ہیں" میں نے فرط شوق سے پوچھا

"میری مالکہ" — اس کا لہجہ خشک تھا اور بے حد غیر دلچسپ۔

"انہی کا مکان ہے نا" — میں نے دریافت کیا

بڑھیا میرا منہ تکنے لگی اور ایک لمحہ سکوت کے بعد بولی "... نہیں میرے آقا بابو پریم چند کا"

اس کے لہجہ میں اب بھی کوئی فرق نہ تھا۔

"اور یہ ان کی ....." میں جملہ ختم نہ کر سکا تھا کہ اس کے چہرے کا دائرے چہرے پر سرخی

دوڑ گئی اور کچھ پسینہ آگیا، میں آگ بگولہ ہوگیا، میری آنکھوں میں خون اتر آیا، دل میں رشک وبغض کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں کانپنے لگا اور بڑھیا سہم گئی اور اپنے شانہ پر کپڑے سنبھالنے لگی۔
"یہ دونوں اب کہاں رہتے ہیں" میں نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا، میرے ہاتھوں میں لرزش تھی اور تصویر،
"بابو پریم نندر کٹی پر ہیں اور ان کا ابتک کوئی سراغ نہ ملا" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا اور نظریں نیچی کرلیں۔
"تو... کیا ساتھ نہیں رہتے"
اس نے سنجیدگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

میں نے جذبات کی عنان کو زیادہ ڈھیلا نہ کیا۔ پاس ہی صوفہ پر بیٹھ گیا اور نہایت متین اور صلح آمیز لہجہ میں خادمہ سے مخاطب ہوا — "لیکن ایسا کیوں ہوا" میں ان کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں، بچپن میں ہم اور یہ ساتھ کھیلتے تھے، نہایت شریر ہے اور بلا کی باتونی، یہ مجھے اکثر نیند میں جگا دیا کرتی تھی، اکثر ساری رات سونے نہ دیتی، گدگداتی اور بے ضرورت بکواس سے میرا سر کھائے جاتی، میں اسے رانی رانی کہا کرتا — ہاں تو بتاؤ ایسا کیوں ہوا، بہت ممکن ہے کہ میں انہیں ڈھونڈھ لاؤں اور تمہارے آقا کی دنیا اجالی کردوں۔"

ضعیفہ نے شانہ پر کا کپڑا سنبھالتے ہوئے مجھے سر سے پیر تک تاکا، مگر میں نہایت سنجیدہ بنا ہوا تھا، جھوٹ کا شمّہ اشتباہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ مجھے اک صدق و صفا کا پتلا سمجھ کر رازدارانہ انداز سے کہنے لگی — "اللہ میرے! اس نگوڑی نے تو میرے آقا کی جیون تباہ کردی، وہ اس کی شکارگاہ میں پہلے پہل نظر آئی، وہیں میرے آقا سے نگاہیں چار ہوئیں، وہ سیدھے سادے اسے ساتھ لے آئے اور دونوں اس مکان میں رہنے لگے، دریا کی لہروں سے کھیلتے تھے، چاندنی راتوں میں درختوں کے سائے میں بیٹھے رہتے، انہیں اس سے بے پناہ محبت تھی، اس کے بغیر انہیں چین نہ آتا تھا۔ ایک روز قضا را مالک کی طبیعت قدرے خراب ہوگئی اور علی الصباح حسب معمول وہ سیر کو نہ جاسکے۔ وہ اکیلی چلی گئی اور دن اٹھتے تک نہ آئی، ہم نے تمام دن انتظار کیا، آقا بہت پریشان تھے، مجنونانہ کیفیت ہو رہی تھی۔ بہتیرا تلاش کیا گیا مگر نہ ملی — آہ وہ ابتک نہ آئی"

میں انتہائے مسرت سے پھولا نہ سما رہا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے وہ مل گئی۔ خوب ہوا — اس ناہنجار کو چھوڑ کر چلی گئی، اس کے دام فریب سے نکل بھاگی، اس کے

ہوس کے جالوں سے بچ گئی ـــ چلی گئی ـــ خوب ! خوب !!

"وہ وفورِ غم سے بیہوش تھے، جب ہوش آیا تو سنیاسی کا روپ بنا کر کٹی پر چلے گئے اور پھر نہ لوٹے ..." بڑھیا بڑبڑاتی رہی۔ "اب میں یہاں اکیلی ہوں، اس مکان کو فروخت کر کے میں بھی اپنے آقا کی کٹی پر چلی جاؤں گی۔ اس عمارت کی قیمت ...." بڑھیا بکتی گئی لیکن میں نے کان نہ دھرے، میں تخیلات کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا، مجھے یقین ہو رہا تھا کہ وہ مجھے ڈھونڈھنے گئی ہے۔ میں نے ایک اشرفی بڑھیا کے حوالہ کی اور تصویر لئے ہوئے باہر آیا ـــ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ہی فاصلہ پر آگے آگے جا رہی ہے، میری تلاش میں ـــ یقیناً میری ہی تلاش میں، میں دوڑنے لگتا اور کبھی کبھی کھڑا ہو کر تصویر کو بغور دیکھنے لگتا، پھر بے تحاشا بھاگتا اور دیر تک بھاگتا رہتا، جب کسی اونچے ٹیلے پر پہونچتا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور تک دیکھتا ـــ کوئی چیز سفید متحرک نظر آتی تو مجھے گمان ہوتا کہ وہی جا رہی ہے۔

میں پھر اسی کیفیت کی آڑ پر چل رہا تھا، سینہ دھڑک رہا تھا، امید و بیم کی حسین شعاعیں اس تجرد کی زندگی کو حسین بنا رہی تھیں، گیہوں کے زرد زرد پودے اب بھی ٹھنڈی ہوا کے دوش پر مستانہ جھوم رہے تھے، ندی کے زیر و بم کی خوش آہنگ صدائیں اب تک احساسِ سماعت کو راحت پہونچا رہی تھیں، مجھے یقین تھا کہ میں اسے پالوں گا اور وہ مجھے پالے گی۔ میرے احساسات میں شگفتگی پیدا ہو رہی تھی۔

میں اب بھی مسرور چلا جا رہا تھا۔ رفتار کبھی دھیمی کبھی تیز ہو جاتی۔

(ماخوذ) محمد زبیر انصاری

# سیاہ موتی

اگست کے اخیر میں، جب پیرس کے باشندے پانی کے ناکافی ہونے کا اظہار کرتے ہیں تو مجھے ہنسی آنے لگتی ہے، کیونکہ بحر احمر کے نچلے سرے پر میں ایک ایسے شہر کو جانتا ہوں جہاں ساٹھ ہزار انسان بستے ہیں اور جو کوہ آتش فشاں کے منجمد اور سرد --- نامکمل طور پر سرد --- ٹیلے پر آباد ہے، اور جسے عدن کہتے ہیں۔ یہاں دنیا کی تمام عورتوں کی دولت یا پیرس کے پورے محکمہ میونسپلٹی کی جدوجہد نہ تو گھانس کا ایک پتہ پیدا کرسکتی ہے اور نہ پانی کا ایک قطرہ۔

"لیکن جب بارش ہوتی ہے تو یہ پانی کیا ہو جاتا ہے؟" میں نے اپنے دوست سفیر پوچال سے پوچھا جن سے ملنے کے لئے میں اس چٹیل کوہستانی علاقہ میں چین سے واپسی پر ایک دن کے لئے اتر گیا تھا۔

"جب بارش ہوتی ہے تو یہاں کی نالیاں بھر جاتی ہیں۔ لیکن یہاں کے باشندوں نے پانچ سال سے بادل کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔"

"تو پھر آج ناشتہ کے وقت جو پانی ہم نے پیا تھا وہ کہاں سے آیا تھا؟"

"یہ کارخانہ سے آتا ہے۔ انگریزی تاجر مقطر پانی بیچتے ہیں اور یہ سونے کے بھاؤ بکتا ہے قیمت نہایت تباہ کن ہے۔ میرے یہاں پینے کے پانی کا بل ایک سو فرانک تک پہنچ جاتا ہے اس میں میری شریک زندگی کے نہانے کا پانی بھی شامل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سمندر کے شور پانی میں غسل نہیں کرتی ہیں۔"

"معاذ اللہ! تو پھر یہ عرب کس طرح کام چلاتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ پینے کے پانی کے لئے سو فرانک نہیں صرف کرسکتے۔"

"یہ اسی پانی پر قناعت کرتے ہیں جو ان پہاڑیوں سے جو بیس میل کے فاصلے پر واقع ہیں اونٹوں پر لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمہیں ناپسند ہوگا کیونکہ اس میں بکری کے چمڑہ کی بو ہوتی ہے۔ پولس کے قانون کے مطابق مقطر پانی کا دیسی باشندوں کے ہاتھوں بیچنا جرم ہے۔ یہ صرف یوروپین باشندوں برطانوی حفاظتی فوجوں اور ان گزرنے والے جہازوں کے لئے جو پانی کے محتاج ہوں خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے۔"

ان باتوں کو میں نے اپنے روزنامچہ میں درج کرلیا اور پھر ہم دونوں سفارت خانہ

واپس آئے جہاں مادام پوجال ہم دونوں کی منتظر تھیں۔ مادام پوجال مارسیلز کی خوبصورتی کا ایک حسین اور اچھوتا نمونہ نکلیں جو فی الحال صحرائے عدن میں جلا وطن تھیں۔ ان سے آج صبح مجھے پہلی مرتبہ شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ یہ ابھی حال میں میرے دوست کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی تھیں۔

عدن کے سوشل دلچسپی کے متعلق جو گفتگو چھڑی تو مادام پوجال نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ میرے ملنے والوں کی فہرست میں صرف دو شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو سن رسیدہ برطانوی عورت ہے جو میری زبان کے دو لفظ سے بھی واقفیت نہیں رکھتی اور دوسری "کائنات ہوٹل" کی مالکہ ہے جسے ہموطن عورتوں سے بات چیت کرنے کے بدلے۔ اپنے موروثی خطہ ضلع شیمپین کے نام ونمود کو قائم رکھنے کے لئے ناکارہ عربوں اور سوالیوں سے جھگڑنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔"

میں اپنے دوست کی بیوی کی اس تنہائی پر اظہار تاسف کر رہا تھا کہ پوجال بول اٹھا:
"دیکھو پیاری یہ ٹھیک نہیں۔ اب زیادہ تصنع اور فریب سے کام نہ لو۔ تم اس بات کو کیوں چھپا رہی ہو کہ عرب آبادی میں تمہارا ایک دلربا ہے"

مادام پوجال نے ہلا! کہہ کر اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا:
"ذرا سنئے! دلربا بھی ایسا کالا جیسے القطرہ کا رنگ!"

"ہاں! سیاہ فام لیکن پھر بھی خوبصورت، کالا مگر پھر بھی حسین" پوجال نے دہراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور عدن میں قہوہ کا سب سے بڑا تاجر۔ میں تمہیں کل اُس کے پاس لے جاؤں گا تاکہ تم بھی اُس کی بیش قیمت چیزوں، اُس کے نفیس قالینوں اور دوسری صنعتی اشیاء کو دیکھ سکو۔ اس کے مکان کو ایک مکمل بازار ہی سمجھو۔ میری بیگم صاحبہ تو وہاں جاکر گھنٹوں اپنا وقت صرف کرتی ہیں اور میں انہیں منع بھی نہیں کرتا اور بیچارہ ملاؤ صرف اس وجہ سے کہ یہ چیزیں اس سفید عورت کو پسند ہیں، میرے مکان کو سجنے کے لئے اپنے گھر کے سارے لوازمات دینے کے لئے تیار ہے۔"

"واہ کیا مبالغہ ہے!" مادام پوجال نے کہا جن کے چہرہ پر اب خشونت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ "یہ حبشی میرا دوست نہیں، آپ ان کی باتوں میں نہ آیئے"

"بات اصل یہ ہے" میرے دوست نے کہا "کہ آج صبح ایک موتی کے کھو جانے سے ان کے مزاج کا توازن درست نہیں ہے۔"

"اس کے گم ہو جانے سے یقیناً میری طبیعت کچھ مکدّر ہو گئی ہے" مادام پوچال نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "کیونکہ آج سارا دن اس گمشدہ موتی کی تلاش میں گذرا ہے مجھے یہ دو موتی بیحد پسند تھے میں اپنے کان سے انہیں کبھی اتارتی تھی میرے شوہر نے انہیں لنکا میں خریدا تھا۔ اس گمشدہ موتی کی خوبصورتی، نفاست، پاکیزگی اور نادر ہونے کا اندازہ آپ اس دوسرے موتی سے کر سکتے ہیں جو آپ کے سامنے میرے ایک کان میں آویزاں ہے"

میں جو اس کے معائنہ کے لئے جھکا تو میں نے محسوس کیا کہ مادام پوچال کے کان خوبصورت ہیں اور یہ نہایت نفیس اور دلپسند خوشبو استعمال کرتی ہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا اور اس صحبت کے اختتام پر اس ملک کے رواج کے مطابق میں مکان کی چھت پر سونے کے لئے چلا گیا۔

دوسرے روز میں اپنے دوست کے ساتھ دیسی عربی محلہ میں مادام پوچال کے دلربا سے ملنے گیا۔ ملاد بن سعید کے نام ہی سے عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لکھ پتی اور قہوہ کا تاجر ہے۔ اور پیرس کے قہوہ فروشوں کے بعد دنیا کے نفیس ترین قہوہ کا تاجر ہے۔ تاہم ہر سیاح ملاد بن سعید کی دوکان سے قہوہ خرید کر بطور تحفہ پیرس ضرور لاتا ہے تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جو قہوہ کہ پیرس میں خریدا جاتا ہے اس سے یہ کچھ بہت زیادہ گراں نہیں پڑتا ہے۔

اس تاجر کے یہاں جاتے ہوئے ہم لوگوں نے ایک دوسرے ہموطن سیاح کو (جس کا نام میں بھول رہا ہوں) ساتھ لے لیا تھا۔ یہ شخص سیّاح تھا اور پوری دنیا کا سفر کر چکا تھا۔ یہ نوٹ لکھنے میں بہت ہی ماہر اور چست تھا اور کندہ حروف اور نقشوں کی نقل اتارنے میں بھی کافی دست گاہ رکھتا تھا۔ اکاڈیمی میں جس کا یہ مراسلی ممبر کہا جاتا تھا' اس کے مضامین بڑے بڑی قدر اور عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ غرض علمی لیاقت کی حیثیت سے اس میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جن کے یکجا ہونے سے انسان پر فاضل کا اطلاق ہوتا ہے۔

ملاد جو ایک اچھے شہری کی طرح انگریزی بولتا تھا' عربی نسل کا ——— جو شاید خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا کی بہترین نسل ہے ——— نہایت ہی اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس نے ہمارا استقبال نہایت ہی سلیقہ خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے کیا اور نہ صرف اپنی دوکان ہی میں لے گیا بلکہ اپنی ذاتی رہائش کے مکان میں بھی لے لیا گیا۔ جس سے ہم لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ رخصت کے وقت ہماری دعوت نہایت ہی اعلیٰ مشرقی قہوہ تمباکو اور پھر رسمیہ طور پر ایک گلاس تازہ پانی سے ہوئی۔ دس میل سے چمڑے کی تھیلیوں میں

اونٹ پر آنیوالا پانی کسی حالت میں اچھا نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر پیاس سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ جنوبی چین کے دھان کے کھیتوں میں مجھے اس سے بھی خراب پانی سے پالا پڑ چکا تھا۔

مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس پانی میں چمڑے کی مہک تو درکنار ایسی نفیس خوشبو تھی کہ طبیعت نہایت محظوظ ہوئی۔ میں نے اسے دوبارہ سونگھا۔ اور بخدا! اس کی خوشبو کسی تازہ اور نادر پھول کے ایسی تھی۔

ہمارا فاضل سیّاح بھی اس خوشبو سے محظوظ ہوا اور پانی کو مزہ لے کر پینے لگا۔ اور پھر اس کی خوشبو اور اس کے مزہ کے اسباب کی تفتیش میں ڈوب گیا اور گویا بات کی تہہ میں ڈوب کر نہایت عالمانہ شان سے اس طرح سرگرم گفتگو ہوا:۔

"کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ اس پانی میں ایک خاص قسم کا مزہ ہے؟"

"ہاں اس میں ایک خاص مزہ تو ہے" میں نے جواب دیا

"بالکل درست، بالکل درست! مگر حضرات! —— اب آپ کو یہ جاننا چاہیئے کہ کوئلہ کی ترکیب بہت سے اجزا سے ہے۔ ان اجزا میں سے ایک شئے ایسی بھی جس سے عطر بنانے والے اپنے عطروں کو باستے ہیں۔ اس سے میں نے یہہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہہ پانی جو وقتاً فوقتاً اونٹوں پر آتا ہے اسی قسم کے کوئلہ کی سطح پر واقع ہے جس کی خوشبو اس میں پھیل جاتی ہے۔ جناب! —— ذرا غور کیجئے کہ عدن میں اور کوئلہ! —— آپ سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوئے؟ ذرا سوچئے تو کہ اس کے اندر کس قدر بے پایاں دولت پوشیدہ ہے! آپ کے خیال میں یہ بات بھی کبھی گذری ہے کہ کوئلہ کا ذرّہ ذرّہ بھی جو یہاں جلایا جاتا ہے انگلینڈ سے آتا ہے"

اس کے بعد اس جگہ کی دوری، سمت، چوحدّی وغیرہ کے بیان سے اُس شخص نے ہم لوگوں کے ناک میں دم کر دیا۔ اور لطف تو یہ کہ وہاں جانے کے لئے خود بھی فوراً تیار ہوگیا مگر چونکہ جہاز اسی دن کھلتا تھا اس لئے مجبوراً اس ارادہ کو ترک کر دینا پڑا پھر بھی اُس نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ کم سے کم ایک بوتل بھی اس پانی کا ساتھ لے لیا جائے تاکہ پیرس پہنچ کر وہاں کے معمل خانہ میں اس کا کیمیاوی جانچ کیا جائے۔ مگر مجھے سخت تعجب ہوا کہ اس بات پر ملاد کے چہرہ سے تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔

بہرکیف ہم لوگ ملاد کے یہاں سے اب روانہ ہی ہونے کو تھے کہ میں نے اپنے لئے

ایک گلاس پانی ڈھالا۔ پانی ڈھال ہی رہا تھا کہ کوئی ٹھوس چیز پانی کے ساتھ گلاس میں گری۔ لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ تو وہی سیاہ موتی تھا جس کا ایک نمونہ کل شام کو میں نے مادام کے کان میں دیکھا تھا۔ اور پھر ساتھ ہی بالکل وہی خوشبو بھی میں نے اُسے فوراً ہی پہچان لیا!

یہ فاضل سیاح اپنی ساری علمی کائنات اور کوئلہ کی کان کے ذخیروں کے ساتھ بھی بیوقوف نکلا! ــــ اور میرا دوست پوجال.......... ! ابھی جس چیز کا میں نے پتہ لگایا تھا اس کو دنیائے معدنیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس انکشاف کے بعد غریب پوجال کا یہ جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا:

"عدن کی آب وہوا کا عجیب اثر ہے۔ مردوں کو تو یہ کمزور کرتا ہے۔ لیکن عورتوں کے احساسات کو یہ اُبھارتا ہے۔"

اور پھر اس عرب کے مکان میں ــــ وہ عرب جو جوان، خوبصورت اور امیر تھا اور جس کی رہائش نہایت ہی عالیشان تھی میں نے اس موتی کو مع اس کی خوشبو کے پایا جو مادام پوجال کے ساتھ مخصوص تھی۔ ایسی حالت میں میں کیا کرسکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے بارے میں کچھ بھی یہاں چھیڑنا عزت، شان اور اخلاق کے خلاف تھا۔ ایسا کرنے میں صرف ملاد کی سبکی ہوتی بلکہ سب کے سامنے میرے دوست ــــ سفیر کے باعزت عہدہ رکھنے والے دوست ــــ کی عزت اور ناموس پر بھی بٹہ لگتا۔

اسی درمیان میں جب ہمارا فاضل سیّاح بوتل میں پانی بھر کر اسے بند کر رہا تھا۔ میں نے موقع پاکر اس موتی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیونکہ میں نے یہ سوچا کہ پوجال "سب چیزوں" کو کیوں کھوئے.......... اس کے بعد ہم سب عرب کے یہاں سے روانہ ہوگئے۔ ماہر معدنیات نے سیدھے بندرگاہ کا رخ کیا۔ مجھے موتی واپس کرنا ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے پوجال مجھے اکیلا چھوڑ کر کپتان سے بات کرنے چلا گیا۔

---

"قبل اس کے کہ میں آپ سے رخصت ہوں میں اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کا موتی آپ کو واپس کردوں"

مادام پوجال مارے خوشی کے چلا اٹھیں

"میرا موتی۔ بڑی خوش قسمت ہوں میں۔ کہاں ملا؟"

"ملاد بن سعید کے یہاں" میں نے ہر ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ہاں! میں نے اسے وہیں پایا۔ مگر خدا کا شکر کیجئے کہ پوجال اس راز سے واقف نہیں ہے"

اُس کے چہرہ پر تعجب کا رنگ اور بھی گہرا ہوا تو میں نے اسی لب و لہجہ میں کہا:

"میں اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں جانتا ہوں۔ اور نہ میں اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں۔ یہہ کہنا بیکار ہے کہ اس معاملہ میں میرا رویّہ بالکل شریف انسان کا سا ہوگا اور ایک شریف انسان کی حیثیت سے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس معاملۂ کے بارے میں کسی سے بھی، کچھ نہیں کہوں گا"

یہہ کہہ کر اپنی نظروں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے میں اس سے ہاتھ ملائے بغیر چلا آیا۔ میں نے اپنے دوست کو جہاز پر پایا اور اُس سے کچھ اس قدر بے اختیاری اور جوش سے لپٹ پڑا کہ وہ نہایت متعجب ہوا ـــــ بیچارہ پوجال!۔۔۔۔۔۔ ایک گھنٹے کے بعد میں عدن سے بہت دور ہو چکا تھا۔

---

ایک دن اچانک پوجال اور اس کی شریک زندگی سے مجھے پیرس کی ٹھنڈی سڑک پر ملاقات ہوئی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہہ دونوں پہلے سے بھی اور زیادہ محبّت میں گتھے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں سیاہ موتی مادام پوجال کے کان کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ہم تینوں نے کھانا ساتھ ہی کھایا اور پھر فطری طور پر عدن کے متعلق گفتگو چھڑ گئی۔

"تم نے تو ملاد کے مکان پر موتی پاکر ایک ہفتہ تک ہم لوگوں کو اس طرح کے ذہنی اُلجھاؤ اور چکّر میں ڈال دیا تھا کہ خدا کی پناہ" میرے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خود اس واقعہ سے پریشان نہیں ہوئے تھے"

اس موقع پر تو یقینی میں بہت پریشان اور متعجب ہوا تھا۔ لیکن میں نے بلا سوچے سمجھے کچھ یونہی سا "ہوں، ہاں" کر دیا۔

"ذرا سوچو تو" پوجال نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے نوکر نے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کا کیا عجیب اور نادر ذریعہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ اس پانی کو جس میں میری بیوی نہایا کرتی۔ عربوں کے یہاں بیچ دیا کرتا تھا۔ وہ

وہ موتی بھی اس روز پانی میں گر پڑا ہوگا اور اس کے ساتھ ملاد بن سعید کے یہاں چلا گیا ہوگا۔ تم کو یہ وہاں کیسے ملا؟"

"بخدا! میں تو گویا اُسے نگل ہی گیا تھا" میں نے اُس خوبصورت عورت کی طرف جو شرما رہی تھی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

بوتل کے پانی کے کیمیاوی تجزیہ کا حال تو معلوم نہیں۔ لیکن ہم تینوں کے اس انکشاف کے باوجود بھی پیرس کی سائنس اکاڈیمی میں عدن میں کوئلہ کی کان پر ایک مقالہ پڑھا ہی گیا۔

مترجمہ محمد یحیٰی

# کلام تپاں

مولانا مخدوم شاہ نور الحق تپاں رح کے والد ماجد حضرت مخدوم شاہ عبد الحق ابدال رح حضرت تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قادری پھلواروی رح کے بڑے صاحبزادے تھے۔ حضرت تپاں کی ولادت ماہ جمادی الاولی سنہ ۱۱۵۶ھ میں ہوئی۔ بیعت و اجازت و خلافت اپنے جد امجد مخدوم شاہ مجیب اللہ رح سے سنہ ۱۱۷۳ھ میں حاصل کی۔ اور اپنے پھوپھا حضرت سجّاد رح کی بڑی صاحبزادی سے بیاہے گئے۔ اور حضرت سجاد کی وفات کے بعد ان کے جانشینی اپنے جد امجد کے حکم سے قبول کی سنہ ۱۲ھ میں حضرت تپاں نے اپنے صاحبزادے مولانا حافظ محمد ظہور الحق رح کو بٹھا دیا۔ اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

سنہ ۱۲۳۰ھ میں بعض اقارب کا لعقارب کی طویل اور مسلسل ستم کیشیوں سے تنگ آکر حضرت مولانا ظہور الحق محدث رح کو اچانک شب کے وقت گھر چھوڑ کر پٹنہ سٹی چلا آنا پڑا، اور ہجرت کے وقت کچھ ضروری تبرکات اور کتب ضروریہ کے سوا کچھ سامان ساتھ نہ لے جاسکے جب پٹنہ میں قیام کا انتظام قابل اطمینان ہو گیا تو تیسرے دن کچھ لوگوں کو پھلواری روانہ کیا تاکہ باقی کتابیں اور سامان وہاں سے لے آئیں۔ مگر آنے والوں نے مکان کو بالکل جلا ہوا۔ ایک تودہ خاک پایا۔ اور کوئی چیز لانے کے قابل نظر نہ آئیں وہ مولانا کے پاس ناکام واپس آئے اور حالت بیان کی۔ مولانا نے فرمایا ع خوب شد، اسباب خود بینی شکست اور کہا الحمد للہ علی کل حال۔

حضرت تپاں اور حضرت سجّاد کے اور خود حضرت مولانا ظہور الحق رح دواوین فارسی و ذخیرۂ کلام اردو اور اکثر تصنیفات تالیفات اور نیز بعض بزرگان پیشیں کی بعض اہم تصنیفیں اسی سلسلے میں ضایع ہو گئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض گھروں پر اسوقت تک بعض چیزیں ان میں کی موجود ہیں۔ مگر وہ لوگ دکھاتے تک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کے کلام کے بیشتر اجزاء ادھر ادھر سے کسی طرح مجتمع کئے جاسکتے ہیں۔ وہ بھی بمشکل تمام۔ بعض حصّہ کلام تو محض بوسیدہ مسودات پر سے جس سے بمشکل نقل کیا۔ اور پھر وہ مسودات اس قابل بھی نہ رہے کہ محفوظ رکھے جاسکیں۔ کیونکہ اوراق کے جس حصّہ پر بھی انگلی پڑی وہ وہیں سے سفوف ہو گیا۔ حضرت تپاں رح کی وفات ۲ شعبان روز سہ شنبہ سنہ ۱۲۳۳ھ کو پٹنہ میں ہوئی۔ اور لاش پھلواری لاکر حضرت مجیب رب العلا رح کے احاطہ مقبرہ میں ان کی قبر کے قریب ہی دفن کی گئی۔

محی الدین تمنّا

جو کام تیرا ہے سو کر، رٹ یعنی نام اللہ کا
کریگا اللہ جو ہوویگا کام اللہ کا

اللہ ہی اللہ ہے، اللہ رے نام اللہ کا
ہووے جو آنکھ آوے نظر جلوہ تمام اللہ کا

دشمن کے بھی دل پہ اگر ٹک درد کا پاوے اثر
اوس پر بھی رکھے اک نظر احسان عام اللہ کا

ہوتے سماعت پر مرے قربان باقی سب حواس
سنتے پیمبر سے اگر ہم بھی پیام اللہ کا

معراج ہی معراج ہی، جس کا تلاوت نام ہی
ہی گفتگو اللہ سے پڑھنا کلام اللہ کا

الزام کیا دونوں اگر ہیں اپنے اپنے کام میں
جب کام ہی میرا گنہ بخشش ہے کام اللہ کا

دیکھیں بلاوے جاویں ہم کس طرح سی کس حال سے
ہوویگا جب محشر کے دن دربار عام اللہ کا

کیونکر ہیں یہ شمس و قمر، کس پر ہیں یہ ارض و سما
پوچھیگی اس کو عقل کیا، یہ ہے انتظام اللہ کا

کہتے ہیں سب جس کو تپاں میخوارہ وحدت ہی ایک
خمخانۂ توحید میں پیتا ہے جام اللہ کا

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا

ہم جو ہر ایک کی سنتے ہیں تو کیا ایسے ہی؟
ہر فسانے کو سمجھتے ہیں فسانہ تیرا

رکھدیا چھید کے دل، کیا یہ خطا تھوڑی ہے
بے خطا کہنے کو ہے صرف نشانہ تیرا

دوست جب دوست ہے اے دل کوئی پروا مت کر
دشمن جاں جو ہے سارا زمانہ تیرا

کل تلک تو یہی، دل آئینۂ عارض تھا
ہو کے صد چاک مگر آج ہے شانہ تیرا

اے اجل کھینچ ہی لائے گا تجھے خنجر دوست
اب چلے گا کوئی حیلہ نہ بہانہ تیرا

عقل کو چھوڑ دیا تو نے تو ہشیاری کی
پڑ گیا نام تپاں کیونکہ دوانہ تیرا

ناشاد نہیں بلبلِ ناشاد کے ایسا
پھر بھی وہ نہیں اس دل برباد کے ایسا

آفت ہی دم نزع یہ چلنا بھی نفس کا
جو حلق کو ہے دشنۂ جلاد کے ایسا

بلبل کو کیا گل سے جدا موسم گل میں
ظالم نہیں دیکھا کوئی صیاد کے ایسا

یہ چھوٹ کے گلشن سی بھی زندہ ہے قفس میں
بے مہر نہیں مرغ چمن زاد کے ایسا

کیوں فاختہ کرتا ہے ہر اک لمحہ یہ کوکو
لگتا ہے کسو صاحب اولاد کے ایسا

ظاہر میں تو ہے موم سے بھی نرم وہ ظالم
دل اوس کا مگر سخت ہے فولاد کے ایسا

دیکھنے میں تو تاکا تھا فقط اپنے لیکن
کچھ دل پہ لگا تیشۂ فرہاد کے ایسا

فرہاد ہو یا قیس ہو یا وامق و ذلّ ہو
ہوتے تو سمجھتے مجھے استاد کے [illegible]

ایمان کی یہ بات تپاںؔ ہم تو کہیں گے
استاد نہیں حضرت سجّاد کے ایسا

عزم آنے کا جو وہ لے دل بے تاب کریں
فرش ہم راہ میں جا دیدۂ بیخواب کریں

فصل گل آئے تو مرغانِ قفس کم سے کم
بر زباں یادِ گلستاں کا کوئی باب کریں

لے لیا ہے تو کریں قدر بھی میرے دل کی
آپ برباد نہ یہ گوہر نایاب کریں

خفتہ بختی کے سبب نیند ہوئی مجھ پہ حرام
بخت بیدار جو ہو جائے تو کچھ خواب کریں

پھر تو عرفان کی کھل جائے حقیقت اون پر
فرش زاہد جو کوئی جام مئے ناب کریں

میرا عاشق، مرا دیوانہ، مرا خوگرِ غم
خط مجھے لکھیں تو ارقام یہ القاب کریں

گر بسر اپنی نہ ہو شے رہِ تسلیم کے بیچ
پھر تو جینے ہی کو ہم دور سے آداب کریں

کر چکے جبکہ مسبّب پہ بھروسا ہمدم
بے سبب بیٹھے کیوں ہم غم اسباب کریں

جو بدی ان سے کرے کیونکہ نہ ہو وے ملعون
جب بنے آپ تپاںؔ حجت اصحاب کریں

ہجر کی شب اور زلفِ یار دونوں ایک ہیں
میرے دل کے داغ اور گلزار دونوں ایک ہیں

اے نہ ہے ذوقِ خلش گویا ترے دیوانے کو
نوکِ مژگاں اور نوکِ خار دونوں ایک ہیں

گرمیٔ صبرِ دلِ عاشق کو شامِ ہجر میں
برقِ سوزاں، آہ آتش بار دونوں ایک ہیں

حضرتِ واعظ اگر ہے واقعی نشہ حرام
نشۂ مے نشۂ پندار دونوں ایک ہیں

ٹالتے رہتے ہیں کیوں لا و نعم میں میری بات
آپ کا اقرار اور انکار دونوں ایک ہیں

مر کے جینا بھی ہے اور جیتے بھی ہیں مر مر کے ہم
مرنا جینا تب تو میرے یار دونوں ایک ہیں

اٹھ کے ہم جائیں یہاں سے فائدہ کیا اے تپاںؔ
باغِ جنّت اور کوئے یار دونوں ایک ہیں

بیچ دیویں گوہرِ دل کیوں نہ اوس دلبر کے ہاتھ
قدر جوہر کی لگے گر صاحبِ جوہر کے ہاتھ

دیویں گے بوسہ لبوں پر میرے آکر قدسیاں
چوم لیویں خواب میں بھی ہم جو پیغمبر کے ہاتھ

جھک نہ آوے دست بوسی کیلئے پیرِ فلک
لو نہ انگڑائی خدارا دونوں اوپر کر کے ہاتھ

جوشِ سودا اس کے تو رگ رگ میں ہے اے چارہ گر
کیا بھلا دیکھے ہے اک دیوانۂ مضطر کے ہاتھ

قاتلا! ناکام رہ جائے نہ تیرا نیم جاں،
اور بھی دو چار لگوا دیں گے خنجر کے ہاتھ

یہ کلک یہ سر یہ پاؤں یہ جبیں یہ کمر
ہیں غضب اون ابروؤں کی تیغ سے پیکر کے ہاتھ

ہاتھ میں شیخ زماں کے دیدیا ہاتھ اے تپاں
یہ سمجھ لو بک گئے ہم حیدرؓ صفدر کے ہاتھ

جب محبت کا نام کوئی لے
ٹک صبوری سے کام کوئی لے

دیکھو تڑپے ہے کس طرح بجلی
کچھ تڑپ اوس سے دام کوئی لے

دل یہ چلائے ہے کہ اب ہم کو
دونوں ہاتھوں سے تھام کوئی لے

بوسہ کیا مفت مانگا جاوے ہے
نقد دل ہم سے دام کوئی لے

جنس کا سد ہے دل تو لیوے کون
کہتے پھریئے تمام کوئی لے

ہوش بھی کوئی شے ہے رکھے کی
عقل سے کچھ تو کام کوئی لے

ہو کبوتر کہ کبک یا طاؤس
سیکھا ان سے خرام کوئی لے

جب مرے قتل کی گھڑی آوے
تیغ ابرو سے کام کوئی لے

میں یہ کہکہ کے دل کو بیچوں ہوں
ہے جہاں ہیں یہ جام کوئی لے

دیوے پرچاک نہ چشم ساقی گر
کیوں بڑھا ہاتھ جام کوئی لے

سہل ہے پھر تپاں ہر اک مشکل
نام خیر الانام کوئی لے

مارتے ہیں نظر کے بھالے سے
اور دیکھے ہیں بھولے بھالے سے

راہ کچھ اور اب نکال اے دل
کام چلتا نہیں ہے نالے سے

بس ملائے رہو نگاہ فقط
حال مت پوچھو مرنے والے سے

چارہ گر ٹک سمجھ سے بھی لے کام
موت ٹلتی نہیں ہے ٹالے سے

کوئی نسبت ہے عقد پروین کو
آپکے موتیوں کے مالے سے

مونہہ سے خم ہی لگادے اے ساقی
کون پیتا ہے لگا پیالے سے

خار صحرا کو دو مبارکباد
تلوے پھر بھر گئے ہیں چھالے سے

دیکھکر گیسوؤں میں رخ انکا
چاند بھاگا نکل کے ہالے سے

داغ اٹھایا ہے جب سے تئیں دل پر
انس گلشن میں ہے تو لالے سے

دھیان میں زلف کے جو سوئے ہم
نیند میں ڈر رہے ہیں کالے سے

اپنی کملی ہی میں مگن ہے تپاں
کام کیا شال سے دوشالے سے

اول تو انہیں دے دیا ایمان بھی دل بھی ... اب آپ ہی بیٹھا ہوں پشیماں بھی خجل بھی

اپنے تو وہ جی کھول کے غیروں سے ملے ہیں ... اور ہم پہ یہ قدغن ہے کہ مت اپنوں سے مل بھی

آوے طلب عیش میں ہے میکدہ واعظ ... پھر عیش کے بیچ آکے یہ ہووے ہے مخل بھی

پانی کی جگہ مے تھی تو مٹی کی جگہ دُرد ... سرمست ازل سے ہے مری آب بھی گل بھی

طوف در دلدار کا ہم باندھے ہیں احرام ... احرام بھی ایسا کہ حرم ہمکو ہے جل بھی

ہم جان سے بیٹھے کہ فقط زلف ہے آفت ... واللہ غضب ہے ترے رخسار کا تل بھی

عزت وہی دیوے، وہی ذلت سے بچاوے
اوس رب کا تپاں نام معز بھی ہے مذل بھی

شام فرقت، یاد زلف یار دو دو قہر ہے ... ایک میرے حق میں بالاستمرار دو دو قہر ہے

دل کے ایسی چیز کیسے مفت دیدیوے کوئی ... ہم سے کہنا آپ کا ہر بار "دو۔ دو" قہر ہے

دینے رہتے ہیں برابر ابروے پُرخم کو بل ... ننھی ننھی آپ کی تلوار دو دو قہر ہے

دشت پیمائی میں مژگان نظر دونوں ہیں یا ... پاؤں کے ہر آبلہ میں خار دو دو قہر ہے

لکھنے کو برجستہ مجھکو حضرت شورش تپاں
دیویں گر ایسی طرح اک بار دو دو قہر ہے

تقدیر کا جھگڑا تو ہے تدبیر کے آگے ... تدبیر کی کیونکر چلے تقدیر کے آگے

رہتے ہیں شب و روز حسینان دو عالم ... مانند مرید اس بت پیر کے آگے

آئینے کے اندر وہ اوسے کیونکر لگاوے ... حیراں ہے سکندر تری تصویر کے آگے

ہیہات کہ مسجد میں مسلمان پڑے ہیں ... کفار کی صورت تری تصویر کے آگے

تو تیغ بکف ہو تو غزالان حرم بھی ... سر خم کئے آویں تری شمشیر کے آگے

گر تیر نظر آوے اوس ابرو کی کماں سے ... سب سینہ سپر ہوویںگے اوس تیر کے آگے

اک خواب سے بڑھکر نہیں یہ ہستی موہوم ... وہ خواب جو شرمندہ ہے تعبیر کے آگے

کیا صور قیامت کا تپاں ذکر یہاں پر
دم بند ہے اوس کا مری شبگیر کے آگے

دم توڑے دل! اب ہمارا جائے ہے ... گانٹھ سے تیرے بھلا کیا جائے ہے

جی تو چاہے ہے بہت قاتل! مگر ... ہائے کب جی بھر کے تڑپا جائے ہے

ایک تو پا کوبی جوشش جنوں! ... تسپہ یہ دل ہے کہ اوچھلا جائے ہے

رگ رگ ہو رستے ہی ہیں، بولے ہے ضعف ‏— شوق سے دم بھر بھی ٹھہرا جائے ہے؟
تیرے عاشق، تیرے شیدا کا یہ حال؟ ‏— ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے
ہے رواں جو زندگی کا قافلہ ‏— یہ کہاں بارِ الٰہا! جائے ہے
لگ گئی ہے آگ سی سینے کے بیچ ‏— اور دل کمبخت بجھتا جائے ہے
کب مٹے ہے دل سے یاد روئے یار ‏— سر سے کب زلفوں کا سودا جائے ہے
منزلِ مقصود پائے ہے وہی ‏— جو ترے رستے میں کھویا جائے ہے
اٹھ رہا ہے دردِ دل جب بار بار ‏— دل سے پوچھو کا ہے بیٹھا جائے ہے
اب بلاوا آ رہا ہے یار کا ‏— دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے

وے نہیں آئے تپاں کے پاس اگر
اے اجل تجھ سے کب آیا جائے ہے

دیکھیں وحشت وشت کب لے جائے ہے ‏— بیٹھے بیٹھے جی بہت گھبرائے ہے
ہائے رے عالم تری تصویر کا ‏— جیسے اب کچھ مونہہ سے فرمائے ہے
وے تو ہیں معشوق جو چاہیں کریں ‏— دردِ دل کا ہے بھلا تڑ پھائے ہے
زندگی یا موت جو بھی چاہیں ہم ‏— بِن تمہارے کچھ نہیں بَن آئے ہے
اَب تو اچھی طرح سے بیدل ترا ‏— دل لگانے کا نتیجہ پائے ہے
دل کو سمجھاویں ہیں، یہ کہہ کہہ کے ہم ‏— یار بس اَب آئے ہے اب آئے ہے
جب کبھی وعدہ کرے ہے غیر سے ‏— میرے ہی سر کی قسم وہ کھائے ہے
مشک و عنبر سے بسا ہے چاروں اور ‏— دوش پر وہ زلف کو بکھرائے ہے

کیا تپاں لکھیں زبردستی کا شعر
کوئی مضمون ہی نہیں جب آئے ہے

(باقی)

# قومی تعلیمی نظام اور اُس کے اسباب

حکما اور فلاسفہ کی نظر میں تعلیم کے مقاصد برابر ایک ہی رہے ہیں اور وہ یہ کہ انسان اپنی ہستی کو پہچانے۔ اپنے نفسانی خواہشات پر قابو حاصل کرے اور اخلاقی و روحانی جذبات کو ترقی دے اور اس طرح وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے مفید ثابت ہو۔ اور ہر طرح کے قومی و ملکی نیز دیگر اختلافات کو فنا کرے۔ اس میں مغربی و مشرقی ممالک کے فلسفی بالکل ہم خیال ہیں۔ فلسفیوں کے علاوہ ایک بڑا گروہ مدرسوں کا بھی ہے جو اسی خیال کی تائید و ترجمانی کرتا ہے اور خاص کر موجودہ دور میں جبکہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اپنے ملکی اور قومی تاثرات کے ماتحت ایک دوسرے سے کٹ گئی ہیں اور ایک غیر معمولی عالمگیر انقلاب کی طرف اشارہ کر رہی ہیں بہتیروں کا بھی یہی خیال ہے کہ تمام دنیا کی قومیں اپنے ملکی تعصبات سے بالکل بری ہو کر اس امر کی کوشش کریں کہ ایک بین الاقوامی تعلیمی نظام کی بنیاد پڑ سکے اور ایک ہی طرح کے اخلاقی اور روحانی اصول کی تعلیم دی جائے۔ بلکہ بعض ممتاز سیاسی حکماء نے تو یہاں تک زور دیا ہے کہ اس بین الاقوامی دارالعلوم میں صرف ایک زبان منتخب کر لی جائے ایک ہی صلاحیت اور اصول و خیال کے مدرسین مقرر کئے جائیں۔ اور ایک ہی تعلیمی نصاب تمام عالم کے لئے اختیار کیا جائے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے گذشتہ جنگ عظیم کے اختتام پر بھی سارے یورپ کی نظر میں سب سے بڑا مجرم "حضرت مدرس" تھا جس نے اپنی تنگ نظری ملکی تعصبات اور حب الوطنی کے غلط جذبات سے متاثر ہو کر ایک مسموم فضا پیدا کر رکھی تھی اور قوم کو بری تعلیم دے کر وحشیانہ جنگ پر آمادہ کر دیا تھا مثلاً پروفیسر ہرن شاد اپنی کتاب "تعلیم کی ترقی" [illegible] میں اسباب جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے تین بڑے اسباب تھے اولاً انتہائی حب الوطنی دوم انتہائی مادیت پرستی سوم دماغی تربیت اور اس کے ساتھ اخوت روحانی کے جذبات کا فقدان۔ قرینہ غالب ہے کہ موجودہ جنگ کے ختم ہونے پر بھی ہر ملک میں مروجہ تعلیمی نظام پر الزامات کی بوچھار ہو گی۔ ہر طرح کی جائز و ناجائز تنقیدیں کی جائیں گی۔ اور سرگرمی سے کاوش ہو گی کہ دنیا کے قومی اختلافات کو مٹانے کے لئے ایک بین الاقوامی درس گاہ کی تشکیل کی جائے تاکہ دنیا میں ہمیشہ کے لئے جنگ وجدال کی بیخ کنی ہو سکے اور انسان چین اور اطمینان کی زندگی بسر کرے

اگرچہ اس طرح کی کاوشیں ایک حد تک خلوص اور انسانی ہمدردی کا ثبوت دیتی ہیں اور اس لئے ایک گونہ قابل تحسین ہیں۔ لیکن وہ اس بات کا بھی پتہ دیتی ہیں کہ ان کے حامیوں نے ان ناگزیر اور اٹل حقیقتوں پر گہری نظر نہیں ڈالی ہے جو مختلف ممالک کے مروجہ قومی تعلیمی نظام کے اسباب ہیں۔ ان حقیقتوں کا صحیح مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ کائنات کے تمام تعلیم پانے والے افراد کو ایک ہی عالمگیر اصول تعلیم کے تحت میں لا کر منسلک کرنے کا خیال بالکل ہی ناقابل عمل اور بے سود ہے۔ اور جن جن ممالک میں یہ کوشش کی گئی کہ اجنبی اصول اور غیر ملکی طریقۂ تعلیم کی کورانہ تقلید کی جائے وہاں تعلیم کو فائدہ کے بدلے نقصان ہی نقصان اٹھانے پڑے۔ میرے اس بیان کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری متمدن اور ترقی پذیر قوم کے تعلیمی، اقتصادی، عمرانی، اور سیاسی تجربات کو تعصب کی بنا پر نظر انداز کر دے اور ان کا فائدہ نہ اٹھائے۔ ایسا کرنا نہ صرف غلط بلکہ مہلک ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کا اعتراف لازمی ہے کہ ہر قوم، ہر ملت اور ہر ملک اپنے فلسفۂ زندگی، تخیل کائنات، قومی جذبات اور روایات عظیمہ، اقتصادی نظام، معاشرتی و اخلاقی اصول اور دیگر مسائل کی بنا پر ایک جداگانہ اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اور تقلید کی راہ میں قدم بڑھانے کے وقت ان امتیازات کا خیال لازم ہے۔

ان قومی خصوصیات میں سب سے پہلا عنصر ایک قوم کی تاریخ ہے۔ ہر قوم کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے جنھوں نے اسکی انفرادی اجتماعی زندگی پر دائمی اثر ڈالا ہے۔ جن کی یاد اس قوم کے ہر فرد بشر کو اب تک پیاری ہے۔ ہر قوم کے گذشتہ اخلاقی، اقتصادی اور روحانی تجربات و احساسات اس کے تاریخی واقعات سے وابستہ ہیں جن میں اسکی موجودہ تمدنی زندگی کا راز نہاں ہے۔ جاپان اور ٹرکی جیسے ترقی پذیر اور تہذیب نو کے دلدادہ ممالک میں بھی جو خود ملک کی گذشتہ تاریخ سے بالکل الگ سمجھتے ہیں۔ ہنوز وہ دیرپا اور عمیق قومی احساسات اور روایات موجود ہیں جو صدیوں قبل سے ان ممالک کی قومی زندگی میں موجود تھے اور ان کے فنا ہونے کا کوئی بھی امکان نہیں ہے۔ قوم کے سربرآوردہ افراد قدامت پسندی سے متنفر ہو کر اور مغربی تمدن سے مرعوب ہو کر اکثر کوشش کرتے ہیں کہ جدید اقتصادی و معاشرتی زندگی کے اصول قوم کے سامنے پیش کریں لیکن وہ اس قوم کے ان تاثرات کو مٹانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے جن کی شہادت اسکی تاریخ ہنوز دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تاثرات اس قسم کے تعلیمی نظام اور درسگاہوں میں خاص طور پر نمایاں ہوں گے۔ قوم کے ان افراد کو جو اس کے قدیم اصول تعلیم کو بدلنا چاہتے ہیں لازم ہے کہ جس طرح کا بھی نظام وہ مرتب کریں قوم کے پرانے تجربات، اصول کے

برخلاف نہ ہو۔ ورنہ انھیں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

قوم کی مذہبی اور روحانی ترجمانی بھی اس کی زندگی کا بہت اہم جز ہے اور اس کا تعلیمی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک قومی تہذیب کے بنیادی اصول کی ترجمانی نہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ الحاد اور مادیت پرستی کا دور ہے اور بقول اکبر؎

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا ✦ نہ کعبہ جا نہ مندر جا نہ گرجا

قوم کا وہ طبقہ جو اپنے کو متمدن اور مادی ترقی کا دلدادہ سمجھتا ہے، مذہب کے نام سے کوسوں دور بھاگنا چاہتا ہے اور زندگی کے ہر مسئلہ کو اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے گرچہ اس مسموم تخیل کا آغاز مغرب میں ہوا۔ لیکن مشرقی ممالک بھی اس سے بڑی حد تک متاثر ہو چکے ہیں اور یہ آگ بڑی سرعت کے ساتھ سارے جہان میں پھیل رہی ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت نہیں کہ آیا مذہب پرستی نے اقوام کو نقصان پہونچایا یا نہیں۔ مغربی مورخین میں ایسے افراد بھی ہیں۔ جن کے خیال میں کلیسا اور اس کی مذہبی درسگاہوں نے اپنی تنگ نظری اور برائیوں کے باوجود تمدن و تعلیم کی بڑی خدمت انجام دی اور اگرچہ رفارمیشن کے زعما نے اپنے خیال میں قدیم درس گاہوں کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس کا اعتراف کیا کہ اپنے محدود حلقہ میں اور اپنے اصول کے مطابق انھوں نے علم کو ترقی دی اور صرف انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ دورِ گذشتہ کی تمدنی میراث دورِ جدید کو مل سکی۔ بہرکیف مذہب کسی قوم کے لئے ضرر رساں ثابت ہو یا سودمند۔ لیکن وہ دنیا کی اور خاص کر مشرقی اقوام کی زندگی کا ایک بڑا طاقت ور عنصر ہے اور اس کو فنا کرنے کی کوشش سعیِ لاحاصل نہیں۔ بلکہ نہایت مہلک ثابت ہوگی۔ سر ارتھرے سو اپنی کتاب "ہندوستان کی تعلیم" میں ہندوستان کے جدید تعلیمی نظام کی خامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ہندوستان کی مذہبی غیر جانب دارانہ حکومت نے ملک کی تعلیمی درسگاہوں اور نصاب و طریقۂ تعلیم کو مذہبی جوش و سرگرمی اور اعتقادات سے جدا کر ڈالا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم ہندوستان کے باشندوں کے لئے جن کی زندگی کا راز شروع سے مذہب میں پنہاں ہے۔ محض لاحاصل، ادھوری اور ناقابلِ قبول ہو کر رہے گی۔ لارڈ میکالے اور لارڈ بنٹنک کو انیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس حقیقت کو محسوس کرنا چاہئے تھا کہ کسی قوم کی اخلاقی ترقی اس وقت تک ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب تک اس کے تمدنی اور روحانی روایاتِ عظیمہ کو اس کے پیشِ نظر نہ رکھیں اور اسکی ترجمانی نہ کریں۔ قوم کے فطری عادات و خصائل بھی اسکی تعلیم پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں مشرق و مغرب کی مختلف قومیں اپنے جداگانہ اصولِ زندگی پر قائم ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ

ان کا فلسفۂ تعلیم بھی اور ممالک کے تعلیمی اصول سے جداگانہ ہوگیا ہے۔ یورپین قوموں کے فطری خصائل نہ صرف مشرقی اقوام سے مختلف نظر آتے ہیں بلکہ امریکہ کے اقوام سے بھی جداگانہ ہیں اور پھر اگر صرف یورپ ہی کے چھوٹے سے برّاعظم پر نظر ڈالئے تو اگرچہ بہ ظاہر اپنے لباس اور وضع کے اعتبار سے یہاں کی سب قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں، لیکن ہر ایک کا فلسفۂ زندگی، طرزِ عمل، سیاسی افکار اقتصادی نظام، اور فلسفۂ تعلیم بالکل ہی نرالا ہے۔ مثلاً انگلستان کے باشندے آزادی کے غیرمعمولی طور پر دلدادہ ہیں۔ خود اپنی ملکی حکومت اور اس کے طرزِ عمل کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے فلسفۂ زندگی کے مطابق ہر ملک ہر فرد و بشر اور ہر جماعت کو پیدائشی حق حاصل ہے کہ جس عنوان سے چاہے زندگی بسر کرے۔ جس طرح کی ادبی اخلاقی اور روحانی و مذہبی تعلیم اپنے بچوں کو دے۔ ان امور میں حکومت کو دخل دینے کا کوئی بھی حق نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جب بھی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اس راہ میں سب سے پہلے ملک کے ممتاز افراد نے قدم بڑھایا اور اپنی ذاتی سعی و کاوش سے اس کو بڑی حد تک کامیاب بنایا اور حکومت نے ان امور میں صرف اس وقت دلچسپی لی جب ان افراد کی ذاتی کاوش ناکافی تصور کی جانے لگی۔ تعلیمی شعبہ میں بھی اسی حقیقت کا انکشاف ہر ہر قدم پر ہوتا ہے پہلی تعلیمی درسگاہیں انگلستان کے باشندوں نے محض رفاہ عام کے خیال سے قائم کیں اور ایک صدی کے بعد حکومت نے ان کی مالی امداد شروع کی۔ اختیاری ابتدائی تعلیم کی بنا پڑ لینے کے بعد جبریہ ابتدائی تعلیم کے قوانین بنائے گئے۔ درس گاہوں کی اختیاری دیکھ بھال کے بعد حکومت کی طرف سے مدارس کے سالانہ جبریہ ملاحظہ کا رواج ہوا۔ قبل اس کے کہ حکومت کی طرف سے ٹریننگ اسکول قائم ہوں مدرسوں نے اسکی ضرورت خود محسوس کی اور اپنی جد و جہد سے ایسے بیسوں اسکول کھول ڈالے جہاں پڑھانے والوں کی منظم طور پر درسی تربیت ہو سکے۔ اس کے برخلاف جرمنی کے باشندوں نے کچھ تو اپنے طبعی رجحان کی بنا پر اور کچھ ملک کے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے فلسفیوں کے اصول سے متاثر ہو کر اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں صرف حکومت ہی کو رہنمائی کرنے کا حق حاصل ہے۔ قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ حکومت اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد کے پیش نظر ایک ایسی تنظیمی زنجیر میں ہر فرد بشر کو جکڑ ڈالے کہ حکام کو اس کا موقع رہے کہ وہ جس طرح چاہیں قوم کو لے چلیں۔ اس بنیادی اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی درس گاہیں اور ملک کا پورا تعلیمی نظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جبریہ تعلیم کے قوانین، مدارس کا انعقاد

مدرسوں کا تقرر۔ نصاب تعلیم کا انتخاب، طریقۂ تعلیم۔ تعلیم کے اغراض و مقاصد۔ اسکول کا نظم سب کچھ سرکاری صیغۂ تعلیم کے تحت آگیا اور ہنوز ہے۔ اب امریکہ کی جمہوریت پسند قوم پر نظر ڈالئے تو وہ اپنے بعض فطری خصائل میں تو یوروپین اقوام سے ملتی جلتی ہے اور بعض میں بالکل جدا گانہ ہے۔ انگریز بڑی حد تک قدامت پسندی کے دلدادہ ہیں۔ وہ اپنی روایات دیرینہ کو، اپنے قدیم اصول زندگی، اپنی قدیم درسگاہوں، اپنے قدیم اصول تعلیم حتیٰ کہ اپنی قدیم عمارتوں کو بڑے ادب و احترام سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ راہ ترقی میں گامزن ہیں لیکن اس کی جدید ترقیوں کے ہر شعبہ میں قدامت پسندی کی بڑی گہری جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے برخلاف امریکہ کے افراد قدامت پسندی اور جمہوریت کو متضاد سمجھتے ہیں۔ ہر پرانی رسم، درس گاہ اور اصول کو راہ ترقی میں خلل انداز خیال کرتے ہیں اور شعبوں کے ساتھ تعلیمی شعبہ میں بھی ہر طرح کی جدّت کو نہ صرف جائز بلکہ نہایت ضروری تصور کرتے ہیں۔ یہ تمام نئے تجربات، نئے اصول، نئے طرز عمل۔ نئی تحقیقات، نیا طریقۂ تعلیم یہ سب امریکہ کی سرزمین میں سب سے پہلے ظہور میں آتے ہیں۔ اب اگر مشرق کی دنیا پر نظر ڈالئے۔ تو یہاں کے باشندوں کے اصول اور فلسفۂ زندگی چند ترقی پذیر اقوام کو مستثنیٰ کرکے امریکہ اور یورپ سے بالکل ہی الگ معلوم ہوں گے۔ قدامت پسندی، غیر اعتمادی اوہام پرستی، کاہلی، فرقہ پرستی، روحانی تصنع جس میں مادیت کا عنصر غالب ہے، اور جمہوریت کا فقدان ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آئے گا۔ ان کی تعلیمی درس گاہیں اور ان کے اصول تعلیم ان کے خصائل کی کماحقہٗ ترجمانی کر رہے ہیں۔ ان حقیقتوں پر نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجہ پر آنا پڑتا ہے کہ ہر قوم کے نظام تعلیم کا انعقاد یا اسکی اصلاح کرنے والوں کو قوم کی عادت و خصائل پر کافی غور و خوض کر لینا چاہیے

۔ نظام تعلیم کی کامیابی ملک کی جغرافیائی کیفیت پر بڑی حد تک منحصر ہے۔ شعبۂ تعلیم کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ اس امر کو بہ نظر غور دیکھیں کہ ملک کے سرزمین کی وسعت کیا ہے۔ اس کے باشندے زیادہ تر شہروں میں مقیم ہیں یا مضافات اور دیہاتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ملک کے کن حصّوں میں سڑکیں ہیں اور کن قطعات میں سفر دشوار گذار اور محال ہے۔ جدید سائنس کے مفید آلات مثلاً ریڈیو، ٹیلیفون ریلوے اور چھاپے خانے کن کن حصّوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور کون حصّے ان نعمتوں سے محروم ہیں انگلستان کی آبادی، ساڑھے چار کڑور سے زیادہ ہے۔ صرف لندن کے شہر میں پچاسی لاکھ نفوس بستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے مدارس زیادہ تر شہروں میں ہیں اور ہر درس گاہ میں مدرّسوں کی کافی تعداد ہے اور کتب خانہ و دیگر اسباب تعلیم پورے طور پر مہیّا ہیں اسکے برخلاف کناڈا، آسٹریلیا اور ہندوستان میں تقریباً ۸۵ فیصدی افراد دیہاتوں میں مقیم ہیں۔ جس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ ان

ممالک میں ابتدائی دیہات کی تعلیمی درسگاہیں ہیں ان میں صرف ایک ہی مدرس رہتا ہے۔

قوم کے معاشرتی اور اقتصادی اصول زندگی بھی اسکی تعلیمی نظام پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں، مدرسین اور ناظمان تعلیم کا فرض منصبی ہے کہ وہ بہ نظر غور دیکھیں کہ قوم کی اقتصادی بہبودگی کے کون کون ذرائع موجود ہیں۔ آیا اکثریت زمینداری اور کاشتکاری میں مشغول ہے یا صنعت وحرفت کی طرف مائل ہے۔ ملک کی سرزمین زرخیز ہے یا نہیں، وہاں کن اقسام کے صنعتی کارخانے کھولے جاسکتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سرمایہ داری کے دلدادہ ہیں یا اس کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ جب کبھی قوم کے افراد سرمایہ داری میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو ان کے حوصلے بلند ہونے لگتے ہیں وہ اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے بچّے ان مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل نہ کریں جو عوام الناس کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ وہ اپنے شہری تعصبات کی بناپر خواہاں ہوتے ہیں کہ چند ایسے مدارس کھولے جائیں جن کے خرچ کثیر کے بار کو کمزور اقتصادی جماعت کے لوگ برداشت نہ کرسکیں۔ جہاں ان کے بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے ان کی فراہم کردہ ثروت اور حاصل شدہ عزّت میں بہ عوض تنزلی کے ترقی ہو چونکہ حکومت نے عوام کی ابتدائی تعلیم کی ذمّہ داری اپنے اوپر لے لی ہے اس لئے اس تعلیم سے سرمایہ دار کی تشفی نہیں ہوسکتی۔ وہ یا تو اپنے شہری مدرسوں کے پورے وقت کو مول لے لیتے ہیں یا غیر حکومتی اسکول کھولتے ہیں۔ جن کے مدرسین۔ جن کا نصاب اور اصول تعلیم اور ادبی فضا اور اسکولوں سے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔

ان اسباب کے علاوہ قوم کی زندگی کا ایک اور اہم عنصر اس کے سیاسی عتقادات ہیں۔ دنیا میں اسوقت بھی مختلف قوموں کی سیاسی زندگی میں بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں جن کا تفصیلی بیان یہاں ناممکن ہے لیکن فروعی اختلافات کو قطع نظر کرتے ہوئے کم ازکم دو ایسے متضاد سیاسی اصول ہیں جن سے دنیا کی ہر قوم بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے۔ پہلے سیاسی تخیل کے مطابق قوم کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے افراد اپنی ذاتی آزادی کو خیرباد کہکر قومی حکومت کے فرماں بردار ہوجائیں اس نافذ شدہ احکام کا کماحقہٗ ادب واحترام کریں اور اس بات پر ایمان کامل رکھیں کہ حاکم وقت اور اس کے خاص مشیر ہی اپنے غیر معمولی دماغی اور سیاسی اوصاف کی بناپر قوم کو شاہ راہ ترقی پر لیجاسکتے ہیں۔ اس سیاسی نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے ممالک میں نظام تعلیم کی تشکیل اور اس کی اصلاح۔ فلسفۂ تعلیم، مدرسین کی تقرری اور طریقۂ تعلیم مکمل طور پر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ چونکہ مدرسین کی ٹریننگ ایک خاص

فلسفۂ تعلیم کے ماتحت ہوئی ہے۔ اس لئے وہ ابتدا ہی سے بچوں کو تعلیم دینے میں حکومت کے سیاسی اغراض و تاثرات نیز احساسات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ بچے صغر سنی ہی سے ان ہی تخیلات سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ انکا ذاتی ضمیر مفقود ہو جاتا ہے، انفرادی سعی اور روحانی آزادی باطل ہو جاتی ہے۔ وہ حکومت کی آواز کو صدائے حق سمجھتے ہیں اور تعلیم کے مختلف مدارج طے کرنے پر وہ ان آلات اور مشینوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو صنّاع اور مصور کی خارجی چالاکیوں کے ماتحت اپنا فرض تشفی بخش طور پر دے رہے ہیں۔ لیکن انسانی احساسات سے بالکل نا آشنا

اس سیاسی فلسفۂ زندگی کے برخلاف دوسرا گروہ ان اقوام کا ہے۔ جو انفرادی آزادی اور جمہوری نظام کی دلدادہ ہے اور جہاں حکومت کا ہر رکن آپ کو قوم کا نمایندہ اور خادم تصور کرتا ہے۔ جہاں اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے ذاتی دل و دماغ سے کام لے۔ ایسے ممالک میں والدین کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ مقامی کیفیت اور جماعتی جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو جس طرح تعلیم مناسب سمجھیں۔ دیں۔ حکومت صرف اس کی تشفی چاہتی کہ بچے جاہل نہ رکھے جائیں لیکن اصول تعلیم، طریقۂ تعلیم اور نصاب سے متعلق ہر طرح کی تفصیل خود قوم کے افراد کے اوپر چھوڑ دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو متضاد سیاسی نظریہ کا اثر قوم کی تعلیمی درس گاہوں پر بہت ہی گہرا ہوگا جو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مذکورۂ بالا حقیقتوں پر نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی کہ فلسفۂ تعلیم کا تعلق فلسفۂ زندگی سے ہے اور چونکہ اقوام کے فلسفۂ زندگی اور اصول و اغراض زندگی میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے نظام تعلیم کی شکل اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جب تک ان تمام خاص اسباب کو بہ نظر غور نہ دیکھیں جن پر قوم کی زندگی کا انحصار ہے۔

محمد سعید احمد

# قطب جنوبی

(مسلسل)

بیسویں صدی کی ابتدا میں پے در پے مہمیں شمال و جنوب کی طرف مختلف ممالک سے بھیجی جارہی تھیں۔ اسکاٹ اور شاکلٹن نے قطب کے بہت قریب پہونچکر یہہ ثابت کردیا تھا کہ ایک منظم مہم کے لئے قطب جنوبی تک پہونچ جانا اب کوئی بڑی دقت کی بات نہ تھی۔

کپتان روالڈ آمنڈسن ملک ناروے کا رہنے والا تھا وہ قطب شمالی تک پہنچنے کا خواہاں تھا۔ ۱۹۰۸ء میں آمنڈسن شمال کی طرف روانہ ہونے ہی کو تھا کہ کک اور پیری نے الگ الگ قطب شمالی تک پہونچ جانے کا دعوہ کیا۔ اب آمنڈسن کا اسطرف جانا بیکار تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ اچھا۔ اگر کک یا پیری قطب شمالی تک پہونچگئے تو جنوبی قطب تک تو ابھی کوئی نہیں پہونچا ہے۔ کیوں نہیں اس طرف رُخ کیا جائے۔

آمنڈسن کی اس مہم کی غرض صرف قطب جنوبی کی طرف جانا۔ وہاں تک جلد از جلد پہونچنا اور وہاں سے صحیح و سلامت واپس آجانا تھی۔ سائنس کے متعلق کسی نئی دریافت یا کسی خطہ کی پیمائش وغیرہ کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ آمنڈسن نے صرف اس مقصد کو سامنے رکھکر اپنے ساتھی چنے تھے اور سامان سفر مرتب کیا تھا سو اسکیمو کتے اچھے سے اچھے کتے ہنکانے والے رسّی پر چلنے کے ماہر۔ برف میں راہ کا پتا لگانے کے مشاق۔ ساتھ تھے۔ اور متعدد سلیج گاڑیاں برف پر سفر کرنے کے لئے رکھ لی گئی تھیں۔

یہ مہم اوسلو سے اگست ۱۹۱۰ء میں روانہ ہوئی۔ انہیں دنوں ایک بڑی مہم اسکاٹ کی ماتحتی میں پھر جنوب کی طرف جارہی تھی۔ اور اس کا کافی ڈھنڈھورا پیٹا جاچکا تھا کسی کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ قطب جنوبی کی تلاش میں مقابلہ کی ٹھہرگئی۔ اسکاٹ آمنڈسن کے ارادوں سے بے خبر اپنی مہم لے کر روانہ ہوچکا تھا کہ آسٹریلیا میں اسے اکتوبر کے مہینہ میں آمنڈسن کا تار ملا۔ ظاہر ہے کہ اس تار نے اسکاٹ کو کس قدر پریشان کیا ہوگا۔

بہرحال آمنڈسن بغیر کہیں اور رُکے ہوئے تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا ابتدائے جنوری ۱۹۱۱ء میں بحر منجمد تک پہونچ گیا۔ اور بحر روس سے گزر کر اس نے کنگ اڈورڈ لینڈ کے قریب ایک مقام پر ڈیرا ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اسے اس مقام پر خیمہ زن ہونے کی

ایک مجبوری بھی تھی۔ جزیرہ روس کی اسکاٹ کی مہم اپنی پرانی جائے قیام کے پاس اترنے والی تھی اور پورب کی طرف کنگ اڈورڈ لینڈ کے کنارے جاپان سے ایک آنیوالی مہم نے اترنے کا قصد ظاہر کیا تھا۔ اسکاٹ اس عرصہ میں جزیرہ روس پر اتر چکا تھا۔

آمنڈسن نے وقت برباد نہ کیا اور قطب کی راہ میں جگہ جگہ پر کھانے پینے کے سامان کا ذخیرہ اور ڈھیر لگانے کا نظم کیا۔ اب جاڑونکی رات آچکی تھی اُسے کاٹنے کا سامان کیا گیا۔ اور آئندہ موسم گرما میں خاص قطب کے طرف جانے کے لئے تیاریاں ہونے لگیں۔

جب آفتاب پھر نمودار ہوا تو ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو آمنڈسن اپنے چار ساتھیوں کو لے کر قطب کی طرف چلا۔ چار سلج پر سامان لدا ہوا تھا۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔ کیونکہ راہ میں کافی سامان جمع کر دیا گیا تھا۔ باون کتے سلج کھینچنے کے لئے چن لئے گئے تھے۔ فرام ہائیم سے قطب آٹھ سو میل دور تھا۔ امید تھی کہ تیرہ چودہ میل روزانہ چلنے پر بھی جو کھانے پینے کو تھا وہ اور راہ میں جو کھانے پینے کا سامان تھا اسکی مدد سے وہ سب بغیر کسی تکلیف کے قطب تک جاکر واپس چلے آسکیں گے۔

برف کی سطح ہموار تھی۔ کتے مزے میں دوڑتے چلے جارہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد پورب کی طرف پہاڑ نظر آنے لگے یہاں سے راہ میں دشواریاں پیدا ہونے لگیں۔ پہاڑ کے دامن اکثر بہت ڈھالواں تھے۔ اکثر سامنے راہ نہ ملتی تھی اور میلوں کا چکر کاٹ کر آگے بڑھنا ممکن ہوتا تھا۔ اکثر سلج کو اوپر چڑھانا اور کتوں کو آگے بڑھانا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا۔ کبھی تو اسکی نوبت آجاتی تھی کہ سب کتے مل کر صرف ایک سلج گھسیٹ کر اوپر چڑھا آتے تھے اور پھر واپس آکر دوسری لے جاتے تھے کٹی پھٹی برف کی سطح اور شگافوں اور ڈراروں پر سے گزرنے کے معنی پل صراط سے گزرنا ہوتا تھا ساتھ ساتھ پہاڑوں کی بلندی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر یہ جماعت جب سطح بحر سے دس ہزار میل بلندی تک چڑھ گئی تو اُسے سطح مرتفع کی حدیں دکھائی دینے لگیں۔ اسی سطح مرتفع کے بیچ میں قطب جنوبی واقع تھا۔ شاکلٹن کے سفر نے بتا دیا تھا کہ یہ زمین مسطح تھی اس لئے اب اسکی امید بندھی کہ اس پر سے گزرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

آمنڈسن نے اس مقام پر اپنے نصف کتوں کو مار ڈالا کیونکہ اب بقیہ سفر کے لئے ان کی ضرورت نہ تھی اور بہ ان سب کو کھلانے کے لئے کافی گوشت ساتھ تھا۔ اس کے بعد ہی برف باری شروع ہوگئی اور برف کے ٹکڑے اس تیزی اور زور سے گرنے لگے کہ اگر یہ جسم کے کسی کھلے ہوئے حصّہ سے چھو جاتے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں پر استرہ لگ گیا۔

آمنڈسن کے ساتھی کچھ دن اسکا انتظار کرتے رہے کہ طوفان کم ہو جائے۔ مگر جب یہہ نہ رکا تو وہ آگے بڑھے اور دس بارہ میل تک بڑھے چلے گئے گو سامنے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا مگر اس کے بعد انہوں نے حس کیا کہ وہ نشیب کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ رک کر غور جو کیا تو دیکھا کہ وہ دو پہاڑوں کے بیچ سے گزر رہے ہیں۔ سربفلک پہاڑ آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور ہر طرف سے برف کی چٹانوں کے ٹوٹ کر گرنے کی مہیب صدائیں دلوں کو ہلائے دیتی تھیں اور ہر ہر لمحہ اس کا یقین ہوتا تھا کہ کہیں گرتی ہوئی برف کے ڈھیر انہیں دفن نہ کر دیں۔

دسمبر کی ابتدا میں یہ جماعت سطح مرتفع کے اوپر پہونچ گئی۔ اور آٹھویں دسمبر کو انہوں نے ۸۸° ۱۶' عرض بلد پر پہونچ کر دم لیا۔ اور دوسرے دن اس عرض بلد سے بھی آگے بڑھ گئے جہاں تک شاکلٹن جا سکا تھا۔ یہاں انہوں نے ایک دن آرام کیا اور کچھ سامان چھوڑ کر پھر آگے بڑھے۔ اب مرتفع کی سطح بتدریج نیچی ہونے لگی تھی۔ ۱۱ دسمبر کو آلات نجوم اور رفتار کے حساب سے پتا چلا کہ وہ ۸۹° ۱۵' عرض بلد پر تھے۔ ۱۳ دسمبر کی دوپہر کو انہیں حساب لگا کر اور آلات نجوم کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہ ۸۹° ۳۷' عرض بلد تک پہونچ گئے تھے۔ گھڑی سے اپنی رفتار کا حساب کرتے ہوئے وہ اس دن ۸۹° ۴۵' عرض بلد پر جا کر خیمہ زن ہوئے۔ دوسرے دن یعنی ۱۴ دسمبر کو اسی حساب سے وہ دوپہر تک ۸۹° ۵۲' عرض بلد تک پہنچے آمنڈسن اور اس کے ساتھیوں کے دل اب تیزی سے دھڑکنے لگے۔ صرف چند قدم آگے منزل مقصود تھی۔ کسی اور کے آنے کے نقش قدم بھی نہ تھے۔ ساری مصیبتیں، اور تکلیفیں سوارت لگتی نظر آ رہی تھیں۔ اب چند ساعت کے بعد وہ تھے اور ناموری کا طرہ امتیاز ان کے سروں پر تھا۔ جس رفتار سے یہہ چلے جا رہے تھے اس سے یہہ حساب لگا کر جان لیا کہ تین بجے دن کو وہ ٹھیک قطب جنوبی پر پہونچ جائیں گے۔ اب وہ پھر چلے ہر شخص کی نظر گھڑی پر تھی۔ دل بلیوں اُچھل رہے تھے۔ سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ کھسکتی جا رہی تھی کہ ادھر وہ تین پر پہونچی اور یکایک ہر شخص نے بیک زبان پکارا۔ "رک جاؤ" سفر ختم ہو گیا اور یہہ مسافر منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ یہہ تھکے ماندے جانباز اسوقت کیا کیا سوچ رہے تھے اور ان کے تخیلات میں کیسا ہیجان تھا شاید کوئی ماہر علم النفس ہی بتا سکتا ہے۔ ہاں آمنڈسن نے اپنے دل کا حال لکھا ہے "میں نے یہہ نہیں محسوس کیا کہ جیسے میری زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہو۔ میں سچ کیوں نہ کہدوں۔ مجھے تو بچپن سے

قطب شمالی تک پہونچنے کی تمنا تھی۔ اور آج میں قطب جنوبی پر پہونچا ہوا تھا"۔ یہہ ممکن ہے کہ وہاں تک پہونچنے کے بعد ان کے دماغ کے سامنے سوال کا نشان چمک رہا۔ "؟ ؟ ؟ ؟"۔ کیوں بہادرو۔ آ تو گئے۔ مگر کس لئے ... کیوں۔ اور پھر پایا کیا ؟ ؟ ؟ ؟"

قطب پر پہونچ کر آمنڈسن نے بڑی عزمت اور احترام سے اپنے ملک کا علم نصب کیا۔ سبھوں نے برہنہ سر ہوکر اس کے سامنے سرنیاز جھکایا۔ اور پھر اسنے باواز بلند قطب جنوبی اور اس کے گرو کے حصہ پر اپنے بادشاہ ملک معظم شاہ ہاکن کی طرف سے قبضہ کرنے کا اعلان کیا۔ اور اس جگہ کا نام کنگ ہاکن لینڈ رکھا۔ تصویریں لیں۔ پھر اس کا مزید تیقن کرنے کے لئے کہ وہ سچ سچ قطب تک پہونچ گئے تھے امنڈسن کے تین ساتھی تین طرف شی پر چلتے ہوئے کئی میل دور جاکر ہو آئے۔ اس عرصہ میں آمنڈسن اور اس کے ایک ساتھی نے گھنٹہ گھنٹہ آفتاب کی افق سے بلندی اور اس کے محل وقوع کو آلات نجوم سے ناپ ناپ کر اس کا یقین کرلیا کہ وہ کہاں پر کھڑے تھے۔

یہہ جماعت اس جگہ تین چار دن تک آرام کرتی رہی۔ اب فرام ہائیم تک پہونچنے کی کوئی ایسی جلدی بھی نہ تھی۔ انکی صحت اچھی تھی۔ موسم اچھا تھا۔ کھانے پینے کو کافی ساتھ تھا۔ دل بڑھے ہوئے تھے۔ مگر اتنا دور آکر آمنڈسن نے سونچا کہ دل میں شک نہ رہ جائے کہ سچ مچ قطب تک پہونچے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے آلات نجوم میں کوئی نقص ہو اس لئے ایک دن وہ ساڑھے پانچ میل اور "دکھن" کے طرف چلا گیا اور وہاں پہونچ کر اس نے چوبیس گھنٹوں تک گھنٹہ گھنٹہ اپنی جائے قیام کی پیمائش کی۔ یہاں سے اس کے چار ساتھی۔ چار طرف اور آگے بڑھ گئے اور دور دور جاکر پلٹے کہ اب اس کا کسی طرح بھی دلوں میں شک نہ رہ جائے کہ وہ اصل قطب تک نہ پہونچے تھے۔

واپس ہوتے ہوئے آمنڈسن نے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا اور اس میں دو خطوط چھوڑے۔ ایک تو اسکاٹ کے نام تھا۔ جس میں وہاں تک اپنے پہونچنے کی اطلاع تھی اور درخواست کی تھی کہ دوسرا خط جو شاہ ہاکن کے نام تھا انتک پہونچا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ آمنڈسن اس کامیابی کے بعد بھی وطن نہ پہونچ سکے۔

اب آمنڈسن آہستہ آہستہ فرام ہائیم کے طرف پلٹا۔ راہ میں اسے پہاڑی سلسلہ دکھائی دیا جسے اس نے اپنے ملک کی ملکہ ہوڈ کے نام سے موسوم کیا

راہ میں وہ کل ڈھیر ملتے گئے جہاں وہ کھانے پینے کے ذخیرے چھوڑ گئے تھے۔
خوش و خرم یہہ پانچ کامیاب بہادر کھاتے پیتے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۲ء کو علی الصباح فرام ہایم پہونچ گئے۔ جہاز فرام انہیں وطن لے جانے کے لئے آکر منتظر کھڑا تھا۔ اب دیر کا ہے کی تھی۔ کیمپ اٹھا دیا گیا اور سب کے سب اس عظیم الشان کامیابی کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔

آمنڈسن کے قطب جنوبی تک پہونچنے کا تذکرہ کرنے کے بعد ممکن تھا کہ مضمون یہیں ختم کر دیا جاتا۔ مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ جن دنوں وہ قطب کی طرف جا رہا تھا انگلینڈ کے چند بہادر بھی اسی طرف لو لگائے چلے جا رہے تھے۔ اور مرتے دھنستے وہاں تک پہنچ گئے تھے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ آمنڈسن کامیاب وطن کو واپس آ گیا مگر یہہ بدنصیب مر کر ہمیشہ کے لئے وہیں رہ گئے۔ آئندہ نمبر میں انہیں کی داستان ہوگی۔

(باقی) علی اکبر کاظمی

# مطبوعاتِ جدیدہ

ایضاح سخن: مصنفۂ جناب تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی۔ صفحات ۴۰، تقطیع ۷ × ۵ انچ، قیمت دو روپے
شائع کردۂ ارکان مسلم ایسوسی ایشن پھلواری ضلع پٹنہ۔ جناب شوق سندیلوی کی یہہ جدت اور ستم ظریفی
ادب اُردو میں یادگار رہے گی کہ وہ بہ یک وقت ۲۴ شاعروں سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے اور
جب بہت سی اصلاحیں جمع ہوگئیں تو ۱۹۲۶ء میں انھیں کتابی صورت میں شائع کردیا۔ ایضاح سخن
میں شوق صاحب کی پہلی غزل اور اس کی اصلاحوں پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور خود جناب تمنّا نے بھی
اس کے ہر شعر پر اپنی جانب سے اصلاح دی ہے۔

ایضاح سخن میں پہلی اصلاح تو مصنّف اصلاح سخن کے نام پر ہے۔ اسے عبدالعلیٰ سے احمد علی بنا دیا
گیا ہے۔ احمد علی، شوق عبدالعلی، شوق کے استادوں میں تھے، اور انھیں صلاح دے چکے تھے کہ اپنا
تخلص بدل دو، زمانہ دیدہ استاد کی بات نہ ماننے کا نتیجہ یہہ ہوا کہ بہ یک گردشِ کلک پھلواروی عبدالعلی
کی برسوں کی کمائی احمد علی کی جھولی میں جا پہنچی۔

جناب تمنّا دوسرے شاعروں کی اصلاحوں پر انتقاد کے بعد اپنے خیال کے مطابق دو بہترین
اصلاح شدہ مصرع چن لیتے ہیں، پھر خود ان میں کچھ تغیر و تبدل فرماتے ہیں، ان مصرعوں سے جو شعر بنتا ہے
وہی شوق کے شعر کی بہترین اصلاحی صورت قرار پاتی ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کی اصلاح کے بعد
انہیں مزید تغیّر و تبدّل کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو اور اپنی اصلاح کے متعلق شاید ہی کوئی مقام ہو
جہاں یہہ یا اسی قبیل کے دوسرے جملے انھوں نے نہ لکھے ہوں: "شاید شوق صاحب کے اس شعر کی اس سے
بہتر اصلاح ممکن نہ ہو" "شاید" محض انکسار ہے، ورنہ اصلی مدعا "لاریب فیہ" ہے۔ اس پر بھی اُن کا دعویٰ ہے کہ
تنقید کا منشا یہہ ثابت کرنا نہیں کہ راقم الحروف ان سب سے زیادہ مہارت فن رکھتا ہے۔"

اس سے قطع نظر جس خوب صورتی کے ساتھ جناب تمنّا نے اصلاحوں پر تبصرہ فرمایا ہے، اُس کی داد
نہ دینا صریح ظلم ہے۔ لفظ لفظ سے ان کی سخن فہمی، نکتہ رسی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر اصلاح کے
حسن و قبح کو اس طرح کھول کر بیان کیا ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔
دوسرے شعر کے ضمن میں تعقید پر دلچسپ اور مفید بحث ہے، اس کے علاوہ بھی نحو و معانی و بیان کے
قیمتی نکتے اس کتاب میں ملتے ہیں۔ انداز تحریر ستھرا اور شگفتہ ہے جا بجا طنز کی چٹکیاں بھی مزہ
دے جاتی ہیں، صنعت ایہام و مراعات النظیر کو اچھی طرح برتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں عبارت میں اس کی

بہ دولت، آورد بھی پیدا ہوگیا ہے۔ الغرض، کتاب میں خوبیاں بہت ہیں اور خامیاں کم۔

میں امورِ ذیل کی طرف جناب تمنّا کی توجّہ منعطف کرانا چاہتا ہوں:

سب سے پہلے تو اُن کا نظریۂ "اصلاح" قابلِ غور ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "مَیں عموماً یہ اصول مدنظر رکھتا ہوں کہ کم سے کم محو و اثبات جائز رکھا جائے۔ مضمون بہ شرطے کہ پست یا مبتذل نہ ہو، اگر بہ ادنیٰ تغیر بلند ہوسکے تو فبہا ورنہ حتی الوسع علی حالہ رہے" یعنی شعر کا مضمون پست ہو تو زیادہ سے زیادہ تغیّر بھی جائز ہے۔ یہ وہی اصول ہے جو عام طور پر غزل گو شاعروں میں مقبول ہے۔ مضمون کی واقعیت سے نہ استاد کو بحث ہوتی ہے نہ شاگرد کو فرضی خیالات میں اگر تغیّر بھی ہوگیا تو کیا مضائقہ! لیکن، کیا ضروری ہے کہ اس رسمِ کہن کی تقلید کی جائے؟ شعر کی بنیاد اگر شاعر کے ذاتی تجربے پر ہو، اور ہونی چاہیے تو اس کی جناب تمنّا کے اصول کے مطابق اصلاح شاعری کی جان پر بہت بڑا ظلم ہے۔ مثال کے لیے میں شوق صاحب کا پہلا شعر لیتا ہوں، اس کی اصلاح کو دیکھنے سے اندازہ ہوجائے گا کہ مضمون میں تغیّر و تبدل کا یہ طریقہ کس درجہ لغو اور مہمل ہے:

شوق: خواب میں اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا — دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

پہلے مصرع کی اصلاحوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب تمنّا فرماتے ہیں: "خواب میں کا لفظ... اکثر مصلحین کو کھٹکا ہے....

اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا اور دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا ان دونوں علّت و معلول میں سے کوئی بھی ایسی بات نہیں جس کا خواب سے کوئی تعلق خاص ہو۔ جو بات عالمِ واقعات میں بہ خوبی ہوسکتی ہے اور ہوا کرتی ہے... خواہ مخواہ اس کو عالمِ خواب سے متعلق کر دینا بغیر کسی سبب کے، ترجیح بلا مرجح نہیں تو اور کیا ہے؟"

جناب تمنّا نے جناب وحشت کے ایک قول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ضروری تغیّر کے بعد خود جناب تمنّا پر صادق آتا ہے: "مولانا وحشت اگرچہ بہت بڑے شاعر اور نہایت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ہیں، مگر پھر بھی مولانا ہیں معشوقانِ سنگ دل کی بے رحمیوں سے غالباً وہ پوری طرح واقف نہیں" جناب تمنّا بھی آخر علّامہ ہیں دنیائے محبت کی مجبوریوں سے وہ اچھی طرح واقف ہوتے تو یہ کبھی نہ کہتے: "جو بات (یعنی محبوب سے گلے ملنا) عالمِ واقعات میں بہ خوبی ہوسکتی ہے الخ" انھوں نے ہماری موجودہ سوسائٹی کے رسم و رواج کو یک سر نظر انداز کر دیا ہے، کیا ہمارا ضابطۂ اخلاق (خواہ وہ کتنا ہی مصنوعی اور جابرانہ کیوں نہ ہو) اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے محبوب سے بے روک ٹوک ملے؟ گلے ملنا درکنار، فقط ملنا بھی بھاری جرم ہے۔ غالب گمان تو یہی ہے کہ عالمِ واقعات میں شاعر کو اپنے محبوب سے گلے ملنا کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اگر عالمِ واقعات میں اس کا امکان بھی تھا تو اُس نے خواب میں

دیکھا کہ محبوب نے اسے گلے سے لگا لیا، اب اگر اُس نے اسی واقعے کو نظم کر دیا تو کیا گناہ کیا؟ اور خواب کا ذکر کیے بغیر اس واقعے کا بیان کرنا کیوں کر ممکن تھا؟ "خواب میں" کا ٹکڑا اسی وقت غیر ضروری ٹھہر سکتا ہے جب ہم یہ فرض کر لیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا صریح جھوٹ ہے، مگر ایسا فرض کر لینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ جناب تمنّا کو تمام اصلاحوں میں سے یہ اصلاح پسند ہے:

ہائے وہ اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا ۔۔۔ دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

اس سے واقعے کی نوعیت بالکل بدل گئی، شعر ایک ذاتی تجربے کا بیان ہونے کی جگہ ایک مصنوعی حکایت بن کر رہ گیا۔

خود جناب تمنّا نے اس شعر پر جو اصلاح دی ہے اور اس کی جو توجیہہ کی ہے، وہ یہ ہے: "خواب کا پہلو ذرا دب رہا ہے اور بس۔ اگر ایک 'بھی' کا اضافہ کسی طرح 'خواب میں' کے بعد ہو جائے، تو یہ کمزوری بالکل رفع ہو جائے" انھوں نے دوسرے مصرع کو علیٰ حالہ رہنے دیا ہے اور پہلے مصرع کی جگہ تین مصرع تجویز کیے ہیں جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے: "ان کا وہ خواب میں بھی مل کے جدا ہو جانا" اس کا مطلب وہ یوں بیان کرتے ہیں: "اب مضمون یوں ہو گیا کہ بیداری تو بیداری خواب میں بھی تو گلے مل کے جدا ہو جاتا ہے تو دل کے ارمانوں میں حشر سا بپا ہو جاتا ہے۔ جب خواب کا یہ عالم ہے تو عالم بیداری میں اگر ایسا ہو تو خدا جانے کیا ہو" بہ ظاہر جناب تمنّا کے نزدیک خواب دیکھتے وقت انسان یہ بھی جان لیتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، اگر ایسا نہیں تو پھر عالم خواب اور عالم بیداری کا تقابل کیا معنی؟ اگر وقتی تاثر کے لحاظ سے عالم خواب اور عالم بیداری میں کوئی فرق نہیں تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ "جب خواب کا یہ عالم ہے تو عالم بیداری میں اگر ایسا واقعہ ہو تو خدا جانے کیا ہو" درحقیقت خواب کے عالم میں انسان یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں عالم بیداری میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ شاعر کے دل میں حشر برپا ہو گیا، کیوں کہ اُس کے نزدیک ملاقات اور جدائی عالم واقعات میں تھی، اگر خواب ہی میں اُسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں محض خواب ہے، تو محبوب کی جدائی سے اس کا دل ہرگز اس درجہ متاثر نہ ہوتا۔ یہ اصلاح جس میں 'بھی' کی مدد سے عالم خواب اور عالم بیداری کے مراتب کا مقابلہ کیا ہے، من چہ می سرایم و تنبورہ من چہ می سراید کی مصداق ہے۔ دراصل جو اصلاح شعر کے بنیادی خیال کو بدل دے وہ اصلاح نہیں، دخل در معقولات ہے۔

جناب تمنّا کے نزدیک "دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا" صحیح ہے، لیکن مجھے اس کے معنی کا تعین دشوار نظر آتا ہے، ارمانوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس صورت میں عالم خواب اور عالم بیداری کے مراتب کا مقابلہ جو جناب تمنّا کے اصلاحی شعر میں ہے بالکل بے معنی

جناب تمنّا کی نکتہ سنجی مسلم، مگر بہ مقتضائے بشریت کہیں کہیں اشعار کا مطلب سمجھنے میں اُن سے غلطی بھی ہوگئی ہے۔ اور شعر کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر جو انتقاد کیا جائے گا ظاہر ہے کہ وہ کیا ہوگا:

شوق: آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے — روٹھنا اُن کا ادھر دم کا خفا ہو جانا

صلاح احسن: آخری وقت بھی چھوڑا نہ گیا پاس وفا — ان کا رکنا کہ مرے دم کا خفا ہو جانا

اصلاح پر جناب تمنّا یہ تبصرہ فرماتے ہیں: "ادھر وہ رُکے ادھر میرا دم خفا ہو گیا" اس میں وفاداری کی کون سی نمائش ہوئی؟ دوسرے، ان کا رکنا کس چیز سے رکنا؟ یہ بھی ایک معمّا ہے۔ کیا وہ جا رہے تھے مگر رک گئے، اس وجہ سے عاشق کا دم خفا ہو گیا؟ اگر ایسا ہے تو یہ عاشق کی سخت بے وفائی ہے"

حیرت ہے کہ جناب تمنّا کو یہ علم نہیں کہ 'رکنا'، خفا ہونا، ناراض ہونا، کشیدہ ہونا، ملاقات ترک کرنا کے معنی میں بھی آتا ہے:

معروف: اول تو میں رکتا نہیں اور جب رکوں ہیں — منہ کھولو خزانوں کے تو تو بھی نہ کھلوں ہیں

حسن: رُکے جو کوئی اُس سے رک جائیے — جھکے جو کوئی اس سے جھک جائیے

شعر کا مطلب صاف ہے۔ وہ مجھ سے خفا ہوئے تو میرا دم بھی خفا ہو گیا، یعنی میں نے جان دے دی۔ وفاداری کی نمائش اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی کہ محبوب جب خفا ہو گیا تو عاشق نے زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ "دم خفا ہونا" سے مرگ مراد لینا خود جناب تمنّا کے نزدیک روا ہے۔

شوق: خوب رد یوں سے کہیں کر کے محبت اے شوق — نہ خدا کے لیے محصورِ بلا ہو جانا

صلاح آرزو: پھیر قسمت کا ہے اُس زلف کی الفت اے شوق — ..................

جناب آرزو نے زلف کی محبت کو قسمت کے پھیر سے تشبیہ دی ہے، جس طرح قسمت کے چکّر میں پھنس کر کوئی نکل نہیں سکتا، اُسی طرح زلف کی الفت میں پھنس کر رہائی ناممکن ہے۔ جناب تمنّا اس کا مطلب غلط سمجھ کر یہ اعتراض کرتے ہیں: "جب قسمت کا پھیر ہے تو پھر کوئی اختیاری چیز تو رہی نہیں، پھر اس سے بچنے کے لیے ترہیب کیسی؟"

شوق: آج اُن کی نگہہ ناز کا وہ اٹھ کے ادھر — دردمنداں محبّت کی دوا ہو جانا

اصلاح جگر: دیکھنا! اپنے مریضوں کا مسیحا بن کر — دردمنداں محبت کی دوا ہو جانا

جناب تمنّا نے اصلاح شدہ شعر کے تین معنی بیان کیے ہیں (۱) معشوق سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا دیکھنا! تمہارے مریض مسیحا بن کر دردمنداں محبت کی دوا بن گئے (۲) معشوق جو اپنے مریضوں کو مسیحا بن کر دیکھ رہا ہے اس کا یہ دیکھنا درحقیقت دردمنداں محبت کی دوا ہو جانا ہے (۳) پہلے مصرع میں 'کا' کی جگہ 'کو' پڑھا جائے اور 'دیکھنا' اور 'ہو جانا' یہ دونوں صیغے امر مانے جائیں، جس کا مخاطب معشوق ہو

تو یہ ایک معقول شعر ہو سکتا ہے" یہ تیسرا مطلب جناب جگر کے مفہوم سے بہت قریب ہے لیکن 'کا' کو 'کو' سے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ 'دیکھنا' مخاطب کو متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ 'ہو جانا' صیغہ امر ہے۔

اصلاح احسن: ہائے ان کی نگہہ ناز! کہ اُٹھ اُٹھ کے اِدھر　　درد مندان محبت کی دوا ہو جانا

اس پر جناب تمنّا کا تبصرہ یہ ہے: "ایک درد مند تو ہے نہیں کہ ایک 'اُٹھ' کافی ہو جائے ... شعرا عموماً حسینوں کی آنکھ کو بیمار باندھتے آئے ہیں۔ دوسرے حسین بہت نازک ہوا کرتے ہیں ... نگہہ ناز کو بار بار اٹھتے دیکھا تو ... یہ زحمت کشی ان سے (جناب احسن سے) دیکھی نہ گئی اور دفعتاً چیخ اٹھے کہ ہائے ان کی نگہہ ناز! اب ایسے دن آ گئے کہ اس نزاکت پر اس کو درد مندان محبت کی اُٹھ اٹھ کر دوا ہو جانا پڑتا ہے" اٹھ کی تکرار پر اعتراض ہے۔ ایک بار پھر کہنا پڑتا ہے کہ جناب تمنّا فقط علامہ ہیں عاشق نہیں۔ ذرا اس صحبت کا تصور کیجیے جس میں طالب و مطلوب یک جا ہیں، نگاہ ناز اٹھتی ہے اور جھک جاتی ہے، پھر اُٹھتی ہے اور پھر جھک جاتی ہے۔ نگاہِ ناز کے اس بار بار اٹھنے میں جو لذّت لطف اور کیف ہے وہ صرف ایک بار کے اٹھنے میں کہاں! اس کیفیت کے اظہار کے لیے 'اٹھ اٹھ کے' سے بہتر کوئی دوسرا کلمہ نہیں ہو سکتا۔ جناب تمنّا کا اعتراض 'ہائے' پر بھی ہے خواب کے نزدیک اظہار تاسف کے لیے استعمال ہوا ہے، لیکن یہ تعریف کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے، ایسی تعریف جس میں قائل کی فریفتگی بھی شامل ہو۔ مجروح کا شعر ہے:

پہنچتے کب ہیں مانے اس ادا کے　　وہ چلنا ہائے دامن کو اٹھا کے

جناب احسن نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

خود جناب شوق کے پہلے مصرع میں جناب تمنّا کو لفظ 'ادھر' پر اعتراض ہے: "اگر درمندان محبت بہ صیغۂ جمع نہ ہوتا، بہ صیغہ واحد ہوتا تو سمجھا جاتا کہ شاعر اپنے آپ کو درمندانِ محبت کہہ رہا ہے۔ اس لیے وہ 'ادھر' کا اشارہ بھی اپنی ہی طرف ہے۔ مگر درد مندان محبت تو خدا جانے کتنے ہیں، اور کس کس طرف کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی ایک طرف مجتمع بھی ہوں تو اس سمت کی طرف اشارہ قریب ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں" جناب تمنّا ان اشعار پر غور فرمائیں:

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے　　تیری محفل میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

کلیجا منہ کو آتا ہے کوئی ذکر اور ہی چھیڑو　　پتا خانہ بہ دوشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا

'درد مندوں' اور 'خانہ بہ دوشوں' سے صرف قائل کی ذات مراد ہے۔ شوق صاحب نے 'درد مندان محبت' سے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے۔ لفظ ادھر اور بھی اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے، حشو نہیں جیسا کہ جناب تمنّا کا خیال ہے۔

شوق: دل بیمار! یہ ہیں دشمن صحت آثار — اک خیال آتے ہی پھر وروسوا ہو جانا

اصلاح مومن: دل بیمار یہ صحت کے ہیں کم بخت آثار — اک خیال آتے ہی بس درد سوا ہو جانا

جناب تمنّا اصلاحی شعر کا مطلب بالکل نہیں سمجھے، پہلے مصرع کو بہ طریق استفہام پڑھنا چاہئے، مطلب یہ کہ یہ آثار صحت کے نہیں اس لیے صفت کم بخت لائے ۔ کم بخت پر اعتراض صحیح نہیں ۔ جناب تمنّا لفظ 'بس' پر بھی معترض ہیں ۔ 'بس' کے محل وقوع نے انھیں کو الجھن میں ڈالا ہے اسے مصرع کے شروع میں رکھ کر پڑھنا چاہیے ، اس صورت میں 'بس' کے معنی صرف یا فقط ہوں گے :

امیر: کیا کروں وصفِ بتانِ خدا پسند — ان سے بڑھ کر بس خدا کی ذات پر

اصلاح احسن: دل بیمار یہ آثار تو صحت کے نہیں — اک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا

اصلاح عزیز: دل بیمار یہ آثار تو جینے کے نہیں — اک خیال آتے ہی بس درد سوا ہو جانا

تبصرۂ جناب تمنّا: "جناب عزیز نے شاید 'صحت' میں کوئی سقم محسوس کیا ، اس لئے اس کی جگہ 'جینے' کو پسند فرمایا ، یا جینے میں کچھ زیادہ لطف نظر آیا ، کیوں کہ مقصود اصلی جینا ہے نہ کہ صحت اور جب جینے ہی کے آثار نہیں رہے تو صحت کے آثار رہے بھی تو کیا ؟" یہ امر قطعاً محال ہے کہ جینے کے آثار تو معدوم ہو جائیں اور صحت کے آثار باقی رہیں ۔ جناب عزیز نے ہرگز صحت میں کوئی سقم محسوس نہیں کیا ، بلکہ صحت کی جگہ جینے کو اس لئے پسند فرمایا کہ صحت تو جینے کے ضمن میں آ ہی گئی ۔ مریض بچ گیا ، تو صحت کی بھی اُمید ہے ۔

شوق: ساتھ پروانوں کے جل جل کے دل شمع نصیب + داخل مارت ارباب وفا ہو جانا

جناب تمنّا فرماتے ہیں : "پروانے ایک بار جل بجھتے ہیں نہ کہ رفتہ رفتہ ۔ دل بھی جب پروانوں کے ساتھ جلے گا تو ایک بار جل جائے گا ' اس لیے ... فعل کا مکرر لانا رکاکت سے خالی نہیں" یہ دعویٰ کہ ایک بار جل بجھتے ہیں مشاہدے کے خلاف ہے ۔ بہت سے پروانوں کا تو ذکر کیا ' جو شام سے صبح تک جلتے رہتے ہیں صرف ایک پروانہ بھی بسا اوقات ایک دفعہ میں جل کر ختم نہیں ہو جاتا اتفاقاً اس کے خلاف بھی ہوتا ہے لیکن عموماً یہی کہ رفتہ رفتہ جلتا ہے ۔ اس سے فعل کا مکرر آنا اظہار واقعہ کے لیے بہترین انداز بیان ہے ۔

ایضاحِ سخن میں زبان کی بھی غلطیاں نظر آتی ہیں : (۱) "ڈیڑھ اصلاحیں" صفت عددی اگر دو سے کم ہو تو اسم معدود واحد لانا چاہیے ۔ ڈیڑھ کو "پونے دو" پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا ' وہاں "دو" موجود ہے ؛

میر: "اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد — میر ویرانے میں بنائیے گا"

(۲) 'بادی النّظر میں' کی جگہ صرف 'بادی النّظر' لکھا ہے صـ۲ـ و صـ۱۲۴ـ (۳) "کچھ تو شادی مرگ کی طرف اشارہ کیے ہوتے" صـ۵۵ـ فاعل آپ محذوف ہے۔ 'اشارہ کرنا' مصدر متعدی ہے اس لیے 'نے' کا لانا ضروری ہے۔ "آپ نے اشارہ کیا ہوتا" صحیح ہے۔ "لانا" اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے (۴) "اگر دیکھا انجام" کی جگہ "ثمرہ پایا" لکھے ہوتے صـ۱۳۶ـ اس جملے میں بھی "آپنے لکھا ہوتا" چاہیے (۵) "جان کے بوجھ کے" صـ۱۲۱ـ یا "جان بوجھ کے"؟ (۶) نہیں خیال فرمایا صـ۱۹ـ نہیں ثابت ہوتا صـ۲۵ـ نہیں تصوّر فرمایا صـ۳۴ـ افعال مرکبہ میں حرف نفی فعل کے شروع میں نہیں ہونا چاہیے۔
(۷) مصرع سے مدغم صـ۸۷ـ یا مصرع میں مدغم؟ (۸) "بے محاورہ" صـ۱۲۵ـ یا خلاف محاورہ؟ (۹) "دو وجہ" صـ۹۱ـ یا دو وجہیں؟ (۱۰) "چھٹاں شعر" صـ۹۶ـ یا چھٹا شعر؟ (۱۱) کئی جگہ "ترجیح دی" کے بدلے "ترجیح دیا" لکھا ہے (۱۲) "ایک کو دوسرے پر بڑھا یا جائے" مقدمہ 'پر' کی جگہ سے ہونا چاہیے۔
(۱۳) صفت لگا کر اور بھی زوردار تر کر دیا صـ۱۴۲ـ صفت کے تین درجے ہیں مطلق، تفضیلی اور عالی۔ تفضیلی کو تفضیل بعض، اور 'عالی' کو تفضیل کل بھی کہتے ہیں۔ فارسی میں صفت تفضیلی کی علامت 'تر' ہے اور صفتِ عالی کی علامت "ترین"۔ اُردو میں صفت تفضیلی اور صفت عالی کے درجوں کو مختلف الفاظ کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً زوردار صفت مطلق زیادہ زوردار صفت تفضیلی اور بھی زیادہ زوردار صفت عالی۔ لہٰذا اور بھی زوردار تر نہ فارسی ہوئی نہ اردو، یا تو زوردار ترین کہنا چاہیے تھا" یا اور بھی زیادہ زوردار۔
(۱۴) "نہایت معیوب ترین تعقید ہے" صـ۱۰۱ـ یا تو "معیوب ترین" کہنا چاہیے تھا یا نہایت معیوب" زیادہ سے زیادہ نہایت ہی معیوب کہہ سکتے تھے (۱۵) جس کو ورد صـ۱۱۶ـ یا جس کے ورد؟

ان چند فروگذاشتوں کے باوجود جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ایضاح سخن ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ اصلاح شعر کے موضوع پر اردو میں اور بھی کئی کتابیں موجود ہیں، لیکن، ایضاح سخن میں جس طرح دادِ تحقیق دی گئی ہے اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ جناب تمنّا کی یہ سعی بلا شبہہ مشکور ہے اور راقم الحروف اس کامیاب تصنیف پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

عندلیب شادانی

گئی واں سے دائی پری کے حضور　　پلنگ پر تھی بے تاب وہ رشکِ حور

ملا پیٹ کو اُس کے دی مشتری　　بحال اس دوا سے ہوئی وہ پری

کمر اس کی باندھی اٹھایا اُسے　　لگا گاؤ تکیہ بٹھایا اُسے

حریرہ پیا شوربا بھی پیا　　تناول طلا تاب پانی کیا

دکھایا پسر اس پری زاد کو　　ہوا چین اُس رشکِ شمشاد کو

وہاں آیا سلطاں خوشی سے شتاب　　نظر آیا اُس شہہ کو وہ آفتاب

لگایا گلے سے جو وہ نورِ عین　　ہوا نور دیدے کو اور دل کو چین

دیا دایہ کو وہ پسر ایک بار　　کیے خوان زر کے پسر پر نثار

منجم بھی حاضر ہوا شہہ کے پاس　　پکارا خوشی سے وہ اختر شناس

مبارک قدم یہہ بھی مولود ہے　　یہ فرزند محمود و مسعود ہے

ذو الاقبال یہہ رشکِ شمشاد ہے　　سلیماں حشم یہہ پری زاد ہے

یہ نور البصر بھی جواں بخت ہے　　یہ گیرندۂ افسر و تخت ہے

مطیع اس کے ہوئیں گے جن و بشر　　پرستاں میں جا کر کرے گا گذر

بنی جاں کے شاہوں سے لے گا خراج　　یہ ہوگا وہاں مالکِ تخت و تاج

مسخر کرے گا یہ سب کوہ قاف　　کرے گا زمیں کو تظلم سے صاف

کرے گا یہہ آباد سب دشت و کوہ　　رکھو نام اس کا سلیماں شکوہ

ہوا شاد سلطاں یہ سن کر خبر　　دیا اس منجم کو پھر مال و زر

منجم نکل گھر سے در پر گیا　　وہیں آسماں پر اُجالا ہوا　　ورق ۷۱

ستارہ سحر کا ہوا آشکار　　ہوئی صبح صادق وہیں نور بار

چٹکنے لگے صبح گلشن کے گل　　محل تیسرے سے اٹھا شور و غل

گیا واں شتابی شہہ بے نظیر　　نظر آئی بے تاب روشن ضمیر

اٹھا درد اُس رشکِ شمشاد کو　　ہوئی بے کلی اس پری زاد کو

گئی دوڑی دائی جنائی شتاب　　ہوئی حاصل اُس کو کمائی شتاب

لگا ہاتھ اپنے ہلایا اسے　　کئی پل میں بیٹا جنایا اسے

تولد ہوا اس پری سے پسر
ہوا روشن اس ماہ سے اس کا گھر

فلک پر ہویدا ہوا آفتاب
زمیں پر بھی پیدا ہوا آفتاب

دو خورشید اُس وقت آئے نظر
فروزاں ہوا دونوں سے بام و در

یہ خورشید پردے میں مستور تھا
عیاں اس سے لیکن نیا نور تھا

اگر آفتاب فلک دور سے
مقابل ہو اُس نور مستور سے

تجلّی سے اُس کی ہو جل کر کباب
زمیں پر گرے آسماں سے شتاب

کیا روشن اُس نور نے شہ کا گھر
فروزاں ہوا شاہ کا بام و در

نظر آیا دائی کو وہ پاک ذات
کٹی اور بھری مشک سے دیکھی ناف

دیا غسل اُس کو پہنایا لباس
گئی دایہ لے اس کو بیگم کے پاس

لیا اُس نے فرزند چھاتی لگا
پلایا اُسے دودھ دائی بلا

دو دائی گئی جس طرف تھی پری
زچہ کا ملا پیٹ دی مشتری

کمر باندھی اُس کی بٹھایا اٹھا
پری نے پیا مرغ کا شوربا

طلا تاب پانی کیا نوش جاں
پسر دیکھ اپنا ہوئی شادماں

یہ سن کر خبر آیا سلطاں وہاں
فروزاں نظر آیا اس کو مکاں

پڑا دیکھ گہوارے میں آفتاب
تصدق ہوا اس کے جا کر شتاب

کیے طفل پر لعل و گوہر نثار
دیا دونوں دائی کو زر بے شمار

ہوئیں دونوں دائی طربناک شاد
ثنا خواں ہوئیں شہ کی حد سے زیاد

ہوا حاضر اس دم ستارہ شناس
کہا بیٹھ کر اس نے سلطاں کے پاس

کہ یہ طفل ان دونوں اطفال سے
بہت خوب ہے حق کے افضال سے

یہ صورت میں سیرت میں ہے بے مثال
یہ ہے مہر رخسار یوسف جمال

بزرگی میں اور قدر میں ہے بڑا
کہ اس مہ کا گردوں پہ سایہ پڑا

یہ ہے شاہ آفاق انجم سپاہ
یہ ہے ثانیِ جم فلک بارگاہ

یہ بہرام صولت ہے کیواں شکوہ
یہ ہے ماہ طلعت سلیماں شکوہ

سعادت میں بہتر ہے برجیس سے
فضیلت میں بہتر ہے ادریس سے

ورق ۴۲

یہ پہنچے گا عالی مقامات کو
کرے گا یہ برہم طلسمات کو

بڑی اس کی شوکت بڑی اس کی شان
یہ عالم میں ہوئے گا صاحب قران

تم اس طفل کا اے شہ دیں پناہ
رکھو نام جمشید زریں کلاہ

وو سلطاں ہوا خرّم اس بات سے
کیا شاد اس کو عنایات سے

دعا گو ثنا خواں منجم ہوا
تونگر ہو وہ اپنے گھر کو گیا

مچی تینوں گھر میں عجب دھوم دھام
ہوا کسبیوں کا وہاں ازدحام

بھرے کسبیوں سے وے تینوں محل
کہ وے موسیقی میں تھیں سب بے مثل

مچا ہر زچہ خانے میں راگ و رنگ
پکھاوج بجی اور قانون و چنگ

بجے دائرے اور بین اور رباب
ہوئی نغمہ پرداز ہر ماہتاب

ترانے سنائے سدا رنگ کے
بدھاوے بھی گائے سدا رنگ کے

شہانے کی تانیں اٹھائیں نئی
سہانی ادائیں دکھائیں نئی

کیا رقص آغاز انداز سے
تھرکنے لگیں غمزہ و ناز سے

سماں ناچ کا بندھ گیا جا بجا
کرشمے کیے اور ناز و ادا

ہر اک مہ کی منزل میں شادی مچی
ہر اک مہر کے در پہ نوبت بجی

اٹھا ہر طرف سے ٹکوروں کا شور
مچایا وہاں غل نفیری نے زور

سہانی بجیں اور شہنائیاں
گئی چرخ پر کرنا کی فغاں

شکم سیر کھاتے تھے پیر و جواں
مہیا تھی دنیا کی نعمت وہاں

شب و روز واں ہر محل میں تھی دھوم
ادا سب ہوئے واں چھٹی کی رسوم

شب و روز گانا بجانا تھا واں
نئی تان لے کر رجھانا تھا واں

سب اسباب عشرت کا موجود تھا
ہر اک شخص خرّم تھا خوشنود تھا

رہا راگ اور ناچ چالیس دن
رہی سب کی خاطر وہاں مطمئن

نہ تھا ایک کے دل میں غم کا نشاں
طرب ناک تھے گھر میں خرد و کلاں

چہل تھی نئی گھر میں ہر صبح و شام
خوشی سے ہوا ان کا چلّہ تمام

## داستان در بیان حسن چلّہ آن سرو پری زاد غیرت شمشاد و عیش و عشرت کردن شاہ زادہ سرو آزاد و تمام شدن این قصۂ عیش بنیاد

شتابی سے لے ساقی بزم جم
کر اس بزم کو رشک باغ ارم

کر اس بزم کو تو جواہر نگار
کہ آئی ہے گلشن میں فصل بہار

سیہ مست سوسن ہے گلزار میں
وہ چھپتی ہے انگور کی دار میں

مے حسن سے گل بھی مغرور ہے
گلستاں میں نرگس بھی مخمور ہے

چمن میں گل و لالہ گل پوش ہے
ہر اک غنچہ گلشن میں مے نوش ہے

ورق ۴۳

کر اس بزم شادی کو آراستہ
نئی زیب و زینت سے پیراستہ

قرابے کا منہ کھول دے تو شتاب
تو گردش میں لا ساغر آفتاب

مہ نو کی کشتی میں بھر دے شراب
کہ ہر دم زمانے کو ہے انقلاب

پلا مجھ کو اے ساقی رشک حور
مے ناب سے بھر کے جام بلور

کہ میں مست ہو ساقی مہرباں
کروں بزم چلّہ کا تجھ سے بیاں

لگا ابٹنا تن میں مل کر عبیر
نہا دھو کے بیٹھی وہ بدر منیر

اور اس گل نے پہنا زری کا لباس
کہ جس میں سے آتی تھی پھولوں کی باس

اور الماس کا پہنا زیور تمام
لگا خوشنما وے جواہر تمام

وہ چوٹی گوندھی بوریا باف کی
وہ پٹی جما گوند سے صاف کی

وہ موباف بھی بادلے سے بنا
نیا پیچ اس ناگنی کو دیا

لبوں پر مسی کی دکھائی بہار
کیا داغ دل لالے نے آشکار

بھرے مانگ میں گوہر شاہوار
کیا اس نے سولہ سوا اپنا سنگار

نکل آئی چلّے سے وہ بے نظیر
ہوئی مسند آرا وہ بدر منیر

نہا دھو کے لڑکے نے پہنا لباس
لے آئے اسے اس کی مادر کے پاس

دیا اس کو دائی کو ہنس کر کہا
پلا دودھ اس کو شتابی پلا

ہوئی عیش پرداز وہ رشکِ حور — ہوا رقص آغاز اُس کے حضور
بندھا اس کے آگے سماں راگ کا — تنبورے بجے اور مندل بجا
مچی اُس کے گھر میں نئی دھوم دھام — ہوا ماہ رویوں کا واں ازدحام
اور اس ماہ کے در پہ نوبت بجی — عجب طور چلّے کی شادی مچی
اور اس ماہ کے گھر میں سلطاں گیا — وہاں تخت پر جلوہ فرما ہوا
وہاں آئی بیگم بھی شہ کے حضور — زمرد کی کرسی پہ بیٹھی وہ حور
بلا خادمان محل کو تمام — اکٹھے کیے اور سب خاص و عام
اور ان کسبیوں کو کہ ناچیں تھیں ان — بدھاوے بھی گاتی تھیں اور گھوڑیاں
نئے تاش کے ان کو جوڑے دیے — اور ان کو اشرفی کے توڑے دیے
ہوئی مال و دولت سے ہر اک نہال — لکھوں اس کی بخشش مجھے کیا مجال
دیے جوڑے نوبت نوازوں کو واں — عنایت کیا مال و زر بے کراں
ہوا زر فشاں مثل ابر مطیر — ہوئی شاہ سلطاں سے بدر منیر
گیا واں سے سلطان عالی جناب — نزاکت پری کے محل میں شتاب
ہوا جلوہ فرما وہاں تخت پر — گئی شاہ بیگم ادھر سے اُدھر
ہوئی کرسی زر پہ وہ جلوہ گر — مصفّا نظر آیا اُس کو وہ گھر (ورق ۴۰)
نہا دھو کے آئی نزاکت پری — کر آراستہ تن پہ رخت زری
پہن کر زمرد کے زیور تمام — بنی وہ پری طوطی سبز فام
وہ زیور تھا اس کا عجب خوش نما — ہوئی مسند زر پہ جلوہ نما
دیا غسل اور اس کے فرزند کو — پنھایا لباس اس کے دلبند کو
جواہر کا زیور پنھایا اسے — خوش اسلوب دولھا بنایا اسے
کیا اس پہ یک خوان پُر زر نثار — ملائیوں کو وہ زر بے شمار
ہوا واں بھی آغاز رقص و سرود — بجے دائرے اور بجے چنگ و عود
اٹھی ارغنوں سے خوشی کی صدا — اٹھی نے سے اور خرمی کی نوا
مچا اون کی مجلس میں سازوں کا شور — نکلنے لگے تب مقامات زور

رہا دی کی آہنگ پر سوز تھی — حسینی وہاں عالم افروز تھی
عرب کو عجب سمے سے ہوا اتفاق — ہوئی جاں فزا صوت و بانگِ عراق
وہاں بھی مچی الغرض دھوم دھام — ہوا اس پری کا بھی چلّہ تمام
وہاں ہر زن ماہ رخسار کو — اور اس ماہ کی ہر پرستار کو
اور ان کسبیوں کو کہ گاتی تھیں واں — خوشی کا سماں سب دکھاتی تھیں واں
کیا یاد لا پوش و زیور دیا — کئی خوان بھر لعل و گوہر دیا
تونگر کیا ان کو اس شاہ نے — دکھایا نیا نور اس شاہ نے
دیا اور نوبت نوازوں کو زر — زر افشاں ہوا شاہ مثلِ مطر
ہوا چلّہ آخر پری زاد کا — ہوا نام اس رشک شمشاد کا
نزاکت پری شاد و خرم ہوئی — طرب سے خوشی سے وو توام ہوئی
وہاں سے وو سلطانِ گردوں سریر — گیا جانب قصر روشن ضمیر
پکڑ ہاتھ میں اپنے اس شہہ کا ہاتھ — گئی شاہ بیگم بھی سلطاں کے ساتھ
ہوئے جلوہ گر تخت پر دونوں ماہ — منوّر ہوئی ان سے وہ بزم گاہ
نہا دھو ہوئی پاک وہ مشتری — پہن اپنی پوشاک نیلوفری
وو سنجاف تھا نقرۂ تاش کا — اور اس پر بنت تھی نئی خوش نما
وو گوٹے لگے تھے سنہرے بہت — ہوئی اس کے دامن میں ان کی کھپت
دوبنی میں بیٹھا خوش اسلوب تھا — لہر گوکھرو سے وو محبوب تھا
ازار اس پری کی بھی کمخواب کی — صفائی دکھاتی تھی مہتاب کی
دو شبنم کی محرم خوش اسلوب تھی — زری کی بنت اس میں کیا خوب تھی
وو جالی کی کرتی تھی کیا خوش نما — کہ ہر مرغ دل اس میں جا کر پھنسا
سراپا تھی بحر جواہر میں غرق — کہ جس کی چمک سے تھی شرمندہ برق (ورق ۵،)
کیے اس پری نے نئے سب سنگار — گلے میں پڑے موتیوں کے تھے ہار
گندھائی تھی چوٹی پری نے شتاب — کہ ہر موے سنبل کو تھا پیچ و تاب
کنارے کا موباف اس میں پڑا — خوش اسلوب اس سے تھا جوڑا بندھا

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدّین احمد

دائرہ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

| جلد ۳ | فروری سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۴ |
|---|---|---|

# ایک سوال

آج کیا بات ہے کچھ دل میں جوانی ہی نہیں
خوں تو ہے جسم میں پر جیسے روانی ہی نہیں
جوشِ طوفاں ہی نہیں، اشک فشانی ہی نہیں
بزمِ جاناں میں بھی کچھ سحر بیانی ہی نہیں
کوئی نسخہ ہی نہیں کوئی کہانی ہی نہیں

اُن کے آغوش میں اب بھی تو ہے نیت تازہ
اُن کے ساغر سے چھلکتی تو ہے لذّت تازہ
انکی بدمست نگاہوں میں ہے دعوت تازہ
ہو تو سکتی ہے شبستاں کی حکایت تازہ
ولولوں میں ترے کیوں اگلی جوانی ہی نہیں

کوہساروں سے ہواؤں کے سلام آتے ہیں
آبشاروں سے محبّت کے کلام آتے ہیں
لالہ زاروں سے مئے شوق کے جام آتے ہیں
اب بھی کشمیر سے فطرت کے پیام آتے ہیں
ان سے کیا شرطِ وفا کوئی نبھانی ہی [illegible]

ابھی لیلائے سخن میں ہے جوانی باقی
ختم ہونے پہ بھی ہے اس کی کہانی باقی
دھندلی دھندلی تو ہے محمل کی نشانی باقی
پر ترے عشق میں گرمی نہ روانی باقی
سرد ہیں قلب، کہیں آگ لگانی ہی نہیں

عالم قدس میں پلتے تو ہیں اسرار ابھی
مہ و خورشید کی راہیں ہیں فسوں کار ابھی
گر ہمالہ کی بلندی پہ نہیں پیار ابھی
کہکشاں میں ہیں ترے واسطے کچھ ہار ابھی
ایسے پھولوں سے کوئی بزم سجانی ہی نہیں

ظلمتیں کیسے یہ آئیں تیرے ایوانوں میں
زہر یہ کس نے ملایا ترے پیمانوں میں
کیا ہوئی وہ خلش غم ترے دیوانوں میں
خاک اڑتی ہے یہ کیوں تیرے گلستانوں میں
کیا یہ سچ ہے ترے اشکوں میں روانی ہی نہیں؟

ہند میں عام نہیں علم کی دولت اب تک
منہ چھپائے ہوئے پھرتی ہے صداقت اب تک
اینٹھتی ہے تری محفل میں جہالت اب تک

دیوزادوں پہ ہے بونوں کی حکومت ابتک
تجھ کو اس ظلم پہ آواز اٹھانی ہی نہیں؟

کتنے شاعر ہیں کہ بیٹھے ہیں بڑی دیر سے یاں
اپنے سینے سے لگائے ہوئے جھوٹے ارماں
کتنے بدمست۔ بنائے ہوئے خوابوں کے جہاں
بلبلے رنگ کے۔ لیکن نہ یہاں ہیں نہ وہاں
کیا انہیں تلخی مے یاد دلاتی ہی نہیں

کتنے میکش ہیں کہ پیتے ہی اٹھے جاتے ہیں
کتنے نغمے ہیں کہ ہونٹھوں میں رہے جاتے ہیں
کتنے شعلے ہیں کہ افسردہ ہوئے جاتے ہیں
کتنے جوہر ہیں کہ مٹی میں ملے جاتے ہیں
اور ابھی تیرے لئے کوئی کہانی ہی نہیں؟

منجمد ذہن کو بجلی کی سی نمو دینا ہے
خس و خاشاک کو شعلوں سے وضو دینا ہے
شاخ افسردہ کو یوں ذوق نمو دینا ہے
اپنی رگ رگ سے صداقت کا لہو دینا ہے
کیا یہ سچ ہے کہ ترے دل میں جوانی ہی نہیں؟

آل احمد سرور

# دوسرا خط

۴ بینک روڈ۔
الہ آباد ۔ ۴ فروری ۱۹۴۲ء

محترمی تسلیم!

غزل کے اشعار میں جس بے ربطی اور انتشار پر آپ نے اتنا زور دیا ہے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر پھر سوچ بچار کیا جائے۔ بے ربطی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کی مثال کچھ ایسی ہوگی کہ کوئی ایک ہی سانس میں یہ جملے بولے:۔ میں کل بمبئی سے وطن واپس آیا۔ میرے فاؤنٹین پن میں روشنائی کم ہے۔ ریل موٹر آنے پر سڑک سے نہیں ہٹتا افلاطون بہت بڑا فلاسفر گذرا ہے۔ ہیضہ میں پودینہ مفید ہے۔ تاج محل بھی خوب عمارت ہے۔ کتا بہت وفادار جانور ہے۔ کاغذ بہت مہنگا ہو چلا ہے۔ آج دو ریل گاڑیاں پٹنے کے پاس لڑگئیں۔ آپ بہت کھاتے ہیں۔ میں خدا کا وجود نہیں مانتا۔ آپ کو سگریٹ دوں یا آپ کھلکھلا کر ہنسنا پسند کریں گے؟ آئیے سنیما چلیں۔ عینک لگا کر سوجائیے۔ اچھا پھر کل ملاقات ہوگی۔ یہ بے ربطی البتہ پاگلوں کی سی ہے اور پاگل بنا دینے والی ہے۔

دوسری طرح کی بے ربطی کی مثال کچھ ایسی ہوگی:۔

اداسی اور غم کی شام ہے۔ آؤ کچھ اس کی پُرکیف نگاہوں کا ذکر چھیڑ دیں کیونکہ بیخودی بڑھتی جا رہی ہے اور اس وقت راز کی باتیں ہونی چاہئے۔ یہ سکوتِ یاس، دل کی رگوں کا یہ ٹوٹنا۔ اس خامشی میں تو شکستِ ساز کا ذکر چھیڑنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بالوں کی خوشبو، یا شامِ غم کی داستان، رات بھر اسی انداز کی باتیں ہوں۔ اس کا تو نام لینا بھی ایک جہانِ رنگ و بو ہے، ہاں آج تو اسی نوبہار ناز کی داستان کہو۔ ہم اسیروں کی بھی کیا زندگی ہے، ہمارے قفس کی تیلیوں سے کچھ نور سا چھن رہا۔ اس مجبوری اور دلتنگی کو بھولنے کے لئے کچھ کھلی ہوئی فضا اور کچھ اڑنے کی حسرت کا ذکر کرو۔ فراق، جس کی فرقت نے عشق کی کایا ہی پلٹ دی اسی عیسیٰ نفس دمساز کا ذکر آج چھیڑو —— اس گفتگو کو غزل میں یوں ڈھال دیں گے:۔

| | |
|---|---|
| شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو | بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو |
| یہ سکوتِ یاس، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا | خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو |
| نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم | صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو |
| نام بھی لینا ہے جس کا اک جہانِ رنگ و بو | آج کچھ اس نوبہارِ ناز کی باتیں کرو |
| کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا | کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو |
| جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق | آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو |

ظاہر ہے کہ "بے ربطی" یا "انتشار" کی یہ مثال پہلی مثال سے کس قدر الگ ہے۔ اس غزل میں اس قسم کا تسلسل نہیں ہے جو منطق، فلسفہ، اقلیدس، حساب، قانون یا سیاسی تقریروں کے دلائل میں۔

ہوتا ہے۔ اور نہ وہ سطحی تسلسل ہے جو عام بات چیت میں ہوتا ہے۔ لیکن اس "بے ربطی" و انتشار سے طبیعت پراگندہ یا بدمزہ نہیں ہوتی کیونکہ حقیقتاً کامیاب اور اچھی غزل میں، صحیح تغزل میں انمل بے جوڑ باتیں ہوتی ہی نہیں۔ غزل کا عنوان و موضوع غیر متعین نہیں ہے بلکہ سختی سے متعین ہے۔ ہر اچھی غزل ایک ازلی و ابدی و عالمگیر غزل کی کچھ آوازوں کی آوازِ بازگشت یا اس کے بے شمار پردہ ہائے ساز کے نغموں کی نمود ہے وہ ازلی و ابدی غزل جسے ہم وجود یا زندگی کہتے ہیں حیات و کائنات کہتے ہیں، حیات و کائنات کے وہ مرکزی و مستقل و اہم پہلو جو سب سے زیادہ ہمارے دل کو لگتے ہیں جن سے ہم مانوس و ہم آہنگ ہونا چاہتے ہیں۔ وجود کا وجدانی مجمل ادراک حاصل کرنا غزل کا مقصد ہے حسن و عشق اور زندگی کے دیگر مرکزی تاثرات غزل کے عنوانات ہوتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور وہ زندگی کے کسی نہ کسی قانون پر یا مستقل طور پر دلکش مسئلہ یا منظر پر حکم لگاتا ہے۔ غزل کے اشعار میں وہ تسلسل ہوتا ہے جو نماز کی آیتوں میں ہوتا ہے یا جو حسن و عشق، حیات و کائنات پر اجمال کے ساتھ مسلسل طور پر حکم لگانے میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایسے جملے:۔ اے خدا تو نے کائنات کی خلقت کی ہے۔ اے خدا تو پاکیزگی حسن و محبت پاکیزگی خیر و برکت کا سرچشمہ ہے۔ اے خدا تو ان سب سے بھی بے نیاز ہے۔ آج کی رات کتنی سہانی ہے میں فضا میں تیرے درشن کر رہا ہوں۔ ہم گناہگار ہیں لیکن ہم کو اپنے گناہ پر ناز ہے۔ گور غریباں کے جھلملاتے ہوئے چراغ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم رندوں کے سامنے واعظ کی آنکھ جھپک جاتی ہے۔ یہ کنج قفس، یہ جور صیاد۔ یہ آمدِ بہار، یہ یاد آشیاں۔ یہ حسرتِ پرواز یہ پر شکستگی۔ ہم دیوانوں کے دم قدم سے ویرانے آباد ہیں۔ میں تم سے بہت کچھ کہنے والا تھا بہت گلے شکوے رازو نیاز اور محبت بھری باتیں دل میں تھیں لیکن میں تمہیں دیکھتا ہی رہ گیا کچھ کہہ نہ سکا۔ نہیں نہیں خدا وا سب دھوکا ہے نہ کوئی خدا ہے نہ کوئی شیطان، نہ کوئی پیر و پیغمبر، ہم دہریئے ہیں دہریئے۔ جو کچھ ہے سب معراج آب و گل ہے۔ بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ـــــ مر گیا کوہکن یہی کہہ کر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو (تیسرا)

یہ بظاہر بے ربط باتیں بے ربط نہیں ہیں۔ یہ انمل اور بے جوڑ باتیں نہیں ہیں۔ کسی کو ایک ہی غزل میں یہ باتیں خوش آیند اور باسلیقہ طور پر کہنے آئے تو طبیعت پراگندہ و بے مزہ نہ ہو گی بلکہ طبیعت کو ایک فرحت اور تازگی نصیب ہو گی۔ غزل سننے کے پہلے سننے والوں کے دل و دماغ ایک پُر تپاک انتظار کی حالت میں ہو جاتے ہیں حسن و محبت زندگی اور دنیا کے متعلق دلنشیں اجمالی باتیں سُننے کے لئے اس بات کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ اگر ایک شعر میں یہ کہا جائے کہ معشوق کے قد سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں تو دوسرے شعر میں یہ کہا جائے کہ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب۔ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں ـــــ اگر ایک شعر میں یہ کہا جائے کہ:۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

تو دوسرے شعر میں یہ کہا جائے کہ

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — ہائے وہ بادہ جو افشردۂ انگور نہیں

یہ سب اشعار اور یہ سب غزلیں اسی ایک ازلی و ابدی غزل کی آوازیں ہیں جس کا نام ہے دنیا اور زندگی اور ایسے ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است۔ رگِ زندگی کے ( [illegible] ) رنگا رنگ تمثیلیں ہیں جو غزل نے اپنے لئے متعین کر لی ہیں۔ دشنہ و خنجر، بادہ و ساغر، زلف و رخ، گل و بلبل، نقشِ قدم و منزل بہار و خزاں، ہوش و جنوں، خلوت و جلوت، جلوۂ و پردہ، وغیرہ وغیرہ.... غزل کی روایتیں اس مربوط بے ربطی اس غیر مسلسل تسلسل کے لئے سامعین کو تیار کر دیتی ہیں جنکا مظاہرہ غزل کے مختلف اشعار میں ہوتا ہے۔ اگر ہر غزل کی سُرخی رکھی جائے "زندگی اور محبت" تو غزل کا ہر شعر اس سرخی اور عنوان سے مربوط نظر آئے گا۔ ہر شعر میں اور اس سرخی میں چولی دامن بلکہ گوشت و ناخن کا ساتھ نظر آئے گا۔ غزل کے اشعار میں وہی ربط ہوتا ہے جو کسی رقص کے حرکات و سکنات میں اور اداؤں میں ہوتا ہے منطقی ربط نہیں جمالیاتی ربط۔ اب رہا یہ سوال کہ پوری غزل میں یہ غیر مربوط ربط، یہ غیر مسلسل تسلسل ایک مکمل فنی کارنامہ کی وحدت ( Unity ) پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب ہے ہاں بھی اور نہیں بھی۔ بہر حال غزل کوئی افسانہ نہیں ہے جس میں شروع کا حصّہ ہو، درمیان کا حصّہ ہو اور آخیر کا حصّہ ہو۔ غزل کے اشعار کو بظاہر مربوط و منسلک کرتے ہیں قافیے و ردیف یا محض قافیے (اگر غزل غیر مردف ہے)، پھر بہ باطن انھیں مربوط و ہم آہنگ کرتے ہیں شاعر کے یکساں نظریے اس کے مزاج کی یکسانیت اس کے اسلوب و لب و لہجہ کی یکسانیت ضمنی، مفرد اور تفصیلی طور پر مختلف خیالات، موضوعات و عنوانات پر شاعر کے شعور کا یکساں ردِ عمل اور پھر مختلف اشعار کے سروں کا زندگی و محبت کے مرکز سے مل جانا۔

وہیں سے ہیں رگیں وابستۂ ہر وحشتِ ہجر دل کی — جہاں سے جنبشیں ملتی ہیں دامانِ بیاباں کو

جنبشِ برگِ شجر سے تا بہ طوفانِ حیات — ایک ہی پیغامبر تھا ایک ہی پیغام تھا

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائیں ہیں — جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیرلبی

غرضکہ مختلف اشعار کے مفہوم و اثر سے گذر کر ماورائی طور پر پوری غزل کا ایک مجموعی اثر ہوتا ہے اور ایک مجموعی فضا ہوتی ہے جس میں صرف ایک لفظ گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے زندگی، زندگی، زندگی۔ یا محبت، محبت، محبت۔ یا وجود، وجود، وجود، وجود۔

غزل شاعری نہیں ہے غزل عطرِ شاعری ہے۔ اہلِ عرب کی مہذب زندگی چونکہ اتنی پرانی اور پختہ نہ تھی جتنی اہلِ ایران کی مہذب زندگی تھی اس لئے فارسی اور اردو کی غزلوں کی طرح اہلِ عرب

غزلیں نہیں کہہ سکے۔ غزل میں جس فرزانہ شاعری (Gnomic poetry) کا مطالبہ ہوتا ہے
اس کے لئے بہت پختہ کار، اور پُرکار مہذب زندگی کی ضرورت ہے۔ آپ غزل کو نیم وحشیانہ صنف
بتاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اہل عرب بھی فارسی غزل کی طرح غزلیں کہتے بلکہ اہل عرب میں بھی سب سے
اچھی غزل عرب کے بدو اور لٹیرے اور ان پڑھ لوگ کہتے اور ہندوستان یا دوسرے ملکوں کے نیم مہذب
گنوار بھی غزل کہہ لیتے۔ بلکہ نیم مہذب اور نیم وحشی قومیں تو بہت مربوط و مسلسل نظمیں کہتی ہیں ان کا تخیل
و تصور تو خارجی تسلسل یا واقعاتی تسلسل کا سہارا لئے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ غزل کی کامیاب
شاعری غزل کی جامعیت تو کلچر و تہذیب کی انتہائی پختگی و لطافت کی غزلوں میں ممکن ہے ——
مٹ گئیں نظمیں تو اجزائے تغزل ہو گئیں

| | |
|---|---|
| عجمیت تھی جس نے دنیا میں | کفر و ایماں کا کر کے پاک حساب |
| ٹھیٹھ انسانیت کو سمجھا تھا | تیرے بس کا نہیں یہ بادۂ ناب |
| خوشہ چیں ان کے لاکھ ہوں ہشیار | ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب |

غزل کی قدر سمجھنے کے لئے بہت مرکوز لچکدار اور رچے ہوئے شعور کی ضرورت ہے۔ آمرسن نے
اپنے مقالہ بنام ایرانی شاعری (Persian Poetry) میں حافظ کی غزلوں کے اشعار کی بظاہر
"بے ربطی" پر بحث کرتے ہوئے اسی مرکوز، لچکدار اور رچے ہوئے وجدان کا ذکر کیا ہے۔ غزل کے اشعار
ایک سانس میں پڑھے جانے اور سُنے جانے کی چیزیں نہیں ہیں۔ غزل کے اشعار سے انسانی شعور جتنے بل کھاتا
ہے اور جس طرح بل کھاتا ہے اس کا طرز عمل (Tempo) بہت اہم چیز ہے۔ بے ربطی، عدم تسلسل، انتشار
یا ربط، تسلسل اور وحدت و یکسانیت کے علاوہ اُردو کے دو اور لفظ حاضر خدمت کرتا ہوں جو غزل کے
مختلف اور مفرد اشعار پر چسپاں ہوتے ہیں اور انھیں منسلک کرتے ہیں۔ وہ لفظ ہیں مناسبت اور مطابقت
غزل کے مختلف اور الگ الگ اشعار میں مناسبت اور مطابقت ہوتی ہے۔ یہ مناسبت و مطابقت
نفسیاتی ہے۔ جیسے کسی کے متعلق یہ جملے کہیں کہ وہ شخص پڑھا لکھا ہے اور خوش حال ہے لیکن پوشاک کے معاملے میں
کنجوس ہوتے ہوئے بھی بڑا لاپرواہ ہے اکثر پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتا ہے۔ پڑھا لکھا ہونا، خوش حال ہونا
کنجوس نہ ہونا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنا ان سب باتوں میں یوں کوئی ربط اور تسلسل نہیں ہے۔ لیکن
ایک شخص کی صلاحیت اور کردار یا افتاد مزاج دیکھ کر یہ غیر مربوط باتیں مربوط معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح
غزل میں زندگی پر یا کائنات پر غور کرنے سے حسن و محبت سے متعلق معاملات و واردات، دلکش یا نشاط
کرنے والے مناظر کی جھلکیاں، رندی و مستی، زہد و اتقا، دیر و حرم، کفر و ایمان، ہوش و جنوں، بہار و خزاں،
عشق و ہوس زندگی و موت اور اخلاقیات و نفسیات کے متعلق اور انفرادی یا سماجی زندگی سے متعلق انسانوں کے

باہمی تعلقات کے متعلق مرکزی باتیں غیر مربوط ہوتے ہوئے بھی ایک ربط رکھتی ہیں۔ ان باتوں میں تسلسل نہ سہی ایک مطابقت اور مناسبت ہوتی ہے کیونکہ ان سب باتوں یا غزل کے سب اشعار کا موضوع زندگی ہے۔ ازلی و ابدی غزل زندگی ہے، دنیا ہے غزل کے مختلف العنوان اشعار اسی سوز و ساز کے مرکز سے بکھری ہوئی، خون اور آگ میں ڈوبی ہوئی کرنوں کی طرح پھوٹتے ہیں ۔ غزل کا مفہوم اور اثر پوری غزل کے مکمل ساز و نغمہ میں ہوتا ہے۔ ایک شعر کی لے دوسرے شعر کی لے سے مل جاتی ہے اور ہر شعر کی لے دوسرے شعر کی اثر میں اضافہ کرتا ہے۔ غزل کے مختلف اشعار کے مختلف خیالات کو اگر مختلف بحروں اور زمینوں میں منظوم کیا جائے تو اثر بھی بہت کم ہو جائے گا اور معنی و مفہوم تک نغمہ کے بدل جانے سے بدل جائیں گے۔ نغمہ بجائے خود معنی ہے (The music is the meaning) اکبر الہ آبادی کے سیکڑوں نہایت اچھے اشعار ان کے دیوانوں سے باہر نہیں نکل سکے بلکہ اسی میں دفن رہ گئے کیونکہ نہ وہ قطعہ تھے نہ غزل بلکہ بالکل مفرد اشعار تھے۔ امیر مینائی کی غزلوں میں مشکل سے اس پایہ کے اشعار ملیں گے جیسے ان کے دیوان کے تتمہ گوہر انتخاب و جوہر انتخاب میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ اشعار اکھڑے پتنگ کی طرح بے ٹھکانے رہ گئے۔ چونکہ ان کو امیر مینائی غزل میں ٹھکانا نہیں دے سکے اسی لئے دنیا ان اشعار کو دل و دماغ و یادداشت میں ٹھکانا نہیں دے سکی۔ پوری غزل اس لئے بھی فن کے لحاظ سے ایک اکائی (unit of art) ہے کہ غزل کے مختلف اشعار معانی اور اثر کے لحاظ سے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور ہر شعر دوسرے شعر کو مکمل بناتا ہے۔ جیسے گلدستہ کے مختلف پھول مل کر اپنی رنگا رنگ نوعیتوں سے ایک دوسرے کے حسن و رنگ و بو میں اضافہ کرتے ہیں اور گلدستہ کو وحدت (unity) دیتے ہیں۔

لیکن غزل کے اشعار کی باہم مطابقت غزل میں اسی قسم کی وحدت نہیں پیدا کرتی جو کسی محدود اور مخصوص موضوع پر ایک مسلسل نظم میں ہوتی ہے۔ مسلسل نظم میں کلیات نہیں بیان کئے جاتے اس کے ہر مصرع یا شعر میں جامع اور عالمگیر باتیں نہیں کہی جاتیں۔ نظم میں اجمال کے بجائے تفصیل ہوتی ہے، تشریح ہوتی ہے اور جزوی صراحت ہوتی ہے۔ نظم کے ہر شعر کا مفہوم ضمنی چیز ہے پوری بات، مکمل مفہوم کل اشعار کو ملانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اردو غزل اقبال کی غزلوں سے قطع نظر کر کے ابتک عمل کا عنصر یا وہ عنصر جو قوت ارادی کو بھرپور بنائے اور اکسائے ابتک عموماً اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ یہ عنصر اگر تھا بھی تو کمزور اور منتشر تھا۔ آفاقی ادراک، سماجی زندگی کے رموز زندگی میں گرمی اور زور اور حرکت پیدا کرنے والے عنصر اب تک اردو غزل میں کم تھے۔ زیادہ تر اچھی غزلوں میں بھی ایک نہایت لطیف مہذب اور رچی ہوئی مجہولیت تھی، کیف و اثر و انفعال کی کثرت تھی، مستی تھی، رنگینی تھی، ترنم تھا، نازک اور لطیف نفسیاتی مسائل تھے۔ ان چیزوں نے ہمارے شعور کو بہت کچھ رچایا۔ لیکن مقصد و قوت کا ادب (literature of purpose and power) پہلے پہل اقبال کی غزلوں نے ہمیں دیا۔ یہ ہمارے ادب میں ایک بہت گرانبہا اضافہ ہے اور دنیا کے ادب میں بھی ایک گراں بہا اضافہ ہے۔ یہ اندھی عمل پرستی نہیں ہے بلکہ اس عمل پرستی کی روشنی و گرمی کے سرچشمے آفاقی ادراک اور آفاقی جذبات ہیں۔ کچھ لوگ نوکٹھ ملّوں کی طرح اقبال کی تقلید کرنے لگے صرف مسلمانوں کو آفاقیت کا ٹھیکہ دار ثابت کرنے لگے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اقبال کے وقت سے انسانیت، اخوت انسانی، اور

عالمگیر سماجی نظام کے نظریے بدل چکے ہیں۔ جدید مادیت، دہریت اور لامذہبیت میں اقبال کے اسلامیات سے زیادہ روحانیت ہے۔ اس لئے جدید نظم اور غزل میں ہم اقبال سے بہت کچھ فائدہ اٹھاتے ہوئے نئی بصیرت اور نئی فرزانگی پیدا کریں نہ کہ اقبال کی کورانہ اور کمزور نقالی کریں۔ بہرحال اقبال نے اُردو غزل کے لئے نئے امکانات پیدا کردیے ہیں حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے تغزل میں وہ امکانات نہیں ہیں۔ یگانہ کے تغزل میں البتہ کچھ ایسے امکانات ہیں لیکن اُن کی شدید انفرادیت اقبال کی آفاقیت سے نمایاں طور پر علحدہ ہے۔ یگانہ ایک منظم انسانیت کے متعلق خیر و برکت کے ٹھوس اور بھرپور نتائج مرتب نہیں کرتے۔ پھر بھی یگانہ کی شاعری حیات افزا ہے اور اس میں زندگی اور عمل کی قوتیں ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہماری شاعری ننانوے فی صدی غزل تھی اور ایک فی صدی نظم تھی۔ سب سے نیک شگون ہے کہ جہاں پہلے گھر گھر محلے محلے میں وبا کی طرح غزل گوئی پھیلی ہوئی تھی، جہاں خواندہ یا حرف شناس لوگوں میں قریب قریب ہر شخص شاعر تھا وہاں اب ہزاروں پڑھے لکھے لوگوں میں ایک آدمی کچھ شاعری کرتا ہے۔ لیکن جہاں اب سے پچیس تیس برس پہلے تک تین ہی چار چوٹی کے شاعر تھے اب چوٹی کے شاعر آٹھ دس ہوتے ہیں اور ان سے کچھ ہی اتر کر ملک میں چالیس پچاس آدمی عمدہ شاعری کر رہے ہیں۔ شاعری کی سطح اب میلوں اُوپر جا چکی ہے۔ اب سے بیس برس بعد اچھے غزل گو ایک آدھ ہوں گے اور ان کا نام غالب اور اقبال کے ساتھ لیا جائے گا لیکن نظم بہت ترقی پر ہوگی اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ نظم میں وہ تعمیری صفت اور وہ تسلسل ہوتا ہے جو غزل ہیں نہیں دے سکتی۔ غزل کا اجمال اور اسکے اشعار کی مرکزیت جامعیت اور ہمہ گیری بڑی چیزیں ہیں اسکے احکام بڑے احکام ہیں۔ اس کے اشعار کی مطابقت اور باہم تناسب ہمارے ادراک اور شعور کے قریب قریب انتہائی مدارج ہیں۔ پھر بھی وہ مخصوص موضوعات جو غزل میں بیان نہیں کئے جا سکتے اور اس خاص منظم و مسلسل طریقہ پر بیان نہیں کئے جا سکتے جس طرح نظم میں وہ بھی بڑی چیز ہیں۔ مغرب کی زبردست اور معرکہ آرا نظمیں بنگلہ زبان اور ہندستان کی دوسری زبانوں کی کامیاب نظمیں۔ چین و جاپان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کی کامیاب نظمیں سب اُردو نظم گوئی کے لئے اعلیٰ ترین نمونے پیش کریں گی۔ جب کہیں جاکے ہماری شاعری بھرپور ہوگی ——— میں ہرگز ان لوگوں میں نہیں ہوں جو محض غزل تک اردو شاعری کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ایسے رزمیے ( Epics [?] ) یا ایسے منظوم ڈرامے جیسے شیلی کی ( Prometheus Unbound ) اُردو میں لکھے جا سکتے ہیں جن کا مرتبہ قطعاً غزل سے بہت بلند ہوگا۔ غنائی نظمیں ( Odes ) بھی اور دوسری طرح کی نسبتاً مختصر نظمیں، غیر مقفا نظمیں، محض آہنگی نظمیں (Free Verse) ہندوستان کی اور زبانوں کی بحروں اور اصناف سخن میں نظمیں اگر کامیاب طور پر لکھی جائیں تو ان کا مرتبہ غزل سے ہرگز کم نہ ہوگا اور بسا اوقات غزل سے معنوی و فنی لحاظ سے بلند ہوگا۔

فراق گورکھپوری

# اُردو ادب میں طنز اور ظرافت

(۱)

زندگی درد و غم کا دوسرا نام ہے۔ ہماری زندگی ہی ہماری مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ستائے جانے کے لئے لائے گئے ہیں۔ انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول لاپرواہ۔ انسان حساس ہے اس لئے اس کا دل بہ آسانی رنج والم کا نشانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں فطرت نے ایسی امنگیں ایسی تمنائیں ڈالدی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں، ان تمنّاؤں کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں اسکی تمنّاؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اسکی تکلیفوں کی داستان شروع ہو گئی۔ کیونکہ جس دنیا میں اسے لایا گیا ہے وہ اسکی تمنّاؤں کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ یہ دنیا نہ اسکی تمنّاؤں سے آگاہ ہے اور نہ ان سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ کمزور لیکن حساس انسان اس بے حس لیکن طاقتور دنیا سے ٹکراتا ہے اور تکلیفیں سہتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن یہ پوری حقیقت نہیں۔ اگر یہی پوری حقیقت ہوتی تو شاید زندگی دشوار ہو جاتی۔ زندگی میں ایسے واقعات، ایسے مناظر، ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب انسان اس تلخ حقیقت کو وقتی طور پر بھول جاتا ہے۔ پس منظر میں ہمیشہ یہی تلخ حقیقت ایک مہیب دیو کی طرح موجود رہتی ہے لیکن پیش منظر میں اکثر ایسے واقعات، ایسے مناظر ایسے متبسّم لمحے بھی ملتے ہیں کہ انسان اس خوفناک اور تاریک پس منظر کے باوجود بھی مُسکرا اٹھتا ہے یا قہقہے بلند کرتا ہے۔ یہ واقعات، مناظر اور لمحے بھی زندگی کے اجزا ہیں اور جو حضرات انہیں پس پشت ڈالدیتے ہیں وہ یونان کے گریاں فلسفی کی طرح زندگی سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔

کہا گیا ہے کہ انسان ہنسنے والا جانور ہے۔ یہ پوری حقیقت نہیں لیکن اس مقولے میں انسان کی ایک اہم خصوصیت کا انکشاف ہے۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ یہاں ہنسی کی ماہیت اور اسکے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہم ہنستے ہیں۔ جیسے غم غصّہ کرتے ہیں،، نفرت یا محبت کرتے ہیں جاگتے یا سوتے ہیں۔ اور ہنسی ہماری روحانی صحت کے لئے ضروری ہے۔ اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کر لیا جائے، اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جنکی وجہ سے ہم ہنستے ہیں

تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ ہو جائے لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے
نہیں اور نہ ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شئے مکمل، موزوں و متناسب ہو وہاں
ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی عموماً عدم تکمیل، بیڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جسے
اس کا احساس نہیں، یعنی جسے ہنسی نہیں آتی اُسے ہم انسان شمار نہیں کرینگے۔ ادب میں انسان کے
تمام دماغی اوصاف، اس کے سارے حواس کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک انسانی
خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے۔
ادب زندگی، زندگی کے ہر شعبے، زندگی کے نشیب و فراز، زندگی کے جملہ محاسن و معائب کی
ترجمانی کرتا ہے۔ ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اس لئے ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے،
زندگی کے تمسخر انگیز پہلو کی عکاسی ادب میں اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے رقت انگیز
پہلو کی۔ زندگی میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی، ہم روتے ہیں اور
پھر ہنستے بھی ہیں۔ ادب اس روشنی اور تاریکی، اس خوشی اور غم، اس ہنسی اور آنسو کا آئینہ ہے
عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا وہ حصہ جو ہنسی کا ترجمان ہے زیادہ اہم نہیں۔ یہ محض تفریح طبع کا
ذریعہ ہے اور بس۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ سنجیدہ، متین زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر
وقت اہم، پیچیدہ، گہرے امور میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس لئے اُسے ضرورت محسوس ہوتی
ہے تفریح کی، دل بہلانے کی، دماغ میں شگفتگی پیدا کرنے کی۔ جسطرح ہم روزانہ کام کی
تھکان، یکرنگی، دشواری سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لئے سینما چلے جاتے ہیں بجنسہ اسی
طرح جب ہم سنجیدہ مشکل تحریروں کے مطالعہ سے تنگ آجاتے ہیں تو ان ہلکی، لطیف تحریروں
کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے سنجیدہ تحریروں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط ہے۔
موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل ہو یا ہلکا، دشوار ہو یا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادھا
غرض ہر قسم کا موضوع محض خام مواد ہے جس سے ادیب مصرف لیتا ہے۔ اگر وہ صحیح معنوں میں
ادیب ہے تو وہ ہر قسم کے موضوع پر اپنے آرٹ کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے اور
پڑھنے والا دونوں قسم کی تحریروں، سنجیدہ اور مزاحیہ تحریروں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔
موضوع مزاحیہ ہی لیکن اگر ادیب نے اپنے موضوع پر بحث کرنے میں صنعت کارانہ سنجیدگی
سے کام لیا ہے تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع سنجیدہ
یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اردو انشا پرداز اس حقیقت سے
واقف نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ہنسی عدم تکمیل اور بیڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے اس لئے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت مسلم ہے۔ ہم محض اس ناتمامی کے احساس کا اظہار کرسکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرسکتے ہیں۔ یہہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے احساس میں پہلے احساس کا وجود ضروری ہے لیکن پہلے احساس کے ساتھ دوسرے احساس کا وجود لازمی نہیں پہلے قسم کے احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے، دوسرے کا نتیجہ ہے طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بیڈھنگی شئے کو دیکھکر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس نقص، خامی بدصورتی کو دور کرنے کا خواہشمند نہیں۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص وناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیل، حسن، موزونیت، انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبہ سے مجبور ہوکر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ اور منزلیں جدا جدا ہیں لیکن واقعہ یہہ ہے کہ ان دونوں کو علحدہ کرنا عموماً دشوار ہے۔

خالص ظرافت نگار ہو یا ہجو گو دونوں صنّاع ہیں، دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا۔ وہ اس بے آہنگی کی تخلیق باردگر کرتا ہے اور اسے دلچسپ سے دلچسپ تر بنادیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے، اسکی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع وبوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کرلیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لئے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے وسعت نظر ضروری ہے۔ وہ دنیا کے ہر گوشے، زندگی کے ہر شعبے سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کا مواد ہر جگہہ ہے اور اگر اسے اپنے فن کی اہمیت کا صحیح احساس ہو تو وہ کسی چیز سے قصداً احتراز نہیں کریگا۔ وہ اپنا مواد کاوش کے ساتھ جمع کرتا ہے، اس پر غور کرتا ہے، مشاہدہ کی کمی یا بیرنگی کو رنگینیٔ تخیل، رعنائی خیال کی مدد سے پورا کرتا ہے اور دیکھی ہوئی یا تصور کی ہوئی چیزوں کو صنعت کارانہ حسن وصداقت سے مزین کرتا ہے۔ اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا۔ وہ صناع ہے حامئی اصلاح نہیں۔ اسکے کارنامے بھی صحیح معنوں میں تخلیقی ہوتے ہیں۔ یہ کارنامے ہماری تفریح کا باعث ہوتے ہیں لیکن تفریح اصل مدعا نہیں۔ اس کا مقصد ایک حسین مکمل، موزوں کارنامے کی تخلیق ...

حاصل ہوتی ہے وہ ایک حد تک اتفاقی ہے۔

ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھکر مسکرا اٹھتا ہے لیکن اور کسی قسم کا جذبہ اسکے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گو کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھکر بیتاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بیرحمی، ریاکاری کی مثالیں دیکھکر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کی ہجویں انہی جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ وہ بھی صناع ہے اسلئے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے، انکی شدت کے باوجود۔ علحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہوکر، انہیں اپنے قابو میں لاکر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے اور اس صنعتکارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔ ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن ہجو گو انسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اسکی ہجوؤں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اسکی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبہ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے۔ بہرکیف ہجو گو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف، فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔

(۲)

ہجو کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: نظم و نثر۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ اور جو فرق ہے بھی تو اسے ایک لفظ میں بیان کیا جاسکتا ہے یعنی وزن۔ اگر وزن نہ ہو تو پھر ہجو بہ نظم و نثر میں تمیز ممکن نہیں۔ شاعر اور نثر نگار دونوں ہجو کے میدان میں ایک ہی مقصد لے کر گامزن ہوتے ہیں، دونوں کی راہیں اور منزلیں ایک ہیں۔ صرف ایک اشہب وزن پر سوار اور دوسرا پاپیادہ ہے۔ یہ طرزِ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شعر اور نثر میں اہم اور بنیادی فرق ہے۔ وزن شعر میں ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں۔ دور حاضر میں بعض مغربی شعرا نے ثابت کردکھایا ہے کہ وزن شعر کی لازمی خصوصیت نہیں۔ وہ ایک مخصوص صورت میں اپنے احساس شعری کی ترجمانی کرتے ہیں جسے نظم معرا کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نثر کے جملہ کو وزن کے جامہ سے آراستہ کردیا جائے

تو وہ شعر کے زمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شعر ہمارے تجربات، حسین وبیش قیمت تجربات کا حسین موزوں اور کامل ترجمان ہے۔ نثر میں ہمارے خیالات کا صاف مختصر اور بے کم وکاست اظہار ہوتا ہے۔ دونوں کی راہیں جداجدا اور منزلیں الگ الگ ہیں۔ جس طرح غزل یا نظم اور مقالہ میں صنفی اور بنیادی فرق ہے بجنسہ اسی طرح ہجویہ نظم اور ہجویہ نثر میں بھی صنفی اور بنیادی فرق ہے۔ اس جگہ ایک دوسری غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے عموماً یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ہجویہ نظم میں شاعری، بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن نہیں۔ عام گفتگو میں شاعری جذبات کی ترجمانی کا دوسرا نام ہے۔ ہجویہ نظم میں کسی شخص کے معائب یا کسی عام انسانی نقص کا طنزیہ انکشاف ہوتا ہے۔ اس لئے ان نظموں میں بظاہر جذبات کا (اور جذبات سے خاص قسم کے جذبات مراد ہوتے ہیں) وجود نہیں ہوتا اس روایتی نقطۂ نظر میں جذبات صرف وہی ہیں جن سے غزلیں بھری پڑی ہیں۔ انہیں احساسات، مخصوص و محدود احساسات، کو شعریت کامل سمجھا جاتا ہے جو حسن وعشق سے وابستہ ہوتے ہیں، جو بے ثباتیٔ دنیا، موت یا زیادہ سے زیادہ وطن کی محبت، آزادی کی لگن سے سروکار رکھتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجویہ نظم جذبات کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہجو گو شاعر ناانصافی بیرحمی، ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اور اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر اس کا جذبۂ نفرت غضب حقارت جوش میں آتا ہے۔ انہیں جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے۔ اگر جذبۂ عشق ایک پرزور طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقتور زور ہے۔ اگر کوئی حسین فطری منظر ہمارے ذوق حسن کو بھڑکاتا ہے تو کوئی کریہہ انسانی منظر ہمارے احساس غضب کو برانگیختہ کرتا ہے اگر معشوق کے جسمانی حسن کی تعریف میں ہم رطب اللسان ہو سکتے ہیں تو کسی شخص کے اخلاق قبیح کا حقارت آمیز انکشاف بھی کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہجویہ نظم میں بھی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور پیمانۂ شعر میں ہر قسم کے جذبات سما سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں جس طرح غزل کے اشعار یا کسی رومانی نظم میں شدت جذبات کا وجود ہو سکتا ہے اسی طرح ہجویہ نظم میں بھی جذبات کی شدت ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی شعر یا نظم میں بلند پایہ شاعری ہو سکتی ہے تو پھر ہجویہ نظم میں بھی بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن ہے۔

اردو میں ہجویہ شاعری کو زیادہ فروغ نہوا۔ ریختی اور ہزلیات سے یہاں بحث نہیں۔ خالص ہجویہ شاعری پر بہت کم شعرا نے توجہ کی اور ان میں صرف دو چار ہی کم وبیش کامیاب ہوئے۔ سوداؔ کے معاصرین میں [illegible]

انشا و مصحفی کی نوک جھونک سے دنیا واقف ہے لیکن اُن کی ہجویں محض ذاتی بغض وعناد کی ترجمان تھیں اور اس قسم کی ہجوؤں میں بھی ان کا رتبہ بلند نہیں۔ اودھ پنچ کے سلسلہ میں شہباز، ظریف وغیرہ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی مگر کوئی زندہ کارنامہ نہ پیش کر سکے۔ موجودہ زمانہ میں بعض ترقی پسند شعراء نے اور ان کے ہم مسلک شعراء نے طنز وظرافت سے مصرف لیا لیکن اُن کی طنز وظرافت محض سطحی ثابت ہوئی۔ اُردو میں صرف چار شعراء ایسے ہیں جنکی ہجو یہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ یعنی سودا، اکبر، اقبال اور جوش۔

رشید احمد صاحب کہتے ہیں: "بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن وفکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام وکمال پوری نہیں اترتیں" یہ صحیح نہیں۔ ہجو گو شاعر اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر وبیشتر کسی ذاتی جذبۂ عناد بغض وتعصب سے متاثر ہوکر آمادۂ ہجو گوئی ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً ہجوؤں میں ذاتی عنصر کا وجود ناگزیر ہے۔ اساسی شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے ذاتی جذبہ کو عالمگیری عطا کر سکے یعنی وہ اپنی شخصیت کو علحدہ کرکے اپنے جذبۂ نفرت وغضب کو عام انسانی نقائص کے خلاف برانگیختہ کرسکے۔ مثلاً زید، عمر، بکر یعنی کسی فرد یا سماج نے شاعر کے ساتھ ناانصافی برتی۔ اس ناانصافی کی وجہ سے اس کے دل میں غم وغصّہ نے ہیجان بپا کیا۔ کامیاب ہجو گو شاعر اپنے جذبات کے ہیجان کو قابو میں لاتا ہے اور مخصوص واقعہ سے قطع نظر کرکے ناانصافی، عالمگیر ناانصافی کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ "ذہن وفکر کی بے لوث برہمی" کے نمونے کم ملتے ہیں، شاعر انسان ہے اور اس کے جذبات ذاتی ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ذاتی جذبات کو عالمگیر بنا سکتا ہے لیکن جب تک وہ فرشتہ یا خدا نہو جائے اسوقت تک وہ "ذہن وفکر کی بے لوث برہمی" کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ہجو گو شاعر ایک برہم انسان ہے اور اسکی برہمی بے لوث نہیں "بالوث" ہوتی ہے ممکن ہے کہ اس برہمی کا سبب بظاہر نظر نہ آئے اور اس کے تحت شعور کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو اس لئے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ نہیں کہ وہ ذاتی عناد وتعصب سے پاک ہو۔ بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالمگیر ہو جائے۔ اگر سودا کی ہجویں ناقص ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے احساسات کو قابو میں نہیں لاتے، ان سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور انہیں شعلۂ تخیل کی مدد سے ذاتی آلائشوں سے پاک نہیں کرتے۔ سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ ہجو گو کے لئے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے بقول آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے

لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب وہ برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے ان کے معاصرین آشنا تھے اور اس سے خائف رہتے تھے کیونکہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی دھار بے پناہ تھی۔ لوگ ان سے خائف رہتے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا وہ ایک لمحہ میں بوقلموں تصویریں مرتب کر سکتے تھے ایک سے ایک رنگین و مضحکہ خیز" قصیدہ در ہجو اسپ المسمّٰی بہ تضحیک روزگار" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار ...

ہے اسقدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے — میخیں گر اسکی تھان کی ہوویں نہ استوار ...

ہے پیر اسقدر کہ جو بتلائے اس کا سن — پہلے وہ لیکے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے — شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں — جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

دیکھا! سودا کو کیسی سوجھتی ہے اور جو سوجھتی ہے خوب سوجھتی ہے لیکن وہ اپنے اشہب تخیل کی جولانی کو روک نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے ان کی ہجویں رطب و یابس سے بھری پڑی ہیں اور اعتدال تناسب کی کمی نظر آتی ہے۔ اگر ان کی سوجھ میں بوجھ کا کچھ زیادہ دخل ہوتا تو یہ ہجویں زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ ہجویہ نظموں میں جزئیات کے حسن، ان کی بوقلمونی اور موزونیت سے حسن نظم میں افزائش ہوتی ہے۔ لیکن اگر جزئیات کی ایسی فراوانی ہو کہ نظم کا حسن صورت مستور یا ناقص ہو جائے تو یہی جزئیات عیب شمار کی جاتی ہیں۔ یہی عیب سودا کی نظموں کا ایک اہم ترین عیب ہے۔ ان نظموں میں جزئیات کی ایسی فراوانی ہے کہ گویا اشجار کی زیادتی سے جنگل نظر نہیں آتا۔ اُردو شعراء اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر نظم کی ایک صورت ہوتی ہے جو الفاظ، نقوش، خیالات سے الگ اور بلند ہوتی ہے اور کسی نظم کی کامیابی کے لئے اس حسن صورت کا وجود لازمی ہے۔ سودا اس حسن صورت سے واقف نہ تھے۔ ان کے تخیل کی سبک روی اور بلند پردازی فراوانی جزئیات کی شکل اختیار کر لیتی اور ان کی نظموں کو ضرورت سے زیادہ طویل اور "ڈھیلی" بنا دیتی ہے اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو ان کے حسن میں اضافہ ممکن تھا۔ اس فراوانی کے ساتھ سودا ضرورت سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا عام عیب ہے لیکن مبالغہ بجائے خود کوئی

بڑی شے نہیں۔ یہ شاعری اور دوسرے فنون کے لئے ضروری بھی ہے اور حسین بھی معلوم ہوسکتا ہے
ایک مغربی نقاد کہتا ہے کہ مبالغہ آرٹ کی جان ہے۔ یہ سب صحیح لیکن مبالغہ جب حد سے تجاوز
کرجاتا ہے تو پھر اہم ترین عیب بن جاتا ہے۔ مثلاً اس گھوڑے کی ہجو میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:۔

کہتا تھا کوئی ہے بزکوہی نہیں یہ سپ — کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ — کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز — فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم — اس ماجرے کو سن کیا دونو نے واں گذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر — پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار
بدشکلی اس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال — لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بے شمار

پہلے دو شعر تک مضائقہ نہ تھا۔ یہاں جائز حد تک اس گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے لیکن بقیہ اشعار میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلے شعر میں کہنے والے واقعی گھوڑے کو "بزکوہی" یا ولایت کا حمار نہیں سمجھتے۔ دوسرے شعر میں بھی کہنے والے نے محض ظرافت اچھی ظرافت سے کام لیا ہے لیکن بعد کے شعروں میں اس گھوڑے کو واقعی گدھا تصور کیا جاتا ہے اور پھر اسے خرس بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ذوق لطیف کے لئے بے لطفی کا سبب ہوتا ہے۔ پھر یہاں تکرار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ گھوڑے کو گدھے سے تشبیہ دی جاچکی ہے۔ پھر بار بار اسی تشبیہ کی تکرار مذاق صحیح پر گراں گزرتی ہے۔ تکرار بھی سودا کا ایک عام نقص ہے۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار، مختلف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے

گھوڑے کی ہجو دلچسپ ضرور ہے لیکن اپنی دلچسپی کے باوجود بھی یہ بلند پایہ ہجو یہ شاعری کی مثال نہیں۔ یہاں موضوع اہم نہیں۔ جذبات کی شدت بھی نہیں اور نہ مختلف عناصر کی شدت کے ساتھ آمیزش ہوئی ہے۔ غرض یہاں ایک بھی ایسا عنصر نہیں جو بلند پایہ شاعری کے لئے ضروری ہے یہی کمی دوسری نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ دوسری ہجوؤں میں فدوی، ضاحک، حکیم غوث، بندی فولاد خاں کوتوال، دولت مند بخیل وغیرہ کو طنز کا شکار بنایا گیا ہے۔ قصیدہ شہر آشوب اور مخمس شہر آشوب میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ زیادہ اہم امور کی طرف توجہ کی گئی ہے لیکن ان سب نظموں کو پیش نظر رکھ کر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سودا کا میدان تنگ ہے۔ وہ جملہ انسانی نقائص سماج کی بے انصافیوں، مختلف طبقوں اور پیشوں کل انسانیت کو حلقۂ ہجو میں داخل نہیں کرتے۔ سودا میں سنجیدگی و متانت موجود تھی۔ اگر وہ سنجیدگی و متانت کو اپنی سب نظموں میں برقرار

رکھتے" اگر وہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ اہم انسانی اور سماجی نقائص کا انکشاف روا رکھتے تو ان کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی۔ بہرکیف سوداؔ نے اچھی ہجویں لکھی ہیں۔ شیدی فولاد خاں کوتوال اس طرح اپنی لاچاری کا اظہار کرتا ہے۔

خلق جب دیکھ کرکے یہ بیداد کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھسے اب بجاکر ڈھول میری پگڑی کا میرے سر پر مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور دیکھو تو ٹک کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل ہے امیروں کے گھر میں چور محل
دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا ہاتھ میں ہے انہوں کے دزد حنا
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی چوری کرنے سے کون ہے خالی

یہ طنز کی ایک عمدہ مثال ہے اور یہاں طنز ظرافت کے دوش بدوش ہے:۔

دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا ہاتھ میں ہے انہوں کے دزد حنا

سوداؔ میں ظرافت کا مادہ طنز پر غالب ہے۔ غالبًا اسی ظرافت کی ہمہ گیری کی وجہ سے ان نظموں میں شدت جذبات کی کمی ہے۔ مخمس شہر آشوب کے علاوہ شاید ہی کہیں پُر اثر اور شدید جذبات کی مثالیں مل سکیں۔ سوداؔ ایسے شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے کہ وہ غضب، نفرت حقارت اور اسی قسم کے تیز و تند جذبات سے آشنا نہ تھے۔ وہ غصّہ ہوتے تھے لیکن وہ ہجو لکھکر اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے۔ یعنی غصّہ انہیں ہجو گوئی پر آمادہ کرتا لیکن جہاں انہوں نے قلم اٹھایا، جہاں ان کا تخیل مائل پرواز ہوا تو پھر غصّہ فرو ہو جاتا اور اس کے بدلے ان کے دماغ میں نئے نئے مضامین، انوکھے خیالات، دلچسپ رنگین، جاذب نظر تصویروں کی آمد سے انہیں ایک قسم کی مسرت ہوتی اور انکی نظم غضب کے بدلے اس مسرت کا اظہار ہوتی، وہ مسرت جو ایک صنّاع کو اپنے کارنامہ کی تخلیق میں ملتی ہے۔ اس وجہ سے قاری بھی کبھی غضبناک برہم نہیں ہوتا بلکہ قوت ایجاد اور اس کے حسین و دلکش نتائج کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ مثل روز روشن ہے کہ سوداؔ کی ہجویہ شاعری کے نقائص و حدود کے باوجود بھی اردو میں آج تک سوداؔ سے بہتر کوئی دوسرا ہجو گو شاعر نہیں پیدا ہوا۔

تعجب ہے کہ شعراء مابعد پر سوداؔ کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ سوداؔ کے بعد اکبرؔ کا نام آتا ہے لیکن اکبرؔ نے سوداؔ سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ وسعت اور تنوع

مضامین کے لحاظ سے اکبر کو سودا پر فضیلت حاصل ہے لیکن اس فضیلت کا ذمہ دار اکبر کا عہد ہے اس عہد کی تصویر عبدالماجد صاحب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔

" اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمالی کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے.... عقائد میں تزلزل آچکا ہے۔ ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ حرص و طمع، مکر و نفاق، خود غرضی و غداری، نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں، تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں، سفر کے لئے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لئے انگریزی شفاخانے ہیں.... عزت و حکومت کے لئے انگریزی عہدے ہیں، حصول زر کے لئے انگریزی پیشے..... ہیں زینت و آرائش کے لئے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں.... غرض جس طرف بھی رُخ پھرتا، حد نظر تک ایک غیر محدود نا متناہی پرچم، انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا....

" اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے، تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے، اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے۔ تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں... عقل و دانش کا یہ مفہوم قرار پایا کہ ہر انگریزی مصنف کے قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے..... یہ فضا تھی جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں "

یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب دو مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا۔ اس تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دلفریبی کا سکہ لوگوں پر جمارہا تھا۔ اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور حسن غیر میں نگاہیں محو تھیں اکہ پرانے تمدن، پرانے نظام کے پرستار تھے اور وہ نئے تمدن، نئے نظام کے نقائص کا انکشاف

کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ان کی طنز کے سامنے ایک نامحدود میدان نظر آیا کیونکہ انگریزی تمدن کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر محیط تھا۔ سوداؔ کے سامنے یہ نامحدود میدان نہیں تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے۔ لیکن انگریزی تمدن نے اپنا جادو شروع نہیں کیا تھا سوداؔ زیادہ سے زیادہ مٹنے والی تہذیب، لٹی ہوئی شان و شوکت، گذری ہوئی عظمت کو حسرت بھری نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف زمانہ میں انتشار کی صورت نمایاں تھی، پراگندگی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہ پراگندگی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ سوداؔ اسی پراگندگی کا اظہار اپنے مخمس "شہر آشوب" میں کرتے ہیں اور وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں سماج کی وہ طنزیہ تنقید ممکن ہی نہ تھی جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ اکبرؔ کا قدم پرانی تہذیب پر جما ہوا تھا اور وہ اس محفوظ و مثبت مقام سے نئی تہذیب کی بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں اور تن تنہا اس یلغار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد میں اپنی فطری طنز و ظرافت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی تیز اور باریک بیں نگاہیں دشمن کی کمزوریوں کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ ان کمزوریوں کی اپنی طنز و ظرافت سے قطع و برید کرتے ہیں۔

مضامین کی وسعت اور تنوع مسلم ہے لیکن اکبرؔ سوداؔ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے۔ کیونکہ ان کا آرٹ سوداؔ کے آرٹ سے بنیادی طور پر کم مرتبہ ہے۔ سوداؔ اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے نظم کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ضرورت سے زیادہ طولانی اور "ڈھیلی" ہیں پھر بھی وہ نظمیں ہیں۔ اکبرؔ اشعار، نہایت مختصر قطعے، رباعیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جس قسم کی ہجویں اکبرؔ لکھتے ہیں ان کے لئے یہ مختصر سانچے زیادہ موزوں ہیں۔ اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی جس قسم کے سانچے اکبرؔ کی نظموں میں ملتے ہیں وہ سانچوں کی حثیت سے نسبتاً کم مرتبہ ہیں۔ ان سانچوں میں وسعت پیچیدگی ممکن نہ تھی۔ ان کی تنگ دامانی ان کا اصل نقص ہے۔ اکبرؔ کا آرٹ مختصر تصویریں یا نقشے بنانے کا ہے اور یہ مختصر تصویریں حسین بھی ہیں اور مؤثر بھی اور اپنے مقصد میں کامیاب۔ ملاحظہ ہو!

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور  
بھینس کو کون پنھا دیجئے عاشق ہو جائیں

---

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے  
صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جناب قبلہ من  
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس  
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی — چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

یہ ہے اکبر کا آرٹ ۔ مختصر پیمانہ میں وہ ایسی ہجویں لکھتے ہیں جو تیر بہدف ہو جاتی ہیں ۔ وہ ایسے ایسے شعر تراشتے ہیں جو نشتر کی طرح دلوں میں چبھتے ہیں ۔ وہ ان شعروں کے تراشنے میں کاوش سے مصرف لیتے ہیں اور جانفشانی کے ساتھ ان کی جلا ، تیزی ، کاٹ کو حد کمال تک پہنچا دیتے ہیں ۔ اکثر یہ اشعار یا مختصر قطعے دماغ میں ہیجان برپا کرتے ہیں اور ایک وسیع منظر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں ، اور قاری اس منظر کے پھیلتے ہوئے دامن میں گم ہو جاتا ہے :۔

تھے معزز شخص لیکن انکی لائف کیا کہوں — گفتنی درج گزٹ ، باقی جو ہے نا گفتنی
بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا
بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں — لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

یہ مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئی ہیں ۔ ان شعروں میں محض ایک مختصر خیال کا اظہار نہیں ۔ ہر شعر گویا ایک تنگ رستہ ہے جس سے گزر کر ہم کسی وسیع میدان میں قدم رکھتے ہیں ۔ جو بات ان شعروں میں کہی گئی ہے وہ بجائے خود زیادہ اہم نہیں ۔ اصل اہمیت ان باتوں کی ہیں جو کہنے میں نہیں آتی ہیں لیکن جنھیں قاری اپنے ذہن رسا کی مدد سے سمجھ سکتا ہے ۔ یہ آرٹ سودا کی نظموں میں نہیں ملتا ۔ سودا سب باتیں تفصیل کے ساتھ کہہ ڈالتے ہیں ۔ اکبر کچھ کہتے ہیں اور باقی خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ اس کچھ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور کہیں بھی خیالات مبہم و غیر متعین نظر نہیں آتے ۔ بہر کیف ، سودا کی نظموں میں یہ آرٹ نہیں ملتا اور نہ سودا کو اس آرٹ کی ضرورت تھی ۔ جن سانچوں کا استعمال سودا کرتے تھے وہ تنگ داماں نہ تھے ۔ ان میں ہر قسم کی وسعت ، پیچیدگی تخیل کی جولانی کی گنجائش تھی ۔ سودا کے تخیل کو وسعت کی ضرورت تھی تنگی میں اس کا دم نا لبا گھٹنے لگتا ۔ اکبر کا تخیل تنگی میں خوش ہے ۔ اسے کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں ہوتی ۔ مطلب یہ نہیں کہ سودا کی تصویریں ہمیشہ مفصل اور وسیع پیمانہ پر ہوتی ہیں ۔ مختصر اور موثر تصویریں یہاں بھی ملتی ہیں یہاں بھی دو مصرعوں اور اکثر ایک مصرع میں ایک مرقع پیش کر دیا جاتا ہے ایسا مرقع جو زندہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے :۔

ضعیفی نے کی اسکی فربہی گم — گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دُم
کھانا آوے تو اس طرح ٹوٹے — جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے
بسکہ مطبخ میں سردی رہتی ہے — ناک باورچیوں کی بہتی ہے

وہ جو سودا بکے ہے لایعنی      آپ کرتا ہے وزد ئی معنی

اصل یہ ہے کہ سودا مفصل یا مختصر اور ہمیشہ زندہ مرقعے پیش کرتے ہیں۔ اکبر کسی ظرافت آمیز خیال یا کسی تیز طنز کا بیان کرتے ہیں۔ سودا میں ڈرامہ نگاری کی قوت ہے۔ اس لئے جو تصویریں وہ مرتب کرتے ہیں وہ جیتی جاگتی ہماری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ اکبر محض انوکھے خیال، ہنسنے اور ہنسا دینے والے نکتے، تیز و تند طعن و طنز سے ہمارے دماغ کو محظوظ کرتے ہیں اور اُسے متحرک کرتے ہیں۔ یعنی اکبر میں نکتہ سنجی (Humour) ہے۔ یہ مادہ سودا میں بھی موجود ہے لیکن اس حد تک نہیں۔ لیکن ظرافت میں سودا اکبر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

اکبر اگر مفصل نظمیں کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے تو ان کی ہجویں شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ اگر وہ اپنے خیالات کا تسلسل کے ساتھ اظہار کرتے، اگر وہ مختلف نقوش کو مجتمع کر کے ایک نقش کامل تیار کرتے، اگر ان کی نظموں میں خیالات کی باریکی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ ہوتی، اگر وہ مختلف جذبات، شدید جذبات پر قابو رکھتے تو ریزہ خیالی کا الزام جو ان نظموں پر عاید ہوتا ہے وہ عاید نہ ہوتا۔ بہرکیف، اکبر کے ادبی ماحول کا لحاظ رکھکر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ سیاسی اسباب کی وجہ سے جو قابل ہجو صورتیں پیدا ہو گئی تھیں انہیں وہ چُن چُن کر طنز کے خنجر سے قطع کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہر چیز کو دیکھ لیتی ہیں معمولی باتوں کو بھی وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی ہجو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ جہاں وہ مغربیت کا اثر دیکھتے ہیں، جہاں انہیں مادیت کا گمراہ کن اثر نظر آتا ہے تو وہ فوراً آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں۔ "بے تمیزی، کورانہ تقلید، بدمذاقی اور تنگ نظری" انہیں چیزوں کے وہ مخالف تھے اور انہیں سے وہ جنگ آزما تھے۔ ان کے عہد کا مرقع ان کی ہجوؤں کو جمع کر کے مرتب کیا جاسکتا ہے اور یہ ان ہجوؤں کی تاریخی اہمیت ہے اور اسی مرقع کے ساتھ ساتھ اس عہد پر بے مثل انفرادی تنقید بھی ملتی ہے۔

اکبر کے رنگ نے قبول عام کی سند حاصل کی۔ انھیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید سودا کی نظموں کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ رشید احمد صاحب لکھتے ہیں: "اکبر اپنے رنگ میں منفرد رہے ان کے رنگ میں بعض لوگوں نے لکھنے کی کوشش کی، لیکن ... کامیاب نہ ہوئے" جن لوگوں نے اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ان میں سے ایک اقبال بھی ہیں۔ "بانگ درا" کے اخیر میں جو ظریفانہ اشعار ہیں ان میں صاف اکبر کا رنگ جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں      مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے      واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہوگئے
وعظ میں فرما دیا کل آپنے یہ صاف صاف — پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہوگئے

صاف ظاہر ہے کہ ان شعروں میں اقبال نے اکبر کا تتبع کیا ہے، سطحی نظر غالباً ان میں اور اکبر کے شعروں میں تمیز بھی نہیں کرسکتی۔ خیالات، طرزِ بیان، لب ولہجہ، اختصار، غرض سبھی خصوصیات وہی ہیں جو اکبر کی ہجووں میں ملتی ہیں۔ لیکن دوسرے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رنگ اقبال کے لئے فطری نہ تھا اور وہ طبیعت پر زور دیکر اس قسم کے اشعار موزوں کرتے ہیں۔ اقبال میں وہ شوخی، زندہ دلی شگفتہ مزاجی نہ تھی جو روزِ ازل سے اکبر کو فطرت سے ودیعت کی گئی تھی۔ ان کا دل کنول کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ ومتین واقع ہوئے تھے۔ اس لئے جب وہ ہنسنے ہنسانے پر اتر آتے ہیں تو ان کی ہنسی مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ان کی ظرافت میں آورد کی جھلک ہوتی ہے:۔

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے — مہذب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا — یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گذر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو — کرائے پر منگا لوں گا کوئی افغاں سرحد سے

یہاں وہ سبکی، وہ تیزی نہیں جو اکبر کے شعروں میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش طبعی پر آمادہ ہے۔ غالباً اقبال نے خود محسوس کیا کہ اس رنگ میں وہ نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے اس لئے انہوں نے اس راہ کو جلد ترک کردیا۔ لیکن ان کی دوسری نظموں میں جو قصداً ظریفانہ انداز میں نہیں لکھی گئی ہیں، وہ نظمیں جن میں وہ سیاسی اور مذہبی امور کے متعلق متانت وسنجیدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، ان میں وہ عموماً قصداً یا بلا قصد طنز سے مصرف لیتے ہیں۔ ان نظموں میں وہ اکبر یا کسی دوسرے شاعر کی تقلید نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنا ایک علحدہ رنگ قائم کرلیا ہے۔ "جمعیت اقوام" "ایک بحری قزاق اور سکندر" "مسولینی" "اجتہاد" "جہاد" "پنجابی مسلمان"۔ یہ چند مثالیں ہیں جو "ضربِ کلیم" میں ملتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھکر ہم ہنستے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ متبسم ہوتے ہیں۔ اکثر تبسم کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں طنز خالص طنز ہے اور یہ طنز اقبال کی سنجیدگی ومتانت کی کامیاب ترجمان ہے۔ "نفسیاتِ غلامی"

[illegible]

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
"بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ"
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند — تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ظاہر ہے یہ طرز زیادہ رنگین اور متنوع نہیں لیکن یہاں کسی کی تقلید نہیں۔ یہ رنگ انفرادی ہے اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر شعرا سیاست، مذہب اور مذہبی پیشوا، مروجہ اخلاق کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ یہ سب براہ راست یا بالواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال سے متاثر ہوئے ہیں لیکن جوش کے علاوہ کوئی ذکر کا مستحق نہیں۔ جوش میں ایک حد تک طنز و ظرافت کا مادہ موجود ہے۔ "مولوی" "خانقاہ" "شیخ" میں یہ مذہب کی بعض صورتوں کی ہجو کرتے ہیں۔ اس طرح اکثر سیاست کے میدان میں بھی جا نکلتے ہیں لیکن جوش کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو (اور یہ خیالات نئے، انفرادی نہیں) بہت اہم سمجھتے ہیں اس لئے وہ ان سے اپنی شخصیت کو علحدہ نہیں کر سکتے۔ یعنی ان کے خیالات ذاتی رہتے ہیں عالمگیری اختیار نہیں کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

الاماں! خانقاہ کی دنیا — معصیت کی، گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفان خدا — کام لیتے ہیں سکّہ بازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر بُن مو ہے ایک دست سوال
کون بہتر ہے ایزد باری! — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

یہ "خانقاہ کی دنیا" کی ہجو نہیں، اپنی عذرداری ہے۔ قاری شاید وقتی طور پر متاثر تو ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ جوش مسلسل اشعار یا نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ اکبر کی طرح مختصر قطعوں یا دو تین شعروں پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کی نظموں میں تکرار و مبالغہ کی وہ زیادتی نہیں جو سودا کا مخصوص عیب ہے۔ یہ سب سہی لیکن جوش کی ہجویہ نظموں میں اس دلچسپی کی کمی ہے جو سودا اور اکبر کی نظموں کی خصوصیت ہے اور دلچسپی کی کمی یا فقدان آرٹ میں سب سے زیادہ اہم عیب شمار کیا جاتا ہے۔

اس مختصر سی تنقید سے ظاہر ہو گیا کہ اردو میں صرف اکبر اور سودا ہجو نہ

شاعری کے میدان میں مستقل عزم کے ساتھ گام زن ہوئے اور اس میدان میں آگے بڑھے۔ لیکن یہ دونوں بھی ایسے کارنامے نہیں پیش کر سکے جن کا مغرب کے اعلےٰ ہجویہّ کارناموں کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ اس میدان میں سوداؔ اور اکبرؔ کی کاوشوں کے باوجود بھی لامحدود گنجائشیں باقی ہیں اور اگر اردو شعراء اس طرف توجہ کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں، لیکن محض توجہ کافی نہیں۔ ہجو ایک فن، ایک اہم فن ہے۔ ہجو یہ نظم ایک صنف شاعری، ایک دلچسپ اور اہم صنف شاعری ہے اور اس صنف میں بھی بلند پایہ شاعری ممکن ہے۔ اگر شعراء اس فن کے امکانات و مقاصد کو سمجھیں، اسے فن کی حیثیت سے برتیں، اور جو خصوصیتیں ایک ہجو گو شاعر کے لئے ضروری ہیں انہیں بہم پہنچائیں تو ترقی ممکن ہے ورنہ نہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس سے اس صنف شاعری کی ترقی کی امیدیں وابستہ ہوں۔

کلیم الدّین احمد

# ہوتا تو کیا ہوتا

(عمر خیام)

[ عنوان بالا "ہوتا تو کیا ہوتا" کے سلسلہ میں آل انڈیا ریڈیو دھلی سے جو تقریریں حال میں نشر ہوئیں یا ہونے والی ہیں ان میں کی یہ پہلی تقریر خیام پر ۸۔ جنوری کو نشر کیجا چکی ہے، اور ضروری اضافہ و اصلاح کے بعد اب شائع کیجاتی ہے۔ مدیر ]

اگر بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے تو بگڑے ریاضی داں کو فلسفی کہہ دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ بگڑے ریاضی داں کو فلسفی کسی نے نہیں کہا ہے۔ لیکن کیا معلوم یہی بات کوئی اور کہدیتا اس نے یوں ہی کیوں نہ پہلے کہدوں۔ اس طرح کی بات کوئی کہدیتا ہے تو کوئی مار بھی بیٹھتا ہے لیکن کوئی ہرج نہیں۔ لڑائی کے زمانہ میں شرفا اسکی پروا نہیں کرتے۔ پھر انصاف تو کیجئے قافیہ اور سجع بولتا ہوا ہو تو شاعر یا لیڈر اپنے آپے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ اب اتنی سی بات اور رہ گئی ہے کہ بگڑا مرثیہ گو یا بگڑا فلسفی کیا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا جواب دیا جائے تو سوالات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا اس لئے اسکو کسی فلسفی یا مرثیہ گوہی پر چھوڑیئے۔ اس طرح کی باتوں سے یہی دونوں خوب نپٹتے ہیں۔

اس کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ اب تک جتنی بات کہی گئی ہے وہ بطور تمہید کے تھی تمہید سے نفس مضمون تک پہنچنے کا راستہ ہموار اور فاصلہ کم رہجاتا ہے۔ یا فاصلہ طویل ہو جائے تو مضائقہ نہیں سفر آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ فاصلہ اب بھی زیادہ ہے۔ اسلئے ایک دوسری تمہید بشکل ایک حادثہ کے گوش گذار کرتا ہوں وہ یہہ کہ اس سال کرسمس میں ہماری یونیورسٹی میں دو واقعات آل انڈیا قسم کے ہوئے یعنی یکے بعد دیگرے آل انڈیا فلاسفیکل کانگرس اور آل انڈیا ہسٹری کانفرنس کے جلسے ہوئے۔ کرسمس میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس ملک کی فضا آل انڈیا ہو جاتی ہے۔ آل انڈیا ایک قومی تخلص ہے جو ہر بحر میں موزوں ہو جاتا ہے بہت سے شاعر اپنے تخلص کی رعایت سے شاعری کرتے ہیں۔ لیڈر اسی تخلص سے اس زمانہ میں شاعری کرتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ آل انڈیا ایک طرح کا مشہور و مجرب پتیرا ہے جس پر ہر علم صحت حمایہ یا سرشتہ الا قادر ہوتا ہے اور جو ہر طرح کی جنگ یا شکست کے لئے موزوں ہی نہیں بلکہ لازمی ہے عجیب اتفاق کہ عمر خیام اور باتوں کے علاوہ زبردست ریاضی داں اور فلسفی بھی تھا۔

لیکن ابھی تمہید باقی ہے اس لئے آپ تھوڑے سے اور صبر سے کام لیں میں بھی شرافت کا رشتہ ہاتھ سے ندوں گا۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ تمام ہندوستان کے بیشتر جید فلسفی اور ریاضی داں علی گڈھ میں جمع ہوئے تھے (اور یہاں بعض لوگ ریاضی داں کو ریاضی دآن کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں ممکن ہے اس سے علمیت سے زیادہ ظرفیت پر زور دینا مقصود ہو) اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہر فن کا کامل اور ماہر طبعاً فلسفی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ریاضی ہو یا فلسفہ سائنس یا شاعری ان کے پہنچے ہوئے لوگ بالآخر فلسفی ہو جاتے ہیں۔ "خبرش باز نہ آمد" کا حادثہ یہیں سے شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتا ہے!

چنانچہ ان فلسفیوں کو دور سے دیکھنے قریب سے بھانپنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا مجھے موقع ملا۔ اگر پہلے سے نہ معلوم ہوتا کہ سابقہ فلسفیوں سے ہے تو میں ان کو پہچان نہ سکتا اس لئے کہ وہ بالکل ہمیں آپ جیسے تھے سوا اس کے کہ یا تو کھاتے وقت بات نہ کرتے یا بات کرتے وقت کھانے لگتے۔ مخاطب کو اکثر بھول جاتے اور کوئی نہ ہوتا تو اپنے آپ کو۔ کھو بیٹھتے اچھے شعرا کے بارہ میں فلسفیوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے سو سال پہلے پیدا ہو جاتے ہیں بڑے شعرا فلسفیوں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ فلسفی بھی دراصل شعرا ہی کی ایک قسم ہے۔ البتہ وہ پیدا نہیں ہوتا تہ نشیں رہتا ہے!

اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلسفیوں کے ساتھ لینے سے مجھ پر کیا اثر ہوا ہے اور عمر خیام کا حشر میرے ہاتھوں کیا ہوگا۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ آج عمر خیام ہوتا تو کیا ہوتا۔ بغیر سوچے سمجھے۔ صحیح جواب تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ شاعر بھی تھا اور فلسفی بھی اس لئے یا تو کسی مشاعرہ میں شرکت کرنی پڑتی اور معاوضہ پر جھگڑنا پڑتا یا اس کو فلاسفیکل کانگرس و متھیمٹیکل کانفرنس میں داخل کیا جاتا اور مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ بہت ممکن ہے اسے ریڈیو پر تقریر کرنے کی دعوت دیجاتی اور مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کا موقع ملتا جو اسوقت مجھ پر عائد ہے۔ اسطور پر آپ کو اس فکر سے بھی نجات ہو جاتی کہ کس بات پر ہنسیں اور بیوقوف نہ بنیں اور کس بات پر غور کریں اور فلسفی نہ کہلائیں

عمر خیام کا عام تصور یہہ ہے کہ رند لاابالی تھا، شب و روز مست و سرشار پڑا رہتا تھا، ادھر اُدھر کچھ پیالے، صراحیاں، اور شراب کے ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں اور وہ اسی عالم میں جو کچھ بک جاتا ہے وہ رباعی بنجاتی ہے، خدا کا منکر تھا، دنیا کی بے ثباتی کا جتنا دلنشیں نقشہ کھینچتا تھا اس سے زیادہ کھانے پینے اور عیش کرنے کی ترغیب دیتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ یہہ بھی ظاہر ہے کہ ہم سب مغربی مصنفین بالخصوص فٹز جیرلڈ کے واسطہ سے خیام سے آشنا ہوئے اور خیام کو جس رنگ و آہنگ یعنی شراب

ساقی، کتاب و رباب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہی ہمارے ذہن و دماغ میں رچا ہوا ہے۔
لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ طبیب، ادیب، شاعر، ریاضی داں، قاری صوفی ہونے کے علاوہ مسلمان تھا اور خدا رسول کا قائل، وہ نماز پڑھتا تھا، فریضۂ حج بھی بجالایا تھا مغفرت الٰہی کی دعا بھی اس نے بار بار مانگی ہے، جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کے بارے میں بھی اس کے وہی خیالات تھے جو دوسرے حکمائے اسلام کے ہیں اسکی وفات کے بارہ میں ایک فاضل نے بتایا ہے۔

"ابو علی سینا کی کتاب الٰہیات شفا کا مطالعہ کر رہا تھا، جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ بیچ میں خلال رکھکر اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلاکر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں نہ کچھ کھایا نہ پیا آخر عشاء کی نماز پڑھکر سجدہ کیا اور سجدے میں بار بار کہتا تھا:
خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے اپنی امکان بھر تجھکو پہچانا، تو مجھے بخشدے کہ میری یہی پہچان تیرے دربار میں میرا وسیلہ ہے — یہہ کہکر یہ طوطیٔ خوشنوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا —"

خیام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرسری طور پر اس کے بعض بنیادی تصورات اور معتقدات بھی آپ کے سامنے پیش کردئے جائیں،

خیام بالکل وہ نہ تھا جو عام طور پر وہ مشہور ہے، وہ متکلم حکیم بھی نہ تھا اور نہ فلسفی یا طبعی حکیم، اگر تھا تو صوفی حکیم، اسی طریقہ کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا، یہاں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ تصوف کی دو قسمیں ہیں ایک مذہبی تصوف، دوسرا فلسفیانہ تصوف، مذہبی تصوف سے مراد مذہبی روح یعنی اخلاص و محبت، زہد و تقوٰی، عبادت وغیرہ ہے، اس کے پیرو کوئی خاص عقیدہ نہ رکھتے تھے فلسفہ سے نا آشنا تھے۔ ان کا مشغلۂ زندگی فرائض مذہبی، اخلاص عمل اور خلق کی خدمت تھا، دوسری قسم فلسفیانہ تصوف کی اس سے مراد الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کرکے انکی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، پہلے تصوف کا مرکز خیال نبوت ہے، یعنی وہ شخصیت کاملہ جو سنت عادلہ لیکر دنیا کے امن و نظام کو قائم کرتی ہے اور اہل دنیا کو ملوثات دنیا سے پاک کرکے حق تعالےٰ کیطرف دعوت دیتی ہے اور وہ روحانی قوتوں سے تائید پاتی ہے۔

دوسری طرف فلسفیانہ تصوف ہے جس کا مرکز حکمت ہے جسمیں فلاسفہ اور حکما کے اقوال کی پیروی کیجاتی ہے، خیام کا تصوف مذہبی نہیں بلکہ حکیمانہ تھا۔ اسکے سامنے انبیا کے اقوال نہیں بلکہ حکما کے حالات تھے مختصر یہہ کہ خیام کا مشرب و مسلک فلسفیانہ تصوف تھا

اور وہ خود ایک صوفی حکیم تھا، اس کا عقیدہ علتِ اولیٰ (First Cause) یا خدا پر تھا جس کو وہ خیر محض سمجھتا تھا، وہ کمالات انسانی کی انتہا معرفت کو سمجھتا تھا، جسکا اقرار اس نے مرتے وقت تک کیا، معرفت کا راستہ خیام کے نزدیک ریاضت ہے، خیام جبر کا قائل ہے، اس کا جبر مذہبی استدلال پر نہیں بلکہ فلسفیانہ دلائل پر مبنی ہے، خیام جس زہد و پاکیزگی کی دعوت دیتا ہے وہ بھی مذہبی نہیں بلکہ یونان و اسکندریہ کے زاہد خشک فلاسفروں کی تعلیم کے مطابق ہے وہ گناہ یا رذائل سے پرہیز جنت کے حصول یا خدا کے لئے نہیں بلکہ عفت نفس کے لئے کرتا ہے جس کی تکمیل علوم عالیہ اور اخلاق فاضلہ کے حصول سے ہوتی ہے، اسی طرف وہ ایک رباعی میں اشارہ کرتا ہے

روزے کہ جزائے ہر صفت خواہد بود        قدرِ تو بقدر معرفت خواہد بود
درحسن صفت کوش کہ در روز جزا        حشر تو بصورت صفت خواہد بود

خیام پر شراب خواری کی تہمت بھی عام ہے اور غالباً یہ اسی تہمت کا تصرف ہے کہ خیام عام نظروں میں ملحد و لذت پرست قرار دیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیام کے سخت سے سخت دشمن نے بھی اس کو شراب خواری سے ملوث نہیں کیا ہے، صرف رباعیات کی بنا پر جن میں بہت سی مشکوک الاصل ہیں، خیام کو شراب خوار نہیں قرار دیا جا سکتا، تحقیقات سے پتہ لگایا گیا ہے کہ جن رباعیوں میں شراب سب سے زیادہ تیز و تند ہے وہ تمامتر مشکوک ہیں یعنی خیام ان کا مصنف نہیں۔

بہر حال خیام کی شراب کیا ہے اور کیسی ہے ایک طویل بحث کی محتاج ہے جس کا یہ موقع نہیں، البتہ ایک جگہ خیام نے اپنے اس مسلک کا اظہار بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے یعنی

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است        نز بہر نشاط و ترک دین و ادب است
خواہم کہ بے زخویشتن باز رہم        می خوردن و مست بودنم زاں سبب است

ممکن ہے یہاں پہنچکر آپ کا ذہن غالب کے مشہور شعر کیطرف منتقل ہو،

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو        اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ آج موجود ہوتا تو کیا کرتا یا کیا کہتا۔ آیئے تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیں کہ کسی اخبار کے نمائندہ نے خیام سے انٹرویو کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے۔

سوال — آپ کی رباعیات بہت مشہور ہیں، اس کا کیا سبب ہے کہ آپ نے ارشادات عالیہ کے لئے رباعی کا وسیلہ اختیار کیا؟

خیام ــ بات یہہ ہے کہ جس طرح آجکل یا اب سے کچھ عرصہ پہلے آپ کے ہاں غزل گوئی شاعری کی زبان قرار پاگئی تھی اور بڑی حد تک اب بھی ہے اسی طرح ہمارے زمانہ میں رباعی شاعری کی زبان بن گئی تھی۔ رباعی کو ترانہ بھی کہتے ہیں۔ بچوں اور عورتوں کو یہہ لحن بہت پسند تھا۔ آپ کو غزل میں یہہ سہولت ہے کہ ایک ہی شعر میں ایک مستقل خیال نظم ہو جاتا ہے اور ہر شعر میں آپ مختلف جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں، اسی طرح ہر طرح کے جذبات یا مسائل ہمارے زمانہ میں رباعی میں ادا ہو جاتے تھو دیگر اصنافِ سخن طبع آزمائی کرنے کے لئے فرصت اور اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لوگ متحمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر بات جس آسانی اور لطف سے غزلگو کہہ جاتے ہیں ہملوگ رباعی کہتے تھے، گو رباعی کہنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ غزل، ہمارے زمانہ میں رباعی کو وہی قبول، عام نصیب تھا جو اس زمانہ میں غزل کو ہے۔ فرق صرف یہہ ہے کہ غزلگوئی کی جیسی مٹی اُردو میں تباہ ہوئی ہے یا خود غزل نے جیسی مٹی آپ کی تباہ کی ہے ایسے رباعی کا دامن آلودہ نہیں ہے۔

یہاں نامہ نگار نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا کیوں پیر و مرشد آپ کو میخانہ شراب ساقی، کوزہ اور اس قسم کے لوازم پیمانہ و میگساری سے اسدرجہ شغف کیوں ہے کہ آپ ان کے بغیر آگے بڑھتے ہی نہیں خیام نے جواب دیا۔ آپنے صحیح فرمایا، لیکن آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میں ان سے پینے کا نہیں مطالعہ کا کام لیتا ہوں، میخانہ میرے نزدیک دنیا کا خلاصہ ہے میں دنیا کے ہر نشیب و فراز کی تعبیر میخانہ سے کرتا ہوں آپنے اپنے ایک عارف شاعر کا شعر سنا ہوگا،

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا میخانہ    اسی سے رند راز گنبد مینا سمجھتے ہیں

اصل یہہ ہے کہ شاعر کی شراب، شرابی کی شراب نہیں ہوتی، وہ شاعر کی دعائے مغفرت بھی ہے اور نعرۂ تکبیر بھی، شراب کا کمزور پہلو یہہ ہے کہ اس سے آدمی فشار ذہنی کا خوگر نہیں ہونے پاتا اور بجائے اس لذت کے جو سعی عمل کا نتیجہ ہو وہ سستے اور عارضی سکر و سکون کا دلدادہ بنجاتا ہے شراب انسان کو ریاضت سے باز رکھتی ہے حالانکہ ریاضت ہی وہ چیز ہے جو خیال و تجربہ دونوں کو متوازی و متوازن رکھتی ہے، جو جذبات کو ہموار اور ارادہ کو استوار کرتی ہے، جو انسان کو مستند و محکم اور اسکی فتوحات کو لازوال بناتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا آج کل کی جدید ترین اُردو شاعری میں لذتیت کا یہی سستا فرمایہ اور عارضی سکر و سکون پایا جاتا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسان کو زندگی اس لئے نہیں دیگئی ہے کہ وہ اسکو سازگار نہ پائے تو اپنے کو کھودے۔ زندگی کو انسان نہیں بخشا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے آدمی کو الٹتی پلٹتی رہے بلکہ انسان کو زندگی دیگئی ہے کہ وہ اسے موڑے بنائے، محکم و آراستہ کرے اور یہہ باتیں بغیر ریاضت اور اور احتساب نفس کے ناممکن ہیں۔ اور یہی چیز

آجکل کی جدید اُردو شعرا یا شاعری میں جسنے ابھی تجربہ کی منزل پوری نہیں کی ہے مفقود ہے۔
نامہ نگار نے سوال کیا۔ موجودہ اُردو شاعری و ادب کے ٹکنک (وسیلۂ پرداخت) سمبالزم (علامات) اور اس کے مقاصد و مستقبل کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں؟
خیام۔ حضرت پہلی بات اور اصلی بات تو یہہ ہے کہ زندگی صرف شباب یا بیدلی کا نام نہیں ہے۔ آپکے جدید شعرا، زندگی کی تلخیوں یا برہنگیوں کو پیش ہی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی کجروی یا کمزوری کو معاف کر دیا جائے وہ علاج کے متلاشی نہیں ہیں، بد پرہیزی کرنا چاہتے ہیں۔ اچھا شاعر زندگی کی عکاسی نہیں کرتا وہ زندگی کی رہبری کرتا ہے۔ آرٹ اظہار یا اعلان کے مخصوص انداز کو کہتے ہیں لیکن یہہ شعرا، اس مخصوص انداز کا جواز نفس کے احتساب میں نہیں بلکہ نفس کے مطالبات میں ڈھونڈھنا پسند کرتے ہیں۔ آپکے اس دور میں اختیار کو جو آزادی دیگئی ہے اسنے احتراز کی گرفت کو بہت زیادہ ڈھیلا کر دیا ہے اور یہی سبب ہے کہ آج جو چیز ہم اختیار کرتے ہیں دوسرے ہی دن اسے ناقص یا نا مکمل پاکر ترک کر دیتے ہیں۔ آپ کے ہاں شعر و ادب کے اسالیب جو جلد جلد بدلتے رہتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے۔

اُردو شاعری کا موجودہ ٹکنک سے انحراف کرنا کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے لیکن محض ٹکنک کا نیا ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں تاوقتیکہ اس میں اسکی صلاحیت نہ ہو کہ وہ اچھے شعر کہنے اور اچھے خیالات کو اچھے طور پر ڈھالنے میں معین ہو اگر موجودہ اصناف سخن میں بعض نئے اصناف کا اضافہ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس صنف میں بعض وہ خامیاں ہیں جو اُردو غزلوں میں بھی ہیں مثلاً باوجود اس کے سخت مجازی ہونے کے اس میں خیال بندی کا وہ شدید التزام ملتا ہے جسنے اُردو کے بعض نامور شعرا کو بدنام کر دیا ہے پھر یہہ بھی ہے کہ بعض سخت بندشوں کی وجہ سے غزل میں جو تعقید لفظی یا معنوی پیدا ہو جاتی تھی اس کو شاعری کے جدید اسلوب میں نہ ہونا چاہئے کیونکہ غزل کی بندشوں اور پابندیوں سے جدید اُردو شاعری اپنے آپ کو آزاد کر چکی ہے اس لیے اس میں وہ نقائص بھی نہ ملنے چاہئیں جو اُردو شاعری کے قدیم اسکول میں ہیں۔

اس کے علاوہ سمبالزم جو مفہوم کی دلنشینی، جامعیت اور وضاحت میں معین ہوتی ہے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ اسکی حیثیت سکّہ رائج الوقت کی ہے۔ جدید شاعری میں سمبالزم بہت ہی گنجلک اور پراگندہ ہے۔ اس پر وہ ٹھپہ نہیں جس سے اسکی قدر و قیمت ہی نہیں بلکہ اس کا مفہوم بھی متیقن ہو سکے۔ پھر سمبالزم کو ایسے مقام یا ایسے واقعہ سے اخذ کرنا چاہئے جو بجائے خود واضح ہوں اور اپنی وضاحت خود کرتے ہوں نہ یہہ کہ جس کھوٹے کھرے کو چاہا چلن میں لائے اس سے

بازار میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ صراف کی ساکھ گھٹتی ہے اور مال جہاں کا تہاں رہجاتا ہے
اس شاعری کا مقصد میں پہلے بتا آیا ہوں۔ رہا اس کا مستقبل اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا
سوا اس کے کہ جب تک اس فن کا کوئی حالی نہ پیدا ہوگا اس میں کسی اقبال کے پیدا ہونیکا
امکان نہیں اور میرے نزدیک دنیا کا کوئی ادب، ادب کہے جانے کے قابل نہیں تاوقتیکہ
اس میں حالی اور اقبال نہ جنم پا چکے ہوں۔

نامہ نگار نے سوال کیا، جناب والا زیر بحث شاعری کے پیرو جدید طرز کی نظموں کو غزل کا
بدل قرار نہیں دیتے اور نہ غزل کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ اس لئے غزل کی روشنی میں ان نظموں کا
جائزہ لینا درست نہیں۔

عمر خیام :۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ میں نے یہ باتیں برسبیل تذکرہ کہدیں لیکن غزل کی جو گرفت اسوقت
خاص و عام کی تخیل پر ہے اس کو ڈھیلا کرنے کے لئے ظاہر آپ کو ایک ایسی صنف سخن بروئے کار
لانی پڑے گی جو غزل کا بدل ہوسکے

نامہ نگار :۔ معاف فرمائیے گا قطع کلام ہوتا ہے۔ آخر اسکی ضرورت کیا ہے۔ غزل اپنی جگہ پر
اور یہ اپنی جگہ پر۔ اس میں کیا قباحت ہے ؟

عمر خیام : کوئی قباحت نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جو چیز پیش کیجارہی ہے اسکی حیثیت کیا ہے
یا آپ اسکو کیا حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ چیز محض ضمنی اور تفریحی ہے تو پھر کوئی
بحث نہیں اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ قوم کا مذاق و مزاج بدل دیں یا قوم کا مزاج و مذاق
کسی نئی چیز کا طلب گار ہے تو پھر آپ کو اس بات کا پتہ لگانا چاہئے کہ وہ کون سے عناصر
ہیں جن سے قوم کا مزاج شعری بنا ہے۔ ہر قوم کا مزاج شعری جداگانہ ہوتا ہے اور اسی
مزاج شعری کے مطابق ہر قوم مخصوص صنف سخن کا اپنے لئے انتخاب کرتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ
غزل آپ کی افتاد شعری کی ترجمانی شروع سے آخر تک کرتی رہی ہے اور چونکہ اس میں بہت
کافی وسعت رنگا رنگی لچک اور لطافت ہے اس لئے زمانہ کے رجحانات کے مطابق
اس کے اسالیب بدلتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ بغیر اسکی آمیزش
کے آپ کا کوئی اسلوب سخن وہ مزہ نہیں دیتا جس کے آپ خواہشمند رہتے ہیں۔

نامہ نگار نے اکتا کر سوال کیا۔ اگر سوء ادب نہ ہو تو یہہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ یہہ
جنگ عظیم کیا ہے۔ کیوں ہے اور کیا انجام ہونے والا ہے

نامہ نگار کو جواب دیا۔ ماشاء اللہ آپنے تو اظہار مطالب کے لئے رباعی سے بھی

زیادہ مختصر پیمانہ وضع کر لیا۔ لڑائی کے زمانہ میں لڑائی پر رائے زنی نہیں کرتے بلکہ لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ جنگ عظیم کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی کارکردگی کا امتحان ہے، یعنی انسان اپنی ترقیوں کے فشار کا خود متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ کیوں ہوا اسلئے کہ ہونا چاہیے تھا، زندگی ہمیشہ اپنی قدروں کو تولتی پرکھتی رہتی ہے۔ کیا انجام ہونیوالا ہے اس کا حال اس سے پوچھیے جو اس کے انجام سے دلچسپی رکھتا ہو۔ میں تو صف جنگ میں کھڑا ہو کر سوال نہیں کرتا حملہ کرتا ہوں یا حملہ سہتا ہوں۔ انھیں دونوں کا حاصل اپنا انجام نہیں، انعام سمجھتا ہوں۔ سنا ہے کہ نہیں ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند!

خیام کے تیور اسوقت کچھ ایسے نظر آئے کہ نامہ نگار معمولی مراسم اخلاق بھی بجا نہ لا سکا اور اپنی جان لے کر بھاگا۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ میں بھی آپ سے کچھ اسی طرح رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

[اس تقریر میں خیام کے معتقدات خصوصی علامہ سید سلیمان ندوی صاحب بالقابہ کی عالمانہ تصنیف خیام سے ماخوذ و منقول ہیں]

رشید احمد صدیقی

# فٹ پاتھ

شہر میں سڑکوں کی دونوں طرف کی دنیا ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ کہیں بھرے بازار کے درمیان
سڑک یوں نرمی سے بل کھاتی ہوئی گذرتی ہے جیسے مشتاقوں کے ہجوم میں حسن سر محفل۔ آمد و رفت کی کثرت سے
کھوے سے کھوا چھلتے ہیں۔ کہیں شاندار رہائشی محلوں سے اس کا گذر ہوتا ہے۔ دو طرفہ نئی وضع کی کوٹھیاں،
سبزہ زار احاطے، دھنک کی طرح رنگ برنگ کی ہنستی ہوئی کیاریاں، جدید فیشن کے لباس، ناز فرماتی
ہوئی ساریاں، نغمہ زن بالا خانے اور دھوم مچاتی ہوئی موٹریں۔ اور کہیں مفلوک الحال حلقوں کا جگر چیرتی
ہوئی یہ سڑکیں یوں تیر جاتی ہیں جیسے اُپی ہوئی تلوار۔

بڑی سڑکوں کے حاشیوں پر فٹ پاتھ کا وجود اُن کے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ سڑکوں کی بہ نسبت
فٹ پاتھ کی دنیا ذرا آہستہ خرام ہوتی ہے۔ سڑک ندی کے درمیانی دھارے کی طرح ہوتی ہے اور فٹ پاتھ موج
ساحل آشنا کی مثال۔ مگر فٹ پاتھ کی دنیا حرکت و سکون دونوں کے مناظر پیش کرتی ہے لہذا زیادہ دلچسپ ہے
رہرووں کے علاوہ فٹ پاتھ کی آغوش میں بہت سی ہستیاں ہوتی ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات، اور
اشرف المخلوقات بھی، جی ہاں اشرف المخلوقات بھی جس پر حوریں رشک کریں اور جنکے سامنے فرشتے سجدے میں گر گئے تھے۔
میونسپلٹی کے ٹین اپنی الابلا کوڑے کرکٹ، بہار ان کے ساتھ ایسے دوکانداروں کے پلنگ جو صرف
نفع کمانا، قانون کو دھوکا دینا اور ساری دنیا کو اپنا سمجھنا جانتے ہیں۔ صرف پلنگ ہی نہیں، بنچ، کرسیاں،
ٹوکرے، دیودار کے بکس وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستانی وزیروں کی طرح موٹے تازے، چمکتے دمکتے مگر مجبور و پابہ گل
لیٹر بکس اور حیوانات میں بکریاں، گائیں، گھوڑے، گدھے، کتے اور سب کے سبھاپتی سانڈ دوسروں
کی کمائی کھانا خود بیکار رہنا اور دندنانا۔ ویسے ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور زمینداروں کی طرح
سانڈ بھی کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ نباتات میں میوے کی بڑی دوکانوں سے پھینکے ہوئے چھلکے اور
ایسی ٹوکریوں کے بیر، خراب و خستہ کیلے اور آدھی سڑی ہوئی نارنگیاں جنکی پوری کائنات ایک
گوشے میں سما جاتی ہے۔ غرض یہی ہستیاں فٹ پاتھ کی رونق ہوتی ہیں۔ مگر جو اشرف المخلوقات نہ ہوتا
تو آسمان و زمیں، جمادات، نباتات و حیوانات کہاں ہوتے۔ فٹ پاتھ پر اشرف المخلوقات بھی ہوتے ہیں
مسلسل صدا لگائے ہوئے فقیر، اپاہج بھک منگے، بھنکتے ہوئے کوڑھی جو اپنے ٹھنٹھ ہاتھوں کو دکھا کر
صرف سوالیہ اشارے کرتے ہیں، ایسے زار و نزار محتاج جو برائے نام سا چیتھڑا سامنے بچھا کر بے حس
و حرکت لیٹے رہتے ہیں۔ [illegible] سے زیادہ گندے اور ادھ موئے بچوں والی عورت جو بیر

یا شکر قند ۔ رکشا والوں اور قلیوں کے ہاتھ بیچتی ہے ۔ ایک پلّہ نما بچّہ ربود کرتی سے ڈھلکی، ڈھلکی ہوئی خشک چھاتیوں کو اس طرح چاٹتا ہوا جیسے کوئی غریب بچہ آم کے پھینکے ہوئے چھلکوں کو رس نکل جانے کے بعد بھی چاٹ لینا پسند کرے ۔ میلے برقعے کے اندر سے نکیاتی ہوئی سائلہ عورت ۔ چائے کی پھینکی ہوئی سٹھی سے بننے والی چائے بیچنے والے اور ان کے گرد بے کار اور تھکے ہوئے مزدور ۔ اور راتوں کو انہیں فٹ پاتھوں پر دو اینٹوں کو جوڑ کر بنائے ہوئے چولھے جو چُنی ہوئی لکڑیوں اور تنکوں سے سلگائے جاتے ہیں ۔ ہانپتے ہوئے فٹ پاتھوں کے سینوں کی دبی ہوئی آگ دہک اٹھتی ہے ۔ خالی خولی ہانڈیوں میں چند دانے اُبلتے ہیں ۔ پانی کے اُبال کی آواز دھرتی کی کراہ معلوم ہوتی ہے ۔ بھوکے پیٹوں کو ا جگا کر فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والے سونے کی نقل کرنے زمین پر دراز ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح زندگی کا چکّر چلتا رہتا ہے اور قسمت کے بہانے برداشت کر لیا جاتا ہے ۔

آج میں آپ کو فٹ پاتھ ہی سے متعلق ایک کہانی سنانے والا ہوں ۔ نہ جانے کتنی ان کہی اور ان سنی کہانیاں فٹ پاتھوں سے گرد راہ کی طرح لپٹی ہوئی ہونگی ۔

دس سال کی عمر کا ایک لڑکا میرے مکان کے سامنے سڑک کے چھوٹے سے پل پر بیٹھا ہوا تھا ۔ پاؤں پھیلائے ہوئے ، بے پروا آزاد عالم میں ۔ لنگوٹی کسی بے شرم کی یونہی سی لاج کی طرح چپکی ہوئی ۔ گردن سے ایک میلا ، ڈھیلا ڈھالا ، چور چور کسی کا اتارن کرتا جھول رہا تھا ۔ شکستہ کرتے کے چاکوں کو ایک حد تک چھپانے میں سیاہ مرزئی مدد دے رہی تھی ، جو خود بھی اکثر جگہ خندۂ دنداں نما کی شکل پیدا کر رہی تھی ۔ یہ مرزئی بھی یوں تھی جیسے چھوٹے تکیے کے اوپر کوئی گاؤ تکیے کا خول پہنا دے ۔ کرتا جانگھ تک آتا تھا اور سامنے پھٹے ہونے کے سبب جسم زیریں کی عریانی کو دور کرنے کی بجائے اس کے ننگے ہونے کا پردہ فاش کر رہا تھا اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور اس کے سیاہ ہاتھ پاؤں پر گرد کی تہیں نمایاں طور پر جمی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ۔ زمین کی خاک اور جسم کے پسینے نے مل کر یہ اُبٹنا تیار کیا تھا ۔ وہ شاید بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا ۔ سہ پہر کی دھوپ نے جا بجا پسینہ چلا کر اُبٹنے کو ہلکا کر دیا تھا سر کے بال پسینے میں چپک رہے تھے ۔ وہ سنہری دھوپ سے لطف اٹھا رہا تھا دنیا سے لا پروا ہو کر ۔ وہ اپنی مرزئی کے اوپر کی جیلیٹریں مار رہا تھا اور گاہ گاہ اپنا بدن تیزی سے کھجا لیا کرتا تھا میرا محلہ شہر کا ایک خاموش حصہ تھا ۔ دو جانب کالج کے کوارٹر تھے ، تیسری جانب دریا اور چوتھے جانب درمیانی اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے کچھ مکانات ۔ وہ نہ جانے ادھر کیسے آنکلا ۔ شاید پکنک کے لئے روزمرہ کے ہنگاموں سے تنگ آکر یا محض یونہی آج اسکی ٹانگیں ادھر ہی اُسے لے آئیں ۔ جاڑے کے دن تھے دسمبر کا مہینہ اُسے دھوپ میں بڑے اطمینان و سکون سے بیٹھا دیکھکر یہ اثر ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں

عالم رنج و حسرت کو بھول کر آسودگی و طمانیت کے ساتھ بیٹھا ہوا ابدیت کے ساتھ رشتہ جوڑ رہا ہو۔

میرا ملازم اُسے بلا کر بہ ہزار مکان کے اندر لے آیا پہلے تو اُس نے پکار تک نہ سنی۔ وہ اتنا محو تھا شور کرنے سے وہ چونکا، مگر شان سے پل ہی پر بیٹھا رہا۔ جب اُسے اندر بلایا گیا تو اُس نے بہت ہی مشکوک تیوروں سے ماحول کو بھانپا اور پھر چیلیں سی مارنے لگا۔ خوشامدیں کرنے، چمکارنے اور دلاسے دینے پر مشکلوں سے وہ کشاں کشاں یوں اندر لایا گیا جیسے چیتر کے میلے سے ایک نئے اڑتے ہوئے، اگریزاں بچھڑے کو خرید کر کوئی کسان ڈریاتا ہوا لئے جا رہا ہو۔

شاید وہ کچھ بہرا بھی تھا، اور اُسکی دونوں آنکھوں میں پھولیاں تھیں۔ ایک میں زیادہ، دوسری میں کم۔ وہ گھر کی چار دیواری کے اندر گھبرایا گھبرایا سا معلوم ہو رہا تھا۔ نوگرفتار پرندے کی طرح، سائبان سے دوڑ کر وہ انگنائی میں چلا گیا اور کنوئیں کی منڈیر پر لاپروائی سے بیٹھ گیا۔ گردن نیچی کئے ہوئے [illegible] دانت [illegible] چپٹی سے لگے ہوئے جیسے دانتوں پر سونا چڑھایا جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے اُسے کھانا دیا۔ وہ بہ مشکل کھانے پر راضی ہوا مگر جب کھانے لگا تو بھوکے کتے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ صحن میں بیٹھا بیٹھا جب وہ رکابی صاف کر چکا تو تیزی سے گرسنہ بھیڑیئے کی طرح وہ باورچی خانے میں گھس گیا اور کھانے کی مزید چیزیں تلاش کرنے لگا۔ قاب، ہانڈیاں، پیالے، ٹوکریاں سب اُس نے الٹ پلٹ کرنی شروع کیں، باورچی نے اُسے ڈانٹ بتائی، ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ یہ بدتمیزی ہے اور کھانا ہو تو مانگ کر کھایا کرو۔ مگر یہ باتیں اسکی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ اس وقت تک [illegible] جب تک اُسے کچھ اور کھانے کو نہ مل گیا۔ دوبارہ کھا کر بھی اس کے تقاضے جاری رہے۔ ہم لوگوں نے اُسے سمجھایا کہ اب رات کو کھانا بھر پیٹ پھر ملے گا۔ وہ کچھ مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں رکابی سے دال اور شوربا چاٹنے لگا۔ چاٹ واٹ کر اس نے رکابی کو ایک طرف [illegible] سے سرنا یاد دیا اور کنوئیں کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔ بے تعلق سا، بے حس [illegible] کا جواب دیتا تھا۔ ہم لوگوں کو گملوں اور چمن کی آبپاشی کے لئے ایک ایسے چھوکرے کی ضرورت تھی جو اوپر کے اور کام بھی کر دیا کرے۔ اس لونڈے کو ہم نے خداداد سمجھا [illegible] اور خود غرضی و جذبہ ترحم نے مل کر ہم میں یہ شدید خواہش پیدا کی کہ کسی [illegible] یاد آوری [illegible] پاس جائے۔ ہم لوگوں نے اُسے سمجھانا شروع کیا کہ وہ نوکر ہو کر یہاں [illegible] تو اُسے [illegible] کو ملے گا، اچھے صاف ستھرے کپڑے پہننے کو ملیں گے اور پیسے بھی [illegible] چپ چاپ دانت نکالے ہنس دیتا عجیب طرح کی بے تعلقی، بے [illegible] اُسے نہانے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اُسے نہانے کو کپڑا

دھونے والا صابن دیا گیا۔ اُس نے اُسے سونگھا اور منہ بنا لیا۔ پھر ہنستا ہوا نہانے کے لئے کل پر بیٹھ گیا
اُسے ایک پرانا ہاف پینٹ اور ایک پرانی قمیص دی گئی۔ اُس نے خوش خوش انہیں پہنا۔ بٹن لگاتے
وقت اُسے بڑا لطف آ رہا تھا کئی بار بٹن کھول کھول کر اس نے لگائے۔ وہ جدّت کا لطف لے رہا تھا
اپنے کرتے اور مرزئی میں اس قسم کی نامعقول بندشیں نہیں تھیں۔ نہا دھو، کپڑے بدل کر وہ سیدھا
باورچیخانے میں گھس گیا اور اب کے اس نے باورچی سے بہ منت کچھ اور کھانے کو مانگا۔ چند سوکھی
روٹیاں اُسے دے دی گئیں اور اس نے انہیں بھوکے کی طرح دو تین لقموں میں ختم کر دیا
کھا کر وہ اٹھا اور اپنے پھٹے پرانے کرتے میلی چکٹ لنگوٹی اور چیلڑوں سے اٹی ہوئی مرزئی کو لپیٹ
لپاٹ کر سنبھال کے آنگن کے ایک گوشے میں ٹوٹے ہوئے گھڑے پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا
میرے پاس آیا اور غیر متوقعہ جراٗت سے اس نے سوال کیا۔

"کتنا مشارا دو گے ؟"

میں نے کہا ـــــ "ٹھکانے سے کام کر۔ کھانا، کپڑا، مشاہرہ سب ملیں گے"

کہنے لگا ـــــ "نہیں بول دو ! کتنا ملے گا ؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ابے تو مشاہرہ لے کر کیا کرے گا ؟ خوب بھر پیٹ کھایا کر اور روز پیسے
لے لیا کر ایک دو۔"

"اونہہ ! تب ہم نہیں رہیں گے۔"

"مشاہرہ بھی ملے گا۔ تو گھبراتا کیوں ہے ؟ تیرا گھر کہاں ہے ؟" میں نے اسے تسلی دی۔

"مجپٹھر پور جلع"

میں نے دریافت کیا ـــــ "ماں باپ ہیں ؟"

اُس نے کہا ـــــ "نہیں ! کوئی نہیں !" اور نفی میں زور سے سر ہلاتا رہا۔

"بھائی بہن ؟"

"کہہ تو دیا کوئی نہیں" وہ بگڑ سا گیا۔

"اچھا تجھے مشاہرہ دوں گا۔ میرے پاس جمع کرانا اُس سے بہت سے کپڑے
بنا لینا اور مٹھائیاں کھانا"

"نہیں مشاہرا ہاتھ میں لیں گے۔"

"ہاتھ میں لے کے کیا کرے گا ؟ پھینک دے گا، اور کیا ! یا گر جائیں گے
روپے کہیں ؟"

"نہیں! ہم کو مکان بنانا ہے۔" اس نے شان و وقار کے ساتھ کہا
میں بھی چونک گیا اور سب لوگ ہنسنے لگے۔ اُسے چوٹ سی لگی۔ کہنے لگا۔
"میرے بھی مکان ہے جی! جلجلّہ میں گر گیا ہے تھوڑا۔ دو کوٹھری ہے!"
اس کے سیاہ چہرے پر خون نے چھپے ہوئے توے کا رنگ پیدا کر دیا۔
میں نے کہا۔ "اچھا! بنانا مکان۔ تیرے ہاتھ میں روپے دونگا۔" وہ خوش ہو گیا اور ہنسنے لگا۔ اس نے یہ بھی نہ پوچھا پھر کتنا مشاہرہ ہوگا۔ اس کے دل میں بھی حسرت تعمیر اور تمنّائے ملکیت تھی۔ اسی حسرت، اسی تمنّا کے پورا ہونے کا تصوّر ہی اتنا خوش آیند تھا کہ وہ سرمست ہو گیا۔

وہ مکان کے بیرونی احاطے میں جا کر بیٹھ رہا۔ جب اُسے کسی کام کے لئے بلایا جاتا تو وہ چلا آتا اور کام کو ادھورا ہی چھوڑ کر پھر باہر احاطے میں جا بیٹھتا۔ اُسے ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ ہلوگوں نے یہ سمجھ کر کہ ابھی ذور دنیا ٹھیک نہیں، چُپ ہو رہے کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔
اب رات ہو چلی اور وہ مزے میں صحن میں بیٹھا رہا۔ کھانا کھانے کے لئے اندر آیا اور پھر باہر چل دیا۔ بڑی دقتوں سے اُسے سلانے کے لئے اندر لایا گیا۔ اب وہ کوٹھری کے اندر سونے پر رضامند نہیں۔ رات بھر وہ سائبان ہی میں سوتا رہا۔ غضب کی سردی تھی مگر وہ تو کھلی فضا کا پنچھی تھا۔ اُسے اوڑھنے کے لئے ایک کمبل دے دیا گیا۔ جسے اُس نے نہایت ہی استغنا کے ساتھ سرسری طور پر لے لیا۔

صبح ہوتے ہی وہ احاطہ میں جا پہنچا۔ صرف قمیص اور ہاف پینٹ پہنے ہوئے اسے بُلا کر چولھے کے پاس باورچیخانے میں بٹھایا گیا۔ وہاں وہ چپکا بیٹھا رہا۔ جب ہلوگوں کے ناشتے کے بعد اُسے روٹی کھانے کو مل چکی تو میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔
"ہم جا کے چادر لی آویں"
میں نے پوچھا۔ "کہاں ہے تیری چادر؟"
اس نے نہایت صفائی سے جواب دیا۔ "فٹ پاتھ پر"
"ارے! فٹ پاتھ پر کہاں؟"
"جہاں ہم روج سوتے تھے۔ حاطہ کے ٹٹّی میں لٹکا کے رکھ دیا ہے۔"

اب وہ جانے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے کہا "تجھے دوسری چادر مل جائیگی مت جا"

مگر اس نے ایک نہ سنی اور جانے پر مصر ہوا۔ ملازموں نے اُسے زبردستی روکنا چاہا تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

میں نے آخرش اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ چھلانگ لگا کر احاطے کے اندر چلا گیا اور وہاں سے یک بیک لوٹ کر اندر آیا۔ اُس نے صحن کے گوشے میں جا کر قمیص اتاردی اپنا میلا سا ربود کرتہ اور مرزئی پہنی اور ہاتھ میں لنگوٹی کا چیتھڑا لے کر باہر جانے لگا۔

میں نے اُسے کہا۔ "ارے یہ کیا! اپنی چادر لے کر تو واپس نہیں آئے گا کیا؟"

وہ بلا جواب دئے پھرتی سے احاطے سے باہر نکل گیا اور پھاٹک سے باہر ہو کر دوڑتا ہوا بھاگا۔ یہ جا وہ جا۔

فٹ پاتھ اُسے آواز دے رہا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کی پکار سن لی۔ کل کا بھولا بچہ اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔

سید اختر احمد اختر اورینوی

# کلام تپاں

(۲)

ہر لمحہ رہے خالق اکبر کے بھروسے
انسان نہ دنیا میں رہے ہر کے بھروسے

کٹتی نہیں شمشیر ستی ترچھی نگاہیں
قاتل مرا قاتل نہیں خنجر کے بھروسے

صیاد نے آزاد کیا کر کے لنٹ ڈورا
اپنی تو جدو جہد تھی شہپر کے بھروسے

ہو جاوے جہاں سانجھ وہیں رات گذارے
وحشت میں بھی نکلے ہو کوئی گھر کے بھروسے

دریا ہی میں ڈوبیں کہ نہ تربت نہ جنازہ
کاہکو مریں بھائی برادر کے بھروسے

دل کا جو سہارا تو کوئی سہل ہوا ہیں
کشتی بھی جو ٹھہرے ہے تو لنگر کے بھروسے

ہر کوئی کو ہو ویگا تپاں ایک سہارا
ہم حشر میں اٹھینگے پیمبر کے بھروسے

---

نقش اونکی مرے دل کے نگینے پہ کھدی ہے
وے اسکو نہ مانیں تو یہ اک بات جدی ہے

کیوں جھومتی جاتی ہے کو لے ناقہ لیلے
یہ قیس کا نالہ ہے کہ آواز حدی ہے

کیا کہیے انا الحق کے تئیں، پاوے خدا کو
تا حال تو منصور ترے دل میں خودی ہے

وعدہ انہیں ٹک یاد دلایا تو وہ بولے
اے واہ بھلا کسنے زباں آپ کو دی ہے

مٹی ہی میں اوسکے تئیں اک روز ہے ملنا
مٹی مرے اس جسم میں جو کالبدی ہے

ہر شب ہے شب ماہ جو تم بام پہ آوو
ہو کچھ جو مہینے کا بدی بھی تو سدی ہے

اس ناشدنی دور میں اثبات کی ہے نفی
گردان میں اسکے نہ شدم ہے نہ شدی ہے

تھا غش میں تپاں ہوش میں آیا ہی ابھی تو
ٹک آن کے دامن کی ہوا تم نے جو دی ہے

---

اللہ رے امیدیں کوئی آوے ہے نہ جاوے
ہے در کی طرف آنکھ کہ شاید کوئی آوے

ہم در پہ کھڑے ہیں سو نہ دیں ہم کو اجازت
اغیار نہ آویں تو وہ بھیجے ہیں بلاوے

رستے ہی میں ہم بھور تلک سوئے ہوئے ہیں
اور قافلہ والوں نے کسے اپنے کجاوے

ہم رند ہی کچھ یاد خدا کرتے ہیں دل سے
زاہد کی عبادت میں تو خالی ہیں دکھاوے

ظلم اوس بت سفاک کے ہیں ہم پہ ہزاروں
اور گردش گردوں کے ستم اُن پہ علاوے

کیا امن رہے کشور دل میں کہ وہاں تو
اب لشکر مژگاں کے رہا کرتے ہیں دھاوے

وہ عرض محبت پر کہے ہے یہ تپاں سے
کس طرح بنے بات جو تو بات بناوے

دل میں رہو تو دیدۂ نم کو نہ بھولیو — کعبہ میں جاکے بیت صنم کو نہ بھولیو

اے دل کسی کے لا و نعم کو نہ بھولیو — سرمایۂ وجود و عدم کو نہ بھولیو

جسوقت ہووے قوت تدبیر پر گھمنڈ — خطِ جبیں کے حسنِ رقم کو نہ بھولیو

اون میں جفا کے ساتھ ہے اے دل وفا بھی کچھ — زاہد ہے جو یاد تو کم کو نہ بھولیو

مٹی سے جب بنے ہو تو مٹی میں جاؤ گے — اے پرغرور اپنی جنم کو نہ بھولیو

کہتے ہیں وہ کہ میری کمر کا ہے خیال — اس جادۂ صراطِ عدم کو نہ بھولیو

تقسیم غم جو کرنے لگو عاشقوں کے بیچ — اوسوقت اپنے خوگر غم کو نہ بھولیو

تیغ زباں چلاؤ جو منطق کے زور سے — دس حاسوں کے جذر اصم کو نہ بھولیو

بھولے سے "ہاں" جو خط میں نہیں کی جگہ لکھا — ایسے مفید سہوِ قلم کو نہ بھولیو

سبزہ کے اوپر آب [illegible] — اوس کم نصیب تشنہ [illegible] کو نہ بھولیو

غیروں سے جھوٹا وعدہ جو کرنے لگو کبھی — اوسوقت میرے سر کی قسم کو نہ بھولیو

جسوقت عاصیانِ اُمم کو بلاؤ تم — ق — صدقہ نگاہِ لطف کا ہم کو نہ بھولیو

بتلا دیگا یہہ عدل کہ اس کی ہو یہ سزا — تم مقتضائے عفو و کرم کو نہ بھولیو

راہ سلوک پر جو لگے ہو چلے تپاں — اسلاف کے نشانِ قدم کو نہ بھولیو

---

جب سے گریہ اپنی آنکھوں کا سہارا ہو گیا — اشک کا قطرہ جو تھا آنکھوں کا تارا ہو گیا

دل مرا میری نہیں کہتا، تو پھر میرا نہیں — جب تمہارا ہی یہ گاتا ہے۔ تمہارا ہو گیا

اب اجل آئے بھی تو کیا، کر نہیں سکتی ہے کچھ — ہم نے دیکھا، اون کی آنکھوں کا اشارا ہو گیا

طور سے بھی تھا کوئی بڑھکے دل مضطر مرا — اک تجلی سی ہوئی اور پارا پارا ہو گیا

سختی ہی سختی ہے قسمت میں تو پھر نرمی کہاں — موم آیا ہاتھ میں اور سنگ خارا ہو گیا

جو گرا بحر حوادث میں تمہارا لے کے نام — اوسکو ہر گرداب دریا کا کنارا ہو گیا

آ کے بالین تپاں پر کہہ رہے ہیں وقت نزع

لو شہید عشق اب یہ بھی بچارا ہو گیا

---

تمنا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے — تو ہوتا سامنے۔ ہم تا قیامت دیکھتے رہتے

کیا سجدہ میں لاکر کس نے ہم کو کشتۂ حیرت — جو ہوتے بتکدے میں، حق کی قدرت دیکھتے رہتے

لگا دی اپنی آنکھوں سے جھڑی خود آخرش ہم نے — کہ رستہ کبتلک اے ابر رحمت دیکھتے رہتے

بڑھا ما حضرت واعظ نے آخر ہاتھ ساغر پر — فقط بیٹھے ہوئے حضرت سلامت دیکھتے رہتے

تڑپنے نے مرے تڑپا دیا سب اہل مقتل کو    تماشا تھا؟ کہ بیٹھے اہل صحبت دیکھتے رہتے
غلام ان کا ہوں جب انکی بھی تو توہین تھی آخر    وہ کن آنکھوں سے بیٹھے میری ذلت دیکھتے رہتے
دیا کرتے ہیں جانی ترقی لے تپاں یونہی    برابر وہ مرا زور طبیعت دیکھتے رہتے

کس لیے آئے تھے ہم دنیا میں کیا کرنے لگے    مدعا بھولے، تو ترک مدعا کرنے لگے
حسرتیں دل کی نکلنے کے لیے حیران تھیں    نوک خنجر سے وہ پیدا راستا کرنے لگے
دیکھکر حالت مری آیا جو کچھ ان کو ترس    ہاتھ اٹھا کر میرے مرنے کی دعا کرنے لگے
جیسے ہی ہم چپ ہوئے تھے کرکے شکوہ جور کا    وہ مجھے تلقین تسلیم و رضا کرنے لگے
وصل کا وعدہ اٹھا رکھا ہے جیسے حشر پر    روز وہ کوچے میں اک محشر بپا کرنے لگے
لوگ کہتے ہیں بچارا مر رہا ہے عشق میں    اور اب ہم زندگی کا حق ادا کرنے لگے
خوگر [illegible]    اب تو ہم ان کی جدائی میں مزا کرنے لگے
بے وفا کہکر دلایا ہے جو وعدہ ان کو یاد    تب وہ کاہے کے لیے وعدہ وفا کرنے لگے
بتکدے میں تم پہ کیا گذری تپاں بتلاؤ تو    بیٹھکر مسجد میں کیوں یاد خدا کرنے لگے

خوب مشہور ترا نام مسیحا ہووے    کوئی مر جائے ترے پر تو یہ اچھا ہووے
لے چل اے وحشت دل مجھکو اوسی راہ ستی    نامۂ یار لیے جیدھر ستی آتا ہووے
جانیو کوچۂ قاتل نہ اوسی کو قاصد    رقص بسمل کا جہاں اور تماشا ہووے
عشق کو چھوڑ دے کمبخت خرد کے چلتے    یہ تو وہ ہی کرے جسکے تئیں سودا ہووے
لو وہ کہتے ہیں کہ وعدہ تو کیا تھا لیکن    یہ تو لازم نہیں وعدہ مرا ایفا ہووے

ہائے رے قہر تپاں راہ میں ہر جان تپاں
دل میں تو شوق مگر پاؤں نہ اٹھتا ہووے

# ناظر میر وزیر علی عبرتی مرحوم

۱۹۳۳ء کے ندیم بہار نمبر میں ناظر سید وزیر علی عبرتی مرحوم کے حالات کے متعلق ایک مختصر تحریر جناب شاد مرحوم اعلی اللہ مقامہ کی اور ایک طویل مضمون پروفیسر محفوظ الحق صاحب ایم اے کلکتہ کا شائع ہوا تھا جناب شاد مرحوم کا مضمون بھی جناب پروفیسر صاحب کے ذریعہ معرض طبع میں آیا تھا۔ ان دونوں مضمونوں سے وہ پیاس جو عبرتی مرحوم کے حالات معلوم کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے بجھ نہیں سکتی جیسا کہ خود پروفیسر صاحب معترف ہیں کہ "یہ مضمون نامکمل اور تشنۂ تحقیق ہے لیکن جیسا بھی ہے اس کا چھپ جانا بہتر ہے ممکن ہے کہ ہمارے صوبہ کے کوئی دوسرے اہل قلم اس طرف توجہ کریں اور اس مضمون کا تکملہ شائع فرمائیں" ابھی ۲۴ رجون ۴۲ء میں پورے نوسال کے بعد پروفیسر حسن عسکری ایم اے سے عبرتی مرحوم کے تصانیف کا ذکر ہوا۔ ممدوح نے مذکورہ بالا ندیم بہار نمبر نکال کر مجھے دیا اور کہا تمہارے پاس ان کے تصانیف بہت ہیں، لہذا کچھ ان پر لکھو اس پرچہ کے اندر جو دونوں مضمون ہیں وہ "مسکن عطش نہیں ہیں" اپنے مکان پر آکر ان کے تصانیف کا جو مجھے جون ۳۸ء میں دستیاب ہوئے تھے جائزہ لیا تو ۱۹ عدد نکلے۔ لہذا ہمت ہوئی کہ ان کے حالات پر کچھ خامہ فرسائی کی جائے۔

قبل اسکے کہ اس موضوع پر قلم رواں کیا جائے اتنا بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان مرحوم کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لئے ان کے تصانیف سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر بجائے ان کے ان کا کوئی شاگرد ان کے حالات زندگی قلمبند کرتا تو وہ ذرا وقیع ہوتا، لیکن جس نے عبرتی مرحوم کے دائرہ شاگردی میں قدم نہ رکھا ہو، ہم صحبت و ہم بزم نہ رہا ہو، ہمسایہ نہ ہو اور ان کے حالات یاد رکھنے کے لئے اپنے پاس اور کوئی قوی محرک نہ رکھتا ہو اس کا بیان خالی از شواہد و براہین جو صرف یاد داشت پر مبنی ہو قابل وقعت نہیں ہوسکتا لیکن اسی قدر جو باہمی ملاقات اور دید و شنید کے متعلق ہو۔ غالبًا یہ معیار جو میں نے پیش کیا ہے ایک حد تک بداہت کا حکم رکھتا ہے۔ اب اسی معیار کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔

عبرتی مرحوم کا مولد۔ سب سے پہلی چیز جو معرض بیان میں آتی ہے وہ عبرتی کا مولد ہے۔ جناب شاد مرحوم نے ان کا مولد باڑھ بتایا ہے لیکن عبرتی مرحوم خود لکھتے ہیں "مولدش خاک لطافت بہر شہر عظیم آباد صانہ اللہ عن الآفات" اگر ان کی اس تحریر پر کوئی نکتہ چینی کی جائے اور غلط بیانی کا الزام وارد کیا جائے تو خود نوشت سوانح حیات کا پایہ گھٹ جائے گا اور ایک عبرتی مرحوم کیا تمام خود نوشت سوانح والے

محل اطمینان نہ باقی رہیں گے۔ حالانکہ مبصرین کے نزدیک اس قسم کے سوانح کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، پھر بقول شاد مرحوم "عبرتی دس برس کے بعد عظیم آباد آئے" یہ سن کافی ہوش و حواس کا ہے ان کے سارے تصانیف دیکھ جائیے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کہ وہ دوسری جگہ سے عظیم آباد آئے۔

والدین شاد مرحوم فرماتے ہیں" ان کے والدین کا سایہ ان کے دس برس کے سن میں ان کے سر سے اٹھ گیا تھا" لطیفہ یہ ہے کہ ان کے رقعات نثر کے مجموعہ "عقد پروین" کے رقعہ نمبر ۵۲ میں جو سہراب جنگ بہادر کو ان کے قیام ڈھاکہ کے زمانہ میں عظیم آباد سے لکھا گیا ہے یہ عبارت موجود ہے "چندیں روز کہ توقف در عرائف رو داد بسبب پیش آمد اندوہ نابینا گشتن ضعیفہ مادر ایں کلفت نصیب بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد پروین کے سنہ تالیف سے جو ۱۲۵۹ ہجری ہے۔ چند سال پیشتر عبرتی مرحوم کی عمر کی تیسویں منزل سے چالیسویں منزل تک کے مابین ان کی والدہ معظمہ موجود تھیں

عمر۔ ان کی عمر کا حساب شکرستان نبوت کے خاتمہ سے حل ہوگا۔ یہ کتاب عبرتی مرحوم کے شاگرد نواب سید محمد حسن خانصاحب عرف سید محمد نواب صاحب کی اجازت سے مرتب ہوکر آرہ ضلع شاہ آباد کے مطبع نور الانوار میں مہتمم مطبع سید محمد ہاشم بلگرامی کے زیر اہتمام ۱۲۹۲ھ ہجری میں طبع ہوئی، اس کے خاتمہ کی عبارت پیش نظر ہے "چوں چند سال گذشت کہ مصنف ممدوح ازیں جہاں درگذشت ایں کتاب شکرستان نبوت کہ بفرمائش والا ... نواب سید محمد حسن خانصاحب عرف سید محمد نواب ... کہ ذکر خیر ایشاں مصنف کتاب در دیباچہ کردہ مرتب شدہ بود۔ معرفت استاذنا جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی برائے طبع اجازت دادند و دریں مطبع فرستادند چنانچہ حسب الحکم جناب ممدوح طبع کردہ و تاریخش در فقرۂ باقیات کاملہ عبرتی، و دیگر ازیں فقرہ کہ طبع لائق از حکم نواب سید محمد حسن خاں" برآمدہ ان دونوں فقروں سے ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے۔ مرزا انور علی صاحب انور عظیم آبادی نے ابتدائے طبع کی تاریخ یوں نکالی ہے ؎ یہ مصرع اپنا کیا منبر نشیں ہے + کلام عبرتی معجز نما ہے۔ آخری مصرعہ کا عدد ۹۹۹ ہے اور منبر نشیں میں تعمیہ ہے لہذا منبر کے ۲۹۲ جوڑ دینے سے ۱۲۹۱ نکلتا ہے۔ اسی سنہ میں طباعت شروع ہوئی اور محرم ۱۲۹۳ھ میں چھپکر کتاب تیار ہوئی۔ آغاز طبع کی صرف ایک تاریخ ہے اور ختم طبع کی پانچ تاریخیں ہیں ان سے نواب سید تجمل حسین خانصاحب عرف سلطان صاحب فرزند نواب ولایت علیخاں صاحب کی اردو تاریخ کے یہ چند شعر ؎

کیا استاد نے جب اس کو انجام — بہت مشتاق تھے سب خاص اور عام
یہ حسرت تھی ہمیشہ ان کے جی کی — کہ یہ نادر کتاب اپنی بھی چھپتی!
خدا نواب صاحب کو رکھے شاد — ہوئی یوں شاد ان سے روح استاد

اور سید خورشید احمد صاحب کلیم برادر خرد جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی کے فارسی قطعہ تاریخ کے یہ شعر ؎ چوں بفرمان خالق یکتا + کرد ارمعان را مدد و د ؛ حسب منشائے صاحب ہمت ٭ گشت ساماں طبع زود از زود۔ آخر میں نوابصاحب ممدوح کی اُردو تقریظ "بعد حمد... بندہ ہیچمداں الملقب بہ سید محمد نواب ... بن عالیجناب ... نواب سید قاسم علی خاں مرحوم بن ... سید عبداللہ صاحب جنت مکان ... تلمیذ مصنف کتاب ہے عرض کرتا ہے کہ جناب استاذی ... ناظر سید وزیر علی صاحب عبرتی عظیم آبادی نے جب یہ کتاب ... میری فرمائش سے تحریر فرمائی، طبیعت کو بہت روزوں سے شوق تھا کہ یہ کتاب چھپکر نور افزائے اولوالابصار ہوتی ... اتفاقاً ۱۲۹۰ھ میں جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی سے اس باب میں ذکر آیا موصوف نے میرا شوق دیکھکر ... چھپوانے کا وعدہ کیا اور کتاب لے گئے مگر بسبب موانع چند اختتام اس کا محرم ۱۲۹۲ھ میں واقع ہوا۔ جب اس کتاب کے چھپ کر تیار ہونے کی خبر مجھکو پہونچی یہ شکریہ فقرہ جسمیں ۱۸۷۵ء و ۱۲۹۲ھ نکلتے ہیں میری زبان سے نکلا "شکر خدا کو درود پاک مصطفےٰ کو سلام ائمہ ہدیٰ کو"۔ خداوند تعالیٰ اس کتاب سعادت انتساب کا ثواب روح پرفتوح جناب استاد مرحوم کو عطا فرمائے"۔ ان تمام شواہد سے بسہولت یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ عبرتی مرحوم ۱۲۹۲ھ سے تقریباً تین چار سال پہلے ہی رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ جناب شاد مرحوم کا بتایا ہوا ۱۲۹۶ھ تو قطعاً نہیں لیا جا سکتا لیکن انکی تجویز کردہ عمر ۷۰ مانی جاسکتی ہے۔ اس لئے اگر وفات ۱۲۸۸ھ میں فرض کی جائے تو ولادت ۱۲۱۸ھ میں قرار پاسکتی ہے۔ جناب شاد مرحوم نے پہلے پہل جو عبرتی مرحوم کو دیکھا تھا "تو تخمیناً ان کی عمر ۴۵ سے ۵۰ تک ہوگی" اور شاد مرحوم کی عمر اس وقت شاید تیرہ برس کی تھی، لہٰذا اگر پچاس سے تیرہ برس گھٹائے جائیں تو عبرتی مرحوم ۳۷ برس بڑے نکلتے ہیں۔ شاد مرحوم ۱۲۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۵ھ میں وفات پائی ۸۲ برس کی عمر پائی۔ لہٰذا ۱۲۶۲ سے ۳۷ گھٹائے جائیں تو عبرتی مرحوم کا سنہ ولادت ۱۲۲۵ قرار پاتا ہے اس میں ۷۰ جوڑنے سے ۱۲۹۵ نکلتے ہیں جو شاد مرحوم کے بتائے ۱۲۹۶ھ سے قریب تر ہے لیکن شکرستان نبوت کے خاتمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ عبرتی مرحوم ۱۲۹۲ھ کے پیشتر فوت ہوچکے تھے اسلئے لامحالہ ماننا پڑیگا کہ شاد مرحوم کی پہلی ملاقات کے وقت عبرتی مرحوم کی عمر ۵۷ ہوچکی تھی یا اس سال کی ابتدا تھی۔ لہٰذا سنہ ولادت ۱۲۱۸ ہی معتبر قرار پاتا ہے۔

سیادت (۱) کسی شخص کی نسل کے متعلق سوائے اس کے ذاتی دعویٰ اور خاندانی روایات کے کوئی دوسرا ذریعہ تحقیق ناممکن ہے تو لامحالہ اس کی تصدیق کرنی پڑیگی (۲) اگر کوئی شخص کسی خاص نسب سے منسوب ہو اور اس کی شہرت کے باوجود اپنے کو کسی دوسرے سلسلہ نسب سے

وابستہ کرے تو ہر طرف سے بوچھار ہونے لگتی ہے۔ عبرتی مرحوم کے خاندان کا نہ تو شجرہ ہی موجود ہے جس سے سیادت و عدم سیادت کا پتہ ملتا۔ نہ وہ خود اپنا سلسلہ نسب بیان کرتے ہیں۔ لیکن دعوی سیادت ضرور کرتے ہیں۔ جس کے شواہد اتنے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے انکار کی صورت نظر نہیں آتی (۱) حسب ذیل کتابوں میں اپنے کو میر وزیر علی لکھتے ہیں، معراج الخیال، اعجاز المحبت۔ اول کی عبارت "اسم رسوائے من مؤلف شوریدہ سر با طالع مجنوں ہم آغوش میر وزیر علی است"۔ دوسری کی عبارت" اما بعد سرشتہ دل بندہ سر بزانوئے حسرت گذاشتہ از سخن سنجی جز سیہ بختی خطے نہ برداشتہ سید وزیر علی عبرتی چنیں بر زبان خامہ می سپارد" (۲) ان کے شاگرد میر حیدر علی مرحوم عظیم آبادی جن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تصنیفات عبرتی مرحوم میرے پاس موجود ہیں توشۂ آخرت کے آخر میں لکھتے ہیں "یکے از تصنیفات استاذی جناب میر وزیر علی عظیم آبادی" زاد العقبیٰ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں" بخط خام بندہ میر حیدر علی عظیم آبادی تلمیذ سید ناظر فقیر علی عبرتی مدظلہ العالی" حملۂ اسکندریہ کے تتمہ پر لکھتے ہیں" مصنفہ استاذی جناب سید وزیر علی عظیم آبادی"۔ (۳) عبرتی مرحوم کے استاد الفتی کا دیوان ۱۸۷۱ء مطابق ۱۲۸۷ھ میں مصنف کے پوتے کنور سکھراج بہادر رحمتی کی ترتیب پر مطبع نولکشور لکھنو میں چھپا ہے اس کے خاتمہ پر کنور نے ایک خاتمہ تحریر کیا ہے اس میں لکھتے ہیں،" ایں پنج غزل، یکے از فکر کنور ہیرا لعل متخلص بہ ضمیر صلب زادۂ جناب الفتی، و یکی از فکر من کنور سکھراج بہادر مسود اوراق متخلص بہ رحمتی و یکے از فکر جناب استاذی میر وزیر علی متخلص بہ عبرتی و یکے از فکر شاہ بخش حسین متخلص بہ وحشتی و یکے از فکر لالہ ہیرا ناتھ مختی کہ شاگرد جناب الفتی اند بطریق یادگار در خاتمہ ایں دیوان برمی نگارد"۔ پھر اسی دیوان کے صفحہ ۸۲ میں عبرتی کی غزل کے پہلے بطور تعارف یہ چند سطریں سپرد قلم کی ہیں۔" میر وزیر علی عبرتی کہ استاد من مسود اوراق است داز و مثنوی ہائے منظومہ سکندر نامہ بری نظامی، و زلیخائے جامی و لیلیٰ مجنوں ہاتفی و نل دمن فیضی در انجا بہ بیر قمر الدین منت، بہ پیرایہ نثر آمدہ از عجائب روزگار است و نیز نسخ محیط الکلام در فن املا و حدیقۃ الاضافہ وغیرہ صرف و نحو فارسی و انشا نثر و انشا نظم و تذکرہ نثر رقعہ و تذکرہ نظم غزل و مدینۃ الحکایات و شکرستان نبوت در تصرف تالیفش گشتہ۔ اگر خدا خواست بعد چندے بطبع خواہم آورد چہ ترتیبش در پیش است"۔ (۴) الفتی کی مثنوی نیرنگ تقدیر ۱۲۹۸ھ میں مطبع محمدی پٹنہ میں طبع ہوئی۔ اس کے مرتب بھی کنور سکھراج بہادر ہی ہیں دیباچہ میں لکھتے ہیں" بندہ سکھراج بہادر متخلص بہ رحمتی نبیرۂ راجہ پیارے لال الفتی دہلوی بخدمت ناظرین با توقیر و شائقین ایں مثنوی بے نظیر مسمی بہ نیرنگ تقدیر چناں ملتمس است کہ مختصر احوال دودمان ایں ننگ خاندان کہ جناب جنت مکان سید وزیر علی قبلہ عبرتی عظیم آبادی غفر اللہ ذنوبہ و رفع درجاتہ بہ نسخۂ اعجاز محبت مؤلفہ خود ترقیم فرمودہ اند

آں احوال... مسطور ہست، ازاں حال خاندانم بخوبی واضح خواہد شد مگر دراں حال مختصر رقم فرمودہ جناب سید وزیر علی قبلہ مرحوم اکثر حال ونام ونشان چند بزرگان وبرادران وخردان مندرج نیست" (میں نے اعجاز المحبت کی وہ عبارت ابتدا میں نقل کردی ہے جسمیں خود عبرتی نے خود کو سید لکھا ہے میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں میر ہے۔ اور مثنوی نیرنگ تقدیر میں جو عبارت نقل کی ہے اس میں سید ہی) (۵) مولوی مہدی علی تسلی کا رقعہ جو منجانب خواجہ سلطان جان صاحب عبرتی کو لکھا گیا تھا۔ ریاض الافکار میں موجود ہ ایں رقعہ بلاغت آمود ازاں اعجاز طراز ست کہ بمن مسود اوراق از طرف مشفقی خواجہ سلطان جان صاحب زاد اشفاقہ بزنگاشتہ رقعہ نساج کارگاہ معانی محسود شعرباف شروانی، زیبندہ طراز بلند فطرتی سید وزیر علی عبرتی۔ (۶) نواب مبارز الملک ضیاء الدولہ سید محمد حسن خاں بہادر تہور جنگ کا رقعہ نجابت دستگاہ شرافت پناہ منشی میر وزیر علی سلمہ اللہ تعالیٰ" (۷) راجہ بھوپ سنگھ کا رقعہ " سخن رس ندیم مزاجداں میر عبرتی سلمہ اللہ تعالیٰ" (۸) شکرستان نبوت کی لوح (ٹائیٹل پیج) مصنفہ شاعر شیریں گفتار ناظر سید وزیر علی عبرتی مرحوم عظیم آبادی" (۹) اسکی فارسی تقریظ " ایں کتابیست شگرف موسوم بہ شکرستان نبوت... کہ رونق بازار سخندانی گہر سنج دکان معانی... ناظر سید وزیر علی عبرتی عظیم آبادی کہ در شیوہ فارسی بعہد خود مشہور وممدوح جمہور بود بسیارے از امرا وارکان عظیم آباد زانوئے تلمذ بجد متش تہ کردہ واز لجۂ فیض او استفادہ نمودہ" (۱۰) نواب سید محمد حسن خانصاحب کی اردو تقریظ " بعد حمد... بندۂ ہیچمداں الملقب بہ سید محمد نواب... تلمیذ مصنف کتاب عرض کرتا ہے کہ جناب استادی... ناظر سید وزیر علی عبرتی عظیم آبادی نے جب یہ کتاب الخ..." (۱۱) شاہ بخش حسین صاحب وحشتی تلاڈھوی جن کے متعلق عبرتی ریاض الافکار میں لکھتے ہیں۔ " دریک دبستان ہم حل ماندہ بادہ میگسار میکدہ سخن سنجیہا بودیم" ان کی ایک تصنیف قواعد فارسی میں مسمّی بہ بساتین القوانین قلمی میرے پاس موجود ہے۔ مصنف کے قلم کا اصلی مسودہ ہے اور اس پر جابجا راجہ ہیرا لعل ضمیر کے ہاتھ کا حاشیہ بھی ہے اور سنہ کتابت ۱۲۵۵ھ ہے اس کے دیباچہ میں وحشتی تحریر فرماتے ہیں " وتعطیر ایں سواد ریختہ مشکبید قلم بہ نعتہ پسند طیب مغز ورالافطرتی سر حلقہ شاگردان جناب الفتی میر وزیر علی عبرتی سلمہ اللہ تعالیٰ خہے مشکیں نفس کہ عالی دماغان خنق فصاحت رانکہت سواد نثرش مشک اذفر تاتاری است ونازک مشامان تاتار بلاغت را مداد نطقش عود خام قماری" ان شواہد کے بعد جنمیں سے اکثر عبرتی مرحوم کے شاگرد اور ہمدرس کے ہیں اس بات کی گنجائش کہاں کہ ان کے ماں باپ کھتری تھے یا کایست تھے۔ مگر زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ کایست تھے اسی لگاؤ سے راجہ پیارے لعل الفتی کے گھر میں رہے کہ وہ بھی کایست اور اسی گروہ میں شامل تھے

جو عبرتی کے ماں باپ تھے۔ (شاد مرحوم) حیرت ہے کہ باوجود اس ... کے خود الفتی کے ... نے اس امر کو بالکل فراموش کر دیا اور جب الفتی کا دیوان اور مثنوی چھپی تو اس خاندان ... عبرتی مرحوم کو سیادت کی سند دیدی گئی جیسا کہ گزرا۔ پھر شاہ دہشتی کہ عبرتی انھیں کی صحبت ... پختہ مسلمان اور شیعہ مذہب ہوگئے اور آخر تک اس پر قائم رہے" (شاد مرحوم) وہ بھی ان کے ... اور کایست ہونیکو فراموش کرگئے یہاں تک "بساتین القوانین" میں انھیں ... وزیر علی عبرتی سلمہ اللہ تعالی" لکھدیا۔ ان قوی شواہد کے ہم پہلو ایک ضعیف شاہد بھی ان کی سیادت کا ملتا ہے وہ مصباح الاخلاق کا انچاسواں رقعہ ہے۔ عبرتی اپنے ایک بھتیجے کو لکھتے ہیں" روز عید الضحی (عید اضحی) کہ من ذبیح قربان گاہ اخلاص درکاشانہ محمد اسمعیل بیگ با مرزا حاجی محسن درخوردم بخشم تمام بمن مستمند گفت کہ میر مہدی برادر زادہ ات آنچہ شیوہ آموختہ کہ بہر انجمنے کہ میرود غیبت بندہ می کند.... ازانجا کہ شکایت مرزا بجا بود جز سکوت اصلاح حالش نہ پرداختم لیکن جائے صد حیف است کہ دریں مرانہ سری باعث دلشکندی غم پرمی شود"۔ اسی طرح "عقد پروین" کا پندرہواں رقعہ ہے جسکی عبارت یہ ہے" درہمیں نزدیکی از نوشتہ کنار پروردہ محبت عزیز برادر میر احسن مفہوم گشت" اور سولہواں رقعہ جس کا سرنامہ یہ ہے" رقعہ بنام عزیز از جان میر احسن برادر خود تحریر یافتہ" اگر عبرتی مرحوم کو خود کو سید منوانا مدنظر ہوتا تو ان کی تصنیف کی ہر وہ جگہ جہاں "عبرتی" لکھا ہے میر یا سید سے خالی نہ ہوتی۔ لیکن کہیں ہے کہیں نہیں ہے۔ دوسروں کے خطوط جنمیں میر عبرتی ہے یا صرف عبرتی ہے بعینہ نقل کر دیتے ہیں (۱) مرزا امان علی ذبیح لکھتے ہیں" تغافل پیشہ وفا نشناس یار من عبرتی سلمہ اللہ تعالی" (۲) مرزا نوروز علی خاں یکتا لکھتے ہیں" خدمت عالی خیال رنگیں کلام محب باکرم عبرتی نام دام اشفاقہ" اگر عبرتی ہر جگہ میر یا سید اضافہ کر دیتے تو کون گرفت کرسکتا تھا کہ فلاں نے تم کو فلاں خط میں میر نہیں لکھا ہے۔ ان شواہد سے مثل آفتاب نصف النہار واضح و آشکار ہوگیا کہ عبرتی کی سیادت بھی اسی طرح حد شیاع کو پہونچی ہوئی تھی جس طرح اور سادات کی۔

محمد مصطفی

(باقی)

# قطب جنوبی

(مسلسل)

اسکاٹ پہلی اگست ۱۹۱۰ء کو لندن سے پھر قطب جنوبی کی طرف روانہ ہوا اور مختلف [illegible] کے بعد چوتھی جنوری کو اس کا جہاز ٹیرانووا خلیج میک مرڈو کے کنارے راس روائیڈ کے پاس [illegible] لنگر انداز ہوا اور سامان اتارا جانے لگا۔ اس سفر کے لئے اسکاٹ نے ہر چیز اپنے انتظام سے خریدی اور [illegible] رکھوائی تھی اس لئے ہر چیز آسانی سے اتار لی گئی۔

چونکہ ابھی موسم اچھا تھا اور ان دنوں آفتاب ہر وقت چمکتا رہتا تھا۔ اس لئے اسکاٹ نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور قطب کے سفر کے لئے راہ میں ضروری سامان کے ڈھیر لگانے کے لئے مختلف جماعتیں بھیجنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ سامان ۷۹ - ۲۰ ½ عرض بلد تک لیجا کر اکٹھا کر دیا گیا اور جب راہ میں کل سامان ترتیب سے رکھا جا چکا تو یہ جماعت کیمپ کو واپس آگئی اسی درمیان میں اسکاٹ کو آمنڈسن کے آنے کی بھی خبر ملی۔ اسکاٹ یہ سنکر بہت پریشان ہوا مگر اس نے بہت جلد اپنے اوپر قابو پا لیا۔ اور اس دن کے روزنامچہ میں لکھا "بہتر اور انسب یہی ہے کہ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہیں اس طرح۔ جیسے کوئی نئی بات ہوئی ہی نہیں اور اپنے ملک کی لاج رکھنے کے لئے ہمیں بے خوف و خطر آگے بڑھے جانا چاہئے"۔ لکھنے کو تو سب کچھ لکھ ڈالا۔ دھڑکتے دل کو سنبھالنا بھی مگر بات تھی مشکل۔ پہلے اسے صرف قطب تک پہونچ جانے کی فکر تھی۔ مگر اب جب ایک [illegible] میدان میں قدم اٹھائے بڑھا چلا جا رہا تھا تو منزل مقصود تک پہلے پہونچنے والے [illegible] قطب تک پہونچنا کافی نہ تھا۔ مگر وقت یہ تھی کہ جس جگہ آمنڈسن اترا ہوا تھا [illegible] ۶۰ میل قریب تر تھی۔

بہر حال جاڑوں کی رات راحت و مشغولیت میں کٹی ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف رہا جب جاڑوں کی رات ختم ہو گئی تو سفر کی تیاری ہونے لگی۔ اسکاٹ نے اپنے ساتھ جانے والوں کی کئی جماعتیں بنا ڈالیں۔ خاص خاص خدمتیں انکے سپرد کیں۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو یہ جماعتیں ایک ایک کرکے قطب کی طرف روانہ ہوئیں۔ اسکاٹ خود ۳ر نومبر ۱۹۱۱ء کو ہٹ پوائنٹ سے روانہ ہوا۔

۴ر جنوری ۱۹۱۲ء کو ۸۷° ۳۲' عرض بلد تک اسکاٹ سات آدمیوں کے ساتھ پہونچا یہاں پہنچکر اسکاٹ نے تین کو واپس کر دیا۔ اور بقیہ پانچ نفوس آگے بڑھے۔ قطب جنوبی اس مقام سے

صرف ڈیڑھ سو میل رہگیا تھا اور اب اسکی کافی اُمید تھی کہ وہ اب آسانی سے وہاں تک پہونچ جائیں گے۔ سطح مرتفع کے اوپر نہ پہاڑ تھے نہ ٹیلے۔ رستہ صاف کھلا ہوا تھا۔

اسکاٹ کے ہمراہیوں کے نام یہہ ہیں:۔ ڈاکٹر ولسن۔ لفٹنٹ اُوٹس۔ لفٹنٹ باوُرس۔ اور ایونس۔ یہ پانچ جانباز اپنے سر ہتھیلیوں پر دھرے قطب کی طرف چلے جا رہے تھے ۳؍ جنوری ۱۹۱۲ء کو یہ جماعت ۸۹° عرض بلد تک پہونچ گئی۔ قطب جنوب یہاں سے ۶۰ میل رہگیا تھا۔ مگر اب سب کے سب تھکن محسوس کرنے لگے۔ بعض کی صحت خراب ہوگئی اور سب سے زیادہ پریشان کن بات یہہ تھی کہ ان میں دو تین اب سردی محسوس کرنے لگے اس کے معنی یہہ تھے کہ طاقتیں جواب دیرہی تھیں۔ اور جسمانی حرارت خوفناک درجہ تک گھٹ گئی تھی۔ آثار اچھے نہ تھے۔

۱۴؍ جنوری کو یہ جماعت اس مقام پر پہنچی جو قطب سے صرف چالیس میل دور تھا۔ ۱۶؍ جنوری کی دوپہر کو یہہ لوگ ۸۹° ۴۲' عرض بلد تک پہونچگئے۔ اور اب رات ہوتے ہوتے قطب تک پہونچنے میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا۔ کھا پی کر وہ اس اُمید میں چلے ہی تھے کہ لفٹنٹ باورس کو بہت دور ایک سیاہ سی کوئی چیز نظر آئی۔ ہر طرف برف پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سفیدی ہی سفیدی تھی پھر بیچ میں یہہ سیاہ سی کونسی چیز تھی؟ اس نے دوسروں کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ سب گھبرا کر دیکھنے لگے۔ کلیجے بلیّوں اچھلنے لگے۔ سانسیں رک رک کر آنے لگیں۔ یا میرے اللہ یہہ کیا نظر آرہا ہے۔ کیا ہماری کل محنتیں اور ساری مشقتیں رائگاں گئیں، کیا ہمسے پہلے کوئی وہاں تک پہونچ گیا؟ اس طرح کے سینکڑوں پریشان کن خیالات ہر ایک کو نیم جاں کئے جا رہے تھے مگر تقدیر سے لڑنا لاحاصل تھا۔ آگے بڑھتے نہیں تو کیا کرتے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو کسی جماعت کے خیمہ زن ہونے کے نشانات تھے۔ برف پر کتوں کے نقش قدم تھے۔ اور ایک لمبے بانس پر ایک سیاہ پھریرا لہرا رہا تھا۔

اس رات جب یہہ پانچوں چند میل اور آگے بڑھکر خیمہ زن ہوئے تو کسی کو نیند نہ آئی۔ دل بیٹھے ہوئے تھے۔ شکست کی بھیانک شکل ہر وقت انہیں انکی ناکامیابی کو یاد دلاتی رہی تھی۔ اسکاٹ کا دل کچھ ایسا بیٹھ گیا تھا کہ اس نے اپنے روزنامچہ میں ایک کلمہ لکھا جو آئندہ کے واقعات کی سچّی پیشین گوئی تھی:۔ "اب اپسی میں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے، کون جانے کہ ہم اس میں بھی کامیاب ہونگے یا نہیں" ان سب باتوں کے باوجود قطب تک تو کسی حال سے جانا ہی تھا ۱۷؍ جنوری ۱۹۱۲ء کو یہہ لوگ اس مقام پر پہونچے۔ جہاں آمنڈسن کا خیمہ کھڑا تھا۔ اسکاٹ نے آمنڈسن کے خطوط پڑھے۔ اپنا حال لکھ کر رسم کے مطابق وہاں چھوڑا

آلات نجوم سے اس مقام کے جار و توع کو دریافت کیا۔ تصویریں کھینچیں۔ اور دوسرے دن یہہ جماعت گھر کی طرف پلٹی۔ اب نہ کسی منزل کی لو لگی تھی۔ نہ کسی چیز کے حصول کی دھن تھی۔ اب نہ ہمت تھی نہ طاقت۔ اب تو بس جانوں کی پڑی تھی کیمپ تک زندہ اور صحیح سلامت پہونچ جانا۔ موسم ایسا خراب تھا کہ خدا کی پناہ۔ ہر طرف آثار برے نظر آرہے تھے۔ پھر بھی یہہ جماعت ہر روز تقریباً پندرہ میل طے کرتی ہوئی چلی جارہی تھی کھانے پینے کے ڈھیر انھیں آسانی سے ملتے گئے۔ مگر اب انھیں سردی بہت زیادہ محسوس ہورہی تھی لفٹنٹ اوٹس کی حالت سبھوں سے زیادہ خراب تھی۔ ولسن کے پیر میں سردی کے مارے آبلے پڑ گئے تھے۔ ۴ر فروری کو یہہ جماعت ایک ذخیرہ کے پاس پہونچا ہی چاہتی تھی کہ ایونس اس بری طرح گرا کہ اس کے بچنے کی امید نہ رہی۔ خیریت یہہ تھی کہ ذخیرہ میں انھیں کافی سامان مل گیا۔ لیکن موسم ہر روز خراب ہوتا گیا اور برف کی سطح روز بروز خراب و خستہ ہوتی گئی۔ راہ میں ایونس کا دماغ ماؤف ہوگیا اور ۱۷ر فروری کو رحیم مطلق نے اسے موت کی نیند سلادیا۔

۶ر مارچ کو لفٹنٹ اوٹس ایسا علیل ہوا کہ اب اس میں سلج کھینچنے کی سکت نہ رہی پھر بھی اسکے ساتھیوں نے اسے نہ چھوڑا۔ ۱۴ر مارچ کے روزنامچہ میں اسکاٹ نے لکھا تھا "بس اب اخیر وقت آگیا ہے"۔ ۱۵ر مارچ کو اوٹس نے تینوں سے التجا کی کہ وہ اسے سوتا ہوا چھوڑ کر چلے جائیں اور اپنی جانیں بچالیں مگر انھوں نے نہ مانا۔ اور اسلئے اس نے خود سے اپنا خاتمہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ ۱۵ر مارچ کی صبح کو اوٹس نے اٹھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا "میں باہر جارہا ہوں اور دیر میں واپس آؤنگا" یہہ کہکر اس نے خیمہ کا پردہ اٹھایا اور موت کے منہ میں خراماں خراماں چلا گیا۔ اس حادثہ کے بعد اب "تین جو بچ رہے تھے ان کے دلوں کا کیا حال تھا۔ اس کا سوچنا ہی فضول ہے۔ یہ نیم جاں ہر ہر لمحہ موت کے منتظر کسی نہ کسی طرح بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ۱۹ر مارچ کو انہیں ایک طوفان نے گھیرا اور برف باری کا یہ زور ہوا کہ یہہ اپنے چھوٹے سے خیمہ میں مقید ہوگئے۔ اب ان کے لئے باہر نکلنا ناممکن ہوگیا۔ ۲۱ر مارچ کو تیل بالکل ختم ہوگیا اور یہہ طے ہوا کہ ولسن اور باورس باہر نکل کر ذخیرہ تک جانے کی کوشش کریں مگر طوفان نے اس کی اجازت نہ دی۔ بس۔ اب موت کی گھڑی کا انتظار کیا جانے لگا۔ ساری امیدیں منقطع ہوچکی تھیں۔ افیون کی گولیاں ساتھ تھیں مگر انھوں نے اسے کھا کر مرنا پسند نہ کیا۔ زندگی کے اخیر لمحے گزرتے جارہے تھے مگر اسکاٹ اسی حالت میں خط پر خط لکھتا جارہا تھا۔ اپنی بیوی کے نام ماں کے نام۔ دوستوں کے نام۔ مہم کے ہمدردوں کے نام اور قوم و ملک کے نام۔ ۲۲ر مارچ

سے ۲۹ تک یہہ تین ضرور زندہ تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ سات دنوں کے فاقوں کے بعد بھی
انمیں ہمت باقی تھی۔ اس تاریخ کو اسکاٹ نے لکھا ہے: "ہم یہاں سے ہر روز چلنے کو تیار ہوئے
مگر طوفان نے ہمیں اجازت نہ دی"۔ آگے چل کر لکھا "بس اب آخیر وقت آگیا ہے۔ ہائے
مصیبت تو یہہ ہے کہ مجھسے اب لکھا بھی نہیں جاتا"۔ اس کے بعد معلوم نہیں کب موت آئی۔ مگر کسی
ایک دن کون جانے مرنے کے کتنا پہلے جسم میں اتنی طاقت آئی کہ اسکاٹ بس ایک آخیر کلمہ لکھ سکا

"برائے خدا ہمارے پس ماندگان کی خبر لینا"

اسکاٹ کے دم توڑتے وقت کی یہہ دل ہلا دینے والی فریاد جب کئی مہینوں کے بعد قوم و ملک کے
کانوں تک پہنچی تو ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، اشرفیوں کی تھیلیاں کھل گئیں۔ امیروں نے دیا غریبوں نے دیا
دل کھولکر دیا اور ضرورت سے زیادہ دیا اور مرنے والوں کے بال بچّوں کے لئے بہتر سے بہتر نظم کر دیا گیا۔
جب اسکاٹ واپس نہ آیا تو پہلے تو اس کا انتظار رہا۔ جب اسکی موت کا یقین ہوگیا تو
موسم سرما سر پر تھا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو ۲۹ اگست ۱۹۱۲ء کو ایک جماعت اسکاٹ کو ڈھونڈنے یعنی اسکی لاش
کی تلاش میں نکلی اور ۱۲ نومبر کو انہیں دور برف کا ایک تودہ نظر آیا جسکے اوپر بانس کا سرا دکھائی دیتا تھا اس خیمہ کا
مل جانا بھی ایک معجزہ تھا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی ہموار زمین پر ادھر ادھر برف جمع ہوگئی تھی۔
جب برف الگ کرکے ڈھونڈنے والے خیمہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اسکاٹ کی لاش بیچ میں ہے۔
اس کے داہنے طرف باورس مرا پڑا ہے اور بائیں طرف ولسن اسکاٹ کا ایک ہاتھ ولسن کے جسم پر ہے۔ اسکاٹ
کے کمر نیچے اس کا روزنامچہ رکھا ہوا ہے۔ پاس کئی خطوط پڑے ہیں۔ اور ایک چراغ کی
جلی ہوئی بتّی اپنی خاموشی میں یہہ کہہ رہی ہے کہ اسی کی لَو میں اسکاٹ نے غالبًا دم توڑتے ہوئے
اپنی آخری فریاد لکھی ہے۔ تلاش کرنے والوں نے کل چیزیں لے لیں۔ مگر لاشوں کو انکی جگہ سے نہ ہٹایا
انہیں کا خیمہ ان کے اوپر گرا کر انہیں دفن کر دیا اور اس کے اوپر برف کا ڈھیر کرکے انہیں وہیں حشر تک
کے لئے سوتا چھوڑ دیا۔ برف کے ڈھیر کے اوپر ایک صلیب نصب کی مرنے والوں کے نام کھودے
اور پھر آگے بڑھکر اس جگہ پر جہاں غالبًا اوٹس مرا تھا ایک اور صلیب نصب کرکے واپس چلے
آئے۔ اگر اسکاٹ زندہ واپس آجاتا تو غالبًا اسے یہہ عزّت نہ حاصل ہوتی۔ مر کر وہ زندہ
جاوید ہوگیا۔

علی اکبر کاظمی

# استثنا

سید نصیر حسین خیال مرحوم نے زبان و ادب اُردو مفصل تاریخ داستانِ اُردو کے نام سے لکھی تھی، اور اس کا ایک باب اُن کی زندگی ہی میں مغل اور اردو کے نام سے شایع بھی ہوا تھا۔ یہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ ادب اور زبان کی تاریخ ملک کی عمومی تاریخ کے غائر مطالعے کے بغیر کامیابی کے ساتھ نہیں لکھی جاسکتی۔ یہ سمجھ کر اس کتاب کے دیباچہ نگار نے اُن کی مدح سرائی کے ضمن میں ان کی "حیرت انگیز" تاریخی معلومات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اہم تاریخی واقعات اور مشہور تاریخی شخصیتوں کے بارے میں جو کچھ جناب خیال کے قلم سے نکلا ہے دیباچہ نگار کیا ہر شخص کو اس پر حیرت ہوگی۔ مسلّمات کے خلاف لکھنے کا انہیں بہت شوق ہے۔ لیکن وہ عموماً اپنے دعوے کی کوئی سند پیش کرنی ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر تو کسی ایسی بات کو جس کی تائید میں ضعیف سے ضعیف روایتیں بھی موجود نہیں، اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے۔ اور اگر اختلاف ہے تو ان لوگوں تک محدود ہے جن کے قلم انگریزوں کے سیاسی مصالح کے تابع ہیں۔ جناب خیال نے اس امر پر بڑا افسوس کیا ہے کہ اس ملک کے "افسرانِ تعلیم" تاریخ سے بے بہرہ ہیں اور ہمارے بچے ان کی تاریخیں پڑھ کر گم راہ ہوتے ہیں۔ دوسروں کو نشانۂ ملامت بنانے کا اُنھیں کس قدر کم حق ہے، ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا۔

(۱) سادات بارہہ اور فرّخ سیر کی نزاع کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "فرّخ سیر کو ان وزرا (سادات) کا ایسا درخور گوارا نہ تھا، اُن کے احسانوں کو بھول کر اس نے اُن کی مخالفت شروع کردی... سید حسین علی خاں کو ... دکھن بھیج کر... اُن کے خلاف سازش کرنے لگا۔ سیّد حسین علی خاں باخبر ہوئے اور... دلّی کی طرف بڑھے۔ فرّخ سیر مقابلے کے لئے نکلا۔ لڑائی ہوئی اور اس نے "شکست" کھائی۔ وہ قتل ہوا اور تخت خالی ہوگیا" صفحہ ۶۳ و ۶۴

واقعہ یہ ہے (اور اس پر مورخین کا اتفاق ہے) کہ فرّخ سیر اور سادات میں کوئی جنگ نہیں ہوئی، دکن سے واپسی کے بعد حسین علی خاں اور ان کے بھائی عبداللہ خاں قطب الملک نے پہلے تو بادشاہ کی اجازت سے قلعے میں اپنے آدمی بٹھائے، قلعے کا بندوبست کرلینے کے بعد ایک دن فرّخ سیّر کو پکڑوا کے آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔ تھوڑے دن قید رکھا، اور بڑی تکلیفیں دے کر قتل کرا ڈالا۔ کامور خاں جس نے عالم گیر سے لے کر محمد شاہ تک کا زمانہ پایا اپنی تاریخ میں لکھتا ہے "عبداللہ حرام خوار... حقوقِ نعمت و تربیت ولی نعمت را نسیاً منسیاً پنداشتہ بنداز نام روہیلۂ بے دین را... بر سر دروازۂ محل سرا فرستاد کہ ولی نعمت را اسیر کردہ بیارند... دروازۂ محل سرائے خاص را بہ تیغ و تبر شکستہ وقیقۂ از بے ادبی فرو نہ گذاشتند...

ولی نعمت را گرفتہ از محل سرا آوردند... القصّہ ہماں وقت عبداللہ حرام نمک.. در چشم آں آفتاب آسمان خلافت نیل کشیدہ... و داغِ لعنت و نفریں بر پیشانی روزگار خود گذاشت... شب نہم جمادی الآخر جلادے چند را فرستادند بہ تسمہ چرمی آں شاہ را شربت شہادت چشانیدند" نسخہ کھجوا

فرخ سیر کی قید اور اس کے قتل کا حال خافی خاں کی زبان سے بھی سنئے: "از میانِ انبوہ زباں بہ بے حرمتی تمام کشاں آوردہ کحول ساختہ در حبس خانہ کہ بالائے ترپولیہ... چوں گور مظلم جائے تنگ و تاریک برائے محبوسانے کہ خواہند بہ انواع شکنجہ عذاب نگاہ دارند، ساختہ بودند، زندہ بہ گور در آوردند و در آں کنج غم و الم کہ سوائے یک طشت و آفتابہ برائے قضائے حاجت و صراحی آب دیگر رفیق و ہم دم نہ بود" جلد ۲ صفحہ ۸۱۶ در آں مکان بہ انواع شکنجہ عذاب.. بسر می برد... وقت تسمہ کشیدن بہ ہر دو دست تسمہ را گرفتہ دست و پائے لا حاصل زدن گرفت، محصلان جلاد پیشہ بہ ضرب زدن چوب دست ہائے او را از کار ساختند" ص ۸۱۹ و ۸۲۰

عبداللہ خاں نے اسی پر بس نہیں کیا، حرم شاہی کی عورتوں پر بھی دستِ تصرف دراز کیا۔ خافی خاں کا بیان ہے: "سید عبداللہ خاں... بہ روایت مشہور دو سہ زنِ حور لقا از جملہ محرمانِ حرم بادشاہی پسند نمودہ بہ تصرفِ خود در آورد۔ ہر چند کہ از زیادتی حرص.. قریب ہفتاد زن فراہم آوردہ" ص ۸۲۱ و ۸۲۲

سادات کو صرف ہم عصر مورخین ہی نے ملامت نہیں کی، شعرا نے بھی انھیں نفریں کی ہے۔ مرزا بیدل کے تعلقات سادات سے بہت اچھے تھے (مغل اور اردو ص ۴۲) لیکن فرخ سیر پر جو غیر ضروری مظالم ہوئے تھے، اور اس کی جو بے سبب بے حرمتی کی گئی تھی، وہ بھی اسے برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے ایک رباعی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا ایک مصرع یہ ہے: 'سادات بہ وے نمک حرامی کردند'

اس عہد کے ایک دوسرے شاعر کی رباعی کامور خاں نے نقل کی ہے:

کالے عجبے یزیدکیشاں کردند      جمعیت عالمے پریشاں کردند
بہلول ز سر گذشتہ گو ید تاریخ      کے کرد یزید ہر چہ ایشاں کردند[۱]

یہ سوال کہ فرخ سیر اور سادات کی نزاع میں حق بہ جانب کون تھا جداگانہ ہے، لیکن جناب خیال کا یہ دعویٰ (مغل اور اردو ص ۴۱) کہ سادات کو برا کہنے والے صرف انگریز مصنف یا ان کے کاسہ لیس ہیں صحت سے بہت دور ہے۔

(۲) محمد شاہ اور سادات کے جھگڑے' اور حسین علی خاں کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قطب الملک کو بھائی کی ایسی شہادت کی خبر ملی تو طیش میں نکلے، شاہی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ امرا بیچ میں آئے اور

---

[۱] مصرع آخر سے اعداد مطلوب نہیں نکلتے۔ اس میں تخرجہ ہے' لیکن کسی لفظ کا یہ پتا نہیں چلتا۔

لڑائی موقوف ہوئی"۔ ہر لڑائی کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہوتی ہے، لیکن جناب خیال کا مطلب یہہ ہے کہ ابھی لڑائی کی ابتدا ہی تھی کہ امرا نے بیچ میں پڑکر مصالحت کرا دی۔ یہہ بالکل واقعے کے خلاف ہے، مورخین کا اس پر کامل اتفاق ہے کہ محمد شاہ اور عبداللہ خاں کی فوجوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی عبداللہ خاں نے شکست کھائی، گرفتار ہوکر قید ہوئے، اور چند سال کے بعد بہ قول بعض مسموم ہوکر مرے۔ خافی خاں کی چند سطریں ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

"دوراں حال کہ سیّد عبداللہ خاں زخم شمشیر بر دست و تیر پوست مال بر پیشانی او رسیدہ بود حیدر قلی خاں ... برسر او رسید سید عبداللہ خاں بہ اظہار امانِ جاں کہ سیّدم بدو مخاطب گردید و بہ سبب ترحمے کہ حیدر قلی خاں در بارۂ او نمود، زندہ بہ دست آمد ص۹۳۲ و ۹۳۳ ... سید عبداللہ خاں... ازیں جہان فانی بہ روضۂ جاودانی شتافت۔ گویند مسموم ساختند" ص۹۴۱

(۳) سادات کے استیصال کے نتائج کا ذکر اس طرح کیا ہے:" ان واقعات اور محمد شاہ کی بے ترکیبیوں کا امرا پر سخت اثر پڑا۔ نظام الملک نے ... دکھن پر آخر قبضہ کرلیا، اور نواب صفدر جنگ نے بادشاہ سے ناراض ہوکر اودھ کو ایک مستقل صوبہ بنالیا" ص۶۴

نظام الملک خود سادات سے بہت بگڑے ہوئے تھے، اور جیسا کہ کامور خاں اور خافی خاں نے لکھا ہے سادات بھی ان کی فکر میں تھے۔ اس لئے یہہ خیال کہ سادات کے استیصال کی وجہ سے ان پر برا اثر پڑا صحیح نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وزارت کا عہدہ قبول کیا ہے۔ وزارت کے زمانے میں محمد شاہ کا جو رنگ انھوں نے دیکھا وہ ان کی خفگی کا باعث ہوا۔ صفدر جنگ غریب کا تو اس زمانے میں (اوائل عہد محمد شاہ) کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ ان کے خسر اور ماموں سعادت خاں (بعد میں برہان الملک کا خطاب پایا) حسین علی خاں کے قتل کے مشورے میں شریک تھے، اور یہی بات اُن کی ترقی کا باعث ہوئی۔ صوبۂ اودھ بھی انھیں سادات کے زوال کے بعد ملا۔ "سبب اور نتیجہ" جیسا کہ جناب خیال فرماتے ہیں "تاریخ کی جان" ہے، لیکن واقعات سے واقفیت پیدا کئے بغیر اسباب و نتائج سے بحث کرنا بڑی جسارت کا کام ہے۔

(۴) "انگریزوں نے پھر اپنی کرٹ پتلی میر جعفر کو (میر قاسم کی جگہ) مسند بنگالہ کا شیر قالین بنایا۔ اُدھر میر قاسم نے نواب شجاع الدولہ (اودھ) کی مدد سے بنگالہ و بہار پر قبضہ کرنا چاہا ... انگریزی فوجیں جمع ہوگئیں ... کی طرف سے میجر منرو دوڑا، اور فوراً بکسر پہنچ کر اس نے بڑھتے ہوئے لشکر ... کرم ناسا ندی کے ... شجاع الدولہ کی کمزوری سے میر قاسم گویا اکیلا لڑا، اور پسپا ہوکر بھاگا۔ ۱۷۶۴ء میں یہہ مشہور جنگ ... ہوئی، اور کرم ناسا کے کنارے ہندیوں کا کرم ناس کرکے اس طرح ان کی لٹیا ڈبوئی گئی"۔

جناب خیال نے اپنا سارا زور طبیعت صنائع لفظی پر صرف کردیا، اور اس کی مطلق ضرورت نہ سمجھی کہ

متداول تاریخوں ہی کو دیکھ لیں۔ یہہ دعوی کہ جنگ بکسر میں اصلی لڑنے والا میر قاسم تھا، اور شجاع الدّولہ محض تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا' یا برائے نام شریکِ جنگ تھا، بالکل بے بنیاد ہے' اور اس کی تائید میں ضعیف سے ضعیف روایت بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ کرم علی مصنف مظفر نامہ' جس نے اپنی کتاب جنگ بکسر کے دس گیارہ برس بعد لکھی ہے، اور جس کے متعلق انگریزوں کی خوش آمد یا پاس داری کا وہم بھی نہیں ہو سکتا، اس جنگ کے متعلق اس سے قبل کے مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نواب وزیر (یعنی شجاع الدّولہ) را تابِ مقاومت نہ ماند'... و از آں جا روانۂ بکسر گردیدہ توقف فرمودند کہ ہر گاہ انگریز بہ میدان بر آید، باز بہ معاوضہ پیش آیند' و درحین توقفِ بکسر بہ بہانۂ روز دروزینہ با نواب عالی جاہ (یعنی میر قاسم) ناخوشی ہا کردہ' مقید کردند' و تمام مال و اسباب اورا از نقد و جنس ضبط سرکار کردہ' قدرے برائے نام از اجناس مستعمل ناکارہ بہ سرکار حضرت صاحب قرانی فرستادند"۔

---

جناب سید مناظر احسن صاحب (استاذ دینیات جامعۂ عثمانیہ) نے اپنے ایک مضمون میں چہار عنصر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک دن میرزا عبدالقادر' بے دل نے اپنے باپ کی قبر پر ایک ریچھ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بھاگنا چاہتے تھے کہ ندا آئی: عبدالقادر میں تمہارا باپ حکیم نورالدّین ہوں' سخت دنیا دار ہونے پر بھی میں لوگوں کو اپنی دین داری کا یقین دلاتا تھا۔ اس لئے عالمِ مثال میں یہہ صورت ہو گئی ہے (خلاصہ) چہار عنصر مصنفۂ بے دل سے حکیم نورالدّین کا ریچھ کی شکل میں نظر آنا ثابت ہے لیکن، نہ تو وہ بے دل کے باپ تھے، اور نہ بے دل نے انہیں اس شکل میں دیکھا تھا۔ اصل واقعہ بے دل کے الفاظ میں یہہ ہے:

"حکیم طاہر گیلانی... باریاب.. گردیدہ آں حضرت (یعنی شاہ قاسم ہواللّٰہی).. فرمود:" ما از حق درخواستیم تا باطنت را بہ رنگینی ظاہر متصف گرداند و آئینۂ اعتقادہم بہ رتبۂ صافی کلامت رساند' امّا بہ طرفہ حالتے خواہشت بہ آں طرف گرد" سوم روز آں صحبت... بہ عرض رسانیدند کہ حکیم طاہر را یکایک بحران سوداوی دریافتہ... بہ مجرد عرض میرزا ظریف را.. طلبیدہ و فقیر را نیز ہم عنان تہیّۂ عیادت گردانید' فرمود:"... اگر بہ رفاقت ما عزم ملازمت ما نماید، زنہار اقبال نہ نماید... ہنوز دو روز دیگر باقی ست، بہ طریقے کہ ارادۂ الٰہی متعین ست.. خود بہ خودش ایں طرف خواہیم آورد"... القصہ تا بہ بالینش رسیدیم... گفت ما را فرصت رفتنے نہ دارم... امّا ہماں روزِ ملازمت برق عرتے بر خرمنم نظر دوختہ ست کہ نہ جرات اظہارے.. وقت صحبت... شتاب قیامتے تافتہ کہ بے سایۂ عنایت آں حضرت داغ دار عقوبتِ جاوید.. باید بود چوں ما (یعنی میرزا ظریف اور بے دل) از محرمانِ آں جناب تصوّری نمایم، پردۂ جرات از کار می افگند... در ست پدرم حکیم نورالدّین در صحن باغچہ.. مدفون ست.. شام آں روز کہ مستعدّ ہوائے

فاتحہ گردیدم۔۔ نعلے دو چارم گردید۔۔ سراز قبر برآوردہ کہ افروختن بہ زبانِ شعلہ اش می نالید۔۔ خرسے
بود در کمالِ کراہت نشستہ۔ خواستیم کہ برگردم، ناگاہ خرس فریاد برآورد کہ "اے طاہر، من نور الدین ام
از من مہراس از صورتِ مثالیم معنی کار عبرت شناس این ہا نتیجۂ ان معاصی ست کہ در دینِ باطلِ خود مان
عبادت دانستیم۔۔ آن چہ می بینم، ہیچ کافر مبیناد۔۔ ... بے ہوشی در دماغ طاقتم مینا شکست۔۔ رفقایم
از آن جا برداشتند... آئینۂ یقین گواہی می دہد کہ کشف این امور اثرے ست از توجہ حضرت شاہ...
عمرِ موہوم بال افشانِ کم فرصتی ست، مبادا در کشمکش این حالت بمیرم" گفتم: "مصلحت ست کہ یک دو
روزانہ خطِ تسلیم درنہ باید گذشت..." روز سوم غلغل آمد، حلم جنون انگیخت... صیحے جلوہ گر گردید۔۔ در حالتے
چشمش بر جمالِ حضرت شاہ افتاد۔۔ نعرہ زد و سر بہ خاک نہاد... در کنار کشید و مقابل خودش جا بخشید،
بعد از آن بہ تلقین شہادت از زمزمہ سازِ یکتائیش آگاہ نمود و از ہر طرف نوائے مبارک بادِ شرفِ اسلام
جوشید... سا عتے بسر نیادہ، بہ بوسہ گاہِ قدم حضرت فتاد... و عرضہ داد کہ "من یک دو نفسے بیش ندارم
رخصتے تا بہ منزل گذارم و بہ ساں ہا دوگانۂ اخلاص یگانگی بجا آرم" آں حضرت فرمود: "تعجیل این اندیشہ از دستہا
نہ باید داد..." بعضے از عیان محفل حال زہے آداب مشایعت کردند و تا داخلِ خانہ گردیدنش، آئین ہم عنانی بجا
آوردند۔ ہنوز فرصت مراجعت در کمین نفس راست نمودن بود... بہ سجدۂ ابدی پیوست۔ حضرت بہ دستِ
مبارکش بہ خاک سپرد... [illegible] بر ائمہ معصومین علیہم ست صریح..." کیا فاضل مضمون نگار یہ
بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ چہار عنصر کے نسخے میں نور الدین نے طاہر کی جگہ عبدالقادر کو مخاطب کیا ہے اور اس
کتاب کی کس عبارت سے انھوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ نور الدین کو گندم نما جو فروش ہونے کی سزا مل رہی تھی؟
فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ آزاد بلگرامی کی چشم دید شہادت ہے کہ جب کبھی میرزا
بے دل آصف جاہ سے ملنے جاتے، آصف جاہ گدی سے اٹھ جاتے اور بہ اصرار پاس بٹھاتے۔ وقت رخصت ڈیوڑھی
مبارک کے پھاٹک تک پہنچانے تشریف لے جاتے۔ آزاد نے سرو آزاد میں اس کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے وہ یہ ہے:
"ہرگاہ میرزا بہ دولت خانۂ نواب می رفت، استقبال و مشایعت می کرد و بر مسندِ خود می نشاند" فاضل مضمون نگار کا
بیان اگر آ[illegible] کسی دوسری تصنیف پر مبنی ہے تو براہ کرم وہ عبارت جس کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے پیش کریں۔
اس سلسلے میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ آزاد بلگرامی کا کوئی بیان بیدل کے متعلق چشم دید نہیں ہو سکتا، اس لیے
کہ آزاد ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور بے دل کی وفات کے بعد ہی ۱۱۳۳ھ میں گئے تھے۔ [illegible]
جب بے دل کا قیام آزاد کی [illegible] سے پہلے کا واقعہ ہے

قاضی عبدالودود

دو چشم سیاہ اور کاجل سیاہ
نہ ہو کیوں کے دونوں کا باہم نباہ

تھی اس کی نگہہ کی لگاوٹ نئی
مسی کی تھی لب پر جماوٹ نئی

نکل کر زچہ خانہ سے وہ پری
ہوئی برق ساں گرم جلوہ گری

وہ مسند پہ بیٹھی نئی شان سے
ہوئی جلوہ آرا نئی آن سے

دیا غسل طفل پری زاد کو
ہوئی خرّمی سروِ آزاد کو

پنھایا اُسے سب زری کا لباس
تصدق ہوئیں دائیاں آس پاس

پنھایا جواہر کا زیور اسے
لگے خوشنما لعل و گوہر اسے

دیا گود میں اُس کی ماں کے شتاب
ہوئی شاد دیکھ اس کو وہ ماہتاب

دیا گود میں دایہ کی وہ پسر
کہا اس قمر کو سُلا جلد تر

گئی اس کو لے کر کے دایہ شتاب
ہوا اس کی گودی میں وہ گرم خواب

ہوئی نغمہ پرداز ہر رشکِ حور
نئے ناز سے اُس پری کے حضور

اٹھا شور شادی کا ہر ساز سے
تھرکنے لگی ڈومنی ناز سے

بنانے لگی بھاؤ وہ ناز سے
اٹھی بانگ عشرت کی ہر ساز سے

رباب اور قانون سے نکلی صدا
اٹھی چنگ دنے سے خوشی کی نوا

اٹھی بین سے تال ہنڈ دل کی
پچھی دل میں دل کش صدا ڈھول کی

اثر بخش سارنگیوں کی صدا
خوشی سے بھری ارغنوں کی نوا

غرض نکلیں سازوں سے دل کش صدا
سماں ناچ کا راگ کا بندھ گیا

محل میں ہوئی اس کی بھی دھوم دھام
ہوا اس پری کا بھی چلّہ تمام

سب اس کے پرستار و خادم کو واں
دیے جوڑے سلطان نے سب زرفشاں

جواہر دیا ان کو اور مال و زر
ہوا شاد و آباد وہ سارا گھر

اور ان دونوں دائی کو بھی زر دیا
لباس زری اور زیور دیا

اور ان کسبیوں کو بھی جوڑے دیے
جواہر دیا زر کے توڑے دیے

دیا اس کے نوبت نوازوں کو زر
فقیروں کو اور بے نواؤں کو زر

عنایت کیا پھر گداؤں کو زر
ہوئے شاد خرم وہ رشک قمر

گئیں تینوں پوتوں کو لے دائیاں — خوشی سے وہ سلطاں کے پاس آئیاں
دیا اس کی گودی میں ان کو لیا — لیا اُن کو سلطاں نے چھاتی لگا
دیا دائیوں کو یہ اُن کو کہا — کرو پرورش ان کو تم گھر میں جا
نگہبان رہنا ان کی تم صبح و شام — کرو احتیاط ان کی تم سب مدام
مہیا ہوئے خوان نعمت وہاں — بچھایا وہاں ایک دستار خواں
ظروف بلوریں ظروف ذہب — ملبّب تھے اقسام نعمت سے سب
ہر اک قاب میں میوۂ خشک و تر — پیالوں میں لبریز شیر و شکر
طلاکار بلّور کے چند قاب — بھرے اُن میں اقسام کے تھے کباب
قرینے سے ان کو چنا جا بہ جا — خوشی سے ہر اک نے تناول کیا
ہوئے سیر نعمت سے پانی پیا — شتاب اب ہاتھ منہ دھو لیا
ہوئے سیر نعمت سے سلطان کے — کیے نوش جاں بیڑے تب پان کے
ملا عطر تن میں گئے اپنے گھر — ہوئے شاد و خرّم پدر اور پسر
لگے پرورش ہونے اطفال شاہ — کہ سلطاں کو بھی جن کے جینے کی چاہ
محافظ تھیں ان کی سدا دائیاں — فدا اُن کے کرتی تھیں سب نقد جاں
جھلاتی تھیں جھولے میں ان کو صدا — سلاتی تھیں جھولے میں ان کو سدا — ورق ۸۰
دل و جان سے کرتی تھیں سب احتیاط — کہ حاصل تھا ان سے مواد نشاط
ہوئے پرورش ناز و نعمت سے سب — خوش و خرّم اطفال تھے روز و شب
تصدّق تھے مادر پدر جان سے — انھیں پالتے تھے وہ ارمان سے
جد و جدّہ اُن کے فدا تھے مدام — کریں تھے انھیں پرورش صبح و شام
خدا نے کیا ان کا آباد گھر — ہوا شاہ کا عیش بنیاد گھر
رہے شاد و آباد گھر میں مدام — ہوئی یہ کہانی بھی اس جا تمام
الٰہی ہمیں بھی تو دل شاد کر — مرے شہر میں مجھ کو آباد کر
صفا دے مرے قصر و ایوان کو — کر آراستہ میرے دیوان کو
مجھے بھی بٹھا زر کی مسند پہ واں — مرا حکم ہو مثل دریا رواں

مرے گلستاں کو نئی دے بہار
شگفتہ مرے دل کو کر ایک بار

ذرا مہر سے اپنی اے ذوالجلال
مرے مدّعی کو تو کر پائمال

دے اپنی عنایت سے فتح و ظفر
سنا دے نئی اب خوشی کی خبر

کر اس مثنوی کو مری پُر اثر
سخن کو مرے بخش آب گہر

مرے دل کو آرام دے جی کو چین
منوّر کر اب لطف سے میرے نین

کرم سے تو کر میری حاجت روا
کر اب دین و دنیا کی نعمت عطا

الٰہی مری عرض کرنا قبول
طفیلِ رسولؐ و طفیلِ بتول

مجھے کر سرافراز تو ایک بار
طفیلِ علی شیرِ نام دار

تو اب کر دے روشن مری دونوں عین
طفیلِ حسن اور طفیلِ حسین

ترے فضل سے اے قدیم المثال
کٹے عیش و عشرت میں ہفتاد سال

اسی طور خوش رکھنا مجھ کو مدام
الٰہی اثر بخش ہو یہ کلام

پڑھیں مثنوی میری سب خاص عام
کریں خیر سے یاد مجھ کو مدام

یہ شعر [illegible] گفتار ہے
کہ سن اس کو طوطی شکر بار ہے

یہ [illegible] رنگین نرٹ
مٹھائی کے بل سے ہے شیریں نپٹ

فصاحت [illegible] ہے اس میں بھری
صفا اور لطافت ہے اس میں بھری

نہ سمجھے ہے کوئی زباں کو مرے
نہ جانے ہے حسنِ بیاں کو مرے

عزیزوں سے میں کیا کروں التماس
کوئی ہے کہاں یاں حقیقت شناس

کسی سے ہمیں کیا سروکار ہے
ستائش کا ایزد سزاوار ہے

درود و تحیّت ہے شام و سحر
محمد پر اور آلِ اطہار پر

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدین احمد

---

دائرۂ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

| جلد ۳ | مارچ ۱۹۴۲ء | نمبر ۵ |
|---|---|---|




چندۂ سالانہ للعہ　　　فی پرچہ　　　۶/

# اُردو ادب میں طنز اور ظرافت

(مسلسل)

(۳)

اُردو نثر میں طنز اور ظرافت کی وہ کمی نہیں جو نظم میں ملتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نسبتاً نثر میں طنز اور ظرافت کی افراط ہے اور اس افراط میں بیسویں صدی کے مصنفین کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حضرات کی کافی تعداد ہو گئی ہے جو طنزیہ اور ظریفانہ مضامین صرف لکھتے ہی نہیں بلکہ لکھنے پر مصر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ جسقدر جلد ممکن ہو اس کمی کے الزام سے اُردو کے دامن کو پاک کر دیا جائے ان کے قلم سے مضامین کا سیلاب جاری ہے۔ وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ مضامین معیاری ہیں یا نہیں وہ کیفیت کو کمیت پر قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ بہرکیف ان مصنفین اور انشا پردازوں کو تین گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی مدعا نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ پُر مقصد ہے جو نقائص انسانی، سماجی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی غرض ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے یا کم سے کم ان نقائص کو دیکھکر برافروختہ ہو جاتا ہے۔ اس گروپ کے انشا پرداز کا جذبۂ غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبۂ غضب کی اپنی ہجوؤں میں ترجمانی کرتا ہے اس قسم کے انشا پرداز خالص طنز کے عوض ظرافت اور طنز، زیادہ تر طنز سے مصرف لیتے ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ان کا نصب العین نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر وہ اس میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل مقصد کسی نقص کو رفع کرنا یا اپنے جذبۂ نفرت، غضب و حقارت کی ترجمانی ہے۔ تیسرا گروپ وہ ہے جسکی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفۂ زندگی کی یا ان مشاہدوں کی جن پر اس فلسفہ کی بنا ہے ظرافت آمیز نقاشی ہے۔

(۱) پہلے گروپ میں سب سے پہلا نام غالب کا ہے۔ غالب کی طرز تحریر کی خصوصیتوں کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:۔

" وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں

ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشل اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں۔ بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں، باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی"۔

میں تو یہ کہوں گا کہ "مرزا کی تحریر، صرف خط و کتابت کے محدود دائرے" ہی میں" اپنا نظیر نہیں رکھتی" بلکہ اس وقت تک بھی کوئی اردو انشا پرداز بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان" کے غالب کی تحریر کی مثال نہیں پیش کر سکا۔ یہ صحیح کہ مرزا کے بعد "نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشل اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں" بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں" اس سے بھی انکار نہیں کہ غالب کی نثر ہر قسم کے موضوعات کے لئے موزوں و مناسب نہیں۔ اس کا دائرہ کسی حد تک محدود ہے اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ اکثر غالب اپنے خطوط میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ابھی تک اردو میں جو خالص ظرافت کے نمونے، ایسے نمونے جو ادبی معیار پر بھی پورے اتریں، نظر آتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں، اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے خصوصاً موجودہ زمانے میں اس طرف توجہ کی گئی اور متعدد مصنفین اس میدان میں اترے اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی غالب کی بلند مرتبت شخصیت کا حامل نہیں کسی کا تخیل بھی غالب کے تخیل کی باریکی، تیزی، زور، بلند پروازی کو نہیں پہنچتا۔ ان کی ذہنیت میں وہ گہرائی اور پختگی نہیں جو غالب کی ذہنیت کی نمایاں خصوصیت ہے، کہیں غالب کی شوخی، رنگینی، بے ساختگی، بوقلمونی، قوت ایجاد کی مثال بھی نہیں ملتی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی کی انشا ادبی معیار کے لحاظ سے غالب کی انشا کو نہیں پہنچتی۔

غالب کی زندگی میں ان کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ گرچہ وہ عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر نہ کرتے تھے لیکن دنیا کی دولت و حشمت سے انہیں اس قدر میسر نہ تھا جتنا وہ چاہتے تھے۔ پھر بھی اُن کی طبیعت میں غضب کا ابھار تھا جو کبھی انہیں پنپنے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ان کی طبیعت کا ابھار ان کے ہر ہر لفظ، ہر ہر جملہ سے ٹپکتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی یہی ابھار ہے۔ اصل یہ ہے کہ ظرافت ان کی فطرت ثانی تھی۔ جہاں قلم اٹھایا اور ظرافت کے پھول جھڑنے لگے۔

"میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو۔ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دئے۔ خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آئی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا۔ ۵۰ روپے خرچ راہ دئے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کرینگے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائیگا۔"

یہاں صرف ظرافت ہی موجود نہیں بلکہ گویا غالب نے ایک زندہ سین پیش کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی قوت غالب میں موجود تھی۔ وہ محض کسی شے کسی واقعہ، کسی سین کا بیان ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں پوری تصویر صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں، شوخی سے تو خطوط بھرے پڑے ہیں،

"دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا، یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے"

اس شوخی کے ساتھ متانت و سنجیدگی بھی موجود ہے۔ لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثلاً جب یوسف مرزا کو ان کے باپ اور ان کے بیٹے کی تعزیت میں خط لکھتے ہیں تو اس میں لہجہ سنجیدہ و متین ہو جاتا ہے۔ اور الفاظ میں ایک خاص قسم کا اثر آ جاتا ہے۔ شوخی و بذلہ سنجی سے وہ قطع نظر کرتے ہیں۔ تکلفات سے یکقلم کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور سیدھے سادھے مؤثر پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مثالوں اور ان جیسی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب صرف ہنسنے ہنسانے پر قادر نہ تھے۔ وہ رونے رلانے کی بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ غالباً ان کی شوخ طبیعت اور ان کا فلسفہ "مصری کی مکھی بنو، شہد کی نہ بنو" دونوں مانع آئے ورنہ اس قسم کی عبارت میں بھی بے مثل ہوتے۔

"ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی۔ رکاب میں پاؤں ہے باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخشدیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ❊ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اگر اردو انشاپرداز چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں۔ اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کرسکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنہیں فنا نہ ہو تو پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔

غالب کے خطوط کے بعد "اودھ پنچ کی زعفران زار نظم و نثر" سامنے آتی ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے وہ مختلف مذاق بھی رکھتے تھے۔ اودھ پنچ کے مضامین کے متعلق چکبست نے یوں اظہار خیال کیا ہے: "قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہئے.... اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر.... ان کا ہنسنا غالب کی زیرلب مسکراہٹ سے الگ ہے یہ خود بھی نہایت ہی بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں"۔ کسی اتفاق نہو لیکن مجھے چکبست سے کامل اتفاق ہے کہ "اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں"۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ بحیثیت مجموعی اودھ پنچ کی ظرافت کو ادبی ظرافت نہیں کہہ سکتے "بذلہ سنجی و تمسخر" اور ظرافت کے ادبی مفہوم میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ جو طنز اور ظرافت اودھ پنچ کے مضامین میں ملتی ہے وہ کچی، خام، ناقص اور طفلانہ ہے۔ ان مضامین کی یہ خامی نہیں کہ ان میں غالب کی زیرلب مسکراہٹ نہیں ملتی۔ اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ اودھ پنچ کے ظریف خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ زیرلب مسکراہٹ اور بے تکلف قہقہہ، دونوں میں ادبی شان نمایاں ہو سکتی ہے اودھ پنچ نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا تھا۔ یہ کام ایک حد تک ضروری بھی تھا اور مستحسن بھی۔ لیکن پنچ نے جو خدمتیں انجام دیں وہ وقتی تھیں۔ اس کی اہمیت تاریخی ہے ادبی نہیں۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں ادبی شان کی نمایاں کمی ہے۔ جو ظرافت یہاں ملتی ہے وہ ادبی نہیں بازاری ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔ "وہ مارا۔ کیوں جی۔ تم لاکھ شور و غل مچایا کئے ہم نے اپنی تہذیب کا ڈنکا لگا ہی دیا۔ ہے ہے، دونے کہیں میں لگا لگا تاکید اہم سے کہئے تو بڑے بڑے بانس لگا دیں لیکن یہ اتنی لمبی چوڑی باتیں ہی کاہے پر ہیں ذرا ہم بھی تو سنیں آپ نے ابھی تک سنا نہیں۔ اجی بی زہرہ کا نکاح ہو گیا۔ مشتری نے بھی کوئی خریدار پیدا ہوئے ہیں۔ اب تو سب ہی کی سب رنڈیاں گھر گھر جاکے بیٹھنے کو ہیں۔ خیریت ہے ذرا سی اگر رہیا ہیں منہ دھو رکھیے خدا لگی ہے تم اور رنڈیوں کو مراق نہ خفقان نہ آنوجی کا"

طبیعت ایسی رنڈیاں گھر نہ پڑیں تو کیا کریں ۔"

اودھ پنچ کے پہلے دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین، سرشار ظریف، ہجر، آزاد، شہباز، برق، شوق اکبر کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے اور اسکے دوسرے دور میں سب سے ممتاز نام سید محفوظ علی صاحب کا شمار کیا جاتا ہے۔ میں خالص ظرافت کے سلسلے میں سجاد حسین سرشار اور محفوظ علی صاحب کا ذکر کافی سمجھتا ہوں۔ سجاد حسین اور سرشار دونوں نے اردو میں غالباً پہلی مرتبہ ایک ظریفہ کردار پیش کیا ہے حاجی بغلول اور خوجی کے کیریکٹر اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہی حقیقت کہ اردو ادب ان سے بہتر کیریکٹر نہ پیش کرسکا اردو ادب کی ایک سنگین تنقید ہے۔ رشید احمد صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے پک وک ابراڈ کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ حاجی بغلول اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آیا ہے" اگر کوئی شئے کسی خاص ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہو تو اس سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ حاجی بغلول اور پک وک میں وہی فرق ہے جو ایک مدھم شمع اور آفتاب میں ہے۔ یہ صحیح کہ حاجی بغلول کا کیریکٹر اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن جہاں کسی دوسرے ادب سے مقابلہ کیا پھر اس کیریکٹر کی تہی مائیگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حاجی بغلول صرف "ایک طور پر" اور "ایک حیثیت سے" ہی پک وک کا نامکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ حاجی بغلول سراسر نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کی اہمیت یہی ہے کہ اس سے ایک نئی راہ کھلتی ہے۔ خوجی کا کردار حاجی بغلول سے بہتر ہے۔ یہاں کسی کا نامکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ یہ ایک تخلیقی کارنامہ ہے، کافی رنگین اور متنوع۔ خوجی خود ظریف ہیں اور اس ظرافت کا سبب ہیں جو دوسروں میں ہے۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور لوگوں کو ہنساتے بھی ہیں اور لوگ ان پر ہنستے بھی ہیں۔ وہ ایک منفرد ہستی رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت مختلف عناصر سے بنی ہے۔ خوجی کا کردار کسی ایک خصوصیت یا کسی خاص طرز گفتار پر مبنی نہیں اور انکی شخصیت انکے گفتار و کردار سے ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کے کردار پر دوسروں کے الفاظ اور اعمال سے مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت دوسروں کی شخصیتوں سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم کی وجہ سے انکی ہستی پر نت نئی روشنی پڑتی ہے۔ خوجی کے کمالات کی فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں :-

"سنو میاں خواجہ بدیع ہفت زبان ہے وہ کون سی زبان ہے جس سے یہ واقف نہیں۔ فرمائیے عربی فارسی ترکی اور فرانسیسی سب میں عبور انگریزی زبان کا بادشاہ" پھر فرماتے ہیں: "حضرات سنئے آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم آدمی مستغنی ہوتا ہے اور میری استغنا سے بھی آپ خوب واقف ہیں۔

مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا شاق گذرتا ہے اور وجہ کیا کہ ہم کسی سے دب نکلیں۔ جب طمع ہمارے مزاج میں چھو نہیں گئی۔ لالچ سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ حرص کے قریب نہیں جاتے ہیں پھر ہمارے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور امیر اور غریب اور مفلس سب یکساں، خوجی نے دنیا دیکھی ہے ان کے ساتھ مختلف و متنوع قسم کے واقعات پیش آئے ہیں۔ ساری دنیا نے ان کی قدر کی ہے۔" مصر میں وہ اعزاز ہوا کہ سبحان اللہ، استنبول اور قسطنطنیہ میں تو وہ قدر افزائی ہوئی کہ زمانہ واقف ہے"۔ ہم خوجی کے کسی اور محاسن کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن ان کی قوت ایجاد کی ضرور قدر کرتے ہیں۔ ان کی قوت ایجاد بلا کی ہے۔ بات کی بات میں وہ ایک ایک مرتب کر سکتے ہیں۔ "صف شکن علی شاہ" کی داستان ملاحظہ ہو: "حضور ریاست یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف سے نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم! یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ غور کر کے دیکھا تو روشنی پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے ....

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چھوٹا سا دریا تھا اس طرف ہم اس طرف غنیم لب دریا مورچہ بندی ہوگئی اور گولیاں چلنے لگیں۔ دفعتاً بس خدا وند میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود آتے ہی دیکھا آؤ نہ تاؤ ایک لکڑی لے کے کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ گئی اور ہزار ٹکڑے ہو گئی ... میں مزے مزے افیون گھول رہا تھا، اور افسر اور سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ میں! یا الٰہی یہ تالیاں کس نے بجائیں۔ سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے۔ پیالی لبوں تک لے ہی گیا تھا کہ اوپر روسیوں نے باڑھ ماری کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح اور مقتول ہوئے مگر واہ رے میں خدا گواہ ہے۔ پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اب سنئے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود اور میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ افیون سے تر کیا اور زور سے چونچ کھولی تو دو قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو پھٹا تو ارارا دھوں اور لطف یہ ادھر کا ایک آدمی ضایع نہیں ہوا۔ بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔ بیٹر کیا خدا جانے وہ کون چیز نایاب شئے ہے۔"

خوجی کے کیرکٹر میں تین کیرکٹر پنہاں ہیں: خوجی جیسا وہ اپنے کو سمجھتے ہیں، خوجی جیسا انہیں ناول کے دوسرے کردار سمجھتے ہیں۔ خوجی جیسے وہ پڑھنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ اس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اپنے زاویہ نظر کے ساتھ ساتھ اور دونوں زاویوں سے بھی واقف ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود بھی خوجی کا کیرکٹر ناقص ہے۔ اور یہ نقص وہی ہے جو فسانہ آزاد کا عام نقص ہے یعنی تکلف اور اس تکلف کا لازمی نتیجہ ضرورت سے زیادہ طوالت اور غرابت بھی۔ بقول عبدالباری آسی صاحب! "نگاہ خود طوالت کلام کی وجہ سے ہر داستان کو لندھور بن سعدان کی داستان خیال کرنے لگتی ہے۔" بہر کیف

خوجی" اُردو میں ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

سجاد حسین اور سرشار نے زندہ کردار کی تخلیق کرنے کی کوشش کم و بیش کامیاب کوشش کی تھی سید محفوظ علی صاحب تمثیلیہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی نہایت دشوار ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے طاقتور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے سید محفوظ علی صاحب میں یہ اوصاف موجود نہیں۔" شیخ سمار اللہ کی صاحبزادیاں تمثیلیہ کی صنف میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں۔ یہ ایک حد تک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا حسن سطحی ہے۔ خیالات معمولی ہیں اسمیں نہ خطیبانہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف:

"آسیہ (آہ سرد بھر کر) ہاں بہن سچ کہا، خدا کی شان، کبھی ہم بھی اس پڑوسی میں تمیز والے سمجھے جاتے تھے۔ سینا پرونا ہم جانتے تھے۔ کھانا پکانا ہم جانتے تھے۔ آج پھوہڑ ہم، بدتمیز ہم، گندے ہم، گھنونے ہم مگر اس کی وجہ جانتی ہو، آیا پیسہ آئی مت گیا پیسہ گئی مت، گانٹھ میں دام تو سب کریں سلام۔"

جس کی نگاہوں کے سامنے تمثیلیہ کی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں وہ اس قسم کی مثال سے مرعوب متاثر نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ آرٹ نہایت دشوار ہے اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس آرٹ کے جاننے اور برتنے والے اردو میں موجود نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ محفوظ علی صاحب نے "پنچانہ رنگ" کو ترک کرکے اسپکٹیٹر سے قریب ہونے کی کامیاب اور مستحسن کوشش کی۔" خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں:" نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب بی رلے ساکن بدایوں ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سرتاپا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ہے۔" یہ تنقید نہیں تعریف ہے اور اس تعریف میں صحت صرف اس قدر ہے کہ محفوظ علی صاحب کا لب و لہجہ "اودھ پنچ" کے مقابلہ میں زیادہ متین و سنجیدہ ہے وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے سنجیدہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات میں گہرائی نہیں اور انکی تنقیدی قیمت نہیں اس کے ساتھ ساتھ انکی سنجیدگی سبکی، لطافت، باریکی کی منافی ہے اور اکثر تو یہ ناقابل برداشت بیرنگی کا سبب ہو جاتی ہے:" میرے تجربہ میں صاحب دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے۔ تفصیل سکی یہ ہے کہ ایک صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے مزاج کے ساتھ تو ہمیشہ گرم تر رہتا ہے مگر غیر صاحب دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریل کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لئے چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یا دعوت چاہئے، ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لئے چاہے وہ خفیف درخواست ہی لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم۔"

محفوظ علی صاحب کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کی رائے تسلیم کرنے کے قابل نہ تھی لیکن انہوں نے اپنی ظرافت پر نہایت جامع تنقید کی ہے: "میری طبیعت کی افتاد شوخی و ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ ترغم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں... جسقدر جی کا بہاؤ دکھ کی جانب ہے سکھ کی جانب نہیں۔ مگر جناب اکبر کی ہمنشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجکو بھی شوق ہوا کہ اُردو کے اس میدان میں طبع آزمائی کروں... میری ظرافت... درحقیقت ظرافت نہیں ہے میں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ اردو ہے اور لوگوں میں زندہ دل اور لطیف نکتہ چینی کا شوق پیدا کرنے کو بہ طور بار تیار کیا ہے... اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے۔ وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے۔ بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی ہے۔ بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے بالقصد بھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اڑھادی ہے... ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا مگر میں نے محض زبان اُردو کی خاطر اس میں دخل دیا ہے... گو میں جانتا ہوں کہ لطافت و ظرافت جس کا نام ہے وہ ان مضامین میں نہیں ہے تاہم نہ ہونے کے مقابلہ میں کچھ ہونا بہتر تھا"۔

خواجہ صاحب کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی ہے۔ وہ اپنے کو لئے دئے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ قدم سنبھل سنبھل کر رکھتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہوتے، اسی وجہ سے ذرا تصنع اور آورد کا شبہہ ہوتا ہے،۔ "مقتول کا رقص": "کل میدان جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا اور اسکے رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ ملک الموت نے کہا اس کو میری گود میں دیدو میں نے کہا ٹھہرو! اس کے رقص کی سیر تو کرلوں۔ فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے آپ کو اسمیں مزا آتا ہے۔ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف ہے۔ صوفی باطنی تلوار سے مجروح ہو کر ناچتا ہے اور زخمی ظاہری تیغ سے دونوں میں ایک ادا ہے مرنے والے نے کہا ناچنے کا لفظ صوفی کی توہین ہے۔ میں بولا سب مہذب ناچتے ہیں۔ بادشاہ اور بیگم تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں پھر صوفی کو رقص میں کیا عار ہے۔ تہذیب مادی ہو یا روحانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے..."

یہ ہے خواجہ صاحب کا رنگ۔ خواجہ صاحب کی اصل اہمیت ان کی انشا ہے۔ وہ نہایت ہی آسان سادہ، پر لطف طرز میں لکھتے ہیں۔ خصوصًا جب وہ رعایت لفظی کے دام میں نہیں جا پھنستے۔ اور ہمیشہ سنجیدگی و متانت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور ان کی پاکیزہ اردو سے اگر نوجوان انشا پرداز استفادہ کریں تو بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی انشا کو بہت سے نقائص سے پاک کر سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی پاکیزہ اُردو

کی ایک مثال ملاحظہ ہو، ایسی مثال جسمیں ظرافت مطلق نہیں۔

"دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آکر جل جاتا ہے، کہیں بلبل پھول کو گلے سے لگاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے تنکا کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینہ سے چمٹ جاتا ہے مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوا چکوی کو نہ ستاؤ کہ وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں۔"

مزاح نگار کی حیثیت سے اسوقت پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کافی شہرت رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ ان دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے۔ اور یہ مقام وہی ہے جسے "انڈر گریجویٹ" ذہنیت کہتے ہیں۔ دونوں استعداد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ شمار کیا جائے تو لائق تحسین ہے اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاق صحیح پر دانستہ ظلم کرنا ہے۔ ان کی خامی کا الزام ایک حد تک پڑھنے والوں پر بھی عاید ہوتا ہے۔ ان کے مضامین اس قدر مشہور ہو جائے، ان کی اس قدر مانگ ہوئی کہ انہوں نے سمجھا کہ تصنیف کی دشواریوں پر انہوں نے کامل اختیار حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے مزید کاوش کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو شروع سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی حالانکہ ان کی کھیتی میں خود رو گھانس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ انہیں لازم تھا کہ جو کچھ وہ لکھتے تھے اسے محض مشق سمجھتے۔ لکھتے اور لکھ کر پھاڑ دیتے اور آہستہ آہستہ مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر میں وسعت، باریکی اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ دونوں کو سوجھتی ضرور ہے لیکن جو کچھ سوجھتی ہے وہ محض سطحی قسم کی چیز ہے۔ بذلہ سنجی اور تمسخر، لطیف ظرافت کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اسکے ساتھ ساتھ ان میں ترقی کی گنجائش نہیں۔ ان کا رنگ اپنی جگہ پر پختہ ہو گیا ہے۔ دونوں کے مضامین سے ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:-

"ہندوستان کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اس کے سر پر، گود میں، آگے پیچھے ادھر یا اُدھر ہانپتا ہوا زبان نکالے دُم ہلاتا ہوا کتا ضرور ہے اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو یوں ہی سا ہے مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کتے کے ان کو لطف زندگی ہی نہیں حاصل ہوتا۔ جب تک ان کے نرم اور معطر آغوش میں ایک پلا نہ دبا ہو وہ اپنے عدم وجود کو یکساں سمجھتی ہیں اور اگر پلا دبا ہوا ہے تو اس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے

اُسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دبوچتی ہیں کہ ان کے عشاق کتا بن کر نہ پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کتا بن جانے کے لئے دست بدعا ہو جاتے ہیں .... "قدر سگ انگریز داند یا بداند اسکی میم"

"چودھری صاحب نے اب وہاں دہائی دینا شروع کر دی اور ہیں پڑے پڑے ان کی کوششوں کی داد دے رہا تھا وہ چلا رہے تھے اب نالائق شیخ برحمتک ...کم بخت اشدۃ المن الرقص... ابے اخرج... من الگرداب ارے موذی ناؤ نکال" چکرا کر وہ پھر میرے اوپر گرے میں نے آنکھ کھولکر دیکھا ساری دنیا گھوم رہی تھی۔ چودھری صاحب نے پڑے دھاڑ کر کہا" ایہا الشیخ ... ابے الو ... ابن الالود الخنزیر... قسم خدا کی ... واللہ... ارے بھائی شیخ ارے اشدۃ المن الرقص ... ارے مرے ... ابے روک ... روک ارے نکال... یا اللہ... ابے ایہا الشیخ من الموذی اخرج من الماؤ گرداب ... نالائق ... بدمعاش ... واللہ بھائی شیخ .... مگر توبہ کیجئے بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ رکنے والی تھی!"

ان مثالوں سے دونوں کی شخصیت اور ذہنیت نمایاں ہے اور دونوں ترقی کرنے سے رک گئی ہے۔ شوکت تھانوی کے سارے کارنامے پر ان کے اس مصرع سے روشنی پڑتی ہے:" قدر سگ انگریز داند یا بداند اسکی میم" یا اس دوسرے مصرع سے" تو مشق ناز کر سارا اندھیرا میری گردن پر" جو شخص ایسے مصرعے موزوں کرکے سمجھے کہ اس نے ایک ظرافت کا شاہکار پیش کر دیا ہے اُسے ظرافت کے معنی سے کوئی شناسائی نہیں ہوسکتی۔ شوکت تھانوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ ان مصرعوں میں ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں وہی" انڈر گریجوٹ" ذہنیت ہے جسکی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہی انڈر گریجوٹ ذہنیت اس دوسری مثال میں بھی نظر آتی ہے لشنذری کسی طالب علم کا شاہکار ہو سکتا۔ پورے افسانے ساری جزئیات سے مصنف کی کمزوری اور خامی ظاہر ہوتی ہے۔ جب میں اپنے طالب علموں کو کبھی کہتا ہوں کہ کوئی دلچسپ مقالہ لکھو اور اسمیں جسقدر ممکن ہو شعوری ظرافت سے مصرف لو تو وہ اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں۔

میں پطرس کو شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی دونوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ پطرس کی ذہنیت نسبتاً زیادہ پختہ ہے۔ اس میں وہ سطحیت نہیں۔ پطرس غلط اردو لکھتے ہوں، ان کی ظرافت اکتسابی ہو لیکن ان نقائص کے باوجود بھی محض اپنی شخصیت کی گہرائی کی وجہ سے شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انکی ظرافت کی ایک اچھی مثال یہ ہے:

" علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے اب جناب وفاداری اگر اسی کا

نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقع پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔"

یہ ایک مشاعرے کا بیان، دلچسپ بیان تھا، اب ایک دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

"جلسہ شروع ہوا ایک نے مصرعہ اٹھایا سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا مجمع کی یہ حالت ہو جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور و بے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کرکے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی۔ پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات نوتی پیدائش موجود ہیں پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ منقطع کر دیا دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں۔ جناب صدر سکریٹری مشاعرہ مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے گل حکمت ہو گئے۔"

جو فرق ان دونوں مثالوں میں نظر آتا ہے وہی فرق پطرس اور رشید احمد صاحب میں ہے جگہ موجود ہے پطرس میں وہ بے ساختگی، وہ آمد، وہ جوش نہیں جو رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس کی انشا بھی نسبتاً پھیکی، بے جلا، اکتسابی معلوم ہوتی ہے رشید احمد صاحب کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ انکی تحریروں میں ایک ادبی شان ہوتی ہے جو شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور پطرس کی تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ مزاح نگار ایک ادیب ہے۔ اس کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہیں۔ وہ محض مشاہدہ یا قوت ایجاد سے کام لیکر صرف ایسے واقعے ایسے کردار کی تخلیق نہیں کرتا جس سے بے اختیار ہنسی آ جائے۔ وہ اس واقعہ یا کردار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس لئے اسے الفاظ کی جستجو اور انتخاب میں کاوش کی ضرورت ہوتی ہے کوئی واقعہ یا کردار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اگر اسے حسین و موزوں الفاظ کے ذریعہ پیش نہ کیا جائے

تو دنیائے ادب میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی۔ عموماً اردو مزاح نگار اس حقیقت کو فراموش کرتے ہیں۔ انہیں سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے لیکن جب تک ان کی سوجھ میں بوجھ اور خصوصاً ادبی حسن کی جلا نہ ہو تو پھر وہ کسی مصرف کی نہیں۔ رشید احمد صاحب کی سوجھ میں ہمیشہ بوجھ کا عنصر بھی موجود رہتا ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ مزاح نگاری کو بھی ادب کی ایک صنف سمجھتے ہیں اس لئے اپنی تحریروں میں ادبی محاسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی ذہنیت خام ہے۔ رشید احمد صاحب کی شخصیت اور ذہنیت دونوں اس الزام سے پاک ہیں۔ وہ محض مصنف بننے کی تمنا نہیں رکھتے۔ انکی طبیعت میں سنجیدگی و متانت ہے، وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور انکی ظرافت میں خیالات کی گہرائی ہوتی ہے۔ یعنی وہ محض اپنی ظرافت سے ہمیں محظوظ ہی نہیں کرتے بلکہ ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔ قہقہہ کے بعد طبیعت اس سنجیدہ معنی کی طرف رجوع کرتی ہے جو عموماً ان کی تحریروں میں موجود رہتا ہے۔ یعنی ان کی ظرافت محض سطحی نہیں۔ اس میں کچھ اور بھی ہے یہ ضرور نہیں کہ ہم ان کے خیالات سے اتفاق کریں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور وہ چند واضح، متعین خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں:۔

"آئیے لگے ہاتھوں میں آپ کو چوری کے صحیفۂ اخلاق کا مطالعہ کرادوں۔ گو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ دوسرے معاملات کے مانند چوری کے صحیفۂ اخلاق اور چور میں بہت بڑا تفاوت پیدا ہوگیا ہے۔ شاعروں کے مانند چوروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں لیکن ذرا توقف فرمایئے۔ یہ ریڈیو ہے ممکن ہے ہماری آپ کی برادری میں بعض ایسے ننگ نظر اور بے وقوف چور بھی ہوں جو میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہوجائیں کہ میں نے ان کو شاعروں سے کیوں تشبیہ دی۔ لیکن ان کے اطمینان کے لئے میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میری نیت چوروں کی دل آزاری نہیں ہے۔ شاعروں کی ہمت افزائی ہے۔ اس لئے کہ بغیر چوری کے شاعری ناممکن ہے۔ چوری کے فروغ سے شاعری کا فروغ ہوتا ہے۔ جیسے بے روزگاری کا فروغ بیداری ہے آپ تو جانتے ہوں گے کسی ملک یا قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی بے روزگاری ہے۔ غیر متمدن اقوام میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی۔"

رشید احمد صاحب کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بہک جاتے ہیں۔ آپ معاف فرمائیں میں یقیناً موضوع گفتگو سے دور جا پڑا ہوں، اس قسم کے جملے اکثر لکھتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ اگر یہ بہکنا ارادی ہو اور اسے جائز حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن رشید احمد صاحب ضرورت سے زیادہ بہک جاتے ہیں اس لئے

اکثر پڑھنے والے کی طبیعت میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھی بسیار نویسی کے دام میں جا پھنسے ہیں جو الفاظ انہوں نے عظیم بیگ چغتائی کے متعلق لکھے ہیں وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں :۔

اُمید ہے کہ رسالوں کے مختلف اور بے شمار اڈیٹر صاحبان بھی ان پر رحم فرمائیں گے کیونکہ مرزا صاحب کی مروت ان کو بسیار نویسی پر مجبور کرتی ہے اور بسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں لغویت بھی ہے"۔ بسیار نویسی کا لازمی نتیجہ ہے غور و فکر کی کمی۔ نیاز فتحپوری نے ٹھیک کہا ہے: "لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے"۔ موجودہ مزاح نگاروں میں رشید احمد صاحب سب سے زیادہ فطری صلاحیت رکھتے ہیں کاش وہ مختصر تحریروں کے علاوہ بسیط، سنجیدہ، زیادہ اہم ظریفانہ کارناموں کی طرف بھی توجہ کریں۔

کلیم الدین احمد

(باقی)

# انیسویں صدی میں اردو صحافت

## (۲)

(بہ سلسلہ معاصر دسمبر ۱۹۴۱ء)

چھاپہ کی آزادی کی جو مثال مذکور ہوئی اس کی اہمیت اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس عہد میں غیر ملکوں میں بھی چھاپہ پر بہت کچھ پابندیاں تھیں۔ چنانچہ اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اپنی اشاعت مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۶ء میں کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"فرانس میں مطابع کی آزادی کی نسبت جو کچھ امید تھی اب وہ رہی سہی بھی جاتی رہی، آجکل ہی وہاں کے اخبار نویسوں پر صرف اس وجہ سے چار سو روپیہ جرمانہ کیا گیا کہ انہوں نے سرکاری اخبار مانیٹر کی بعض محقق خبروں کو حرف بہ حرف نقل نہ کیا بلکہ ممبران پارلیمنٹ کی تقریروں کے خلاصے پر ہی اکتفا کی۔ ہم اپنی گورنمنٹ کی فیاضی پر مبارک باد دینے کی قدرت نہیں رکھتے جس نے صرف اخبار نویسوں کو ہی اسے لکھنے کی اجازت نہیں دی بلکہ خاص اپنے معاملات میں ہر دوست دشمن سے رائے طلب کی ہے۔ انگریزوں کے سوائے، کل اہل یورپ اور فرانس کو ہندوستانی مطابع کی آزادی پر بڑا تعجب آتا ہے، اور اگر وہ یہ بات سنیں کہ ہندوستانی لوگ اس آزادی کو بیجا طور سے عمل میں نہیں لاتے تو ان کو اور بھی تعجب ہوگا[۱]

**انیسویں صدی کی صحافت میں اردو ہندی مسئلہ**

اردو ہندی کی کشمکش جس نے ہمارے زمانہ میں بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے اور جس کی شدت میں بجائے کمی کے روز بروز زیادتی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے ہیں، انیسویں صدی کے ان اخباروں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ گارساں دتاسی اس کا ذکر اپنے ۱۸۶۹ء والے مقالے میں کرتا ہے۔[۲] اس کا بیان ہے کہ ۱۸۶۹ء کے اردو اخباروں میں اردو ہندی کی کشمکش کا زور صاف نظر آتا ہے، اس سال الہ آباد انسٹیٹیوٹ میں ایک خاص جلسہ منعقد ہوا اور لطف یہ تھا کہ ان لوگوں نے جو اردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت میں کھڑے ہوئے تھے خود اردو میں تقریریں کیں، اودھ اخبار نے اس جلسہ کی کارروائی بڑی تفصیل سے شایع کی جس سے ہندی کے علمبرداروں کی ہٹ دھرمی اور زیادتی اور لسانی رسہ کشی کی ابتدا کا پورا پورا حال معلوم ہوتا ہے، علی گڑھ کے اخبار میں بھی اسی موضوع پر ایک مضمون شایع کیا جسے اودھ اخبار نے دوبارہ نقل کیا۔ ۵ مارچ ۱۸۶۸ء کو پھر ایک مضمون علی گڑھ کے اخبار میں اردو کی تائید اور حمایت میں شایع ہوا۔ اور ۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء

---

[۱] علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۶ء۔ [۲] خطبات مقالات گارساں دتاسی۔

کے اخبار میں سرسید احمد خاں نے خود اس موضوع پر قلم اٹھایا، میرٹھ کے اخبار جلوۂ طور میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا، جس میں لکھا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے وہ اپنے حسب خواہش تبدیلیاں کرسکتے ہیں، اودھ اخبار نے اس سلسلہ میں بڑی دیانت داری سے کام لیا اور عرصہ تک تمام مضامین جو اس مسئلہ میں اردو کی حمایت یا مخالفت میں شائع ہونے کے لئے موصول ہوئے شایع کرتا رہا۔ چونکہ یہ مسئلہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم ذیل میں بعض اخباروں کے بیانات نقل کرتے ہیں۔

ان اخباروں میں اس بحث کی ابتدا گورنمنٹ کی اس تجویز پر شروع ہوئی کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کونسی زبان اور کون حروف رواج پانے کے مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں گارساں نے سب سے پہلے بنارس گزٹ کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے۔ ہم بھی پہلے اسی مضمون کو اصل اخبار کے ایک پرچہ سے نقل کرتے ہیں۔ بنارس گزٹ کے مضمون نگار نے اپنا نام نہیں لکھا ہے اس بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ مضمون خود اس اخبار کے مہتمم یا اڈیٹر کے قلم سے نکلا ہوگا۔ مضمون کا اقتباس یہ ہے[له]:

"بالفعل ہندوستان میں اس بات پر بڑی دلیل ہو رہی ہے کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کون زبان اور حروف جاری رکھنا واجب ہے۔ اس باب میں دو مختلف تجویزیں ہو رہی ہیں، بعضوں کی یہ رائے ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان اور فارسی حرف ہونا مناسب ہے اور بہتوں کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان میں ہندی زبان اور ناگری حرفوں میں اس کی تحریر ہونا چاہئے۔

اس اختلاف میں اگرچہ گفتگو کرنا دفعتاً ایک مشکل بات ہے لیکن جس قدر کہ اس روداد میں بیان کرسکتے ہیں اس کو ہم اس غرض سے ظاہر کرتے ہیں کہ اصل دعویٰ اور حق میں ضرر نہ پہونچے اور نیز جو جو قباحتیں تحریرات میں واقع ہوتی ہیں وہ رفع ہو جاویں۔

واضح ہو کہ جس وقت سے مسلمان اس ملک میں آئے اور ان کی قوت اور حکومت کو وسعت ہوئی تو انہوں نے ہندی حروف کو "یکقلم" اپنی سرکار سے دور رکھا بلکہ زبان بھی فارسی ہی قائم کی[له]۔ جو فرقے بالتخصیص مسلمانوں کی سرکار میں محرری کا کام کرتے تھے ان میں یہ زبان بطور دیسی زبان کے جاری ہوگئی یعنی جب وہ آپس میں بھی خط و کتابت کرتے تھے تو فارسی ہی زبان میں کرتے تھے بلکہ اب بھی ایسے لوگ

---

له بحوالہ بنارس گزٹ جنوری ۱۸۶۹ء۔ له یہ بیان بھی کس قدر متعصبانہ ہے، مسلمانوں نے تو اپنی خالص فارسی کو بھی ہند کرلیا۔ چنانچہ غالب اہل ہند میں سوائے خسرو کے کسی کو استاد نہیں مانتے، تزک بابری۔ آئین اکبری، تزک جہانگیری وغیرہ میں ان تازہ ولایت مغلوں نے ہندی الفاظ بڑی محبت سے برتے ہیں دکھنیوں نے تو فارسی کو اپنی سرکار سے نکال کر دیسی زبان کو رواج دیا۔

اوسی طریقہ پر چلتے ہیں اور اسی وجہ سے بہتیرے ان میں سے ایسے ہوگئے ہیں کہ اب وے اپنی دیسی زبان اور حروف کو پڑھ اور لکھ نہیں سکتے۔

جاننا چاہئے کہ یہ سب باتیں جب تک مسلمان اس ملک پر حاکم تھے جس طرح پر ہو لیکن اچھی قرار دی جا سکتی تھیں[1] پر اب ہم کو وہ کام کرنا چاہئے جو کہ زمانہ حال کے مطابق ہو اور جو جو قباحتیں کہ ہوں ان کو رفع کر دینا چاہئے۔

ہر ایک ملک میں بالعموم دو زبان کا رواج ہونا چاہئے۔ اول جو کہ دیسی ہو دویم جو کہ اس ملک کے حاکم کی ہو اور جس ملک میں کہ دو ایسی زبانیں جاری ہوں جو کہ باہم کم مختلف ہوں ان کی ترقی میں اس طرح پر ساعی ہونا چاہئے کہ درحقیقت اصل کون ہو اور وضع تحریر وصحیح پڑھنے کا سہل طریقہ کس میں ہے اور دیسی زبان کس میں درست لکھی جا سکتی ہو اور اس زبان میں کس سے زیادہ مدد مل سکتی ہے اور جس سے کہ مدد مل سکتی ہے وہ عوام میں کس طرح پر خاطر پذیر ہے۔

خیال کرنا چاہئے کہ اُردو زبان ہندوستان میں "اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے"[2] لیکن یہ زبان نہ تو حاکم کی ہے اور نہ ہندوستان کی دیسی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور وضع تحریر اس کی فارسی ہے اور بہ سبب اس کے کہ فارسی میں ایسے حروف بہت کم ہیں کہ جن سے ہندی لفظوں کو ٹھیک ٹھیک لکھ سکیں اس وجہ سے اس کے پڑھنے میں نہایت قباحت ہوتی ہے اور ان کے لکھنے میں بیشتر غلطی واقع ہوتی ہے جس سے بڑی دقت اور خرابی ہوتی ہے۔

ہم اس جگہ پر تمثیلاً چند حروف ہندی کے بہ مقابلہ حروف فارسی کے اور جو حروف مرکب ہو کر ہندی الفاظ کی تحریر کی غرض سے بنے ہیں لکھتے ہیں اور اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ کیا کیا غلطیاں ہندی لفظوں کو فارسی حروف میں لکھنے سے بہ سبب کم ہونے حروف اور نیز زیادہ تر مشابہ ہونے ایک دوسرے کی وضع سے تحریر میں واقع ہو سکتی ہیں ......

......

اردو زبان کو فارسی سے مدد مل سکتی ہے اور چونکہ فارسی خود ہی ایک محتاج کم مایہ ہے تو بقول اسکے "عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے دوسروں کو کیا صحت بخشے گا" اس سے بدرجہ لاچاری عربی سے مدد لی جاتی ہے اب اول تو فارسی ہی ہم سے غیر مانوس ہے دویم عربی کہ ہم سے بالکل غیر مخلوط ہے پس کسی طرح پر تسہیل کی صورت دکھائی نہیں دیتی بلکہ بجائے سہولیت کے دقت اور مشکلات آوینگی۔

---

[1] اسی ایک فقرے سے ہندی پرستوں کی نیت کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔
[2] اس فقرہ کا تضاد خاص طور پر قابل لحاظ ہے "اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے"۔

ہماری اوپر کی تحریر سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندی کے حروف اس ملک کی زبان کے لکھنے کے واسطے بہ نسبت فارسی کے حرفوں کے کہیں مفید اور افضل ہیں اور ٹھیک ٹھیک تلفظ الفاظ بھی ہو سکتا ہے اب صرف اس کو لکھنا ضرور ہے کہ بالعموم یہ کس طرح پر رائج ہے اور اس کی مدد کے واسطے کون سی زبان زیادہ تر بہتر ہے، حقیقت میں ہندی زبان ہمارے ملک میں بہ نسبت اُردو کے کہیں زیادہ مروج ہے اور اگر اوسط نکالا جاوے تو اغلب ہے کہ فی صدی بیس اُردو کے خواہاں پائے جاوینگے اور فی صدی اسّی ہندی خواستگار پائے جاوینگے۔ عام دیہات کے رہنے والے شہر کے باشندوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں اور ان کی عام کارروائی ہندی زبان میں اور ناگری یا کیتھی میں ہوتی ہے بلکہ دیہات میں سرکاری کاروبار بھی ہندی ہی حرفوں میں ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی فارسی کے حروف وہاں پر سرکار اور عوام کے کام میں آتا ہے۔

اس زبان کو زیادہ تر مدد سنسکرت سے مل سکتی ہے[1] اور چاہے ہماری اس بات کو لوگ قبول نہ کریں لیکن ہم ٹھیک ٹھیک کہتے ہیں کہ ہندی درحقیقت بگڑی ہوئی سنسکرت ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندی میں سنسکرت کے ملنے سے اس کو زیبائش ہوتی ہے اور علاوہ اس کے سنسکرت نہایت پرمایہ زبان ہے نظر برآں ہماری دانست میں ہندی زبان اور حروف سرکاری اور نیز عوام کے کاروبار میں استعمال کرنا چاہیئے۔ جس وقت سرکار نے یہ حکم دیا کہ اُردو زبان سرکاری کاموں میں مستعمل ہو اس وقت ہم نے یہ تصور کیا تھا کہ رفتہ رفتہ ہماری ہندی زبان بھی ساتھ ہندی حرفوں کے جاری ہو جاوے گی اور جس طرح کہ زبان اٹھا دی گئی اسی طرح پر ایک نہ ایک دن حروف بھی باقی نہ رہیں گے۔ لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جا بجا یہ تجویز ہو رہی ہے کہ اُردو کی یونیورسٹی قائم ہو اور یہی زبان اور یہی وضع تحریر بالعموم جاری کیجائے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیا لوگوں کو کسی کی حق تلفی کرنے میں ترس نہیں آتا اور اس پر افسوس کرنا چاہیئے کہ بیشتر ہنود[2] اس کی ترقی کو روک کر اردو کی ترقی پر دل لگاتے ہیں ..........[3]

اسی اردو ہندی کے سلسلہ میں سر دوا پرساد سنڈل نے سرسید احمد خاں سے بہت کچھ تحریری بحث و مباحثہ کیا۔ چنانچہ ان کی پہلی تحریر ۲۷ نومبر ۱۸۶۸ء کے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شایع ہوئی چونکہ اگلے چند مہینوں میں یہ کشمکش اور بڑھ گئی اس لئے سر دوا پرساد سنڈل نے ۲۹ جنوری ۱۸۶۹ء کو

---

[1] اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ہندی کی موافقت کرنے والے درحقیقت ہندی کے پردہ میں سنسکرت کو زندہ کرنا چاہتے تھے جو اب مر کر اب سے صدیوں پہلے دفن ہو چکی ہے۔

[2] اردو ہندی کے مسئلہ کو مضمون نگار خود ہندو مسلم مسئلہ بنا رہا ہے اور یہی موجودہ مناقشہ کی ابتدا ہے۔

[3] مضمون کا باقی حصہ جو اس بحث سے بالکل غیر متعلق ہے بخوف طوالت نقل نہیں کیا گیا ہے۔

ایک اور تحریر بھیجی جسے سرسید احمد خاں نے کامل دیانت داری سے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۱۹ر فروری ۱۸۶۹ء میں شایع کر دیا۔ ۵ر مارچ ۱۸۶۹ء کو پھر علی گڑھ کے اخبار نے مولوی تفضل حسین کا ایک مضمون نور الابصار کے حوالے سے شایع کیا، یہ مضمون کئی حیثیتوں سے اہم ہے، اول تو اس کی تحریر سے اس عہد کے مسلمان علماء کے طرز کا پتہ چلتا ہے اور علاوہ بریں خود اردو ہندی کی بحث کے سلسلہ میں بھی اس میں بعض اہم امور کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس کے بعض حصے ملاحظہ ہوں:-

"بحث اس باب میں کہ رواج تحریر اردو کا سررشتہ جات سرکاری میں بحال رہنا چاہیے یا نہیں ان ایام میں بعض صاحب اہل ہنود نے تحریک اس امر میں کی ہے کہ جو رواج زبان اردو کا سررشتہ جات سرکاری میں ہے وہ موقوف ہو کر بجائے اس کے زبان ہندی بخط ناگری رواج پائے اور اس کے مضامین بھی درج اخبار ہوتے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اگرچہ بمصداق اس کے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون یعنی ہر گروہ اس سے خوش ہے جو اس کے آگے ہے ایسی تحریک اہل ہنود کی بجائے خود ہے اور علیٰ ہذا القیاس اگر اہل اسلام اس کے بالعکس تائید اردو کی کریں تو وہ بھی بے محل نہیں لیکن اول یہ بات غور طلب ہے کہ قوت باعثہ اس بات کی کہ وہ ایک جزو تحریک کا ہے کوئی شئے دینی اور مذہبی ہے یا غیر اس کے، سو امر مذہبی اور دینی کی موثریت تو اس میں نہیں پائی جاتی کیونکہ دینی زبان مسلمانوں کی عربی ہے جس میں ان کی کتاب سماوی یعنی قرآن مجید اور اس کے سوائے احادیث و ادعیہ و اوراد وارد ہیں اور ان کا عمل عبادتی قسم نماز و دعا وغیرہ سے غیر زبان عرب میں بسبیل ترجمہ اکثر کے نزدیک ممتنع ہے اور ایک اولویت استعمال اس زبان کے تو قطع نظر عبادات کے معاملات تک بھی متفق علیہ اس فریق کے ہے چنانچہ زمان حال تک اہل اسلام الفاظ ایجاب و قبول معاملات بیع وغیرہ کے قبالجات میں بزبان عربی تحریر پاتے ہیں جیسا کہ لکھتے ہیں بیعاً صحیحاً اور مثل اس کے اسی طرح اہل ہنود کی دینی زبان سنسکرت ہے کہ جس میں ان کی کتاب سماوی یعنی بید اور اور اقوال اور اشلوک اور اعمال عبادتی یعنی پوجا پاٹ کے ہیں اور بعض معاملات مثل ایجاب و قبول ازدواج کا ان کے ہاں بھی سنسکرت میں رواج ہے، معہذا یہ بھی ظاہر ہے کہ علاوہ علم منقول کے علم معقول حکمت وغیرہ بھی عربی یا سنسکرت ہی میں ہے اور زبان میں ابھی تک ترجمہ جات کامل موجود نہیں ہیں پس اگر امر مذہبی یا فوائد علمی پر نظر ہو تو مسلمانوں پر تحریک زبان عربی کی اور ہنود پر [illegible] کی ضروری ہے نہ اردو یا ہندی کی، اور اگر کہیں کہ اردو کو عربی سے اور ہندی کو سنسکرت سے تعلق ہے تو یہ وجہ موجہ نہیں کیونکہ تعلق اردو ہندی کا عربی و سنسکرت سے بسبیل فرعیت اور اصل کو چھوڑ کر فرع پر رجوع لانا مزیت فرع کی اصل پر لازم کرتا ہے جو عقلاً ممتنع ہے، پس ان وجوہ سے مبداء تحریک اس امر کا مذہبی تو نہیں ہے اور جب امر مذہبی نہیں تو پھر اس امر پر لحاظ ضروری ہے اور

اسی بات کی بعض وجوہ بھی ارباب تحریک مقدم الوصف نے لکھی ہیں، سو بر سبیل تلخیص اس محل پر بالفعل مناظرہ قائم کیا جاتا ہے اور جیسا کہ مفہوم مناظرہ کا ہے تحقیق صواب منظور ہے کچھ مجادلہ یا مکابرہ کہ جس میں صرف دوسرے کی بات کا ٹنی منظور ہو اصلاً اور قطعاً مقصود نہیں ہے اور بموجب آداب مناظرہ کے اس وجہ سے کہ ابتدا صاحبین موصوف نے ایک تحریک کا ادعا بدلائل کیا ہے وہ صاحب مدعی ہیں اور جو بمقابل ان کے گفتگو کرے وہ طرف مقابل ہے اثبات بدلائل منصب مدعی اور ایراد منع اور نقض اور مناقضہ ومعارضہ منصب جانب مقابل ہے جب تک مدعی بدلائل ثابت نہ کرے جانب مقابل کو کہ نافی ہے صرف انکار پر قایم رہنا کافی ہے اول دلائل صاحبان ادعا پر غور کرکے من بعد ان پر منع وغیرہ جو مناسب ہے وارد کیا جائیگا۔ اگرچہ مطالب ارباب تحریک بہت طویل ہیں لیکن عمدہ دلائل منجملہ ان کے تین ہیں اول یہ کہ سررشتہ جات سرکاری میں ہندی کے رواج کے بند رہنے سے غصب حق اہل ہند ہے کہ باوجود جاری ہونے زبان ملک کے اور ممالک کے کار سرکاری میں خاص ان ممالک میں یہاں کی زبان جاری نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ زبان مروجہ حال یعنی اردو عام فہم نہیں ہے اور اس سے حرج اہل غرض کا ہوتا ہے، تیسرے اردو فارسی کے املا میں التباس مطالب کا تفاوت نقاط وغیرہ سے بہت ہے ان ہر سہ دلائل پر اول اجمالاً بایں سند منع وارد کیا جاتا ہے کہ یہ تین وجہ جو حیثیت اب رکھتی ہیں وہی حیثیت عہد انگریزی سے پہلے بھی رکھتی تھیں بوقت تسلط اہل اسلام کے اگرچہ مجبوری کا عذر ہو سکتا ہے کہ بمقابلہ حکام کے رعایا کیا اصرار کرتی مگر جب اس سلطنت میں ضعف پڑا تو اولاً ان کے خلاف بعض اقطاع ہند میں تسلط جنوبیوں یعنی مرہٹوں کا ہوا وہ ہندو تھے، انھوں نے کچھ بندوبست اجرائے سنسکرت کا کہ زبان قدیم ہند اور زبان مذہبی اہل ہند کی ہے نہ کیا بلکہ فارسی ہی قائم رکھی، چنانچہ اس وقت کے اسناد ونوشتہ جات سرکاری شاہد حال ہیں اس وقت اہل ہنود کو بہت ہی موقع تھا کہ ایسے وجوہ سے انسداد فارسی اور اجرائے سنسکرت یا ہندی مروجہ وقت وملک کی درخواست کرتے لطف یہ ہے کہ مرہٹی زبان میں الفاظ سنہ کے بالفاظ عربیہ اور شہور عربی اور سور سنہ کہ وہ عہد خلافت ایک خلیفہ اسلام سے ماخوذ ہیں لکھے جاتے ہیں، اب تک بھی گوالیار سے یہ رواج مسدود نہیں ہوا، اس پر بھی کسی نے اعتراض نہ کیا، اور نہ خود مرہٹوں نے کہ وہ ہندو ہیں مذموم سمجھا، بلکہ بدستور کئے جاتے ہیں، حالانکہ سنہ سور بالکل سنہ ہجری سے مطابقت رکھتا ہے جیسے کہ فصلی ہجری میں تفاوت ہے، ہنود میں بعض رئیسوں نے بھی بطوع ورغبت اردو کو جاری کر رکھا ہے بلکہ بعض ریاستوں میں تحریرات دو[illegible] زیادہ تر اردو میں ہیں۔ چنانچہ حال ریاست الور اور گوالیار اور جے پور اور اندور وبینہ کامل اس [illegible]ت کا ہے پس جس وجہ سے ہنود با اختیار نے غیر زبان ہند کا رواج جائز رکھا اور فریق رعایائے ہنود نے بروقت قابو اور خاص کر عمل سرکاریں کہ اس کا حال ابتدائی اور اب کا

برابر ہے دربیشتی وشیوع ایسے عذرات میں سکوت کیا وہی وجہ اب بھی صلاحیت معاوضہ ان سب دلائل کی رکھتی ہے کیونکہ سکوت مجمل بیان حکم اقرار میں ہے، راقم کو خوب یاد ہے کہ جب بموجب ایکٹ ۲۹ سنہ ۱۸۳۷ء عیسوی کے فارسی کے رواج کا انسداد اور اردو وغیرہ کا آغاز ہوا زبدۃ الاخبار وغیرہ میں مضامین افسوس انسداد فارسی کے شایع ہوئے اور ہندی کے جاری نہونے کا افسوس کہیں کسی اخبار یا تحریر میں اس وقت تک دیکھا یا سنا نہیں گیا، اور بعضے حکام نے ارادہ کیا تھا کہ دیسی زبان جاری ہو مگر چل نہ سکا۔ بہر حال جو جواب جواز ہنود باختیار اور سکوت عامہ ہنود کا سابق سے تا حال بنسبت ارباب تحریک جانب متقابل کی رائے میں ہے وہی نقص کامل ان دلائل کا ہے فما ھوا جوابھم فما جوابنا ) . . . . . . . . . . ." (بحوالہ نور الابصار)

یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اردو کی تائید اور حمایت کے مضامین مسلمان مضمون نگاروں یا صرف مسلمانوں کے اخباروں کے ذریعہ سے اشتہار پاتے تھے، چنانچہ رتن پرکاش میں بھی ایک مضمون اُردو کی حمایت میں نکلا تھا، اس کے بعض فقرے ملاحظہ ہوں:۔

ہماری رائے میں تمام ہندوستان کے قصبات اور بلاد میں اردو زبان کا اس قدر رواج ہے کہ خواص وعوام کے محاورہ میں یہی زبان رایج وشایع ہے گو قریات میں اور زبانیں بھی بولی جاتی ہوں علی الخصوص ممالک مغربی وشمالی واودھ کے قریات ودیہات میں فقط اردو زبان سے کارروائی ہوتی ہے علاوہ اس کے اردو زبان لب لباب چند زبانوں کی ہے اس میں الفاظ مستکرہ وشدید اللفظ سے بہت اجتناب رہتا ہے، اردو کی تحریر میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑے حرفوں میں بہت مضمون سما جاتا ہے اور پڑھنے میں کسی قسم کا تکلف وتردد واقع نہیں ہوتا اُردو کی ایک سطر کا مضمون ہندی کی تین سطر سے کم میں نہیں آ سکتا ...... غرض عموماً ہندی کے رواج سے نوع بنوع کی دقتیں پیش آئینگی اور کارروئی میں بہت ہرج واقع ہوا کریگا اس لئے کہ ہندی زبان مدت سے متروک ہے، اس کے رواج اور اشاعت کے واسطے زمانہ دراز چاہئے ......"

اب ہم اُردو ہندی کی اس طویل بحث کو بعض تحریروں اور تقریروں کے حوالے پر ختم کرتے ہیں تاکہ اگر کبھی اردو ادب وتاریخ کا کوئی طالب علم اردو ہندی کی کشمکش پر تحقیق وتنقید کرنے بیٹھے تو اسے زمانہ قدیم کے ان حوالہ جات کی مدد سے اپنا راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

(۱) چٹھی کیمپسن صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مغربی وشمالی بنام سکریٹری بنارس انسٹیٹوٹ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء مطبوعہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ۱۰ جنوری ۱۸۶۸ء

(۲) چٹھی سردا پرساد سنڈل الہ آباد انسٹیٹوٹ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۹ء بنام سرسید احمد خاں وجواب

سر سید احمد خاں مطبوعہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی ۲۷ ر نومبر ۱۸۶۸ء

(۳) چٹھی ۲ سرودا پرساد سنڈل مورخہ ۱۴ ر نومبر ۱۸۶۸ء وجواب سر سید مطبوعہ اخبار مذکور مورخہ ۲۷ ر نومبر ۱۸۶۸ء

(۴) "عدالتوں کی زبان" خط سرودا پرشاد سنڈل بنام سر سید احمد خاں مطبوعہ اخبار مذکور مورخہ ۱۹ ر فروری ۱۸۶۹ء وجواب سر سید مطبوعہ اخبار مذکور مورخہ ۱۲ ر مارچ ۱۸۶۹ء

(۵) "عدالتوں کی زبان" تحریر مہتمم نورالابصار منقولہ اخبار مذکور ۱۲ ر مارچ ۱۸۶۹ء

(۶) "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" مطبوعہ اودھ اخبار منقولہ اخبار مذکور مورخہ ۲۶ ر مارچ ۱۸۶۹ء

(۷) ہندی اردو باب میں بحث، مطبوعہ نورالابصار منقولہ اخبار مذکور مورخہ ۲۶ ر مارچ ۱۸۶۹ء

(۸) مضمون درباب بحالی زبان اردو، مطبوعہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی بہار، منقولہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۹ء (مضمون سید وارث علی)

(۹) ہندی زبان کے رواج میں واسطے کاروبار عدالت سرکاری کے، مطبوعہ آب حیات منقولہ اخبار مذکور مورخہ ۱۶ ر اپریل ۱۸۶۹ء

(۱۰) عدالتوں میں ناگری خط کے رواج کی ضرورت ہے مضمون R. J. مطبوعہ اخبار مذکور مورخہ ۲۳ ر اپریل ۱۸۶۹ء

(۱۱) زبان مروجہ پنجاب کا حال، مطبوعہ رسالہ جلسہ تہذیب لکھنو منقولہ اخبار مذکور (اخبار علی گڑھ گزٹ) مورخہ ۲۳ ر اپریل ۱۸۶۹ء

(۱۲) مضمون درباره اردو و ناگری مطبوعہ نورالابصار نمبرہ مضمون سید مظہر حسین منقولہ اخبار علی گڑھ گزٹ مورخہ یکم مارچ ۱۸۶۹ء

(۱۳) جواب مضمون بالا، مطبوعہ، نجم الاخبار منقولہ اخبار علی گڑھ گزٹ مورخہ ۳۰ ر اپریل ۱۸۶۹ء

(۱۴) تحریر پنڈت شمبھوناتھ سکریٹری لٹریری سوسائٹی فتحپور، بنام مہتمم انسٹیٹیوٹ گزٹ مطبوعہ اخبار مذکور مورخہ ۰ مئی ۱۸۶۹ء

(۱۵) "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" مطبوعہ جلوہ طور منقولہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی مورخہ ۰ ر مئی ۱۸۶۹ء

(۱۶) گفتگو مولوی فدا حسین مطبوعہ دبدبہ سکندری منقولہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۰ ر مئی ۱۸۶۹ء

(۱۷) جمیع اہل ہند کی کاربراری کے واسطے ہندی زبان اچھا وسیلہ ہے، مضمون گمنام مطبوعہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۱۴ ر مئی ۱۸۶۹ء

(۱۸) "ہندی زبان کے رواج میں" مطبوعہ آب حیات، منقولہ علی گڑھ گزٹ ۱۴ ر مئی ۱۸۶۹ء

(۱۹) اردو ناگری کی بحث مطبوعہ اردو گائیڈ کلکتہ منقولہ علی گڑھ گزٹ ۲۱ ر مئی ۱۸۶۹ء

(۲۰) تقریر مولوی وارث علی مطبوعہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی بہار منقولہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۲۰ ر مئی ۱۸۶۹ء

---

لہ یہی وہ مضمون ہے جس کا ذکر گارساں نے اپنے مقالہ میں خاص طور پر کیا ہے۔

(۲۱) مباحثہ اس باب میں کہ سرکاری سرشتوں میں بجائے اُردو کے رواج ناگری کا ہو مطبوعہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء

(۲۲) روئداد جلسہ ایسوسی ایشن مراد آباد واقع تاریخ ۱۶ مئی ۱۸۶۹ء مباحثہ در باب تحریر حروف فارسی ناگری و رومن مطبوعہ اخبار علی گڑھ گزٹ مورخہ ۴ جون ۱۸۶۹ء

(۲۳) بحث ناگری و فارسی مطبوعہ نور الابصار منقولہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۴ جون ۱۸۶۹ء

(۲۴) اُردو ناگری، مضمون سید مظہر حسین، مطبوعہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۹ء

(۲۵) ممالک مغربی وشمالی کی عدالتوں میں ہندی زبان رائج ہونی چاہئے۔ مطبوعہ ایجوکیشن گزٹ منقولہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۹ء

(۲۶) عدالتوں میں بجائے فارسی حروف کے ناگری اور انگریزی حرف جاری ہونے چاہئیں، مضمون آنریبل راجہ شیوراج سنگھ مطبوعہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۲ جولائی ۱۸۶۹ء

(۲۷) بحث اُردو ناگری کی، مطبوعہ نجم الاخبار منقولہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۲ جولائی ۱۸۶۹ء

(۲۸) عدالتوں میں ہندی زبان کا رواج ہونا چاہئے، مضمون پائنیر، منقولہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۶۹ء

(۲۹) تحریر[۱] در باب بحث اردو ہندی مطبوعہ اخبار سوسائٹی علی گڑھ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۹ء

(۳۰) ہندی زبان کیا چیز ہے، مطبوعہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء

(۳۱) کارروائی جلسہ الہ آباد منعقدہ ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء مطبوعہ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۳ء

(۳۲) اُردو اور ناگری، مطبوعہ اخبار سررشتہ تعلیم اودھ یکم جولائی ۱۸۷۴ء (منقولہ مقالات گارساں دتاسی مقالہ ۱۸۷۴ء مطبوعہ رسالہ اُردو اپریل ۱۹۴۰ء)

(۳۳) مضمون بابو کاشی ناتھ مطبوعہ ہریش چندر میگزین فروری ۱۸۷۴ء (بحوالہ مذکور الصدر)

(۳۴) اُردو کی جوانی یا زندگانی، مطبوعہ اخبار انجمن پنجاب ۵ جون ۱۸۷۴ء (بحوالہ مذکور الصدر)

(باقی)

محمد ابواللیث صدیقی

---

[۱] اس تحریر کے بعض حصے بہت اہم ہیں۔ مثلاً ”ہمارے ہموطنوں کو چاہئے کہ اب اس جھگڑے کو موقوف کریں کیونکہ ابتک تو اس میں فائدہ عام کی نظر سے گفتگو ہوئی تھی لیکن اب یہ دشمنی نفسی اور تعصب مذہبی کی بات ہو گئی ہے“
ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔
”جتنے ملازم سرکار ہیں اعلیٰ سے ادنیٰ تک اُردو جانتے ہیں اور لکھ پڑھ سکتے ہیں، ہاں جو کھیت جوتتے ہیں اور قبر کھودتے ہیں وہ اردو نہیں لکھ پڑھ سکتے، مگر وہ ہندی بھی نہیں لکھ پڑھ سکتے۔۔۔“

# زندگی

حق بجانب، الاماں وردِ زباں ہے زندگی
زندگی سمجھے ہیں جسکو وہ کہاں ہے زندگی

داغ ناکامی سے سرگرمِ فغاں ہے زندگی
جاں گزا ہے خواب یا وہم و گماں ہے زندگی

اک طرح کی موت ہے دل پر گراں ہے زندگی
اک دلِ زندہ کے غم میں نوحہ خواں ہے زندگی

زندہ دل ہو جاؤ پھر کہنا کہاں ہے زندگی
نوجوانو! سو جوانوں میں جواں ہے زندگی

دشمنِ جاں ہے کہیں آرامِ جاں ہے زندگی
یا انہیں دو ہستیوں کے درمیاں ہے زندگی

جائے مجنوں لیلیٰ پیر و جواں ہے زندگی
جانِ شیریں بھی فدا وہ جانِ جاں ہے زندگی

خیر و شر کی نیک و بد کی رازداں ہے زندگی
خضر رہبر ہے حیاتِ جاوداں ہے زندگی

یا زمیں ہے زندگی یا آسماں ہے زندگی
کچھ نہیں جب چار دن کی میہماں ہے زندگی

بے خزاں باغِ شہادت باغباں ہے زندگی
مرحبا اوجِ امامت نردباں ہے زندگی

خطِ آزادی مبارک رتبہ داں ہے زندگی
خطبۂ آزاد قائم خطبہ خواں ہے زندگی

آزاد عظیم آبادی

# ایک مغربی سیاح کے خطوط

نمبر ۱۰

دلّی ۱ر جون ۱۹۳۰ء

پیارے اسمتھ!

میں اپنے خطوط میں ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی حالتوں کا مفصل ذکر کر چکا ہوں لیکن ابھی تک میں ہندوستان کے گراں بہا ادبی خزانوں کا بیان نہ کر سکا بات یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف زبانیں رائج ہیں اور ان زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے وقت چاہیئے سنی سنائی باتوں سے مجھے تشفی نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شئے سے ذاتی واقفیت بہم پہنچاؤں۔ میں نے ایک زبان میں، جسے اردو کہتے ہیں، کافی مہارت پیدا کرلی ہے۔ اُردو دنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے لیکن اس کمسنی کے باوجود بھی اُردو ادب دنیا کے کسی ادب سے قدر و قیمت میں کم نہیں۔ دلّی، تم شاید جانتے ہوگے دلی ہندوستان کا قدیم دارالسلطنت ہے، دلّی کی زبان مستند مانی جاتی ہے، اس لئے میں نے دلّی ہی میں قیام کیا ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ میری ملاقات ایک ایسی بلند پایہ ہستی سے ہوگئی ہے جو اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے لئے بھی مایۂ ناز ہے۔ اسی رہنما کی مدد سے میں اُردو ادب کے رنگین و زریں باغ کی سیر کروں گا۔

یوں تو اردو ادب بحیثیت مجموعی اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن اس شہنشاہ کا تاج اس کی شاعری ہے اور اس تاج میں سب سے بڑا ہیرا غزل ہے۔ میں نے اپنے رہنما سے پہلی درخواست جو کی وہ یہ تھی کہ وہ اس عدیم المثال جواہر، اس دُر بے بہا، اس گل صد رنگ، اس اختر تابندہ کی زیارت سے میرے دیدہ و دل کو شادکام فرمائیں اور میں خوش ہوں کہ انہوں نے میری درخواست رد نہ کی۔ کچھ تامل کے بعد فرمایا:

"سنو یہ اُردو جسے تم حقیر خیال کرتے ہو، جس کی شاعری کو تم کم مایہ سمجھتے ہو، اسی اُردو میں ایک ایسا غزل گو شاعر گزرا ہے جس کی نظیر کوئی دوسرا ادب نہ پیش کر سکا۔ تم ہومر، ورجل، ایسکیلس، سوفوکلیز، شیکسپیر، ملٹن، دانتے، راسین، مولیئر، گوئٹے، شلر کا دم بھرتے ہو۔ ہومر کی وسعت و بلندی، ورجل کی شیرینی اور جلا۔ ایسکیلس کی بیباکی تخیل، سوفوکلیز کی طنز، شیکسپیر کی گہرائی، ملٹن کی پرواز، دانتے کا فلسفہ راسین کی باریک نفسیات، مولیئر کی ظرافت، گوئٹے کی ہوشمندی، شلر کی غزلیت، یہ سب چیزیں اُردو کے ایک شاعر میں موجود ہیں اور اس شاعر کا نام ہے غالب"۔

میں نے اس شاعرِ بدل کی غزلیں سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میرے رہنما نے شفقت کے ساتھ فرمایا:

"اچھا میں تمہیں ایک غزل سناتا ہوں۔ غور سے سنو اور وجد کرو:-

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

میرے شفیق رہنما یہ دو سطریں پڑھ کر چپ ہو گئے۔ میں نے سمجھا کہ شاید دوسری سطریں وقتی طور پر حافظ میں محفوظ نہیں ہیں، انہیں کی تلاش میں محو ہیں۔ اس لئے میں پر اشتیاق خموشی کے ساتھ انتظار کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ چیں بجبیں ہوئے، چہرے سے ناخوشی کے آثار ظاہر ہوئے مجھے اس پر کچھ تعجب سا ہوا لیکن بمقتضائے ادب میں چپ رہا۔ یکایک ذرا بلند آواز میں کچھ خشونت کے ساتھ کہنے لگے:۔

"دیکھا تم نے۔ اسے شاعری کہتے ہیں۔ یہ شاعری نہیں عطر شاعری ہے، شاعری کا جوہر ہے۔ جو بات جو درد، جو اثر، جو جادو اس شعر میں ہے وہ شیکسپیر اور راسین کے ڈراموں میں ممکن نہیں۔ غالب نے اپنے تجربات کا نچوڑ اس مطلع میں بھر دیا ہے۔ اس کی زندگی گویا درد و غم کا نشانہ تھی۔ معشوق کی بے مہری و سنگدلی، ابنائے زمانہ کی بے التفاتی و ناقدری، دنیا کی ناانصافی، فلک کی جفا پروری نے اس کے دل کو ایک ناسور بنا دیا تھا۔ اس شعر میں اس ناسور کی ٹیس ہے۔ اس پکے پھوڑے کا ٹپکا ہے۔ شیکسپیر کو اس بے پایاں درد کے اظہار کے لئے ایک وسیع ڈرامہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ایک طویل پیراگراف سے کم میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ دیکھو! وہ "اوتھیلو" کے روحانی مصائب کو یوں بیان کرتا ہے:[1]

"اگر فلک نے میرا صبر آزمانے کے لئے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہوتا، اگر اس نے میرے ننگے سر پر ہر قسم کے ناسور ہر طرح کی ذلتوں کی بارش کی ہوتی، اگر غربت کے سمندر کا پانی میرے لبوں تک آگیا ہوتا۔ اگر میں اور میری ساری امیدیں ہمیشہ کے لئے اسیر ہو جاتیں تو بھی میں اپنی روح کے کسی گوشہ میں صبر کا ایک قطرہ ضرور پا لیتا لیکن آہ! فلک نے میری ایسی اٹل شکل بنائی جس پر زمانہ کی آہستہ حرکت کرنے والی انگلی انگشت نما ہو۔ میں اسے بھی بخوبی برداشت کر لیتا: لیکن جہاں میں نے اپنی تمناؤں کو جمع کیا تھا، جہاں میری زندگی ہے اور جہاں سے نکل جانا میری موت ہے، وہ سرچشمہ جس سے میری زندگی کا دھارا بہتا ہے اور جس کے بغیر یہ خشک ہو جائے۔ ایسی جگہ سے نکل جانا!" جس کیفیت کا اظہار شیکسپیر ان جملوں میں کرتا ہے غالب نے اسے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ شیکسپیر یا کسی مغربی شاعر کو اس ایجاز و اختصار پر قدرت نہیں جو اردو شعراء کا حصہ ہے"۔

میرا ذہن نارسا اس موازنہ کو مطلق سمجھ نہ سکا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: "شیکسپیر نے جس تجربہ کی ترجمانی کی ہے وہ جداگانہ ہے۔ اس کے علاوہ "اوتھیلو" ایک پیچیدہ ڈرامہ ہے۔ اس پیراگراف میں جو شدت جذبات ہے اسے سمجھنے کے لئے ڈرامہ کے بقیہ حصوں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس میں جو بے پناہ زور ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی عقبی زمین آتش فشاں جذبات کا وہ پیچیدہ مرتب و مکمل نقش ہے جسے "اوتھیلو" کہتے ہیں۔ غالب کا شعر معلق ہے اس کی کوئی عقبی زمین نہیں..."

میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میرے رہنما نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "غالب کے شعر کی عقبی زمین ساری دنیا ہے، زندگی ہے، محبت ہے، زندگی و محبت کی رنگین، خونیں، موثر داستان ہے۔ غالب کا شعر ایک اکائی ہے اس لئے غزل کے بقیہ شعروں سے واقفیت غیر متعلق ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہے۔ اس کی ذات بے نیاز ہے۔ اس کا نہ آغاز ہے اور نہ انجام۔ یہی شاعری کی ابتدا ہے اور یہی شاعری کی انتہا بھی ہے۔ آغاز شاعری یوں ہوا کہ کسی زبان سے کسی اضطراری کیفیت میں خودبخود ایک شعر موزوں ہوگیا اور انسان جب تہذیب کے اعلیٰ ترین زینوں پر ہوگا اسوقت اس کی شاعری اشعار غزل تک محدود ہوگی۔"

میرے رہنما نے یہ باتیں کچھ ایسے الہامی انداز سے کہیں کہ میں نے فوراً سر جھکا لیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جو پردے میری آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے وہ یک بیک ہٹ گئے اور مجھے ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح غزل آسمان شاعری پر درخشاں نظر آئی۔ تم نظریۂ ارتقا سے واقف ہو۔ زندگی پہلے زور کے بھنور میں رقصاں تھی پھر اس نے مادہ پر دست درازی کی لیکن خود مادہ کی محکوم ہوگئی۔ زندگی کی برابر یہی کوشش رہی ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہو جائے۔ اس نے مختلف آزمائشیں کیں۔ ماقبل تاریخی حیوانات بنائے۔ ہاتھی، گھوڑا، بندر، سور، خچر، غرض مختلف قسم کے جانور پیدا کئے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی زندگی نے صحیح رستہ میں پہلا قدم رکھا جب اس نے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ ادب میں بھی اسی ارتقا کی کارفرمائی ہے۔ انسان نے پہلے مختلف صنفیں، ناول، ڈراما، رزمیہ، ایجادکیں لیکن صحیح رستہ میں پہلا قدم غزل کی ایجاد ہے۔ جس طرح زندگی کی خواہش ہے کہ مادہ سے آزاد ہو جائے۔ اسی طرح روح شاعری کی، جو ادب کی جان ہے، خواہش ہے کہ وہ الفاظ سے آزاد ہو جائے۔ جو باتیں انسان وسیع و پیچیدہ ناول، ڈراما، رزمیہ میں بیان کرتا تھا اُسے وہ ایک شعر میں بیان کرسکتا ہے۔ شاعری کے ارتقا میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ شاعر کو ایک مکمل شعر کہنے کی زحمت بھی ناگوار ہوگی اور:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں      روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کہنے کے بدلے وہ محض چند اہم، بنیادی الفاظ پر قناعت کرے گا مثلاً "دل... سنگ و خشت... درد... آنسو... ظلم" اور شاعر کا پورا تجربہ نہایت اختصار و کامیابی کے ساتھ قاری کے ذہن میں آجائے گا۔ اس کے بعد شاعری ایک رمز ہو جائے گی۔ خارجی و داخلی اثرات و حسیات کی علامتیں مقرر ہو جائیں گی۔ مثلاً، گل، بلبل آنسو، ہنسی وغیرہ وغیرہ۔ جہاں موسم بہار نے شاعر کے دل میں نئی نئی امنگیں پیدا کیں۔ جہاں اسکی آنکھوں نے بہار کی رنگینی کے مزے لوٹے پھر فوراً وہ ایک خاص لہجہ میں کہے گا "گل" اور سننے والا شاعر کے تجربہ سے بہرہ ور ہو جائے گا۔ اسی کامل اختصار کے ساتھ وہ اپنے بوقلموں جذبات و تصورات کا نقشہ کھینچے گا۔

آخری منزل وہ ہوگی جب الفاظ کے استعمال کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور شاعری اشراقی ہو جائے گی۔

بہرکیف، میرے رہنما نے تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "غالب کے اشعار میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی گہرائی بھی ہے۔ ایک مقطع ہے:۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

جس حقیقت تک فلسفیوں کا ایک گروہ طویل غور و فکر کے بعد پہنچا ہے اور جسے وہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا ہے، اسے غالب نے وجدانی طور پر محسوس کیا اور چند لفظوں میں بیان کر دیا۔"

ان باتوں سے میرا سر چکرا یا۔ اس شعر میں غالب کے بدلے اسد کا نام تھا اور میرے رہنما نے اُسے غالب کا بتایا تھا۔ میں نے کہا: "یہ شعر تو غالبًا اسد کا ہے۔ غالب سے اس کو کیا واسطہ؟" میری بات سُن کر وہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا: "غالب کا نام مرزا اسد اللہ خاں اور تخلص غالب ہے۔ ہر اردو شاعر کا ایک تخلص ہوتا ہے جسے وہ غزل کے آخری شعر میں استعمال کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں شاعری ایک جرم رہی ہے۔ جس طرح افلاطون نے شعرا کو اپنی جمہوری سلطنت سے خارج کر دیا، اسی طرح ہندوستان میں غالبًا شاعری کو بیکار کام شمار کیا جاتا تھا اور جس طرح انگلینڈ میں بھیک مانگنا جرم ہے اسی طرح یہاں شاید شاعری جرم تھی۔ اسی لئے جو لوگ شاعری کرتے تھے وہ اپنا نام پوشیدہ رکھتے تھے اور اپنی غزلوں میں فرضی نام داخل کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ شاعری جرم نہ ہو، صرف اُسے ذلیل کام شمار کیا جاتا ہو۔ تم جانتے ہو کہ ملکہ ایلزبتھ کے عہد میں پیشہ ور شاعر، خصوصًا وہ ڈرامہ نگار جو ڈرامے لکھ کر اپنا پیٹ پالتے تھے حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اسی وجہ سے بیکن نے جو ڈرامے لکھے اسے ایک نامعلوم ایکٹر شیکسپیر کے نام سے موسوم کیا۔ ممکن ہے کہ اسی نظر حقارت سے بچنے کے لئے مشرقی شعرا اپنے شعروں کو کسی فرضی نام سے منسوب کر دیتے تھے۔ اس طرح ایک روایت کی بنیاد پڑ گئی۔

بہرکیف، میں نے ایک پوری غزل سننے کی خواہش ظاہر کی، ایسی غزل جس سے اس نادر و نایاب صنف شاعری کے سارے محاسن روشن ہو جائیں۔ فرمایا: "اچھا سنو" پھر نہایت سُریلی آواز میں یہ غزل گائی:۔

مُنہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا شعلۂ حسن چراغ تہہ داماں ہوتا
استرا منہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا محو پندار سے کیونکر خط قرآں ہوتا
اپنے ہونٹوں سے جو اکبار لگا لیتا وہ ہے یقیں ساغر مے چشمۂ حیواں ہوتا
سنگ چقماق بھی بنتا تو مرا ضبط یہ ہے نہ مری قبر کا پتھر شرر افشاں ہوتا

ہوں وہ وحشی کہ اگر دشت میں پھرتا شب کو　　آگے مشعلچی وہی غول بیاباں ہوتا

کس کی پرواہ ؟ شہہ جنات کو بھی آٹھ پہر　　ہے یہہ حسرت کہ سگ کوچہ جاناں ہوتا

حسرت دل نہیں دیتا ہے نکلنے ناسخ

ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

جب یہہ غزل ختم ہوئی تو وہ دیر تک چپ رہے گویا کسی دوسری دنیا میں کھوگئے تھے اور سچ تو یہہ ہے کہ مجھ پر بھی محویت کا عالم طاری تھا - جب اس طلسم کا اثر کم ہوا تو وہ کہنے لگے : " جو مغرب زدہ ہیں وہ کہیں گے کہ یہہ غزل ہے - اس میں بے ربطی ہے - انتشار ہے - پراگندگی ہے - انہیں معلوم نہیں کہ ہر شعر کی طرح ہر غزل بھی ایک اکائی ہے - غزل کے اشعار مختلف موضوعات پر نہیں ہوتے - ہر شعر کا تعلق ہوتا ہے زندگی سے - محبت سے انسانی جذبات سے - ہر شعر میں زندگی و محبت کے کسی پہلو کی عکاسی ہوتی ہے - کہتے ہیں کہ غزل میں حسن صورت نہیں - غزل میں وہ حسن صورت ہے جو نظم میں ممکن نہیں - اس کے حسن صورت میں ایک لچکیلا پن ہے - اس میں جو بوقلمونی ہے - وہ نظم میں کہاں نصیب غزل میں حسن صورت بھی ہے اور وحدت اثر بھی اس حسن صورت - اس وحدت اثر کی ظاہری علامتیں ہیں مطلع و مقطع - ردیف و قافیہ - وزن - باطنی حسن صورت ، وحدت اثر کا سبب یہہ ہے کہ ہر شعر ہم آہنگ ہے ، ہر شعر میں ساز ہستی کی صدا ہے "

انہوں نے ایک پنسل اٹھائی اور کاغذ کا ایک ورق لے کر کہا " آؤ - غزل کیسی لچکیلی ہوتی ہے اس کا مشاہدہ کرو " یہہ کہکر ایک افقی لکیر کھینچی پھر جلد جلد پانچ لکیریں بنائیں اور آخر میں ایک لکیر کھینچی جو پہلی لکیر کے متوازی تھی - شکل کچھ اس طرح کی تھی :
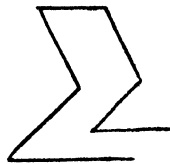
پھر تیزی سے دائرہ ، مثلث ، مربع کی شکلیں بنائیں اور کہا " دائرہ ، مثلث ، مربع میں وہ حسن صورت بالخصوص وہ لچکیلا پن کہاں جو اس شکل میں ہے - اس غزل کا کسی مغربی نظم سے موازنہ کرو - دیکھو ! [illegible] میرا دل رو رہا ہے - جیسے آسمان رو رہا ہے آہ یہہ کیسی خلش ہے جو میرے دل میں [illegible] ہے - زمین پر چھتوں پر بوندوں کی آواز کیسی شیریں ہے - کسی بیزار دل سے بارش کے گیت کا لطف پوچھو - میرا دل حزیں بلاوجہ رو رہا ہے - کیا ! کسی نے بیوفائی نہیں کی ؟ یہہ غم بلاوجہ ہے - بدترین درد یہی ہے جس کی وجہ سمجھ میں نہ آئے - مجھے نہ کسی سے محبت ہے اور نہ کسی سے نفرت ہے - پھر بھی میرے دل میں کتنا درد ہے ! " پول ورلین نے محض ایک تجربہ کی عکاسی کی ہے - یہہ اسی قسم کا

تجربہ ہے جسے ٹینی سن نے (Idle Tears ، Tears) میں نظم کیا ہے۔ لیکن ٹینی سن اور پول ورلین صرف ایک تجربہ کو داخل نظم کرتے ہیں۔ انکی نظموں میں تلوّنی کہاں جو ناسخ کی غزل میں ہو۔ ناسخ کے ہر شعر میں نیا جداگانہ مضمون ہو۔ اس لئے غزل میں دلکشی زیادہ، تنوع زیادہ، پیچیدگی زیادہ ہے اور وحدت اثر بھی کم نہیں پھر اُسے ہم کیوں نہ ٹینی سن اور پول ورلین کی نظموں پر ترجیح دیں، ناسخ کے اشعار میں پراگندگی نہیں ان میں وہ مناسبت ومطابقت ہے جو ایک گلدستہ میں ہوتی ہے ایسا گلدستہ جس میں ہر پھول اپنی بو، اپنا رنگ الگ الگ رکھتا ہے۔"

میں جسارت سے کام لے کر بول اٹھا: "پول ورلین کی نظم میں وہ مناسبت ومطابقت ہے جو کسی حسین گلاب کی مختلف پتیوں، اس کے رنگ وبو میں ہوتی ہے"

"ہوتی ہو" میرے رہنما نے تمکنت کے ساتھ کہا۔ "پھر بھی نظم ایک ہی پھول ہے۔ غزل میں کتنے پھول ہیں کوئی سُرخ ہے تو کوئی سبز، کوئی زرد ہے تو کوئی سفید اور کوئی ارغوانی۔ نظم پھول ہو تو غزل گلدستہ ہے گلدستہ۔ غزل موتیوں کی مالا ہے۔ غزل ہیروں کا ہار ہے۔ غزل ریل ہو جو ایک ہی رفتار سے رواں ہو۔ غزل ہوائی جہاز ہے جو ہمیں آزادی کے ساتھ ہر سمت لے جاسکتا ہے۔ غزل بندوق ہے۔ غزل توپ ہے۔ غزل بم کا گولہ ہے ابھی دلّی کی سڑکوں پر گرا تو ابھی لکھنؤ کی چھتوں پر ابھی پٹنہ میں اور ابھی ٹمبکٹو میں۔"

یہ خط ذرا طویل ہو گیا لیکن میں جانتا ہوں کہ تم بھی میری طرح اردو ادب کے مشتاق ہو آئندہ خطوط میں میں ان مزید بیش قیمت معلومات کا ذکر کروں گا جو مجھے میرے رہنما سے حاصل ہوئی ہیں۔

مخلص

جون سمپل

(۱) olhello Act IV Sc. ۲

(۲) Paul verlaine : Il pleure dans mon coeur

# نئی ماما

"اچھا! یہ نئی عورت کون ہے؟" ذاکر نے ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھتے ہی بیوی سے سوال کیا۔
"کیا کوئی نئی ماما رکھی گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ جوان ہے۔ بیوہ۔ صورت شکل بھی خاصی ہے۔ کیوں پسند آگئی کیا؟"

زبیدہ نے مسکراتے ہوئے ذاکر کی چٹکی لی۔

"ہوگی۔ مجھے اسکی صورت تھوڑی دکھائی دے رہی ہے"

"نزدیک بلا دوں۔ آپ کو ضرور پسند آجائے گی"

"تو پھر تم ایک منٹ اسے تکنے بھی دوگی؟"

"کیوں نہیں" زبیدہ نے قطعاً بے اثری سے کہا جیسے وہ بے سمجھے بول رہی ہو۔

"خیر!" ذاکر نے ماما کی طرف نظر جماتے ہوئے کہا لیکن وہ اسکی پیٹھ کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکا اور سیٹی بجاتا ہوا بالائی منزل پر چلا گیا۔

"جوان ماما گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں" اُس نے سوچا "لیکن نقصان کیا ہے؟ بیچاری بیوہ ہوکر بے سہارہ ہوگئی ہوگی۔ گھر میں ہے ہی کون جس سے کوئی خطرہ ہو۔ مجھکو اسکی طرف نظر اٹھاکر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں۔ ان لغویات کی فرصت ہی کہاں۔ بے فکری اور شباب کا جب زمانہ تھا کافی لطف رہا" "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو۔ ایں رندی و سرمستی در عہد شباب اولیٰ" ذاکر خواجہ حافظ کا شعر گنگنانے لگا۔ ماضی کی لذتوں کے مختلف نقوش پے بہ پے اس کے تصور پر ابھرنے لگے۔ جیسے کوئی رنگین تصاویر کے البم کی ورق گردانی کر رہا ہو۔ ایک خاکہ پر اسکے خیالات کی رفتار تھم گئی۔ "سکینہ کتنی خوبصورت تھی" سکینہ کے ساتھ اس کی وابستگی، سکینہ کا اس سے انتہا پیار سکینہ کا روح فرسا انجام" یہ ساری باتیں بجلی کی رفتار کے ساتھ اس کے دماغ سے گذر گئیں۔ "نہیں جوان ماما رکھنا ہرگز ٹھیک نہیں۔ مفت کی بدنامی میری لغزشوں کا زمانہ تو اب ختم ہوچکا پھر بھی لوگوں کو فضول شبہہ ہوجا سکتا ہے [illegible] جانے واقعی اسکی صورت کیسی ہے۔ ہوگی نہایت مردہ۔ تب ہی تو وہ اسکا مذاق اڑا رہی تھیں کسی حسین لڑکی کو گھر میں رہنے دینگی؟ ان عورتوں کو کبھی شوہروں پر اعتبار ہوسکتا ہے؟ انکی فطرت میں بدگمانی کوٹی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ شک کرتی ہیں۔ کمبختوں کو عقل کہاں کہ مرد اسی بدظنی سے اکتا کر انکی طرف سے نظر پھیر لیتا ہے۔ مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔ جب سے شادی ہوئی میں نے کبھی اُن کے سوا

کسی کو دل میں جگہ نہ دی"۔ اس کی تردید میں ذاکر کا ضمیر مس نائک کے ساتھ اسکی دوستی کی یاد پیش کرنے لگا
"لیکن میں نے ان کے ساتھ التفات میں کوئی کمی نہ کی۔ انہیں کوئی فرق محسوس ہونے نہ دیا۔ ان کا یہ عالم ہے
کہ بات بات پر شک۔ ایسے ہی گرتوتوں سے آدمی چڑھ کر وہ سب کچھ کرنے لگتا ہے" اس کے چہرہ پر متانت
پیدا ہوگئی جیسے وہ کوئی اہم ارادہ کرنے والا ہو۔ "جوانی میں بیوہ ہو جانا بڑا برا ہے" وہ سوچنے لگا۔ "اس بیچاری
کے دل میں ابھی سارے ارمان بھرے ہونگے۔ سوسائٹی کا بڑا ظلم ہے۔ دل کی تمنائیں کسی سے بیان کرے
تو لوگ سنگسار کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اس کی بے بسی پر کسی کی نظر نہ جائے گی۔ سوسائٹی کی اس
حماقت کو دور ہونا چاہئے۔ آخر اس کے معنی کیا ہوئے۔ ایک شخص کی زندگی برباد ہو جائے۔ اسکے سارے
ارمان خاک میں ملجائیں اور سوسائٹی اس کا مداوا کرنے کے عوض اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کو آمادہ رہے
ایسا نہ ہونے دینا چاہئے۔ پڑھے لکھے سمجھدار لوگ کیوں سوسائٹی کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ تو سب
کچھ دیکھ سکتے ہیں، سب کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و کلچر کا صحیح مفہوم تو یہی ہے کہ آدمی روایتی توہمات کے
آزاد ہو کر صحیح و مناسب طریقہ پر عمل کرے۔ بیچاری جوان بیوہ! اگر کسی کے ساتھ ہنس بول کر دل بہلالیا
کرے تو اس کے دکھ کا کچھ تو علاج ہوگا۔ اور اس میں کسی کا نقصان بھی نہیں" ذاکر کے چہرہ پر بشاشت آگئی
لیکن فوراً ہی اس کی جگہ مال اندیشی کی بے رونقی نے لے لی۔" انہیں ہرگز اس جوان بیوہ کو نہ رکھنا چاہئے"
ذاکر سوچنے لگا" خصوصاً اگر وہ خوبصورت بھی ہے۔ جوانی ہی تو اصل حسن ہے، تندرست جوانی" مس نائک
کے بھرے ہوئے اعضا کا تصور تھوڑی دیر کے لئے تخیل کی رو کے سامنے آکر رک گیا۔" ان میں اسی کی تو کمی ہے
قبل از وقت بوڑھی دکھائی دینے لگی ہیں" زبیدہ کا مریض لاغر چہرہ اسوقت اُسے اور زیادہ خستہ اور بے رونق
معلوم ہونے لگا۔ "مجھے ان سے محبت ہے۔ بوڑھی معلوم ہوں تو کیا حقیقت میں انکا سن تو زیادہ نہیں"۔ وہ
سوچنے لگا کہ شوہر بیوی کے لئے کافی قربانیاں کرتا ہے۔" وہ اگر میری بیوی نہ ہوتیں تو شاید میں آنکھ اٹھا کر بھی
ان کی طرف نہ دیکھتا" "کوئی خاص بات تو انکے اندر ہے نہیں" اس کا دماغ ایک جانبدار نقاد کی طرح زبیدہ
کی صورت کا جائزہ لینے لگا۔ "پھر بھی میں ان سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ انہیں معمولی معمولی بات میں مجھ پر
شک ہو جاتا ہے" بیوی کی یہ حرکت اُسے نہایت ناپسندیدہ معلوم ہوئی" ہر درجہ کی خود غرضی" اسے ایک
تکلیف دہ احساس پیدا ہوا"۔ ماما جوان ہرگز نہ ہوگی۔ خوبصورت ہونا تو ناممکن ہے" اس کے دل میں ماما کو
دیکھنے کی تیز خواہش پیدا ہونے لگی اور وہ زینہ سے اتر کر نیچے چلا آیا۔

"کیوں! کوئی کام ہے کیا؟" زبیدہ نے تعجب سے سوال کیا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ
آپ اوپر کسی کام میں لگ گئے ہیں"۔

"نہیں! اچھا یہی آپ کی نئی ماما ہیں!" ذاکر کی نظر ماما کے خوبصورت چہرہ پر پڑی جو دُور

بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔

"ہے نہ جوان ؟"

"ہو گی۔ لیکن تم بھی غضب کرتی ہو۔ اگر ایسی شکل حسین کہی جائے تو جانے بدصورت کسے کہا جائیگا"
ذاکر نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔

"واہ بیچاری کیسی بھولی بھالی ہے" زبیدہ کے سوکھے ہوئے گالوں پر طمانیت کی سرخ ڈوریاں نمودار ہوگئیں جس سے اس کا مریض چہرہ اور بدصورت ہوگیا۔ ذاکر کی نظریں زبیدہ کے چہرہ سے ہٹکر دوبارہ ماما کی طرف پھر گئیں اور وہ حریص نگاہوں سے اسے تکنے لگا۔

"لیکن اس کے رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کام تو ایک ماما سے چل ہی رہا تھا" ذاکر نے زبیدہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔

"بس آپ کو خرچ کا خیال ہوگیا۔ کام تو بغیر ایک ماما کے بھی چل سکتا تھا۔ لیکن میری صحت بھی تو اس قابل ہوتی"

"ارے توبہ! میں نے یونہی کہدیا۔ مجھے کیا تمہاری صحت کا خیال نہیں۔ کونسا فاضل خرچ ہی ہوجائیگا۔ اور پھر میں جو کچھ کماتا ہوں تمہاری ہی خاطر یا اپنے لئے۔ تم تو ذرا سی بات کی پکڑ کرلیتی ہو"۔ زبیدہ کے چہرہ پر خجالت آمیز مسکراہٹ پھیلگئی۔

نئی ماما کا خوبصورت چہرہ، اس کا سڈول تندرست جسم ذاکر کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا وہ بار بار اس کی طرف سے ذہن منتقل کرنے کی بےسود کوشش کر رہا تھا۔ اسے زبیدہ سے نہایت محبت ہوگئی تھی۔ زبیدہ کی کوئی تکلیف وہ برداشت نکرسکتا تھا۔ دس سال کی پرسکون رفاقت نے اسے زبیدہ کے ساتھ ایک گہرا انس پیدا کردیا تھا۔ اس کی دلجوئی، اس کی جمعیت خاطر کا سامان وہ اب عادتاً کرنے لگا تھا۔ نئی ماما کے ورود نے اس کی پرسکون [illegible] عافیت آمیز زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا کردی تھی اس کا دماغ خوف اور خطرہ کی کیفیت محسوس کرنے لگا جیسے دور اٹھتا ہوا بگولا صحرانشیں کے دل میں دہشت طاری کردیتا ہو۔ "انکا دل ٹوٹ جائے گا" وہ سوچنے لگا۔ "وہ اس کی تاب نہ لاسکینگی"۔ اسے زبیدہ سے ہمدردی ہونے لگی۔ "نہیں ان کے ہوتے ہوئے میں کسی دوسرے پر نظر کیوں ڈالنے لگا" نئی ماما کا تندرست اور خوبصورت ڈھانچہ اسکی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ "ان کا اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ ان کے ساتھ جو مجھے دلی تعلق ہے [illegible] فرق تھوڑا ہی آجائے گا؟ میری محبت [illegible] کمی تو آنے کی [illegible] ہرگز راضی نہوں گی" وہ خیال کرنے لگا کہ زبیدہ کو اس میں بڑی بادتی نہیں اپنی صحت کا [illegible] خرابی کا کوئی احساس ہی نہیں! اتنا نہیں سمجھتیں کہ میں کب تک انکی خاطر

اپنی مسرتیں پامال کرتا رہوں گا۔ یہ عورتیں سچ مچ بڑی خود غرض ہیں اور ساتھ ہی ناسمجھ بھی۔"
نئی ماما کا گداز جسم ذاکر کے تصور پر منعکس ہو گیا۔ وہ اُسے اپنے نہایت قریب محسوس کرنے لگا۔ ایک گہری لذت کی سرشاری اس پر طاری ہو گئی۔ جیسے وہ تصور میں اُسے بھینچ رہا ہو۔ پھر اُسے زبیدہ کا خیال آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ پچھلی بیماری میں اگر اس نے زبیدہ کی اتنی اچھی طرح تیمارداری نہ کی ہوتی تو وہ زندہ نہ رہ سکتی۔ زبیدہ کی موت کے خیال سے وہ سہم گیا۔ "وہ زبیدہ کے بغیر کس طرح زندہ رہ سکتا تھا" اس نے سوچا۔ "ان کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ کیوں نہیں میں ان کو سمجھا کر راضی کر لوں۔ وہ دل سے کبھی راضی نہوں گی۔ ان کی صحت اور زیادہ خراب ہو جائے گی" اس کے چہرہ پر نا امیدی کی شکستگی چھا گئی۔

دن کی مصروفیتوں سے علٰحدہ ہوتے ہی ذاکر کا دماغ خیالات کے ادھیڑ بن سے الجھنے لگتا رات کے سناٹے میں جب زبیدہ اسکے پہلو میں بے خبر سوئی ہوتی نئی ماما کا تصور ذاکر کو چھیڑنے لگتا۔ خواب میں زبیدہ پر اُسے نئی ماما کا دھوکہ ہوتا اور وہ اسے اپنی آغوش میں محسوس کرکے کامرانی کی مسرتوں سے لذت گیر ہونے لگتا۔ لیکن بیداری کے بعد اسکی لطف اندوزیاں کافور ہو جاتیں۔ نئی ماما کے قریب پہونچ جانے کا ارادہ دفعتاً اُس کے اندر اُبھر آتا۔ اور اس کے پاؤں بستر سے اترنے کے لئے مچلتے ہوئے سے محسوس ہونے لگتے۔ لیکن زبیدہ کا خیال اس کے ارادہ پر پانی پھیر دیتا۔ "شاید اسکی نیند ٹوٹ جائے!"

"تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی نئی ماما کی ہمارے گھر میں کوئی ضرورت نہیں۔ جب ایک ماما تھی اسوقت بھی مجھے خود اتنا ہی کام کرنا ہوتا تھا۔ جس قدر اب۔ اس نے پہلے کبھی نوکری کی ہی نہیں۔ آپ سے کوئی کام کرتی نہیں ہے اور میری عادت نہیں کہ ایک کام کے لئے بار بار کہوں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اُسے علٰحدہ کر دوں" زبیدہ نے ایک دن ذاکر سے مشورۃً کہا۔

"بھئی اس قسم کے معاملہ میں مجھ سے رائے نہ لیا کرو تو اچھا ہے"۔ ذاکر نے بے مروتی سے جواب دیا۔ زبیدہ نے اُسے محسوس کیا۔ "تمہیں تو خود فضول کام کرنیکی عادت ہے۔ اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں۔ دوا بھی تو نہیں کھاتی ہو۔ مرض بڑھ جاتا ہے تو خود بھی پریشان ہوتی ہو اور مجھے بھی جھکتنا پڑتا ہے"

"میں نے آپ کو کب کہا کہ میری بیماری کے پیچھے آپ اپنے کو پریشان کیجئے؟" زبیدہ نے غمناک آواز میں سوال کیا۔ "میں تو برابر کہتی ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کیجئے۔ میری قسمت میں بیماری لکھی ہے۔ میں بھگتوں گی۔ آپ خواہ مخواہ اپنے سر پریشانی لے لیا کرتے ہیں۔ اب کے بیمار پڑوں گی تو آپ کو خبر نہ دوں گی" زبیدہ نے آخری جملہ رکتے رکتے کہا۔ اسکی آواز بھرنے لگی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"بس تمہیں تو ذرا ذرا سی بات بری لگ جاتی ہے" ذاکر یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ماما چلی جائے گی" ذاکر سوچنے لگا۔ "اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ لیکن بیچاری بے سہارا ہو جائے گی۔ ان کا یہ صریح ظلم ہے۔ ایسا ہی تھا تو پہلے ہی گھر میں پناہ نہ دینی تھی۔ اب اس طرح اسے علحدہ کر دینا! بڑی نامناسب بات ہے۔ بیچاری کہاں بھٹکتی پھرے گی" اس نے ارادہ کیا کہ وہ ماما کو علحدہ کرنے سے زبیدہ کو منع کر دے۔ لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ "وہ کیا سمجھیں۔ میں نے کبھی پہلے دائی ماما کے معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ وہ جانیں اور اس کی قسمت جانے۔ واقعی میں کیوں اس کے معاملہ میں دخل دیتا پھروں۔ انسانی ہمدردی بھی تو ایک چیز ہے۔ ایک بیکس لڑکی کو اس طرح بے گھر کر دینا۔ جوان ہے خوبصورت۔ کتنے بدمعاش اس کے پیچھے لگ جائیں گے" ذاکر کی آنکھیں حریصانہ ہو رہی تھیں۔ جیسے بھوکا خدمتگار دور سے مالک کے دسترخوان کو تک رہا ہو۔ "اس کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ وہ ضرور اسے علحدہ کر دیں گی" ذاکر نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی کی عزیز ترین چیز اس سے چھنی جا رہی ہو۔ اس کے اندر بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ ماما کا حسین معصوم چہرہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ ذاکر کو اس پر غائت ترس آنے لگا لیکن زبیدہ سے ماما کی سفارش کرنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

ذاکر کی گفتگو کی تلخی پر زبیدہ کو صدمہ سے زیادہ اچنبھا ہوا۔ ذاکر اس کے ساتھ اس طرح کی ترش روئی کا عادی نہ تھا۔ اور وہ بھی بے سبب۔ "ماما کا علحدہ کیا جانا شاید انہیں پسند نہیں" لیکن کیوں؟ جواب سے پہلے ہی یہ سوال اس کے معصوم دماغ سے کھو گیا۔

زبیدہ نے ماما کو علحدہ نہ کیا۔ ماما ذاکر کی ملتفت نظروں کی رفتہ رفتہ عادی ہوتی جا رہی تھی اور زبیدہ سے آنکھیں بچا کر وہ بھی اکثر ذاکر کو دیکھ لیا کرتی۔ پہلے تو دونوں کی نگاہیں ملتے ہی جھپک جاتیں لیکن رفتہ رفتہ ایک دوسرے کو دیر تک تکنے لگے تھے۔ جیسے دونوں نگاہوں کے تار آہستہ آہستہ منسلک ہوتے جا رہے تھے۔ نگاہوں کے جلو میں اب چہرہ کی مسکراہٹ بھی نمایاں ہونے لگی تھی اور بے زبانی راز و نیاز کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ذاکر بے سبب بھی اب زنانہ مکان میں دیر تک رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی زبیدہ کی وقتی غیر حاضری میں وہ ماما سے چٹکیاں بھی لینے لگا تھا ماما اب تک زبان سے کچھ نہ بولتی تھی لیکن ذاکر کی چھیڑ چھاڑ کا جواب وہ ایک خوش آئند مسکراہٹ سے دیدیا کرتی جس سے ذاکر کا شوق اور بھڑک اٹھتا۔

زبیدہ ذاکر کے معمولات کا فرق محسوس تو کر رہی تھی۔ لیکن اب تک اسے اس تغیر میں خطرہ کی جھلک نہ دکھائی دی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر تو اسے [illegible] کہ ذاکر اس کی صحت کی خرابی سے متاثر ہو کر

اس کی صحبت اور دلجوئی میں اَب کچھ زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ ماما سے اُسے دن بدن نہ معلوم کیوں چڑھ سی ہوتی جارہی تھی۔ بات بات پر وہ اس سے غصہ کرنے لگتی۔ اس کے ہر کام میں اُسے کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا۔ اس کی ہر بات پر وہ نکتہ چینی کرتی اور اس کے ہر انداز پر کوئی نہ کوئی اعتراض اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا زبیدہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ماما اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی لیکن اس کا اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑتا۔ رفتہ رفتہ اس کی خودداری مردہ ہونے لگی اور وہ بےحس اور بےحیا بنگئی۔

زبیدہ کسی معمولی قصور کے لئے نئی ماما پر خفگی کا اظہار کررہی تھی کہ ذاکر مکان میں داخل ہوا ماما گردن جھکائے مالکہ کی جھڑکیاں خموشی سے سن رہی تھی۔ ذاکر کی آہٹ پاکر دونوں کی توجہ اسکی جانب منعطف ہوگئی۔ خادمہ کا چہرہ ذاکر کو نہایت معصوم اور بےگناہ دکھائی دیا۔ زبیدہ اُسے نہایت تشدد پسند اور شقی القلب معلوم ہوئی۔

"کیا حضرات مچا رکھا ہے؟" ذاکر نے زبیدہ کی طرف خشمگیں نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بیماری تمہیں کافی بدمزاج بنادیا ہے۔ جب دیکھو دائیوں پر غصہ غضب کرتی رہتی ہو۔ ماما رکھنے کا خود سلیقہ نہیں۔ بات بات پر ان کے پیچھے لگی رہتی ہو۔ دائیوں سے لڑنے کے علاوہ کسی دوسری بات سے تمہیں دلچسپی بھی ہے۔ بس ہر وقت انہیں کے معاملوں میں لپٹی رہتی ہو" ذاکر بڑبڑاتا ہوا کوٹھے پر چلا گیا۔

زبیدہ دم بخود ہوگئی۔ ذاکر کے تیور، اس کی گفتگو کا نشتر زبیدہ کے لئے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ایک حادثہ! اسکی گھبرائی ہوئی نگاہیں ماما کے چہرہ سے ٹکرائیں وہ اسے بشاش اور مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ زبیدہ کے چہرہ پر مردنی چھاگئی۔ اس کے جسم کا خون جم گیا اور ایک بےجان پتلے کی طرح اس کے پاؤں زمین سے چپک گئے۔

اوپر پہونچکر ذاکر اپنی اس اضطراری حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ "مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔" اس نے سوچا۔ "ان پر کافی اثر ہوا ہوگا۔ خانگی معاملات میں مَیں کبھی ان سے اس طرح پیش نہ آیا تھا بدمزاج ہوتی جارہی ہیں۔ پہلے تو اس طرح دائیوں سے جھگڑنے کی انہیں عادت تھی۔ بیچاری کی صحت بھی تو خراب ہے۔ آئے دن کا روگ آدمی یونہی چڑچڑا ہوجاتا ہے" اسے زبیدہ پر ترس آنے لگا۔ "مجھے ماما کے مقابلہ میں ان سے اس طرح نہ بولنا چاہیئے تھا۔ ان کے دل پر سخت چوٹ لگی ہوگی۔ جواب میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکیں۔ بڑا صدمہ پہنچا ہوگا۔ میں نے غلطی کی تنہائی میں سمجھا دینا تھا۔ سمجھدار کافی ہیں۔ کبھی بھی کوئی کام انہوں نے میری رضامندی کے خلاف نہیں کیا۔ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ اس طرح پیش نہ آنا چاہیئے تھا" ذاکر پر

انفعال کی ایک گہری کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا ضمیر اسے نشتر چبھانے لگا۔ وہ کافی دیر تک اس ذہنی اذیت میں مبتلا رہا۔ پھر روزمرہ کے کاموں میں لگ کر اس واقعہ کو اس نے دماغ سے فراموش کر دیا۔

زبیدہ کی ناقابل اعتبار صحت پر ذاکر کے برتاؤ کا گہرا اثر پڑا۔ وہ فطرتاً غائت ذکی الحس تھی۔ اس پر صحت کی مسلسل خرابی نے برداشت کی قوتیں اس سے چھین لی تھیں۔ بیماری کے کسی حملہ نے کبھی اسے ایسا صدمہ نہ پہونچایا تھا۔ جیسا اسے اس دن کے واقعہ سے ہوا۔ رات بھر اس پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ جیسے کوئی اپنی موت کے خواب سے جاگا ہو۔ اس کی نیند بالکل اچاٹ رہی اور اس کے سارے جسم میں سنسنی سی محسوس ہوتی رہی۔ گو ذاکر پر اس نے اپنا اضطراب ظاہر نہ ہونے دیا اور مصنوعی طور پر اپنے کو خوش دکھاتی رہی۔

زبیدہ کو پھر ہلکی حرارت شروع ہوگئی۔ اس کی بھوک رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور طبیعت گری گری سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن ظاہرا وہ اپنی صحت کے اس بتدریج انحطاط سے متاثر نہ تھی صحت کا بگاڑ اب تقریباً اس کی روزمرہ زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ اور جب تک وہ اسے کھپ سکتی اپنے آپ کو زیر نہ ہونے دیتی۔ جب مرض کافی زور پکڑ لیتا اور برداشت اسکی قوت سے باہر ہوجاتی تو اُسے اپنے بیمار ہونے کا احساس پیدا ہوتا اور علاج و تدبیر شروع کی جاتی۔

ذاکر کچھ دن سے زبیدہ کی صحت کا فرق محسوس کر رہا تھا۔ لیکن زبیدہ نے اسے اطمینان دلادیا تھا کہ اس کی صحت میں کوئی قابل توجہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اب اسے بہت زیادہ اہمیت دینے کا عادی نہ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ زبیدہ کی صحت کا نمایاں فرق ذاکر کو کھٹکنے لگا۔ اور اس نے زبیدہ کے علاج کیطرف توجہ شروع کردی۔ زبیدہ کو بھی باضابطہ مریض بنکر پلنگ پر گر جانا پڑا۔

ایک روز زبیدہ کی علالت نے مہلک صورت اختیار کرلی بخار دفعتاً بہت تیز ہوگیا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی ذاکر بہت گھبرا گیا۔ اس نے کمال احتیاط کے ساتھ تیمارداری شروع کردی۔ دن بھر اپنے ہاتھ سے زبیدہ کے سر پر برف کی ٹوپی رکھتا رہا۔ اُسے رہ رہ کر ڈر پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں زبیدہ اس دفعہ مرض کی شکار نہ ہو جائے۔ اس خیال سے اس کے دل و دماغ میں غم و اندوہ کا دریا امڈا آ رہا تھا، زبیدہ کی نیک طبیعت، اس کی اعلیٰ سمجھ، ذاکر کی دلداری کا خیال، اس کے آرام و عافیت کی فکر؛ یہ ساری باتیں اس کے دماغ کے سامنے چکر لگا رہی تھیں اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زبیدہ اور اس کی ساری خوبیوں سے وہ محروم کر دیا جانیوالا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ زبیدہ کے بغیر اس کی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا پر تاریکی چھا جائیگی۔ وہ جینے کے قابل نہ رہسکیگا۔ زبیدہ کے بغیر وہ کس طرح زندگی گذار سکے گا؟ اس نے خیال کیا کہ زبیدہ کے بعد وہ دنیا سے قطع تعلق ہو جائیگا، زندگی کی لذتوں سے بیگانہ۔ وہ دوبارہ ازدواجی زندگی کا منہ دیکھیگا

اور ایثار و خدمت کی بلند پایہ مصروفیتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیگا۔

شام سے زبیدہ کا بخار اترنے لگا۔ لیکن ابھی اسے ہوش نہ ہوا تھا۔ ذاکر اسی سرگرمی سے اس کے سرھانے بیٹھا سر پر برف کی ٹوپی رکھ رہا تھا۔ رات کے دس بجے زبیدہ نے انکھیں کھولیں۔ "آپ ابتک بیٹھے ہوئے ہیں؟" اس نے نحیف اور مضمحل آواز میں کہا۔ "آپ جاکر سو رہئے" "میں سوؤں گا۔ تمہاری طبیعت اب اچھی ہو رہی ہے نا" ذاکر نے مشتاقانہ زبیدہ سے سوال کیا۔ "میں اچھی ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جاکر سو رہئے" زبیدہ نے چہرہ پر مسکراہٹ اور صحت کی کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ذاکر کا دل بھر آیا اور اسکی آنکھوں سے آنسو کے قطرے زبیدہ کے گال پر گر گئے۔ زبیدہ نے اپنی کمزور نگاہیں ذاکر کی طرف اٹھاکر اسے تسلی کی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا اٹھی تھیں۔ ذاکر نے وارفتگی میں اپنا چہرہ زبیدہ کے گرم گالوں کے قریب کر دیا۔ اس کی آرزوؤں کی ساری دنیا زبیدہ کے بیمار چہرہ میں سمٹ آئی تھی۔ زبیدہ اسوقت اُسے بے حد حسین دکھائی دیرہی تھی۔ جیسے کوئی جنت کی حور۔

تھوڑی دیر میں زبیدہ کو نیند آگئی۔ ذاکر نے محسوس کیا کہ اس کا بخار کافی اتر چکا تھا اور برف کی ضرورت باقی نہ رہی تھی، اس کا خوف اب جاتا رہا تھا۔ اور اسے غائت مسرت تھی کہ زبیدہ اُسے واپس مل گئی تھی۔ زبیدہ اسکی چہیتی بیوی! اس نے ارادہ کیا کہ زبیدہ کو ماما کی نگرانی میں چھوڑ کر خود تھوڑی دیر کے لئے سو رہے اور ماما کو آواز دینے کی غرض سے آہستہ سے کمرہ سے باہر نکلا۔ اس نے دھیمی آواز سے ماما کو پکارا۔ نئی ماما جاگ رہی تھی۔ آواز سنتے ہی بازو کے کمرہ سے نکل کر ذاکر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ذاکر اُسے ضروری ہدایت کرنیکی غرض سے اس کے قریب ہو گیا۔ چاندنی میں اس کی آنکھیں ماما کی نظروں سے دوچار ہوگئیں۔ اس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔ ماما سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے ماما کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اضطراری طور پر اس کے ساتھ بازو کے کمرہ میں چلا گیا۔ دوسرے لمحہ میں اس کا ہاتھ ماما کی گردن میں حمائل ہو چکا تھا اور ماما اس کی آغوش میں تھی۔

محمد محسن

# چچا برنارڈ کی سیپ

چچا برنارڈ کے پاس ایک بہت بڑی سیپ تھی، جسے وہ اپنے درازوالے صندوق پر رکھتے تھے
ہنڈسکرک کے جنگل میں جو سمندر سے ڈیڑھ سو میل پر تھا گلابی کناروں والی سیپ کثرت سے نہیں ملتی تھی
اس سیپ کو ریاست کا ایک سپاہی ڈینل رشر نامی اپنے بحری سفر کی دائمی یادگار کے طور پر لایا تھا،
مت پوچھیے اس نادر چیز نے ہم دیہاتی بچوں کے تصور سے کتنا خراج تحسین وصول کیا، چچا
جب ملاحظہ کیلئے باہر جاتے ہملوگ سروں پر روئی کی ٹوپیاں رکھے اپنا ہاتھ اچکنوں کی جیب میں
ڈالے لائبریری میں گھس پڑتے اور اپنی ناک سنگ مرمر کے تختے سے لگا کر اس "امریکن اسنیل" کو ٹکٹکی
لگا کر خوب دیکھتے۔

لڈک کہتا یہ جھاڑیوں میں رہی ہوگی، کیسپر کا خیال ہوتا کہ دریاؤں میں اس کی پرورش
ہوئی ہوگی۔ مگر شاید ہم میں سے کوئی بھی اسکی حقیقت سے باخبر نہ تھا، ایک دن ہملوگوں کو بدستور سابق
جھگڑاتے دیکھکر چچا برنارڈ مسکرانے لگے۔ انہوں نے اپنی مثلث نما ٹوپی میز پر رکھدی، سیپ کو ہاتھ میں
لے کر آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "سنو تو اس کے اندر کیا ہو رہا ہے"

ہم سبھوں نے اپنے کان سیپ سے لگا دیا آواز سنائی دی۔ کچھ شکوہ اور بھنبھناہٹ کی سی جیسے
بہت دور جنگل کی خاموشی میں آندھی چل رہی ہو۔ ہملوگ دام تحیر میں گرفتار ہو گئے۔
"تم لوگوں نے اسے کیا سمجھا" چچا نے پوچھا۔ لیکن ہملوگوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ کیا جواب دیا جائے
پھر انہوں نے معنی خیز لہجے میں ارشاد فرمایا۔

"بچو! یہ بھنبھناہٹ جو اس کے اندر بند ہے وہ تمہارے سر، تمہارے بازو، تمہارے دل اور
تمہارے ہر ہر عضو کے خون کی روانی کی آواز ہے۔ کہیں اسکی رفتار ایک چشمہ کی سی دھیمی ہے۔ کہیں
فوارے کی مانند تیز، اور کہیں بڑے بڑے جھرنوں کی طرح رواں دواں ہے۔ یہی تمہارے اندرونی جسم
کو سیراب کر کے پھلنے پھولنے اور تمہیں زندہ رہنے کا سلیقہ بخشتی ہے اور تمہاری تازگی کے لئے ایک
حیلہ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ صدائے بازگشت میں ہولوروک سے تمہاری چیخ ہی پلٹ کر واپس آتی ہے
جب تم چلاتے ہو۔ تمہارے گیت ہی سنائی دیتے ہیں جب تم گاتے ہو اور شام کو جب تمہاری
بکریوں کا چھوٹا سا قافلہ رینگتا ہوا گھر کی طرف آتا ہے اسوقت تمہاری بانسری کی گونج ہی فضا میں
تیرتی پھرتی ہے۔ سمجھے۔ یہ سیپ بھی ہولوروک کی طرح ایک صدائے بازگشت ہی ہے۔ جب تم اسے

اپنے کان کے پاس لے آتے ہو تو اسکی صدائے بازگشت تمہارے ہی دل کی پکار ہوتی ہے جو زمین و آسمان کی ہر آواز سے بالکل مشابہ ہے آخر کیوں نہ ہو؟ ہملوگ بھی تو الگ الگ ایک دنیا ہیں۔ انسان اُن معجزات کا جو ایک پل میں اُس کے دماغ میں رونما ہوتے ہیں، جو اُسے زندگی اور فکر کی طاقت بخشتے ہیں اور جنکی بھنبھناہٹ اس سیپ میں ملتی ہے اگر ایک ادنیٰ حصہ بھی دیکھ سکتا تو وہ اپنا سر گریبان میں ڈال کر پہروں خوب روتا اور خدا کی بے انتہا خوبیوں کا شکر بجالاتا"

بعد ازاں جب تم جوان ہو گئے تم ہماری باتوں کو اور بھی اچھی طرح سمجھ گئے اور تسلیم کروگے کہ میں نے سچ کہا ہے۔ اس دوران میں میرے پیارے دوستو! اپنی روح کی خوب دیکھ بھال کرنا۔ اس پر آنچ نہ آنے دینا کیونکہ تمہاری زندگی اسی روح سے وابستہ ہے۔ اُس مالک نے تمہاری چھوٹی سی دنیا کو منور بنانے کے لئے اس میں روح عطا کی ہے جس طرح فضائے بسیط کو گرم اور روشن رکھنے کے لئے اُس رب قدیر نے آفتاب کی تخلیق کی ہے جھوٹ، نافرمانی، سُستی اور کاہلی سے سدا بچتے رہنا۔ نہیں تو یہ ساری کثافت بادل کی طرح پھیل کر تمہاری اُس روشنی کو جو اللہ نے تمہیں دی ہے الوپ کر دے گی، اگر تمہاری روح ان بدلیوں سے پرے رہی تو ہمیشہ صاف شفاف سورج کی طرح روشن رہے گی۔ اور تم خوش نظر آوگے"۔

یہ تھی چچا کی وہ تقریر جسکو ہم سبھوں نے خوب غور سے سُنا، انکی اس نصیحت پر کاربند ہونے اور اپنی روحوں کو آلائشوں سے پاک رکھنے کا مصمم ارادہ بھی کر لیا۔

اس کے بعد میں نے بارہا اس حیرت کن سیپ سے کان لگا کر اس کی بھنبھناہٹ کو سُنا، موسم خزاں کی سہانی شام کو جب چراگاہ سے واپس آتا اُسے اپنی گود میں لے کر اپنے گالوں کو اسکی گلابی میناکاریوں کے برابر کر کے اس میں خوب گہرے خیالات کا کھوج لگاتا، اور کبھی کبھی یہ سوچکر "کاش میں ان تمام چیزوں کو ایک ننھے سوراخ کے ذریعہ دیکھ سکتا" انہیں طرفہ خیالات کی تصویر میری نظروں کے سامنے آجاتی جس کا تذکرہ اکثر و بیشتر چچا برنارڈ کیا کرتے تھے۔

لیکن مسلسل غور و خوض سے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ سیپ کی بھنبھناہٹ میرے ہی خیالات کی صدائے بازگشت ہے اور اس تمیز نے مجھے اور بھی حیرت میں ڈالدیا۔ ہمارے خیالات میں سے بعض تو بڑے لطیف اور رس دار ہوتے اور بعض نہایت ہی دل خوش کن۔ انکا ترنم نو وار دانِ بہار کے گیتوں سے آشنا معلوم ہوتا جس سے میں بے حد خوش ہوتا تھا اسی لئے گھنٹوں مُنہ کھولے، نظریں ایک سمت جمائے، سانس روکے سیپ کی آواز سننے میں

محو رہتا اور شاید اسی طرح لگاتار سُنتا جاتا اگر بوڑھا گریڈن مجھے یہ کہکر آواز نہ دیتا۔
فرزل! کیا سوچ رہے ہو؟ تھوڑی دیر کے لئے سیپ کو ہٹالو اور میز پوش تو بچھادو
ڈاکٹر صاحب اب واپس آرہے ہیں"
ایک آہ بھر کر میں نے سیپ کو صندوق پر رکھدیا، اپنے اور چچا کے لئے میز پر چادر کو
پھیلا دیا اور بڑا شیشہ لے کر کنوئیں سے پانی لے آیا۔
غرضکہ ایک دن چچا برنارڈ کی سیپ نے مجھے خاطر خواہ پیغام نہ دیا، اس کی موسیقی میں
ایک عجیب تلخی تھی جس سے میں بہت خائف ہوگیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں خود اپنی ذات ہی سے مطمئن
نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے؟ کالے بادل تو میری روح پر چھاگئے تھے کیونکہ میں نے ایک جرم کیا تھا
بہت بڑا جرم۔ یہ واقعہ بھی مجھے شروع سے ضرور کہدینا چاہیئے۔ یہ اس طرح رونما ہوا
لڈوگ اور میں التبرک کے پلیٹو پر سہ پہر کے وقت اپنی بکریوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے،
چابک کی ڈور بھی گوندھتے جاتے اور ساتھ ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے سیٹی بھی بجاتے جاتے تھے۔
بکریاں چٹانوں کے سرے پر چڑھکر اپنی گردنیں اُٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں
ہمارا بڈھا بے دانت والا کتا بوکل اپنا بڑا سا سر تلووں کے درمیان سمیٹے گہری نیند
لے رہا تھا۔ ہملوگ ننھے ننھے سایہ دار صنوبر کے کنج میں لیٹے ہوئے تھے کہ لڈوگ نے
دفعتہً نالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "دیکھو اُس بڑے چٹان
کے کنارے پر جو شاہ بلوط کا ایک پرانا پیڑ ہے اس پر ابابیلوں کا ایک گھونسلا ہے"
تب میں نے دیکھا کہ ایک ابابیل شاید اس سے بیخبر کہ ہملوگ اس کی
طرف دیکھ رہے ہیں شاخوں پر ادھر ادھر پھدک رہی ہے۔ چچا برنارڈ نے ہزاروں دفعہ
چڑیوں کے گھونسلوں کو برباد کرنے سے ہمیں منع کیا تھا۔ اور خاص کر یہ گھونسلا تو نشیب سے
کافی بلندی پر درخت کے نہایت ہی پتلے دو شاخ پر آباد تھا۔ تھوڑی دیر تک ہملوگوں نے
اسکی طرف خوب غور سے دیکھا، پھر لڈوگ نے کہا۔
"اس میں بچے بھی ہیں۔ صبح کو جب میں جھاڑی میں جامن چن رہا تھا میں نے
ان کی چہچہاہٹ سنی ہے، کل شاید اڑان کر جائیں گے، ان کے پر بھی ضرور نکل آئے ہیں
میں ابھی تک خاموش تھا، لیکن اس شیطان نے مجھے آگے ڈھکیل ہی دیا،
میں اوپر چڑھکر درخت کے پاس گیا، درخت کانٹوں سے گھرا ہوا تھا میں نے چاہا کہ اُس کے
تنے سے لپٹ کر اوپر چڑھ جاؤں، مگر اس کی موٹائی بہت زیادہ تھی۔ چاروناچار پاس

ہی اُگے ہوئے ایک ہریالے پودے کے سہارے میں نے شاہ بلوط کی ایک شاخ کو تھام لیا اور اوپر چڑھ گیا، دونوں ابابیلیں غمناک چیخ پکار کے ساتھ گھونسلے کے گرد چکر کاٹنے لگیں میں نے اُس طرف کوئی توجہ نہ کی اور اُس پتلی شاخ کو جھکا کر گھونسلے کو قریب لے آیا اب میں اُسے اچّھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ اس میں تین بچّے اور ایک انڈا دیکھکر فرطِ خوشی سے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ بچّے سب اپنی گردنیں نکالے، زرد زرد چونچ حلق کے نیچے جمائے بیٹھے تھے، مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے ان کو پالیا، لیکن جونہی میں سامنے والی شاخ کو تھام کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا یکایک وہ شاخ ٹوٹ گئی اور میرے پاؤں نیچے لٹک پڑے اور میری زبان سے ایک چیخ نکل گئی "اے میرے اللہ"

فضا میں دو قلابازیاں کھا کر میں ایک بڑی سی نچلی شاخ پر گر پڑا جسے میں نے فوراً پوری مضبوطی سے تھام لیا۔ سارا پیڑ جڑ سے کانپ اٹھا اور اوپر والی شاخ چٹانوں سے ٹکراتی ایک مہیب آواز کے ساتھ جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے نیچے کی طرف آتی رہی۔ حواس باختہ میں نے اُسے نالے میں گرتے دیکھا۔ تیز دھارے پر یہ چھینٹے اڑاتی جھاگ کے ساتھ گھومتی گھماتی ایک بڑے گرداب میں جاکر نظروں سے اوجھل ہو گئی تب میں نہایت ہوشیاری سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے دبائے تنے تک پہنچا اور وہاں سے پھسل کر ہانپتا کانپتا جھاڑی میں آ کر گر پڑا، دونوں ابابیلیں ابھی تک گریہ وزاری کرتی میرے سر پر منڈلا رہی تھیں۔ لڈوگ بھاگ چکا تھا لیکن اتفاق سے آلتنبرگ کے راستے نیچے اترتے وقت اسنے پلٹ کر دیکھا، مجھے صحیح وسالم پا کر یہ آواز دیتا میرے پاس آیا "تم یہاں ہو۔ کیا تم چٹان سے نہیں ٹکرائے؟

"ہاں" میں نے بھی ہکلاتے ہوئے جواب دیا "یہیں ہوں، خدائے غفور نے مجھے بچا لیا....... چلو ہم لوگ چلیں۔......... بھاگ چلیں یہاں سے.... میں بہت ڈر گیا ہوں....

شام کے سات بجے ارغوانی آفتاب صنوبروں کے درمیان ڈوب رہا تھا۔ میں نے اپنی بکریوں کی رکھوالی اس دن خوب کی تھی۔ شام ہونے پر ہمارا گلّہ کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی سے ہو کر سیدھا "ہرشس لینڈ" کی طرف جا رہا تھا۔ گذرے ہوئے اور شاموں کی طرح آج نہ تو میں نہ ہی لڈوگ ہولو روک کی صدائے بازگشت کیلئے خوب مگن ہو کر اپنی بانسری بجا رہے تھے۔ ہم لوگوں پر خوف طاری تھا۔

میرے پاؤں تو ابھی تک کانپ رہے تھے ۔ مکان پر پہنچکر جہاں بکریاں دائیں بائیں ہو ہو کر ہر ہر اڈے پر ممیاتی ہوئی جانے لگیں میں نے لڈوگ سے کہا

"تم کچھ کہو گے تو نہیں"

"نہیں ۔ اس سے اطمینان رکھو"

میں گھر پہنچ کر چچا برنارڈ کے پاس گیا ۔ وہ پہاڑیوں پر کسی بڈھے لکڑہارے کو دیکھنے گئے تھے ۔ وہ بیمار تھا گریڈل نے دسترخوان چن دیا ۔ جب چچا آٹھ بجے تک واپس نہیں آئے تو ہم لوگوں نے اکیلے ہی کھالیا ۔ گریڈل برتنوں کو باورچی خانے میں لیجاکر دھونے لگا اور میں لائبریری میں گھس پڑا ، ہاتھ میں سیپ کو تو لے لیا مگر ایک خلش سا تھ رہی ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسکی جھنجھناہٹ کیسی تھی ۔ میں نے تمام جھرنوں اور ندیوں کو گرجتے ہوئے سُنا ، اسی گرج میں ابابیلوں کی گریہ وزاری بھی شامل تھی اور ساتھ ہی شاہ بلوط کی تھرتھراہٹ اور اسکی گرتی ہوئی شاخ کے چٹان سے ٹکرانے کی آواز بھی ۔ بچارے ننھّے بچوں کا پتھر سے ٹکرا کر بھرتہ ہو جانے کا سماں ، معاذ اللہ !! ...... کتنا وحشتناک تھا ...... کتنا وحشتناک !

وہاں سے بھاگ کر اپنے کھلیان سے دور میں اپنے کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ رہا ۔ مگر کچھ نہ سوسکا مجھ پر خوف ابھی تک طاری تھا ۔

قریب دس بجے رات کے سناٹے میں چچا کے گھوڑں کی ٹاپ سنائی دی وہ ہمارے دروازے کے قریب رُکے گھوڑے کو اصطبل میں چھوڑ آئے اور اندر داخل ہوئے میں نے انہیں باورچی خانے کی الماریوں کو بھی کھولتے سُنا ، ان کی یہ عادت تھی جب بھی وہ باہر سے دیر کرکے آتے تو ہلکا ناشتہ کر لیتے

"میری کارستانی اگر ان پر ظاہر ہوگئی تو" میں نے دل ہی دل میں کہا —— آخرکار چچا سو گئے ، میں نے سونے کی بے حد کوشش کی مگر بے سود ۔ کسی کروٹ چین نہ آیا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری روح تاریکی میں جکڑ گئی ہے اور میں نے چیخ مارنی چاہی ۔ آدھی رات گئے میری بے چینی اور بھی بڑھ گئی ۔ میں نے بہتر سمجھا کہ چچا کے سامنے جاکر اپنے سارے گناہوں کا اعتراف کرلوں ۔ پلنگ سے اٹھ کر قمیص پہن چچا کے کمرے میں آپہنچا ۔ میز پر روشنی جل رہی تھی اور چچا سوئے ہوئے تھے ، میں اُن کے پلنگ کے پاس دوزانو ہوکر جھک گیا ۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور کہنی کا سہارا لے کر کمال تعجب سے میری طرف نظریں جما دیں ،

"فریزل" انہوں نے کہا "کیا ماجرا ہے میرے بچے ؟

"چچا برنارڈ" کہکر میں رو پڑا "مجھے معاف کر دیجئے، میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے"
"کیا ہوا تم سے" انہوں نے بڑی متانت سے کہا۔
"السبزگ میں ایک ابابیل کے گھونسلے کو نوچنے کے لئے میں ایک شاہبلوط کے پیڑ پر چڑھ گیا اور شاخ ٹوٹ گئی" "کیا ٹوٹ گئی؟ اے میرے اللہ!"
"جی ہاں! لیکن اللہ نے مجھے بچا لیا۔ موقع سے درخت کی نچلی شاخ میری گرفت میں آگئی اور میں بچ گیا —— لیکن اب ابابیلیں مجھ سے رہ رہ کر اپنے بچوں کے بارے میں پوچھتی ہیں، میرے گرد منڈلاتی ہیں اور مجھے سونے نہیں دیتیں"
ہمارے چچا کچھ دیر تک خاموش رہے اور میں پھوٹ پھوٹ کر خوب رویا
"چچا" میں نے پھر کہنا شروع کیا "آج شام کو میں نے سیپ اٹھا کر جو سنا تو بالکل اناپ شناپ اور الٹ پلٹ سننے میں آیا، شاید اب کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔
تب انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر بڑی سنجیدگی سے کہا
"میں تجھے معاف کرتا ہوں میرے بچے! اب چپ رہو۔ لیکن تم اسے اپنے لئے ایک سبق سمجھنا، سوچو تو اگر تم مردہ واپس لائے جاتے تو مجھے کتنا صدمہ ہوتا، غریب ننھے ننھے ابابیلوں کے ماں باپ بھی اتنا ہی غمگین نظر آتے ہیں جتنا رنج شاید ہمکو اٹھانا پڑتا۔ تم نے اس پر غور نہیں کیا۔ اب چونکہ تم نادم ہو اس لئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں"
چارپائی سے اٹھ کر انہوں نے مجھے ایک گلاس شربت دیا اور کہا جاؤ اب سو رہو۔ بیچاری ابابیلیں اب تمہیں تکلیف نہیں پہنچائیں گی۔ چونکہ تم اپنے کئے پر پشیمان ہو اس لئے خدا نے بھی تمہیں معاف کر دیا۔ اس لئے اب جاؤ چپ چاپ سو رہو۔ لیکن کل سے تمہیں بکریاں چرانی نہیں ہوگی۔ تمہاری عمر کے بچے کو تو اسکول جانا چاہیئے"
میں اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ مجھے کچھ سکون معلوم ہوا اور میں خوش خوش سو رہا
دوسرے دن چچا برنارڈ مجھے اپنے پرانے اسکول ماسٹر، ٹوبی ویریس کے پاس لے گئے سچ تو یہ ہے ابتدا میں صبح سے شام تک بلاحس وحرکت ایک کمرے میں بند رہنا مجھے جبر محسوس ہوا۔ ہاں یہ اور بھی ناگوار گذرا جب میرے دل میں کھلی ہوا میں گھومنے کا ولولہ انگڑائیاں لینے لگا۔ مگر اس دنیا میں بغیر تکلیف کے کچھ نہیں حاصل ہوتا یہ خیال آتے ہی میرا یہ کام ایک دلچسپ عادت میں تبدیل ہو گیا۔ تمام چیزوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بھی ہماری سچی اور اہم خوشیوں میں سے ہے۔

اب چچا برنارڈ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اپنا پورا وقت آرام کرسی میں بیٹھے چوٹھوں کے پاس گزارتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کی بیٹھک مکان کے سامنے پتھر پر انگوروں کے سایہ میں ہوتی ہے۔ اور میں انکی جگہ پر ڈاکٹر ہوں، پو پھٹنے سے پہلے علی الصباح گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں اور تھکن سے چور چور جب تک شام خوب بھیگ نہیں لیتی واپس نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ زندگی کٹھن ہے اور خاص کر برف باری کے ایام میں تاہم میں بہت زیادہ خوش رہتا ہوں۔

سیپ برابر اپنی جگہ پر رہتا ہے، سیر و سیاحت سے پلٹنے پر اب بھی کبھی کبھی میں سیپ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی بھنبھناہٹ میں اپنے خیالات کی جھنکار سنتا ہوں ہمیشہ اس میں خوشی نہیں ہوتی، کبھی کبھی جب مریض عالم نزع میں ہوتا ہے اور اس کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتا تو میرے خیالات کی بازگشت مدھم اور مضمحل ہو جاتی ہے۔ —— لیکن ویسا بھیانک سماں پھر آج تک نہ پیدا ہو سکا۔ جیسا کہ ابا بیلوں کے حادثہ کے بعد اس شام کو پیش آیا تھا، میرے عزیز دوستو! دنیا میں وہی خوش رہ سکتا ہے جو اپنے ضمیر کی آواز بلند ہو کر سن سکتا ہو۔ پھر امیر ہو یا غریب اس کے دنیاوی تجربات میں وہ تمام شادمانیاں ضرور آئیں گی جس سے دو چار ہونے کے لئے انسان تخلیق کیا گیا ہو۔

(ترجمہ) واسم

# پیغامِ جنوں

بہار آئی ہے۔ پھر پیمایشِ دشت و بیاباں ہو
مبارک میرے تلوو تم کو پھر خارِ مغیلاں ہو

چلو آوارہ گردانِ جنوں ، وہ دَور پھر آیا
کہ نجد و بیستوں پھر گونج اٹھیں آباد زنداں ہو

وہی صحرائے بے پایاں ، وہی ہو آبلہ پائی
وہی ستِ جنوں کا شغل ہو اور چاکِ داماں ہو

زمیں پر پاؤں ہوں اور لیلیِ مقصود آنکھوں میں
برابر ہو نظر میں ، دشت و دریا یا گلستاں ہو

پڑا ہے سرد بازار اشکِ آہ گرم کا زندو
وہ ساعت آگئی ہے پھر کہ خونِ گرم ارزاں ہو

کہاں تک تنگنائے دل میں از حق پڑا تڑپے
زمانہ آگیا ہو پھر یہ کروٹ لیلئے عُریاں ہو

انا الحق کا لگے پھر نعرہ ، پھر دشت و جبل گونجیں
وہی چوگانِ تیغ اور گوئے سر ہو ، بازیِ جاں ہو

تمہاری زندگی کیا ؟ زندگی اے خضر اس کی ہے
جسے ہر عید مقتل ، تیغِ قاتل آبِ حیواں ہو

کوئی چھیڑے سمجھ کر اس گلی کے سرفروشوں کو
مٹا دینا ہی کھیل اُس کو جسے مرنے کا ارماں ہو ؟

جلا دے۔ آشیانہ ہو قفس یا دام و دانہ ہو
تو پیدا بے سروسامانیوں میں ساز و ساماں ہو

ابھی مردہ نہیں ، خاکسترِ غفلت میں سوتی ہے
یہ چنگاری ، ہوا دے انقلاب اٹھے تو طوفاں ہو

ارے ناچیز قطرے۔ تجھ میں وہ طاقت ودیعت ہے
کہ جنبش تیری سیلاب اور سکوں تمہیدِ طوفاں ہو

جسے جز تن میسر کچھ نہ ہو سامانِ دنیا سے
بھلا برقِ بلا کی چشمکوں سے کیوں وہ لرزاں ہو

شرابِ عشق کی مستی ہے ایماں نہ مشرب کا
اگر توحید کافی ہو تو کیوں مردودِ شیطاں ہو

نہ دینداری نہ درویشی کسی کا میں نہیں قائل
کرامت ہے یہی سب سے بڑی انساں انساں ہو

سہارے سے جنوں کے [illegible] پا [illegible] مسلم
[illegible] ابھی گوارا [illegible] آسان ہو

محمد مسلم

# عبرتی مرحوم

(۲)

ابتدائی تعلیم۔ پیش نظر تصنیفات اس ذکر سے خالی ہیں کہ ان کی ابتدائی تعلیم کیونکر ہوئی اور اس موقع پر انھوں نے شرف تلمذ کس سے حاصل کیا۔ لیکن عقد پرویں کے رقعہ ۴۸ سے جو کنور ہمت سنگھ کو لکھا گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اساتذہ میں ایک بزرگ حکیم ابوالحسن صاحب تھے چنانچہ اسکی عبارت یہ ہے "حرفے دو از نامۂ مدعا می نگارد کہ روزے در خدمت استاذی حکیم ابوالحسن صاحب قبلہ رفتہ بود..." اور رقعہ ۴۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بزرگ مولوی انوری تھے۔ جنکی خدمت میں کچھ غزلیں بغرض اصلاح بھیجی تھیں چنانچہ یہ رقعہ مولوی صاحب ممدوح ہی کی خدمت میں ہے اسکی آخری سطر یہ ہے" :یکدو غزل بامید اصلاح ہمایوں حضور کلیم طبع بندگان ارسال میکند" ممکن ہے اور تصنیفوں پر بالاستیعاب نظر کرنے سے کچھ اور پتہ ملے لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ تلمذ راجہ الفتی کی دہلی سے آمد کے پہلے کا ہے کیونکہ اُن کے عظیم آباد آجانے کے بعد عبرتی سب سے مستغنی ہو گئے اور اس وقت سے لیکر آخر تک انھیں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے رہے چنانچہ ریاض الافکار کی یہ عبارت "بازاز دہلی رخت اقامت در شہر عظیم آباد انداخت (الفتی) وبشغل درس وتدریس پرداختہ۔ دریں نزدیکی من محرر اوراق ہم مشرف بشرف شاگردی آں کامل العیار شدم" اور معراج الخیال کی یہ عبارت "چوں صیت سخندانی آں کامل العیار در جہاں پیچید راقم کس میرسی نیز بحلقہ تلامذۂ آں جادو بیان در آمد" اس کی شاہد ہے۔ اور یہ دونوں عبارتیں جہاں یہ بتاتی ہیں کہ (۱) عبرتی کچھ باسواد ہونے کے بعد الفتی کے شاگرد ہوئے۔ وہاں یہ بھی بتاتی ہیں کہ (۲) الفتی کے عظیم آباد آنے سے پہلے عبرتی عظیم آباد میں موجود تھے اور (۳) بچپنے میں لاکر الفتی کے سپرد نہیں کئے گئے تھے اور (۴) نہ ان کے ابتدائی پروردہ تھے۔ ورنہ اُن کو الفتی کے صیت سخندانی در جہاں پیچید" کے انتظار کی کیا ضرورت تھی البتہ اس حضوری کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا وہ الفتی ہی جیسے باکمال سے۔

ملازمت۔ سلسلۂ تعلیم کب ختم ہوا اور ملازمت کس سنہ میں شروع کی اس کا پتہ نہیں ملتا۔ لیکن آغاز ترتیب کے متعلق ریاض الافکار میں لکھتے ہیں "چوں طفنتے مذاق آشنائے سخن سنجی شد نخست بچاکری رئیس الامراء نواب روشن الملک مبارک الدولہ محمد مہدی قلی خاں بہادر شوکت جنگ نوراللہ مرقدہ وازاں بامنشی گری فخرالامراء نواب مبارز الملک ضیاء الدولہ سید محمد حسن خاں بہادر تہور جنگ جعل اللہ الجنۃ مثواہ وازاں پس بہنا دمت تمع دوعمال انتظام الملک رائے ولی نعم باہمت دھرم جنگ راجہ بھوپ سنگھ بہادر دام دولتہ

سرعزت وافتخار برافراختہ بسر برد اوقات می نمود۔ اکنوں امیدوار بحضرت واہب العطایا چناں است کہ مقیم کوچہ معرفت خودش فرماید وبدلش ہوس تقرب اغنیا نیفزاید" اس عبارت سے اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) تعلیم کے بعد پہلی ملازمت جو کرتے ہیں۔ وہ نواب مہدی قلی خاں کے وہاں اور اسی سلسلہ میں تہور جنگ کی منشی گری بھی کی اور غالباً ان کے ہمراہ کلکتہ ڈھاکہ، اور بنارس کا سفر بھی اس سلسلہ میں ہوا (۳) اس سلسلہ کے منقطع ہونے کے بعد راجہ بھوپ سنگھ کے ندیم ہوئے (۴) جب ریاض الافکار مرتب کی ہے ۱۲۶۰ھ اس وقت بظاہر کہیں ملازم نہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ کب سے کب تک نواب مہدی محمد قلی خاں کے ملازم اور تہور جنگ کے منشی رہے اور کب سے راجہ بھوپ سنگھ کے ندیم ہوئے۔ سراج المحبت مؤلفہ ۱۲۵۳ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ عرصہ سے میری تمنا تھی کہ میر قمر الدین منت کی مثنوی ہیر رانجھا کو نثر کا جامہ پہنادوں لیکن مکروہات زمانہ نے اتنی فرصت ندی کہ اس کام کو انجام دوں بالآخر میرے دن پھرے اور مجھے بھوپ نرائن سنگھ کی ملازمت کا شرف حاصل ہوا اب اس خواب کی تعبیر کا وقت آیا۔ چنانچہ ہیر رانجھا کو نثر کا جامہ پہنایا اور اپنے ولی نعمت راجہ بھوپ نرائن کے نام پر معنون کیا" مؤلف نے راجہ کی تعریف میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے اور کتاب کے دو صفحے اس تعریف و توصیف کی نذر ہو گئے۔ اخیر میں لکھتے ہیں ... درین زمان کہ سنہ یکہزار دوصد وپنجاہ، ۵ہجری نبوت است باہزاراں خون جگر وانواع دردسر... آں لولوئے آبدار از عقد نظم بہ سلک نثر درکشید و بنام نامی آں قدرشناس سخن سنجاں حسن انجام داد و بہ سراج المحبت مسمی ساخت"، اس عبارت سے معلوم ہوا کہ راجہ بھوپ کی ملازمت ۱۲۵۳ھ میں اختیار کی لہذا اس سے پیشتر تک نواب محمد مہدی قلی خاں اور تہور جنگ کے ملازم و منشی رہے۔

نظارت اسی سلسلہ میں مسئلہ نظارت سامنے آتا ہے۔ ۱۲۵۹ھ سے پہلے جو خطوط عبرتی مرحوم نے مختلف لوگوں کی خدمت میں بھیجے تھے انہیں اپنے شاگرد حسین قلی خاں سہراب جنگ کی فرمائش سے جمع کیا اور اس کا نام "عقد پروین" رکھا۔ اس کے دو رقعے نظارت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ رقعہ ۲۸ محمد رافق صاحب صدر اعلی کے نام کا ہے جس میں لکھتے ہیں " اکنوں تازہ خبر از کاغذ گزٹ بگوش افتاد یعنی بہر ضلع پنج چار ڈپٹی مجسٹریٹ در ماہ جولائی مقرر خواہند گشت۔ دل جاہ طلب برآں آورد کہ حرفے دو از یں مقولہ بقید تحریر درآورد۔ قبلہ گاہا! اگر ایں خبر محقق است البتہ جائے آں دارد کہ از بہر پرداخت ایں نامراد بشرط امکان جہدے بکار تواں بردہ باشد کہ بمراد رسد۔ زیادہ چہ گزارش دہد غیر ازیں کہ اگر فرماید دریں ماہ کہ فارغ از ہمہ جہت است بشرف عالم بزم دریابد" دوسرا رقعہ ۵۵ شاہ بخشش حسین چشتی کے نام اس مضمون کا نظر آتا ہے" دریں عرصہ دل خوکردہ ساحی مکالمہ ناخن زن پردہ شوق گشت کہ سطرے چند

از پریشان حالی خود بنگاشته از شرح ہجوم افکار تعلقات سر رشتہ نظارت و اظہار نویسی بخیہ برلب
گلہ آمیز آں ہمدم شکایت پیشہ زند مگر قلت فرصت مہلت خامہ بناخن زدن ہم نداد چہ رسد باین اطناب
نگارہا اکنون کہ ایام تعطیل محرم پیش آمدہ کو سہ فرصتے از اشغال متعلقہ حاصل گشت۔ پہلا خط خواہش ملازمت
اور دوسرا ملازمت پر گواہ ہے اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رافق صدر اعلیٰ نے انہیں عہدہ نظارت
دلوایا تھا لیکن ان کی دوسری تصنیف "نظم ثریا" سے جو منظوم رقعوں کا مجموعہ ہے نہ تنہا یہ معلوم ہوتا ہے
کہ یہ عہدہ محمد رافق صاحب نے دلوایا تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبرتی مرحوم ان کے بھی ناظر رہے
اور یہ کہ کب سے کب تک نظارت کے عہدہ پر ممتاز رہے۔ اس مجموعہ کا رقعہ نمبر ۲۲ جو مولوی نعمت علی خاں صدر
اعلیٰ شاہجہاں پور کو لکھا گیا تھا اس کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں۔ ؎ عرض مختصر اینکہ با صد کرم + یکے سر بختے جہان محترم
سلیمان نوال آصف روزگار + سعید زمان افق ذی وقار + ازیں پیش شش سال انگشتری + چہ انگشتری مایہ سروری
نظارت ز نظارہ اش ارجمند + حکومت بپا بوسیش سربلند + بایں بے سرو پا عطا کردہ بود + بایں مردمی یک جہانش ستود
براسود یک چند جان حزیں + بہ نیرد التجائے نجا قان چیں +۔ اس کے بعد پانچ شعر عیش و آرام کے تذکرے میں
بجا رکھتے ہیں۔ ؎ کہ ناگہ شد از سال ہفتم عیاں + بریں بندہ شد چرخ نامہرباں + بصہبائے عیش نمک ریختہ
غبار تالم بسر بیختہ + یکے اہرمن سیرت عفریت کار + ازاں روئے آب آمدہ برکنار + بصد دیو بگرفت جا در کمیں
نہاں گشت چوں زہر در انگبیں + مرا خاتم جم گرفتہ ز دست + زبانم تبرزیر دلبیس بست" اس رقعہ سے صاف معلوم
ہوگیا کہ (۱) نظارت مولوی محمد رافق کی بدولت ملی (۲) چھ برس نظارت کی اور (۳) ساتویں سال ایک خبیث
خطرت کے سبب علیحدہ ہونا پڑا۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے جام جہاں نما کی جو عبارت لکھی ہے کہ دریں خجستہ زمان
کہ سنہ یکہزار و دو صد و شصت و شش ہجری نبوی باشند و راقم اوراق بہ ترک گفتن خدمت نظارت رسائی
عدالت یکینہ توزی مرحوم انشا کہ تیرہ رائے خدا ناترس ثلاث نمائے راسخ تنکر لعل صدر اعلیٰ کے پنجہ وست
برگزاشتہ۔ اس میں ترک ملازمت کا سنہ ۱۲۶۶ مذکور ہے۔ جسے رقعہ منظوم میں سال ہفتم بتایا گیا ہے۔
اس حساب سے تقرر بعہدہ نظارت ۱۲۵۹ھ میں ہوا۔ اور عبرتی مرحوم چھ برس تک اس عہدہ پر بحال رہے۔
اسکول کی ملازمت: حضرت شاد مرحوم نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ اس اسکول میں جو بعد غدر
پہلے کوچہ صدر اور کھر دو لال کے کٹہرہ میں قائم کیا گیا تھا پھر تین ہسپتال کی پشت پر پہنچایا گیا پھر وہاں سے
شیش محل اور بالآخر بانی پور میں ہائی اسکول کے نام سے لایا گیا عبرتی مرحوم فارسی کے مدرس مقرر کئے گئے"
۱۸۵۵ء اور ۱۲۷۲ھ مطابق ہیں۔ اس لئے ۱۲۶۶ھ سے جو نظارت سے مستعفی ہونے کا سال ہے سات برس
بعد اسکول کی ملازمت سامنے آتی ہے۔ لیکن منظوم رقعوں کے مجموعہ نظم ثریا کو جسمیں ایام جوانی کے رقعے جمع
کئے ہیں جیسا کہ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ ؎ کہ در عہد جوانی نامہ چند + برقم کردم بکلک نکتہ پیوند۔ انھوں نے ۱۲۶۲ھ

میں مرتب کیا ہے لکھتے ہیں سہ "درین سال لطیفے دور ز آسیب + کہ باشد در عدد باغ ارم زیب" "باغ ارم زیب" کا ۱۲۶۳ ہے۔ اس مجموعہ میں ایک رقعہ ۲۲ منشی امیر علی صاحب مؤلف امیر نامہ کے نام نظر آتا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں سہ گزین پیش چندے در اسکول شہر + مرا برگزیدند صحاب بہر + کہ باشد مدرس مرا نیک ریخ در اسکول این شہر بے درد و رنج + ولے صدر اعلائے ناظم بنام + بمن ساختہ کینہ توزی تمام + بحرفے را کہ دم راہمی تو بدم نبودے از خوا اندنش ہیچ غم + بجایم مدرس نمودش بزور + کہ او بیلتن بود و من بندہ مور + اس کے بعد اس مدرس کی نالائقی اور پھر افسر اعلیٰ کی جانب سے اس کی برطرفی اور اپنی بحالی کا ذکر کیا ہے سہ چنانچہ بہ نیر وے بخت بلند + رسیدم بر آں منصب ارجمند" اس حوالہ سے یہ ملازمت نظارت سے کئی سال پیشتر کی قرار پاتی ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

اسی کے ذیل میں ایک بات عرض کردوں۔ عبرتی مرحوم اس رقعہ میں منشی امیر علی صاحب سے اپنی اسکول کی تنخواہ کے اضافہ میں مدد چاہتے ہیں سہ چو اینگونہ شد واژگوں حال من + نوشتم بآں دوست چندے سخن + چو پاس وطن ہست عہد سما شود تا چہل شصت لے باوفا + چو در دہر یوسف نمود ت خدا + بکنعانیاں چشم باید ترا + بیا آرزو دیم بپاس وطن کہ ہستیم ما و تو از یک چمن + تو گشتی گل ارغواں بندہ خوار + مرا نیز گرداں گل نوبہار + ان شعروں سے صاف ظاہر ہے کہ عبرتی مرحوم اور منشی امیر علی ہموطن تھے۔ اور امیر نامہ گواہ ہے کہ منشی صاحب باڑھ کے رہنے والے تھے۔ لہٰذا عبرتی کا وطن بھی باڑھ ہی قرار پاسکتا ہے جیسا کہ حضرت شاد مرحوم نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ ان کا مولد بھی قصبہ باڑھ یا معصوم گنج ہو۔ اس لئے جمع کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ والدین عبرتی کے عظیم آباد میں آبسے ہوں۔ ورنہ عبرتی کو یہ یاد رہنا کہ وطن باڑھ ہے اور ولادت گاہ کو بھول جانا بعید از قیاس ہے واللہ اعلم بالصواب۔

یہ امر بھی فروگزاشت کرنے کے قابل نہیں ہے کہ عبرتی مرحوم زمانہ نظارت میں بھی راجہ بھوپ سنگھ کے عطایا سے محروم نہ رہے بلکہ اپنے ضروریات راجہ صاحب کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ چنانچہ نظم ثریا کے رقعہ ۲۵ و ۲۶ شاہد ہیں۔ سابق الذکر کے متعلق لکھتے ہیں "این عریضہ بکلم کردن دہ روپیہ مشاہرہ راقم بسبب پا بند شدن بخدمت نظارت عدالت و [illegible] حضور خداوند نعمت راجہ بھوپ سنگھ بہادر" اور رقعہ ۲۶ میں [illegible] تنگی کا ذکر کرکے اُسے کشادہ بنوانے میں راجہ سے طالب مدد ہیں۔ اسی طرح اگرچہ سہراب جنگ کی تعلیم اور [illegible] اور تہور جنگ کی منشی گری سے [illegible] میں علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کلکتہ اور ڈھاکہ سے [illegible] آجانے کے بعد پھر اُدھر کا رُخ نہیں کرتے۔ بلکہ [illegible] بھوپ سنگھ کی ملازمت اختیار کرتے اور ۱۲۵۹ھ میں عہدہ نظارت پر ممتاز ہوتے ہیں پھر بھی ان لوگوں سے تعلقات منقطع نہیں کرتے چنانچہ، عہدہ نظارت ہی کے سال سہراب جنگ کی فرمائش سے "عقد پروین" کی تالیف کرتے۔

تصانیف [illegible] سے اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ عبرتی مرحوم کے تصانیف کی تعداد ۲۲ ہے جنہیں سے

۲۰ کتابیں خود میرے پاس موجود ہیں۔

(۱) اعجاز المحبت مؤلفہ ۱۲۴۷ھ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ میں موجود ہے۔ یہ عبرتی کی پہلی تصنیف ہے۔ فیضی کی نلدمن کا فارسی نثر میں خلاصہ ہے میر فرزند علی کے۔ اصرار پر یہ خلاصہ معرض کتابت میں آیا" (۱) میرے پاس جو نسخہ اعجاز المحبت ہے وہ یوسف زلیخائے فارسی کی نثر ہے نہ کہ فیضی کی نلدمن کا فارسی نثر میں خلاصہ (۲) میر فرزند علی کے اصرار سے نہیں بلکہ خود خیال پیدا ہوا کہ جادو آمیز نسخہ یوسف زلیخائے جامی راکہ فسانہ ایست بس ہوشربا و حکایتے است خیلے شورش افزا از نظم بہ پیرایۂ نثر دل آویز در آمدم" (۳) اسے کنور سکھراج بہادر کی خدمت میں پیش کرنا تھا یعنی پیشکش عالی دودمان خجستہ اختر کنور سکھراج بہادر دام اقبالہ سازم" (۴) اس کا دیباچہ اور اس کا خاتمہ دونوں بعینہٖ مثنوی نیرنگ تقدیر کے دیباچہ میں مندرج ہیں جو ۱۲۹۰ء میں چھپی ہے اور اس کا ذکر عبرتی کی سیادت کی بحث میں آچکا ہے (۵) قلمی نسخہ جو میرے پاس ہے اور مثنوی نیرنگ دونوں کی عبارت میں اس کا سنہ تالیف ۱۲۵۳ھ ہے (۶) اعجاز المحبت کی یہ عبارت جو پروفیسر صاحب نے دیباچہ سے نقل کی ہے "یکے از کہن نزاشہ چیناں صحبت پر منفعت افصح الفصحا... جناب النقی شاہجہاں آبادی" اور یہ عبارت "ہزار ہزار شکر کہ بیامن تعلیم سخن سنج عالی مقدار و سرآمد شعرائے روزگار... ہم آغوش" جو خاتمہ سے لی ہے اس کا ایک لفظ بھی میری قلمی نسخہ اور مثنوی نیرنگ تقدیر میں نہیں ہے (۷) ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے نسخہ اعجاز المحبت کی تائید میں ایک بات نکلتی ہے۔ وہ یہ کہ معراج العشاق کے دیباچہ میں مرقوم ہے کہ اعجاز المحبت کی تصنیف کے بعد کلکتہ جانا ہوا، اور وہاں سے واپس آنے پر معراج العشاق کی تالیف عمل میں آئی۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ معراج العشاق بعد کی تصنیف ہے، جس کا سنہ تالیف ۱۲۵۱ ہے۔ یہ یقینی ہے کہ عبرتی نے نلدمن کا خلاصہ کیا ہے اور وہ پہلی تصنیف ہے، جس کا نام کچھ اور ہے غلطی سے اس پر اعجاز المحبت لکھ گیا اور اسی نام کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ میں موجود ہے۔ اور نام کی ترکیب بھی کچھ نلدمن سے مرتبط نہیں ہے کیونکہ نل اور دمن دونوں میں سے کسی کو "اعجاز" سے لگاؤ نہیں ہے برخلاف یوسف زلیخائے جامی کے کہ یوسف پیغمبر تھے اور "اعجاز" پیغمبری کا جزو لاینفک ہے۔ یا مصنف نے دونوں کا نام اعجاز المحبت رکھدیا ہے جیساکہ نسخہ معراج العشاق کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) حدیقۃ الاضافہ ۱۲۵۰ھ اس میں اضافت کے فارسی قواعد وحشی مرحوم کی تصنیف "بساتین القوانین" اور دیگر کتب سے جمع کرکے لکھے گئے ہیں۔

(۳) معراج العشاق ۱۲۵۱ھ لیلے مجنوں ہاتفی کی نثر ہے اور میر الطاف حسین کی فرمایش پر لکھی گئی۔

(۴) سراج المحبت ۱۲۵۲ھ میر قمر الدین منت کی مثنوی ہیر رانجھا کی نثر ہے۔ میرے پاس نہیں ہے۔

(۵) مدینۃ الحکایات ۱۲۵۴ھ میں ابواب الجنان۔ حیات القلوب اخلاق ناصری، اخلاق محسنی، اور اخلاق جلالی وغیرہ سے نصیحت آمیز حکایتیں جمع کردی ہیں۔

(۶) معراج الخیال ۱۲۵۵ھ تذکرہ شعرا (۷) ریاض الافعال ۱۲۵۸ھ اپنے شاگرد سید امیر جان ذرقتی کی فرمائش پر لکھی۔ (۸) عقد پرویں ۱۲۵۹ھ وہ رقعات نثر جو سنہ مذکورہ کے پہلے مختلف حضرات کی خدمت میں لکھے گئے تھے بفرمائش حسین قلی خاں سہراب جنگ اس سنہ میں جمع کئے گئے (۹) ریاض الحروف ۱۲۶۲ھ اپنے شاگرد مہدی حسین خاں کے لئے بفرمائش میر الطاف حسین خاں لکھی۔ (۱۰) نظم ثریا ۱۲۶۳ھ اس میں وہ منظوم خطوط ہیں جو ایّام جوانی میں لکھے گئے تھے۔ بفرمائش مہدی قلی خاں سنہ مذکور میں جمع کئے گئے۔

(۱۱) محیط الکلام ۱۲۶۶ھ اپنے شاگرد کنور مہپت سنگھ کے لئے لکھی (۱۲) زبدۃ الانشا ۱۲۶۶ھ یہ بھی کنور کے لئے لکھی (۱۳) جام جہاں نما ۱۲۶۶ھ نواب ولایت علی خاں کی ہمدمی وہم بزمی کے زمانہ میں لکھی (۱۴) مصباح المرکبات ۱۲۶۶ھ اپنے شاگرد کنور سکھراج بہادر کی فرمایش پر لکھی (۱۵) ریاض الافکار ۱۲۶۸ھ تذکرہ نثر (۱۶) حملہ اسکندریہ ۱۲۸۰ھ سکندر نامہ نظامی گنجوی کی نثر (۱۷) توشۂ آخرت ۱۲۸۰ھ راجہ مہپت سنگھ کے لئے لکھی۔ اس میں ۴۴ رقعے ہیں ایک سے نو تک حمد خدا و نعت رسول و منقبت آل و مدح مجتہد وقت سے متعلق ہیں دسواں رقعہ ترتیب کتاب سے وابستہ ہے باقی "ہمہ اندر و پند" ہے ہر پند کے آخر میں ایک ایک شعر مختلف شعرا کا نقل کردیا ہے۔ ان میں سے بعض میں اپنی پیری کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (۱۸) مصباح الاخلاق ۱۲۸۰ھ اس میں مذہبی اخلاقیات کے رقعے ہیں۔ جنکی تعداد ۷۰ ہے۔ ہر رقعہ کے آخر میں ایک حدیث بزبان عربی پھر اس کا ترجمہ بھی درج ہے۔ اس کا سنہ تالیف منضبط کرتے ہیں میرے نزدیک غلطی واقع ہوئی ہے اس مجموعہ کے رقعات پر بسیط نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سال تالیف وہ نہیں ہے جو درین وان کہ آغاز سال عمر است" سے سمجھا جاتا ہے، اگر عبرتی مرحوم کا سنہ ولادت ۱۲۱۸ھ اور سال وفات ۱۲۸۲ھ مانا جائے جیسا کہ میں سابق میں لکھ چکا ہوں تو ۱۲۵۰ھ میں ان کی عمر ۳۲ برس کی قرار پاتی ہے اور یہ خطوط اس سن کے پیشتر کے ہیں جیسا کہ دیباچہ میں لکھتے ہیں" ایں ابجد خوان دبستان ہیچدانی را در زمان تحصیل علوم خدمت یارانے کہ از کوچۂ پرخم و پیچ حسن اخلاق محض نابلد بودند اتفاق نوشتن رقعات چند در محاورہ روزمرہ بر سبیل انداز و پند دست دادہ از حرمان نصیبی ایام جمعیت اصلاً شیرازہ ترتیب نصیب آں نمی گشت" بلکہ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ زمان تحصیل علم میں لکھے گئے تھے۔ لہذا کم سے کم اس وقت کے رقعے ہیں جب عبرتی ۲۰ برس اور ۳۰ برس کے اندر رہے ہوں گے۔ اب ذرا بعض رقعوں کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔ رقعہ نمبر ۴۹ از سادہ دل بندہ زبان بحرف غیبت نیالودہ عبرتی واضح خاطر غیبت آشنایش باد... با مرزا حاجی محسن در خوردم بچشم تمام بمن مستمند گفت کہ میر مہدی برادرزادہ ات

اینچہ شیوہ آموختہ کہ بہر انجمنے و مجلسے کہ میرو و غلیب بندہ میکند... لیکن جائے صد حیف است کہ دریں پیرانہ سری باعث لیشخند عم پیری می شود" دوسرا رقعہ ۳۲؎ بہ محبت مخلصاں کہ اگر حساب روز من در زن پرورد عجز و نیاز کمتر از چہل سال خدمت پدر بزرگوار آں خیر اندیش نماندہ باشم"۔ اگر اس کتاب کا سال تالیف ۱۲۵۰ھ ہو جس وقت عبرتی ۳۲ برس کے تھے تو ان خطوط کے اس سنہ سے پہلے لکھے جانے پر بیس اور تیس کے مابین عبرتی کا عم بن جانا عجیب اور ۳۰ برس کے سن میں ۴۰ برس تک کسی بزرگ کی خدمت میں بسر کرنا عجیب تر ہے۔ راقم کی نظر تحقیق میں وہ کلمہ غمز نہیں ہے جس سے ۱۲۵۰ نکلتا ہے بلکہ غفر جس کے اعداد ۱۲۸۰ ہیں جو (۱) عبرتی کے سال وفات ۱۲۸۸ سے ۸ برس پہلے کا سن ہے۔ اور (۲) سفر کا بہترین قافیہ ہے پوری عبارت ملاحظہ ہو" دریں آوان کہ آغاز سال غفر است و راقم ہم از وطن آمادہ سفر" یہ اشکال کہ پھر اس وقت میں جو خطوط جمع کیے گئے ان میں سے بعض میں بڑھاپے کا ذکر ہے اور دیباچہ میں زمان تحصیل علوم کے خطوط بیان کئے ہیں یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہو سکتی ہیں تو اس کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ زمانہ تحصیل کے خطوط جمع کرنے کے بعد بعض وہ خطوط بھی ملا دیئے گئے ہوں جو زمان پیری میں لکھے گئے، یا زمان تحصیل علوم سے مراد مطالعہ کتب اور تحصیل معلومات فنون مختلفہ ہو نہ اصطلاحی طالب العلمی جس میں شاگرد استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے۔ اور عجب نہیں کہ لفظ "علوم" اسی غرض سے اس عبارت میں وارد کیا گیا ہو۔ اس توجیہہ کے بعد تمام اشکال دور ہو جاتے ہیں۔ اور ہر بات کی چول بیٹھ جاتی ہے۔

مجھے عبرتی مرحوم کے متعلق جو کچھ لکھنا مقصود تھا لکھ چکا۔ اب اگر پھر کوئی اصرار سامنے آئے گا تو ہمت کی جائے گی، یہ ایک خاکہ ہے جسے سوانح عمری کی بنیاد قرار دیکر "حیات عبرتی" کے نام کتاب لکھی جا سکتی ہے جسمیں ان مرحوم کی دستگاہ علم۔ پایہ انشا دازی۔ خصوصیات انشا، عربی و فارسی کی استعداد کی حد۔ دوسرے معاصر انشا پردازوں میں ان کا مرتبہ۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ، معاصرین، کلکتہ اور ڈھاکہ کا سفر اور وہاں کے علمی و شعری معرکے۔ ان کے احباب۔ ان سرخیوں پر خامہ فرسائی کرنا ضروری ہے۔ اور ان کی موجودہ تصنیفیں میں جنکی فہرست دیکھ چکا ہوں ان باتوں کا مواد جمع ہے۔ ان کا دور شباب اور دور پیری۔ جوانی میں رنگیلاپن اور بڑھاپے میں تقدس۔ لیکن ہر دور میں قاعدہ و اصول مذہب کی پابندی اور سب سے بڑھکر اپنے حالات زندگی کے بیان میں صاف گوئی ان باتوں کو منصۂ شہود پر لانے اور ان سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔

محمد مصطفیٰ

# مطبوعات جدیدہ

میری کہانی میری زبانی: مصنفہ مسٹر سید ہمایوں مرزا مرحوم صفحات ۲۴۰ +
شایع کردہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا، حیدرآباد دکن، قیمت نامعلوم۔ اس کتاب میں سید ہمایوں مرزا مرحوم نے جو صوبۂ بہار کے متوطن تھے، لیکن حیدرآباد میں جا کر بس گئے تھے، اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ اجتماعی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے (محرم، ہولی، چیت وغیرہ کا بیان) اور گو نفسِ موضوع سے چنداں سروکار نہ رکھتا ہو، دل چسپی سے خالی نہیں۔ کچھ حصہ سفرناموں یا ایسی کتابوں کے لئے زیادہ موزوں ہے جو سیاحوں کی رہ نمائی کے لئے لکھی جاتی ہیں (جیسے مثلاً پر صلاح الدین کا ذکر) مصنف نے اپنے متعلق جو کچھ ہے اس میں یہ عیب ہے کہ کہیں ضرورت سے زیادہ تفصیل ہے اور کہیں نامناسب اجمال تاہم واقعات کے انتخاب اور مصنف کے لب و لہجہ سے اس کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کے نزدیک کن اوصاف کو اہمیت حاصل ہے، اور کون غیر اہم ہیں۔ اقتباساتِ ذیل ملاحظہ طلب ہیں:

(۱) "والدہ مرحومہ کو۔ مذکر و مونث، وحدت و جمعیت کا خیال کا ہمیشہ ملحوظ رہتا... جہاں کوئی لفظ میری زبان سے غلط نکلا تو مجھ کو بتلاتیں... مجھے خوب یاد ہے چھوکریوں کو بھی ٹوکتی رہتیں۔ دو چھوکریوں کو موسیقی کی تعلیم دی گئی تھی، ایک سارنگیا اور ایک طبلیا مستقل طور سے ملازم تھا۔ ایک گارڈ آٹھ سپاہیوں اور ایک حوالدار کا نظامت کی جانب سے متعین تھا... روزانہ صبح کے دس بجے ... منشی صاحب پس پردہ حاضر ہوکر۔ حساب کی فرد پیش کرتے.. ماما مرادن عرض کرتی "منشی صاحب حاضر ہیں" اس وقت... دوسرے کمرے میں جاتیں.. ماما مرادن کہتی "حضور تشریف لائیں" اس وقت منشی صاحب سات تسلیمیں بجالاتے۔ ماما مرادن کہتی "منشی صاحب آداب بجالاتے ہیں" والدہ فرماتیں "دعا کہو".. مرادن فرد ان کے پیش کرتی ... دستخط کرکے واپس کر دیتیں... منشی صاحب پھر سات تسلیمیں بجا لاکر رخصت ہوتے.. ساتویں سال میری بسم اللہ خوانی ہوئی.. زنانے اور مردانے میں پندرہ بیس روز بیشتر سے توشے تقسیم کئے جا رہے تھے ... دوات قلم اور تختی چاندی کی بنوائی گئی تھی.. قاری صاحب... نے یہ رسم ادا کروائی... نقرئی چیزیں انھیں کی نذر کی گئیں اور ایک کشتی میں شال چادر اور کچھ روپے بھی دیے گئے۔ بار بار ایک بار کیا سونے چاندی کے پھول بنوائے گئے تھے جو مجھ پر نچھاور کئے گئے، اس دن میری والدہ مرحومہ مارے خوشی کے پھولوں نہیں سماتی تھیں.. میری ایک سال گرہ والدہ مرحومہ نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی" ص ۱۸-۲۱

مصنف نے اپنے والدین (شاہ الفت حسین فریاد اور عفت آرا بیگم) کے طرز بود و ماند اور

نظام اوقات کا جو حال لکھا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے محض چند ٹکڑے نقل کر دیے ہیں
مصنف کے بیانات چشم دید ہیں، سماعی نہیں، لیکن، عفت آرا بیگم کی وفات کے وقت، جیسا کہ آگے
چل کر ثابت ہوگا، مصنف کی عمر دو اور تین سال کے درمیان تھی۔ مصنف کی تاریخ ولادت ۳ رجب
۱۲۸۶ھ، مطابق دسمبر ۱۸۶۷ء ہے صـ۱۳؎، اور عفت آرا بیگم کا سالِ وفات بہ روایت شاد (حیات فریاد)
۱۲۸۷ھ ہے۔ اپنی تاریخ ولادت کے متعلق کوئی وجہ نہیں کہ مصنف کا بیان غلط قرار دیا جائے خصوصاً
اس صورت میں کہ لندن سے واپسی کے بعد تک اُن کے پاس وہ زایچہ موجود تھا جو ان کے والد کے مخصوص
دوست، مہاراجا ہیپت سنگھ کے جوتشی نے ان کی ولادت کے وقت بنایا تھا۔ عفت آرا بیگم کے سالِ
وفات کے متعلق خود مصنف کا اس کے سوا کہ وفات کے وقت مصنف کی عمر دس کے قریب تھی، کوئی
بیان موجود نہیں، لیکن، ان کے اس بیان سے کہ فریاد عفت آرا بیگم کی وفات کے بعد پٹنہ آئے اور
یہاں سات سال مقیم رہ کر مرے، شاد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ فریاد کا سالِ انتقال ۱۲۹۸ھ
ہے۔ مزید یہ کہ حیات فریاد گو شاد کے نام سے شایع ہوئی ہے، لیکن، اس کی تصنیف میں خود مصنف
بھی ایک حد تک شریک تھے۔ کتاب ان کی فرمائش سے لکھی گئی، مواد کی فراہمی میں انھوں نے مدد کی
اشاعت سے پیشتر کتاب کی نظر ثانی کی، اور شاد کی وفات کے بعد کتاب کو خود چھپوایا۔ عفت آرا بیگم کا
سال وفات جو شاد نے لکھا ہے کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا۔ جو باتیں کہ مصنف نے بیان کی ہیں، دو تین
سال کا بچہ ان کا شاہد عینی ہو سکتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ ناظرین کر سکتے ہیں۔

(۲) شہزادہ غلام محمد کے فرزند.. حلیم.. نے اثنا عشری مذہب اختیار کیا تھا'.. شہزادے کو دیکھ کر برا
معلوم ہوا یہ.. لکھ پتی تھے .. پرنس غلام محمدؒ اس قدر علیل ہو گئے کہ زیست سے مایوسی ہو گئی، تو انھوں
نے ایک وصیت نامہ اپنے انگریز سولیسٹر سے لکھوایا.. اس کے مضمون کو مخفی رکھا.. اپنی کل جایداد،
لاکھوں کی ملکیت اپنے داماد گورے صاحب کے نام پر لکھ دی' اور اپنے فرزند کو.. صرف پانچ سو
روپیہ نقد دیا جانا لکھا... اس .. پر انگریز سولیسٹر... کے دست خط تھے، اور مرقوم الحاشیہ میں (تین)، بے
باوقار اشخاص کی دست خطیں (کذا) اور گواہیاں تھیں.. امیر علی خاں' قاضی القضات'.. تیسرے
میرے والد مرحوم تھے۔ یہ دست آویز.. ایک صندوقچی میں سر بہ مہر کر کے رکھی گئی، اور وہ..
ایک بڑے... فولادی بکس میں مقفل کی گئی، اور اس پر اپنے ناموں کی چٹھیاں چاروں اشخاص نے..
چسپاں کر دیں' اور یہ... بکس بڑی احتیاط سے... ڈپٹی گورنر بنگالہ کے پاس رکھوا یا گیا' مع اس ہدایت
کے ساتھ کہ جس وقت شہزادے.. کے انتقال کی خبر تحقیق ہو، اور سولیسٹر طلب کرے تو یہ بکس
بھیج دیا جائے۔ نہیں معلوم اس وصیت نامے کے مضمون کی اطلاع.. حلیم کو کیوں کر ملی۔

بہ ہر حال جب کہ شہزادے کی علالت نے طوالت کھینچی، تو .... حلیم اپنے امام باڑے میں معتکف ہوئے.. اور کوئی دعا وغیرہ پڑھتے رہتے، تا ایں دم کہ شہزادے ... کا انتقال ہوا. سولیسٹر نے کسی معتبر شخص کو.. بھیج کر وہ فولادی بکس لیا.. اور ... چپکے سے گورے صاحب کو سولیسٹر نے مبارک باد دی... لوگ انھیں کو پُرسے دے رہے تھے'.. بیٹے کا اس وقت کہیں پتا نہ تھا.. فولادی بکس... گاڑی میں آیا، اور اس کے ساتھ.. دو فوجی سوار بھی تھے ... والد فرماتے تھے. ہم لوگوں نے اچھی طرح دیکھا کہ.. چیٹھیاں .. اسی حالت میں ہیں جس طرح وہ لگائی گئی تھیں، کنجی سولسیٹر کے پاس تھی، اس نے وہ بکس کھول کر صندوقچی کھولی.. وصیت نامے کا مضمون بہ آواز بلند پڑھنے لگا... ہم لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ گورے صاحب کے نام کی جگہ.. حلیم کا نام دیکھا... سولیسٹر کہتا تھا کہ میں اندھا تو نہیں ہوگیا ہوں، یا میرے دماغ میں کوئی خلل آگیا ہے کہ عبارت اچھی طرح پڑھی نہیں جاتی... دوسرے دو انگریزی دانوں ..نے بھی وہی پڑھا... .. ہر شخص سراپا حیرت تھا'... والد مرحوم فرماتے تھے کہ بے ساختہ میری زبان سے یہہ شعر نکل گیا... صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے..." چاہیں تو انقلاب مقدر کریں علی" ص۲۵'

فقہہ حنفی کے بہ موجب (اس سے قطع نظر کہ وصیت نامہ مرض الموت میں لکھا گیا) گورے صاحب کو ایک ثلث سے زیادہ جایداد وصیت نامے کی رو سے نہیں دی جاسکتی تھی، اگر شہزادہ غلام محمدؐ نے ایسا وصیت نامہ لکھوایا بھی تھا، تو اس پر عمل درآمد (جہاں تک ۲ ثلث ہے) قانونی وارثوں کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ حلیم کا عندیہ معلوم کرنے سے پیشتر ایک سولیسٹر جیسے قانون سے واقفیت ہونی چاہیے گورے صاحب کو مبارکباد کیوں کر دے سکتا تھا؟۔ مضمون کے بدل جانے پر حیرت تو خیر لازمی تھی، لیکن، اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ یہہ حکایت ایک قانون داں نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔

(۳) " اس وقت کلکتہ میں بڑے بڑے دولت مند، معزز، مسلمان معزز تجار، اعلیٰ عہدہ دار، زمین دار، باکمال شعرا، علما وغیرہ کی کثرت تھی، اس حالت میں یہہ امر دیکھنے کے لائق ہے کہ نواب بہادر نواب عبداللطیف خاں سی۔ آئی۔ ای... اپنی سوانح عمری میں ۔ جہاں والد کا ذکر خیر ہے لکھتے ہیں:

*Syed Shah Ulfat Husain, the wellknown author and scholar was the most learned and most influential member of the muslim Community "*

جس کا اردو ترجمہ یہہ ہے کہ سید شاہ الفت حسین، مشہور عالم و مصنف جو کلکتہ کے سب سے بڑھ کر عالم و فاضل اور سب سے بڑھ کر بااثر کلکتہ کے مسلمانوں میں تھے ۔ الخ یہ معمولی الفاظ نہیں ہیں اور پھر نواب بہادر کے

قلم سے نکلے ہوئے"

حقیقت یہ ہے کہ ندر سے چند سال قبل نواب عبداللطیف نے ایک انعام اس طالب العلم کے لئے مقرر کیا تھا جو فارسی میں انگریزی تعلیم کے فوائد پر مقالہ لکھے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ انعام کا مستحق کس کا مقالہ ہے انھوں نے چار آدمیوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ اس کے ایک رکن فریاد بھی تھے۔ فریاد کے متعلق صرف اسی قدر ہے": لے ول نون اسکولر اینڈ آتھر" باقی عبارت جس کا تعلق کمیٹی کے کل ارکان سے ہے یہ ہے:

*"A committee of four of the most influential and learned member of the mohammadan community."*

نواب بہادر اور مصنف کے بیانات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

(۴) شہزادہ جہاں قدر نے ایک دعوت میں جس میں عمائد کلکتہ شریک تھے، مصنف کو اپنی داہنی طرف بٹھایا اور فرمایا کہ حضرات، سید ہمایوں مرزا صاحب کا جو میں اس قدر احترام کرتا ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے ہیں۔ کلکتہ میں چند مسلمان بیرسٹر اس وقت موجود ہیں، مگر ان کی حالت اور خصوصیت اور ہی کچھ ہے، یہ اسی خاندان کے رکن رکین ہیں، جن کے اجداد کو سلاطین مغلیہ نذریں دیتی تھیں اور پاؤں کے موزے اتارے تھے" ص مصنف کے خاندان کے وہ کون سے بزرگ ہیں جنھیں سلاطین مغلیہ نے نذریں دیں، اور جن کے پاؤں کے موزے اتارے؟ تاریخ وسیر کی کتابیں ان کے نام سے ناآشنا ہیں۔

(۵) مصنف نے اپنے والد کے نانا پرنانا میر شیخ علی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صوبۂ بہار میں ... ایک عرصہ تک ناظم رہے" اس بیان کو صحت سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ صوبۂ بہار کے کل ناظموں کے نام اوراق تاریخ محفوظ ہیں۔

(۶) ۱۸۹۳ء میں لارڈ اور لیڈی جیمل جن کے ہاں میں اکثر جایا کرتا تھا، اپنے دیہاتی مکان میں، کرسمس منانے کے لئے مدعو کیا تھا، میں نے جواباً شکریہ ادا کر کے یہ لکھا کہ میں دو دن سے زیادہ نہیں رہ سکوں گا... جب میں پہنچا، تو مجھ کو لارڈ جیمل نے اپنے مہمانوں سے ملایا.. لارڈ اور لیڈی ڈملنڈ، مسٹر میکل اور لیڈی گرنفیلڈ... سب مہمان ڈرائنگ روم میں جب آکر بیٹھ چکے تو کوک ٹیل.. شراب کا دور چلا" ص۱۴۴ و ۱۴۵ جہاں تک مجھ کو علم ہے ۱۸۹۳ء میں کوک ٹیل کا انگلستان میں رواج نہ تھا۔

(۷) "چوں کہ میں پہلا شخص خاص پٹنہ شہر کا باشندہ اور ایک قدیم و معزز خاندان کا رکن تھا، اس لئے پٹنہ والوں نے پرجوش.. خیر مقدم کیا.. ایک صاحب نے تقریر کرتے وقت.. کہا تھا کہ.. خاص پٹنہ.. میں ہمایوں مرزا جو

پٹنہ میں ضرور پیدا ہوئے لیکن ان کا خاندان پٹنہ کا نہ تھا۔ فریاد کی ددھیال اور ننھیال دونوں ضلع گیا میں تھی اور وہ خود بہ قول شاد اپنی ددھیال میں پیدا ہوئے۔ آغاز شباب میں پٹنہ آئے، تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری مدرسے میں فارسی کے معلم ہوگئے اس کے بعد وہ بنگال چلے گئے، اور وہاں مدتوں رہے وفات سے ۷ برس قبل جو پٹنہ واپس آئے تو بہ قول شاد (نوائے وطن) یہ حال تھا کہ بسر اوقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ فریاد کی شرافت خاندانی میں شبہہ نہیں لیکن، یہ دعویٰ کہ ان کے خاندان کی نظیر بہار میں نہ نکلے گی، بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر ہماے مرزا مرحوم عظیم آبادی شمار بھی کر لیے جائیں جب بھی، مسٹر نور الہدیٰ مرحوم خاص پٹنہ کے رہنے والے، اور ایک معزز خاندان کے رکن ان سے بیشتر تعلیم پاکر ولایت سے واپس آچکے تھے۔ مسٹر شرف الدین احمد اور سر علی امام کا ہم نے ذکر نہیں کیا اس لئے کہ وہ اطراف پٹنہ کے رہنے والے تھے۔

(۸) ”اس افواہ کا کہ میں خدا بخش خاں مرحوم کا داماد ہوں، ملک پر بڑا اثر ہوا۔ ایک ... میں یہ خبر درج کی گئی تھی کہ نئے میر مجلس صاحب کے داماد ایک بیرسٹر بھی حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ گو بعد کو اس کی تردید کی گئی، مگر تو وہ بہت سے لوگوں کی نظروں سے نہیں گزری ہو۔ اور پہلی دفعہ جو لکھا گیا، اس کو لوگوں نے مان لیا ہوگا“ ص ۲۶۸

(۹) غرض شبلی صاحب (مسٹر ظفر علی خاں .. وغیرہ ہماری انجمن (انجمن افتخار دکن) کے ماہانہ جلسوں میں ضرور شریک ہوتے تھے، مگر جلسے میری صدارت سے ہوتے تھے۔ دو دفعہ ایسا بھی ہوا کہ قبل آغاز جلسہ مسٹر ظفر علی خاں نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں تحریک کرتا ہوں کہ آج کے جلسے کی صدارت مولوی شبلی فرمائیں ... ظفر علی خاں نے اُن سے پڑھا تھا تو حق شاگردی ادا کیا، مگر شبلی صاحب نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں حقاً کہتا ہوں (میرا نام لے کر) کہ ان کی موجودگی میں میں اپنے تئیں اس کا اہل و مستحق نہیں سمجھتا ہوں“ کہہ کر بیٹھ گئے اور صدارت قبول نہیں کی۔ شبلی صاحب نے اس زمانے میں ... اس غرض سے کئی جلسے کیے کہ انجمن ترقی اُردو قائم کی جائے ... اور ہر بار انھوں نے مجھے صدر بنایا .. نہیں معلوم انجمن پھر قائم کیوں کر ہوئی اور مولوی عبدالحق کے تحت کیوں کر آگئی“ ص ۳۰۲، ۳۰۳

(۱۰) ”لڑکی کی ماں (عیب دار تھیں) نے صاف انکار کیا۔ لڑکی کے باپ نے یہاں تک کہا کہ میری لڑکی ہمایوں مرزا سے شادی کر لیں تو بعد کو میں خود ایک .. صورت دار سیدانی بیاہ لاؤں گا، تاکہ ان کی نسل خراب نہ ہو ان کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اور وہی دو لڑکیاں وارث تھیں“ ص ۲۲۱

(۱۱) ”سچ پوچھو تو تمھیں کون بیٹی نہیں دے گا؟ تمھاری عالی خاندانی، تمھاری صورت شکل، تمھاری لیاقت اس پر سے بیرسٹری کی پوزیشن“ ص ۲۲۶ (خطاب مصنف سے ہے) ۱ بجلی

# کلام میر ضیا دہلوی

میر ضیاء الدین، دہلوی میر تقی، میر قائم وغیرہ کے معاصر تھے۔ مصحفی نے جو انھیں میر کا شاگرد لکھا ہے قابل اعتبار نہیں غالباً حملۂ دُرانی کے بعد دہلی سے ادھر گئے، وہاں کچھ دنوں قیام کے بعد عظیم آباد چلے آئے اور یہیں فوت ہوئے۔ مہاراجا شتاب رائے کا ایک بیٹا زمانۂ تالیفِ تذکرہ میر حسن میں ان کا خبر گیراں تھا۔ ان کے تلامذہ میں میر حسن صاحب مثنوی و تذکرہ بڑے نامور ہوئے۔ عظیم آبادی تلامذہ میں رضا سب سے زیادہ مشہور ہیں ۱۲۱۵ھ سے پیشتر ضیا کا انتقال ہوا۔ دیوان کا ایک نسخہ جو آخر سے ناقص ہے ابھی حال میں دستیاب ہوا ہے، اور ایک عزیز کی مہربانی سے مجھے بھی اسکی زیارت کا اتفاق ہوا ہے، گو بالاستیعاب پڑھنے کا اب تک موقع نہیں ملا۔ ذیل کے اشعار تذکرۂ شورش سے ماخوذ ہیں۔ ق۔ ع۔ و

اس گورے منہ کے تل نے یوں لوٹا دل کو آکر  
جوں چور گھر کسی کا موسے دیا جلا کر

گل غنچگی سے نکلے لالے نے سینہ کھولا  
ظالم کبھی تو تو بھی بند قبا کو وا کر

کوند برق بیستوں، پرویز کی بنیاد پر  
گر چکی تیشے کی بجلی خرمن فرہاد پر

عشق شیشہ ڈھال دل کا یا کہ چکنا چور کر  
لیک اس پتھر کو پہلو سے مرے تو دور کر

جلنا بھنا ان کا یارب ہے کسی کا یادگار  
داغ کو کرے چراغ اور زخم کو ناسور کر

بنا لے شیخ کعبے کو کر بت خانے کو غارت کر  
نہ تو یہ کر نہ تو وہ کر کسی دل کی عمارت کر

دل میں کسی کی آنکھوں میں یا جا کے چھپے ہم  
کیا گزری جی میں آ دو جو یاں پھر نہ آئے ہم

تم کھلکھلا کے ہنس دو ہم آہ و نالہ کر لیں  
مانند بلبل و گل کوئی دم خوشی کا بھر لیں

ہم جا کریں گے نالے قفس ہی میں عندلیب  
تو رہ چمن میں اور ترے چہچہے رہیں

تخم انساں میں حق کا جھاڑ چھپا  
تنکے کی اوٹ میں پہاڑ چھپا

کون سے صدمے کی یہ آہٹ ہے  
پھر در دل پہ کھٹکھٹاہٹ ہے

نالے نے چرخ کو نہ پھاڑ دیا  
لامکاں میں بھی جھنڈا گاڑ دیا

شمع رو ہیں کہ ماہ پارے ہیں  
تیری صورت پہ سارے وارے ہیں

دل جا، غم جگر کو ڈھونڈے ہے  
اس میں کیا خاک اور انگارے ہیں

اس گلی میں خدا ہی حافظ ہے  
دل ضیا دونوں اب سدھارے ہیں

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدّین احمد

دائرہ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

| جلد ۱ | اپریل سنہ ۱۹۴۲ | نمبر ۶ |
|---|---|---|



چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ۶/

# ہم اور وہ

کل ہنس کے کہہ رہے تھے یہ اک مردِ پختہ کار
یہ نسل تو شباب میں بھی کچھ جواں نہیں

چہرے پہ عزمِ زندہ کی سرخی نہیں کوئی
بجلی کوئی نگاہ میں شعلہ فشاں نہیں

رفتار میں وقار نہیں، عظمتیں نہیں
گفتار میں خروش نہیں، گرمیاں نہیں

جذبات میں خلوص تو ہے شدتیں نہیں
افکار میں شرار تو ہیں بجلیاں نہیں

شانے جھکے جھکے سے جبینیں اداس اداس
جیسے لہو تو انکی رگوں میں رواں نہیں

آغوشِ حسن میں بھی وہی تلخ کامیاں
کم بخت یہ بہار میں بھی شادماں نہیں

---

میں نے کہا یہ سچ ہے، مگر پھر بھی اے جناب
یوں دیکھئے تو ختم ابھی داستاں نہیں

شانوں پہ اپنے ہم جو اٹھائے ہوئے ہیں بار
اس بار سے جھکے ہوئے ہیں ناتواں نہیں

چکھا ہے ہم نے اتنا مے و انگبیں کا زہر
جامِ حیات میں بھی وہ شیرینیاں نہیں

سوداگری جو عام ہوئی حسنِ یار کی
پہلو میں اپنے کوئی تمنا جواں نہیں

اتنا جبینِ شوق سے کھیلے ہیں کچھ بزرگ
سجدہ کہاں نظر میں کوئی آستاں نہیں

---

وہ سرد پرسکون زمانہ بدل گیا
انسانیت کی چیخ ہے اپنی فغاں نہیں

---

لیکن جمالِ دہر میں اپنا لہو بھی ہے
ہم سینۂ حیات پہ بارِ گراں نہیں

کچھ کھو رہے ہیں دہر میں کچھ پا رہے ہیں ہم
انصاف کیجئے تو یہ سودا گراں نہیں

آل احمد سرور

# اردو ادب میں طنز اور ظرافت

(۳)

(مسلسل)

دوسرے گروپ میں وہ ظرافت نگار آتے ہیں جنکا مقصد اصلاح ہے۔ جو بعض چیزوں کے خلاف ہوکر یا کسی خاص مشاہدہ سے متاثر ہوکر اپنے جذبۂ غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس گروپ میں نثر لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے۔ انہوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بھی مغربیت کے خلاف تھے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے۔ لیکن انہیں اردو نثر میں اتنی ممتاز کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی اکبر کو نظم میں میسر ہوئی۔ آزاد میں نہ وہ زور تخیل ہے، نہ وہ قوت ایجاد جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ ان میں وہ شوخی اور شگفتگی بھی نہیں۔ اور ان کی طنز کے تیر اسقدر کارگر بھی نہیں ہوتے۔ ان کی طنز کا نمونہ یہ ہے:-

"یہاں ہوٹلوں اور مکانات عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت۔ طرحدار نزبیت یا فتہ چست اور چالاک، کمسن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کے کام دن کو اور رات کو دیتی اور کرتی رہتی ہیں۔ اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سر مبارک کی قسم میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے"

آزاد میں وہ تنوع نہیں جو اکبر میں نظر آتا ہے۔ ان کی طنز زندگی کے ہر رخ پر حاوی نہیں۔ اس طنز کی کاٹ زیادہ گہری بھی نہیں۔ اکبر کے مقابلہ میں آزاد کی طنز میں سطحی معلوم ہوتی ہے۔ جوش، ہیجان نفرت و غضب کے محرکات بھی موجود نہیں۔ طرز سیدھا سادھا اور دھیما ہے:-

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتابیں دیکھوں۔ کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینۂ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے۔ مجھے تمہارا گرنٹ کا پائجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں، تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے... جب کسی معزز لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں، تمہاری چپاتیوں کو حنائی انگلیوں سے تھپکنا یاد آتا ہے اور کیا جی گھبراتا ہے۔"

آزاد کے زمانے کا لحاظ کرکے اور یہ بھی مدِ نظر رکھ کر ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ اردو میں موجود نہ تھا، آزاد کی کوششیں لائقِ تحسین ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت تاریخی ہے اور ان سے ادب و انشا اور ہجو کے متعلق موجودہ زمانے کے نوجوان مزاح نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آزاد کے بعد موجودہ طنزیین میں تین نام سامنے آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں اور ملا رموزی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو دوسرے سرد اور بے روح طنزیات میں مطلق نہیں۔ اُردو انشا پرداز کسی مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو ظریفانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں وہ اسی مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو طنزیہ طور پر بھی پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن عموماً یہ مسئلہ، واقعہ یا خیال ان کے دلوں میں زبردست ہیجان نہیں پیدا کرتا۔ اس سے ان کے دماغ میں ایک تموج پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زیادہ حصہ اُردو طنزیات کا سطحی، سرد و بیجان معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے طبیعت حساس پائی ہے وہ صرف حس ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے احساسات شدید ہوتے ہیں، ان کے جذبات اُبلنے لگتے ہیں، ان کے خیالات میں بلا کا طوفان برپا ہوتا ہے۔ ان جذبات و خیالات اور ان کی شدت سے وہ خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں:

"جو تاریکی چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جبکہ اسلام کا ظہور ہوا تھا، وہی تاریکی آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام اپنی غربت اولی میں مبتلا ہے۔ اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بت پرستی تھی تو اسکی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھاگئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے۔ خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں! دنیا کی وہ کون سی پرانی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی؟ جبکہ وہ بیماری تھی تو کیا اسکی حالت ویسی ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے؟ پہلے وہ پتھر کی چٹانوں پر تھا۔ وہ کی کروٹیں بدلتی ہوگی، اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے۔ لیکن بیمار کے بدل جانے سے بیماری کی حالت نہیں بدل سکتی۔"

دیکھا اس قسم کی شاندار، پرزور، زندہ تحریر کے سامنے جملہ طنزیہ تحریریں بے رنگ و بے اثر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں ہر ہر لفظ خلوص سے پُر ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ پہلے دل میں محسوس کیا گیا ہے۔ ہجو گو بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی طمع، بدتمیزی، بیرحمی، ناانصافی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس مشاہدے سے اس کا دل بیتاب ہو جاتا ہے وہ شدتِ احساس سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ ان چیزوں کو کچل ڈالے۔ بدی کے اس پھولتے پھلتے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات کے اٹھتے ہوئے

طوفان کو ایک زبردست طوفان بنا دیتا ہے، ایسا طوفان جو اپنی فوق فطری طاقت سے ساری گندگیوں کو پاک وصاف کر دیتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فوق فطری زور ہے اور اس زور کی وجہ سے ان کی انشا محض انشا یعنی لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار، ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک اٹھتا ہوا طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے۔ یہ ایسا عصائے موسوی ہے جو افعی بنکر ہر شئے کو نگل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت وہلاکت پھیلانے کی ایسی شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدھوں نے پھنکاری ماری مگر نہ تو ایسی درندگی ابھی تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدھا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے، اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے، اس ہاتھی کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے چیختا ہوا اٹھا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کیلئے پلا ہے، یہ کیسے عجیب ہیں! یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا۔ ایسا طوفان، جو کبھی نہیں اٹھا۔ ایسی آتش فشانی جو کبھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو اتک کبھی زمین پر نہ ہوا۔"

اگر اردو ادب اس قسم کی طنز کی یا دو مثالیں پیش کرسکتا تو پھر وہ طنزیات کے میدان میں دوسرے ادیبوں کے مقابلہ میں اس قدر پیچھے نہیں رہتا۔ اس قسم کی مثالیں ابوالکلام آزاد صاحب کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ تحریر زندہ ہے اور اس کا ہر ہر لفظ زندگی کا حامل ہے۔ اور ہر لفظ بولتا چالتا، متحرک نظر آتا ہے۔ یہ طرز تحریر مولانا ابوالکلام کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ انکی شخصیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اپنے طور پر بالکل منفرد ہے۔ مولانا ابوالکلام کی عبارت سلیس یا محدود نہیں ہوتی۔ انکی روش عام روشوں سے یکقلم علٰحدہ ہے۔ اور یہ ایک حد تک اجنبی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شان ہے۔ رعب دبدبہ ہے، زور ہے اور کہیں کہیں ثقالت بھی ہے۔ اس میں وہ سبکی، باریکی سلاست، روانی نہیں جو دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مولانا ابوالکلام نے عام طرز سے علٰحدہ ہو کر، شاہ راہ اُردو سے دور ہٹکر اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں لیکن ان کی شخصیت کو اس نئی راہ کی ضرورت تھی اور اگر وہ عام روش اختیار کرتے تو شاید اپنی انفرادیت کو

کھو بیٹھتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو ان کا مخصوص رنگ ہے وہ ہر کام، ہر موقعہ کے لئے موزوں بھی نہیں۔ اس قسم کی انشار کا دائرہ محدود ہے۔ یہ خاص خاص موضوعات کے لئے مناسب ہے اور اس کا بے موقع دبے محل استعمال مضحک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے موقع و محل سے استعمال کیا ہے اور جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرتے ہیں ان کے لئے یہ نہایت موزون و کامیاب ہے۔

جو "خطیبانہ ہیجان اور جوش" مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے وہ مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں میں موجود نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی آواز بلند آہنگ ہے۔ مولانا ظفر علیخاں کی دھیمی ہے۔ مولانا ابوالکلام میں بے پناہ جوش ہے۔ مولانا ظفر علیخاں میں خلوص کے باوجود بھی وہ بے پناہ جذبات کی شدت نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی انشا ایک زندہ، متحرک قوت ہے۔ مولانا ظفر علیخاں کی انشار نسبتًا سرد و ساکت نظر آتی ہے۔ لیکن صرف نسبتًا ہی۔ ورنہ ان کی تحریر میں بھی زور ہے۔ ایک ایسی قوت ہے جو اُسے عام سطح سے بلند کردیتی ہے:۔

"آج دنیا کا نظام حکومت جن اخلاقی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ غرق آہن جہاز ہیں اژدر دم توپیں ہیں، فلک پرواز طیارے ہیں۔ قطار اندر قطار عسکریوں کی جگر گزار سنگینیں ہیں۔ صف اندر صف پولس کی جمعیت فرسا لاٹھیاں ہیں جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیردستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے۔ ملوکیت کا یہ عفریت یعنی جسنے عسکریت کی گود میں پرورش پائی ہے آج ربع مسکوں پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ مغرب اس خونخوار دیو کا زاد بوم تھا۔ کاش یہ اپنے ہی وطن میں رہتا مگر اس نے ایشیا کو بھی اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرق اقصیٰ اسکی جہنمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔"

اس مثال میں ظفر علیخاں کی انشار اپنے بلند ترین مقام پر ہے۔ لیکن یہ بلند ترین مقام بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا کے معمولی مقام سے بہت نیچے واقع ہوا ہے۔ دونوں خلوص کے حامل ہیں۔ دونوں سیاسی طنز کی راہ میں گام زن ہیں۔ لیکن جو پائداری ابوالکلام آزاد کی تحریر کا حصہ ہے وہ انکی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ نسبتًا ظفر علیخاں کی تحریریں ہنگامی چیزیں سی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دلچسپ ہیں، اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتی ہیں لیکن انہیں بقائے دوام غالبًا حاصل نہیں۔ اصل یہ ہے موجودہ ہندوستان کی سیاسی کشمکشوں نے موجودہ ادب پر اثر ڈالا ہے اور برابر ڈال رہی ہیں۔ ان کشمکشوں کا اثر آئینہ ادب میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ایک طرف تو ہمارے ترقی پسند شعرا اور ادیب ہیں جو اپنے ترقی پسند خیالات سے دنیا کو بلند آہنگ آوازمیں مطلع کررہے ہیں۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ ہجویں یا ہجو یہ تحریریں ہیں جنکی مثالیں ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علیخاں، قاضی عبدالغفار وغیرہ میں

ملتی ہیں۔ عموماً جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ نئے نہیں۔ جن چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ وقتی چیزیں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کے گزر جانے کے بعد انکی محض تاریخی اہمیت باقی رہے گی۔ اس لئے عموماً یہ نظمیں اور ہجو یہ بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور آئندہ دور کا مورخ ان کے مدد سے اس زمانے کی تصویر مرتب کرنے میں کامیاب ہوگا۔ عموماً وقتی جلد گذر جانے والے موضوعات پر لکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ تصنیف کی اہمیت محض تاریخی باقی رہجاتی ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مصنف اپنی کبھی نہ مٹنے والی انشا کی مدد سے ان وقتی دلچسپی رکھنے والے موضوعات کو بقائے دوامی عطا کرتے ہیں۔ لیکن ایسے مصنف بہت کم ہوتے ہیں اور ابوالکلام آزاد اس قسم کے ایک انشا پرداز ہیں ظفر علیخاں اس گروہ میں داخل نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علیخاں کا دائرہ محدود ہے۔ ملا رموزی کا موضوع محض سیاسیات ہی نہیں۔ اس لئے ملا رموزی میں تنوع مضامین زیادہ ہے۔ مجھے ملا رموزی کی "گلابی اردو" سے بحث نہیں۔ "گلابی اردو" غالباً اپنے "نیاپن" کی وجہ سے مشہور ہوگئی لیکن اس کی ادب میں کوئی جگہ نہیں اس قسم کی چیز وقتی طور پر اور "کم خوراک" میں اچھی لگتی ہے لیکن زیادہ مقدار میں ناقابل برداشت ہوجاتی ہے "گلابی اردو" بالکل قابل اعتنا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ "نکات" کی کیا اہمیت ہے۔ ملا رموزی اپنے نکات کے مقصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :-

"بہرہ نکات یا نکات کے عنوان سے جو کچھ لکھا جائے گا اس کا پہلا مقصد تو یہ ہوگا کہ رسالہ "بیدار" کے پڑھنے والوں میں جو حضرات ہنسی، مذاق، تفنن، خوشدلی کی نعمتیں سے ابداً محروم رہتے ہیں یا ... جن کے دماغوں سے تفریح و ظرافت کی تازگی ضایع ہوچکی ہے ... انھیں گدگدایا جائے اور بتلادیا جائے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ روحانی بنے رہنا ہی متانت نہیں بلکہ کسی وقت مسکرا دینا، کھلکھلانا، یا قہقہہ لگانا بھی طبی اصول سے مفید صحت ہے ... دوسرا مقصد اس عنوان سے یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست مذہب تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و تزمین کے وہ باریک نکتے سمجھا دئے جائیں گے جنکا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ لہذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہا کی متانت و سنجیدگی اختیار کی جائے گی کیونکہ بعض مواقع پر نری ظرافت بھی خطاب و بیان کی تاثیر واہمیت کو کم کردیتی ہے، مگر ایسے سنجیدہ نکات پر آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ نکات کا لکھنے والا ملا رموزی بھی کسی مہاجن کی باسی

کڑھی بن گیا ہے۔ جس میں کوئی چٹپٹا ابال بھی نہیں آتا۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ہماری ظرافت کی ایک ایک سطر میں بھی کام کی باتوں کو تلاش کرتے رہیے۔ وہ ملیں گی اور بکثرت ملیں گی انشاء اللہ"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملا رموزی نے ظریف شہرت پائی ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نکات میں سیاست مذہب تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب قومیت کے نکتوں سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت اور ان کے متین نکات کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے یہ ہے:-

" ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول مدنظر رکھا گیا ہے۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ کہیں وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں۔ جو باتیں مصلحین کی زبان پر بھی نہیں آتیں وہ انکی زبان قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں۔ اور ان کی ادراکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں"

"غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے جس کا راستہ ملا رموزی نے کھول دیا ہے۔ یقیناً آیندہ ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ کریگی اور قوم کے پژمردہ دلوں کے لئے مسرت پائدار ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک گوشوں کے لئے بھی روشنی کا کام دے گی"۔

مجھے اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت میں "ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول" مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ کوئی مقصد ہے۔ یہ بھی صحیح کہ ان کی ظرافت وسیع مضامین پر حاوی ہے۔ لیکن مجھے اس بیان سے قطعی و کلی اختلاف ہے کہ "ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ کریگی" ہر زبان اور ہر زمانہ میں مختلف قسم کے ادیب ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنی میں ادیب نہیں کہے جا سکتے۔ وہ لکھ تو لیتے ہیں اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں کافی مشہور اور ہر دلعزیز بھی ہوتی ہیں لیکن ہر ذی فہم جانتا ہے کہ یہ چیزیں ادب کا جزو نہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ اور وہ مصنفین بھی اپنی حقیقت اور اپنے مقام سے باخبر ہوتے ہیں۔ دوسرے ادیب وہ ہیں جنہیں ادیب بننے کی خواہش ہے لیکن جو

ادیب ہونے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے کارنامے پیدا ہونے سے پہلے ہی مردہ ہوتے ہیں کچھ ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں (اور زیادہ تعداد ایسوں ہی کی ہوتی ہے) جو اپنے زمانہ میں ادیب کہلاتے ہیں اور جنھیں دوسرے بھی ادیب شمار کرتے ہیں لیکن جنکی ادبی عمر صرف ان کے دور تک رہتی ہے اور اس دور کے گذر جانے کے بعد وہ فراموشی کی خلیج میں ڈالدیے جاتے ہیں۔ ملا رموزی انہی قسم کے ادیبوں میں داخل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکی اہمیت کو خود ان کا عہد مانے یا نہ مانے لیکن وہ بقائے دوام کی نعمت ازل سے ساتھ لاتے ہیں۔ ایسے ادیب کم ہوتے ہیں اور ملا رموزی ایسے ادیبوں میں نہیں۔ ان کی تحریریں بس ایسی ہیں کہ موجودہ زمانے میں لوگ پڑھیں گے، کسی حد تک محظوظ ہونگے لیکن اس زمانے کے گذر جانے کے بعد اسی قسم کے دوسرے مصنفین پیدا ہو جائیں گے اور انکی طرف دنیا متوجہ ہو گی۔ شاید ان کے نام سے بھی واقف نہ ہو گی۔ عبدالقادر صاحب نے ملا رموزی کا اڈیسن سے مقابلہ کیا ہے لیکن ملا رموزی کا صحیح مقابلہ ان موجودہ انگریزی مقالہ نگاروں سے ہے جو آجکل تو مشہور و معروف ہیں لیکن جنکی ادبی عمر غالبًا انکی عمر طبعی کے برابر یا اس سے کم ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ملا رموزی کی نہ وہ ذہنیت ہے، نہ وہ شخصیت اور نہ وہ انشا جسمیں پائداری کا عنصر ہوتا ہے اور جو بقائے دوام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں جنکی طرف رشید احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے:-

"وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں لکھنا چاہیئے جن میں ملا صاحب لکھنے کے عادی ہیں۔ ملا صاحب کی تحریروں میں ایک چیز اکثر کھٹکتی ہے اور اس چیز کا احساس سوا ملا صاحب کے ہر ایک کو ہے یعنی وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اچھالنے کی زیادہ فکر رکھتے ہیں! اور یہی وہ چیز ہے جس کے سبب سے ان کی بہترین ظرافت، بدترین طنز اور بہترین طنز بدترین ظرافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو چیز پیشہ بنا لیجائے گی وہ ہمیشہ قبیح نظر آئیگی اور جو چیز بطور مشغلہ تفریح برسرکار رہے گی وہ ہمیشہ مقبول اور محبوب ہو گی۔ ملا رموزی صاحب نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے۔"

ملا رموزی انتخاب، انتخاب موضوعات اور انتخاب الفاظ سے کام نہیں لیتے۔ انہیں موقع و محل، تناسب، موزونیت کا لحاظ نہیں رہتا اور انہوں نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے یعنی ان میں وہ علیحدگی جو ایک کامیاب ادیب کے لئے ضروری ہے موجود نہیں۔ ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ ملا رموزی میں صناعی، ایسی صناعی جو پائدار ہو اسکی کمی ہے:-

"خدا جانے یہ کنگ پرائمر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون

کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرمارہے ہیں اور تو کچھ نہیں لباس کی اس یکانگیت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السّلام علیکم کہہ گذرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجئے میں ہندو ہوں کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اسوقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے لئے ڈھائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچاکر لینے کے لئے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے ڈبا ذرا خالی پاکر ایک سیٹ پر نیا انگریزی وضع کا بستر بچھایا۔ اور مع کوٹ پتلون اسپر لیٹ گئے۔ اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ہاتھ ڈال لیا گویا سر اسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ وکٹوریا اسٹیشن لنڈن سے جمعیۃ الاقوام کی شرکت کے لئے اپنے خانے کے اسپشل میں جنیوا جارہے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکالکر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی معاہدے کو ملاحظہ سے حل فرما رہے ہیں۔"

تصویر کافی صاف کھینچی ہے اور بس۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی انفرادیت نہیں کوئی پائداری نہیں۔

---

۳ تیسرے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جنکی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ جو اپنے فلسفۂ زندگی کو ظرافت اور طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتی ان کی مخاصات ہجویں منتشر نہیں ہوتیں وہ گویا ایک سلسلہ میں منسلک ہوتی ہیں اور بلکہ مصنف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی ہجوؤں میں ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے جسکی وجہ سے ان کے حسن میں ایک حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ کم از کم انتشار و پراگندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس گروپ میں سلطان حیدر جوش اور سجاد علی انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ سلطان حیدر جوش مغربی خصوصاً انگریزی مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں اور ان مصنفین کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اور ایک حد تک اس تقلید میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے ان کی ظرافت میں گہرائی آجاتی ہے۔ یہ رنگ سلطان حیدر جوش کی تخلیق ہے اور غالباً انہی پر ختم ہوگئی ہے:۔

"معلوم نہیں نیچر کو اپنی ترقی کرنے والی مخلوق کے ساتھ کہاں کا بیر ہے۔ کہ جسقدر مشکلات سے یہ پیچھا چھڑاتی ہے اسی قدر وہ اور زیادہ مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ جب انسان نے پیدل چلنے سے قدم آگے بڑھاکر زین سواری شروع کی تو نیچر نے محض ٹھوکر لگ جانے سے آگے بڑھکر گھوڑے پر سے گرکر مرجانا پیدا کر دیا' پھر انسان نے گاڑی بنائی تو اس کا الٹ جانا اور زیادہ مہلک چیز وجود میں آئی

جب ریل نے دنیا کے وجود میں قدم رکھا تو ریل سے لڑجانے کا سخت مہلک حادثہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوا مختصر یہ کہ انسان جس قدر اپنے آرام و آسایش حاصل کرنے کے زور میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ نیچر اسی قدر تکلیف اور مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ یہی حالت سوسائٹی کی ہوئی وہ جسقدر آگے بڑھتی گئی پابندی اور دھوکہ سے گلو خلاصی حاصل نہ کرسکی! مگر اس کی ترقی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ سوشلزم کی اس حدتک نہیں پہنچی تھی جہاں اس کا پہنچنا مقصد تھا!... اگر فرض کرلیا جائے کہ دنیا اس حدتک پہنچ بھی گئی تو اسکو فی الواقع آگے بڑھنا کہیں گے یا پیچھے ہٹنا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ترقی کرے گی یا پھر اسی پہلے وحشی انسان کے بین بین ہوجائے گی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اس مرتبہ پھر وہ انسان سے بندر کے قالب میں پہنچ جائے کیونکہ بندر کو انسان سے بدرجہا بے فکری، مساوات اور مسرت حقیقی حاصل ہے۔"

یہ ہے سلطان حیدر جوش کا رنگ اور اس رنگ میں گہرائی اور پختگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریر میں بے ساختگی اور برجستگی کی کمی ہے۔ لیکن کہہ سکتے ہیں کہ بے ساختگی و برجستگی اس قسم کے فلسفیانہ ظرافت کے لیے موزوں بھی نہیں۔ جو بات ان کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود، خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ اور متین لب و لہجہ ہے۔ سلطان حیدر جوش ایک مخصوص شخصیت کے حامل ہیں ان کی انفرادیت ان کے الفاظ سے عیاں ہے۔ وہ نوجوان مزاح نگاروں کی طرح غیر ذمہ دارانہ طور پر محض ہنسنے ہنسانے کے لوازمات کی تلاش نہیں کرتے اور انہیں تلاش کرکے قارئین کے سامنے پیش نہیں کرتے۔ وہ سستی شہرت کے طلبگار نہیں۔ اس لئے وہ عام فہم اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں اور سطحی رنگینی، سطحی رعنائی خیال کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا ہے۔ اس لئے ان کے مضامین کبھی شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی کے مضامین کی طرح عام پسند نہیں ہوسکتے۔ لیکن ان کے مضامین شاید پڑھے جائیں گے جب شوکت تھانوی وغیرہ کے نام سے بھی لوگ واقف نہ رہیں گے۔ ان کے مضامین کا حلقہ اثر لازمی طور پر محدود ہے۔ یہ مضامین ان ہی لوگوں کو متاثر و محظوظ کرسکتے ہیں جنھیں خود غور و فکر کی عادت ہے جو خیالات کی کشمکش سے بچنا نہیں چاہتے ہیں۔ جو ادب کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ان سب اوصاف کے باوجود سلطان حیدر جوش کے مضامین میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں۔ ان کی ظرافت فطری نہیں۔ اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے تخیل میں غیر معمولی باریکی، بلند پروازی اور روانی نہیں ہے۔ ان کی انشا غیر معمولی دلچسپیوں کی حامل نہیں ہے:

"آہ دنیا ترقی یافتہ دنیا تمام تمول تمام قابلیت، تمام سائنس، تمام قوت ایجاد و اختراع

س بات پر ماتم کر رہی ہے کہ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں گروہ کے گروہ نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔
دولت اور فنا آور نوجوان عین عالم شباب میں اسی پرانی خیالی عزت کے پیچھے اپنے جیتے جاگتے
جانوں کو قربان کر رہے ہیں! اور سونے کے بڑے بڑے انبار لوہے کی توپوں اور لوہے کی اور چیزوں
کے بنانے میں برباد ہو رہے ہیں! صدیوں پرانی صناعی کی قابل قدر یادگاریں اور اس کے ساتھ ہی بیچاری
کم نہ ساز بھولی بھالی صورتیں اسی طوفان بے تمیزی کی رو میں بہی چلی جاتی ہیں"

اس میں ایک زور ہے۔ ایک روانی ہے۔ ایک اثر ہے لیکن یہ زور یہ روانی یہ اثر فطری نہیں بلکہ
سلطان حیدر جوش کے قصد و ارادہ کا نتیجہ ہے۔ اس وجہ سے اس میں سبکی اور لطافت نہیں بلکہ ایک قسم کی
گرانی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ مکمل طور مصنوعی نہیں۔ یہ غور و تفکر کا مادہ سجاد علی انصاری میں بھی موجود تھا
نوجوانی کا تقاضا تھا اسلئے ان کے الفاظ میں نرمی کے عوض تیزی تھی۔ ان کی طنز میں کاٹ بھی زیادہ
تھی لیکن وہ سلطان حیدر جوش کے سے پختہ کار انسان نہ تھے۔ اس لئے ان کے خیالات میں وہ گہرائی
وہ تسلسل وہ جامعیت نہیں انہیں اپنے ذمہ داری کا اسقدر احساس بھی نہیں۔ بظاہر سجاد علی انصاری
کو ذمہ داری کا زیادہ احساس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ذمہ داری اس قسم کی زیادتی کی حامل ہے جو
عموماً ان نوجوانوں میں نظر آتی ہے جو اپنے ذمہ داری کا احساس کرنا چاہتے ہیں اور اس احساس میں
غلو سے مصرف بیتے ہیں اس قسم کا غلو ان میں نظر آتا ہے لیکن اس غلو اور صحیح ذمہ داری کے صحیح احساس
میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ بہر کیف نسبتاً سجاد علی انصاری میں ذمہ داری کا مادہ دوسرے نوجوان
انشا پردازوں سے زیادہ ہے۔

"فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔ ایک حقیقت جب مٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی
ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا۔ اس وقت تخلیق شیطنت کی ضرورت ہی نہ تھی وہ جانتا
تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنت مضمر ہیں۔ سلسلہ ارتقا سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔
معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر مکمل ہو چکے تھے جو تخلیق شیطنت کے لئے لازمی تھے۔
فطرتاً اس کے لئے یہ محال تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی ملکوتیت پر قانع رہے۔ وہ شیطنت پر مجبور ہو گیا
اس کے سامنے ایک نئی حقیقت کی وسعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ کسی طرح فرشتہ نہیں رہ سکتا تھا"

یہ ہے سجاد انصاری کا رنگ۔ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہے وہی رنگ جو سلطان حیدر
جوش میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں وہ پختگی نہیں، وہ گہرائی نہیں، متانت و سنجیدگی بہرحال وہ نہیں۔
اس قسم کی طنز اور عام پسند طنز میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ وہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن یہ
کچھ دوسری چیز ہے۔ اس سے بالکل مختلف جس کی مانگ اخبارات و رسائل کے اڈیٹر کیا کرتے ہیں

فلسفیانہ ظرافت میں بہت کچھ گنجائشیں باقی ہیں۔ سلطان حیدر جوش صاحب نے اسکی ابتدا کی ہے۔ سجاد انصاری میں اسکی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن اس رنگ کی ابھی ابتدا ہے اور اسکی ہوا منتظر ہیں کسی ایسے رہرو کی جو اس راہ میں جرأت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔

(۴)

طنز اور ظرافت کے میدان میں رہرو تو بہت ہیں لیکن شاید پانچ نام ایسے ہیں جو بقا کے ذمہ دار ہیں: سودا، اکبر۔ غالب۔ سرشار ابوالکلام آزاد۔

ابھی اردو میں ادبی طنز اور ظرافت کے لئے لامحدود گنجائشیں ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں۔ اگر اردو انشا پرداز اس فن کی اہمیت کو سمجھیں۔ اسکی خصوصیتوں سے شناسائی بہم پہنچائیں تو بہت کچھ ترقی ممکن ہے۔

کلیم الدین احمد

# بشارت الامامت (۱)

سید غلام حسین خاں نے سیر المتاخرین۵ میں اپنے جد شاہ علیم اللہ۲۵ صاحب کا حال لکھتے ہوئے، دو جگہ بشارت الامامت کا ذکر کیا ہے:

"از علو مقامات و سمو کرامات آں مرد خدا اگر ذکرے رود، سخن بہ طول انجامد۔ در مثنوی بشارت الامامت۔ بہ ذکر بعضے از خوارق عادات و مقامات آں عالی درجات پرداختہ ام۔ من شاء فلیرجع الیہ ص۵۲۲" "ریاضات و مجاہدات۔۔ و خرق عادات و کرامات کہ۔۔ بہ ظہور رسیدہ و بندہ برآں مطلع گردیدہ در مثنوی علیحدہ کہ۔۔۔ بہ بشارت الامامت موسوم ساختہ ام برخے از آں مندرج ۳ے"

میر علی محمد شاد مرحوم نے حیات فریاد۴ے (ص۳۲ تا ص۳۴) میں اس مثنوی کا مفصل حال لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "ایک نسخہ اس کا نواب۵ے بہادر سید ولایت خاں (ولایت علی خاں) کے پاس تھا، راقم نے اس کی نقل لے لی تھی۔۔ جو نواب مرحوم۔۔ عاریتًہ لے گئے تھے۔ لیکن مجھ کو واپس۶ نہ دی"

نواب ولایت علی خاں مرحوم کا نسخہ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں ہے، اور اس کا اجمالی ذکر ضمیمہ فہرست کتب خانہ جلد اول میں موجود ہے۔ ابتدا میں کاتب نے جو سادہ ورق چھوڑا ہے اس پر شاد مرحوم نے مصنف، پدر مصنف، علی نقی خاں، کاظم علی خاں اور ولایت۶ے علی خاں کا حال اختصار

۵ اسی موضوع پر اور اسی عنوان سے میرا ایک مضمون = ن ستمبر ۱۹۴۷ء میں ندیم نے چھاپا تھا۔ نیا مضمون لکھنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ ن میں بہت سی باتیں جنھیں تفصیل سے لکھنا تھا، مجمل رہ گئی تھیں، اور فاحش اغلاط طباعت سے قطع نظر، بعض غلطیاں ایسی بھی تھیں جن کا میں خود ذمہ دار تھا۔ میں جناب مختار الدین احمد صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری ہدایات کے مطابق ب سے متعلق ایک یادداشت لکھ کر دی۔ بغیر اس کے نہ ب کے اشعار صحیح نقل ہو سکتے تھے، اور نہ میرے لیے یہہ ممکن تھا کہ میں ب کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھ سکوں۔

۱ے = سیر (نسخہ لکھنؤ) ۲ے ن میں ایک جگہ کاتب ندیم نے سہواً "علیم اللہ خاں" لکھ دیا ہے۔ "خاں" ان کے نام کے ساتھ کہیں نظر نہیں آیا۔ جناب سید ریاست علی صاحب ندوی نے ندیم کے بہار نمبر میں لکھا ہے ص۲۵ کہ ابتدا میں عظیم شاہ کی فوج میں کسی اعلیٰ عہدے پر تھے۔ اس دعوے کا کوئی ثبوت اس وقت تک نظر سے نہیں گزرا۔

۳ے = ف ۴ے شاد کے تتبع میں میں نے بھی ن میں نواب بہادر لکھا تھا، لیکن بی اینڈ او ڈسٹرکٹ گزیٹر پٹنہ میں (ص۱۴۱ و ص۱۸۱) نام کے ساتھ صرف نواب مرقوم ہے۔ غالبًا نواب بہادر کا خطاب نہ تھا۔

۵ے مکاتیب شاد عظیم آبادی = م ص۱۳۵ "بشارت الامامت۔۔ مجھ سے چھین کر خدا بخش خاں لے گئے۔ یقینًا لیبریری میں ہے۔"

۶ے شاد مرحوم نے کاظم علی خاں، برادر زادۂ مصنف کو ولایت علی خاں کا 'جد مادری' لکھا ہے۔ اور ن میں میں نے بھی اسے قبول کر لیا تھا، لیکن نقش ناپایدار (حواشی نسبت موقوفات) میں درج ہے کہ کاظم علی خان لاولد تھے۔ اور غالبًا یہی صحیح ہے۔

کے ساتھ لکھا ہے۔ شاد مرحوم کی عبارت کی پہلی سطر یہ ہے: ایں نامۂ نامی منظوم کہ بہ بشارت الامامت موسوم ست' نوک زیز قلم بیضا رقم خورشید فلاک ریاست و امارت" مصنف کی دوسری تصانیف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "چندیں تصانیف غیر از سیر المتاخرین چوں تفسیر در تازی با محاورہ و شرح مثنوی مولانائے روم و دیگر کتب کلامیہ و دیوان اشعار از حباب و الالیش بر صفحۂ ہستی منقوش ست"

مثنوی سے پہلے مصنف نے ۶ صفحوں کا ایک دیباچہ نثر فارسی میں لکھا ہے۔ سطر اول یہہ ہے: "حمد و ثنائے حضرت آفریدگار جلت عظمتہ' را چارہ نیست' بہ جز اقرار و اعتراف بہ عجز و بے چارگی"

حمد و نعت و منقبت کے بعد مصنف نے وجہ تصنیف یوں بیان کی ہے: "راقم ایں کلمات .. چوں دید کہ اکثر مردم .. بہ وجود حضرت صاحب الامر انکار بلیغ .. می نمایند خواست کہ سرگذشت جدّ کلاں خود حضرت میر شاہ فیض اللہ .. و ملاقات ایشاں با حضرت صاحب الزماں ... آں چہ .. از زبان .. سید علیم اللہ .. بلاواسطہ و بہ واسطۂ پدر و اعمام و شاہ غلام علی .. کہ استفادۂ اسرار درویشی از جدّ فقیر نمودہ ایں مسلک را بہ اقتضائے او شاں پیمودہ اند' و بندہ بہ چشم خود کرامت و خرق عادت ... مشاہدہ نمودہ و شنیدہ است بے کم و کاست در سلک نظم کشد" [۵۷]

مثنوی کے صفحات کی تعداد ۱۲۶ ہے' عموماً فی صفحہ ۹ سطریں ہیں۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد ن میں ۱۱۰۶ لکھی ہے۔ چوں کہ ن کا مسوّدہ موجود نہیں' یہہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تعداد کاتب ندیم نے صحیح نقل کی تھی یا نہیں۔

بیت اول: بہ نام خدائے کہ جاں آفرید ۔۔۔ زمیں آفرید و زماں آفرید

حمد و نعت کے بعد ائمہ کی مدح ہے، امام دوازدہم کی مدح، جیسا کہ مقتضائے مقام ہے

---

۵۷ لیکن جناب شاد فرماتے ہیں: "شاہ علیم اللہ .. فقیر ہوکر اور یہہ کہہ کر کہ جب تک حضرت امام مہدی کی زیارت نہ کروں گا، پلٹ کر نہ آؤں گا' کسی طرف نکل گئے تھے، تقریباً ۲۰ برس بعد پلٹے ہیں" ف ۲۳۳ "شاہ علیم اللہ نے .. امام مہدی .. سے ملنے کا احوال کچھ ظاہر نہ کیا' البتہ شاہ غلام علی صاحب سے یہہ راز کہا تھا" ف ۳۷۔ جناب شاد کے قول کے مطابق یہہ بیان مثنوی سے ماخوذ ہے۔ لیکن' مثنوی میں اس کے متعلق ایک لفظ نہیں۔ شاہ فیض اللہ کا امام صاحب کی تلاش میں نکلنا اور ان سے ملنا البتہ لکھا ہے۔

زیادہ تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ اس کے بعد کا عنوان "دربیان استدعائے ظہور" ہے،
اس کے چند شعر یہ ہیں:

براورنگِ شاہی مربع نشیں — بر انداز از بیخ و بُن کفر و کیں
نہ ماندست اسلام را آبرو — بیا و بیار آب رفتہ بہ جو
نہ بوے ز اسلام و نہ رنگ دیں — نہ بودست احوال گاہے چنیں
مذلت بہ حدّ نہایت رسید — نہ ماندست از ہیچ جانب امید
اسیر بلائیم در عار و ننگ — نہ یارائے صبر و نہ نیروے جنگ

وجہ تصنیف:

مرا طبع موزوں ز عہد صبا — عطا گشتہ از حضرت کبریا
بہم گاہ گاہے گہر می فشاند — دو مصرع بہ پہلوے ہم می نشاند
فراہم چو آمد غزل ہاے چند — بہ گوش دلم ہاتفے داد پند
کزیں کار کردن ترا سود چیست — بہ گفتار بیہودہ مقصود چیست
میسّر گرت فرصتِ گفتن ست — گہر ہاے ناسفتہ را سفتن ست
چرا فکر تازہ نہ انشا کنی — چرا دفترے را نہ املا کنی
کہ ناگہہ بزرگے گراں مایۂ — سعادت یضیے فلک پایۂ
غلام علی شاہ عاشق دروں — بہ شد از عنایت مرا رہ نموں

شاہ غلام علی نے مصنف سے کہا کہ تم اپنے اجداد کا حال کیوں نہیں لکھتے کہ تمھارے
خاندان کے افتخار کا سبب ہو اور لوگوں کو ہدایت بھی نصیب ہو۔ اس کے بعد
حالات شروع ہوتے ہیں:

علیم خردمند روشن ضمیر — بہ ظاہر فقیر و بہ باطن امیر
ہدایت ز فیض پدر یافتہ — عنانِ دل از غیر حق تافتہ
مرا جدّ امجد پدر را پدر — ز روشن روانی بہ عالم سمر
بیاں قصۂ والد خویش کرد — حکایت ہمہ بے کم و بیش کرد
کہ چوں شانزدہ سالہ شد والدم — فزوں می شدش عشق حق دم بہ دم
چو کامل شد آں سال از عمر او — گریبانِ جانش گرفت آرزو
کہ باید در اقلیم جاں تاختن — دریں رہ سر از پاے نہ شناختن

به گوشِ دل از غیبش آمد چنیں — که اے نیک فرجام پاکیزہ دیں
به دستے فروشی اگر خویش را — بکن فرق از رہ زن و رہ نما
چو مہدی ست ہادیٔ دیں روزگار — بود بیعت از دیگراں ننگ و عار

امام آخر الزماں کی تلاش میں گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے :-

زمانے درازے به صحرا و دشت — به ناکامی و رنج و محنت گذشت
که ناگہہ ز فضل خدائے مجید — دراں دشت گردید کوہے پدید
چه گویم از آں کوہ رفعت اساس — که می کرد از طور نور اقتباس
کشیدہ سر برتری بر فلاک — به ہر گوشہ اش مجلسے از ملک
رواں چشمہ سارش ز جوئے بہشت — ہوا مشک بو خاک عنبر سرشت
پرافشاں ملائک در او چوں طیور — منور ز نور خدا ہم چو طور
حجارش گرفتہ زبر جد بہ بر — به طوبیٰ رسانیدہ اشجار سر
به کیواں کشیدہ سر عز و جاہ — که بُد صاحب الامر را سیر گاہ
چناں حُبّ آں کوہ در دل نشست — تو گفتی کسے پائے او در بہ بست
نمود آں قدر جذب دل کوہسار — که از وے گذشتن نہ بود اختیار
به ناچاری آں مرد صحرا نورد — به حکم قضا رو سوے کوہ کرد
برآمد برآں کوہ ہم چوں کلیم — به قلب سلیم و به عزم صمیم

میر فیض اللہ نے دل میں ٹھان لی کہ اگر نصیب نے یاوری نہ کی تو یہیں جان دے دوں گا۔

دراں کوہ عالی سہ روز و سہ شب — گذشتہ به انواع رنج و تعب
ورم کردہ پاہائے پُر آبلہ — ہمی رفت بے زاد و بے راحلہ
ولے داشت چوں عہد خود استوار — نہ بودش به ماکول و مشروب کار
که اندر نظر آمدش ناگہاں — یکے آستانِ سعادت نشاں
نہ بودہ برآں کوہ کاشانۂ — نہ سقفے نہ ایواں و نے خانۂ
به یک گوشۂ کوہ بنہادہ تخت — به بالائے آں سایہ پرور درخت
ولے بود تخت از حجر ساختہ — نہ از چوب و از عاج پرداختہ
میان فضا چشمہ چوں چشم حور — که بود آب او از شراب طہور

میر فیض اللہ نے وضو کیا، اور تخت پر بیٹھ گئے۔ دو دن بھوکے پیاسے وہیں رہے۔

تیسرے دن ایک شخص جو اپنی شکل سے عرب معلوم ہوتا تھا، ان کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا لایا، لیکن، انھوں نے نہ کھایا۔ وہ کئی روز تک لایا گیا، لیکن یہہ نہ کھاتے نویں روز امام آخرالزماں خود تشریف لائے۔

بہ روز نہم صبح دولت دمید    برآمد غم و شادمانی رسید

امام صاحب نے ان کا نام لے کر انھیں مخاطب کیا، ان کی بیعت قبول کی اور انھیں تعلیم فرماتے رہے۔

بہ ایں حال بودش در آں جا مقام    سعادت بہ کام و عنایت بدام
شب و روز مستغرق یادِ حق    دلش خانۂ بود آبادِ حق
چو با غیب داں عشق ورزیدہ بود    تماشاے غیب اندرش دیدہ بود
زمانے درازے بہ ایں حال رفت    ز عمر سباک سیر سی سال رفت

میر صاحب نے استدعا کی کہ کوئی کتاب عنایت ہوتی۔ ان کی یہہ خواہش پوری ہوئی۔

بہ طور کتاب از امام امم    زبخت ہمایوں بہ دست آمدم
کتابے عنایت نمود آں جناب    کہ او با کتاب ست با او کتاب
ولے کس نہ دانست کاں نسخہ چیست    کہ املاش فرمودہ تصنیف کیست[۵۸]

امام صاحب نے فرمایا کہ اب گھر جاؤ اور عقد کر لو۔ یہہ بھی کہا کہ تمھیں تین اولاد ہوگی۔ ان میں سے ایک لڑکا تمہارا پیرو ہوگا۔ انھوں نے عرض کی کہ مجھے یہیں رہنے دیجیے، مجھے لڑکی کون دے گا۔ ارشاد ہوا کہ اس کی فکر نہ کرو۔ کسی کو اس کی ہدایت کر دی جائے گی۔ گھر واپس پہنچے تو کسی نے پہچانا نہیں۔ بطور امتحان ان کی پرورش کرنے والی کنیزوں نے سوالات کے صحیح جواب دینے پر ماں نے اندر بلا لیا، انھوں نے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ ماں نے کہا کہ پہلے فقیروں کے کپڑے تو اتار دو۔ انھوں نے عذر کیا کہ یہہ ناممکن ہے۔ اس زمانے میں ایک شخص[۵۹] تھا جس نے

---

[۵۸] مصنف نے یہہ نہیں بتایا کہ میر فیض اللہ نے یہہ کتاب کسے دی اور اس کا کیا حشر ہوا۔
[۵۹] ان کا تو نام معلوم نہیں لیکن بہ قول مصنف (سیر ص۱۱۳) ان کے حقیقی بھائی کا نام شاہ حیدری تھا۔ جو اکبر علی خاں پدر ایرج خاں کے ساتھ اکبر آباد سے آ کر بھاگلپور میں اقامت گزیں ہوئے تھے"۔ از اولاد علی بن الحسین در تشیع نہایت مجاہر و بے باک و در کمال استغنا" شاہ حیدری کے بیٹے شاہ جعفری تھے۔ مزید حالات کے لیے سیر ملاحظہ ہو۔

اپنی لڑکی کو امام صاحب کی نذر کردیا تھا، اسے القا ہوا کہ اپنی لڑکی کی شادی میر فیض اللہ سے کردو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ تھوڑے دن بی بی کے ساتھ رہ کر پھر چلے گئے۔ ان کی غیبت میں میر کریم اللہ متولد ہوئے۔ امام صاحب کے حکم سے پھر واپس آئے۔ اس بار میر علیم اللہ پیدا ہوئے۔ تیسری بار جو غائب ہوئے تو آٹھ نَو برس کے بعد واپس آئے۔ اب کے لڑکی ہوئی۔ چوتھی بار جو وطن سے رخصت تو میر علیم اللہ کی عمر ۹ سال سے بھی کم تھی۔ باوجود امتناع یہہ بھی ساتھ ہو لیے ان کی وجہ سے عرب سرائے پہنچ کر ٹھہر گئے۔

پے را حتم در سرائے عرب — فروکش نمود و بیا سود شب
سہ روز و سہ شب و ہشت آں جا قیام — بہ تعلیم و تلقین من شاد کام

اس کے بعد میر علیم اللہ رخصت کردیے گئے۔

من آ جا روم در جوار امام — تو ایں جا مہا باش قائم مقام
بہ دستت خدا خیر جاری کند — ترا صاحب الامر یاری کند

اس کے بعد سے شاہ علیم اللہ کے حالات ہیں۔ مصنف نے یہہ نہیں بتایا کہ میر فیض اللہ واپس آئے یا امام صاحب کے ساتھ ہی رہ گئے۔ عرب سرائے سے واپسی کے بعد میر علیم اللہ ہمہ تن تحصیل کمال میں مصروف ہوئے۔ خدا کی یاد کرتے، کتابیں پڑھتے یا کتابیں لکھتے۔ کسی اور بات سے مطلق سروکار نہ تھا بہ خلاف ان کے، میر کریم اللہ "عیش و طرب" کی طرف مائل تھے، ماں نے دونوں بھائیوں کا نکاح کردینا چاہا۔ بڑے بھائی نے تو انکار کردیا، لیکن میر علیم اللہ راضی ہوگئے۔ میر کریم اللہ نے چند سال بعد انتقال کیا۔ فرط غم سے میر علیم اللہ مدتوں بیمار رہے۔ ماں نے منت مانی تو شفا ہوئی۔ مصنف نے میر علیم اللہ کی بہت سی کرامتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض قلم انداز کردی گئی ہیں۔ ایک مرتبہ قبرستان میں مراقبہ کر رہے تھے کہ کسی نے نشتر چبھو دیا، انھیں خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک شخص کی بصارت زائل ہو رہی تھی۔ ان کی دعا سے وہ اچھی طرح دیکھنے لگا۔ ایک بار دریائے جمنا میں زمین نکل آئی تھی۔ وہاں جاکر چلہ کھینچا۔ حضرت خضر بھی ان کے ساتھ نماز میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت خضر نے ان سے کہا کہ کچھ مانگنا ہو تو مانگو انھوں نے

جواب دیا:

نہ دارم زکس حاجتے جز امام | نہ خواہم ز دیگر کسے ہیچ کام
مرا صاحب الامر خضر رہ ست | ز ہر مطلب و حاجتم آگہ ست

شاہ علیم اللہ صاحب کے سفر پٹنہ کا ذکر اس کے بعد آتا ہے:

بہ نحوے کہ تقدیر حیّ قدیر | ز دہلی شدش تا بہ پٹنہ مسیر
در اثنائے رہ بہر بعضے مدام | شدش چند جا اتفاق قیام
پراگ آمد و چند روزے بہ ماند | ز رخت سفر گرد راہے فشاند
وزاں جا یکے ز آشنایان ما | کہ بودیم با ہم دگر از صبا
جوانِ عزیزے سعادت نشاں | غلام علی نام آں نوجواں
ز عہد صبا ہم دم و ہم مقام | ہم آئین و ہم مکتب و ہم شیام
بناگہہ شد از ما جدا اے شگفت | در آں شہر سالے سکونت گرفت

شاہ غلام علی کو سچے درویش کی تلاش تھی، جہاں سنتے کہ کوئی فقیر ہے، ملاقات کے لیے جاتے لیکن کسی سے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ ایک فقیر نے ان سے کہا کہ تمھارا راہ بر جلد آنے والا[۵] ہے۔

---

۵ جناب شاد نے حیات فریاد میں (ص۳۱ و ص۳۲) ان مطالب کو جس طرح لکھا ہے وہ ملخصًا یہ ہے: شاہ غلام علی خانقاہ دیورہ کے سجادہ نشین تھے، کم سنی میں باپ سے مرید ہوئے تھے ابھی نوجوان ہی تھے کہ اُن کا انتقال ہوگیا۔ ابھی کسی کو مرشد نہیں بنایا تھا، خیال گزرا کہ کسی ایسے باکمال کو مرشد بنانا چاہیے جو حضرت علی کی زیارت کرادے۔ بہار گئے وہاں کے سجادہ نشین نے چھ ماہ خود بھی ریاضت کی اور ان سے بھی کرائی، لیکن، کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خواب میں ایک "باوقار شخص" نے پچھم جانے کی ہدایت کی، منیر پہنچے، وہاں انھوں نے صا. سجادہ کے ساتھ مل کر چلہ کھینچا، چالیسویں دن اُسی باوقار شخص نے خواب میں کہا کہ تمھارا مطلب بنارس یا الٰہ آباد میں حاصل ہوگا۔ بنارس میں دو مشہور خانقاہوں میں چلہ کشی کی لیکن لاحاصل، وہاں سے الٰہ آباد گئے۔

جناب شاد کے بیان کا بیشتر حصّہ ب میں نہیں، لیکن، لطف یہ ہے کہ یہ سب ب کے حوالے سے لکھا ہے۔

زحرمانِ مقصود شد ریش تر — بہ شد لاجرم عازم پیش تر
دل آزدہ سامانِ ہجرت نمود — کہ ناگاہ فرمود سیّد درود
بہ مہماں سرا بار خود می کشاد — جواں را ازآں رہ مرور اوفتاد
نظر کرد سیّد سوے او بہ غور — نمود ابتدا در سلامش بہ فور

شاہ غلام علی کو حیرت ہوئی کہ ایک اجنبی نے کیوں سلام کیا، شاہ صاحب نے کہا کہ تمھاری پیشانی سے آشفتگی کی علامت نمایاں ہے۔ شاہ غلام علی نے مصنف سے کہا کہ شاہ علیم اللہ صاحب کا اتنا رعب مجھ پر بیٹھا کہ رفتار و گفتار کی قوت سلب ہوگئی، بہ مشکل اپنا حال بیان کیا کہ مجھے سچّے درویش کی تلاش ہے۔

بگفتم نہ دیدم بغیر از دروغ — کہ دہ چمچہ آب ست و یک چمچہ دوغ

شاہ علیم اللہ صاحب نے جواب دیا کہ سب بُرے نہیں اچھّے بھی ہیں[11]۔ شاہ غلام علی نے شاہ علیم اللہ صاحب کی ہدایتوں پر عمل کیا اور حضرت علی کو خواب میں دیکھا اس کے متعلق یہہ اشعار ہیں:

مراقب نشستم میان قبور — دلم یافت لذّاتِ قربِ حضور

---

[11] ف ص۳۲ و ۳۳ جناب شاد 'ب' کے حوالے سے فرماتے ہیں (ملخّصاً): الٰہ آباد میں ایک ایک سرا میں مقیم ہوگئے، اپنے طور پر ریاضت کرتے رہے، اس کے بعد یہہ ارادہ کیا کہ ایک اربعین یہاں ٹھہر کر دیکھ لیں، اگر ناکام یاب ہوئے تو سجّادہ نشینی نہ کریں گے کسی جنگل کی طرف نکل جائیں گے۔ جس دن چلّہ ختم ہوا، مایوسی کے عالم میں پھاٹک پر ٹہل رہے تھے کہ "ایک بلند و بالا قامت شخص، سُرخ و سفید رنگت، ساٹھ ستّر برس کی عمر، خوبصورت چہرہ، سر میں بڑے بڑے بال، ڈاڑھی چھتری، بال کھچڑی شنجرفی کرتہ، شنجرفی تہہ بند، ننگے سر ننگے پاؤں، بغل میں رسّی سے بندھا ہوا ایک کمّل دبّا ہوا" سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آکر اُس نے اِن سے ان کا نام لے کر خطاب کیا، سرا کی کسی خالی کوٹھری میں اپنا کمّل بچھانے کا حکم دیا۔ [11] ف ص۳۳: (ملخّصاً)، رسّی کی گرہ کھول رہے تھے کہ غنودگی پیدا ہوگئی۔ سبزہ زار اور میدان لق ودق نظر آیا، ہزاروں آدمی حضرت علی کی زیارت کو جارہے تھے، یہہ بھی دوڑے۔ ایک قصر شاہانہ میں شہہ نشیں کے نیچے حضرت علی جلوہ افروز اور فرشتے مروحہ جنباں تھے۔ زیر شہہ نشیں بہت لوگ دست بستہ حاضر تھے۔ حضرت علی نے ان سے فرمایا کہ (بقیہ حاشیہ ص۲۱ پر)

مرا چشم بیدار بُد پردہ دار — بہ خوابم بہ شد پردہ از روے کار
ہماں اند کے چشم من تا غنود — بہ رویم چہ در ہاے دولت کشود
سرا پردۂ دیدم افراشتہ — حقائق شقائق درو کاشتہ
درآں مسندے فرش و بروے آں — نشستہ شہنشاہ کون و مکاں
بہ گردش ہمہ اہل دل ذرّہ دار — بہ فرمانِ آں مہر انوار بار
علیؑ ولی شمع بزم فلک — کہ پروانۂ اوست جانِ ملک
مرا بخت بیدار شد رہ نما — رسیدم من و ایستادم بہ پا
اشارت از آں ہا یکے سوے من — نمود و بہ پرسید از آمدن
ولیکن بہ ایما بہ پرسید او — کہ آوردہ چوں آمدی باز گو
جوابش بہ فرمود شاہ امم — کہ آورد ایں را علیم اللّٰہم
بہ گفت و بہ دستے کہ خیبر کشود — اشارت بہ صدر منوّر نمود
دہ و دوا ما می لقب گفت ہم — ازیں مژدہ دل گشت باغ ارم

شاہ غلام علی پر شاہ علیم اللہ کا مرتبہ آشکارا ہو گیا تو ان کے

---

غلام علی میرے فرزند کو مرشد بنا" انھوں نے عرض کیا کہ کون فرزند؟" ایک طرف ملاحظہ کرکے حضرت علی نے فرمایا "یہہ علیم اللہ شاہ"، شاہ غلام علی نے نظر جو پھیری تو ان بزرگ کو پایا جن کا کمّل کھول رہے تھے۔ انھوں نے بازو ہلا کر کہا "کمبل کھول رہا ہے یا سوتا ہے؟ .. دیکھ لیا جس کے لیے تمام حیران پھر رہا تھا؟ شاہ غلام علی نے مکرّر جو نظر کی تو وہی بزرگ تھے جنھیں بہار اور منیر میں خواب میں دیکھا تھا۔ ۵۱۳ ف صـ۳۳ و ۳۵ (ملخصاً): پاؤں پر گر پڑے، اور تا وصال ساتھ رہے۔
شاہ صاحب نے شاہ غلام علی سے کہا کہ میرا بیٹا ہدایت علی ناظم عظیم آباد ہے، میں وہیں جا رہا ہوں، شاہ غلام علی اور ہدایت علی خاں سے کمال شناسائی تھی، اور شاہ غلام علی کو اس کی پہلے سے واقفیت تھی کہ ہدایت علی کے والد ایک درویش ہیں اور مدّت سے غائب ہیں۔ یہہ سُن کر کہ وہی ہیں اور بھی خوش ہوئے۔

مرید ہو گئے[۱۱۵]:

چو شد پایۂ او بہ من آشکار — فتادم بہ خاکِ رہش سایہ وار
عقیدت کشید و سر افگندگی — بہ گوشِ دلم حلقۂ بندگی
چو گردیدم از فیض او کامیاب — رسیدم بہ کامِ دل خود شتاب

(باقی) قاضی عبدالودود

---

[۱۱۵] میں نے ن میں لکھا تھا کہ شاہ غلام علی نے بیعت کی، لیکن ن میں اس موقع پر کے ب کے اشعار نقل نہیں کیے گئے تھے۔ جو اشعار مختارالدین احمد صاحب کی یاد داشت میں ہیں ان سے قطعی طور پر اس کا ثبوت نہیں ملتا، لیکن آگے چل کر ایسا شعر ملے گا جس سے بیعت کا ثبوت ملے گا۔

# ایک بیل

چر، چر، چرچوں.. کرڑ۔کرڑ چرچوں... ن۔ن۔تیل اور گرد سے میلا چٹّا، پٹّر باندھے دُبلا مَریل سا بیل ہمیشہ سے ایک طرح کے گول گول چکّر لگاتا رہتا، وہ کہیں پر ذرا ٹھہرے بغیر بس ایک جانے ہوئے انداز سے آہستہ آہستہ گھومتا جاتا۔ سوکھے ہوئے چمڑے میں اسکی ساری پسلیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ گردش کرتے کرتے اس کے کوھلے کی ہڈّی ایک طرف خطرناک طور پر نکلی ہوئی تھی اور اس کے دوسرے جانب دھنسی ہوئی مگر نمایاں۔

پٹّر بندھا ہوا بیل چکّر لگاتا اور کولھو کے بھاری پتّھرں پر بیٹھی ہوئی تیلن ہاتھ میں ایک لکڑی لئے مسلسل گھومے جاتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر اسکے سُوکھے ہوئے ہاتھوں میں جنبش ہوتی، لیکن بَیل اِن ہلکے پُھلکے ماروں کی پرواہ نہ کرتا اور، اپنے مخصوص انداز میں بغیر کوئی تبدیلی پیدا کئے اسی طرح چلتا رہتا۔ چرچر... چرچون"۔ اور ٹھیک ویسے ہی کھُردرے پتّھروں پر بیٹھی ہوئی تیلن کے دماغ میں بھی خیالات چکر لگاتے ہوئے آنکھوں میں گھومتے رہتے۔ "کتنا اچھا تھا وہ بچارہ بیل ایک پہر رات رہے سے جو چلتا تو دو بجے دن تک چار سیر تیل دیدیتا تھا اور پھر دوسرا پھیرا۔ سارا خرچ اُسی کے دَم سے تھا گھر، باہر، کھانا پینا تلہن، چارہ، سب ہی کچھ۔ بچارا اسکھوا کا دوا دارو بھی تو اسی سے ہوا تھا۔ پر کرم کا لکھا۔ اور جو کریا کرم میں لگا تو کہاں سے اسی کے بھروسے ناسلیا کا بیاہ ہوا  برات کو کھلا پلا کر گونا میں بازو ہنسلی کان کا پھول سب ہی دیا اور پھر جو اتنے دنوں سے منوا کا باپ پلنگ پکڑے ہوئے ہے تو بیسوں قسم کی دوا اسی کے دم سے ہوتی رہی تھی۔ اور اب تو نیگوڑے کو بھر پیٹ دانہ بھی نصیب نہیں ہے دوا کہاں سے ہو "آرررر ہرٹ"۔ وہ جیسے چونک جاتی  مرنکھٹّو، کوڑھی بیل، وہ اسکی پیٹھ پر لکڑی مار کر سر کھجاتی ہوئی بڑبڑاتی۔

روز روز وہ ایک طرح سے اس کام چور بیل کے پیچھے تھک گئی تھی۔ جب وہ بیل کی آہستہ چلنے والی ٹانگوں کو دیکھتی تو جیسے اس کے سارے بدن میں آگ سی لگ جاتی"، کوڑھی دن بھر میں جو دو سیر بھی نہ پیر سکے۔ وہ بھی بیل کہلائے۔ چار کھانے والے بچّے اور ایک فالج کا مارا کھوں کھوں کرتا ہوا دمّہ کا مریض شوہر۔ اتنے لوگوں کا پیٹ وہ کہاں سے بھرتی۔ تلہن آگ کا مول ہو رہا تھا پھر بھی وہ جیسے تیسے قرض، ادھار لیکر ساری ذمہ داریاں پوری کرتی تھی۔

لیکن وہ بیل کے قدموں کو کیسے تیز کرے جب وہ اپنے پاس سے گاہک کو لوٹتا ہوا دیکھتی تو وہ تلملا تلملا کر بیل کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کو پیٹتی، اس کا جی چاہتا کہ وہ اسکی پٹّی سے بندھی ہوئی آنکھوں میں زور سے لکڑی گھونپ دے اور اس کے گلے کے زخموں کو رسّی سے خوب رگڑ رگڑ کر اسے کھینچتی ہوئی کسی گڑھے میں دھکیل آئے۔ اور اس کے بعد سامنے کی ٹھٹھر گرا کر وہ ڈھیروں ڈھیر سرسوں کی ایک ہی گھانی لگا کر بیل کی جگہ اپنی گردن پر کولھو کا جُوا اٹھا رکھے۔ اتنی زور زور سے گھومتی جائے کہ اسے اپنے گھر کی نونی لگی دیواریں، سیاہ ٹوٹی ہوئی کواڑ، کولھو کھودی ہوئی زمیں، اور پھر ٹھٹھری کی دراخوں سے تھوڑا تھوڑا دکھائی دیتا ہوا آسمان کچھ بھی نظر نہ آئے۔ جیسے وہ اپنی ماں کے گھر چکّی پیستی ہوئی گاتی جاتی تھی تو اُسے اتنا ہوش بھی نہ رہتا تھا کہ کتنے سیر پیس چکی ہے۔ بالکل اُسی طرح وہ اب بھی لہک لہک کر وہی گیت گانا چاہ رہی تھی مگر اُس نے اپنے دُبلے لٹکتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا" اسکی کلائیاں کتنی بھری ہوئی تھیں جب ان دنوں نہ تو اس کا کوئی بیٹا مرا تھا نہ بیمار شوہر کی تیمارداریاں تھیں اور نہ اس کی جان کو کھانے والے اتنے روتے اور ٹھنٹھناتے ہوئے بچّے ہی تھے۔ سکھوا کا مرجانا، منوا کے باپ کی بیماری، جوان بیٹی کا سر پر اتنا بڑا بھار اور اس پر یہ نگوڑا بیل۔"

اور بچّے تو نادان تھے لیکن ماں کے دُکھ درد کی ساتھی نینا گھر کی حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی لڑکپن سے جوانی تک اس نے چین کی گھڑیاں نہ دیکھی تھیں چوڑی اور انگوٹھیوں سے خالی، جب وہ اپنے ڈُنڈے سے ہاتھ کو دیکھتی تو اسکے دل پر ایک دھکا سا لگتا۔ لیکن اسے یہ سوچ کر تسکین ہوجاتی کہ اس نے اپنے ہاتھوں کے کڑے اپنے بیمار باپ اور مرنے والے بھائی کے لئے ہی اتارے تھے۔ بچپن کی شریر اور چنچل نینا کو جوانی کے بوجھ نے سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا، اپنی ماں کے ساتھ اسکو بھی خود سے شکایت تھی کہ وہ اتنا جلد آنکھوں پر پہاڑ کیوں بن گئی۔ اس پر پابندیاں عائد ہوچکی تھیں وہ گھر سے نکلتی تو ایک مجرم کی طرح مُنہ چھپائے سر کو جھکائے، آنکھیں چرائے، اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں گولیوں کی طرح سنسناتیں۔ مگر وہ خاموشی سے اپنے کام کئے جاتی۔ اب وہ ان باتوں کی عادی ہوچکی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ ان گنڈوں کے مُنہ نوچ لے۔ "غریب، بے نتھا، نینا" جیسے اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

ایک دن پانی سے بھنگی، کیچڑ سے لت پت۔ سرسوں کا بھرا ہوا ٹوکرہ اپنے سر پر لئے ہانپتی چلی آرہی تھی اور اس کے پیچھے جیسے بھوک کے چھچھورے کتّے۔ اپنی دموں کو ہلاتے زور

زور سے بھوک رہے تھے۔ ستیل انھیں نکال کر ڈانٹتے ہوئے بولا "اپنے گاؤں کی اِجّت اپنے ہاتھوں بگاڑتے سرم بھی نہیں آتی تمھیں"۔؟ نینا حیران تھی ایسے بھی ہوتے ہیں انسان۔ ستیل نے اسکے سر سے ٹوکرہ لے لیا وہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی بھنگی ساڑی میں سمٹی ہوئی جانے لگی۔ کئی باتیں ستیل نے اس سے راستہ میں پوچھیں مگر وہ شرمائی ہوئی آنچل کا کونا اپنے دانتوں سے دباکر خاموش رہی۔ اُس دن کے بعد سے نینا محسوس کرنے لگی کہ وہ بے آسرا نہ تھی اُسے اپنے کمزور ہاتھوں میں سہارا کے لئے ایک لاٹھی کی ضرورت تھی اور وہ اسے مل گیا تھا۔ وہ ستیل کو روزانہ کہیں نہ کہیں دیکھ ہی لیتی وہ اس سے کتنی طرح کی باتیں کرتا رہتا نینا اپنے بچپن کی باتیں بڑے شوق سے سنتی اور جب ستیل اُسے یاد دلاتا "نینا تو ہر گھڑی میرے کندھے پر سوار مجھے گھوڑا بناتی تھی بھول گئی سب! ایں"۔ تو نینا کا جی چاہتا کہ وہ اسے بتا دے کہ اسے ایسے ہی سہارے کی تو ضرورت بھی تھی۔ گھر کے کاموں سے تھک کر جب وہ اپنی اندھیری کوٹھری میں ایک پل کے لئے کمر سیدھی کرنے لگتی تو ستیل کا مسکراتا ہوا چہرہ اسکی آنکھوں میں گھوم جاتا اسوقت اُسے ساری باتیں یاد آجاتیں وہ اپنی کلائی کو مٹھی میں بھینچ کر کہتی ستیل نے اُجلے اُجلے چاندی کے کنگنے بنا دینے کو کہا ہے اور ماں کے لئے بھی ایک اچھا سا بیل لا دیگا، پھر کتنا آرام رہے گا"۔ جب وہ اپنی ماں کو پریشانیوں میں گھری روتے ہوئے دیکھتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ جلد اُسے یہ خوشخبری سنا دے کہ ستیل ایک چمکتا ہوا بیل اُسے لا دیگا، وہ اکثر تنہائیوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو تسکین دیتی "تیرے اچھے اچھے کپڑے بناویں گے اور ڈھیر سی مٹھائی بھی"۔ تو بچے اس منہ چڑا کر بھاگ جاتے "دور جھوٹی"۔ کنگنے۔ کپڑے، بیل، اور بہت ساری چیزیں نینا پہروں اپنے دل کے ویران گوشوں کو جوانی کی انہی رنگین و پرکیف مگر نا قابل اعتبار اور سرسری باتوں سے آباد کئے رہتی، اس کے تصور میں اس کی زندگی ہر روز نت نئی بہاریں لے کر آتی۔

نینا کی ماں جب بیل کی ہڈیوں کو بری طرح پیٹ چکتی تو اس کا دل تھوڑی دیر کے لئے پچھتاتا "بچارہ بُرا یا بھلا، گھر چالو تو یہی ہے نا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے جب یہ نہ تھا تو کیسے کیسے کٹھن وقت ان پر گذرے تھے۔ یہی رام لال بنیا جو آج اس بیل کو دیکھ کے ادھار بھی دیتا ہے کیسا دیدہ بدل کر کہتا تھا کس برتے پر دیں تجھے"۔

وہ روز منوا کے باپ کو اُمید دلاتی ذرا دم لے گرمی کھلا کھلا کر ٹھیک کر دین گے" ابھی تو بیل نیا تھا کیا جانے بچارہ کو تھوڑ اور وہ گرمئی، جڑی بوٹیوں کی ایک طویل فہرست

اسکی ساری خصوصیت کے ساتھ بڑی تیزی سے بتاتی جاتی۔ بچارہ منوا کا باپ جھلنگا چارپائی پر پڑا اپنے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے ہوئے کھوں کھوں کرتا ہوا مشکلوں سے کہتا "پہلے اپنے بیل کو کھلا پلا لے نینا کی ماں، بس ہڈی چمڑا ہے کھالی"۔ کھانسی سے بے دم چتوا تیلی بھر منہ پیلے پیلے بلغم سامنے کی دیوار پر پھینک کر زبان چاٹتے ہوئے شاباشی کے طور پر اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے نینا کی ماں کو تکتا ہوا کہتا کہ اب تک یہ اسی کا جگر تھا جو گھر باہر لڑکے بالے سنبھالے ہوئے تھی لیکن جہاں اس نے اتنے کام کئے تھے وہاں بچارے چتوا کی یہ انتہائی تمنا تھی کہ وہ ذرا اور ہمت دکھا کر بیل کے قرض کو بھی اُتار دے۔ مگر نینا کی ماں تڑپ جاتی۔ اسی کا دل جانتا تھا کہ ایک ایک گھڑی اس پر کیسی بیتی ہے۔ تلہن کے کئی روپے اب تک اس پر گر چکے تھے۔ پھر قرض کا سُود الگ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیٹ کی خاطر اپنی بیاہی ہوئی بیٹی کی چیز گروں رکھی تھی۔ اگر اس کا اپنا بازو قرضے میں بک بھی جاتا تو اسے اتنی پریشانی نہ ہوتی بچاری اپنے پیٹ کی بیٹی تھی جب ہی نہ سسرال سے اپنا بازو چرا کر دے گئی کہ جب تیل کا دام نکلنے لگے تو وہ اُسے چھڑا دے گی۔ چھ مہینے بیت گئے اور اس روگی بیل کے دَم سے ایک پیسہ کا بھی آسرا نہ تھا۔ مگر پھر بھی آیندہ کے سہارے ہر روز کتری کے بھاری بھاری پتھروں پر بیٹھی ہوئی وہ سوچتی۔ کوڑے کا دن بھی بارہ برس پر پھرتا ہے۔ سلیا کا بازو چھڑانے کے بعد وہ ایک اور بیل لے گی اور جب دو بیل دن دن بھر چلیں گے تب تو بس تیل ہی تیل رہے گا۔

"چاچی، اب چاچا کا جی کیسا ہے" وہ یکا یک ایسے چونک پڑی جیسے تیل کے بھرے ہوئے کنستر ٹھوکر لگ کر بہہ رہے ہوں۔

کون! ستیل؟۔ آ بیٹیا! کل کتنی گھڑی توں آیا تھا؟ ہم نا دیکھا۔ تیرے یہی منوا بولا توں آکر لوٹ گیا"۔

"ہاں چاچی کچھ کام تھا تیرے سے" وہ کھسیانا ہو کر ادھر اُدھر تاکنے لگا۔ ستیل سر جھکائے مغموم رُک رُک کر باتیں کرنے لگا۔

پانی برسنے لگا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے بعض کھیت ایسے ہی بیکار پڑے تھے دنیا اتنی مہنگی ہو رہی تھی اور اس پر ٹھیک جتائی کے دنوں اس کا ایک بیل بُری طرح بیمار پڑا تھا۔ اب ایک بیل سے کیا ہو، جب دوسرا انہیں ملے تب نہ بس یہی دو چار دنوں کی ضرورت تھی۔

نینا کی ماں اس کی باتوں کا مطلب سمجھ گئی لگی۔ اس سے بھی کوئی بہانا تھا

لیکن ایسا کوڑھی نکما بیل بھی دنیا میں نہ ہوگا جو بیسر چلانے کا نام تک نہ جانے اور پھر بچارہ چلتا بھی کیا بارہ روپے کا بیل بھی کہیں کولھو میں چلتا ہے۔

"اچھا لادے ہم چالو کرلاویں" نینا کی ماں کا جی چاہا کہ وہ زور سے اس سے کہدے کہ "ہم نہیں دینگے" لیکن اُسے یاد آگیا ایسے ہی۔ رام داس کو جو اس نے بیل نہیں دیا تھا تو اس کے سراپ سے وہ بچارہ ایک مہینہ بھی کولھو میں نہ جتا ہوگا کہ مر گیا، وہ ڈری اگر وہ آج بھی نہ دے تو پھر کہیں یہ زندگی کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا تو کیا ہوگا ؟

جب ستیل بیل کھول کرلے جانے لگا تو نینا کی ماں نے پکار کر کہا" جرا اسے کھلا پلا لینا ستیل سبیرے بھکا ہے" مگر یہی کہدینے سے اس کے دل کو تسلی نہ ہوئی اس کا جی اندر سے گھبرا رہا تھا۔ "جانے ستیل کے کتنے کھیت آج جتائیں گے بچارہ اپنے تو مرہا" وہ اس بُرے شگون کے خیال سے کانپ گئی اس نے سوچا اب ہریالی ہو رہی ہے میرا بیل کھا کھا کر مٹا جائے گا۔

سورج ڈوبے ستیل کے چھوٹے بھائی چندو نے بیل لاکر باندھ دیا، آج پہلی بار نینا کی ماں اس کے لئے بچین رہی تھی اس نے بیل کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا" کہاں نیوتا کھائے گیا تھا ہیروا؟ کیسا سُنا سُنا گھر لگتا تھا تیرے بنا۔ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی انگلیوں میں چھین لگ گئے وہ چونک پڑی، بیل لڑکھڑا کر گرا وہ باری باری اس کے پیروں کو اٹھا کر دیکھنے لگی کہیں کانٹا نہ چبھ گیا ہو۔ بیل ہانپتا ہوا اپنے پاؤں پھیلا کر تڑپنے لگا اس کے منہ سے اُجلے اُجلے جھاگ نکل رہے تھے اس کی گردن کا زخم خون سے لت پت ہو رہا تھا اور انتہائی تکلیف سے اُس کی آنکھیں کھل کھل کر بند ہوئی جارہی تھیں، نینا کی ماں اپنی اُمیدوں کا آخری دیا بجھتے ہوئے نہ دیکھ سکی، وہ روتی ستیل کے گھر گئی وہ گھر پر نہ تھا اُس نے چیخ کر سارے محلّے میں فریاد کی وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہی تھی اُس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اس کے گلے کی تمام رگیں تن گئیں اور وہ اپنے بدن کا سارا زور لگا کر گالیاں دے رہی تھی" منڈی کاٹا، حرمجادہ، تیرا بھی کہاں نکلے گا رے اگر یب دُکھیا کو ستاکے تو کہاں جاگا"؟ وہ مسلسل گالی اور کوسوں سے اپنے دل کا بھڑاس نکال رہی تھی۔

چندو کی تیز زبان شعلے برسانے لگی۔ جبان سنبھال کے بول، نہیں تو ٹھیک کردینگے" وہ کہنے لگا شاید اس پوری بستی میں نینا کی ماں جیسی بھی کوئی قصائن نہ ہوگی جس نے

۔ لی بیل کو کولھو میں جوت جوت کے آخر جان ہی لے لی اس کی۔ اور اب شرم کرنے کی جگہ اپنا الزام دوسرے کے سر تھوپ رہی ہے وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر بولا کہ بھلا ایک دن کی محنت سے بھی کہیں بیل مر سکتا تھا۔ نینا کی ماں تڑپ گئی وہ تلملا کر بولی" نا رے چندوا ہمرا بیل اچھا تھا توں ہی مار ڈالے"۔ وہ بین کر کر کے رونے لگی، چراغ بتی کے وقت اپنے گھر یہ رونا دھونا چندو کیسے گوارہ کر سکتا تھا' وہ اسے دھمکاتا ہوا پکڑے پکڑے گلی کے نکڑ تک چھوڑ آیا۔ جب وہ گھر پہونچی تو بیل مر چکا تھا وہ زور زور سے سینہ پیٹ کے رونے لگی۔ آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے اس نے دور سے سنیل کو دیکھا وہ لڑکھڑاتی ہوئی وہاں تک آئی اس کی آواز بیٹھ چکی تھی، اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پیر پکڑ لئے وہ روتے ہوئے بولی "تیرا کا کیا تھا سنیل"۔ سنیل منہ میں انگلی دبائے چپ کھڑا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا" نینا کا گھر اس نے اپنے ہاتھوں کیوں اجاڑ دیا، کیسی ساعت میں وہ بیل لے کر چلا تھا، زمیں بلا سے پڑی رہتی ایسے ہی، بنجر کھیت ہرا ہوگا پودے لہلہائیں گے کھیتی ہوگی۔ لیکن نینا کا دل اس نے مٹی کے ڈھیلوں کی طرح ہمیشہ کے لئے چور چور کر دیا تا اور اب اس کے باپ کو کیا پڑی تھی جو اس کی دل دہی کے لئے نینا کو ئی بیل دیدیتا اور وہ بیچارہ اگر چاہے تو کیا کر سکتا تھا دو ہی بیلوں کے سہارے اسے بھی اتنی بڑی زندگی کھینچنی تھی' جس میں سے ایک بیل تو بیمار ہی تھا' اسے تو خود ہی دوسروں کا آسرا ہوتا۔ سنیل کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دنیا کے حسین سے حسین بیل نینا کے قدموں پر لا کر ڈال دے اس نے ماں سے لگی سسکتی ہوئی نینا کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں مجبوری و حسرت کے آنسو بھر گئے نینا کی مایوس نگاہیں، سنیل کے چہرے پر گئیں' ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا روح اور جسم تاریکیوں میں ڈوب چکے تھے۔ تمنائیں گھٹ رہی تھیں سہارے مٹ رہے تھے اور بے آس سسکیوں میں کبھی کبھی زور سے امیدیں ہچکیاں لے کر دم توڑ رہی تھیں۔ نینا اپنے آنسوؤں کے قطروں میں چوڑیاں، کنگنے، اور چمکتے ہوئے چکنے چکنے بیل، ابھر ابھر کر مٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

شکیلہ اختر

# سارنگی

عرصہ ہوا کہ ایک روز شام کے وقت شفق کی رنگین چھاؤں میں گشت لگانے کی غرض سے نکلا اثنائے راہ میں ایک دوکان کے پاس ٹھٹک گیا، سائن بورڈ پر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ یہ مادام مانشابل کی ملکیت ہے۔ موصوفہ کی ایک نوجوان کافر ادا لڑکی بھی تھی۔ چھریرے بدن کی ایک بلند و بالا مخلوق جس کے اعضا کا تناسب، رنگ کی شگفتگی اور چہرے کی شادابی بہت سے زندہ دل حضرات کو دعوت نظارہ دے چکی تھی، لیکن مادام بذات خود شباب کی بہاریں ختم کر چکی تھیں۔ قوی الجثہ پیشانی پر دو بڑی بڑی شکنیں۔ رخسار ابھرے ہوئے جن کی عمر کے متعلق اگر کوئی قیاس آرائی کی بھی جائے تو پچاس سال سے کم نہ ٹھہرے۔

بہرکیف آج نہ میں اس حسینہ کے شباب کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے آیا تھا اور نہ محترمہ کی جوانی کی حسرت آگیں یاد کو تازہ کرنے، مجھے دوکان سے ایک دست بند خریدنا تھا۔ اس جستجو میں دوکان کا ایک نیم نگاہانہ جائزہ لے رہا تھا کہ یکایک میری نظر ایک پرانی وضع کی سارنگی پر جا پڑی۔

"ماشاءاللہ آپ آلات موسیقی بھی فروخت کرتی ہیں، یہ تو سونے پر سہاگہ۔ ہاں.... شاید آپ مسٹر پلوک کو کوئی تحفہ بھی پیش کرنے والی ہیں"

"نہیں جناب، بالکل نہیں، میں اس قسم کی عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی لڑکیوں کے لئے مردوں پر کوئی خارجی اثر ڈالتی ہیں، میں اپنی لڑکی کی قدر و قیمت جانتی ہوں اور اس روز سعید کا انتظار کر رہی ہوں جب اس کا حسن و شباب اسے ایک بلند جگہ پہونچا دے گا جس کی واقعی وہ مستحق ہے۔ ــــ وہ سارنگی ایک کار خیر کی یادگار ہے جسے میں نے انجام دینے کی کوشش کی تھی"

"کار خیر!" میں استعجاب سے ان کا منہ تکنے لگا نہ معلوم کیوں۔ مادام مانشابل اور کار خیر میں دور کا بھی واسطہ بعید از قیاس تھا" لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی اور میں آپ سے قسم کھا سکتی ہوں کہ اس کار خیر کو دہرانے کی کوشش نہ کروں گی ــــ آپ کے خیال میں اس سارنگی کی کیا قیمت ہوگی؟"

میں نے اس کو ہاتھ میں اٹھا لیا، نہایت غیر دلچسپ، بالکل بچوں کا کھلونا۔ میں نے بلا پس و پیش جواب دیا کہ اس کی قیمت بارہ فرانک سے زیادہ نہیں۔

"اور چار سو فرانک اس کی لاگت ہے" مادام نے جواب دیا۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں... لیکن موٹے موٹے شیشے والی عینک کے نیچے مادام کی

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے اور چہرہ سُرخ ہو رہا تھا ــ میں بہت زیادہ رقیق القلب واقع ہوا ہوں۔ عورتوں کے آنسوئے بہانے پر مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے ــ میں سراسیمہ سا ہو گیا۔ دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ عالم بدحواسی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ "معاف فرمائیں ... اگر زحمت نہ ہو تو اس واقعہ کی تفصیل مجھے بھی سنائیں" میں بہت دشواری سے یہ الفاظ ادا کر سکا، میری زبان سوکھ رہی تھی۔

اس نے اک آہ سرد بھری، نظروں کو اک عالم حسرت میں آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر زمین کی طرف تکنے لگی ــ "آپ میرے ان زخموں پر جو مندمل ہو رہے تھے ایک بار پھر نمک پاشی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن صرف آپ کی خاطر کہے دیتی ہوں۔ جاڑے کا سرد موسم تھا پو پھٹ رہی تھی، افق پر کہرا بہت زیادہ تھا۔ میری لڑکی ناشتہ کر چکی تھی اور اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ میں شیشہ کے برتنوں کی گرد صاف کر رہی تھی ــ گرد صاف کرنا۔ اُف، میں ہی ایک عورت ہوں جو اس فن کو حقیقی معنوں میں سمجھتی ہے، یہ بہت دشوار فن ہے۔ یہ سکھلایا نہیں جاتا، یہ بتلایا نہیں جاتا ــ یہ خدا کی دین ہے جو سب لوگوں کو تفویض نہیں کی جاتی ــ میری سہیلی دیکھئے، بالکل میری لڑکی کی سبک خرامی جیسی ہے، اس کی رفتار کتنی سبک ہے جناب؟"

"ہاں بالکل جیسے پھولوں پر شبنم، جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے" میں نے جواب دیا، مادام کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں "ہاں تو اتنے میں ایک بھکارن پہونچی ــ کمسن، حسین، معصوم، لٹی ہوئی زلفیں، پیشانی پر عسرت کی شکنیں، چہرے پر غبار، اور جا بجا دھبے ــ کاش عالم شباب میں جوان عورتیں اپنی اٹھتی جوانی کی قدر کریں" اس کے لہجے میں کپکپی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے لٹی ہوئی بہار کی حسرت آگیں یاد ستا رہی ہے ــ "ہاں تو وہ دوکان میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں سارنگی تھی ــ کچھ مانگ رہی تھی۔ لیکن شروع ہی سے میرا یہ اصول ہے کہ اجنبی بھکاری کو کچھ نہیں دیتی بلکہ اسے بھی جیسے میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ لڑکی رونے لگی ــ "دیا کیجیے مادام، ماں نے آج دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے۔ صبح کے وقت جب سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم زیادہ رہتا ہے تو میں گاتی ہوں۔ کچھ پیسے مل جاتے ہیں، یاد رکھیے میں دوپہر کے بعد آپ کے پیسے واپس کر دوں گی۔ میں بغیر ساز کے بھی گا سکتی ہوں مری سارنگی گرو رکھ لیجیے اور مجھے صرف بیس سو عنایت فرمائیے، یہ اگلے زمانہ کی ایک بے بہا یادگار ہے میرے پردادا کے مصرف میں تھی میرے لئے اس کے سامنے دولت کونین بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی آپ اسے رکھیں، خدارا۔" بہر کیف میں نے اسے رکھ لیا اور اتنی رقم اس کے حوالہ کی"

"لیکن مادام آپ نے فرمایا تھا چار سو فرانک لگے..." میں نے کچھ بے صبری سے پوچھا۔

"آپ گھبرائیں نہیں میں ساری باتیں بالتفصیل کہہ رہی ہوں۔ تو وہ چلی گئی۔ دو ہی گھنٹے کے بعد ایک شخص تشریف لائے، وضع و قطع نہایت شریفانہ، چہرے پر جلال و وقار، گفتگو سے شکوہ و تدبر آشکار انہوں نے پہلے تو کچھ پرانی تصویریں اور مجسمے دیکھے اور بہت تعریف کی پھر اس سارنگی پر کمال اشتیاق سے لپکے، ہاتھوں میں اٹھا لیا، کچھ دیر تک نہایت غور سے دیکھتے رہے اور فرمایا کہ یہ اصلی stradivarius ہے۔

"غیر ممکن" میں (مادام) نے کہا۔ "مجھے پانچ سو فرانک میں دیدیجیے"

اتنی بڑی رقم کے تصور ہی نے مجھے متعجب کردیا۔ "لیکن یہ مری چیز نہیں ہے۔ ایک ماہر موسیقی اسے یہاں رکھ گیا ہے۔ وہ اسے فروخت کرنا نہیں چاہتا، کہتا تھا کہ یہ چیز اسے اپنے پردادا سے ورثہ میں ملی ہے... پھر بھی.. وہ حاجتمند معلوم ہوتا ہے۔ خیر میں اس کا نظم کردوں گی"

"مادام خدا کیلئے اس نایاب چیز کو پانچ سو فرانک میں مجھے دلوا دیجئے میں آپ کو دو سو فرانک کمیشن دوں گا"

"بہت بہتر جناب آپ سہ پہر کو تشریف لائیں۔ میں اس سے باتیں کروں گی" دوپہر کے وقت وہ ماہر موسیقی واپس آئی اور میرے بیس سو میرے حوالے کئے" دیکھا آپ نے، شرافت میرا ایمان ہے، میں آپ کی بہت مشکور ہوں، اب میری سارنگی واپس دیجئے، خدا آپ کو خوش رکھے"

کمسن بھکارن لجاجت آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔ "میری بچی، میں تمہیں ایک خوش خبری سنانے والی ہوں، میں ایک متمول شخص کو جانتی ہوں جو تمہیں اس سارنگی کے عوض تین سو فرانک دینگے"۔

"معاف کیجئے مادام آپ نے پانچ سو فرانک کا ذکر کیا تھا،" مجھ سے پھر نہ رہا گیا۔

"اُف... لیکن تین سو فرانک اس بھکارن کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جو چھپر پھاڑ کے مل رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس رقم پر پھولے نہ سمائے گی۔ لیکن خلاف توقع اس نے بالکل توجہ نہ کی۔ کہنے لگی کہ یہ میرے پردادا کی نشانی ہے اور مری جان سے زیادہ عزیز۔ مجبوراً چھاتی پر پتھر رکھ کر میں چار سو فرانک تک بڑھی۔ آخر کار وہ راضی ہوگئی اور میں نے سارنگی خرید لی۔

جناب سارا واقعہ ایک حیرت انگیز فریب تھا۔ وہ جلال و وقار، شکوہ و تدبر والی ہستی ایک مشہور چور اور وہ چڑیل بھکارن اس کی شریک کار تھی۔ آج تک دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں اور یہ سارنگی میری چھاتی پر پتھر کی طرح دھری ہے"۔

(ترجمہ) محمد زبیر انصاری

# راسخ کا غیر مطبوعہ کلام

راقم کی فرمائش سے شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم نے دیوان راسخ کی ترتیب شروع کی تھی، لیکن، وہ ابھی اس کے ابتدائی مراحل بھی طے نہ کر سکے تھے کہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ذیل کے اشعار ان کی بیاض سے ماخوذ ہیں، انھوں نے دیوان راسخ کے غالبًا اس نسخے سے نقل کیے تھے جو خود راسخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور میں موجود ہے۔ ق۔ع۔د۔

قطعہ

میں نے افراطِ غم عالم کی پوچھی جو ہیں بات — رعد نے نالے کیے، ابرِ تر رویا کیا
برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے — کچھ کہا اُس نے نہ، لیکن اک تبسّم سا کیا

قطعہ

رہ نہ مصروفِ طرب ہر دم کہ ہے عبرت کی جا — شادیِ پُر اندک و غم ہائے بسیارِ جہاں
غم بہ قدر گریۂ ابرِ تر و فریادِ رعد — شادی اے دل اک تبسّم برق کا ہے بے گماں

تو اپنے صدمہ کشِ ہجر کا نہ پوچھ احوال — قریب ہے کہ اب احوال ہی دگرگوں ہو
کسی کو چاہتے ہو ان دنوں مگر راسخ — کوئی سبب تو ہے صاحب جو ایسے محزوں ہو

کھل جائے نہ اسرارِ محبت کہیں راسخ — باندھا نہ کرو رونے کا تم تار ہمیشہ

یوں تو معشوق بہت اپنی نظر سے گزرے — پر انھوں میں سے کوئی تیرا نہ ہمتا دیکھا
قابلِ سیر ہے اے ہم نفساں شہرِ خیال — خوب دیکھا تو کوئی شہر نہ ایسا دیکھا
طول و عرض اس کا خدا جانے کہ کتنا ہوگا — جس کے اک گوشے میں کونین مہیّا دیکھا
قید سے نسبتِ اطلاق کی بھی باہر ہے — ذات کو اُس کی غرض سب سے مبرّا دیکھا

گئے وہ دن کہ صحبت گرم اُس سے اے عزیزاں تھی — اثر پر اپنے آہِ سرد اپنی سخت نازاں تھی
نہ تھا ہم راہِ نعشِ راسخِ مہجور کوئی ہائے — مگر اک حسرتِ وصل آگے آگے سو پریشاں تھی

ہر شب یہ روشنی ہے مرے دل کے داغ کی — ہم سائے کو بھی کچھ نہیں حاجت چراغ کی

اے کہ باشند گدا پیشِ تو سلطانے چند — نگہے جانبِ ما بے سر و سامانے چند
پس ترست از من وحشت زدہ مجنوں صد دشت — ہست جولانِ تو ہم آں سوئے بیابانے چند
دارد از تیر بہ پہلوئے خود آہوئے حرم — جملہ تن زخم و لے سفتہ بہ پیکانے چند
چوں تصاویر ز خود بے خبر و محوِ تو اند — چہ شود گر نگہی جانبِ حیرانے چند
ما طرب را نہ شناسیم کہ اوقاتِ عزیز — صرف کردیم بہ ضبطِ غمِ پنہانے چند
کو مرا جرأتِ گفتار کہ پیش راسخ — گوییم احوالِ دلِ خستہ بہ عنوانے چند

# جنگ نامہ - ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

اورنگ زیب عالمگیر کے پرپوتے اور شاہزادہ عظیم الشان ابن شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے دوسرے بیٹے فرخ سیر کو صوبہ بہار سے ایک خاص تعلق ہے۔ صوبہ کا صدر مقام پٹنہ اس کے باپ کے نام پر آج بھی عظیم آباد مشہور ہے۔ تاریخ کے صفحات بعض عمارتوں کے کتبے[1] اور چند فرامین و اسناد کی شہادت ان ایام کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جب شاہزادہ فرخ سیر باپ کا حکمنامہ پاکر اوائل[2] ۱۱۲۳ھ میں بنگال سے جانب بہار عازم سفر ہوا۔ راستے میں شہنشاہ کی خبر وفات سُنی، عظیم آباد کے مشہور باغ جعفر خاں میں خیمہ زن ہو کر خاطر خواہ مواقع کا انتظار کرنے لگا یہاں تک کہ اب و اعمام کی جنگ عظیم الشان کی شکست اور دریائے راوی میں غرقیابی سب سے بڑے اور نااہل چچا معزالدین جہاندار کے ہاتھوں بقیہ دو چچاؤں کی شکست و قتل بڑے بھائی عبدالکریم کی گرفتاری اور موت کے حسرت ناک واقعات سنے پھر خود اس کی گرفتاری کے احکام کے صدور کی وحشت خیز خبریں پہونچیں باپ کے متوسلین کی احسان ناشناسی اپنی بے بسی تنگدستی اور لاچاری کے احساس نے سارے حوصلے پست کردئے۔ خودکشی پر آمادہ ہو گیا۔ بالآخر اس کی شیر دل کشمیرزا مادر محترمہ صاحبہ بیگم کے ہمت آفریں الفاظ اور پُر اثر کوششیں رنگ لائیں، ایک سیدہ محترمہ کی سفارش اور فرخ سیر کی ننھی بچی کی معصوم نگاہیں اور توتلی زبان میں التجائیں بہار کے زبردست اور ہر دلعزیز ناظم سید حسین علیخاں بارہہ کے جذبہ سکراہ و کنارہ کشی پر غالب آئیں۔ اپنے مفلس و مجبور محسن زادہ کی اعانت پر کمر بستہ ہو گیا۔ فرخ سیر باغ افضل خاں میں جلوس کیا تخت پر بیٹھا خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا فوجیں جمع کی جانے لگیں مہاجنوں اور متمول حضرات کے کیسے خالی ہونے لگے سید عبداللہ خاں ناظم الہ آباد نے پہلے تو اپنے چھوٹے بھائی حسین علیخاں کو اس امر اہم سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب موخر الذکر کا ارادہ اٹل اور غیر متزلزل پایا اور جہاندار شاہ کی غیر مدبرانہ کاروائیاں اس کے عزل سید راجی خاں مانکپوری کے صوبیداری الہ باد پر تقرر اور سید عبدالغفار خاں کی اس کے خلاف مہم کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ بھی فرخ سیر کے لئے سرفروشی پر آمادہ ہو گیا عبدالغفار خاں کو ار بھگایا۔ شاہزادہ اعزالدین کا راستہ روکا بنگال کے مرسلہ خزانہ کو اپنے قبضہ میں کیا اور فرخ سیر اور حسین علی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ۱۷ر شعبان ۱۱۲۴ھ کو فرخ سیر کا پیش خیمہ پٹنہ سے روانہ ہوا اور چار روز بعد اس نے خود بھی تقریبًا ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ شہر کو چھوڑا۔ داناپور سہسرام مغل سرائے ہوتا ہوا بنارس کے نزدیک دریائے گنگا کے اس پار نماز عید ادا کی پھر آگے بڑھا ۶ر شوال ۱۱۲۴ھ کو جھوسی میں عبداللہ خاں نے شرف قدمبوسی حاصل کیا اس اثنا میں

جہاندار شاہ کا بیٹا اعزالدین خواجہ حسین خاں دوران اور لطف اللہ خاں صادق کے ساتھ بڑھکر کھجوہ میں خیمہ زن ہوگیا تھا۔ اکثر امراء اور عمائدین اس سے ٹوٹ کر فرخ سیر کی فوج میں شامل ہونے لگے جمیعت بڑھتی گئی۔ معزالدین نے خوف زدہ ہوکر معمولی جھڑپ کے بعد اکبر آباد کیطرف مراجعت کی بالاخر خود جہاندار شاہ ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا ۱۳ ارذی حجہ ۱۱۲۴ھ کو آگرہ کے نزدیک فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے درمیان جنگ عظیم واقع ہوئی موخرالذکر نے شکست کھائی اور فرخ سیر شہنشاہ ہندوستان ہوا بہار کے وسائل کی بدولت ایک کمزور شاہزادہ تخت دہلی کا مالک ہوا۔

فرخ سیر و جہاندار شاہ کی اس جنگ کا اجمالی حال مورخین بالخصوص غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین خفی خاں صاحب منتخب اللباب کاموار خاں صاحب تذکرۂ سلاطین چغتائیہ مبارک اللہ واضح معتمد خاں صاحب عبرت نامہ نے حوالہ قلم کیا ہے۔ شیو داس لکھنوی مصنف اقبالنامہ فرخ سیر یا منور الکلام نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ محمد حسن ایجاد کی ہفت سالہ منظوم تاریخ راقم السطور کی نظر سے نہیں گذری۔ ناظم خاں فارغ اور ملا دانائی کشمیری کی منظوم تاریخ جو بقول بندرابن داس خوشگو خود فرخ سیر کے ایما پر تصنیف ہوئی مفقود ہے۔ البتہ آنجہانی مسٹر ولیم اروِن نے اپنی قابل قدر مشہور تاریخ متاخرین مغل جلد اول میں متعدد فارسی تاریخوں کا نچوڑ اس مبحث پر جمع کر دیا ہے۔ جس وقت یہہ کتاب جرنل ایشیاٹک سوسائٹی میں بالاقساط شائع ہو رہی تھی۔ مسٹر موصوف کے منشی مولوی عبدالعزیز متوطن بھنیری نے بابو ہرشن چندر ساکن محلہ چوکھمبہ شہر بنارس کی مملوکہ نایاب ہندی منظوم کتاب جنگنامہ مصنفہ مرلی دھر عرف سری دھر کا نسخہ اپنے ہموطن بابو رادھا کرشن داس کی وساطت سے حاصل کیا مسٹر اروِن نے اس کتاب کا جس کے صفحات کی تعداد ۶۶ اور اشعار تقریبًا سولہ سو تھے تقریبًا نصف حصہ انتخاب کرکے انگریزی ترجمہ اور چند ضروری اشارات کے ساتھ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۰ء میں شایع کر دیا چار سال بعد ۱۹۰۴ء میں سری رادھا کرشن داس اور بابو کشوری لال گوسوامی نے اس کتاب کا مکمل نسخہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کیطرف سے طبع کرایا شاید ہندی داں طبقہ میں یہہ کتاب مقبول نہیں ہوئی اس لئے کہ کوشش سے بھی اب اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ کسی کتبخانہ میں نہیں ملتا۔ راقم السطور پروفیسر ڈاکٹر ایشوردت صدر شعبہ ہندی پٹنہ کالج کا نہایت شکر گذار ہے کہ موصوف کی کوشش سے اس کتاب کا تنہا نسخہ ناگری پرچارنی سبھا سے چند روز کے لئے مستعار ملا۔ ناچیز کو اپنے عزیز شاگرد بابو جوگندر مصر بی۔ اے کی مدد سے اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملا مصر جی ایک ہونہار اور نہایت لائق شخص ہیں بغیر انکی اعانت کے یہہ ناچیز مقالہ جس میں جنگنامہ کے مصنف اور کتاب کی خصوصیات۔ تاریخی اور لسانی۔ کے متعلق ناظرین رسالہ معاصر کی خدمت میں چند

امور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معرض ظہور میں نہیں آسکتا تھا۔ مسٹر جوگندر مصر کا ناچیز نہایت ممنون ہے۔

مشہور مستشرق اور ماہر السنہ مسٹر گریرسن اور آج سے ۱۲۰ سال قبل (۱۸۰۷) ہندی تذکرہ نگار صاحب "شیو سنگھ سروج" مرلی دھر اور "شری دھر" کی تصنیف کبی ونود کا ذکر کرتے ہیں اور اوّل ذکر ان کو دو مختلف شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان دونوں کی متفقہ کوشش جنگنامہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ مسٹر گریرسن نے شاعر کا زمانہ ۱۶۸۳ء(۲) یعنی جنگنامہ کے صحیح سن تصنیف ۱۷۱۳ء سے ۳۰ برس پہلے بتا کر ایک اور زبردست ٹھوکر کھائی ہے اس کا خارجی ثبوت مسٹر ولیم ارون کے محولہ بالا اشارات اور بابو کرشن داس کے دیباچہ میں موجود ہے داخلی شہادت آئندہ پیش کیجائے گی۔ مصرا برادران نے جنہوں نے ہندی شعرا اور مصنفین کا ضخیم تذکرہ "مصر بندھو ونود" چار جلدوں میں لکھا ہے اس ضمن میں اندھی تقلید و انتشار کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے چھ عدد شاعروں کا جنکا نام سری دھر تھا تذکرہ کیا ہے۔ جلد دوم صفحہ ۵۷۲ میں مرلی دھر اُپنام (عرف) مرلی کی تاریخ پیدائش سمبت ۱۷۴۰ دور شاعری ۱۷۷۰ اور کتابوں کے نام جن میں ایک ۱۸۱۴ میں تمام ہوئی بتلائے ہیں یہہ بھی لکھا ہے کہ اس مرلی دھر نے سری دھر کے ساتھ "رس ونود" نامی کتاب تصنیف کی۔ صفحہ ۴۰۵ میں سری دھر مرلی دھر نام کا حال بابو رادھا کرشن داس کے مطبوعہ ہندی نسخہ جنگنامہ کے حوالے سے لکھا ہے فرماتے ہیں کہ "اس کتاب کے بھومیکا (دیباچہ) سے جان پڑتا ہے کہ بابو رادھا کرشن داس نے ان کا جنم کال (سن پیدائش) سمبت ۱۷۳۷ کے لگ بھگ مانا ہے"۔ ساری کتاب اور اس کے دیباچہ کو دیکھ جایئے ایک جگہ بھی تاریخ پیدائش اور ۱۷۳۷ کیطرف اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اس کتاب کے صفحہ ۵۱۳ میں مصرا برادران گہر افشاں ہیں کہ ایک کبی (شاعر) سری دھر نے مرلی دھر کے ساتھ "کبی ونود" ۱۷۴۰ میں تصنیف کی۔ "ہندی تنقید پر ایک نظر" اس مقالہ کا موضوع نہیں ورنہ کلیم الدین احمد صاحب کے سخت مگر جائز اعتراضات جو اُردو تذکرہ نگاروں اور نقاد پر کیے گئے ہندی نواز حضرات کی خدمت میں بھی پیش کیے جاتے۔ یہاں بھی ویسی ہی "پراگندگی" اور "لغو و لایعنی بکواس" کی اکثر مثالیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نقاد اور تذکرہ نگار مصنفین اور شعرا کا حال قلمبند کرنے اور ان کے کلام کا جائزہ لینے کے لئے انکی کتابوں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے لکیر کے فقیر ہیں۔ متقدمین نے جو کچھ لکھدیا اس پر آمنّا صدقنا کہنے کے لئے مجبور ہیں۔

بہرکیف اب ہم ایک موجودہ دور کے مستند ادیب رام چندر شکل جی کی مشہور اور ہر دلعزیز تصنیف "ہندی ساہت کا اتہاس" کے بیان پر نظر کرتے ہیں۔ شکل جی اس کتاب کے صفحات ۲۲۵، ۲۲۴ میں رقمطراز ہیں "سری دھر پریاگ (الہ آباد) کے رہنے والے برہمن تھے اور سمبت ۱۷۳۷ کے لگ بھگ

ادت پن (پیدا) ہوئے تھے (اگرچہ ابھی تک ان کا "جنگنامہ" ہی پرکاشت (شائع) ہوا ہے جس میں فرخ سیر اور جہاندار کے جودھ (جنگ) کا ورنن (بیان) ہے پرسورگی (آنجہانی) بابو رادھا کرشن داس نے ان کے بنائے کئی ریتی گرنتھوں (کتابوں) کا اویکھ کیا ہے جیسے نائکا بھید - چتر کاویہ آدی (وغیرہ) ان کا کبتا کال (دور شاعری) سمبت ۱۷۶۰ کے آگے مانا جاسکتا ہے" آگے چل کر صفحہ ۲۹،۰۹۸ میں تحریر فرماتے ہیں" سری دھر یا مرلی دھر پریاگ کے رہنے والے تھے انھوں نے کئی پشتکیں (کتابیں) لکھیں اور بہت سی پھوٹکل (متفرق) کبتا بنائی - سنگیت کی پستک - نائکا بھید - جین منتوں کے چرتر کرشن لیلا کے پھوٹکل پد (متفرق اشعار) چتر کاویہ (کے علاوہ) انھوں نے جنگنامہ ناٹک (نامی) ایک ایتہاسک پربندھ کاویہ (تاریخی بیانیہ نظم) جس میں فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے جودھ کا ورنن ہے - (لکھی) اس چھوٹی سی پستک میں سینا (فوج) کی چڑھائی ساج (ساز) سامان آدمی (وغیرہ) کا ... اچھا ورنن ہے اس کا کبتا کال سمبت ۱۷۶۶ کے آس پاس مانا جاسکتا ہے" - یہہ ساری عبارت بابو رادھا کرشن کے دیباچے سے ماخوذ ہے - بجز اس کے کہ سن پیدائش اور دور شاعری کا تذکرہ اس میں نہیں ملتا سمبت ۱۷۶۰ سے آگے اور سمبت ۱۷۶۶ کے لگ بھگ کا فقرہ بھی قابل غور ہے ہمیں معلوم نہیں کہ شکل جی کی بتائی ہوئی تاریخوں کا(۴) ماخذ کیا ہے انہوں نے بابو رادھا کرشن داس کی ایک اہم عبارت پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی شاید انہوں نے اسے غیر متعلق اور بے ربط سمجھا حالانکہ اس سے استفادہ سے مصنف جنگنامہ کی شخصیت اس کے خاندان اس کے ماحول اور اس کی زندگی کے مختلف ادوار کو متعین کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو جاتی - البتہ شکل جی کے عدم توجہ کی توجیہہ کیجاسکتی ہے بابو کرشن داس خود اس نتیجہ پر نہیں پہونچے جو ان کے بیان اور صاحب شیو سنگھ سروج کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش کو ملانے سے پیدا ہوتا ہے، مطبوعہ ہندی کتاب کے دیباچے میں علاوہ ان باتوں کے جن کا اقتباس شکل جی کی کتاب سے اوپر نقل ہوا مندرجہ ذیل عبارت قابل توجہ ہے" یہہ کبی (شری دھر عرف مرلی دھر) سو کبی (اچھا شاعر) تھا..... یہہ گرنتھ (کتاب) فرخ سیر کا جنگنامہ اور اس سمئے کے امیر راج کرمچاریوں (عمال سلطنت) اور راجاؤں کی کبتا ہے انکی کبتا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ کوئی بڑا منگھن اور خوشامدی تھا اور لوگوں کی بڑائی گا گا کر کبتا کہتے پھرنے کا اس کا روزگار تھا - نواب مصلح خاں کی تعریف کی بہت سی کبتا اس نے کہی ہے انکی ہولی کا (بیان) اور انکی رسکتا (تعشق) اور ولاسیتا (تعیش) کی بڑی تعریف کی ہے - لوگوں کے ہاں لڑکا ہونے پر بیاہ میں پہونچنا اور کبتا سنانا اس کا کام تھا..... بابو شیو سنگھ اور ڈاکٹر گریرسن نے ان کے بنائے کبی ہنود' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اور کبی مرلی دھر مل کر کبتا کہتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے جنگنامہ سے یہہ صاف ہو گیا کہ شری دھر ہی کا نام مرلی دھر تھا اور وہ پریاگ میں رہتا تھا.....

...پریاگ (الہ آباد) میں ایک کبی مرلی دھر مصر بھی ہوئے ہیں ان کا بھی ٹھیک انہیں کا سا سُوبھاؤ اور بیوہ سایہ (پیشہ) تھا ان کی بنائی رام چرتر نامک کتاب لکھت (قلمی) پریاگ کے بھارتی بھون میں رکھی ہوئی ہے میں نے اس کی نقل کرلی تھی اور اسے پرکاشت (شائع) کرتا ہوں یہہ گرنتھہ سمبت ۱۸۱۸ میں بنا تھا۔ کبی نے لکھا ہے کہ سب جنم سوارتھ (خود غرض) میں تیا گر اب ہیرے ھی نشیچے ٹے (کرکے) انت (آخر) میں رام کے گن گاکر پرمارتھ سدھ (عاقبت درست) کرنا چاہیئے اس گرنتھ کو بنایا۔ یہہ دلی کے بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں تھا۔ جب نادرشاہ نے لوٹ مار کر دلی کو تہس نہس کر دیا تب یہہ بھی اوداس ہوکر رام چرتر درنن (رام چرتر کی تصنیف) میں پرورت (مشغول) ہوا۔ اس نے اپنی بنساولی (شجرہ خاندان) کا ورنن اس بھانت سے کیا ہے کہ جمنا گنگا کے بیچ (پریاگ) ایک گاؤں ہے وہاں پرمانند نامی بڑے پنڈت تھے انہیں اکبر نے اپنے دربار میں جگہ دی تھی اور خوش ہوکر شتاہ دہانی (دہہ داں) کی پدوی (خطاب) دی تھی۔ ان کے بیٹے کیول چند۔ ان کے بیٹے پرشوتم (یہ بڑے کبی تھے اور شاہجہاں کے سمئے میں راج میں انکی قدر تھی) ان کے بیٹے پریم راج انکے بیٹے پرتھی راج (یہہ بڑے کبی تھے) ان کے بیٹے دِن منی (یہہ بڑے مشہور جوتشی تھے) ان کے کئی بیٹوں میں یہہ مرلی دھر ہوئے" اس کے بعد بابو کرشن داس نے مسٹر اردن نے شاعر کی جو دو ایک تاریخی غلطیاں بتائی ہیں انکے متعلق اپنے خیال کا ذ[کر] ا کیا ہے اس کیطرف آئندہ اشارہ کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں کئی باتیں جاذب نظر ہیں لیکن مقالہ کی طوالت اور معاصر کی محدود گنجائش مجبور کرتی ہے کہ ہم صرف چند امور کیطرف ناظرین کی توجہ منبذول کریں۔ مسٹر اردن کو جنگنامہ کے علاوہ شاعر کی ایک دوسری نظم بھی دستیاب ہوئی تھی جو موصوف کے خیال میں تتمہ جنگنامہ قرار دی جاسکتی ہے اس کے اوراق کی تعداد ۱۳۳ اور اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔ مسٹر اردن نے اس کے مختلف اجزا کی تعداد اشعار اور شاعر کے ممدوحین کی محض فہرست دیدی ہو۔ پانچ نظموں کی سرخیاں مسٹر موصوف کو نہیں ملیں فہرست میں رتن چند۔ راو رس (؟)۔ بہادر جی (؟) مہاراجہ چھبیلے رام۔ میر مشرف۔ راجہ جسونت (۵)(؟)۔ شیر محمد؟ قطب الملک حسن علی خاں۔ حسین علیخاں۔ مصلح خاں کے نام آئے ہیں موخر الذکر فدائی خاں کا بیٹا تھا صاحب مآثر الامرا نے ان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس فہرست میں ایک طویل کبیتا سو اشعار پر مشتمل ہے جیسے کہ رام چندر جی کی شان میں شاعر نے نظم کی تھی۔ ہندی مطبوعہ کتاب ان اجزا سے خالی ہے لیکن اس میں بھی شاعر نے سید برادران راجہ چھبیلے رام۔ میر مشرف۔ مصلح خان اور متعدد دوسرے حضرات کی مبالغہ آمیز تعریفیں کی ہیں جس سے بابو کرشن داس کے ریمارک کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسرا اور سب سے اہم امر جو بابو صاحب کے

بیان اور شکل جی اور مصر برادران کی بتائی ہوئی تاریخوں سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے: سری دھر عرف مرلی دھر مصر ولد پرتھی راج دراصل ایک ہی شخص تھے۔ جنگنامہ کے مصنف کی تاریخ وفات کسی نے نہیں بتائی۔ اگر سمبت ۱۷۲۷ء کے قریب میں سری دھر کا جنم کال (بقول شیو سنگھ مصر برادران) اور آدت پن (بقول شکل جی) تسلیم کرلیا جائے اور مرلی دھر مصر کے اواخر ایام زندگی میں (بقول بابو کرشن داس) شاید اسکی آخری تصنیف رام چرتر کا سمبت سال ۱۸۱۰ ملحوظ رکھا جائے اور دونوں شاعروں کو حقیقت میں ایک ہی سمجھا جائے تو اس کی عمر اکاسی برس سے کچھ سوا ہوتی ہے جس سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی نام (مرلی دھر) ذات (برہمن) اور توطن (الہ آباد) کی مطابقت، مشاغل طرز زندگی اور خیالات کی مشابہت بادشاہی دربار سے تعلقات دور شاعری اور اولین اور آخری تصنیفات کے درمیان ناقابل تسلیم عدم بعدت ہمیں ایک ہی نتیجہ پر پہونچاتی ہے تعجب ہے کہ بابو کرشن داس جیسے بزرگ نے بھی جنکے پاس شاعر کی متعدد تصنیفات قلمی صورت میں موجود تھیں نظر انداز کردیا بظاہر ایک دقت پیدا ہوتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جنگنامہ کے ابتدائی اشعار (۱-۴) سے ثابت ہوتا ہے کہ سری دھر شیومت کا پجاری تھا حالانکہ مرلی دھر مصر کا رامایت مت کا ہونا اسکی آخری تصنیف سے متحقق ہے۔ زیر نظر کتاب کے اولین اشعار یہ ہیں:-

سوموکھہ (اچھا منہ: الا) گپل ایک رد (دانت) ونکٹ (بھیانک) بہال چندر (جسکے سر پر ماہتاب ہے) گن ناتھ (گنیش جی)

لمبودر (دراز شکم) شنکر شیوجی، تنئے (لڑکا) آٹھ سدھی پد (قدم) ساتھ

لمبودر شنکر شیوا (پاروتی زوجہ شیوجی) بٹوک (شاگرد) بیر بر (بیر بھدر شیوجی کے ملازم) پائے

گوی شری دھر۔ کی ہنین (کیا) کہتا (قصہ) گورو سارد (سرسوتی جی) پد دھیائے (دھیان کرکے)

حقیقت یہ ہے کہ ہنود بالخصوص بسمارت (ویشنوؤں) کا طبقہ برہما، وشنو، شیو، دیوی (یعنی ترمورتی) کے علاوہ گنیش اور شکتی کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ رامایت مت کے جلیل القدر شاعر تلسی داس جی نے اپنی مشہور عالم رام چرتر مانس شائد گنیش جی یعنی مہادیو جی کے لڑکے کے نام سے شروع کی ہے علاوہ اس کے جیسا اوپر عرض کیا گیا جنگنامہ کے تتمہ میں شاعر نے سری رام چندر جی کی شان میں سو اشعار نظم کرکے رامایت مت سے اپنی والہانہ شیفتگی کا ثبوت بہم پہونچا دیا ہے۔ المختصر ہمیں تو مرلی دھر مصر اور سری دھر عرف مرلی دھر کو شخص واحد تسلیم کرلینے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی۔

اب رہا یہ امر کہ شری دھر ہی کا نام مرلی دھر تھا اور جنگنامہ ان ناموں کے دو شاعروں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ نہیں۔ اس کا داخلی ثبوت اس کتاب کے پانچویں اور چھٹے مصرعوں میں موجود ہے:

سری دھر عرف مرلی دھر۔ دو بجور بہ ست پر یاگ
رو چر۔ کنہا۔ یہہ۔ شاہ کی۔ بڑھی او۔ کتھن انوراگ

یعنی سری دھر عرف مرلی دھر دو بجور (برہمن) پریاگ (الہ آباد میں) بہ ست (بستا ہے) (اور) یہہ شاہ (فرخ سیر) کی رو چر (اچھی) کتہا کتھن (کہہ کر) انوراگ (پریم۔محبت) بڑھیو (بڑھاتا ہے)۔

ساری کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اسی شعر میں شاعر نے اپنا نام مرلی دھر اپنی ذات برہمن اور وطن الہ آباد بتلایا ہے یوں تو اڑتیس (۳۸) جگہ اس نے اپنا نام لیا ہے لیکن تمام سری دھر کا نام ملتا ہے کہیں کہیں۔ کبی (اچھا شاعر) سری دھر' اور سری دھر نیک کدم (قدم) کے فقرے ملتے ہیں بعض مصرعوں میں (جیسے ۱۳۵۱ - ۱۲۱۶) میں سو کبی سری دھر نیک کدم" کا فقرہ ایک ساتھ نظم ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے اپنے متعلق کسی بات پر روشنی نہیں ڈالی البتہ ایک شعر جو نہ اردن صاحب کے نزدیک درخور اعتنا ہوا تاکہ وہ اپنے انتخاب میں اسے شامل کرتے نہ بابو کرشن داس کی اس پر خاص نظر پڑی لیکن جو ایک نہایت اہم مسئلہ پر (آیا یہہ نظم چشم دید حالات پر مشتمل ہے یا نہیں) قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ ہم ناظرین معاصر کی خدمت میں اسے پیش کرتے ہیں اس شعر کا نمبر ۸۰-۱۵۷۹ ہے ؎

سری دھر۔ بیلویو۔ دوری۔ بیرن۔ کی۔ بھیڑ روندہ
منڈن۔ کو۔ میرو۔ سرون۔ سلیتا۔ گمبھیر۔ کی

بیلویو دراصل بیلوکیو विलोक्यो ہے جسکے معنی ہیں دیکھنا دوسرے مشکل الفاظ روند (دھڑ) منڈن (سر) میرو (پہاڑ) سرون سلتیا (سنسکرت سرتیا یعنی ندی) ہیں اس شعر کی شرح یوں ہوگی: سری دھر نے، دوری (دوڑ کر) بیرن (بہادروں) کی بھیڑ روندہ (دھڑ)، منڈن (سر) کا میرو (پہاڑ) (اور) گمبھیر سرون (خون) کی سلیتا (ندی)، بلویو یا بلوکیو (دیکھی)۔ یعنی سری دھر نے دوڑ کر بہادروں کی بھیڑ اور دھڑ اور سر کا پہاڑ اور گاڑھے لہو کی ندی دیکھی۔ کیا اس شعر کے بعد کسی شبہہ کی گنجائش ہے کہ شاعر نے آنکھوں دیکھی باتیں نظم کی ہیں۔ (باقی)

**محمد عسکری**

---

**اشارات:** (۱) راقم الحروف کے محلہ گولکھ پور پٹنہ کی ایک مسجد (مسجد ملا شادمانی کہ درد۔ کرد فرخ سیر نازادا) کی مثال کافی ہے ملا شادمان کی قبر اس مسجد کے نزدیک انجیرنگ کالج کے احاطہ میں موجود ہے (۲) جس قدیم کرم خوردہ بیاض سے ایک مضمون" اردو کا پہلا واسوخت" صفحات معاصر پر شایع ہو چکا ہے اس میں کچھ تاریخی قطعات ہیں۔ حاجی ہادی کا ایک قطعہ" تاریخ بر آمدن (خسرو عالی نسب فرخ سیر) از راحمل"... "می اردتا سکہ شاہی زند ۱۱۲۳ یہاں قابل ذکر ہے۔ (۳) ۱۶۸۳ء سمت سن ۱۷۳۹ کے مطابق اور شاعر کے سن پیدائش سے قریب ہے۔ (۴) غالباً شیو سنگھ تذکرہ سے جو پہلی مرتبہ ۱۸۷۷ء میں شایع ہوا شاعر کا جنم سمبت (۱۷۳۰ کے لگ بھگ) لیا گیا ہے۔
(۵) اس راجہ کا جنگنامہ میں کہیں نام نہیں آیا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہدہ دار۔ مہاراجہ جسونت سنگھ سے اس راجہ کو مناسبت نہیں۔

# مطبوعاتِ جدیدہ

خطوط غالب، پہلی جلد: مرتبہٴ مہیش پرشاد صاحب، مصححہٴ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، صفحات ۴۴۴
+ ۴۴، تقطیع ۹½×۱۲½ انچ، قیمت: مجلد ۵ر، غیر مجلد للعہ؛ شائع کردہٴ ہندوستانی اکیڈیمی صوبہٴ متحدہ الٰہ آباد

غالب کو یہ احساس تو ضرور تھا کہ اُنھوں نے اُردو میں خط لکھنے کا ایک نیا طرز ایجاد کیا ہے، لیکن، وہ اس کے قائل نہ تھے کہ اُردو میں انشا پردازی کا کمال دکھایا جا سکتا ہے؛ اسی بنا پر وہ اپنے اُردو خطوں کی "شہرت" اپنے ادبی شکوہ کے منافی سمجھتے تھے۔ اُردو کی خوش قسمتی تھی کہ احباب کا اصرار غالب کے انکار پر غالب آیا۔ اور آخر عمر میں وہ اس پر راضی ہو گئے کہ اُن کے فارسی خطوں کی طرح اُردو خط بھی شایع کر دیے جائیں۔

خطوط غالب = خ کی اشاعت سے قبل صورت حال یہ تھی: (۱) بہت سے خط غالب کی ہدایات کے مطابق یا مکتوب الیہوں کی بے پروائی سے ہمیشہ کے لیے ضائع ہو چکے تھے (۲) عود ہندی = ع غالب کی زندگی ہی میں شائع ہو چکا تھا اور اسے غالب نے ناپسند کیا تھا۔ پہلی اشاعت (۱۸۶۸ء) ہی کی جب یہ حالت تھی، تو بعد کی اشاعتوں کا جو عالم ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے (۳) اردوے معلّیٰ = ا دو حصوں میں غالب کے سامنے ہی مرتب ہو گیا تھا، پہلا حصہ اُن کی وفات کے کچھ بعد ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا متن کسی حد تک بھروسے کے قابل تھا، لیکن، بعد کی اشاعتوں میں اغلاط روز بہ روز زیادہ ہوتے گئے (۴) ا کا دوسرا حصہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا اور عجب نہیں کہ وہی ہو جس کا ذکر حصہٴ اول کے دیباچے میں ہے اگر وہ نہیں تو حصہٴ دوم جو غالب کی زندگی میں مرتب ہوا تھا، غالباً ناپید ہے (۵) غالب کے جو خطوط رام پور میں محفوظ تھے ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب = م کے نام سے شائع ہوئے۔ م کے متن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے (۶) غالب کے کچھ خطوط جو ان مجموعوں میں شامل نہ تھے، مختلف اصحاب نے مختلف طریقوں سے شائع کیے تھے، اور ان کو جمع کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی تھی (۷) غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ خطوط موجود تھے جن میں ایسے بھی تھے جو کبھی شائع نہ ہوئے تھے (۸) بعض اصحاب نے ذاتی مصالح کی بنا پر کچھ خطوط خود لکھ کر غالب کی طرف منسوب کر دیے تھے۔ (خواجہ فخر الدین کے نام کا مجموعہ جس کا ذکر [illegible] کیا ہے، اور جو اب ناپید ہے، ایسے ہی خطوط پر مشتمل تھا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ مشکل ہے)

[illegible] میں جب مہیش پرشاد صاحب نے خطوط غالب کا ناقدانہ نسخہ مرتب کرنے کا ارادہ [illegible] خطوط سے متعلق وہ تمام مواد جو انسانی کوشش سے [illegible] جمع کیا اور غالب اور اُن کے مکتوب الیہوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل

کرنے کی ہر ممکن سعی کی ۔ خوش نصیبی سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سا محقق اُن کی اعانت کے لیے آمادہ ہو گیا، موصوف سے جو مدد انھیں ملی ہے۔ مہیش پرشاد صاحب نے بڑی فراغ دلی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے:

"اگر وہ .. میرے کام کی نگرانی نہ رکھتے، مواد کی فراہمی کے علاوہ تمام متن کی تصحیح و نظرثانی نہایت ہی جاں فشانی کے ساتھ نہ کرتے، میری غلطیوں کو دور نہ کرتے اور بعض ضروری حاشیے نہ بڑھاتے تو یہ مجموعہ جس صورت میں .. پیش ہو .. ہا ہے اُس صورت میں ہرگز نہ پیش ہو سکتا"

خطوطِ غالب کی اشاعت ایک کارنامہ ہے، جس پر اس کے مرتب، مصحح اور ناشر مبارک باد کے مستحق ہیں کتاب کے کل پہلوؤں سے بحث کا وقت وہ ہوگا جب کُل جلدیں شایع ہو لیں گی، فی الحال محض چند اشاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

پہلی جلد میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مقدمہ مہیش پرشاد صاحب کا دیباچہ، ۲۵۴ خطوط اور چند خطوں اور دو لفافوں کے عکس ہیں۔

دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں صرف غالب کے خطوط ہی نہیں بلکہ تقریظیں اور دیباچے وغیرہ بھی ہیں، اس بنا پر اگر کوئی ایسا نام رکھا جاتا جس سے اس کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا تو بہتر تھا۔ یہ نہیں تو سر ورق پر نام کے بعد جو توضیحی عبارت ہے اسی میں اس کا لحاظ رکھا جاتا۔ مرتب نے "مرزا اسداللہ خاں غالب کے خط، رقعے وغیرہ" لکھا ہے، لفظ رقعہ سے معنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، صرف خط کافی تھا۔ غالب اور مرتب دونوں کے نزدیک یہ لفظ خط کا مرادف ہے۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ صفحہ ک سطر ۱۵، اور خط ۲۷ و خط ۲۸ بہ نام علائی)۔ مقدمے میں اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کے مختلف مطبوعہ نسخوں کا ذکر ہے، اور غالب کے اصول املا سے بحث ہے۔ دیباچے میں انتخاب خطوط غالب کے ایک قلمی نسخے کا ذکر ہے، مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مقدمے میں اس کے متعلق کوئی اطلاع موجود نہیں۔

غالب کو املا کی صحت کا خیال تھا، لیکن، املا کے متعلق کوئی مکمل ہدایت نامہ انھوں نے ہمارے لیے نہیں چھوڑا۔ چند امور ہیں جن کی نسبت انھوں نے اپنے خطوں میں بہ صراحت لکھا ہے، اور کچھ باتوں کا پتا ان تحریروں سے چلتا ہے جو خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور جن کا بیشتر حصہ رام پور میں محفوظ ہے۔ "م کا املا غالباً خود غالب کے املا کے مطابق ہے" لیکن "م کی اشاعت اول کی نسبت اس دعوے کا قبول کرنا مشکل ہے۔ مقدمہ خ سے معلوم ہوتا ہے کہ "خ کے متن کے قائم کرنے میں اُن تمام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جنھیں غالب مانتے تھے اور جو صحیح ہیں" اس کے معنی یہ ہیں کہ

جن اصول سے مرتب یا مصحح کو اتفاق نہیں ہے، اُن کی پابندی نہیں کی گئی۔ مقدمے سے مزید اطلاع یہہ ملتی ہے کہ غالب کی طرزِ کتابت کی پیروی میں بعض الفاظ (جیسے ہات، رت، اودھر وغیرہ) رائج حال کے خلاف بھی لکھّے گئے ہیں۔ میری راے میں یہہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ ساری کتاب میں کل الفاظ کا املا رواجِ حال کے مطابق ہونا تھا۔ مقدمے میں غالب کے اصول املا سے متعلق ایک جامع بیان اُن اصحاب کی ضروریات کے لیے جو املا کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں کافی ہوتا۔

مقدمے میں املا[1] سے متعلق جو قاعدے غالب سے منسوب کیے گئے ہیں اُن میں کئی ایسے ہیں، جن کے وہ پابند نہ تھے۔ کہا گیا ہے کہ غالب "سوا روپیہ" راجہ لالہ وغیرہ کے جو گویا علم ہیں، کبھی کوئی ہندوستانی لفظ ہ سے نہ لکھتے تھے؛ ایسے لفظوں میں ہ نہ لکھتے۔ جن کا وجود فارسی یا عربی میں نہیں اور جو... ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے ہیں جیسے، خاکا، نقشا وغیرہ۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ اُن فارسی عربی لفظوں کو بھی جو اردو میں بہت گھل مل گئے ہیں، یا جو محاورے میں آگئے ہیں، اکثر الف ہی سے لکھتے تھے جیسے روانا، مزا وغیرہ" غالب کے ہاتھ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا عمل کبھی کچھ تھا کبھی کچھ۔ لفظ روانہ، جسے خاص طور پر مثال میں پیش کیا گیا ہے م میں بہت آیا ہے اور زیادہ تر 'ہ' سے لکھا گیا ہے۔ خ میں[2] م سے جو خطوط لیے گئے ہیں ان میں املا بدل دیا گیا ہے۔ م میں تھانہ ۳۳، پودینہ، کیوڑہ ۶۵ بھی موجود ہے۔ جناب مہر کی کتاب 'غالب' میں غالب کے ایک خط کا عکس چھپا ہے اس میں 'نقشا' کو 'نقشہ' لکھا ہے۔ خود خ میں ریختہ ۱۱۱ روزمرہ ۴۴،۳۴ زمانہ، پاءیخانہ تکیہ ۱۲۷ تھانہ ۲۰۹، دوشالہ ۱۶۲ (یہ الفاظ ہ اور الف دونوں سے لکھے گئے ہیں) تکدمہ ۴۱، جھروکہ، درشن، پرچہ، ہنڈوی ۲۱۷، گل تکیہ ۳۱۷ گوشہ، توشہ، دروازہ ۲۸۰، تولہ ۲، پرزہ ۲۲۸، چبوترہ ۱۴۲، زوورقہ[3] ۸۹، جولاہہ ۳۱۳ بے چارہ ۳۳۵ وغیرہ موجود ہیں۔

الف اور ہاے مختفی پر ختم ہونے والے اسماے مذکر کے الف اور ہ کو یاے مجہول سے بدلنے کا جو قاعدہ ہے، اس کے بھی غالب پابند نہیں[4]۔ خ میں تفتہ کے نام کے خط کا جو عکس ہے اس میں "کرایہ کے واسطے" ملتا ہے جسے متن میں "کرائے کے واسطے" بنا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خ میں زندقہ کو ۳۴۵ روزمرّہ میں ۱۹، ریختہ کے دیوان ۲۰۱، تھانہ دار ۲۰۹ توشہ خانہ، عملہ فعلہ

---

[1] راقم کی راے میں 'املا' کو مذکر استعمال کرنا چاہیے اور اس صورت میں آخر کے الف کو یاے مجہول سے بدلنا نہیں چاہیے۔
[2] خ ص روانۂ لوہارو ۳۵م میں اس قاعدے سے انحراف کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، خ میں م سے جو خطوط نقل ہوئے ہیں، اُن کا املا بدل دیا گیا ہے۔ [3] غالباً ہندی کی پیداوار۔

کے نذر ۲۶۳ موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ
خ میں مُطلع کی جمع مُطلعے ہے۔ اگر ع الف کا ہم آواز سمجھا گیا ہے،
تو ہر صورت میں اسے الف کا قائم مقام قرار دینا تھا صـ۹۰ پر
جو مطلع ہیں، اور صـ۹۱ پر جو مصرع ہیں، ہے اُسے مطلع ہیں، اور
مصرعے ہیں ہونا چاہیے تھا۔

خ میں ایک لفظ یا ایک قسم کے لفظ جو ایک قاعدے کے ماتحت ہونے چاہییں، مختلف شکلوں میں
ملتے ہیں:۔

مثلاً: تباد ۴۸ ۲۹ تبلاؤ ۲۱۱، پلاد ۲۲۱، پلاو ۲۳۲، داو ۱۱۸ داؤ ۱۰۲، چھاونی ۲۱۶ چھاؤنی ۱۶۲،
مؤید ۱۹ موّید ۱۵۵ موقر ۱۳۵ موذن ۱۲۴، مؤثر ۱۲۳ موثّر ۱۲۷، لگاؤ ۳۲ لگاو ۱۷۱ بھرکا دھاو
۲۰۵، گھاو ۲۸۵ بناؤ ۳۰۷ ۔ او ۲۸۴، پاو ۱۶۸ مرتب کا مسلک بہ ظاہر یہ ہے کہ بناو وغیرہ میں ہمزہ
نہیں چاہیے لیکن، یہ قابل قبول نہیں) خوشنود ۱۴۴، خشنودی، رایگاں ۷۰، رائگاں ۴۸، گنجایش ۵۸
گنجائش ۴۷، اعتنا ۱۰۱ اعتنا ۱۲۴ استغنا ۱۹۶ بلغار ۱۴۱، مضایقہ ۴ مضائقہ ۱۲۵ معائنے
۳۵۸، پاخانے ۲۳۲ پائخانہ ۱۲۴، سائے ۱۰۶ سایے ۱۹۳، پائے ۱۹۱ پایے ۸۹ جاے ۳۱۵ جائے ۲۶۸
جائیے کیجیے ۲۶۱ کیجیے ہوئے ہوے ۲۶۵، تنقیہ توطئہ ۳۵۸، پہچان ۲ پہچان
ٹھہرنا ۲۳۰ ٹھیرنا (غلط نامے میں ٹھہرنا کی تصحیح کی گئی ہے) کمپنی ۱۴ کمپنی ۱۳۹ کمپ ۲۲۶ کنپ ۲۱۶
کنواں ۸ کنویں کنوے ، سوچ ۱۳۸ سونچ ۱۴۷، ماموں ۱۳۶، مانوں ۱۲۸ گورنمنٹ
گورمنٹ ۲۰۷، ڈاڑھی داڑھی ۲۴۴، مسل ۱۵۷، مثل ۳۹، سکرٹر ۲۰۶ سکرٹری ۲۶۰ بھجوا ۲۹۶
بھیجوا ۱۶۰، بھانا ۱۹۴ بیٹھانا ، سارٹی فکٹ ۱۴۳ سارٹی فکٹ ۲۰۱ رت ۲۹۴ رتھ ۲۲۲۔
معنی ص۳۰۹ معنے ص۲۵۱

مرتب کا سب سے اہم کام متن کو صحیح طور پہ پیش کرنا ہے، اور اس میں اُنھیں نمایاں کامیابی ہوئی ہے
کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جن کی صحت کے متعلق مجھے شبہہ ہے، ممکن ہے کہ غلطیاں ابتدا ہی سے چلی آتی
ہوں اور خ میں نظر انداز ہوگئیں، یا در اصل غلطیاں نہ ہوں۔ انھیں صحیح سمجھنے میں تامل میری سمجھ کا
قصور ہو۔ اس قسم کے مقامات کی فہرست دینے سے پیشتر میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ
اختلافات نسخ کی نشان دہی کا جو طریقہ مرتب نے اختیار کیا ہے، اس سے اکثر یہ نہیں پتا چلتا کہ
متن میں جو الفاظ ہیں وہ کس نسخے کے مطابق ہیں:

(۱) ص۱ بموجب فرمایش.. جاکوب بہادر کے (کسرہ نہیں چاہیے) (۲) ص۲ و تلوار (و ؟) (۳) ص۲۳ زترک تازی آں نازنیں سوار ہنوز (نازنیں سوار' بے معنی ہے' غالباً یار نے سوار) (۳) ص۲۵ دس برس سے... اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں) (غلط نامے میں 'دس' کی جگہ 'وس' دس' لیکن' محل دس ہی کا ہے) (۴) ص۳۲ سررشتہ دار (یہہ ص۱۳۱ پر بھی ہے جیسے استدراک میں سرشتہ دار بنا دیا گیا۔ یہاں پر واقعی کس طرح ہے ؟) (۵) ص۳۷ افسانۂ عجائب (نام تو فسانۂ عجائب ہے) (۶) ص۳۸ میرا اُمیدگاہ (امیدگاہ مؤنث ہے خ ص۲۱۵ پر بھی مؤنث) (۷) ص۱۴ بذریعۂ اُن کے (ہمزہ نہیں چاہیے) (۸) ص۴۱ ملکہ.. کی نذر' ص۵۴ ص۶ ص۳۰۷ وغیرہ پر بھی کی نذر' لیکن ص۷۱ پر جو 'کی' ہے اسے غلط نامے میں 'کے' بنا دیا گیا ہے۔ خ کے ص۲۴ ص۲۹۲ ص۳۰۵ پر کے نذر یا تمھارے نذر اس سے قطع نظر غالب کا مصرع ہے: 'حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی' 'کی' ردیف ہے (۹) ص۴۷ آخر کتاب (میں چھوٹ تو نہیں گیا ؟) (۱۰) ص۷ ناپسند (یا پسند ؟) (۱۱) ص۹۳ مگر میں بانی کلام اہل زبان نہیں ؟ (بانی ؟) (۱۲) ص۹۳ ڈاکیے (یہہ غلط نامے میں 'ڈاکی' ہے۔ ڈاکی سنا نہیں گیا) (۱۳) ص۱۱۹ کے سلامت حال (کی چاہیے سلامت کی رعایت سے) (۱۴) ص۱۲۵ پیالی (پیالے) (۱۵) ص۱۲۹ ان صاحبان (یا صاحبوں ؟ خ ص۱۰۰ پر بخشی صاحبوں) (۱۶) ص۱۱۴ اب ہی نہ ہو (اَب کے ہی ؟) (۱۷) ص۱۱۸ ننگے پاوں" واو کے ضمے کو اثبات کیسا ؟ یہہ تو ترجمہ 'پابم' کا ہے (پاوں ہونا چاہیے ورنہ اعتراض کس پر ہے ؟) (۱۸) پاوں کی یہ املا غلط (یہاں پر 'پانو' چاہیے) (۱۹) ص۱۲۱ کا املا (ص۱۱۸ پر املا مونث) (۲۰) ص۱۴۰ اول رجب میں نوازش نامہ آپ نے کب بھیجا ؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا (مطلب واضح نہیں) (۲۱) ص۱۴۷ بہ ذریعۂ اس خط کے (ء ؟) (۲۳) ص۱۵۳ آج دوشنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی... کل شنبہ ۱۶ فروری (۱۶ کو سہ شنبہ ہوگا نہ کہ شنبہ (۲۴) ص۱۵۳ میرے مرگ (مرگ بالاتفاق مؤنث) (۲۵) ص۱۵۸ تمھاری پنسن' ۵۲ برس کا پنسن (پنسن ایک ہی خط میں مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی، یہہ خط جیسا کہ ابتدائی جملوں سے واضح ہوتا ہے' غالب نے دوسرے شخص سے لکھوایا تھا۔ اُس نے غالب کے دستور کے خلاف ایک جگہ مؤنث لکھ دیا) (۲۶) ص۱۵۸ پوری دوسو روپے کے پنسن کی منظوری) (پورے ؟) (۲۷) ص۱۵۹ بہ موجب تعلیم میر قاسم علی کے) (کسرہ ؟) ص۱۵۹ وہ اور اُن کے متعلق (یا متعلقین جیسا ص [illegible] پر ہے) (۲۹) ص۱۶۱ ذوالفقار الدین حیدر' مولوی (موسوی صحیح ہے) (۳۰) ص۱۶۳ منظفر الدّولہ میر ناصر الدین (اس طرح لکھا ہے کہ پڑھنے والا لازمی طور پر منظفر الدّولہ کو میر ناصر الدین کا خطاب سمجھے گا۔ لیکن یہہ دو مختلف شخص تھے۔ ملاحظہ ہو خ ص۲۳۶ منظفر الدّولہ کا نام سیف الدین حیدر تھا سوانحات سلاطین اودھ جلد ۲ ص۲۵۵) (۳۱) ص۱۶۴ امرا کے ازواج و اولاد (کے کی جگہ کی چاہیے

---

۱ؔ اس فہرست میں کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جن کی نسبت محض یہہ اطمینان کرنا ہے کہ طباعت کے اغلاط تو نہیں۔

(۳۲) ص۱۶۵ برہما کا پتر.. مرگیا.. باپ اس کا شیوجی رام (باپ شیوجی رام تھا تو برہما کا پتر کیوں کر
ہوا؟ برہما کون ہے؟) (۳۳) نصف میں مفلسوں کا مدار۔ حیات خیالات پر ہے مگر اسی خیالات سے
اُن کا حسنِ طبیعت معلوم ہوتا ہے (مفلسوں کا کے بعد غالباً کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے۔ بعد کا جملہ یوں ہے:
مدارِ حیات خیالات پر ہے۔ خیالات کے لیے 'اسی' صحیح نہیں، نہ یہ پتا چلتا ہے کہ 'اُن' سے کس کی طرف
اشارہ ہے) (۳۵) ص۱۷۱ "جانگ" کیا؟ مگر یہ پیروی قتیل کی ہے (جانک، پیروی قتیل کی جانک ہیں؟)
(۳۶) ص۱۸۰ احباب کے خط لکھنے کو (کو؟) (۳۷) ص۱۸۱ تئیں.. متروک.. قبیح، یہ پنجاب کی بولی ہے..
میرے لڑکپن میں ایک اصیل.. تئیں بولتی تھی تو.. سب اُس پر ہنستی تھیں (تئیں غالب کے یہاں نظر نہیں آتا،
لیکن اُن کے زمانے میں بلکہ اُس کے بعد بھی فصحاے دہلی کی زبان پر تھا اور اب بھی متروک نہیں ہوا
عجب نہیں کہ 'تئیں' کی جگہ 'تین' ہو) (۳۸) ص۱۸۴ ہزار پائی (ہزار پایے؟) (۳۹) ص۱۹۳ اب ان سے بیٹے
(آپ؟) پنسن جاری ہوگئی (خط قدر کے نام کا ہے، اگر اس کی اصل موجود ہے تو خیر، ورنہ نقل میں تحریف کا
گمان ہے 'ہُکا کو دگی' کردیا) (۴۱) یہ سطور.. لکھے ہیں (فعل مذکر کی وجہ؟) (۴۲) ص۱۹۵ شکریہ (کیا واقعی یہ
لفظ؟) (۴۳) خطوط بہ نام نواب یوسف علی خاں (ان خطوط میں متعدد مقامات پر م کے مطابق رد یہ ہے
خ میں روپئے ۲۴۸، ص۲۲۵ وہ بھی ایسے ہیں (یا ایسے ہی ہیں؟) (۴۶) ص۲۵۷ بیٹے سے سیانا سو، بوانا
(یا دوانا؟ خزینۃ الامثال مصنفہ حقیقت میں دوانا) (۴۷) ص۲۶۱ میرے عادات (میری) (۴۸) ص۲۶۲ گیارہ
رُپے خرچ راہ دیے مگر.. اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف
پانچ رُپے ظاہر کریں گے (پانچ یا گیارہ؟) (۴۹) ص۲۷۲ مقدور کی تیاری (؟) (۵۰) ص۲۷۵ ذکری (ذکر؟)
(۵۱) ص۲۷۶ رخصتی اپنے گھر گیا (یا رخصت؟) (۵۲) ص۲۸۰ تمھاری طرز (لیکن ص۱۰۱ پر طرز مذکر) (۵۳) ص۲۹۱
یہ خرافات لکھ دیے ہیں (لکھ دی ہے، چاہیے۔ ص۲۷۹ پر اس خرافات، اور ص۲۹۹ پر "نری خرافات" میرے
قول کا مؤید ہے) (۵۵) ص۳۰۱ ان بارہ رپے میں برکت دی (رُپوں کا محل ہے) (۵۶) ص۳۱۵ مغلچے کو
مغل بچہ پر ترجیح دی گئی ہے۔ کیا غالب کے سوا مغلچہ کسی اور نے بھی استعمال کیا ہے؟ مغل بچہ کی
قسم کی اور ترکیبیں افغان بچہ وغیرہ رائج ہیں) (۵۷) ص۳۲۵ موبد (یا مؤید؟) (۵۸) ص۳۲۵ حجوب بن گئے
ہیں (جمع کی حالت میں بھی غالب نے مؤنث استعمال کیا ہے خ ص۲۶۰ حجوب جو.. مجھ کو دی تھیں) (۵۹)
ص۳۳۵ انداز و ادا (لیکن ص۳۲۳ پر انداز ادا) (۶۰) ص۳۲۷ طبیعت امکان (؟) (۶۱) ص۳۴۰ جہاز سے اتر کر
سرزمین عرب میں چھوڑ دیا (اُتار کر چاہیے) (۶۲) ص۳۴۲ بہ حوالہ میری تحریر کے (بہ حوالہ) (۶۴) ص۳۴۴
وہاں کے اوضاع (کی) (۶۵) کے وجوہ (کی وجوہ) (۶۶) ص۳۵۳ مصرعۂ شاعر (مصرعِ ورنہ مصرع ناموزوں)
(۶۷) ص۳۶۱ علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا (کیا یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں؟) (۶۸) ص۳۶۳

یک فنہ ہوں (ص۲۱۳/۱۴ پر یک فنی اور یہی صحیح ہے) (۶۹) ص۳۶۳/۱۳ اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آؤں (آؤں' مرتب کی اصلاح ہے، ورنہ بہ قولِ مرتب کل نسخوں میں آئے' ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کے قبل کا جملہ آئے' کا مؤید ہے" نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں" (۷۰) ص۳۷۸ اجڑی ہوئی قلم رو ہند دلیکن ص۳۹۴ پر قلم رو مذکر (۷۱) ص۴۰۲ بذریعۂ اُن کے (رو؟) (۷۲) ص۱۰۱ اصوات ہیں تارکے (کی' ہونا چاہیے۔ دہلی میں کوئی ایسا قاعدہ نہ تھا جس کی رو سے عربی اسماے مؤنث کی عربی جمع مذکر استعمال کی جائے۔ محض چند الفاظ اس طرح استعمال ہوتے تھے، صوت، حب وضع، وجہ، سطر بھی ایسے ہی تھے اس کا ثبوت مرتب کو پیش کرنا چاہیے)(۷۳) غلط نامہ ص۲ قوہ (یا قوۃ؟) نہ معلوم کس کی بددعا کا اثر ہے کہ کیسا ہی اہتمام کیوں نہ کیا جائے اُردو کی کتابیں اغلاط طباعت سے نہیں بچتیں۔ امیر اللغات بھی جس کی نسبت یہہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس میں غلطیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں، اس سے مستثنیٰ نہیں۔ خ میں اس کی ضخامت کے لحاظ سے' اغلاط زیادہ نہیں، غلط نامہ ۴۸۰ صفحوں کی کتاب کے لیے صرف دو صفحوں کا ہے۔ لیکن کچھ غلطیاں ایسی بھی ہیں جو غلط نامے میں مندرج نہ ہوسکیں۔ وہ یہہ ہیں:

صفحہ ۲ سطر ۴ = ۴/۱ ماء الجبن ۵ یک شنبہ ۱۹ غفور ہت (؟) ۱۹ بازار: بازآر ۲۱ افاقت ۲۲ آمیزش ۴۶ نام کے بعد اے عبد الرحمٰن ۴۷ و ۲۳۱: اِحیاناً: احیاناً ۴۸ مبداء: مبدء ۸۵ بہ کارِ آمدنی: کسرہ نہیں چاہیے، ۹۶ مختسل ۱۱۹ برخنگال: برخنگال ۱۲۴ صلوٰۃ ۱۲۴ و ۱۸۸ و ۲۸۲ آلہی: الٰہی ۱۲۵ مدعا برآری ۱۴۱ ذرا: ذرا ۱۵۰ حضرت کیوں.. حال پوچھا؟: (یا تو حضرت کے بعد، ہونا چاہیے یا 'نے') ۱۵۲ ناتوان ۱۵۶ من جملہ واقعات: من جملہ واقعات ۱۵۸/۱۴ جانا ۱۶۰ بھجوادوں گی: بھیجوانا' کہیں اور نہیں" یہ ظاہر طباعت کی غلطی ہے' بھجوادوں گی' چاہیے، ۱۷۰ ہمشیرۂ عزیزہ ۱۸۲ و ۱۸۷ آئمہ: ائمہ ۲۲۰ آچار: اچار اُردو میں اسی طرح زبان پر ہے، ۲۳۲ اسمعیل: اسمٰعیل ۲۳۵ آؤگے ۲۴۲ تحریک ۲۴۹ انعام ۲۴۹/۱۲ کیا ۲۵۰ جمع ۲۵۰ و ۲۸۹ الہ: الٰہ ۲۵۰ خواجہ "میر درد": خواجہ میر "درد" ۲۵۱/۸ پھرتے، ۲۵۶ عظیم النسا ۲۶۰ ڈیرے ۲۷۱ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام الخ: (اس شعر کو نثر کی طرح لکھا ہے) ۲۷۴ ثلثہ ۲۸۰ ولاے مرتضوی: ولاے مرتضوی ۲۹۱/۵ لڑکے.: (یہاں پر۔ کا محل نہیں) ۳۰۲ سابقۂ معرفت ۳۰۵/۴ اے ۳۰۹ ہے: بھی؟ ۳۲۹ خونابہ: خونابہ ۳۳۴ وہ کرولی رہے۔ حکیم: وہ کرولی۔ رہے حکیم ۳۳۶/۱۰ سی: سے ۳۴۶ کا تتمہ ۳۴۶ الہی: الٰہی ۳۴۶/۲۴ ہے کی: ہے کہ ۳۴۷ سہ دری: سہ درے ۳۵۴ سنہ حال: سنۂ حال (؟) ۳۶۰ روانہ ۳۶۲ دواعی ۳۶۲ ہفتہ ۳۶۷ تو طیہ ۳۹۵/۹ شیشہ ۳۹۵ کوزہ ۴۰۲ سطر آخر ہا ترس

خطوط تاریخی ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں اور یہہ محنت کا کام تھا۔ بہت سے خطوں میں صرف ہجری تاریخیں [illegible] نے ان کے مطابق عیسوی تاریخیں بھی دے دی ہیں، جن خطوں میں صرف دن اور

[illegible] پر یک فنہ ہے تو یک فنی [illegible] نہ لکھا ہوگا۔

چھپنا تھا، ان کے سنین کا پتا چلایا ہے، اور جہاں یہ بھی نہ تھا۔ "اندرونی شہادت یا کسی اور ذریعے سے" زمانے کی تعیین کی کوشش کی ہے، یہ آخری کام سب سے کٹھن تھا اور اس میں انھیں کہیں کہیں ناکامیابی بھی ہوئی ہے۔ ذیل کے خطوں کا زمانہ یا تو صریحاً غلط ہے یا اس کے قبول کرنے کی کوئی معقول وجہ مجھے نظر نہیں آتی:

خط ا بہ نام تفتہ، اگست ۱۸۴۹ء غالب نے دیوان تفتہ کا دیباچہ تحریر کیا تھا، تفتہ کو اپنی تعریف امید سے کم نظر آئی، غالب سے شکایت کی، تو غالب نے دیباچے کا ایک فقرہ بدل دیا۔ خط ا میں اسی کی اطلاع ہے۔ اس کا زمانہ مرتب نے اسعد الاخبار آگرہ کے ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے پرچے سے متعین کیا ہے اُس لیے کہ اس میں... غالب کی... تقریظ کا ذکر ہے۔ ذیل میں اسعد الاخبار کے دو اقتباس اور جناب عرشی کے خط کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے، ان سے جو نتائج نکلتے ہیں، اُن سے مرتب کے بتائے ہوئے زمانے کی قطعی طور پر تغلیط ہوتی ہے:

(۱) دیوان تفتہ جو اس مطبع میں چھپتا ہے رُبع سے زیادہ چھپ چکا، وہ بھی اس موسم سرما میں انشاءاللہ تعالیٰ تمام ہو گا۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزو کے قریب ہے، اور قیمت چار روپیہ، بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے اکثر شائقان سخن نے اس کی درخواست مع زرِ ثمن داخل مطبع کی ہے، کیوں کہ وہ دیوان عجب فصاحت خیز اور لطف انگیز ہے۔ اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں، خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں۔ اسعد الاخبار ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۲۶۵ھ۔

(۲) ان دنوں دیوان تفتہ سکندرآبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ.. وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا، بہ سبب عدیم الفرصتی کے اب تک ملتوی رہا، اب اس کی تدبیر کی گئی ہے۔ اسعد الاخبار ۱۸ دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق ۲۱ محرم ۱۲۶۵ھ

(۳) تفتہ کے دو دیوان ہیں۔ ان میں سے پہلے کے شروع میں مرزا صاحب کی تقریظ ہے، اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا، اور اوائل ۱۲۶۷ھ میں انجام کو پہنچا۔ تقریظ میں کوئی تاریخ نہیں دی۔ جس صفحے پر یہ ختم ہوتی ہے اُس کی باقی ماندہ جگہ میں ..حقیر کا قطعۂ آغازِ طباعت ہے جس سے ۱۲۶۵ برآمد

---

ـه مرتب نے اس خط کے سوا کسی اور خط کے زمانے کی تعیین کی وجہ نہیں بتائی۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص تاریخوں کو جانچنا چاہے، تو اسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے صرف پندرہ خطوں کی تاریخوں کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔

ـه خط میں دیباچے کا ذکر ہے اور پنج آہنگ میں بھی دیباچہ ہی لکھا ہے۔ دیوان میں یہ دیباچہ تقریظ کے نام سے چھپا ہے۔ اگر اس طرف اشارہ کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ ـه یہ اقتباس مرتب نے نقل نہیں کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں تقریظ کا ذکر ہی نہیں۔

ہوتے ہیں" خط سا ان اقتباسات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔ دیوان اور اُس کی تقریظ غالباً اواخر ۱۸۴۷ء ہی میں صاحب مطبع کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر یہہ قیاس صحیح ہے تو تقریظ ۱۸۴۷ء یا اس سے بھی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ ۲۔ دیوان تفتہ کا چھاپا اوائل ۱۲۶۵ھ (اواخر ۱۸۴۸ء) میں شروع ہو گیا تھا۔ (جناب عرشی نے اواخر سہواً لکھا ہے) ۳۔ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء تک ۱۲ جز کے قریب چھپ چکا تھا۔ ۴۔ تقریظ آغاز دیوان میں ہے، اور اس کے آخری صفحے میں حقیر کا قطعۂ تاریخ، اس لیے دیوان کا یہہ حصہ سب سے پہلا چھپا، اور اس کا زمانۂ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔

یہہ متحقق ہو جانے کے بعد کہ تقریظ کا زمانۂ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہو یہہ قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ غالب نے اسے اواخر ۱۸۴۸ء سے پیشتر لکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ خط ۱۱ اگست ۱۸۴۹ء میں تحریر ہوا خط ۲ بہ نام تفتہ، اگست ۱۸۵۸ء: "قطعے کو اپنے دیوان میں۔۔ شامل کر دیجیے۔۔ جب تمھارا دیوان چھاپا جائے گا یہہ قطعہ بھی چھپ جائے گا" غالب کے ان الفاظ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہہ خط آغاز انطباع دیوان سے قبل کا ہے۔

خط ۴۴ بہ نام مجروح، دسمبر ۱۸۶۲ء اس خط سے یہہ ثابت ہے کہ جس وقت یہہ لکھا گیا ہے کپتان الکزنڈر (ہیڈرلی) زندہ تھے لیکن خط ۲۵ سے جو ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کا تحریر کیا ہوا ہے، کہ اس سے قبل ہی الکزنڈر ہیڈرلی کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہہ خط ۲۵ سے قبل کا ہے۔

خط ۴۹ بہ نام علائی: خط ۴۸ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء اور خط ۵۰ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء علائی کے نام رام پور سے بھیجے گئے ہیں خط ۴۹ کا کوئی زمانہ صراحتہً مرتب نے مقرر نہیں کیا، لیکن، چوں کہ خطوط تاریخی ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں، مرتب کے نزدیک بہ ظاہر یہہ خط بھی رام پور سے ۲۲ دسمبر اور ۲۶ دسمبر کے درمیان کسی تاریخ میں لکھا گیا ہے۔ خط کا یہہ ٹکڑا ملاحظہ ہو: بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار رہے۔ اسلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے، اسی کو غنیمت جانتا ہوں تا ب لائے ہی بنے گی غالب۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز" اخوین سے امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں مراد ہیں، خط دہلی سے زمانۂ غدر میں لکھا گیا ہے۔

حواشی جس قدر ہیں کار آمد اور قابل قدر ہیں۔ کہیں متن صحیح نظر نہیں آیا تو اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہیں کوئی تاریخ غلط ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہیں کسی نامانوس لفظ کی تحقیق کی ہے۔ کہیں کسی شعر کے مصنف کا نام بتایا ہے۔ کہیں غالب نے کوئی شعر غلط نقل کیا ہے تو اس کی تصحیح کی ہے، لیکن کتاب کے مرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے، یہہ کہنا پڑتا ہے کہ حواشی بہت کم ہیں اور سیکڑوں مقامات ایسے رہ گئے ہیں، جو مرتب کے عدم التفات کے شاکی ہیں۔ میں محض چند مقامات کا ذکر کرتا ہوں:

(۱) ص۶ اور ص۱۹ پر اسیر کی جن بیتوں کی طرف اشارہ ہے انھیں نقل کرنا تھا (۲) ص۸ ص۹ وغیرہ پر جو تہمار ہیں یہہ بتانا تھا کہ کس کے ہیں (۳) ص۱۴ پر" راجا مرارانی [نہیں] مری" نہیں اضافۂ مرتب ہے ممکن ہے کہ رانی نہ مری ہو، لیکن یہہ امر تحقیق طلب تھا (۳)" یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ' یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لیگ یہہ شعر دراصل منتظر کا ہے، اور غالباً 'یاد رکھنا' کی جگہ 'سن رکھو تم' ہے۔ اس کا ذکر ضرور تھا (۴) ص۹۵ سکہ لمبر ص۲۴۵ سکھ لمبر' تحقیق کا محتاج تھا، نامانوس ہے اور لغات میں نہیں ملتا۔ جناب عرشی فرماتے ہیں کہ "یہہ دراصل 'سپاٹ نمبر' فوجی اصطلاح ہے" ممکن ہے رام پور میں اب بھی رائج ہو (۵) ص۱۳۱ سطر آخر میں کس وزیر اعظم کی طرف اشارہ ہے؟ (۶) ص۱۸۵ 'چاپی' کو غالب نے لغت انگریزی لکھا ہے یہہ انگریزی لفظ نہیں اور نہ اس طرح اردو میں رائج۔ عجیب بات یہہ ہے کہ اس صفحے پر لفظ چاپی بہ معنی کلید بھی آیا ہے۔ پہلا 'چاپی' نہ معلوم کس طرح آگیا؟ (۷) ص۲۵۷ "دار البقا" کیا کسی محلے یا عمارت کا نام ہے؟ (۸) ص۲۹۷ مثنوی کا شعر تشریح طلب تھا (۹) ص۳۲۵ خط ۰ کی بعض عبارتیں تشریح طلب (۱۰) ص۳۶۶ چھوٹی ہے دبڑی ہے کا قصہ تشریح طلب (۱۱) ص۳۰ مدبر کون ہے اور بہاری کون شخص ہے؟ (۱۲) ص۳۱۶ ذکر بہ ہمہ جہت ناپسند، تشریح طلب۔

حواشی میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے مجھے اختلاف ہے: ۱۔ ص۲ "یہہ لفظ (یعنی فراہیر بار) .. دس ہزار جگہ آیا ہوگا" حاشیۂ ذیل جو اردوے معلیٰ حصۂ دوم سے ماخوذ ہے، اور دراصل حالی کا لکھا ہوا ہے، غالب سے منسوب کر دیا ہے: "دس ہزار کا لفظ محض ظرافتہً لکھا ہے، یعنی تم ہمارے قدیم شاگرد اور ہمارے کلام کے درد (یا ورد؟) رکھنے والے اور پھر تم کو یہہ خبر نہیں کہ ہماری فارسی نثر میں یہہ لفظ متعدد طور پر اور متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، پس تمھاری غفلت کی مثال ایسی ہے کہ جو چیز دس ہزار بار دیکھی ہو وہ یاد نہ رہے" حصۂ دوم کے کل حواشی حالی کے لکھے ہوئے ہیں، دھوکا اس سے ہوا کہ حالی نے مطالب کو اس طرح سمجھایا ہے کہ گویا خود غالب سمجھا رہے ہیں اور مخاطب تفتہ ہیں۔ ۲۔ ص۲۴۲ "سالک سے سلوک منظور نہیں، تنہا ہواے شمشاد در سر ہست" حاشیہ: "تنہائی یا تنہا فرض کیجیے تو بھی کچھ معنی نہیں نکلتے" تنہا صرف کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، مطلب یہہ ہے کہ سالک کو نوکر رکھنا نہیں چاہتے، صرف شمشاد کو ملازم رکھنے کی خواہش ہے۔ ۳۔ ص۲۴۲ داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد' حاشیے میں اس غزل کو حیرتی سے منسوب کیا ہے۔ میں اس کی نسبت اپنا خیال مارچ ۱۹۴۱ء کے معاصر میں ظاہر کر چکا ہوں۔ ۴۔ ص۳۶۶ غالب علائی کو لکھتے ہیں: آپ چال چوکے، اردو لکھتے لکھتے جو خط کہ مشتمل ایک مطلب پر تھا اس کو تم نے فارسی میں لکھا'

اور فارسی بھی متصدّیانہ نہیں کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بہ صیغۂ مفرد نہ لکھیں. خیر خط نہ دکھاؤں گا مکتب فیہہ کہہ کر کام نکال لوں گا" اس پر حاشیہ ہے کہ متصدّی کے بعد لفظ "نہیں" زائد ہے۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ غالب کا مطلب یہہ ہے کہ علائی نے متصدیانہ فارسی نہیں لکھی تھی، فارسی میں خواہ امیر ہو یا غریب واحد غائب کے لیے صیغۂ مفرد استعمال ہوتا ہے لیکن متصدّی اس کی تقلید نہیں کرتے، وہ اس طرح لکھیں گے" نواب آمدند" علائی نے صیغۂ مفرد استعمال کیا تھا، لیکن اشارہ غالبًا نواب رام پور کی طرف تھا، غالب نے اس ڈر سے کہ کہیں اسے خلاف ادب نہ سمجھا جائے خط نہ دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ق۔ ع۔ و

**خطابیات**: مصنفہ شیخ رحیم الدین کمال ظہیر آبادی صاحب، صفحات ۱۱۲، تقطیع ۶ ۳/۴ × ۴ ۱/۲ انچ، شائع کردہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد دکن۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ایک کتاب "فنِ تقریر" کے نام سے شائع کی تھی، خطابیات اس کا دوسرا حصہ ہے۔ اردو میں فنِ خطابت پر کتابوں کی ضرورت تو ہے لیکن کتابیں ایسے مصنفین سے لکھوانی چاہییں جو اپنے مافی الضمیر کو دل نشیں طریقے سے ظاہر کرسکیں اور اپنی تحریر کو بے ربطی سے بچا سکیں۔ اس کتاب کی ابتدا ذیل کے جملوں سے ہوتی ہے، ناظرین خود اس امر کا اندازہ کرسکیں گے کہ خطابیات کے مصنف اس زمرے میں آتے ہیں یا نہیں:

"روز بہ روز تقریر کے مفہوم اور منشا میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے، موجودہ زمانے میں عام طور پر تقریر سے مراد وہی بحث سمجھی جاتی ہے جس میں علمی اور سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی جائے۔ ہر ترقی یافتہ زمانے میں تقریر کے لیے کوئی خاص موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ہر عنوان پر تقریر کی جا سکتی ہے"

**میری کہانی میری زبانی**: اس کتاب کے تبصرے میں اغلاطِ طباعت بہ کثرت ہیں۔ ناظرین سے گذارش ہے کہ بہ راہِ کرم اغلاط ذیل کی تصحیح فرمالیں: ۵۵/۲ یہہ الفاظ سطر کے آخر میں چھوٹ گئے ہیں: تقطیع ۱۰ ۱/۲ × ۶ ۱/۲ انچ ۵۵/۲۲ سال گرہ اس سے متعلق حاشیے میں الفاظ ذیل بڑھائے جائیں: آٹھویں سال گرہ ۵۶/۶ مخصوص: ومخصوص ۵۶/۲۰ روپیہ: روپیہ ماہانہ ۵۷/۱۵ ثالث: ثلث کا تعلق ہے ۵۶/۲۶ خاص پٹنہ میں: جس خاندانِ عالی کے یہہ رکن ہیں اس کی نظیر تو سارے صوبہ بہار میں نہیں نکلے گی ۵۸/۱۶ والد کے نانا؛ والد کے ۵۹/۲ ددھیال: ننھیال ۵۹/۹ ہمارے: ہمایوں ۵۹/۸ شرف الدّین احمد: شرف الدّین ۵۹/۱۴ میں یہہ اخبار میں یہہ

ایجدی

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدین احمد

دائرۂ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# طنز، ہجو اور ظرافت

گذشتہ تین نمبروں میں پروفیسر کلیم الدین کا قابلانہ و بصیر مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" شایع ہوا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس موضوع پر جو کامیاب روشنی ڈالی ہے یہ ان کا خاص حصہ ہے۔ مضمون کی پہلی قسط میں پروفیسر موصوف نے مذاح و ہجو وغیرہ کی چند تعریفات پیش کی ہیں۔ انکے متعلق مجھے کچھ شبہات ہیں جنکا اظہار ذیل کی تحریر کی غرض و غایت ہے۔

ہر ادب کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر جو اصطلاحات وضع ہوگئے ہوں وہ ایک معین اور مخصوص مفہوم رکھتے ہوں تاکہ انکا استعمال ہر موقع پر ایک مقرر معنی میں لیا جا سکے اور مماثل اصطلاحات کا باہمی فرق نظر انداز نہ ہونے پائے۔ کسی ادب کی نشوونما اور ترقی کیلئے یہ شرط چنداں ضروری نہ ہو لیکن ادبی تنقید کی کامیابی کے لئے اس شرط کی تعمیل ناگزیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی اصطلاحات کی ابتدائی وضع و ساخت سائنٹفک اصطلاحات کی طرح کسی واضح تعریف کی بنیاد پر نہیں ہوئی اور اسی لئے ایک تنقید نگار کو ان اصطلاحات کا قطعی مفہوم تلاش کرنے میں اکثر بڑی دشواری کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی تنقید کی ضرورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ایسے اصطلاحات کی مقرر تعریفات قائم کردی جائیں تاکہ وہ آپس میں گڈمڈ ہو کر تحریر میں گنجلک نہ پیدا کردیں۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے پروفیسر موصوف کے قابلانہ مضمون کی روشنی میں طنز ہجو اور ظرافت کے متعلق اپنے ذاتی نظریے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ انکی مخصوص اور راسخ تعریفات کی بنیاد ڈالی جا سکے۔

ظرافت نگار تمسخر انگیز واقعات و حالات کا مشاہدہ کرکے خود ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ پروفیسر کلیم اس ہنسنے ہنسانے کا سبب کسی شئے کی "ناموزونیت" "عدم تکمیل" "بیڈھنگا پن" وغیرہ بتاتے ہیں پھر آگے چل کر "دنیا اور زندگی کی ناموزونیت کو مسلم قرار دیتے ہوئے ہنسی کو زندگی کی ناتمامی کے احساس کا نتیجہ کہتے ہیں۔ پہلی تعریف سے مجھے کامل اتفاق ہے گو اس سے ہنسی کے حقیقی سبب پر روشنی نہیں پڑتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہنسی یا احساس ظرافت کے لئے کسی ناموزونیت اور بیڈھنگا پن کا مشاہدہ ضروری ہے لیکن یہ مشاہدہ بذات خود ہنسی نہیں پیدا کرتا۔ مثلاً کسی عزیز خاص کے ناموزوں کردار اور بیڈھنگے پن

ہمیں ہنسی نہیں آتی خصوصاً جب ہم اسے اس کیفیت میں مبتلا دیکھ رہے ہوں۔ اس کے خلاف اس وقت ہمارے اندر جذبۂ غم و ترحم متحرک ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہم کسی غیر شخص کو ایک ناگہانی دشواری میں مبتلا ہو کر بیڈھنگے پن، ناموزوں حرکات، غیر مکمل اور ناکام کاوش کا شکار دیکھتے ہیں تو ہمیں بیساختہ ہنسی آنے لگتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص سائیکل سے الٹکر الکترا سے بھیگی ہوئی سڑک پر گر جاتا ہے اور اس کی زرق برق پوشاک سڑک سے چپک کر ہمارے سامنے اس کی سعی لاحاصل کا منظر پیش کرنے لگتی ہے تو ہم میں سے سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی اگر کھل کھلا نہیں پڑتا تو مسکرا ضرور دیتا ہے۔ یا جب کوئی شخص تیز ہوا میں اپنی بھاگتی ہوئی ٹوپی کا ناکام تعاقب کرتا ہوتا ہے تو ہم خواہ مخواہ مسکرا دیتے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمسخر انگیز واقعات ہنسی کی کیفیت کو متحرک کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ اسے پیدا نہیں کرتے۔ حقیقت میں ہنسی کی کیفیت ایک دوسرے احساس کی آئینہ دار ہے۔ ہنسی عموماً طمانیت و تسکین کا صوری اظہار ہے۔ اس اظہار کی ترکیبیں اور مدارج مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً طمانیت کا اظہار کبھی چہرے کی جھرجھری سے ہوتا ہے تو کبھی مسرت کی شادابی و شگفتگی سے۔ کبھی خندہ زیر لب کے ذریعہ تو کبھی بے پناہ ہنسی اور پرشور قہقہوں کے۔ وہ دوسرے کا بیڈھنگا پن، اس کی بدصورتی، وخامی، ہمارے اندر طمانیت و تسکین کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو اس دشواری اور نقص سے بالاتر سمجھ کر اطمینان کا سانس ہی نہیں لیتے بلکہ اپنی امان و سلامتی کا احساس ہمیں کھل کھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہماری ہنسی خارجی مشاہدہ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایک داخلی احساس کا۔ چغتائی مرحوم کی ظرافت نگاری اس صنف کا بلند ترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ مضمون نگار دو سرپھروں کے الجھاوے، انکی حماقت آمیز کارروائیاں اور تشنۂ تکمیل کوششوں کے مشاہدہ سے خود حظ اٹھاتا اور کمال صنعت کے ساتھ انہیں ناظرین کے سامنے پیش کر کے انہیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقعہ بہم پہونچاتا ہے۔ لیکن ان واقعات کا تعلق لازمی طور پر دو سرپھروں کی ذات سے ہوا کرتا ہے۔ خواہ مضمون نگار نے انہیں اپنی طرف منسوب کر کے کیوں نہ پیش کیا ہو۔ ملا رموزی کی "بیوی زدگی" ان کے پیش کردہ ازدواجی زندگی کی ناموزونیت و عدم تکمیل کے کامیاب مرقعے ہرگز انکے ذاتی تجربات کی عکاسی نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ ملا صاحب کب کے اپنی بیوی سے علحدگی اختیار کر چکے ہوتے یہی سبب ہے کہ اگر مذاحیہ مضمون کا کسی حقیقی خاکہ سے تعلق ہوتا ہے۔

تو مضمون نگار تخیل کے موٹے قلم سے اُسپر رنگ چڑھا کر اُسے خیالی بنا دیتا ہے تاکہ ازالہ حیثیت عرفی (defamation) کے مقدمہ میں ماخوذ ہونے سے بچ جائے

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہنسی حقیقت میں اپنی موزونیت اپنی عدم کمتری، اپنے مکمل ہونے کے احساس کی آئینہ دار ہے۔ بلاشبہہ یہ احساس دوسروں کے نقائص انکی عدم تکمیل سے ابھرتا ہے لیکن آخر الذکر ہنسی کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس صورت میں ہنسی کو " زندگی کی ناتمامی کے احساس کا نتیجہ" سمجھنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا "دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت" پر ہمیں ہنسی نہیں آسکتی۔ ہم کسی فرد یا جماعت کی ناتمامی و ناموزونیت پر ہنس سکتے ہیں لیکن زندگی کے بیڈھنگے پن، زندگی کی عدم تکمیل پر ہم اس وقت تک ہنس نہیں سکتے جب تک ہم اپنی نجات کو زندگی کا نقطہ اسکے سمجھتے ہیں جب تک ہمارے اندر زندگی سے وابستگی کی، یا دوسرے لفظوں میں، زندگی کرنے کی آرزو متحرک ہے ہاں زندگی کی عدم تکمیل و ناموزونیت پر ہم اسوقت دانت بسورنے لگتے ہیں جب زندگی کی اندوہناکیاں، زندگی کی بے مہریاں ہماری جمعیت خاطر ہمارا امن و سلامتی کا احساس ہم سے قطعًا چھین لیتی ہیں، زندگی سے مہر و وفا کی اُمید یکسر ہمارے دل سے مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔ لیکن اس ہنسی کو ہم احساس ظرافت کا نتیجہ نہیں کہتے۔ اس لئے کہ اس ہنسی کے کھوکھلا پن میں ہمیں کرب و اذیت کی جگر خراش گونج سنائی دیتی ہے۔ ایسی خندہ بے معنی دبے جا کو انگریزی اصطلاح میں (hysteria complex) یا پاگلپن کی ہنسی کہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس نوع کی ہنسی پروفیسر موصوف کے پیش نظر نہیں۔

ہجو ظرافت کی ایک قسم کہی جا سکتی ہے۔ لیکن ہجو و ظرافت میں ایک بنیادی فرق ہے ظرافت نگار ایک بے لوث مشاہدہ کرکے اس سے خود حظ اٹھاتا اور اپنی قوت تحریر کے ذریعہ دوسروں کے لئے سرمایہ انبساط پیش کرتا ہے۔ اسکی مثال سنیما ہال کے حاضرین کی ہے جو آنکھیں کھولے پردہ پر پیش کی ہوئی تصویروں کا مشاہدہ صرف لطف اندوزی کی غرض سے کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہجو گو کے اندر " ذاتی عناد اور تعصب" کا عنصر پایا جانا لازمی ہے مجھے پروفیسر موصوف کے اس جملہ سے کامل اتفاق ہے کہ " ہجو گو شاعر ایک برہم انسان ہے اور اسکی برہمی بے لوث نہیں بالوث ہوتی ہے"۔ لیکن وہ اسے ہجو کی اساسی شرط نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں " کامیاب ہجو گو ......... عالمگیر ناانصافی کو ہی طنز کا نشانہ بناتا ہے"۔ کامیاب ہجو گو کیلئے ضروری ہے کہ " ...... اپنے جذبہ نفرت و غضب کو تمام انسانی نقائص کے خلاف

برانگیختہ کرسکے"۔ ہجو کی اس تعریف کی بنا پر وہ اسے طنز کا مترادف قرار دیتے ہیں اور پروفیسر رشید احمد کے اس قول کو "بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک ہو اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو" غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔ لیکن خود ایک اور جگہ پر بیان کرتے ہیں کہ "ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے"۔ ہجو کی ان تعریفات کے بعد سودا کا ہجویہ قصیدہ "در ہجو اسپ" کے چند اشعار نموتاً پیش کرتے ہیں۔ شاعر ایک ادنیٰ انسان کی طرح ذاتی طور پر زمانہ کی کج روی اور چیرہ دستی سے متاثر ہوتا ہے اور اسی ذاتی عناد کا ہجو میں اظہار کرتا ہے۔ چونکہ اس کا روئے سخن زمانہ کی تمام ناانصافی و بے مروتی کی طرف نہیں ہے وہ زمانہ کو ایک مریل ٹٹو کی صورت میں پیش کرکے اسے کوسنے اور گالیاں دیتا ہوا اپنے بغض و نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ سودا کی دوسری ہجویں جنکا ذکر پروفیسر موصوف نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اسی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ہر جگہ ذاتی عناد کی جھلک صرف نمایاں ہی نہیں بلکہ غالب ہے۔ چنانچہ پروفیسر موصوف کو خود اس کا اقبال ہے کہ "وہ (سودا) جملہ انسانی نقائص سماج کی بے انصافیوں مختلف طبقوں پیشوں کل انسانیت کو حلقہ ہجو میں نہیں داخل کرتے"۔

حقیقت میں ہجو ظرافت نگاری کی وہ قسم ہے جس میں ظرافت نگار صرف دوسروں کو ہنساتا ہے۔ عام مذاح نگار پہلے خود ہنستا اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے ہجو گو خود گالیاں اور کوسنے دیتا خود برہمی و نفرت کا اظہار کرتا لیکن ناظرین کو ہنسی کا سرمایہ بخشتا ہے۔ ہجو کے اندر ذاتی عناد بغض و انتقام کی چنگاری سلگتی رہتی ہے جس کا نشانہ زیادہ تر کوئی فرد واحد ہوا کرتا ہے یا وہ جماعت جس سے ہجو گو کو ذاتی گزند پہونچا ہو۔ ہجو گو موضوع ہجو کی کوتاہیاں اس کی حماقتیں اس کے نقائص کا بالوث اور جانبدارانہ مشاہدہ کرتا ہے، ذاتی عناد و جذبہ انتقام [illegible]۔ اسی سبب سے اس کے بیان میں مبالغہ اور تکرار کا نقص نمایاں ہوتا ہے۔ عام ناظرین کے لئے جو نشانہ ہجو کی ذات سے کوئی عناد و تعصب نہیں رکھتے ہجو سامان ظرافت مہیا کرتی ہے اور وہ اپنی امان و سلامتی کے احساس سے بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔ کم از کم یہ احساس کہ وہ اس ہجو کی زد سے محفوظ ہیں اور انکا مذاق نہیں اڑایا جا رہا ہے انہیں خندہ زن کر دیتا ہے ہجو گو کو انکی ہنسی میں اپنے ترکش کے تیر کی کامیابی نظر آنے لگتی ہے اس کے اندر بھی طمانیت اور تسکین کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ ہنسنے لگتا ہے۔ سودا کے ہجویہ قصیدے اس

نظریہ کا کامل ثبوت پیش کرتے ہیں اور اگر سودا کی نظموں کو ہجو کا اعلیٰ ترین نمونہ قرار دیا جائے تو اس کی صحت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

میرے خیال میں ہجو ایک قدیم اور غیر مہذب صنف شاعری ہے اسی سبب سے ہجو میں سنجیدگی اور متانت کا فقدان لازمی ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر ہجویں سوقیانہ خیالات اور وحشیانہ جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ وحشی و نیم مہذب قومیں جب اپنے دشمنوں سے حقیقی طور پر انتقام لینے سے قاصر ہوتی ہیں تو انتقام کی فرضی صورتیں اختیار کرتی ہیں ان میں ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ اب تک اکثر مہذب قوموں میں بھی رائج ہے اور باقیات حیاتیاتی میں شمار کی جاسکتی ہے۔ غنیم سے انتقام لینے کی غرض سے اس کا ایک پُتلا بنایا جاتا ہے اور رسمی طور پر اس پُتلے میں آگ لگائی جاتی ہے۔ غیر مہذب انسان اس طریقہ کو ایک نہایت کامیاب حربۂ انتقام تصور کرتا تھا۔ بسا اوقات نوحہ و ماتم کے مکمل مظاہرے کے ساتھ غنیم کا فرضی جنازہ نکالکر بغض و انتقام کی آگ ٹھنڈی کی جاتی ہے۔ ہجوگو بھی جب غنیم کو حقیقی طور پر زیر نہیں کر سکتا تو اسی طرح واقعیت سے علحدہ ہوکر غنیم کی مبالغہ آمیز اہانت اور تضحیک کے ذریعہ جذبہ انتقام کی فرضی تسکین کا سامان کرتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ہجو میں ذاتی عناد و تعصب کا عنصر لازمی ہے۔ طنز اس سے قطعًا مبّرا ہے۔ مجھے پروفیسر موصوف سے اتفاق ہے کہ طنز گو "ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے"۔ "وہ ہمدردی ترحم انصاف فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ بغض و حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے"۔ ایک طرف تو وہ ہمارے سامنے افراد کا بیڈھنگا پن، جماعتی اداروں کی ناموزونیت، سماجی مفروضات کا کھوکھلا پن پیش کرکے ہمیں سامان ظرافت بہم پہونچاتا ہے تو دوسری طرف وہ ہمارے اندر سماجی انصاف، صحیح اجتماعی حس، حقیقی جذبہ نوعی کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ طنز گو اپنے موجودہ ماحول کا مذاق اڑاتا، ان کا ٹھٹھا کرتا۔ واعظ و مصلح کو رندوں کے درمیان پگڑیاں اچھالتے دیکھکر ہنستا اور دوسرونکو ہنساتا ہے۔ علم برداران مذہب و اخلاق کی آنکھوں سے پٹّیاں کھول کر انھیں اور ان کے فدائیوں کو ایک عجیب ناموزونیت اور بیڈھنگے پن کی کیفیت کا شکار بنا دیتا ہے۔ دین و ملت کے شیدائیوں کو خود انھیں کے ہاتھوں دین و ملت کی بیخ کنی کا نقشہ دکھاکر انہیں ایک تمسخر انگیز اضطراب و عدم تکمیل کے احساس میں مبتلا کردیتا ہے۔ لیڈران و مصلحان قوم کو انکی قوم فروشی کا ثبوت پیش کرکے ان کے انجام

ایک عجیب جز بز کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وارفتگان تہذیب وتمدن دواعیان علم وحکمت کو کورانہ قدامت پسندی اور جہل مرکب کا شکار ثابت کرکے انہیں ایک دلچسپ پیچ وتاب میں ڈال دیتا ہے۔ خود ایک تماشہ بیں کی حیثیت سے پورے طور ان کیفیات ومناظر کے مشاہدہ سے محظوظ ہوتا اور ہنستا ہے۔ پھر انہیں تحریر کے سانچے میں ڈھال کر دوسروں کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس وقت تک اس کی حیثیت صرف ایک ظرافت نگار کی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں پر نظر ڈالتا اور انکی تمسخر انگیزی سے اپنے آپ کو آزاد پاکر خوش ہوتا ہے۔ اس کا عمل اور اس کے تاثرات خالصتاً انفرادی یا ذاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک خودبیں وخودغرض انسان کی طرح دوسرونکی بدحالی سے اپنی خوش حالی کے لئے پس منظر طیار کرتا ہے۔ میرے اس بیان سے خالص ظرافت نگاری کی تعریف پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ظرافت نگار کے تاثرات اور اسکی نگارش خالصتاً اسکی انفرادی حیثیت کی عکاسی کرتی ہے۔ یہی فرق طنز نگاری کو خالص ظرافت نگاری سے ممیز کرتا ہے۔ طنز نگار ظرافت نگار ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ اسکے تاثرات صرف اسکی انفرادی حیثیت کے آئینہ دار نہیں ہوتے بلکہ اسکی جماعتی حیثیت کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی انفرادیت اسے دوسروں کی تکلیف میں اپنی امن وسلامتی کی جھلک دکھلاتی ہے لیکن اس کی اجتماعیت اُسے دوسرونکی حماقتوں میں اپنی بربادی کا نقشہ پیش کرنے لگتی ہے وہ ہنسنے کے بعد رونے لگتا ہے۔ پہلی ساعت میں وہ ایک فرد کی حیثیت سے پیرو ملا مصلح و واعظ کے بے تکے پن پر ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے لیکن دوسرے لمحے میں میں اس کا حس قومی ضمیر کی صورت میں انفعال و ندامت کے تیر برسانے لگتا ہے۔ ہمدردی وترحم انصاف وفیاضی کے جذبات اس کے اندر ابھر آتے ہیں۔ ان کھوکھلے ناموزوں اور لایعنی اداروں کے ہاتھوں اپنی اجتماعیت کو فنا ہوتے دیکھکر وہ غصہ وبغض وحقارت کے جذبات سے بے قابو ہوجاتا ہے۔ اس کی نگارش پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی ویسی ہی کیفیات پیدا کردیتی ہے۔ انہیں بھی وہی چبھن محسوس ہونے لگتی ہے ان کے اندر بھی نفرت، حقارت بغاوت وانقلاب کے ویسے ہی جذبات ابھرنے لگتے ہیں میرے خیال میں طنز نگار ایک مکمل ادیب ہے اس لئے کہ اسکی آواز پر ہماری جامع شخصیت گونج اٹھتی ہے وہ ہماری انفرادیت کو جھنجھوڑ کر ہمارے اندر زندگی کی روح پھونک دیتا ہے اور ہمارے خوابیدہ محرکات کو بیدار کردیتا ہے۔ پھر ہماری اجتماعیت کو تیز کرکے انفرادیت کے بارود کو سماجی غلطیوں، اجتماعی حماقتوں کے نشانہ پر لگا دیتا ہے۔

محمد محسن

* محسن صاحب نے بہت صحیح کہا ہے کہ تنقید میں جن الفاظ کا استعمال ہو وہ معین اور متعین مفہوم رکھتے ہوں

میں نے اپنی مختلف تحریروں میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً "معاصر" جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۰۴ پر یہ جملے ملیں گے:۔ "... اصل یہ ہے کہ عموماً انسان کا دماغ ذرا کاہل ہوتا ہے۔ نہ وہ صاف طور پر سوچتا ہے اور نہ اپنے خیالات کو صاف غیر مبہم پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ غور و فکر ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے محنت و مشق کی ضرورت ہے اور ہر شخص میں اس دماغی محنت و مشق کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ تعلیم ناقص ہوتی ہے اور اس صلاحیت سے صحیح مصرف لینا نہیں سکھاتی عام بول چال روزمرہ کے تعلقات میں انسان کو اس نقص کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ کم و بیش کامیابی کے ساتھ اپنا کام چلاتا ہے۔ لیکن سائنس میں اُسے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بے کم و کاست بیان کرے اور انہیں دوسروں تک پہونچا سکے۔ اس لئے سائنس میں الفاظ علامات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر علامت ایک مخصوص چیز کا اظہار ہوتی ہے اور اس طرح خیالات صفائی کے ساتھ معین و غیر مبہم پیرایہ میں الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں تنقید میں بھی اظہار خیال کے لئے صاف و معین الفاظ کی ضرورت ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال لازمی ہے جن کے مفہوم مقرر شدہ ہیں یا جنکے مفہوم (اور الفاظ جو اُن کے آگے پیچھے مستعمل ہوں) کے مفہوم کی وجہ سے صاف و مقرر ہو جائیں"۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق محسن صاحب کی رائے میری رائے سے مختلف نہیں۔

دوسری بات جو محسن صاحب نے کہی ہے وہ ہنسی کے سبب سے متعلق ہے محسن صاحب نفسیات کے ماہر ہیں اس لئے انہیں ہنسی اور دوسری چیزوں کے اسباب سے خاص دلچسپی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہنسی کے سبب سے (جس مفہوم میں محسن صاحب اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں) بحث نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔ "فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں"۔ اس لئے ان کی تحریر کا یہ دلچسپ اور اہم حصہ جہاں تک اس کا میرے مقالے سے تعلق ہے غیر متعلق ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہنسی عموماً عدم تکمیل، بیڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے اور محسن صاحب بھی اس سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ ہنسی یا احساس ظرافت کے لئے کسی ناموزونیت اور بیڈھنگے پن کا مشاہدہ ضروری ہے"۔ میرے اس جملے اور دوسرے جملے میں کوئی تضاد نہیں: "ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے" یعنی اگر زندگی ناتمام نہ ہوتی تو پھر کسی ناموزوں، بیڈھنگی شے کا مشاہدہ ممکن نہ ہوتا۔ یہی بات میں نے ایک دوسری جگہ واضح کر دی ہے:۔ "جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے اس لئے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں"۔ ان جملوں سے صاف

ظاہر ہے کہ مجھے ہنسی کے فوری و خارجی سبب سے بحث ہے میں نے ہنسی کے حقیقی سبب پر کچھ لکھنے سے قصداً احتراز کیا ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے محسن صاحب بھی متفق ہیں۔ پھر میں نے یہہ نہیں کہا ہے کہ ہمیں دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت پر ہنسی آتی ہے۔ کہنے کا مطلب صرف یہہ ہے کہ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت کی وجہ سے ہنسی کے مواقع ملتے ہیں اور ہم ہنستے ہیں تو کسی خاص ناموزوں واقعہ کے مشاہدہ سے۔ مجھے امید ہے کہ میرے اس بیان سے محسن صاحب کے وہ شبہات جن کا تعلق اس خاص نکتہ سے ہے رفع ہو جائیں گے۔

اب میں یہہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کیوں ہنسی کے سبب پر بحث کرنے سے احتراز کیا۔ بات یہہ ہے کہ تنقید ایک مستقل فن ہے۔ یہہ فن دوسرے علوم و فنون سے مصرف لیتا ہے لیکن کوئی دوسرا فن فن تنقید کا بدل نہیں ہو سکتا۔ نقاد مختلف علوم و فنون سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے اس واقفیت سے ناجائز مصرف لینا نہیں چاہئے یعنی اُسے اپنی تنقید کو تاریخ، معاشیات، نفسیات وغیرہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہئے۔ خصوصاً اسے ایسے تاریخی، معاشیاتی، سیاسی، نفسیاتی مسئلوں سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے۔ جو تنقید سے سروکار نہ رکھتے ہوں اور جن پر تاریخ، معاشیات، نفسیات کے ماہرین متفق نہوں ہنسی کا سبب بھی اس قسم کا ایک مسئلہ ہے۔ اس سبب کی تلاش ہمیں تنقید کی سرحد سے باہر لیجاتی ہے اور نفسیات کی قلمرو میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہہ مسئلہ آسان نہیں اور اس پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک مفصل مقالے کی ضرورت ہے۔ جس کی گنجائش میرے مضمون" اردو ادب میں طنز اور ظرافت" میں نہ تھی۔ پھر یہہ بھی یاد رہے کہ نفسیات ابھی نیا اور نوخیز سائنس ہے اور اپنی حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود بھی یہہ انسانی دماغ کی اتھاہ گہرائیوں سے مطلق واقف نہیں۔ انسانی دماغ بھی کائنات کی طرح وسیع ہے۔ اس کی پیچیدگی، اس کے تاریک رستے اور گوشے، اس باریک اور دشوار قوانین سے مکمل واقفیت میسر نہیں۔ بہرکیف محسن صاحب کہتے ہیں کہ "ہنسی عموماً طمانیت و تسکین کا صوری اظہار ہے" وہ پھر فرماتے ہیں کہ "ہنسی حقیقت میں اپنی موزونیت اپنی عدم کمتری، اپنے مکمل ہونے کے احساس کی آئینہ دار ہے"۔ لیکن یہہ تعریف بھی ہنسی کی تمام صورتوں پر حاوی نہیں۔ مثلاً اس ہنسی کو لیجئے جسے عرف عام میں کھسیانی ہنسی کہتے ہیں۔ اس قسم کی ہنسی اپنی موزونیت کی آئینہ دار نہیں۔ یہہ اپنی ناموزونیت کی پردہ دار ہے۔ پھر ہنسی کا ایک سبب اعصاب کی کمزوری ہوتی ہے۔ جو لوگ nervous

ہوتے ہیں وہ بات بات پر بلا وجہ ہنستے یا مسکراتے ہیں اور یہہ ہنسی ان کی موزونیت طمانیت یا تسکین کا صوری اظہار نہیں۔ اس قسم کی مختلف مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

میں نے ظرافت، طنز، ہجو کو تین انگریزی لفظوں کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے جو ترتیب وار یہہ ہیں Satire, irony, humour ہجو اور ہجو گو شاعر کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی محسن صاحب کو کچھ اختلاف ہے۔ ہجو گو شاعر، انسان بھی ہے اور شاعر بھی۔ ایک طرف تو وہ ایک برہم انسان ہے اور اس کی ہجووں کی ابتدا ذاتی عناد اور تعصب سے ہوتی ہے لیکن وہ شاعر یعنی صناع بھی ہے اور شاعر یا صناع کی حیثیت سے وہ اپنے ذاتی جذبہ سے علحدگی اختیار کرتا ہے اور اپنے ذاتی جذبہ کو عالمگیری (universality) عطا کرتا ہے۔ یہہ علحدگی (detachment) ہر صناع کے لئے ضروری ہے ورنہ وہ کامیاب صناع شمار نہیں کیا جا سکتا۔ محسن صاحب نے شاید اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ میں نے ہجو کو طنز کا مترادف قرار دیا ہے۔ یہہ صحیح نہیں۔ رشید احمد صاحب نے طنز کو ہجو کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اسی لئے میں نے ان کی تعریف کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ پھر میرے ان دو جملوں میں کوئی تضاد نہیں: "ہجو گو شاعر ایک برہم انسان ہے اور اس کی برہمی بے لوث نہیں بالوث ہوتی ہے" اور "ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے" میں نے ابھی کہا ہے کہ ہجو گو شاعر اپنے ذاتی جذبات سے علحدگی اختیار کرتا ہے اور انہیں عالمگیری عطا کرتا ہے۔ ہجو اگر وہ محض ذاتی عناد اور تعصب کا اظہار ہے تو زیادہ قدر وقیمت نہیں رکھتی اور اس کا اثر دیرپا اور عالمگیر نہیں ہوتا۔ انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کی جو مذمت ہوتی ہے وہ بلند اخلاقی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ اگر یہہ بلند اخلاقی نقطۂ نظر موجود نہو تو پھر مذمت کی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہجو گو شاعر ایک بلند اخلاقی مقام سے ان خامیوں کا انکشاف کرتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب نے ہجو میں صناعت کے وجود کو فراموش کر دیا ہے اور ان خصوصیتوں سے سروکار نہیں رکھا جو ہجو گو کو صناع بناتی ہیں۔

محسن صاحب نے ہجو اور طنز کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مجھ سے اتفاق ظاہر کیا ہے: "مجھے پروفیسر موصوف سے اتفاق ہے کہ طنز گو ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے"۔ وہ ہمدردی ترحم انصاف فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ

وہ غصّہ بغض و حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے"۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا
تعلق ہجوگو سے ہے۔ ملاحظہ ہو "بہر کیف ہجوگو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے، وہ
ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی ترحم انصاف، فیاضی کے جذبات کو ابھارتا
ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصّہ، بغض حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے ظرافت نگار
کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے" میں نے ظرافت اور ہجو،
ظرافت نگار اور ہجوگو میں تفرقہ کیا ہے۔ میں نے ہجو کو برابر satire کے مفہوم میں استعمال
کیا ہے۔ ہجوگو ظرافت اور طنز دونوں سے مصرف لیتا ہے۔ خالص ظرافت نگار اور ہجوگو
میں البتہ فرق ممکن ہے اور اس فرق کو میں نے صاف طور پر ظاہر کیا ہے۔ طنز ایک آلہ
ہے جسے ہجوگو استعمال کرتا ہے اس لئے طنز اور ہجو میں تفرقہ کرنے کی ضرورت نہیں
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب طنز کو satire کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں
اور ہجو کو کسی مخصوص و محدود معنی میں۔ اسی وجہ سے وہ ہجو کو "ایک قدیم اور غیر مہذب صنف
شاعری" قرار دیتے ہیں اور طنز نگار کو "مکمل ادیب" سمجھتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے
ظرافت، طنز اور ہجو کو ترتیب وار satire. irony. humour کے مقابلہ میں استعمال کیا
ہے۔ اگر محسن صاحب یہہ بات پیش نظر رکھیں تو ان کے کئی شبہات رفع ہو جائیں گے۔]

(ک۔ ا۔)

# بشارۃ الامامۃ

الٰہ آباد سے پٹنہ روانگی کا حال ب میں اس طرح لکھا ہے :

چو از قدرتِ قادر بے ہمال ۔۔۔ بہ شد منقضی موسم[1] برشکال

بہ عزمِ ملاقاتِ پور کلاں ۔۔۔ بروں آمد از شہر[2] باہم رہاں

پسر مہتر آں ولیِ نعم ۔۔۔ ہدایت علی خاں بہ عالم علم

بہ اقبالِ دولت بہ پٹنہ مقیم ۔۔۔ بہ کارِ نظامت بہ شانِ عظیم

شاہ غلام علی بھی ساتھ تھے، پٹنہ سے سانوت[3] جانا ہوا :

وزآں سوے سیّد بہ سانوت رسید ۔۔۔ درآں بقعہ از رہ رواں کس شنید

کہ گردید از گردشِ چرخ پیر ۔۔۔ ہدایت علی خاں درآں جا اسیر

امیرے کہ آمد بہ جایش نشست ۔۔۔ رہ و فعلِ اغیار محکم بہ بست

وو دیدند از چار سو ہم رہاں ۔۔۔ ز اولاد و احباب و از پے رواں

---

[1] سیر ۶۱۲ سالِ ورودِ عظیم آباد ۱۱۵۵ھ۔ اُس زمانے میں ہدایت علی خاں عارضی طور پر عظیم آباد کے نائب ناظم تھے۔ ۱۱۵۵ھ میں برسات کا خاتمہ رمضان میں ہوا، اس لیے شاہ صاحب اس مہینے میں یا شوال میں پٹنہ پہنچے ہوں گے۔

[2] ف ۹۵ ملخصاً : شاہ غلام علی نے چاہا کہ شاہ صاحب سوار ہو کر چلیں، لیکن انھوں نے انکار کیا، تا چار پیادہ پا چلے اور ننگے سر ننگے پاؤں پٹنہ پہنچے، ہدایت علی خاں کے سنتریوں نے صدر دروازے پر روکا۔ شاہ غلام علی نے بتایا کہ شاہ علیم اللہ صاحب ہیں۔ ہدایت علی کو خبر ہوئی، ننگے پاؤں دوڑے آئے، دیوان خانے میں لائے اور ایک وسیع کمرا جہاں جملہ سامانِ آسایش مہیا تھا، ان کے لیے مخصوص کرنا چاہا، لیکن انھوں نے ایک مختصر سی کوٹھری اپنے قیام کے لیے پسند کی۔ اور اپنا کمبل وہیں بچھایا۔ شاہ غلام علی بھی اسی کوٹھری میں رہنے لگے۔ یہ سب ب میں نہیں، اگرچہ ف میں ب کے حوالے سے درج ہے۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ میں تھوڑے ہی دن قیام کے بعد سانوت چلے گئے، اس لیے کہ صفدر جنگ اواخر شوال یا اوائل ذی قعدہ میں واردِ پٹنہ ہوئے ہیں اور اس کی خبر شاہ صاحب کو سانوت میں ملی ہے۔ اس کے متعلق جناب شاد کا (بہ حوالۂ ب ف ۳۵) بیان ہے کہ بھاسکر پنڈت کے پٹنہ آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہدایت علی نے اپنے عیال و اطفال کو اور شاہ علیم اللہ صاحب کو حسین آباد بھیج دیا۔ بھاسکر پنڈت کے ڈر سے شاہ علیم اللہ صاحب کے حسین آباد جانے کا ذکر ب میں کہیں نہیں، سیر ۵۲۲ میں یہ ہے کہ بالاجی راؤ کے حملہ آور ہونے کا ڈر تھا، ہدایت علی نے بہت اصرار کیا کہ اُن کے عیال و اطفال کے ساتھ گنگا پار چلے جائیں، لیکن اس پر راضی نہ ہوئے، اور یہ پیشین گوئی کی کہ "ہرگز دریں شہر از بلائے کہ می آید کسے اثرے نہ خواہد دید" یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ جناب شاد نے سانوت کو حسین آباد بنا دیا، اور واقعے کا تعلق صفدر جنگ کی جگہ بھاسکر پنڈت سے پیدا کر دیا ہے۔ ب میں کسی جگہ شاہ صاحب کے حسین آباد جانے کا ذکر نہیں۔

شاہ علیم اللہ صاحب نے کہا کہ یہہ خبر صحیح نہیں ان کے حکم کے مطابق شاہ غلام علی دریا کے کنارے گئے اور وہاں دعاے قاموس قدرت پڑھی، دیر تک انتظار کرنے کے بعد ایک شتر سوار نظر آیا، جس نے یہہ اطلاع دی کہ ہدایت علی خاں آزاد ہیں، اور صفدر جنگ واپس چلے گئے ہیں۔[۵۴] ب میں شاہ علیم اللہ صاحب کی کرامتوں کے ذکر میں ایک واقعہ یہہ درج ہے: چوروں کا ہنگامہ رہا کرتا تھا اور لوگ راتوں کو مکانوں کی حفاظت کیا کرتے تھے، شاہ صاحب نے ایک دن کہا کہ کوئی پاس بانی نہ کرے، اور خود شاہ غلام علی کی گود میں پاؤں رکھ کر سو گئے۔ شاہ غلام علی کہتے ہیں کہ:

زخوابیدگاں ہر کہ چشمے کشود عیاں پیکر شش در نظر می نمود

بہ چشم خود ایں واقعہ دیدہ ام نہ از دیگراں قصہ بشنیدہ ام[۵۵]

شاہ علیم اللہ صاحب کی وفات کا حال یوں درج ہے:

۱۰ رجب کو شاہ علیم اللہ کے بیٹے (ہدایت علی خاں سے مراد ہے)[۵۶] کہیں سفر کو روانہ ہوئے، انھوں نے اپنی موت کی پیشین گوئی کی۔ ۱۴ شعبان کو بیمار ہوئے، بیماری کو دس دن گزرے تھے کہ دو آدمی عربی عمامہ سر پر رکھے "ہندوستانی لباس پہنے" ہم اندام وہم قامت وہم قدم" ان کے پاس آئے، تھوڑی دیر خاموش بیٹھے اور چلے گئے۔ لوگ ان کے پیچھے دوڑے کسی کو اس کا پتا نہ چلا کہ کون تھے اور کدھر غائب ہوگئے۔ خالِ مصنف عبدالعلی نے پوچھا کہ یہہ کون لوگ تھے؟ جواب دیا کہ یہہ نہیں بتا سکتا۔

---

۵۴ ت ص۳۷ ملخصاً: حسین آباد میں ہدایت علی خاں کے مقتول ہونے کی خبر آئی۔ غلام حسین رونے لگے۔ اس کا سبب شاہ غلام علی کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ خبر غلط ہے، "حضرت کے حکم سے میں صبح ہی دریافت کر چکا ہوں" اس سے تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہی باتیں ہیں جو ب میں ہیں، مگر خفیف اختلاف کے ساتھ

۵۵ جنوں سے متعلق ایک روایت ف ص۳۶ و ۳۷ میں بہ حوالۂ ب درج ہے۔ یہہ بعض اختلافات کے ساتھ ب میں موجود ہے، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر یہہ اختلاف ہے کہ جناب شاد کے بیان کے مطابق اس روایت کے سلسلے میں ب میں شاہ غلام علی کا چند دنوں کے لیے دیورہ جانا لکھا ہے، یہہ ب میں نہیں۔ جناب شاد نے خالی برتن سے آٹا نکالنے کی روایت جو لکھی ہے وہ بھی ب میں نہیں اور یہی حال اُس روایت کا ہے جو مہابت جنگ کے دیورہ جانے کے بارے میں ب کے حوالے سے ص۳۷ پر مرقوم ہے۔ اس روایت سے مفصل بحث کسی دوسرے موقع پر ہوگی۔ اس روایت کو میں نے ن میں بھی غلط قرار دیا تھا، لیکن ن میں مہابت جنگ اور شاہ غلام علی صاحب دیوروی کی عمروں کے تفاوت کی نسبت جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ صحیح نہیں، میں اُس وقت اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ شاہ غلام علی صاحب دیوروی ہی کا ذکر ب میں ہے۔

۵۶ ہدایت علی خاں ہیبت جنگ کے نائب زیادہ دن نہیں رہے۔ صفدر جنگ کے ساتھ جو سلوک انھوں نے کیا تھا اس سے مہابت جنگ اور ہیبت جنگ ناراض ہو گئے تھے۔ رجب ۱۱۶۰ھ میں ہدایت علی خاں صوبۂ بہار کو چھوڑ دینے کے ارادے سے پٹنہ سے رخصت ہوئے تھے۔

اسی شب[۵] کو انتقال کیا۔ وفات[۶] کے حالات مصنف نے شاہ غلام علی کی زبانی بیان کیے ہیں:

به دروازه حاجت نشست و به بست — دلے شسته از زندگانیش دست
سه ساعت ز شب رفته چوں کم و بیش — سوے قبله رو کرده بر پشت خویش
من از اضطراب آمدم سوے او — نهادم کف دست بر روے او
چو بردم دگر دست بر سینه اش — همان سینهٔ پاک بے کینه کش
کف دست بر پشت دستم نهاد .... مرا بیعت[۹] آخریں دست داد
سه کرّه علیؓ ولی را به خواند — جمالش چو بنمود جاں برفشاند

مصنّف نے یہہ بھی لکھّا ہے کہ خواب میں دو دوستوں کو جن میں ایک منیر کا تھا اپنے مرنے کی خبر دے دی تھی چناں چہ یہہ دونوں وقت پر عظیم آباد پہنچ گئے تھے۔

مصنف نے شاہ غلام علی کے زہد و اتقا کی بڑی تعریف کی ہے۔ سال میں چھ سات مہینے گوشت، مچھلی، روغن نمک سے پرہیز کرتے،

گہے صوم و گاہے قلیل الطعام — خموش اغلب اوقات و کم در کلام

شاہ غلام علی کے متعلق اشعار ذیل سے پتا چلتا ہے کہ مصنف اور شاہ غلام علی کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے:

مرا از جوانیش تا ایں امد — که پنجاه و سه مرحله می رود
جدائی نه رو داده از اتفاق — کما قیل خیر الامور الوفاق

---

۵ سیر ص۶۱۳ میں زمانۂ وفات شعبان ۱۱۵۶ھ مرقوم ہے، لیکن، جناب سیّد ریاست علی صاحب ندوی نے نہ معلوم کس بنا پر ندیم کے بہار نمبر میں سالِ وفات ۱۱۵۵ھ لکھا ہے۔ جناب شاد نے نقش ناپایدار جلد ا میں تحریر فرمایا ہے کہ شاہ علیم اللہ صاحب اپنے مرید شاہ ﷲی کی خانقاہ میں جو محلہ نون گولہ میں ہے دفن ہوئے۔ میں نے اس کی تحقیق نہیں کی ہے۔

۶ جناب شاد نے ب، کے حوالے سے لکھّا ہے کہ "جس شب کو آپ کا انتقال ہوا علی الصّباح حسب معمول میں (یعنی مصنف) اندر سے باہر آیا تو دیکھا کہ.. شاہ غلام علی.. رو رہے ہیں۔ سبب پوچھا تو فرمایا کہ پہر رات باقی ہے.. شاہ.. صاحب نے رحلت فرمائی۔ بیماری کچھ نہ تھی، مجھ کو پکارا میں چونکا تو حضرت نے فرمایا بیٹا میں رخصت ہوتا ہوں۔ صبح کو جب تک منیر اور بہار کے صاحبان سجّادہ نہ آئیں مجھ کو دفن نہ کرنا، چناں چہ ایک پہر دن چڑھے یہہ دونوں حضرات، بہ سواری پالکی آموجود ہوئے۔ معلوم ہوا کہ خواب میں ان دونوں کو حضرت نے ہدایت کی تھی"

۹ اس سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے ۱۰ ص۳۶ بہ حوالہ ب: ہفتے بھر میں صرف ایک دن دسترخوان پر بیٹھ کر شاہ علیم اللہ صاحب اور شاہ غلام علی صاحب کھانا کھا لیتے تھے، باقی دنوں میں کبھی خود شاہ غلام علی صاحب جو کی روٹی اپنے ہاتھ سے پکاتے اور نمک کے ساتھ کھاتے، کبھی جو کا ستو کبھی چنے کا ستو بغیر نمک کے دونوں صاحب کھا لیتے، روزے بہت رکھتے تھے۔ ب میں اسی قدر ہے جو متن میں مرقوم ہے۔

الی الآن باہم بسر بردہ ایم — بہ نیک و بد او نظر کردہ ایم
بہ الحمد تا حالت ارتقام — کہ از ہجرت پاکِ خیر الانام
پس از یازدہ صد نود سال و دو — ہمیں ور گذارست چوں آب جو
انیس و جلیسیم با آں عزیز — تماشائیِ لطفِ حیِّ قدیر

آخر میں عفوِ گناہ کی دعا کی ہے، ان دو شعروں پر مثنوی کا خاتمہ ہوتا ہے:

بدون ارادہ بغیرِ خیال — ہمیں مصرعِ آخر ایں مقال
"بخشا بحق[۱] نبی و علی" — برابر بہ سال ست چوں بشمری

مثنوی کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے: ہذا کتاب بشارۃ الامامۃ حسب فرمان واجب الاذعان مربی غربا و مومنان جناب نواب سید ولایت علی خاں صاحب قبلہ لازالت شموس اقبالکم و دامت افضالکم و نوالکم ۔ عبد الذلیل فدویہ حسین فرحت حسین نقوی ساکن محلہ لودی کٹرہ من محلات شہر پٹنہ بہ تاریخ چہاردہم شہر ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ تحریر نمود ۔

نواب سید ولایت علی خاں کے دستخط کے ساتھ ان کی مہر ہے اور ان کے قلم سے یہ عبارت:
بہ تاریخ ۲۴ جمادی الثانی کتاب ہذا از مقابلہ و صحت فراغت یافت سید ولایت علی خاں ۔
"اقبالکم و افضالکم" وغیرہ میں "کم" کو "ہم" بنا دیا ہے ۔ کتاب میں جا بہ جا اصلاحیں ہیں ۔ مثالاً:

بہ فرمود بر صفحۂ روزگار — زر افشاں ز خورشید انوار بار
اصلاح: ہم او کرد بر صفحۂ روزگار — زر افشانی مہر انوار بار
یکے قرص مہر و دوم قرص ماہ — بہ ہیں ایزدت دادہ روشن نگاہ
اصلاح: " — کہ بر دفترِ فیضِ عاشں گواہ
وصیِ نبی جانشیں علی — ضیائے دو عالم امام جلی
اصلاح: " — ضیائے جہاں ست و جانِ نبی

یہ غلطیاں جن کی اصلاح کی گئی ہے کاتب کی نہیں معلوم ہوتیں ۔ کہیں کہیں حواشی بھی ہیں جو غالباً جناب شاد کے لکھے ہوئے ہیں ۔

---

[۱] اس مصرع سے ۱۱۹۳ نکلتا ہے ۔ اس سے قبل " خاتمے سے کچھ ہی پیشتر ۱۱۹۲ھ کا ذکر آیا ہے ۔ ممکن ہے کہ مثنوی کا بیشتر حصہ ۱۱۹۲ھ یا اس سے قبل ہی لکھا گیا ہو لیکن بالکل آخر کے اشعار ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئے ہوں ۔

اس مثنوی سے متعلق ایک اہم سوال یہہ پیدا ہوتا ہے: کیا شاہ غلام علی جو الہٰ آباد میں شاہ علیم اللہ صاحب سے ملے تھے اس نام کے وہی بزرگ ہیں جن کا نام سیر میں آیا ہے اور جو خانقاہِ دیورہ کے سجادہ نشیں تھے؟ جناب شاد کے نزدیک دونوں ایک ہیں، اور 'ن' میں میں نے بھی اس رائے سے اختلاف[۱۱۳] نہیں کیا تھا، لیکن جناب شاد کا دعوٰی ب پر مبنی ہے، اور ب میں ایک لفظ جس سے جناب شاد کے دعوے کی تائید ہو سکے، نہیں ملتا۔ اسی پر بس نہیں، ب میں شاہ غلام علی (مرید شاہ علیم اللہ صاحب) کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اُس کا مقابلہ سیر کی عبارت (متعلق شاہ غلام علی صاحب دیوروی) سے کیا جاتا ہے تو یہہ ماننے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی کہ ب اور سیر میں جو دو ہم نام اصحاب کا ذکر ہے وہ ایک ہی ہیں۔ سیر ص۱۱۴ کی عبارت یہہ ہے:

"مشائخِ سلاسلِ مشہورہ در اطراف صوبہا (کذا۔ صوبۂ بہار؟) بسیار کساں و اکثرے با نام[۱۱۵] و نشاں بودہ اند اما کیفیتے از آں ہا بہ گوشِ فقیر حقیر نہ رسیدہ کہ قابلِ تحریر باشد از آں جملہ شاہ غلام علی در موضع دیورہ مضافِ پرگنۂ ارول، و شاہ بدیع الدین وغیرہ۔۔۔"

کیا وہ شخص جو "عہدِ صبا" میں مصنف کا "ہم دم و ہم مقام" رہ چکا ہو اور جو اپنی "جوانی" کے زمانے سے ۱۱۹۲ھ تک اس طرح ساتھ رہا ہو کہ کبھی "جدائی" کا "اتفاق" نہ ہوا ہو، اُن لوگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے جن کی کوئی ایسی "کیفیت" جو "قابلِ تحریر" ہو مصنف کے گوش زد نہیں ہوئی؟ اگر شاہ غلام علی صاحب دیوروی واقعی شاہ علیم اللہ صاحب کے مرید ہوتے تو اس کا ذکر سیر میں ضرور ہوتا۔

اس سلسلے میں اور امور بھی قابلِ توجہ ہیں: (۱) ب میں جن شاہ غلام علی کا ذکر ہے وہ مصنف کے "ہم مکتب" تھے اور شاہ علیم اللہ سے ملاقات (۱۱۵۵ھ) کے وقت نوجوان۔ جناب شاد بھی اس کے معترف ہیں کہ شاہ غلام علی اپنی نوجوانی[۱۱۶] کے زمانے میں شاہ علیم اللہ صاحب سے الہٰ آباد میں ملے تھے۔ غلام حسین خاں کا سالِ ولادت (سیر ص۹۴۸) ۱۱۴۰ھ ہے، شاہ غلام علی زیادہ

---

۱۱۳ ن کی تحریر کے وقت سیر کا اردو ترجمہ پیش نظر تھا، اور یہہ اعتراف کرنا چاہیے ۔۔۔۔ کہ اس کی عبارت پر بھی راقم نے کافی غور نہیں کیا تھا۔ ایک اور وجہ جناب شاد کے بیان کو قبول کر لینے کی یہہ تھی کہ شاہ غلام علی صاحب دیوروی کے صحیح حالات سے اُس زمانے میں مطلق واقفیت نہ تھی ۱۱۴ جناب شاد نے نام کو 'نوبت' بنا دیا ہے ف ص۳۰ جس سے معنی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے ۱۱۵ لیکن، جناب شاد کے دوسرے بیانات سے ان کا سن رسیدہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً: شاہ غلام علی صاحب کی دختر کا ۱۱۵۶ھ سے پیشتر میر فیض علی کے نکاح میں آنا۔ میر فیض علی کی عمر اس وقت (جناب شاد کے بیان کے مطابق) کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۴۲ھ میں وہ عظیم آباد کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ شاہ غلام علی ۔۔۔۔ مہابت جنگ سے گفتگو ف ص۳۲۔ بھی اس سلسلے میں قابل غور ہے۔

زیادہ ان سے پانچ برس بڑے ہوں گے۔ اور اس حساب سے ان کی عمر ۱۱۵۵ھ میں ۱۲ برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی، لیکن، شاہ غلام علی صاحب دیوروی کی عمر اُس وقت ستر کے لگ بھگ تھی۔ شاہ رمضان علی مرحوم جو شاہ غلام علی صاحب کی پوتی کی اولاد سے ہیں، فرماتے ہیں:

"ولادتِ باسعادت حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ کی تاریخ ۲ صفر ۱۰۸۶ھ کو ہوئی ہے۔"

(۲) شاہ غلام علی صاحب دیوروی کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ اہل تصوف اور تمام باتیں بھلا سکتے ہیں، لیکن اُن لوگوں کے نام جن سے انھیں روحانی فیض پہنچا ہے، فراموش نہیں کر سکتے دیورہ سملہ، پیر بیگھہ اور دوسرے مقامات کے اصحاب جو شاہ غلام علی صاحب دیوروی سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں، اس سے منکر ہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کو شاہ علیم اللہ سے فیض پہنچا۔ شجروں میں بھی ان کا نام نہیں، اور نہ قدیم بیاضوں وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) شاہ علیم اللہ صاحب اثنا عشری تھے، شاہ غلام علی جن کا ذکر ب میں ہے۔ وہ بھی غالبًا یہی مذہب رکھتے تھے، مصنف نے انھیں ہم آئین، لکھا ہے۔ شاہ غلام علی صاحب دیوروی حنفی تھے، اُن کا ایک اثنا عشری صوفی سے بیعت کرنا خلافِ قیاس ہے۔ قاضی عبدالودود

---

تصحیح و اضافہ: صرف اہم اغلاطِ طباعت کی تصحیح کی گئی ہے۔ اپریل ۴۲ء: ص۱۴ سطر ۱۔ مختار الدین احمد صاحب کا بیان ہے کہ چار قلم زدہ اشعار کو چھوڑ اشعار کی تعداد ۱۱۰۴ ہے ص۱۶ سطر ۱۱ اسجار = اشجار ص۱۷ سطر، بدام صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن مختار الدین احمد صاحب کے نوٹ میں مدام ہے سطر ۱۵۔ فرمودہ = فرمود و ص۱۹ سطر، مدام = مرام۔ مئی ۴۲ء: ص۔ سطر ۳۔ شعر ۲ اور شعر ۱۳ کے درمیان یہ شعر ہے: بہ خوابید و دو دست خود در زمان بہ پہلو بہ چسپاند چوں مردگاں۔ حاشیہ متعلق سطر ۶: جناب شاد نے مرحلہ ۱۲ میں شاہ غلام علی کو "ہمارے حضرت سید شاہ علیم اللہ جہدوی کے خاص مرید" لکھا ہے۔ جہدوی کا اضافہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

---

[illegible] میں نے شاہ غلام علی صاحب دیوروی اور شاہ غلام علی (مرید شاہ علیم اللہ صاحب) کو ایک سمجھ کر لکھا تھا کہ شاہ غلام علی صاحب اور مصنف [illegible] کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہو سکتا۔
[illegible] مطبوعہ [illegible] مصنفہ شاہ رمضان علی صاحب جو اس وقت پیش نظر ہے، اس کا نام معلوم نہیں [illegible] اس کا [illegible] غائب ہے۔

# شام اودھ

دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

یہ سہانی شام فیض آباد گیت اوتار "گھاٹ"
یہ نظر کی کو تک پھیلا ہوا دریا کا پاٹ
لہر کھاتا نرم دھارا بے سُگلی پانی کی کاٹ

دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

یہ نمی پا کر فضاؤں سے اُترتی سرو خاک
اونگھتے ارہر کے کھیتوں میں نسیم خوابناک
وقت کا منظر بدلنے میں مسلسل انہماک

دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

دوڑتی ہیں اس طرح لہروں پہ کرنیں گاہ گاہ
کان آہٹ سن رہے ہیں کُلملاتی ہے نگاہ
دامنِ دریا ہے کمسن بجلیوں کی درس گاہ

دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

یہ شفق کے سُرخ سائے یہ گلابی سبزہ زار
جھاڑیوں پر سانس لیتی رہگذاروں کا غبار
شکریں ذرّوں کی تابانی پہ نمکینی بہار

دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

دن کے نقشے کے مطابق شام کی تعمیر تو
ڈوبتا کمتاب سورج، کانپتی کرنوں کی
سانولے کھیتوں میں کچی نیند کے جھونکوں

دوست یہ شام اودھ [illegible]

ہم بجز مندر کے پیپل سرنگوں جنگل کے پاس
ہر قدم پر ریشمیں تاریکیوں کی نرم سانس

ٹمر کے بل لٹکی ہوئی بھیگے ہوئے ساحل کی گھاس
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے، تیرے بغیر

یوں نکلتا چاند ہے پانی کے اندر بیقرار
جس طرح تھرا رہا ہو گرم سونے کا منار
مضطرب تارے کہ جیسے جگنوؤں میں انتشار
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

ریت کے ٹیلوں پہ ذرّے نور پاش وضو فشاں
گر پڑی ہیں تھک کے یا چنگاریوں کی تتلیاں
ہیں نظر کے فرش پر زرکار ستارے رواں
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

نقرئی تلچھٹ، کلف ٹوٹے ہوئے جھونکوں کا زور
موڑ پر چونکی ہوئی سیماب گوں موجوں کا شور
گھومتے گرداب جیسے ناچتے چاندی کے مور
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے تیرے بغیر

سُست رَو دریا ہے یا پگھلی ہوئی چاندی کی کان
دودھیا پانی پہ ہے سیّال چینی کا گمان
دُور تک پھیلے ہوئے ہوں جس طرح گوٹے کے تھان
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے، تیرے بغیر

یہ تو مانا آسماں پر ہے زمیں کا بانکپن
اپنے انجام محبت سے لرزتا ہے بدن
بُن رہی ہے چاندنی شاید امیدوں کا کفن
دوست یہ شام اودھ بے کیف ہے، تیرے بغیر

احسان دانش

# پناہ گزیں

شہر میں روز طرح طرح کی افواہیں پھیلتی تھیں۔ آج یہاں ہوائی جہازوں کا اڈا بن رہا ہے تو کل امریکن فوجیں اتر رہی ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنتا رہتا تھا۔ اگر بلدیہ کی طرف سے پائپ لائین کی صفائی کے لئے کہیں پر سڑکیں کھودی جاتی ہوں تو ایک کان دو کان ہر جگہ یہ خبر پھیل جاتی کہ شہر کے نیچے ڈائنا مائٹ بچھایا جا رہا ہے۔ بعض افواہیں تو بے حد دلچسپ ہوتیں مثلاً یہ کہ دریا کنارے ریگ پر ایک ننھا منا جاپانی ہوائی جہاز اترا اور راتارات چند جاپانی یکے پر چڑھ کر سارا شہر دیکھ گئے۔

چند دنوں سے یہ خبر گرم تھی کہ شہر میں چھ ہزار پناہ گزیں آ رہے ہیں اور گورنمنٹ نے یہ صورت اختیار کی ہے کہ ہر ملازم سرکار کے یہاں ایک ایک دو دو پناہ گزیں حسب حیثیت ٹھہرائے جائیں گے۔ ایک جگہ یہی مسئلہ چھڑا ہوا تھا کہ ایک ستم ظریف نے کہا "چُن چُن کے ٹھہرانے کا موقعہ دیا جائے تو کیا کہنا ہے۔" سفلہ مجلس تھی۔ پھر بھی سب لوگ ہنس پڑے۔ اُن کی ہنسی میں رغبت جنسی کی گونج کے ساتھ ساتھ ایک پیچیدہ مگر غیر واضح اضطراب کے تار بھی بج رہے تھے۔

مشرق و مغرب میں ہولناک لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں ع
دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔

لوگوں کے دل و دماغ پر تناؤ کی کیفیت طاری تھی جسے بے حسی میں غرق کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پھر بھی فضا میں منڈلاتے ہوئے جنگ کے بھوتوں کے سایے ہر جگہ محسوس ہوتے تھے۔

سنگاپور، ملایا اور برما میں مقیم ہندوستانی بھاگ کر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ چینی اور برمی بھی نیز کلکتہ کی بھگیڑ کے سبب بھانت بھانت قوموں اور علاقوں کے لوگ شہر میں وارد ہو گئے تھے۔ نئی نئی تراش و خراش کی صورتیں سڑکوں اور دوکانوں نظر آ رہی تھیں۔ مکانات اور ہوٹلوں کے کرایے بڑھ گئے تھے اور نوبت تو یہاں تک پہنچی کہ ایک ایک کمرے میں بیس بیس پچیس پچیس پناہ گزیں مقیم تھے۔

وہ بھی ایک پناہ گزین تھا۔ لانبا قد، چھریرا بدن، ستواں ناک، اوسط درجہ کی تیز تیز چمکیلی آنکھیں۔ بھورے بھورے بالوں کے گچھے فکر پرور پیشانی پر جھولتے رہتے تھے۔ شہر اور قصبوں کے تخلیہ اور وحشت بہ جلو ایک عام بھگدڑ کے وقت ہوش کسے رہتا ہے کہ لباس [illegible] خیال رکھے۔ لہٰذا سارے پناہ گزین بے سروسامان ہی تھے گویا۔ مگر اسکی ذہانت کچھ زیادہ ابھرتی۔ اور وہ زیب وزینت کی طرف سے لاپروا سا بھی معلوم ہوتا تھا۔

میرے مکان کے سامنے والے بنگلے میں مہاجرین کی ایک خاصی بڑی جماعت پناہ گیر تھی۔ بنگلے میں تین کمرے رہائشی تھے۔ اور ان غریب الوطنوں کی تعداد ساٹھ سے بالا تھی۔ خبر یہ تھی کہ اور قافلے بھی آ رہے ہیں۔ چٹائیاں اور دریاں بچھا بچھا کر یہ مفلوک الحال لوگ سو پڑ رہا کرتے تھے۔ دل شکستہ نا امید، بے آسرا بے ٹھا ہ مستقبل ایک کالی رات کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ فراق کی طویل راتوں سے طویل تر۔ ان مہاجرین میں بوڑھی عورتیں بیمار و ضعیف العمر مرد، چھوٹے چھوٹے بچے۔ نوجوان مرد اور عورتیں۔ نوخیز لڑکے اور لڑکیاں سبھی تھے۔ یہ سب لوگ ظاہر ہے۔ مختلف خاندانوں کے تھے۔ مصیبت نے ان کو جھٹکے دے دے کر آپس میں ملا دیا تھا۔ ان میں ایسے ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی جو ایک دو نسل سے برما میں رہتے آئے تھے۔ ان کے بشروں میں برمی اور اینگلو برمی خون کے اثرات صاف جھلکتے نظر آتے تھے۔ شریک قسمت چینی بھی تھے جنکا اپنا ملک عرصۂ دراز سے جہنم زار بنا ہوا تھا۔ کچھ سانولے سلونے ہندوستانی عیسائی اور کچھ پنجابی اور سندھی تھے کسی کی مانڈلے میں بیکری کی دوکان تھی، کوئی طاؤ آئے کے دفتر میں کلرک تھا اور کوئی رنگون کے ڈوک یارڈ میں کام کیا کرتا تھا۔ حسین رنگون، دلفریب مانڈلے، ترنم ریز دریائے ایراوتی، شاندار و پرسکون سبز و شاداب جنگل اور خم و پیچ کھاتے ہوئے پُر وقار اراکان یوما اور پیگو یوما کے نشیب و فراز پناہ گزینوں کی پُرحسرت یاس آنکھوں کے روزن سے خواب آسا انداز میں جلوۂ گریز پا کے ساتھ رقص کرتے سے معلوم ہوتے تھے۔ بموں کے دھماکے، طیارہ شکن توپوں کی گرج، گرتے ہوئے مکان، جلتے ہوئے کاشانے، قہرنما ٹریج، جاں سوز منزلیں، کٹھن راستے۔ بھوک اور درماندگی سب مل کر ایک مہیب و پُرپیچ جالے کی صورت میں ان کی یاد میں مرتسم تھے۔

مگر وہ ان سب سے زیادہ اداس نظر آتا تھا۔ بالکل کھویا کھویا سا عموماً وہ سب سے علیحدہ رہتا۔ بایاں ہاتھ خاکی پتلون کی جیب میں، داہنا پاؤں برآمدے کے

پوری جنگلے پر۔ غم اور بے چینی کی تصویر، وہ اسی حال میں اکثر پایا جاتا تھا۔ اس کی گویا آنکھیں سڑک پر راہگیروں کو تکتی ہوئی معلوم ہوتیں مگر در اصل ان کا نقطۂ مقصود زندگی کے تاریک پیچیدہ اور انجان راستوں میں کھویا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے انداز سے فکر پروری آشکار تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیزی اور جوش کے ساتھ گفتگو میں مشغول پایا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اہم مسئلے کے متعلق اپنے مقابل کو قائل کرنا چاہتا ہے۔

جنگوں کے درمیان قیمتی وقفوں میں، مرض الموت کے نسبتًا پُر امید لمحات میں۔ زندگی کی ساری تمنّائیں انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگتی ہیں۔ ستم روزگار کے ستائے ہوئے ان پناہ گزینوں کے کیمپ میں بھی کبھی کبھی حیات مسکرانے لگتی تھی اور شباب غم روزگار کو غم عشق کے ریلے میں غرق کر دینا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی لگاوٹ، پوشیدہ و نیم عریاں لگاؤ، خلش بداماں لاگ محسوس سامان کشش، آرزوؤں سے بوجھل پلکیں، دھک دھک کر اُٹھنے والے، ناداں دل، کالے کالے بھیانک بادلوں کے درمیان بجلی کی طرح کوند اٹھتے تھے۔

جوان لڑکیاں اُسے نیم نگاہی سے دیکھتی ہوئی یا بیباکانہ گھورتی ہوئی گذرتی تھیں۔ اسکی بیگانہ وشی اور ارمان انگیز ثابت ہوتی تھی۔ مگر وہ اپنی داخلی زندگی میں اتنا محو تھا کہ عام خارجی دلچسپیاں اس کے لئے بے معنی تھیں۔ پھر بھی ان مہاجرین میں سے ایک جوان سال دوشیزہ اس آتش خاموش نوجوان کے لئے نمایاں طور پر بامعنی تھی۔ اس کیمپ میں خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن یہ اوسط حیثیت کی لڑکی اُس کے لئے سب سے زیادہ اہم تھی۔ اس لڑکی کی صورت بہت ہی معمولی تھی۔ مگر اس کا شباب اپنی ساری بالیدگیوں کے ساتھ اس قدر نظر افروز تھا کہ اُسے دیکھکر زندگی کے سوتوں کے پھوٹ بہنے کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ اس کے اعضا کے بھرپور نشیب و فراز میں ایک اضطراب خیز ترنم و آہنگ پایا جاتا تھا۔ یہ لڑکی نوجوان سے نسبتًا بیگانگی سی ظاہر کرتی تھی۔ مگر جب بھی مڈبھیڑ ہو جاتی صاف معلوم ہوتا کہ نوجوان نے جیسے برقی تار کو چھو لیا ہے۔ دونوں میں کبھی کبھار گفتگو بھی ہو جاتی تھی۔

پناہ گزینوں کے کیمپ کی زندگی اسی طرح گذرتی جا رہی تھی۔ شہر کی مخیر سوسائٹی، اہل ایسا اور عورت نے تھوڑی بہت مدد کی۔ مگر تپیدگی کے تھپیلے کی رکھوالی ... کیونکہ

ہو سکتی تھی۔ مہاجرین پریشان تھے۔ متردّد اور ہراساں، کچھ لوگ پچھم دیس کی طرف چلے گئے۔ تو انکی جگہ کچھ اور نئے آ گئے۔ ہر شخص روزگار کی تلاش میں تھا، پر جب ملک میں پہلے سے ہی بے روزگاروں کی ایک فوج ہو تو پھر یہ اضافہ مزید کمک کی ہی حیثیت رکھتا تھا۔

دو تین دنوں سے نوجوان پناہ گزیں بہت ہی مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ وہ پہروں جنگلے پر پاؤں رکھے، پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے سوچتا رہتا تھا، سوچتا رہتا تھا۔ خیالات و تصورات کے تانے بانے بنتے رہتے اور بکھرتے رہتے تھے۔ تارِ عنکبوت کی طرح۔ یہ پناہ گزیں بیچارے ہملوگوں سے اسقدر قریب تھے۔ بالکل ہمسایہ۔ لیکن پھر بھی غیریت کے پردے درمیان میں شدید طور پر حائل تھے۔ پناہ گزینوں کا بنگلہ بھرے شہر میں ایک جزیرہ تھا۔ ہم گویا دوسرے ساحل سے کھڑے کھڑے تماشا دیکھا کرتے تھے۔ حیات کا ایک خاموش المیہ۔

ایک روز نمایاں طور پر میں نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان بنگلے میں نہیں ہے۔ کئی روز گذر گئے مگر چوبی جنگلے سے پاؤں ٹیک کر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ بنگلہ مجھے کچھ سونا سونا سا دکھائی دینے لگا۔ چند دنوں کے بعد بنگلے میں مجھے کچھ غیرمعمولی شور وشغب کی آوازیں سنائی دیں۔ باہر جھانک کر میں نے دیکھا کہ وہاں کچھ ہل چل ہے اور پولیس کے کارندے ادھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ میں نے قیاس کیا کہ حکومت کچھ پناہ گزینوں کا بندوبست کرا رہی ہوگی۔ بات گئی گذری ہوئی۔ پر وہ چوبی جنگلہ سونا ہی رہا میں نے سوچا نوجوان کہیں چلا گیا ہوگا۔

ایک ہفتے کے بعد میں اپنے دوست فاروقی کے یہاں گیا۔ فاروقی نہیں تھے میں انتظار کرنے لگا۔ اطلاع ملی کہ وہ اب آ ہی چلے۔ مگر 'اب' کی 'بے' بہت طویل ہو کر پریشان کن انتظار کے لمحات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ خلش انتظار کو کم کرنے کے لئے میں نے فاروقی کی میز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ فاروقی محکمہ خفیہ پولیس میں ملازم تھے اور اکثر ان کے پاس دلچسپ سچّے واقعات کا کافی مواد پایا جاتا تھا۔ میں نے سامنے کی ایک سیاہ خوبصورت سی ڈائری اٹھا لی۔ اور اُسے سرسری طور پر پڑھنے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ڈائری لکھنے والے کی خوش مذاقی اور ادبیت کا سکّہ جمنے لگا۔ ڈائری میں دل کی قاشیں پیش کی گئی تھیں۔ غالبًا یہ ڈائری 'اکزیبٹ' کی تھی۔ میری دلچسپی بڑھنے لگی اور میں نے اس کا باضابطہ مطالعہ شروع کر دیا۔ صاحب ڈائری کی شخصیت بہت ہی انوکھی پُرکشش اور دردناک تھی۔ ڈائری کے بعض بعض مقامات تو آجتک میرے ذہن و خیال

میں آتشیں حروف کی طرح چمک رہے ہیں۔

۱۵ / مارچ ۱۹۴۱ء

"لینٹ شروع ہو چکا ہے۔ یسوع کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ یہ ایک درد انگیز واقعہ ہے مگر آج انسانیت کو مصلوب کیا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں عیسیٰ دنیا کی نجات کے لئے صلیب پر چڑھا۔ مگر انسانیت کو کیا خود عیسیٰ کی نجات کے لئے مصلوب کیا جا رہا ہے؟ خدا کی نجات کے لئے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ روس اور جرمنی دوست کیوں؟ اسپین کا خونِ ناحق، حبش کی مظلومی، چین کی شہادت کیا ان سب کی ذمہ دار فاشیت نہیں؟ پھر نور و ظلمت کا کیسا میل؟

یسوع مسیح کو اس کے ایک حواریِ خاص نے پکڑوا دیا تھا۔ کیا انسانیتِ عظمیٰ کا دوست روس یہودا حواری کی طرح انسانیت کو صلیب دلوانے میں شریک ہوگا۔؟

ہر طرف تاریکیاں ہیں ——"

۱۰ / اپریل ۱۹۴۱ء

"جب مقصد تاریک غار میں گر چکا ہو۔ جب اندھا دھند کام دیوار سے سر ٹکرانے کے مترادف ہو تو زندگی دوزخ سے کم نہیں۔ میں نے محبت کے امنڈتے ہوئے دھارے کو تیر کر پار کیا اور اجتماعی زندگی کے ساحلِ مراد تک پہنچا۔ مگر آہ اب میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے!

فلورا! کیا تم مجھے واپس بلا لوگی۔ کیا مجھے تمہاری آغوشِ محبت میں پناہ ملے گی؟

۲۸ / جون ۱۹۴۱ء

" بادل میں ستارہ چمکا۔ روس کے محاذ پر زندگی اپنی قربانیوں کے ساتھ مسکرائی اشتراکیت میں کوئی غدار نہیں۔ کوئی یہودا نہیں — مگر اب اُمید کے ساتھ خوف بھی دل پر چھایا ہوا ہے۔ جانے کیا حشر ہو؟ سامراج کہیں روس کو تنہا نہ چھوڑ دے۔ اے خوف ہٹ جا! زندگی میں تکرار ضروری ہے۔ انسانیت آگے بڑھے گی۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے۔ برما میں بھی شعلے لپکینگے۔ جاپانی فاشیت چین کے بعد ملایا برما اور ہندوستان کا رُخ کرے گی۔ رفیقہ! تمہاری باری بھی آنے والی ہے۔"

۱۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

"قطب تارہ عفریت پیکر بادلوں کی یلغار برداشت کر رہا ہے۔ لال تارے کی جبین لہولہان ہو رہی ہے۔ کیا یہ دُنیا، یہ بدبخت سیارہ کسی منحوس جرم فلکی سے ٹکرا کر خاک سیاہ ہو جائے گا؟"

۲۱ ستمبر ۱۹۴۱ء

"فلورا! میں نے تمہیں کبھی فراموش نہیں کیا۔ میری منزل کٹھن تھی۔ میں تمہیں سلامتی کے ساحل پر چھوڑ کر سیلاب کے تُند و تیز دھارے میں کودا تھا۔

اب میری روح غرق ہو رہی ہے۔ کاش تم شفق کی طرح صرف ایک بار ہی مسکرا دو کائنات کا دل زخمی ہے۔ دُنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ تم بھی اتنی خود غرض ہو۔ کیا تم مجھے خرید کر ہی مجھ سے محبت کر سکتی تھیں؟ ہر جگہ خرید و فروخت؟ میں تو آزاد رہ کر بھی تمہارا گرفتار ہوں۔ اور تم نئی مملکتوں کی فتح کے خواب دیکھ رہا ہو۔"

۷۔ دسمبر ۱۹۴۱ء

"زندہ باد انسانیت! زندہ باد روس!

نازیت کا دیو سرزمین روس پر دم توڑے گا۔ رفیقو! آگے بڑھتے جاؤ! تمہارا خون انسانیت کے پودے کو سینچے گا۔"

۲۴ دسمبر ۱۹۴۱ء

"حسین رنگون! اے میرے وطن! جاپان کے شیطانوں نے خونیں کھیل کھیلا ہزاروں پُرامن جانیں، فنا کر دی گئیں۔ امریکہ اور انگلینڈ کے خود غرض سرمایہ دار ابتک نفع اندوزی کی حرص میں مبتلا ہیں۔ کاش اس جنگ کو پورے طور پر عوام کی جنگ بنا دیا جاتا! جمہوریت پسندوں کے ہاتھ بند اور غدّار آزاد ہیں۔ برما میں فاشیت کے گیدڑوں کی بہت بڑی تعداد ملک کو کھوکھلا کر رہی ہے اور سرفروشان آزادی قید و بند میں مبتلا ہیں اندھی دنیا!"

۵۔ جنوری ۱۹۴۲ء

"بمباریاں اور صرف بمباریاں! آگ، لوہا اور خون!
یہ دُنیا "کیا"؟ "کیوں"؟ اور "کاش"! کی تثلیث پر قایم ہے۔"

۳ / مارچ ۱۹۴۲ء

"انسانیت ! ملک ! اور محبت !
کاش جمہوریت عوام کی فتح ہو ! کاش میرا پیارا برما جاپانیوں کے ناپاک پنجے سے آزاد ہو ! کاش فلورا میری محبت کی قدر کرے !

۱۴ / مارچ ۱۹۴۲ء

"میں نے فیصلہ کر لیا۔ تخلیہ کے وقت میں فلورا کا ساتھ دوں گا۔
برما میں غداروں کی چلتی ہے۔ طلبا کی تحریک خطرات کی برداشت نہ کر پائی۔
مانڈلے میں آکر میں نے ترقی پسند قوتوں کو مجتمع کرنا چاہا لیکن اکثریت کا نصب العین واضح نہیں۔ شہنشاہیت کا میں بھی دشمن ہوں۔ مگر برطانی سامراج دم توڑ رہا تھا۔ فاشیت جوان شیطنت ہے۔ پھر آزادی و مساوات کا سب سے بڑا قلعہ روس نازی، فاشی، اور شنٹو تگذم کی زد میں ہے۔ میں ہندوستان کے رفیقوں کے ساتھ مل کر جاپان کے خلاف عوام کا ایک محاذ قائم کروں گا۔"

۲۰ / اپریل ۱۹۴۲ء

"میں نے شاید غلطی کی۔ ہندوستانی رفقا آپس میں متحد نہیں۔
ہندوستان کی سیاست برما کی حالت سے بھی بدتر ہے۔ مجھے برما میں رہ کر مقابلہ کرتے ہوئے جان دیدینی چاہئے تھی۔ منزل بہت دور ہے، ساتھی کم حوصلہ اور محبت انگاروں!
فلورا نے مجھے لق و دق صحرا میں چھوڑ دیا اور وہ خود نخلستان کی تلاش میں ہے۔
لیکن جسے وہ نخلستان سمجھتی ہے۔ سراب نظر ہے۔"

۲۳ / اپریل ۱۹۴۲ء

"میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ نصب العین کی عارضی شکست۔ رفیقوں کی کم نظری۔ دنیا کے طعنے۔ یونیورسٹی سے اخراج۔ والدین کی خفگی میرا دل سینکڑوں بار خون ہوا۔ میرے قدم ہزاروں بار ڈگمگائے۔ میں نے منزل کی صعوبتیں سہیں۔ ملک چھوڑنے کا غم برداشت کیا۔ سامراج کے زہریلے نشتروں کے کچوکے سینے پر لئے۔ اور اب بھوک اور ناداری کی جاں سوز چبھن گوارا کر رہا تھا۔ فلورا بھی بھوکی رہ سکتی تھی۔ میں اُسے اپنی بوٹیاں تک کھلا سکتا تھا۔ اس نے یہ کیا کیا!
میری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

وہ ایک ہفتے سے اپنا جسم فروخت کر رہی تھی۔ آج رات میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا جو دانتے کے جہنم سے زیادہ بھیانک تھا۔ زندگی، مقصد، محبت سب لا حاصل!
اے ایراوتی مجھے اپنی آغوش میں لے لے! آہ ایراوتی! تو بھی......"

"اچھا یہ چوری چوری، خفیہ پولیس کی بھی جاسوسی ہو رہی ہے" فاروقی نے ہیٹ میز پر پٹکتے ہوئے کہا۔

"آ گئے فاروقی؟ بھئی بڑا الم انگیز قصہ ہے"

ہاں، اچھا! جانتے نہیں؟ یہ تمہارے مکان کے سامنے جو پناہ گزیں ٹھہرے ہوئے ہیں نا۔ بس وہیں کے یہ صاحب زادے تھے۔ آپ نے محبت فرمائی تھی......"

فاروقی زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے اس بے موقعہ ہنسی سے دکھ ہوا۔ وہ کہہ چلا

"ارے وہی خبطی سا نوجوان۔ تم نے مجھے دکھایا تھا اُسے۔ آپ کی محبوبہ نے پیشہ شروع کر دیا تھا۔ بس آپ..." میں نے سختی سے فاروقی کو ٹوکا۔

"تم نرے بے درد ہو۔ جانور ہو جانور۔ تو کیا اُس نے جان دے دی؟"

"ہاں تو اور کیا۔ بیسویں صدی کے مجنوں تھے آپ۔ گنگا میں ڈوب کر آپ نے خودکشی کر لی"

میں فاروقی سے، فلورا سے، ساری دنیا سے اسوقت شدید نفرت کر رہا تھا دُنیا نے اسے پناہ نہ دی۔ اب وہ گنگا کی گود میں پناہ گزیں تھا۔

اختر اورینوی

# اُلجھن

نرس فلومینا کے لب اعتراف خانہ کے جنگلے کے قریب تھے۔ اُس نے عاجزی سے کہنا شروع کیا۔ "مقدس باپ! میں نہیں سمجھتی ہوں کہ میں نے گناہ کیا ہے۔ کبھی میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں نے گناہ کیا۔ اور کبھی وہ سمجھاتا ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ میں گناہگار نہیں ہوں تو مجھے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔

اعترافِ گناہ کرانے والے پادری نے کچھ نہ سمجھا۔ اس نے کہا "زیادہ کھل کر کہو بیٹی! مجھ سے سب کچھ کہو۔ تم اس قدر کم سن ہو۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ضمیر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے فیصلہ کرنے دو۔ خدا مجھ پر روشن کر دے گا۔ کہو" ۔ "سنئے یہ پورا واقعہ ہے۔ جب سے میں اسپتال میں داخل ہوئی ہوں نرس ماریہ کے عوض میں کام کر رہی ہوں دو شنبہ کو نصف شب کے وقت وارڈ نمبر پانچ میں مریض نمبر سات کو مذہبی تسلّی دی گئی۔ جو ڈاکٹر موجود تھا اس نے کہا کہ اب امیدِ زیست نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا اب زیادہ دیر نہیں۔ تڑکا ہونے سے پہلے موت یقینی آ جائے گی۔ اب زیادہ دورے نہ ہوں گے۔ اگر تم میری ضرورت محسوس کرنا تو مجھے بلا لینا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر آرام کرنے چلا گیا۔"

"مجھ کو کچھ نہیں کرنا تھا صرف ہر آدھ گھنٹہ پر دوا دینے کی خدمت دے دی تھی۔ میں اپنی مقررہ جگہ پر بستر کے قریب بیٹھ گئی اور خیالات میں غرق ہو گئی۔ میں جانے والی روح کے لئے دعا کرنے لگی"

"کس کی روح کے لئے" "اُس غریب مرد کی روح کے لئے جو مصیبت جھیل رہی تھی" ۔ "تب وہ ایک مرد تھا"

"کیا میں نے پہلے نہیں کہا تھا مقدس باپ" "تم نے اگر مجھے غلط یاد نہیں نمبر سات کے متعلق کہا تھا۔ اور نمبر سات کا کوئی جنس نہیں ہے۔ اچھا پھر کیا ہوا" "تین بجے کے قریب مریض بہت ہی خفیف آواز میں بولا۔ موت کی خرخراہٹ نمایاں تھی" "بہن فلومینا! اب موت آ گئی۔ آخر شب میں اس پر غشی طاری تھی۔

"ہمت میرے بھائی ہمت" میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ آہستہ آہستہ اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ الفاظ کو صاف صاف بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں تیار ہوں پچیس برس کی عمر میں مرنا افسوسناک ہے لیکن میں راضی برضا ہوں۔ اور شاید فارغ ہونا ہی بہتر ہے۔ میں تنہا تھا اور غریب تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاعر ہوں لیکن کچھ نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی مجھے چاہتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں چاہتا تھا۔ اگر تم اس وقت میرے پاس نہ ہوتیں تو میں ایک ریگستان میں لاوارث کی طرح مرتا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ اسکی مژگیں آنکھیں پرنم ہیں۔ "کیا تم میری ایک بات مانو گی بہن فلومینا" اُس نے دریافت کیا۔ "بسر و چشم"

بشرطیکہ میں پوری کرسکوں میرے بھائی۔" اس نے کہا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں چین سے مروں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مروں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "ہر اچھے عیسائی کو اس طرح مرنا چاہیئے۔" "تم نے بہت اچھا جواب دیا بیٹی" پادری نے کہا۔ مرنے والے آدمی نے نرمی سے کہا۔ "اس میں میری مدد کرو" "کس طرح میرے بھائی، میں نے دریافت کیا۔

"بغیر تلخی کے زندگی کے دروازہ سے گذرنے میں میری مدد کرو۔ آئندہ زندگی میں ایک مہربانی کی یاد لے جانے دو۔ بہن فلومینا مرنے والے پر ترس کھاؤ۔ مجھے صرف ایک بوسہ کی تمنا ہے۔" "ایک بوسہ" پادری چلایا۔

میں نے دوبارہ کہا۔ ہمت کرو بھائی۔ خدا کے بوسہ کے لئے تیار رہو" "تم نے بہت درست کہا میری بیٹی۔ پادری نے کہا۔" "اکھڑتی ہوئی سانس سے اس نے پھر اصرار کیا۔ میری تمنا پوری کرو۔ تم سمجھتی ہو بہن فلومینا تم میرے لئے باعث نجات ہوگی۔ کیا تم خفت کے بارے ہمیشہ دبی رہو گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنی روح ابدی مصیبت میں گرفتار کروں۔ کیا تم میرے عذاب کا سبب ہوگی۔

"اور تم نے کیا کہا، پادری نے دریافت کیا۔

مقدس باپ میں ان الفاظ کو سن کر خائف ہوگئی۔ میں سوچنے لگی کہ تلخی کے ساتھ جان دینے میں اس کے لئے دائمی عذاب کا خطرہ ہوسکتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اگر میں ہی باعث ہوں۔ میں نے عذر کیا کہ ہر لمحہ کی تاخیر اس کو موت کے قریب تر لے جا رہی ہے۔ تڑکا ہونے کے پہلے خاتمہ ہوجائے گا۔ خاموش کمرہ میں میں اس کی کراہ سن رہی تھی۔ اس وارڈ میں چند مریض تھے اور وہ چین سے سوئے ہوئے تھے۔ روشنی دھیمی تھی دھیمی روشنی میں سفید بستر قبر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ مجھے بڑا افسوس کا غلبہ ہوا۔ میں جھکی اور [illegible] ...یا۔ یہ وقت میں نے سنا شکریہ! شکریہ۔ اس کے بعد میں دعا کرنے لگی۔" "اور کس مقام کا تم نے بوسہ لیا تھا" پادری نے دریافت کیا۔ وہ اپنی پریشانی کو چھپا رہا تھا۔ وہی پریشانی جو اس کے فیصلہ کرنے میں مخل تھی۔ فلومینا نے بہت متانت سے جواب دیا۔

مقدس باپ! اس وقت اندھیرا تھا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اس کے لب کا بوسہ لیا تھا" "بلاشک و شبہہ یہ سخت حماقت تھی۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا ارادہ نیک تھا۔ تمہارا دل عیسائیت کے مقدس جذبہ سے متاثر تھا۔ یہ جذبہ لطیف ہے۔ لیکن جب بے راہ ہے تو نہایت خطرناک ہے۔ لب کے بوسہ سے پیشانی کا بوسہ بہتر ہوتا۔ اور اسکی زندگی کے لئے کافی ہوتا۔ گرچہ تم نے ایسے آدمی کا بوسہ لیا جو تقریباً مردہ تھا" "یہی تو میں نے کہا تھا" "اور اب چونکہ وہ مرگیا ہے اور دفن ہوچکا ہے۔ اب ہم لوگوں کو اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیئے" "لیکن مقدس باپ! یہ درست نہیں ہے وہ زندہ ہے" "زندہ" "ہاں! صبح ہونے تک وہ مردہ تھا۔ آفتاب کی پہلی شعاع کے ساتھ اس کو چین نصیب ہوا جس وقت ڈاکٹر وارڈ میں داخل ہوا، اپنی حیرت کو چھپا نہ سکا۔ اس وقت مریض کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہوشیاری سے جانچ کی اور اس کے جسم میں انجکشن دیا اور آہستہ سے کہا۔ یہ تعجب خیز بات ہے۔ شاید ہم لوگوں کو

مرض پر فتح حاصل ہوئی ہے" ۔ مایوسی کے لہجہ میں پادری نے کہا۔ "یہ سخت خطرناک ہے"۔ "مقدس باپ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"
" یہ اہم معاملہ ہے بیٹی۔ اگر تم نے ایک زندہ آدمی کے لبوں کا بوسہ لیا اور وہ اب تک زندہ ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
کہ کیا کرنا چاہئے۔ جس وقت موت قریب تھی اُس وقت کی بات اور تھی ۔ خدا کی نظروں میں سب خود بخود درست ہو جاتا۔
اگر وہ زندہ ہے تو خدا کی رحمت میں رخنہ پڑیگا۔ ہم لوگوں کو صاف بولنا چاہئے اور ہم لوگوں کو بھرم رکھنا چاہئے" چند لمحہ سوچکر،
یہ تو بتاؤ بیٹی وہ ڈاکٹر کیسا آدمی ہے" " اچھا آدمی ہے" "کس درجہ کا معالج ہے"۔ اس کا شمار اچھے ڈاکٹروں میں ہے"
آج مریض کیسا ہے" " اچھا ہے" "یہی تمہاری بربادی کا سبب ہے"، " اے میرے خدا" " کیا تم خدا کا نام لینے کی ہمت
کرتی ہو"۔ "مقدس باپ ۔ میں خبیث گنہگار ہوں" "تم اس لباس کے پہننے کے قابل نہیں" جب فلومینا زار و قطار
رونے لگی تب پادری ذرا نرمی سے بولا ۔" ابھی تک مجھ کو راہ صاف نہیں معلوم ہوتی ۔ تم نے ابھی مجھ سے کہا ہے کہ جب
تمہارا ضمیر کہتا ہے کہ تم نے گناہ نہیں کیا ہے تو تم کو زیادہ صدمہ پہنچتا ہے ۔ یہ کیوں کر ممکن ہے ۔ میں اسے نہیں سمجھ سکتا"
" میں نہیں جانتی ہوں مقدس باپ! میں محسوس کرتی ہوں اور جو محسوس کرتی ہو اس کا بعینہ اقرار
کر رہی ہوں" "اور تم اپنی حرکت پر پشیماں ہو" "اگر یہ گناہ ہے تو مجھے پچھتانا چاہئے"۔" میں ابھی تمہیں نجات نہیں
دے سکتا ہوں ۔ چند روز انتظار کروں گا ۔ کون جانتا ہے ۔ اس آدمی کے مرض کا کیا حال رہتا ہے۔
اب جاؤ۔ آج میں اس سے زیادہ سننا نہیں چاہتا ہوں ۔"

چند دنوں کے بعد فلومینا پادری کے پاس پھر گئی " اچھا! نمبر سات اب کیسا ہے" پادری نے سوال کیا" میں
سمجھتی ہوں وہ بہت کچھ صحت یاب ہو چکا ہے"۔" ڈاکٹروں کا کیا خیال ہے"۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تندرست ہو جائیگا"
"بچی! اب تمہارے لئے کوئی اُمید نہیں ہے" "یہی میں نے اس سے کہہ بھی دیا" "تم نے اس سے کیا کہا" " میں نے اس سے
کہا کہ میں اسکی وجہ سے تباہ ہو چکی ہوں ۔ اور اگر یہ میں جانتی ہوتی کہ وہ زندہ رہے گا تو کبھی اس کا بوسہ نہ لیتی"۔
" اس تندرست شاعر نے کیا جواب دیا" "اس نے جواب دیا کہ وہ میری تباہی کا خواہاں نہ تھا۔ وہ مجھے تباہی سے بچائے گا"
"وہ مر کر ہی ایسا کر سکتا تھا" "ہاں مقدس باپ! اس لئے اس نے عہد کیا ہے کہ جس روز وہ پورے طور پر صحت یاب ہوگا۔
وہ میری خاطر اپنے کو ختم کر دے گا"

" یہ ایک نئی الجھن ہے"۔ پادری چند لمحوں تک سوچتا رہا ۔ صبر اور شکر کے لہجہ میں اسنے کہا۔" بہرحال تم کو
نجات دینا ہی بہتر ہے ۔ اگر وہ آدمی پھر مرنے لگا تو ہم لوگوں کو دوبارہ یہ الجھن شروع ہوگی ۔"

(ترجمہ)

محمد حسّان

# کلام مرزا جان طپش

شور و سوز بلبل و پروانہ جب یکجا کیا — تب ہمارا مرغ دل خلاق نے پیدا کیا
شمع کو اپنے سے تو مت سمجھیو کم اے پتنگ — اُس نے بھی سر پیچ کر ہی عشق کا سودا کیا
چشم باطن سے تو آخر ہے تری رویت ہمیں — پھر بہ ظاہر کس لئے یہ آنکھ کا پردا کیا

دمبدم اُس میں ہی میں جاتا ہوں کھویا اے طپش
وہ تو تھا مجھ میں ہی میں کیوں ہر طرف ڈھونڈا کیا

کرتے ہیں صاعقہ جسے عالم میں اعتبار — شعلہ ہے وہ کسی کے دل ناصبور کا
لگنے نہ پائے ٹھیس صبا کیجو احتیاط — ہے ہاتھ میں جناب کے ساغر بلور کا
ہر آبلے کو وصل ہوا نوک خار کا — کس منہ سے شکر کیجئے پروردگار کا
جاگے ہو میکشی میں کسی پاس شب کو تم — چھپتا نہیں ہے آنکھ پہ عالم خمار کا
کیا ہنستے ہو رہ رہ کے تم آئینے میں ہر دم — ایسا تمہیں کیا اس میں تماشا نظر آیا
دم لینے کو یوں سایۂ مژگاں میں چلا اشک — گویا اسے درویش کا تکیہ نظر آیا
ہے گریۂ شبنم سے ہے ظاہر یہی — عالم بالا تلک پہنچا ہے اثر اشک کا
بادۂ گریہ میں کرنی خوب ہے بے صرفگی — متصل رہ مضائے ہے شیشے پہ شیشا اشک کا
پار ہے کھیوا خدا کے فضل سے اُس کا طپش — چشم سے کشتی ہو جس کی اور دریا اشک کا
کہنے کو اک قطرہ تھا آنسو پہ پھیلا جس گھڑی — سیل سا کیا کیا نہ کچھ اس دشت پیما سے ہوا
تا نہ ہو نظروں سے غائب پاوے کوئی کیونکہ نام — حل معنے ہم کو یہ پرواز عنقا سے ہوا
گداز دل ہے مثل شمع ہم روشن ضمیروں کا — ٹھہوزا دیکھ جا او نوجوان ٹک رنہ پیروں کا
نہ روک اے لخت دل آنسو کو جانے دے نہ بھر جا یے — نہیں چلتے ہوئے دامن پکڑتے راہگیروں کا
تجھی کو پاس بٹھلاتے ہیں اپنی مونہ کرا آنکھیں — تصور میں ترے یہ شغل ہے ہم گوشہ گیروں کا

طپش پائے قناعت گاڑ کر اب بیٹھ ہی رہئے
کہاں تک کیجئے اٹھ اٹھ کے نت مجرا امیروں کا

دیدۂ خشک میں پھر اشک ہمارا چمکا — آج سے ہم نے یہ جانا کہ ستارا چمکا
دل صد چاک پہ کیا کہئے جو حالت گذری — ٹک جو چلمن سے وہ آنچل کا کنارا چمکا

کرے گا جب حرارت حشر میں خورشید آمرزش — کہوں گا رو کے یہ ہی میں بھی ہوں امانِ تر لایا
چلے تھے اس کے کوچے کو ملا یہ ہی شگوں آگے — کہ مرغِ مردہ کے کوئی سامنے سے مُشت پر لایا
لگا نخلِ مژہ میں بعد و شاک سُرخ لختِ دل — وہ جیسا پھول لایا تھا سو ویسا ہی ثمر لایا

اُس سنگ دل پہ کیوں نہ ہوا اطلاق سوزِ عشق — آتش کو حق نے سنگ میں بھی ہے نہاں کیا
شبنم سے جو بہار تلک سب ہوے رفیق — نالہ چمن میں بیٹھ کے ہم نے جہاں کیا
یک چند طوفِ کعبہ میں ہو حق کیا کیے — یک چند رہ کے دیر میں شور و فغاں کیا
لیکن ہزار شکر کہ پھر آخر اختیار — میخانے میں توسّل پیرِ مغاں کیا

کہہ آبدار اور بھی کوئی غزل طپش
حق نے ہے تجھکو صاحبِ طبعِ رواں کیا

کیا عشق نے یہ معجزہ اپنا عیاں کیا — مژگاں جو خار و خس تھے انہیں گلستاں کیا
ہم خامشی کو سمجھے تھے کچھ ہے یہ راز دار — پر سب زبانِ حال نے اس کی بیاں کیا
از بس مری زباں نہ سمجھتا تھا وہ کبھی — منھ میں زبان لے کے اسے ہم زباں کیا
برسوں تک اس زمیں میں رہی بوے آرزو — ایک دم خرامِ ناز سے تو نے جہاں کیا
کس طرح لامکاں کہوں اس کی ذات کو — جس نے کہ ہو وے حضرتِ دل میں مکاں کیا

آوارگی فلک کو جو منظور تھی طپش
بعد از فنا بھی خاک کو ریگِ رواں کیا

اللہ رے حرفِ شوق کی تاخیر اضطراب — نامہ جدا تڑپنے لگا نامہ بر جدا
جلوہ دیکھ آکے مری چشم کی خونباری کا — کیا ظہور اہے فقیروں کی بھی پھلواری کا
بہم اغیار سے دکھلا کے مجھے کہتا ہے — چاؤ ان کو بھی ہے یوسف کی خریداری کا

دردوغم سے جی بچا کر کیوں نہ آؤں تیرے پاس — آشنا لیتا ہے آکر آشنا کا آسرا
ہاتھ اٹھا بیٹھے دوائے دردِ دل سے اپنے ہم — ہاں مگر اک رہگیا ہے اب دعا کا آسرا
اشک کہتا ہے چھپا لو اپنے دامن میں مجھے — ہوں میں بیکس ہے یہی میرا سدا کا آسرا
چھاؤں میں ٹک نخلِ گل کے بیٹھنے دے باغباں — آن بیٹھے ہیں ذرا پاکر ہوا کا آسرا

سایۂ شمشیرِ قاتل ہی میں اب چلیے طپش
ڈھونڈھیے کس آشنا نا آشنا کا آسرا

انتخاب کردہ شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم

# ایرانی زبانیں

آریہ جرگے شمال و مغرب سے آکر جب بدخشاں پہنچے تو وہاں دو حصوں میں بٹ گئے ایک حصہ کابل کی گھاٹیوں کی راہ ہندوستان آیا جس کی زبانوں کے مختصر حالات پراکرتوں کے زیرعنوان رسالہ ہذا میں درج ہو چکے ہیں دوسرا حصہ شمالی خراسان میں پہنچا اور وہاں سے رفتہ رفتہ سارے ایران میں پھیل گیا۔ سنسکرت لفظ آریہ پارسیوں کے آسمانی صحیفہ اوستہ میں بصورت ائریہ ہے اور اس کی جمع ائریان۔ شمالی ایران یہاں ان کی جمعیت تھی ائریان وِیج یعنی آریہ لوگوں کا گھر موسوم تھا۔ بعد ازاں سارے ملک کا نام ایران شہر ایران زمین یا صرف ایران ہو گیا جس کی حدود ی بعد میں از کنار جیحوں تا لب آب فرات واز باب الابواب (دربند) تا کنار دریائے عمان (خلیج فارس) بتائی گئی ہے۔ اس وسیع خطہ میں موجودہ روسی جمہوریت خیوا (خوارزم) سے لیکر شمالی عراق و کردستان شامل ہیں اور مشرق میں موجودہ افغانستان و بلوچستان کے مغربی حصے ایران کی ولایت خراسان میں داخل تھے۔ پارس بسکون راء سے ترشتہ۔ ایران کے مغربی وجنوبی کونے کا نام ہے عہد رسالت تک عرب بطور اطلاق الجزو علی الکل سارے ملک کو بلاد الفرس یعنی پارسیوں کا ملک کہا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا وطن حدود فارس سے سینکڑوں میل دور نواح اصفہان میں تھا سلمان فارسی کہلاتے تھے۔ خلیفہ ثانی کے عہد میں جب ایران فتح ہوا اور عرب اس کے اندرونی حصوں میں داخل ہوئے تو مغربی و شمالی حصہ کی آب و ہوا عراق کی سی پاکر انھوں نے اسے عراق عجم نام زد کیا یعنی عراق عرب کے برخلاف وہ عراق جہاں کے باشندے گونگے ہیں یعنی ان کی عربی زبان میں ان سے گفتگو نہیں کر سکتے۔

توریت کے ضمیموں میں دو قوموں کا ذکر آیا ہے کہ ان کے قوانین میں کبھی کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ایک تو وہ جس کا مسکن صوبہ پارس تھا۔ دوسری قوم اسی ملک کی رہنے والی جس کا عربوں نے عراق عجم نام رکھا تھا یعنی پارسی اور میڈیائی۔ ایرانی زبانوں کی اسی تقسیم ملک کے مطابق دو بڑی شاخیں ہیں۔ پارسی و عجمی اگرچہ فارسی زبان صدیوں سے حدود فارس سے نکل کر دور دراز ملکوں تک پہنچ گئی ہے اور عجمی کردستان میں اور عراق عجم

سے دور افغانستان و بلوچستان میں بولی جاتی ہے۔

قدیم ایران کی تواریخ کے تین مختلف مواخذ ہیں جن میں سب سے زیادہ معتبر معاصر یونانی مورخوں اور سیاحوں کے بیانات ہیں کیونکہ وہ اپنی نامور قوم کے اکثر افراد کی طرح نظر غائر رکھتے تھے اور وقایع نویسی میں احتیاط برتتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بابائے تواریخ ہیروڈٹس المتوفی سنہ ۴۲۴ قبل مسیح و زنفن ہیں۔ ان کے علاوہ ڈراما نگاروں کے سرخیل ایسکیلس کی تصنیف پرشیٔ فارسیاں سے ایرانیوں کی طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے توریت کے ضمیموں میں بھی چند ایرانی بادشاہوں کا ذکر آگیا ہے۔ دوسرا ماخذ انہی بادشاہوں کے کتبے ہیں جو گزشتہ صدی کے قبل محض گل بوٹے[1] تصور کئے جاتے تھے۔ ان کے حروف تیر کی نوک کے مانند یا میخ نما دکیونیفورم) ہیں اور سطریں چینی رسم تحریر کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف بعدازاں بائیں سے داہنی طرف لکھی ہوئی پائی گئیں ہیں اکیمینیوں کے عہد کے کتبے کوہ بے ستون اور ان کے پایہ تخت استخر قریب شیراز کے محلوں کی دیواروں اور ستونوں پر تین زبانوں، قدیم فارسی و عجمی و آسوری (اسیریا) میں کندہ کئے ہوئے پائے گئے ہیں جو ان کے عہد کے واقعات اور مروجہ زبانوں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کتبوں سے یونانی مورخین کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے شاہان اکیمینی کی دیکھا دیکھی راجہ اشوک نے بھی ہندوستان کے مختلف مقامات پر کتبے کندہ کرائے۔ ساسانی عہد کی زبان کے لئے اس عہد کے کتبوں کے علاوہ سکے بھی موجود ہیں۔ تیسرا ذریعہ معلومات کا شاہ نامہ ہے جسے فردوسی نے سلطان محمود کی سرپرستی میں چالیس سال کی مسلسل مشقتوں کے بعد سنہ ۱۰۱۰ء میں اختتام کو پہنچایا۔ اس کتاب کی شہرت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو سلطان مذکور کی وعدہ خلافی کا افسانہ[2] جو نہایت مختلف صورتوں میں کتابوں میں مذکور ہے۔ دوسرے بعضوں کا لغو خیال کہ اس میں دو ایک کے سوا کوئی عربی لفظ نہ آنے پایا ہے۔ تیسرے شاعر کی معجز بیانی۔ چوتھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایران کے قدیم قومی قصوں کے اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی کی گئی ہے اس کام کے سرانجام کرنے میں فردوسی اس قدر تن دہی و گرم جوشی سے منہمک ہوا کہ اسے نہ سر کی خبر رہی نہ دستار کی۔ نہ حق کا پاس رہا نہ انصاف کا۔

---

[1] عرفی کا شعر مشہور ہے: از نقش و نگار در و دیوار شکستہ ✦ آثار پدید است صنادید عجم را

[2] گزشت شوکت محمود و در زمانہ نماند ✦ جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدر فردوسی۔ (جامی)

جن جذبات کو اس نے ان لوگوں کے سینوں میں پایا جن کی وہ نظم میں تصویریں کھینچنے کو بیٹھا تھا
انہی سے اپنا سینہ بھی پُر پایا۔ جب بھی یہ کسی دشمن کا قول ہے کہ

تنش گیر د جاں گیر و گیری زباں
زگیراں بگیری یکے قصہ خواں

شاہنامہ میں کیومرث سے لے کر گرشاسپ تک کے حالات اوستہ سے ماخوذ ہیں۔
ان میں سے چند کا دوسرے ذرائع سے بھی پتہ ملتا ہے۔ ازاں جملہ جم یا جمشید جس نے سات سو
سالی نہ صرف انسان پر بلکہ حضرت سلیمان کی طرح پرندوں اور دیووں یا جنوں پر بھی حکومت
کی اوستہ میں بطور ایک خوب صورت نوجوان یمؔ نامی کے مذکور ہے جسے اہورمزد نے
اپنا پیغام بنی نوع انسان کو پہنچانے کے لیے مدعو کیا تھا لیکن اس نے انکار کیا۔ ہندوؤں
کی قدیم کتابوں میں یمؔ تحت الثریٰ کے حاکم کا نام ہے اور شاید اسی مناسبت سے بقول
صاحب برہان قاطع جم حضرت عزرائیل کا اور جمدھر ایک ہندوستانی ہتھیار کا نام ہے
اژدھاک جس سے لفظ اژدہا مشتق ہے یا اس کا مخفف دھاک اوستہ
میں ایک بڑے خوفناک سانپ کا نام ہے اسی طرح کا جیسا کہ یونانی خدا فیبس (لاطینی
پولو فارسی خورشید) نے مارا تھا۔ فردوسی اس لفظ کو معرب کرکے ایک پیدائشی
منسوطر نگر خوں خوار عرب۔ جمشید کے قاتل اور تخت کیاں کے غاصب کا نام ضحاک
تازی بتاتا ہے۔ ہیروڈوٹس رقم طراز ہے کہ پہلا صوبہ جو سلطنت آسوریہ سے نکلکر خود مختار
ہوگیا۔ میڈیا یعنی عجم تھا اور اس کے پہلے بادشاہ کا نام ڈیوکینز تھا جو اوستہ کے
لفظ دہاک کی یونانی صورت ہے۔ اس کے تیسرے جانشیں اسٹیاجیز کو کرشس پارسی نے
۵۵۰ قبل مسیحؑ میں شکست دیکر اکیمینی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اہل میڈیا ایرانی نسل ہی تھے
اور ان کی زبان ایک ایرانی زبان تھی۔ ہمدان ان کا دارالسلطنت تھا۔ انھوں نے خود اپنی
کوئی یادگار نہیں چھوڑی مگر ان کے حالات جستہ جستہ توریت اور یونانی تواریخ میں ملتے
ہیں۔ بقول فردوسی جب ضحاک تازی کا ظلم حد سے گذر گیا تو کاوہ آہنگر نے علم بغاوت
درفش کاویانی بلند کیا اور خاندان کیانی کے ایک نونہال فریدوں بن آبتیں کو تلاش کرکے

---

۱؎ اکبر بادشاہ کی بھی کسی وقت یہی حالت تھا۔ منتخب التواریخ میں مذکور ہے کہ جب اس کے سامنے
شاہنامہ کے مشہور شعر تخمیناً سو ساٹھ دار سے پڑھے جاتے تو وہ بے حد
خوش ہوتا اور ان کو بار بار پڑھواتا۔

تخت پر بٹھلایا۔ اس نیک نام بادشاہ کی حیات میں اس کے بیٹوں کے درمیان تقسیم ممالک کے متعلق نزاع شروع ہوئی اور یہ نزاع نسلاً بعد نسلٍ صدیوں تک جاری رہی جس میں نریمان سام زال رستم سہراب نے بڑے بڑے معرکے مارے یا شہرت پائی اوستا میں ان بہادروں کا نام و نشان نہیں اور نہ یونانی مورخین ان کے وجود سے خبر رکھتے تھے۔ جب بھی فردوسی کا یہ کہنا کہ:

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

محض تعلّی ہے کیونکہ رستم کے کارنامے شاہنامہ لکھے جانے کے صدیوں پیشتر سے عوام میں مشہور دیار و امصار تھے۔ کیخسرو تخت و تاج گستاسپ کے حوالہ کرکے غایب ہوگیا۔ گستاسپ کی حیات میں اس کا بیٹا اسفندیار روئین تن رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بعدازاں رستم خود اپنے بھائی شغاد کے فریب سے کنوئیں میں گر کر فوت ہوگیا۔

سیستانی بہادروں کے تذکرے قومی روایات پر مبنی ہیں لیکن کوئی تحریری سند نہیں رکھتے۔ بقول یونانی مصنفین کے ایگروڈیٹیز ملقب بہ کیرس انگریزی تلفظ سائرس جو ایرانی کتبوں میں کرش یا کرد اور عربی تواریخ میں خورس کے نام سے مذکور ہے جیسا اوپر لکھا گیا تاریخی خاندان ایکمینی کا بانی اور ایک نامور فاتح گزرا ہے۔ اس کے دوسرے جانشین گشتاسپ معروف بہ دارا سے اول و دارائے اعظم کے عہد میں ایرانی سلطنت دریائے انڈس سے لے کر دریائے نیل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ایک بیٹے کا نام یا لقب یونانی زبان میں انگریزی تلفظ کے موافق زرکسیز تھا جسے فردوسی بتقلید اوستا اسفندیار کہتا ہے۔ اس کا بیٹا بہمن ملقب بہ اردشیر (یونانی آرٹ زرکسیز، فارسی اردشیر یعنی شیر خشمگیں) دراز دست اپنے دادا کا جانشین ہوا۔

بعدازاں دو داور دارا ب و دارا تخت نشین ہوئے اور الذکر کو اسکندر رومی نے معرکۂ اربل میں ۳۳۰ قبل مسیح میں شکست دیکر خاندان ایکمینی کا خاتمہ کردیا۔

---

فا History of Ancient Persia by Rogers, 1929

فا۲ محمد بختیار خلجی فاتح بنگالہ کی نسبت فرشتہ رقم طراز ہے کہ بنیت او خیلی از غرابت بود۔ ازاں جملہ اینست کہ چوں دستہا فرو گزاشتے سر انگشتہا از زانو ہاش گزشتے۔

دیباچہ برہان قاطع ہیں جس سے ایران کی چودھری اوپر نقل کی گئی ہے فارسی زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف اقوال منقول ہیں۔ از آں جملہ

دگروہے میگویند کہ در زمان بہمن اسپندیار چوں مردم از اطراف عالم بدرگاہ او می آمدند و زبان یک دیگر را نمی فہمیدند بہمن فرمود تا دانشمنداں زبان فارسی را وضع کردند و آں را دری نام نہادند یعنی زبانیکہ بدرگاہ بادشاہ تکلم کنند و حکم کرد تا در تمام ممالک بایں زبان سخن گویند۔

اسی عبارت کا پہلا حصہ میرامن کی اس عبارت سے جو انھوں نے اردو زبان کی ابتدا کی نسبت دیباچہ باغ و بہار میں تحریر کی ہے بہت کچھ مشابہ نظر آتا ہے اگر ان میں سے پوست علیحدہ کر دئے جائیں تو دانے دست یاب ہونگے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا شاہان اکیمینی دو سو بیس ۲۲۰ سال تک برسر حکومت رہے۔ ان کی قلم رو نہایت وسیع تھی اور فارس اس کا برابر مرکز رہا۔ ان میں سے بہمن کا عہد نسبتاً زیادہ امن و امان و ترقی تہذیب کا زمانہ تھا۔ گریرسن کہتے ہیں کہ دری جسے وہ قدیم فارسی یعنی صوبہ فارس کی قدیم زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔

دربار استخر کے دفتروں کی زبان تھی اور اس حیثیت سے سارے ایران میں نہ صرف سرکاری مکاتیب میں مستعمل تھی بلکہ لامحالہ مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان بین الاقوامی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ جیسا کہ ہندوستان میں اندنوں ہندوستانی زبان کا درجہ ہے[1]۔ ہندوستانی سے ان کی مراد سہل اردو ہے[2]

دری فارسی کی قدیم صورت ہے اور فارسی دری کی موجودہ صورت۔ جس زبان میں کہ شاہان اکیمینی نے اپنے احکام و اعلانات میخ نما حروف میں کوہ بے ستون ونقش رستم اور استخر کی دیواروں پر کندہ کرائے تھے اس سے دو ڈھائی ہزار سال آج سے پیشتر کی فارسی زبان کا پتہ ملتا ہے لیکن پروفیسر[3] براون کا یہ کہنا کہ اسی زبان میں کیرس دارا اسپندیار اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہ باتیں کیا کرتے تھے دور از کار معلوم ہوتا ہے کیونکہ ادبی سنسکرت کی طرح دری تحریروں میں بھی اس قدر تصنع و تکلف نمایاں ہیں کہ اسے کسی زمانہ میں کسی قوم یا کسی محدود گروہ کا بھی معمولی روزمرہ فرض کر لینا دشوار ہے۔

---

[1] روئداد مردم شماری ہند ۱۹۰۱ء صفحہ ۲۹۱ [2] ایضاً صفحہ ۳۳۱۔
[3] تاریخ ادبیات ایران جلد اول ۱۹۲۶ء صفحہ ۵ و ۹۷۔

ان کتبوں میں ایک لفظ جو بار بار آتا ہے خشایسی ہے۔ جب تک اس میں سے شروع کی خ اور دونوں ی حذف نکریں اور حسب دستور س کو ہ سے نہ بدلیں آسانی سے متلفظ ہونے کے قابل لفظ شاہ برآمد نہیں ہوتا۔ ابتدا میں اہل یونان ایرانیوں کے ہمزبان۔ ان کی زبان میں بھی بہتیرے لفظوں کے شروع میں ایسے دو حروف صحیح پائے جاتے ہیں جنھیں ملاکر بطور ایک حرف مرکب کے متلفظ کرنا آسان نہیں۔ اس لئے بول چال میں ان کا پہلا حرف گر جاتا ہے جیسے ٹسی فون (مداین۔ ساسانی پایہ تخت) سوائکس (روح) نوم (ذہن یا یک نوع خلقت) نمون (یادداشت) کے علی الترتیب پہلے حروف سی۔ پی۔ جی۔ ام گر جاتے ہیں۔ سنسکرت میں ایک لفظ سہستر تھا۔ پراکرتوں کے ضمن میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ اکثر کسی پراکرت لفظ کے اخیر کے جزو کی حرکت ہندی میں اس حرکت کے مطابق حرف علت سے (جیسے زبر کھینچکر الف سے) بدل جاتی ہے اور اس لفظ کا آخری حرف ساکن ہوجاتا ہے اسی طور پر سہستر کی پہلی س بالکل محذوف اور دوسری کو ہ سے بدل کر اور اس پر الف کا اضافہ اور رکو ساکن کرکے معمولی فارسی لفظ ہزار نکل آتا ہے یہ لفظ ہندی میں سنسکرت سے نہیں پہنچا ہے بلکہ براہ راست فارسی سے ایرانیوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے عوض ہندی میں اب تک دس سو بھی بولتے ہیں۔ الغرض خشایسی کی خ اغلباً محض آرایش کی تھی زیادہ ہی کچھ اہمیت نہیں رکھتیں اور س ہ سے بدل کر یہ دری زبان کے کتبوں کا لفظ فارسی میں بالتحقیق شاہ ہوگیا ہے۔ پس یہ اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عہد ایکمینی میں بھی اس لفظ کا تلفظ بعینہٖ ویسا نہ تھا جیسا کہ کتبوں میں املا کیا ہوا پایا جاتا ہے بلکہ اس سے بہت کچھ ہلکا۔ اگر شاہ نہیں تو اس کے مانند کوئی دوسرا لفظ۔ اور شاہان ایکمینی۔ بپروفیسر براؤن کے حسب بیان مذکورہ بالا کتبوں کی پیچ در پیچ زبان میں باتیں نہ کیا کرتے ہونگے بلکہ اس کی بہ نسبت ان کا روزمرہ بہت کچھ سیدھا سادہ ہوگا۔ کتبوں کی زبان اور اس عہد کے عام روزمرہ کے درمیان ایسا ہی اختلاف کا ہونا یقینی ہے جیسا کہ ادبی سنسکرت اور پراکرت اولی کے درمیان مانا گیا ہے۔

ہروڈٹس و دیگر یونانی مصنفین کا بیان ہے کہ اہل ایران حروف سلبیہ خصوصاً س سعفص کو ہ سے بدل دیتے ہیں یا بالکل ساقط کر دیتے ہیں۔ سنسکرت اور قدیم و جدید فارسی کے چند الفاظ کو بطور مثال مقابلہ کرنے سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

---

Ctesiphon, psyche, gnome, mnemon.

سنسکرت ۔ سپتن دسن ماس ستدہ فارسی ۔ ہفت (دری ہپت)
وہ ماہ (مہینہ) ہند ۔ سنسکرت ۔ اسور سیا علامت متصلہ مضاف الیہ
دری ۔ درا جس سے اہور مزدہ ۔ ہرمزد) ہیا ایضاً ۔

فارسی میں چند الفاظ ایسے بھی ہیں جو ان دو حرفوں میں سے ہر ایک کے ساتھ پائے جاتے ہیں مثلاً آماس و آماہ

گشتاسپ دارائے اول ۵۲۲ق م لغایت ۴۸۶ق م قبل مسیح کا ایک اعلان کوہ بے ستون پر کندہ کیا ہوا تاریخی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس کے چند الفاظ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں :

پُتر ۔ بعینہ جیسا سنسکرت میں ہے ۔ فارسی پسر ۔ پور وُزرک ۔ فارسی بزرگ ۔ سنسکرت کی طرح دری میں بھی لفظوں کے اخیر کے حروف پر عموماً حرکت فتحہ ہوتی ہے اور اس کے برخلاف فارسی و ہندی میں یہ حروف ساکن ہوتے ہیں ۔

دہیُنام ۔ م علامت مفعول خارج کرکے دہیُنا عوام میں دیہاں ۔ فارسی دیہیا و دیہات واحد دیہ و دہ ۔ سنسکرت دیس

تھِرَت کو اس کی قریب المخرج ذ سے بدل کر اور چ گھل کر ی ہو جانے سے یہ لفظ فارسی میں دیر بمعنی معبد ہوا ۔

دری زبان کے لئے مذکورہ بالا کتبوں کے ماسوا دوسرا کوئی ذریعہ علم نہیں ۔ ان کی لغات کا کل سرمایہ چار سو لفظوں سے بہت زیادہ نہیں ۔ دری بھی سنسکرت کے مانند ایک اتصالی زبان تھی ۔ سنسکرت نَرَس ۔ مادہ نَرَ جس سے مفعول نرم ۔ مضاف الیہ نرسیا دری مرتی جس سے مفعول مرتیم ۔ مضاف الیہ مرتیہیا ۔ یہ لفظ اور سنسکرت کا لفظ مرتی ابتدا میں ہم معنی تھے ۔ لیکن بمرور دہور اختلافات صورت و معنی کے ساتھ دری کا لفظ فارسی میں مرد اور سنسکرت کا لفظ ہندی میں مورت ہو گیا ۔ بہر کیف جیسا مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے ۔ دونوں زبانوں میں حالتوں (کیسز) کی علامتیں ایک ہی یا ایک طرح کی ہیں ۔

کوئی اتصالی زبان جب روبہ ترقی ہوتی ہے تو پہلے اتصالی علامتیں خلط ملط ہو جاتی ہیں ۔ بعد ازاں یہ علامتیں بالکل متروک ہو جاتی ہیں اور ان کے عوض حروف معنوی

علٰحدہ سے مستعمل ہونے لگتے ہیں یعنی وہ زبان انفصالی ہو جاتی ہے۔ دری زبان ترقی کے پہلے درجہ پر بہت جلد پہنچ گئی۔ داراب بن بہمن کے عہد ۳۶۱ سنہ لغایت ۳۳۶ سنہ قبل مسیح کے کتبوں میں اسم و فعل کی گردانوں میں متصلہ علامتوں کا الٹ پھیر دکھائی دیتا ہے مثلاً بومام۔ اسمانام[1] جمع بجائے واحد مفعول۔ بومم۔ اسمانم۔ مرتیہیا واحد بجائے جمع مضاف الیہ مرتیانہیا۔ خشایسی فاعل بجائے خشایسیم مفعول۔

ان مثالوں سے پروفیسر[2] براون کے خیال میں دری کی تخریب ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں نحوی غلطیاں بیشک ہیں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے یہ اس کی ترقی کے بدیہی آثار ہیں۔ ابتدائی انگریزی بارہویں اور تیرہویں صدی بعد مسیح اور اس کی ہمعصر قدیم ہندی رچند بروائی کی زبان) میں سابق کی اتصالی علامتیں زیادہ تر خواہ متروک خواہ خلط ملط ہیں۔ یہ ان زبانوں کی اتصالی سے انفصالی کی طرف ارتقا کا زمانہ تھا۔

محمد عبد الحفیظ

---

(۱) سنسکرت ودمن اشمان۔ فارسی آسمان۔ آسمیمان ایک شاعرانہ خیال ہے۔

(۲) جلد اول طبع ۱۹۲۹ء صفحہ ۹۴ و ۹۵۔

# جنگنامہ ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

گذشتہ اشاعت میں مصنف جنگنامہ کے متعلق بالخصوص تین امور کیجانب قارئین رسالہ موقر کی توجہ مبذول کی گئی تھی (۱) سری دھر کا عرفی نام مرلی دھر تھا اور اس کے نتائج فکر جنگنامہ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے (۲) مرلی دھر مصنف رام چرتر (سال تصنیف سمبت ۱۷۱۹) اور سری دھر عرف مرلی دھر (سال پیدائش سمبت ۱۷۰۱) دو مختلف ہستیاں نہیں معلوم ہوتیں نام ذات۔ وطن دور شاعری۔ دربار ی تعلقات شعار زندگی کی یکسانیت ہر دو مصنفین کو ایک ہی شخص قرار دیتی ہے (۳) بیت نمبر ۸۰-۱۵۷۹ کے الفاظ "بلویو" (در اصل بلوکیو = دیکھا) اور دوری (دوڑ کر) بتاتے ہیں کہ شاعر نے چشمدید حالات منظوم کئے پہلی بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ امر دوم کے متعلق البتہ معترض کہہ سکتا ہے کہ جو نتیجہ چند مشترک صفات کے اتصاف سے نکالا گیا ہے قرین قیاس تو ہے لیکن قطعی ثبوت پر مبنی نہیں۔ ضرورت ہے کہ رام چرتر اور جنگنامہ اور دوسرے مختلف تصانیف کا جو اس شاعر سے منسوب کیجاتی ہیں بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے خیالات کے اشتراک الفاظ کی نشست۔ فقرات وتشبیہات کے اتحاد وتکرار عبارت ومضامین کی یکسانیت سے خاطر خواہ ثبوت بہم پہونچایا جائے۔ افسوس ہے کہ ہم اس امر کا انفصال اُن ہندی نقاد کے ذمہ چھوڑنے کے لئے مجبور ہیں جنہیں خوش قسمتی سے شاعر کی دوسری تصنیفات پر دسترس ہو اب رہا آخری امر تو اسے بھی محل نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ "بلویو" (مہتا) اگر صحیح سمجھا جائے تو بھی کوئی قباحت نہیں ہوتی "بلویو"۔ میرو "شرتیا" میں علاوہ رعایت لفظی کے ہندوؤں کی "پورانی" روایات کیطرف جسمیں دیوؤں کا سمندر میں پہاڑ کو متھنے کا ذکر ہے اشارہ موجود ہے لہذا شعر کی اردو نثر یہ ہوگی "سری دھر (کہتے ہیں) کہ فرخ سیر کی فوج نے، دوڑ کر بیروں (سورماؤں) کے جھنڈ کو متھ ڈالا اور سر اور دھڑ کے پہاڑ سے خون کی ندی بہادی۔ ہمیں تو یہ تشریح جو ایک ہندی داں بزرگ سے عطا ہوئی ہے کچھ زیادہ جچتی نہیں "بلوکیو" سے کوئی سقم شاعری عارض نہیں ہوتا کسی لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہوتی شعر کسی مزید وضاحت کا محتاج نہیں رہتا علاوہ اس کے جنگنامہ کے مضامین۔ طرفین کے بہادروں کی طویل فہرست۔ منازل سفر۔ مناظر جنگ اور واقعات کی تفصیل اور مستند تاریخی کتابوں سے بیشتر واقعات کا تطابق ثابت کرتا ہے کہ شاعر نے آنکھوں دیکھی اور ہم عصروں سے سُنی ہوئی باتیں اپنے خاص انداز میں حوالہ قلم کی ہیں۔ ہم سطور ذیل میں مکمل ہندی نسخے مسٹر اروِن کے انگریزی ترجمے اور بابو رادھا کرشن اور بابو جگن ناتھ داس کے "مشگرہ" (تلخیص) سے

جنگنامہ کا خلاصہ مع حواشی کے پیش کرتے ہیں تاکہ اسکی تاریخی خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔

کتاب کا اصل مضمون اس بیت سے شروع ہوتا ہے ؎ چھٹی چلی جہاں جنی بھی یکایک چاہ
جہانتر دیہہ سرلوک کو گئے بہادر شاہ[۱] - یعنی فرخ سیر کو جاسوسوں کے خطوط سے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ کی روح نے جسم سے مفارقت کی اور بہشت کو سدھاری۔ اس نے اپنے بخشی اعظم خاں[۲] کو حکم دیا کہ فوجیں جمع کیجائیں کم و بیش دس دن بعد معتبر ذرائع سے خبریں پہونچیں کہ ذوالفقار خاں اور دیگر امرا نے معزالدین کی اطاعت قبول کرلی اور ذوالفقار خاں نے بھائیوں کو دھوکہ دیکر اپنی طرف ملا لیا۔ معزالدین کی تخت نشینی کا اعلان ہوا خطبہ جاری ہوا اور چاروں طرف احکام صادر کئے گئے[۳] اور یہہ خود دہلی کیجانب روانہ ہوا۔ اس خبر کو پاکر فرخ سیر نے امرا کو جمع کیا فوج کی بھرتی کا حکم دیا۔ تخت پر بیٹھا[۴] چتر شاہی بلند کیا۔ عبداللہ خاں[۵] نے حکم کی تعمیل کی الہ آباد پہونچا۔ سارے سرکار اور صوبہ پر متصرف ہوا اور فوجی دستے جابجا متعین کردئے۔ ادھر میر جملہ[۶] جہاندار شاہ کی مخالفت پر تلا بیٹھا تھا لیکن قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا اس نے ایک طویل خط میں فرخ سیر کو اطلاع دی کہ سید راجی خاں (مانکپوری) کو صوبیداری الہ آباد تفویض ہوئی اس نے سید عبدالغفار خاں کو ہراول مقرر کرکے آگے روانہ کردیا ہے اور عقب سے ایک بڑی فوج (شاہزادہ) اعزالدین کی سرکردگی میں کوچ کرنے والی ہے۔ فرخ سیر کو یہہ خط پاکر گونہ تشویش لاحق ہوئی لیکن حسین علیخاں (بارہہ) نے اس کا غم و غصہ فرو کیا عرض کی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تنہا عبداللہ خاں ان سب کے لئے کافی ہے اسے حکم نامہ بھیجدیا جائے۔ عبداللہ خاں نے فرمان پاکر

---

۱ مسٹر اردن نے چھانڑ (چھوڑکر) دیہہ (بدن) کا ترجمہ "قے کرکے مرگیا" کیا ہے جو صحیح نہیں چھانڈنا کے معنی چھوڑنا اور قے کرنا دونوں ہیں لیکن شاعر کا مطلب صاف ہے۔ جو متن میں عرض کیا گیا۔

۲ اردن نے یحیی خاں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ احمد خاں (غالب جنگ) نے شخصے فضل نامی کو فرخ سیر کے سامنے پیش کیا اسے اعظم خاں کا خطاب اور بخشی کا عہدہ عطا کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ۵ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو بخشی کا عہدہ اس سے لے لیا گیا۔

۳ بہادر شاہ کی وفات ۲۰ محرم ۱۱۲۴ھ جہاندار کی لاہور سے روانگی ۲۵ ربیع الثانی دہلی میں ورود ۱۰ رجمادی الاول ۱۱۲۴ھ

۴ فرخ سیر نے ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ کو دادا کے مرنے کی خبر سنی اور عظیم الشان کی جانشینی کا اعلان کردیا۔ ۲۹ صفر کو باپ کی وفات سنا اور باغ افضل خاں میں اپنی جانشینی کا اعلان کیا (اردن)

۵ یہاں شاعر نے صریحی تاریخی غلطی کی ہے ۱۰ ذی قعدہ ۱۱۲۲ھ کو عبداللہ خاں الہ آباد کا نائب ناظم مقرر ہوا۔ بہادر شاہ کے مرنے کے تین مہینہ قبل یہہ جونپور میں وہاں کے نظم و نسق کے لئے گیا پٹنہ میں اس کا بھائی حسین علی خاں ۱۱۲۰ھ سے نائب ناظم تھا اور پٹنہ اور الہ آباد میں کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہیں لیکن عبداللہ کے پٹنہ آنے کی شہادت کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بابو کرشن داس کہتے ہیں کہ شاید عبداللہ خاں دو ایک دن کے لئے الہ آباد سے پٹنہ آئے ہوئے ہوں لیکن ہم اس مفروضہ کو کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔

۶ عبداللہ ملا ئے تورانی (مآثرالامرا) ڈھاکہ اور پٹنہ میں قاضی رہ چکا تھا عظیم الشان کی وفات کے بعد لاہور سے جانب مشرق روانہ ہوا لیکن روک لیا گیا اسی کی کارستانی تھی کہ "سرداران عمدہ مغلیہ کلہم بادشاہ زادہ فرخ سیر ساختہ بودند" (عبرت نامہ اردن)

سر وقد تعظیم کی پھر اپنا خیمہ سرائے عالم چند کیطرف روانہ کیا دشمن کا راستہ روکدیا اور اپنے بھائیوں نجم الدین علیخاں، سیف الدین علیخاں، سراج الدین علیخاں کو پیش قدمی کی اجازت دی۔ راجہ رتن چند میر محسن خان انور خاں، سمندر خاں۔ یادگار بیگ۔ مرزا دلی بھرام بیگ۔ برقنداز خاں اور درویش علیخاں بھی آگے بڑھے یہہ سب امرا اسطرف سرائے عالم چند میں ٹھہرے۔ فوج مخالف کوھن میں خیمہ زن تھی طرفین کے درمیاں جوش و خروش پیدا ہوا دوسرے روز جنگ واقع ہوئی جو چھ گھنٹہ تک جاری رہی؛ سیدوں نے بڑی جانفشانی دکھلائی سید سراج الدین علیخاں مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا، عبدالغفار[1] خاں بھی زخموں سے چور ہوکر بے بس ہوگیا اور اسکی فوج بھاگ کھڑی ہوی۔ سیدوں کی فوج کو لوٹ کا کافی مال ہاتھ آیا جنکے پیر میں جوتے تک نہ تھے مالک الرقاب ہوے۔

مرزا منظور نے اس جنگ کی روداد عبداللہ خاں کے گوشگذار کی، موخرالذکر نے قسم کھائی کہ بھائی کے خون کا میں ضرور انتقام لونگا۔ اس کے بعد نجم الدین علی خاں الہ آباد میں واپس آئے بھائی سے ملے عبداللہ خاں نے اپنی فتحمند فوج میں انعامات تقسیم کئے پھر صاحب رائے ماتھر کو حکم دیا کہ جنگ کی ساری کیفیت سید حسین علیخاں کو لکھ بھیجے موخرالذکر کو یہہ خط شہر پٹنہ میں موصول ہوا اس کا حسب ذیل مضمون اس نے اپنے آقا فرخ سیر کو پڑھکر سنایا۔ ساری فوج کے ساتھ جلد آئیے اعزالدین نے کوڑہ میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ راجہ چھبیلہ رام[2] چھل کرکے اس کے ساتھ ہولیا ہے علی اصغر خاں بھی اسکے شامل ہے لیکن ان دونوں کے دل ہمارے ساتھ ہیں۔ زین الدین خاں ولی جانباز خاں مظفر علیخاں فقیر اللہ خاں مہ یار خاں ہم سے مل گئے ہیں اور پٹنہ کا قصد رکھتے ہیں تاکہ بادشاہ فرخ سیر کی قدمبوسی کا شرف حاصل کریں۔ ابراہیم حسین خاں زبانی حال عرض کرینگے۔

حسین علیخاں کو سراج الدین علیخاں کی موت کا بہت صدمہ ہوا اسی پیچ و تاب میں فرخ سیر سے روانگی کی اجازت چاہی حکم ہوا دو ایکدن اور ٹھہرو امرا کو جمع کرو۔ اعزالدین کی فکر کیا اب تو معزالدین کی ساری فوج سے مقابلہ کرنا ہے۔ دوسرے دن دیوان خاص میں دربار ہوا مرتضیٰ خاں نے

---

[1] حاجی محمد خاں (کہ پیش آورد معظم خاں بہادر شاہی بود) کا صوبیدار الہ آباد مقرر کیا جانا۔ عبدالغفار خاں گروہزی کا بھیجا جانا سرائے عالم چند میں عبداللہ خاں کی بھیجی ہوئی فوج سے لمقابلہ تاریخوں سے ثابت ہے۔ لیکن جنگنامہ میں ابوالحسن خاں بخشی عبداللہ خان کا نام ملتا ہے نہ عبدالغفار خاں سے بھلائی کی موت کا ذکر ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ عبدالغفار خاں بھاگ نکلا اور معزالدین کے ساتھ فرخ سیر سے لڑا (اردوئی۔ سیر۔ عبرت نامہ وغیرہ)

[2] راجہ چھبیلہ رام اور علی اصغر خاں کے واقعات بھی صحیح ہیں۔ اعزالدین سے غداری کا سبب صاحب عبرت نامہ نے بتایا ہے "درچنین وقت نازک از ہردو فوجدار طلب محاسبہ کردند"

بادشاہ (فرخ سیر) کے حکم کے مطابق مغرب کی جانب اپنے دستے کے ساتھ کوچ کیا۔
اور بہادر پور میں منزل گزیں ہوا۔ پھر اعظم خاں بخشی کو بھی آگے بڑھنے کا حکم ملا اس کے
چاروں بھائی محمد صالح خاں۔ محمد شجاع محمد حسین گلاب (غلام) مہدی خاں اس کے ساتھ تھے
ان کے علاوہ میر عزیز خاں جیما(؟)، خاں سلطان قلی خاں۔ محمد حیات۔ نیک نام خاں۔ خیر الدین
خاں۔ دلاور خاں۔ محمد امان بیگ۔ میر حملہ(؟) میر مکرم۔ شجاعت اللہ خاں۔ شیخ رحمت اللہ خاں
تیمور خاں اور سادات خاں مازندرانی اور اس کے تینوں بیٹے فرزند خاں صلابت خاں
سیف خاں بھی روانہ کئے گئے۔ انہیں حکم تھا کہ آگے بڑھکر دشمنوں کو چاروں طرف سے گھیر لینے
کی کوشش کریں۔

دوسرے دن فرخ سیر کے دربار میں اشرف خاں[1] (خواجہ عاصم) حاضر ہوا۔ یہ معز الدین کا
ساتھ چھوڑ کر اور اعز الدین کی نظر بچا کر پٹنہ پہونچا تھا اس کے آنے سے فرخ سیر کو نہایت مسرت
ہوئی اسے خان دوراں کا خطاب دیا۔ اب کسی نیک ساعت میں پٹنہ سے کوچ کی تیاری ہونے لگی
کہ اس اثنا میں فقر اللہ خاں غازی الدین خاں[2]، جانباز خاں اور ابراہیم حسین خاں بھی آپہونچے
انہیں بھی خطابات و انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ ابراہیم حسین خاں کو بھاگلپور جانے کا حکم ملا۔ سید[3]
غیرت خاں کو پٹنہ کی نیابت، صوبیداری تفویض ہوئی۔ دیگر امرا اور سرداران فوج کے اجتماع کا
حکم دیا۔ یہ سب سلاح بکتر ساز و سامان سے آراستہ ہوکر کوچ کے لئے تیار ہوئے یہاں پر ایک
طویل فہرست شاعر نے فرخ سیر کے عمائدین و رفقا کی پیش کی ہے مسٹر ارون نے یہ حصہ ترک کر دیا ہے
مگر چونکہ ہندی کتاب عسیر الحصول اور بالخصوص اردو داں حضرات کی دسترس سے باہر ہے اس لئے
ہم ان کے اسما کو ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔ علاوہ ان کے جن کا نام اوپر آگیا ہے حسب ذیل امرا فرخ سیر
کے ساتھ تھے۔ حسین علیخاں۔ علی نقی خاں۔ عنایت اللہ خاں (اس کا بیٹا) شجاعت اللہ خاں۔ میر
مشرف[4]۔ اسد علیخاں۔ آتش خاں۔ منظفر خاں۔ نور اللہ خاں (اس کا بیٹا) عنایت خاں۔ دوست
علیخاں۔ ولی محمد۔ سادات خاں۔ خانہ زاد خاں (خطاب شائستہ خاں)، رستم خاں۔ داؤد خاں
دوبیٹہ باز۔ نصرت خاں۔ امیر خاں۔ سیف اللہ خاں۔ مرزا قاسم بیگ۔ سلطان بیگ۔ فتح اللہ خاں
افراسیاب خاں۔ محمد واسع خاں۔ فتح علیخاں (میر آتش)، راجہ گندھرپ سنگہ (ملبندیلہ) سف شکن خاں

---

[1] اس واقعہ کی بھی تاریخیں تصدیق کرتی ہیں (عبرت نامہ۔ سیرۃ المتاخرین خافی خاں۔ ارون وغیرہ)
[2]
[3] یہ لکھنو کا رہنے والا تھا اور حسین علی خاں کے مشہور رفقا میں تھا اس کا ذکر تاریخوں میں متعدد مقامات پر آتا ہے۔
[4] یہ سید برادران کا عزیز تھا۔ ارون کا نوٹ اس کے متعلق ملاحظہ ہو
[5] حسن بیگ نائب ناظم اڑیسہ (سیر المتاخرین۔ خافی خاں ارون وغیرہ

گلاب (غلام علیخاں (ذو الفقار خاں خطاب) میر مختار خاں[۵۱] - امتیاز خاں - دربار خاں مظفر علیخاں (طرہ باز) اکبر علیخاں - سید انور خاں - جبار خاں - بیرم خاں - رشید خاں - الاچی بیگ (خطاب بہادر دل خاں) اختیار خاں - مخلص خاں - خواجہ عبداللہ (اس کا بیٹا) خواجہ رحمت اللہ)

جب کل سردار مجتمع ہوئے فرخ سیر نے ارسلان خاں کو پیش قدمی کی اجازت دی، یہہ نقارہ بجاتا ہوا پیش خیمہ سے کر آگے روانہ ہوا اور پانچ کوس پر منزل گزیں ہوا - دوسرے روز علی الصباح فرخ سیر کی سواری بڑے طمطراق سے نیک شگون میں روانہ ہوئی - اطراف و جوانب سے جانباز آتے اور اس کی فوج سے ملحق ہوتے گئے - مختلف مقامات پر منزل کرتا ہوا فرخ سیر کھجوداں پہونچا - یہاں اعظم خاں اس کی فوج کے ساتھ آکر ملحق ہوا - بہادر پور میں مرتضی خاں ملا - بنارس کے نزدیک[۵۲] نماز عید ادا کی گئی - پھر کسیری کی راہ سے فوج جھوسی پہونچی وہاں سید عبداللہ خاں نے شرف ملازمت حاصل کیا قطب الملک کا خطاب پایا اس کے رفقا کو بھی حسب مراتب مناصب و سرو پا و انعامات عطا کئے گئے - دریائے گنگا پر پل قائم کیا گیا فوج پار اتری چار دن الہ آباد میں جانب مغرب قیام رہا - یہاں فرزند خاں صلابت خاں اور سیف خاں حاضر ہوئے - راجہ چھبیلہ رام اپنی فوج کے ساتھ پہونچا اس کا استقبال کیا گیا راجہ کا خطاب اور چار ہزاری منصب ملا اس کے بعد علی اصغر خاں ہاتھی گرام میں آکر ملحق ہوا اسے بھی چار ہزاری منصب اور خان زمان کا خطاب عطا کیا گیا فوج آگے بڑھی اور رکمو ار پور کے پورب اور بندو کی[۵۳] گاؤں کے پچھم ایک درمیانی مقام پر خیمہ زن ہوئی (شاہزادہ) اعز الدین نے فتح آباد سے آگے جانب مشرق اور بندو کی کے مغرب میں ایک جگہ چھاونی[۵۴] ڈالی تھی - خندق کھود رکھی تھی اور اپنی فوج کے ہر چہار جانب مضبوط مورچہ قائم کیا تھا دونوں فوجوں کے درمیان قریب تین کوس کا فاصلہ تھا - فرخ سیر کی فوج میں جوش پیدا ہوا - عبداللہ خاں اور سید حسین علیخاں نے پیش قدمی کی عنایت خاں شجاعت خاں وغیرہ نے بھی بڑھکر حملہ کر دیا یہاں شاعر نے متعدد و قریباً ... جانبازوں کی فہرست دی ہے اور کئی اشخاص کو کسی نہ کسی اضافی صفت سے یاد کیا ہے مثلاً ھنگ دھر (تیر باز) یودھ یودھا (جنگ آزما) سولچھن (نیک سیرت) شیل ماحد (اخلاق مجسم)

---

۵۱ میر مختار خاں اور امتیاز خاں کا ذکر عبرت نامہ میں موجود ہے -

۵۲ اس کی تصدیق کامدار خاں صاحب تذکرہ سلاطین چغتائیہ نے کی ہے -

۵۳ تذکرہ سلاطین چغتائیہ

۵۴ بقول صاحب عبرت نامہ جنگ ہجو میں درعشرہ اولی شوال واقع ہوئی - کامدار لکھتا ہے کہ دو شبانہ روز جنگ تو لیمانہ بمیان آمد" لیکن ۲۹ شوال کی شب کو "پیش از انکہ جنگ صفوف بمیان آمد" خاں دوراں ناتجربہ کار اعز الدین کو لے کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا -

دشال بھوج بل (مضبوط بازوؤں والا) وغیرہ۔ یہاں کئی نئے نام ملتے ہیں جسمیں حسن خاں دیوان الہ آباد یادگار بیگ۔ میاں منظور۔ امین الدین خاں۔ حلیم خاں، افتخار خاں، رستم خاں وغیرہ قابل الذکر ہیں، فرخ سیر نے اپنی فوج کی صف آرائی کی اور خود گھاٹیں (؟) روک کر کھڑا ہو گیا ۵

شہنشاہ سو بھوج بانٹی ۔۔۔ رھیو آپن رو کی گھانٹی

فوج مخالف جہاں کی تہاں تھم کر رہ گئی اور دشمنوں کے دل میں کھلبلی سی مچ گئی ۵

بنٹی بھو جبں دلّی جہاں تھاں ۔۔۔ پر یو کھر برنشتر و (دشمن، دل مہاں رہیں)

آخر اعز الدّین کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی خوب لوٹ مچی۔ امتیاز خاں نے بڑھکر فرخ سیر کو تہنیت نامہ پیش کیا اور اطلاع دی کہ معز الدّین نے اپنے نہایت معتمد امرا یعنی خاں دوران (حسین خاں)، نو شیری خاں (ابن کوکلتاش خاں) عبدالصمد خاں لطف اللہ خاں صادق راجی خاں دل دلیر خاں کو حضور کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا لیکن اعز الدّین کی نالائقی نے اس کا کام بگاڑ دیا امرا اسے لیکر میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ باربرداری مویشی محافے توپ نقارہ خیمہ جات سب چھوڑ گئے۔ ممتاز خاں کو حکم ہوا کہ ہاتھی گھوڑے توپ اور نقارہ کو لے کر باقی مال غنیمت لوٹنے والوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے دن دربار ہوا مظفر خاں اور مرحمت خاں مستحق عنایت سمجھے گئے اول الذکر کو خان جہاں بہادر اور موخر الذکر کو مشہور خاں کے خطابات عطا ہوئے۔

اس فتح کے بعد فوج نے اسی جگہ چار دن قیام کرکے آرام کیا پھر فرخ سیر آگے بڑھا اور قصبۂ شاہ مدار میں پہونچکر مزار مبارک کی زیارت کی دس دن تک اس جگہ قیام رہا انعامات تقسیم کئے گئے اس اثنا میں میر جملہ کی عرضی پہونچی جسے ممتاز خاں نے دربار میں پیش کیا اور تقرب خاں نے پڑھکر سنایا۔ عبداللہ خاں کے عقلمند کایست عملہ شیر دمن داس متوطن سانڈی نے جس نے معز الدین کے دربار میں آمد و رفت کرکے حالات کا نظر غائر سے مطالعہ کیا تھا اپنے آقا کے پاس ایک طویل خط (۱۰۰ مصرعہ) بھیجا جس میں دربار کا نقشہ کھینچا تھا۔ مضمون خط یہ تھا" معز الدین مغرور اور نشہ سے چور رہتا ہے امرا کی جگہ گویوں اور ڈھاڑیوں نے لے رکھی ہے اور ماہی و مراتب علم نیچہ نوبت پاکر

---

لہ یہ لطف اللہ خاں صادق پانی پتی کا بھائی تھا۔ اس کا ذ[illegible] پیڑیوں میں آتا ہے۔

لہ دراصل اس قصبہ کا نام مکھن پور ہے کامگار خاں لکھتا ہے "بعد فتح سترگ شاہ جواں بخت (فرخ سیر) بعزم زیارت مزار شریف حضرت شاہ بدیع الدین قدس سرہ عرف شاہ مدار متوجہ مکھن پور گشت بعد سعادت زیارت بصوب مستقر الخلافت اکبر آباد (آگرہ) رو گذاشت"

پھولے نہیں سماتے رات دن ڈھول مردنگ شراب افیم اور بھنگ کا مشغلہ دربار میں ہر طرف خوش گلو رقاصائیں زیبا صورت کمسن لڑکے بازی گروں کے چھوکرے نازکش خواجہ سرا نظر آتے ہیں فحاشی کا بازار گرم ہے معزالدّین کو امور سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں، سارا اقتدار کوکلتاش خاں اور ذوالفقار خاں نے غصب کر رکھا ہے مگر ان دونوں میں بھی کسی آن نہیں بنتی[۵۱] غازی الدین خاں (چین قلیچ خاں) محمد امین خاں عبدالصّمد خاں قمرالدین خاں زکریا خاں رحیم خاں غرض کل تورانی[۵۲] امرا کو میر جملہ نے ورغلا کر اپنی طرف ملا لیا ہے اور یہ سب اس کے اشارہ پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔ ایک روز معزالدّین دربار میں بیٹھا تھا شراب کا دور چل رہا تھا کہ فرخ سیر کی فوج کے قنوّج میں پہونچنے اور اعزالدّین کی شکست کی خبریں پہونچیں رنگ میں بھنگ پڑ گیا سب کے ہاتھ پیر پھول گئے معزالدّین بڑبڑانے لگا کہ مجھی سے چوک ہوئی کہ ایک (نا تجربہ کار) کو سردار فوج بنایا اور نا اہل امرا کے ہاتھ میں زمام اختیار دیدیا خواجہ حسین کو جنگ کی واقفیت ہی کیا لطف اللہ خاں صادق پانی پتی کو بھی لڑائی سے کیا سروکار۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو سیدوں کو زیر کرتا اب میں خود ہی کل کوچ کروں گا بارہا کی اینٹ سے اینٹ بجادونگا میں نے تلوار کی زور سے تین شاہزادوں پر فتح پائی تخت و تاج حاصل کیا ان دشمنوں کا بھی قلع قمع کردوں گا۔ اس کے بعد اعزالدّین کو حکمنامہ بھیجا گیا کہ آگرے میں اپنا قدم جمائے رکھّے گھاٹ اور پایاب مقامات کی حفاظت کرے اور نہایت جلد بالم پور سے نیچے تین مظبوط پل باندھ رکھّے اس کے بعد بخشی کو حکم دیا گیا کہ سواروں کو مجتمع کرے فوجیوں کو دو مہینہ کی پیشگی[۵۳] تنخواہ ادا کردیجائے اور سارا انتظام کرکے رات ہی کو کوچ کی تیاری کرے اور میر منزل کو آگے روانہ کردے۔ امرا کو حکم ہوا کہ علی الصباح بہ عجلت آگرہ کی طرف قدم بڑھائیں اٹاوہ پر قبضہ کرلیں۔ دوسرے دن جب ساری فوج تیار ہوگئی معزالدّین سوار ہوا لیکن چاروں طرف سے بدشگونیوں[۵۴] کا سامنا ہوا (اس پر آیندہ روشنی ڈالی جائیگی) باوجود اس کے فوج نے کوچ کیا آگرہ پہونچی ساموگڈھ[۵۵] میں چھاونی پڑی اعزالدّین نے یہاں آکر باپ سے ملاقات کی اور اس کی بھاگی ہوئی فوج بھی ہمٹ آئی ان کے

---

۵۱ جہاندار شاہ کے دربار کا یہہ صحیح مرقع ہے کوکلتاش خاں اور ذوالفقار خاں کی منافقت عناد کی شہادت بھی تاریخوں میں ملتی ہے۔
۵۲ عبرت نامہ۔ تاریخ ارادت خاں۔ اردن وغیرہ۔
۵۳ یہہ مبارک اللہ واقع لکھتا ہے کہ خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ جواہرات الات وجنس حتی کہ چھت کے طلائی حصہ کو بھی گلانے کی نوبت آئی لیکن زیادہ فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔
۵۴ ۱۱ یا ۱۲ ذی حجہ کو آگرہ کے طرف روانگی (عبرت نامہ) "علامات ادبار از روزے کہ جہاندار شاہی متوجہ اکبرآباد شد" کا مواز خان ارادت
۵۵ یہہ مقام مبارک سمجھا گیا اس لئے کہ دارا کو اورنگ زیب نے اسی جگہ شکست دی تھی۔ اردن۔

سامنے معزالدین پھر اپنی بڑائی ہانکنے لگا کہتا تھا کہ سارا فساد ان بارہا کے سیدوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ میں انہیں زیر کرونگا سادات خاں نے کینہ کو راہ دی اپنے رشتہ مند کا حکم مانا اور اسکے بیٹے فرزند خان نے بھی جولانی دکھلائی جسے صمصام الدولہ کہتے ہیں میں اسکی تلوار ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا کون ہے جو میدان جنگ میں میرے سامنے ٹھہرنے کی جرات کر سکے مقہور چھبیلا رام نے اعزالدین کے دربار میں حاضری دی پھر مُل دے کر دشمنوں سے مل گیا اور یہی حال علی اصغر خاں کا ہوا انہوں نے میری طاقت کا اندازہ نہیں کیا۔ غرض ان سب پر بخار اتار کر معزالدین نے اپنی فوج کا جائزہ لیا پانچ لاکھ سوار[1] اور کئی ہزار ہاتھی شمار میں نکلے۔ توپ داغی گئی"۔

قاصد نے دیوان عام میں یہ خط فرخ سیر کے سامنے پیش کیا۔ صاحب اُسے اُٹھ نے پڑھکر سنایا۔ میر جملہ کے مکتوب کا ماحصل بھی یہی تھا۔ عبداللہ خان نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور غصّہ کر کہا اگر اجازت ہو ابھی بڑھکر حملہ کر دوں اور معزالدین کی قوت کو توڑ دوں فرخ سیر کو ڈھارس ہوئی۔ بارہا کے سردار سید عبداللہ کی اس پرجوش تقریر کے بعد محمد خاں بنگش[2] نے بیس ہزار مسلح فوج کے ساتھ آکر حاضری دی اسے پنج ہزاری منصب عطا ہوا اور اس کے رفقا کو بھی مناصب سے سرفراز کیا گیا۔ انہیں ہراول لشکر میں جگہ دی گئی اب فوج نے کوچ کیا۔ گرہ پہونچکر بالم پور کے نیچے دریائے جمن کے کنارے خیمے ڈال دیئے گئے۔ دوسرے کنارے کنارے پر آمنے سامنے فوج مخالف بھی جم گئی عبداللہ خاں کے جاسوسوں نے خبر دی کہ کچھ فاصلہ پر آگرہ سے جانب مغرب دریائے جمن پایاب ہے فرخ سیر کو اس خبر سے نہایت مسرت ہوئی۔ اس نے ایک چال سوچی خبر مشتہر کی گئی کہ دشمنوں نے دریا کو عبور کر لیا ہے۔ کچھ فوج تو روکنے کے لئے وہیں چھوڑ دی گئی۔ فرخ سیر بقیہ فوج کے ساتھ تیار رہا سید عبداللہ خاں رات ہی کو ایک دستہ کے ساتھ دریا کے پار اُتر گیا اور شب بھر کٹ کٹاتے جاڑے میں کھڑا رہا یہاں تک کہ وہ فوج جو دشمنوں کو روکنے کے لئے متعین تھی واپس بلا لی گئی اور قریب چار کوس[3] آگے بڑھکر

---

[1] یہاں کچھ شاعرانہ مبالغہ ہے لیکن تعداد کے متعلق تاریخوں میں اختلاف ہے۔ اردون کی کتاب متاخرین مغل جلد اول ملاحظہ ہو

[2] محمد خاں بنگش کا آنا اور کارنمایاں انجام دینا محقق ہے لیکن ہمراہیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی۔

[3] یہ کس باتیں تاریخوں میں موجود ہیں صاحب ماثرالامرا لکھتے ہیں "معزالدین در فکر عبور کردن دریا جمن بود کہ حسن علی خاں پیش قدمی نمودہ از متصل سرائے روز بانی چہار کروہے از اکبرآباد دریائے جمن را عبور کرد و در عقب او نواب فرخ سیر نیز از دریا عبور کرد" کامور خاں بھی لکھتا ہے کہ ۱۲ ذی الحجہ شب سہ شنبہ کو عین تقاطر باران و کثرت بخارمیں قطب الملک نے ہراول فوج کو "قریب سرائے روز بانی متصل سکندرہ" دریائے جمنا سے پار اتار دیا۔ خفی خاں (منتخب اللباب)

تین چار گھنٹہ میں صبح ہوتے ہوتے دریا کے پار حتی سکندرہ سے دو ایک کوس پورب فرخ سیر کا خیمہ پڑ گیا۔ اس خبر کا سُننا تھا کہ معز الدین کی فوج میں ابتری پھیل گئی مارے غصہ کے یہ اڑ بڑ بولنے لگا اور آنکھیں لال پیلی کرکے تلوار کو گھمانے اور مونچھوں پر تاؤ پھیرنے لگا کہتا تھا کہ میں کسی باغی کو زندہ جانے نہ دونگا اور سب کو عذاب کے شکنجے میں کس دونگا۔ پھر یہ اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہوا اور پانچ لاکھ کی ٹڈی دل فوج حرکت میں آئی آگرہ کے جنوب میں سکندرہ کے پاس بروز چہارشنبہ[۱] بتاریخ ۱۵ پوس سمبت ۱۷۶۹ مطابق ۱۱۲۴ ہجری ۱۴ محرم ۲۳ ماہ الہٰی آذر [۲]... نو بجے چھ گھنٹہ موسلا دھار پانی برسنے کے بعد جب مطلع صاف ہوا ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں سید عبداللہ خاں نے سبقت کی پھر تو ہر چہار جانب سے سورما دوڑ پڑے گھمسان کا رن پڑا کشتوں کے پشتے لگ گئے ادھر ہزار تو ادھر لاکھوں تھے مگر قلیل نے کثیر کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔

(شاعر نے اپنی کتاب کے آخر میں، اور یہ نصف سے کچھ ہی کم ہے۔ اس جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ متعدد جانبازوں کے کارنامے اور دست بدست لڑائی کی کیفیت اپنے خاص انداز میں نظم کی ہے۔ یہاں اس نے اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے۔ لیکن کام کی باتیں بہت کم بتائی ہیں ہم محض چند اہم واقعات پر اکتفا کرتے ہیں) قطب الملک عبداللہ خاں بادشاہ (فرخ سیر) کا حکم پاکر نعرہ کرتا ہوا داہنی طرف حملہ آور ہوا دھر جنگ بجنے لگے "بزن بزن" کا شور ہوا۔ محمد خاں بنگش عبداللہ خاں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس کے پیچھے افغانوں کے مختلف قبائل (انکا ذکر آئندہ ہوگا) لوہے میں غرق اور جان کی بازی کھیلنے پر آمادہ رواں دواں تھے روہیلوں کا دستہ زین الدین خاں[۳] داؤدزئی کی سرکردگی میں شریک جنگ تھا نامی سورماؤں کی چھاپہ مار رہبری کر رہا تھا خان دوران سادات خاں امیر خاں اور بہادر ممتاز خاں مع اپنے رفقا و رشتہ مندوں کے کارنمایاں انجام دینے لگے۔ اس طرف معز الدین (جہاندار شاہ) نے اپنے جنگی دستوں کے صفوف کو آراستہ کر رکھا تھا ہراول فوج کی کمان کو کلتاش خاں کے

---

[۱] روز چہارشنبہ سیزدہم (۱۳) ذی حجہ ۲۱ ماہ الہی ۱۱۲۳ھ (کامگار خاں)۔ دن اور سمبت سال صحیح ہیں تین تبیا (۲۴) کو کتابت کی غلطی اور تیئسا (۲۳) بھی سمجھا جائے تب بھی غلطی باقی رہتی ہے۔ اگرچہ کہ چند تاریخی کتابیں بھی ثلث و عشرین و مائتہ الف ۱۱۲۳ بتاتی ہیں اثر الامراء ۔ بحر المواج۔

[۲] کامگار لکھتا ہے" در نصف النہار اندکے در باران تخفیف شد"

[۳] ماثر الامراء ۔ اردو

ہاتھ میں تھی نوشیری خاں (اس کا بیٹا) اور اعظم خاں[1] (اس کا بھائی) راجی خاں۔ عبدالصمد [illegible] خاں سید عبدالغفار خاں اپنے آقا کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار تھے۔ طرفین کے بہادر بحر جنگ میں غوطہ زن ہوگئے۔ عبداللہ خاں نے جنوب کی جانب رخ کیا رتن چند معظم خاں۔ برقنداز خاں شمس خاں۔ انور خاں۔ سمندر خاں۔ یادگار بیگ۔ منظور میاں اس کے ساتھ تھے۔ دوسری طرف حسین علی خاں بخشی نے حملہ کیا عنایت اللہ خاں زین الدین خاں داؤد زئی گلاب علی خاں شیخ شجاعت اللہ خاں۔ اسد علیخاں گلاب (غلام مہدی خاں بخشی کی کمک میں دوڑے۔ فتح علیخاں اپنی توپیں ساجبیں اعظم پیرجیو یا فغان (امیرالدین) خاں۔ سلطان قلی خاں۔ فتح خاں، محمد امان محمد باقر عبدالرسول اور چھبیلہ رام نے اوتر سے حملہ کیا موخر الذکر کا خویش گلاب رائے اس کا ابن عم گردھر بہادر اور بھائی دیا بہادر اس کے ساتھ تھے بھگوتی داس کے لڑکے نے سورماؤں کو للکارا۔ راجہ گندھرپ سنگھ کے ہمراہیوں میں بندیلے چوہان جندیل گور بگھیلے رگھوبنسی چندربنسی۔ کچھواہے بنسی پرتیہار غرض مختلف راجپوت قبائل کے افراد جنگ آزما تھے۔ غازی الدین خاں داؤد خاں سیف اللہ خاں[2] کاظم بیگ سلطان بیگ خانہ زاد شائستہ خاں افراسیاب[3] خاں افضل خان صدر الصدور سید انور خان محمد علی عزیز خاں وربار خاں اختیار خاں مخلص خاں الایچی بیگ ارسلاں خاں، رشید خاں فتح اللہ خاں تقرب خاں بیرم خاں جانباز خاں فقر اللہ۔ سید مرتضی خاں بارہہ ٹیکا رام چھبیلہ میاں نہال خاں اعتماد خاں بھی کارنمایاں انجام دے رہے تھے۔ میر اشرف ذوالفقار خاں کیطرف بڑھا اور جنگ کرتا ہوا مارا گیا اس کا بھائی میر مشرف غصے سے بیتاب ہوکر شیر کے مانند دشمنوں پر جا پڑا۔ فتح علی خاں صف شکن[4] خاں اور زین الدین خاں بھی کھیت رہے اُدھر کے بھی کئی نامور مارے گئے سید حسین علیخاں[5] اور ذوالفقار خاں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے آخر الذکر کی اعانت کے لیے مختار خاں [illegible] لطف اللہ خاں دل دلیر خاں بڑھے انہیں راجہ چھبیلہ رام اعظم خاں سلطان علی خاں [illegible] اسوحت خاں نے روکا۔ راجہ چھبیلہ رام کا مہاوت مارا گیا راجہ نے ہاتھی سنبھالا [illegible] اس نے دادا رائے گلاب رائے نزدیک پہونچ گئے۔ مختار خاں اپنے ہاتھی کے ساتھ [illegible]

---

[1] محمد خاں، اعظم خاں بہادر، منصور جنگ رستم هند" عبرت نامہ۔
[2] تذکرہ سلاطین چغتائیہ
[3] ایضاً [4] اردین
[5] حسین علیخاں بہادر با امیر الامرا (ذوالفقار خاں) شده چند زخم نمایاں زخمی شده [illegible] میدان افتاد عبرت نامہ اردو۔ کامگار خانی

راجہ گرودھر بہادر دیوان بھگونت رائے کایست کا بیٹا سونبس رائے بینی رام ناگر۔ سید امام شیخ احمد خاں پسر محمد افغاں چھتولیہ۔ سید شاکر۔ غلام محی الدین خان نے پورے جوش سے دشمنوں پر حملہ کیا نواب اعظم خاں کا مقابلہ جانی خان نے کیا۔ موخر الذکر مارا گیا جنگ اسی حال پر جاری تھی کہ یکایک[1] عبداللہ خاں بنگش شادی خاں۔ رتن چند۔ نجم الدین علی خاں ان کے دیوان کرشن داس سید انور خاں سمندر خاں منظور طیب عرب یادگار بیگ کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑے کوکلتاش خاں۔ سید راجی خاں عبدالصمد خاں نوشیری خاں عبدالغفار نے روکنے کی بے فائدہ کوشش کی، کوکلتاش خاں اور قطب الملک محمد خاں بنگش اور اعظم خاں اور نوشیری خاں سے دو بدو مقابلہ ہوا سید راجی خاں عبدالصمد خاں اور راجہ رتن چند اور انور خاں نے بھی ایک دوسرے کا مقابلہ کیا قطب الملک (عبداللہ خان) کی جرأت دیکھ کر فرخ سیر کی فوج کی ہمت بڑھی لہو کی ندی بہہ گئی جیسے پہاڑ سے چشمہ پھوٹ کر نکلتا ہے بالآخر معزالدین نے فرخ سیر سے آگرہ کے میدان میں شکست کھائی اور خوش قسمت فرخ سیر اقلیم ہند کا فرماں روا ہوا۔

(باقی)

سید حسن عسکری

---

[1] عبداللہ خاں کے اچانک حملہ کا جس نے جنگ کا پاسہ پلٹ دیا سب تاریخوں میں ذکر ہے لیکن بیانات میں اختلاف ہے "ہنوز جہاندار (سپاہیاں) حرکت مذبوحی میکردند کہ سید عبداللہ از پشت چنداول [illegible] شروع بہ تیر اندازی کردہ (کوکلتاش خان) دریں اثنا سید عبداللہ خاں نزدیک سپاہ [illegible]

# مطبوعات جدیدہ

**انشائے داغ:** مرتبہ جناب احسن مارہروی مرحوم، صفحات ۱۶۲ + ۱۴، تقطیع ۸½ × ۶ انچ
شائع کردہ انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی۔ قیمت ۱؎

احسن مارہروی مرحوم داغ کے عقیدت مند شاگردوں میں تھے اور انھیں حیدرآباد میں "چند سال تک شبانہ روز اُن کی خدمت میں حاضر" رہنے کا بھی موقع ملا تھا۔ داغ کے حالاتِ زندگی پر ایک مستقل کتاب بھی آج سے کم و بیش چالیس سال قبل اُن کے قلم سے نکلی تھی۔ انشائے داغ کو اُن سے بہتر مرتب ملنا مشکل تھا۔ داغ نے بڑی عمر پائی، مختلف مقامات میں اُن کا قیام رہا، احباب سے قطع نظر، صرف تلامذہ سیکڑوں ہوں گے۔ افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ایک مدت کی تلاش سے بھی احسن مرحوم کو اردو کی ایک تقریظ، فارسی کے ۱۲ خط اور اردو کے ۱۲۷ خطوں کے علاوہ کچھ اور نہ مل سکا۔ انشائے داغ میں یوسف علی خاں اور کلب علی خاں کے نام کے متعدد خط ہیں لیکن آصف جاہ سادس کے نام کا صرف ایک خط ہے۔ غالب سے بھی داغ کی خط و کتابت تھی لیکن غالب کے نام کا ایک خط بھی غالباً محفوظ نہ رہا۔ داغ نے اپنی معشوقہ حجاب کو بھی ضرور خط لکھے ہوں گے، لیکن اس مجموعے میں ان خطوں میں سے ایک بھی نہیں مشہور تلامذہ میں احسن، بےخود دہلوی، دلیر کے نام کے خطوط ہیں، مگر حسن بریلوی، رسا، ہجر، نسیم بھرت پوری، سائل دہلوی نوح، بےباک وغیرہ کا ایک خط بھی مرتب کو نہ مل سکا۔ اقبال کو بھی کچھ دنوں داغ سے تلمذ رہا تھا، اُن کے نام کا بھی کوئی خط انشائے داغ میں نہیں۔

مقدمے میں مرتب نے بتایا ہے کہ خاص خاص لوگوں کے سوا داغ "اپنے دست و قلم سے بہت کم خط لکھتے تھے ... عام شاگردوں اور دوستوں کو زیادہ تر کسی حاضر باش شاگرد سے خطوط لکھوائے جاتے ... خط لکھنے یا لکھوانے میں غور و فکر کے عادی نہ تھے ... بے تکلف اور بےساختہ لکھواتے چلے جاتے تھے" داغ کی نثر کے متعلق مصنف کی رائے ہے کہ:

"وہ نثر میں بھی انھیں شوخیوں، رنگینیوں اور سلاست و لطافت سے کام لیتے تھے، جن کی بدولت اُن کی تمام شاعری نے خصوصی دل کشی و دل آویزی حاصل کی ہے ... وہ معمولی معمولی باتوں میں ایسے چٹکلے اور لطیفے کہہ جاتے تھے کہ سننے والے پہروں اُن کا مزہ لیتے تھے ... وہ اگر مختصر سا رقعہ بھی لکھواتے تو اس میں بھی پوری دلچسپی کا لاسا موجود ہوتا" "وہ جو کچھ بولتے اور لکھواتے وہ سمجھ سوچ کر بولتے اور لکھواتے تھے

جس میں پھر ردّ و بدل کی گنجایش نہیں ہوتی تھی.....:

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے　　　جو ہماری زبان سے نکلا

اُن کے بعض بعض خطوط میں کہیں کہیں لفظی بے ربطی یا املائی غلطی پائی جاتی تھی، مگر فی الحقیقۃ وہ اُن کی غلطی نہیں ہوتی تھی بلکہ کاتب کی غفلت یا غلط سماعت کی وجہ سے ایسا ہو جاتا تھا"

اس رائے میں انصاف پسندی سے زیادہ شاگردانہ عقیدت مندی کارفرما ہے۔ داغ کی فارسی نثر ایسی ہو جس پر متقدیوں کو بھی رشک نہیں ہو سکتا۔ رہی اردو، اس کا حال یہ ہے کہ اکثر خط بہت کمزور عبارت میں لکھے گئے ہیں، اور بے ربطی اس قدر ہے کہ کبھی کبھی داغ کا مطلب سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت صرف اُن خطوں کی نہیں جو داغ نے کسی کاتب سے لکھوائے ہیں، یوسف علی خاں اور کلب علی خاں کے نام کے خطوں کا بھی جو داغ نے یقیناً خود لکھے ہوں گے یہی عالم ہے۔ خط ۳ بنام کلب علی خاں پر رائے زنی کرتے ہوئے مرتب نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی "عبارت ڈھیلی اور معمولی" ہے۔ اور اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ "اب سے ستر بہتر برس پہلے اُردو نویسی اور بی اور منشیانہ شان کے ساتھ تقریباً مفقود تھی"۔ یہ توجیہہ بھی ناقابل قبول ہے، اس کے متعلق صرف اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ خط ۳ غالب کی وفات کے کچھ ہی قبل کا لکھا ہوا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) خط ۱۳ بنام کلب علی خاں: "نواب ضیاء الدین خاں صاحب نے تسلیم عرض کی ہے۔ ۲۔ آم کا باغات (کذا) دہلی میں امسال بھی نہیں، نہایت حیرت ہے۔ ۳۔ کہتے ہیں کہ ایک دوست نے لکھنؤ کے خربزے بھیجے تھے۔ ۴۔ اور آم رام پور میں ثمر بہشت، ننگڑا لاثانی ہیں۔ ۵۔ خربزوں کا حال دریافت کرتے تھے۔ ۶ میں نے کہا کہ آپ کی دلی سے اچھے ہوتے ہیں" پہلا جملہ واضح ہے، دوسرے جملے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حیرت کسے ہے۔ تیسرے جملے میں کہنے والا بظاہر وہی ہے جس نے تسلیم عرض کی ہے۔ چوتھا جملہ غالباً داغ کی زبان سے ہے۔ پانچویں میں دریافت کرنے والے، غالباً ضیاء الدین خاں ہیں۔

(۲) خط ۲۲ بنام کلب علی خاں: خالہ صاحبہ سے ملا۔ چراغ سحری پایا۔ حضور کی طرف سے حسب ہدایت سلام کہا۔ بہت دعائیں دیں۔ کہا کہ چونکہ تمھاری والدہ وہاں گئی تھیں، مشرف ملازمت سے نہ ہوئیں اور اس صدمے میں مر گئیں؟ اس لحاظ سے میں اس حالت ضعف میں بھی، گو ہزار بار قصد کیا، حاضر نہ ہو سکی اور میں نے ایک بار کچھ روپیہ برائے مکان رہن پر چاہا تھا، وہ بھی نامقبول ہوا، میری اُمید منقطع ہو گئی۔ میرا فخر و افتخار ہے جو وہ عطا کریں، مگر یہی خیال ہے کہ مبادا مقبول نہ ہو۔

(۳) ایضاً: "میرے نطفے سے جو لڑکی تھی اور اس کا انتقال ہو گیا تھا وہ مر گئی" انتقال ہو جانے کے بعد دوبارہ کس طرح مر گئی۔ یہ سخت حیرت انگیز ہے۔

داغ کی شوخی طبع مسلّم ہے، لیکن اُن کی نثر میں اس کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے۔ زبان کی سلاست اور لطافت سے بھی اُن کے بیشتر خطوط محروم ہیں۔ کبھی کبھی صحتِ زبان کا بھی لحاظ نہیں کرتے: (۱) بہت بہت مراتبِ آداب و تسلیمات عرض کی ہیں (۲) اہل توہّب سے مسجد کا فتح پایا تھا (۳) فردی مع احمد سعید خاں کے . . حاضر ہوئے اور وہاں شاہ . . صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے۔ (۴) آپ نے میری تاریخ پسند کی۔ تصویر میں دبلا پا کیا دیکھتے ہو (۵) سو روپے ماہوار میرے پاس پچاس روپے ماہوار اپنی استانی کے پاس عنایت کیے جائیں۔

داغ کو وہ سلیقہ نہیں کہ خطوں کو دل چسپ بنا سکیں، علمی اور ادبی مذاق کی باتیں بھی اُن کے خطوں میں بہت کم ہیں۔ انشائے داغ کی اہمیت ادبی حیثیت سے زیادہ نہیں لیکن اس بنا پر کہ یہ اُردو کے ایک مشہور شاعر کی شخصیت اور واقعاتِ زندگی پر روشنی ڈالتی ہے، البتہ قابلِ قدر ہے۔

داغ کی نثر میں جو معائب نظر آتے ہیں، وہ عجب نہیں کہ زیادہ تر بے پروائی کی وجہ سے ہوں۔ اُن کی تقریظ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ کوشش کرتے تو اپنی نثر کو ان معائب سے مبرّا رکھ سکتے تھے۔

مقدّمے میں اگر داغ کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کر دیے جاتے۔ تو خطوں کے سمجھنے میں آسانی ہوتی، اور اُن سے زیادہ لطف اٹھایا جا سکتا۔ مرتب نے خطوں کو تاریخی ترتیب سے پیش نہیں کیا، اس سے بھی اُلجھن ہوتی ہے کہ کسی خط میں عیسوی، کسی میں ہجری اور کسی میں فصلی سنہ ہے۔ مرتب نے اکثر مکتوب الیہم کے حالات لکھے ہیں، لیکن اولیا بیگم، عزیز بیگم وغیرہ کو نہ معلوم کیوں ناقابلِ اعتنا سمجھا۔ مرتب نے جن واقعات کی طرف خطوں میں اشارے ہیں، اُن کی تفصیلات بھی کہیں کہیں دی ہیں، لیکن بہت سے مبہم مقامات توضیح طلب رہ گئے۔ ضمنی طور پر جن اشخاص کے نام خطوں میں آئے ہیں، اُن میں سے بعض کی شخصیت کی تعیین نہیں کی۔ خورشید عالم داغ کے برادرِ اخیافی تھے، ان کے متعلق مرتب کا یہ قول صحیح نہیں کہ صاحب عالم ان کا عرف تھا۔ صاحب عالم وہ اس لیے کہے جاتے تھے کہ ظفر کے پوتے تھے۔

ہمیں افسوس ہے کہ یہ کتاب مرتب کی زندگی میں طبع نہ ہو سکی۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کے متن کو مسخ کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وہ ہوتے تو اس کی تصحیح کر سکتے تھے۔ و

**تاریخ منظوم سلاطینِ بہمنیہ:** مصنفہ سہیل، مرتّبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب صفحات ۱۰۰، تقطیع ۸ × ۶ انچ قیمت ۱۲ مطبوعہ شائع کردۂ انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی۔ یہ مثنوی گذشتہ سال رسالہ اردو میں چھپ چکی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ التفات کی مستحق نہ تھی۔ مقدمے اور مثنوی کو بہ غور پڑھنے کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا مصنف

ایک گم نام شاعر، سہیل ہے جس کی نسبت مرتب کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ برار کا رہنے والا تھا یہ بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، مرتب نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ شاعری سے اس مثنوی کو، مطلق سروکار نہیں، مصنف نے خشک تاریخی واقعات کو بے مزہ اور بے رنگ انداز میں نظم کر دیا ہے۔ مرتب کا یہ دعویٰ بھی کہ "یہ گذشتہ صدی کی اردو نظم کا بہت اچھا نمونہ ہے" کسی طرح تسلیم کرنے کے قابل نہیں، مصنف کو زبان پر کتنی قدرت ہے اور عروض و قافیہ سے کس قدر واقفیت ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے:

تھے نہ عہد یہ بتیس ہجری فزوں — ہوئے وارد ہند جو بابر شیوں
ہوا ان کی آمد کا شور و شغف — گئی کوکبہ کی چمک ہر طرف
علاء الدین عدم کو ہوئے تیز گام — ولی اللہ ہوئے اُن کے قائم مقام
سلاطین میں یہ جو شامل ہوا — تو خطبے میں نام اس کا داخل ہوا
برہمن تھا دہلی میں قانون گوے — منجم بھی تھا اور قانون گوے
منور مزین تھے ساتوں سما — زبانِ فرشتوں پہ صلِّ علی
بہ القاب گرامی ہوئے مخترع — حدود ممالک ہوئی مرتفع
یہ ہے مذہب حنفیہ میں حرام — نہ تھا موافقِ شاہ جو یہ کلام
اصول اور تفسیر و حکمت فقہ — تھا علم طبیعی میں بھی مدرکہ

تاریخی حیثیت سے بھی اسے کوئی وزن نہیں، اس کی بنا تاریخ دکن امجدیہ پر ہے۔ جو سرسالار جنگ کے عہدِ وزارت میں سید امجد حسین، بن سید اشرف الحسینی الایازی خطیب جامع مسجد و عیدگاہ ایلچ پور نے فارسی نثر میں لکھی تھی، اور جو ۱۲۸۰ھ میں طبع بھی ہو چکی ہے۔ خود مرتب کو اعتراف ہے کہ "مثنوی اپنی تاریخی حیثیت سے تاریخ فرشتہ پر مبنی ہے"۔ لسانی مسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، اس لیے کہ نہ اس کے مصنف ہی کو کوئی اہمیت حاصل ہے اور نہ اس کا زمانہ ہی قدیم ہے جس عہد میں یہ لکھی گئی ہے اُس کی بے شمار کتابیں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔

مرتب نے مقدمے میں تاریخ بہمنیہ سے متعلق بعض مسائل کی تحقیق کی ہے، اور مثنوی کے دو قلمی نسخوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ نسخۂ جامعۂ عثمانیہ کی نسبت مرتب کا بیان ناکافی ہے۔ مرتب کو اس کی تحقیق کرنی چاہیے تھی کہ اس میں بھی نسخۂ پونا (اس پر مطبوعہ مثنوی کا متن مبنی ہے)، کی طرح صرف چوتھے باب کے مطالب نظم کیے گئے ہیں، یا مصنف نے تاریخ دکن امجدیہ کے دوسرے ابواب کو بھی منظوم کیا ہے۔

ابجدی

ماہنامہ

مدیر: عظیم الدین احمد

---

دائرۂ ادب بانکی پور، پٹنہ

# فہرست


| جلد ۴ | جون ۱۹۴۲ء | نمبر ۲ |
|---|---|---|





چندہ سالانہ للعہ — فی پرچہ ۶/

# اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی

(۱)

"داستان طرازی منجملہ فنونِ سخن ہے سچ یہہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے" (غالب)

"ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ خدا کا رسول بادشاہ چڑیا لائی مونگ کا دانہ چڑا لایا چانول کا دانہ دونوں نے ملکر کھچڑی پکائی"۔ اِن یا ان جیسے لفظوں سے اُن کہانیوں کی ابتدا ہوتی ہے جنہیں ہم بچپن میں بصد شوق سُنتے ہیں اور جن سے ہماری زندگی زیادہ رنگین و خوشگوار ہو جاتی ہے انہیں کہانیوں کے انتظار میں ہم دن کی گھڑیاں جلد جلد گزارتے ہیں اور شام کی آمد سے خوش ہوتے ہیں۔ وہ شام جو نت نئی کہانیاں اپنے ساتھ لاتی ہے، وہ شام جو ہماری پیاس کو بجھاتی اور ہماری امیدوں کو باور کرتی ہے۔ ان کہانیوں کی ادبی اہمیت کالعدم ہو لیکن یہہ ہماری نوخیز زندگی کی بعض اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور اس کی نشو و نما میں ممد ہوتی ہیں۔ بچّہ اپنے کو نئی دنیا میں پاتا ہے۔ اسے ہر شئے نئی اور حیرت انگیز معلوم ہوتی جیسے انسان اپنے ارتقاء کے ابتدائی منازل میں، ہر شے کو نئی و عجیب پر اسرار پاتا تھا بچّہ کی جسمانی نشو و نما کے ساتھ اس کے دماغ کی بھی ترقی اور تربیت ہوتی ہے اور اس ترقی اور تربیت میں کہانیاں ایک اہم حصّہ لیتی ہیں

انسان کی دماغی ترقی کا ایک بڑا سبب تجسس کا مادہ ہے جو مختلف صورتوں میں کارفرما ہے جو [illegible] چیزوں کی تلاش و جستجو پر آمادہ کرتا ہے۔ جو ہمیں ہر شئے کی ماہیت، اس کے اسباب پر سے پردہ اٹھانے پر مجبور کرتا ہے اور جو ہمیں دماغی کاہلی سے بچاتا اور کسی چیز کو بھی بغیر جانچ پڑتال کئے قبول کرنے نہیں دیتا ہے بچپن میں بھی اس مادہ کی ترقی نہایت اہم ہے اور یہہ ترقی کہانیوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ بچّہ نئی نئی کہانیوں، نئی نئی باتوں کو سننا اور سننے کے لئے بے چین رہتا ہے، اس گرد و پیش کی دنیا ایک طرف تو یہہ خیالی دنیا دوسری جانب وسیع ہوتی جاتی ہے اور اس طرح ذوق تجسس کے ساتھ ساتھ اس کے نخلِ تخیل کی بھی آبیاری ہوتی رہتی ہے اور یہہ دماغی قوت بھی ترقی پاتی رہتی ہے۔

تخیل کی اہمیت مثل روز روشن ہے اور کہانیاں بچوں کے تخیل کی ترقی کا ایک مفید ذریعہ ہیں، کہانیوں میں اس دنیا کا ذکر ہوتا ہے جو بچہ کی جانی ہوئی، چوبیس گھنٹوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہے، ایسے لوگوں کے حالات زندگی ہوتے ہیں جن سے بچّہ واقف نہیں ایسی چیزوں کا بیان ہوتا ہے جو ان دیکھی، غیر معمولی اور اکثر فوق فطرت ہوتی ہیں الغرض ان کہانیوں میں ایسی فضا، ایسی جزئیات ہوتی ہیں جن سے بچّہ ذاتی واقفیت نہیں رکھتا اور نہ رکھ سکتا اس لئے بچّہ اپنے تخیل سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس فضا ان جزئیات کو وہ اپنے تخیل کی مدد سے محسوس کرتا اور سمجھتا ہے۔ اسی تخیل کی مدد سے وہ خود ان کہانیوں کا ہیرو بنتا ہے اور جہاں تک اس کے کچے، نوخیز

محدود تخیل سے ممکن ہوتا ہے وہ اس خیالی دنیا میں سانس لینے کی کوشش کرتا ہے اور خیالی افراد کے خیالی تجربات سے بہرہ ور ہوتا ہے اور اس طرح اس کی دماغی زندگی، زیادہ رنگین و پرلطف ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبات میں بھی ترقی ہوتی ہے اور خصوصاً ہمدردی و ترحم کے جذبات ابھرتے ہیں اور دوسروں کی خوشی سے خوش ہونا اور دوسروں کی تکلیف اور مصیبت پر آنسو بہانا سکھاتے ہیں۔ الغرض یہ ان کہانیوں کا فیض ہے کہ بچہ اپنی بعض ان قوتوں کو ترقی دیتا ہے جو آدمی کو انسان بناتے ہیں اور جن کے بغیر اس کی زندگی ناتمام رہ جاتی۔

مہذب انسان بھی بچوں اور وحشیوں کی طرح قصہ کہانی کا شائق ہے یعنی انسان تہذیب کے زینوں پر پہنچکر بھی کہانیوں کو لغو ولاطائل نہیں خیال کرتا بلکہ ان کی نوعیت بدل کر اپنی مہذب زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ بہرکیف کسی بچہ اور وحشی میں یہ مشابہت ہے کہ دونوں کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور انھیں تعقل اور تنقید کی میزان پر نہیں تولتے۔ کسی بچے یا وحشی کا دماغ نسبتاً غیر ترقی یافتہ ہوتا ہے خصوصاً تخیل کے مقابلہ میں تعقل کمزور ہوتا ہے۔ وہ نئی چیزوں میں دلچسپی تو لیتا ہے، وہ انوکھی باتوں کو شوق سے سنتا ہے لیکن انھیں غیر ناقدانہ طور پر مان لیتا ہے وہ کہانیوں کی صحت کو بہ آسانی تسلیم کر لیتا ہے اور انھیں واقعیت اور حقیقت کی روشنی میں نہیں دیکھتا اور نہ دیکھ سکتا ہے۔ گرد و پیش کے واقعات جس دنیا میں وہ رہتا ہے وہ اسے حیرت انگیز شعبدوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے پھر یہ ان دیکھی چیزیں، یہ عجیب و غریب قصے اسے بعید از عقل نہیں معلوم ہوتے۔ بہرکیف، جیسے وہ کہانیوں کو واقعیت اور حقیقت کی روشنی میں نہیں دیکھتا۔ اسی طرح وہ انھیں جمالیات اور فن کی کسوٹی پر نہیں جانچتا۔ یعنی جس غیر ناقدانہ طور پر وہ ان کہانیوں کے موضوعات کو تسلیم کر لیتا ہے، اسی طرح وہ ان کی صورت میں حسن، مناسبت، ترتیب و ارتقاء کی منطقی صحت سے سروکار نہیں رکھتا اسی لئے ان کہانیوں میں حقیقت اور فنی حسن کا عموماً وجود نہیں ہوتا۔ جب بچے کا دماغ ترقی کے مدارج طے کرتا ہے جب وحشی تہذیب کی منزلوں سے گزرتا ہے تو وہ ان میں ایک کمی محسوس کرتا ہے۔ ان سے اس کی نئی زندگی کی ضرورتیں اب پوری نہیں ہوتیں۔ وہ انھیں اب پہلے شوق سے نہیں سنتا اور اس کی ذہنی اور دماغی ترقی انھیں پس پشت ڈالنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ دوسری ادبی صنفیں اختراع و اخذ کرتا ہے۔ جن سے اس کی نئی پیاس کی تشفی ہوتی ہے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ بچے اور وحشی دونوں میں تخیل کی نشوونما تعقل، تمیز کی نشوونما سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز بلند اور تیز تو ہوتی ہے لیکن تعقل اور تمیز کے ماتحت نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پرواز کے نتائج مہذب دماغ کو زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتے جب وہ ان پر نظر ڈالتا ہے تو اسے مطلق تشفی نہیں ہوتی اور انھیں بعید از عقل، بیکار، مضحکہ خیز سمجھتا ہے۔ اسے ان میں ایک ایسی دنیا نظر آتی ہے جو

جو اُس دنیا سے جس میں وہ سانس لیتا ہے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ وہ اس دنیا میں جانوروں کو چلتا پھرتا بولتا، چالتا، کھاتا پیتا دیکھتا ہے۔ وہ بھی انسان کی طرح محبت، نفرت، غصہ، رنج، ہنسی خوشی، غرض مختلف قسم کے جذبات محسوس کرتے ہیں، اسی طرح اسے اس دنیا میں ناقابل یقین واقعات نظر آتے ہیں کبھی وقت کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے تو کبھی بالکل رک جاتی ہے۔ بچہ ایک آن میں جوان ہو جاتا ہے تو کبھی جوان ہمیشہ جوان نظر آتا ہے۔ برسوں کی راہ ایک لمحہ میں طے ہو جاتی ہے۔ غیر متوقع طریقے پر بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور اسی غیر متوقع طریقے پر پھر مل کر بچھڑ جاتے ہیں۔ فوق فطرت ہستیاں انسانی دنیا میں نظر آتی ہیں۔ وہ انسانوں کے ساتھ چلتی پھرتی ہیں اور ان کے معاملات میں ممد یا مخل ہوتی ہیں۔ کہیں ایک ہیبتناک خونخوار دیو سدّ راہ ہوتا ہے تو کہیں کوئی حسین پری آ کر مدد کرتی ہے۔ انسانی دنیا اور اس فوق فطرت دنیا کے حدود متحد ہیں یا ان کے درمیان ایک کشادہ شاہراہ ہے جس پر دونوں اقلیم کے باشندے آسانی کے ساتھ رہروی کر سکتے ہیں۔ فوق فطرت اشیا کی کمی نہیں۔ فوق فطرت واقعات تو روزمرہ کا قانون ہیں۔ مہذب دماغ ان فوق فطرت کرشموں کو دیکھ کر ہنستا ہے اور ان کا وجود اس کی نظر میں ان کہانیوں کے کم قیمت ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن غور کرنے سے ان چیزوں کے وجود کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ انسان کا شعور اپنی ترقی کے ابتدائی منازل میں تہذیب و تربیت سے نابلد تھا۔ وہ جس دنیا میں رہتا تھا وہ اسے [illegible] اور [illegible] دشمن نظر آتی تھی اور وہ ہر چیز کو اپنے احساسات و مشاہدات کی روشنی میں دیکھتا تھا۔ [illegible] وہ شکار کرتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ موت اس کے ہاتھ کا کرشمہ ہے۔ اسی طرح اسے اپنے کسی دوست یا اپنی محبوبہ کی موت میں درپردہ کسی شکاری کا ہاتھ نظر آتا اور وہ اس شکاری دیوتا کو پوجتا اور اسے دعا اور نذر کی مدد سے تسخیر کرنا چاہتا۔ وہ جانوروں کو انسان کی طرح چلتا پھرتا دیکھتا۔ اس لئے وہ سمجھتا کہ جانور بھی اسی جیسی کوئی ہستی ہے اور وہ بھی انسانی خصوصیات سے بہرہ ور ہے۔ بچہ بھی اسی طرح سوچتا ہے۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ جانور بھی تکلم، شعور، جذبات کے حامل ہیں اس لئے جب اُسے چڑا چڑیا بولتے چالتے، کھچڑی پکاتے نظر آتے تو اُسے کوئی تعجب نہ ہوتا۔ اس دنیا میں اسے کتنی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہیں اس لئے اسے کسی فوق فطرت واقعہ سے مطلق حیرت نہ ہوتی اور وہ اُسے ناقابلِ وثوق نہیں خیال کرتا۔

قصے کہانیاں اپنے فنی اور ادبی نقائص و حدود کے باوجود بھی ایسے نہیں کہ انہیں بالکل ناقابلِ اعتنا سمجھا جائے۔ ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیاری ہوتی ہے ان میں اس قوم کے تخیل کی ابتدائی، نوخیز، طفلانہ قوت پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی، معصوم تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اس آئینہ میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن میں وہ قوم شروع دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی اور جذباتی قوتوں پر پُرزور محرکات کا کام کرتی تھیں۔ اسی آئینہ میں وہ

سب باتیں نظر آتی ہیں جن میں اُسے یقین کامل تھا اور جنہیں وہ واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہناتا تھا۔ اسی آئینہ میں وہ سب تصورات بھی ملتے ہیں جو محض تصورات نہ تھے بلکہ اس کے خیال میں ہونے والے واقعات سے زیادہ مضبوط اور پائیدار تھے اور اسی آئینہ میں وہ مافوق العادت ہستیاں، واقعات، چیزیں، وہ وہم و گمان کے مرقعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں جنہیں وہ صحیح سمجھتا تھا۔ الغرض ان کہانیوں سے کسی قوم کی ابتدائی مجموعی اور اس کے افراد کی انفرادی کاوشوں کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔ بہرکیف یہہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

یہہ مسلم ہے کہ کہانیوں میں ادبی حسن و قدر و قیمت کی نمایاں کمی ہوتی ہے۔ سچ تو یہہ ہے کہ انھیں ادبی معیار سے جانچنا غلطی ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ ان میں ایسے کردار ہوتے ہیں جو ناقابل وثوق ہوتے ہیں، ایسے واقعات کا ذکر ہوتا ہے جنہیں فہم سلیم بھی تسلیم نہیں کرسکتی اور ان واقعات کی ترتیب و تنظیم و ترقی میں فنی اور منطقی نقائص بے شمار ہوتے ہیں۔ یہہ بھی صحیح ہے کہ دنیائے ادب میں انھیں کبھی وہ مرتبہ نہیں حاصل ہوسکتا جو دوسری ادبی صنفوں کو حاصل ہے۔ لیکن یہہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی بچہ ان ادبی نقائص کو محسوس نہیں کرتا اور وہ ان کہانیوں میں ادبی محاسن کو نہیں ڈھونڈھتا۔ وہ ادبی اور فنی اصول و محاسن سے واقف بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف یہہ چاہتا ہے کہ جو واقعات ہوں وہ انوکھے اور دلچسپ ہوں اور کہانی میں مسلسل دلچسپ واقعات ہوں اور اس سلسلہ کی ہر کڑی دلکشی رکھتی ہو۔ اگر واقعات اسے دلچسپ نہیں معلوم ہوتے تو پھر کہانی میں اس کا دل نہیں لگتا اور اس میں اسے کوئی مزہ نہیں ملتا۔ جہاں دلچسپی کے تسلسل میں کمی ہوئی، جہاں کوئی کڑی بے لطف ہوئی تو اس کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا، اسے کہانی کے حسن صورت سے کوئی بحث نہیں، وہ صرف فوری اور پیش نظر چیزوں میں منہمک ہوسکتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ دلچسپ ہو۔ سب کچھ ہو لیکن واقعات کی دلچسپی میں کمی نہو اسکی زبان پر برابر یہہ کلمہ جاری رہتا ہے "پھر کیا ہوا... پھر کیا ہوا..." یہی ایک معیار ہے جس سے وہ واقف ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس سے ہر کہانی کی وہ جانچ کرتا ہے۔ جو کہانی اس معیار پر پوری اترتی ہے اُسے وہ اچھی، قابل قدر سمجھتا ہے اور جو کہانی اس معیار پر پوری نہیں اترتی اُسے وہ کم قیمت خیال کرتا ہے۔ اور سچ تو یہہ ہے کہ یہی ایک معیار ہے۔ جس سے کہانیوں کے حسن و قبح کی جانچ لازم ہے۔ اور یہہ معیار محض طفلانہ نہیں۔ ہر فنی کارنامہ میں دلچسپی کا وجود ضروری ہے۔ دلچسپی کا فقدان ادب میں اہم ترین عیب شمار کیا جاتا ہے۔ ہاں یہہ ضرور ہے کہ اعلیٰ اصناف ادب میں ہم اُس قسم کی دلچسپی نہیں ڈھونڈھتے جیسی ایک بچہ کہانیوں میں تلاش کرتا ہے۔

داستان کہانی کی طویل پیچیدہ، بھاری بھرکم صورت ہے۔ بچے کا نوخیز دماغ طوالت اور پیچیدگی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسے مختصر، صاف سیدھا قصہ ہی مرغوب ہوتا ہے۔ اگر یہہ طویل ہوا تو پھر اس کی انتہا تک پہنچتے پہنچتے وہ اس کی ابتدا کو بھول جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ پیچیدہ گتھیوں کو سلجھائے۔ اسے تو ہلکی پھلکی، چھوٹی موٹی باتیں ہی پسند ہوتی ہیں۔ داستان اسے بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن داستان اپنی طوالت پیچیدگی، کے باوجود بھی کہانی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ یہہ بھی دل بہلانے کی ایک صورت ہے۔ اس میں بھی حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں بھی اعلی ادبی اور فنی اصول کی کارفرمائی نہیں۔ اس کا بھی مرتبہ دنیائے ادب میں بلند نہیں۔ یہاں بھی جانور بولتے چالتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی ناقابل یقین واقعات و مناظر ملتے ہیں اور یہاں بھی فوق فطرت ہستیوں کے کرشموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ الغرض داستانوں کی فضا کہانیوں کی فضا سے مختلف نہیں ہوتی اور یہہ فضا اجنبی، حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اس میں اور انسانی دنیا کی فضا میں صاف فرق نظر آتا ہے۔

انسان بچپن کی منزل سے گزرتا ہے لیکن گزر نہیں جاتا۔ وہ سن شعور کی اقلیم میں قدم رکھنے کے بعد بھی بچپن کے احساسات، بچپن کی خواہشات سے مکمل قطع تعلق نہیں کرتا۔ بچپن اپنی رنگین و شاداب امیدوں، تمناؤں امنگوں کے ساتھ اس کے فطرت میں پوشیدہ رہتا ہے اور موقع ملتے ہی پردہ سے باہر نکل آتا ہے اور وقتی طور پر وہ پھر اس گذری ہوئی دنیا میں جا بستا ہے جس سے بظاہر اب اُسے کسی قسم کا لگاؤ نہیں۔ بچہ کہانی کا دلدادہ ہوتا ہے اور بڑھ کر بھی وہ اس قسم کی چیز کا متلاشی ہوتا ہے اور داستانوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ دن بھر کے کام سے فارغ ہوکر دل بہلانے کا ذریعہ ڈھونڈھتا ہے۔ اور یہہ ذریعہ داستان ہے۔ یہہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ داستان گوئی انسان کا قدیم مشغلہ رہا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر ملک و قوم میں پایا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی اس مشغلہ کا وجود لازمی تھا اور دوسری ادبی صنفوں کی طرح یہہ بھی ایران سے اخذ کیا گیا۔ اس مشغلہ کے لئے، خصوصاً کسی اہم شکل میں، فرصت شرط ہے۔ اس لئے اس کا عروج لازمی طور پر اس وقت ہوا جب بادشاہوں اور امرا میں عیش پرستی آگئی تھی۔ جب انکی عملی زندگی ڈھیلی پڑ گئی تھی، جب ان کے قوا رُسست ہوگئے تھے، جب وہ کاہلی اور عیش کوشی کے خوگر ہوگئے تھے۔ چنانچہ یہہ معمول ہوگیا تھا کہ سونے سے پہلے وہ کوئی دلچسپ داستان سنتے اور سنتے

سنتے سوجاتے۔ یعنی داستان گویا ایک قسم کی خواب آور دوا تھی جو انھیں آسانی سے نیند کی دنیا میں پہنچا دیتی تھی۔ یا یہ کوئی لوری تھی جو اپنے دھیمی نرم، شیریں ترنم سے انھیں موسیقی کی ہلکی ہلکی موجوں پر بہالے جاتی۔ ظاہر ہے کہ تیز و تند، عمیق و پیچیدہ ایسی باتیں جو دماغ کو چونکا دیں جو ہمیں غور و فکر پر آمادہ کریں، ایسی باتیں داستانوں میں ممکن نہ تھیں۔ داستان تازیانۂ عمل نہیں ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ ہر زمانہ میں انسان کو اس قسم کے مشغلوں، دل بہلانے کے ساز و سامان کی ضرورت رہی ہے اور اس نے اپنی بدلنے والی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے مختلف زمانوں اور قوموں میں مختلف سامان ایجاد کئے ہیں۔ کبڈی سے لیکر نورا کشتی Bull baiting تک سب کھیل اسی قسم کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سراغرسانی کے قصوں سے اسی قسم کا مصرف لیا جاتا ہے جو کبھی داستانوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مغرب میں اس قسم کے قصوں کا سیلاب ہے چھوٹے بڑے۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے۔ ادنیٰ اعلےٰ سبھی ان کے دلدادہ ہیں۔ معمولی کلارک ایک طرف تو وزیر و امیر دوسری جانب سبھی ان قصوں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ آجکل "سینما بازی" کا شوق "بٹیر بازی" کا دوسرا بہروپ ہے۔ جب ہم روزانہ کام سے تھک جاتے ہیں تو سینما چلے جاتے ہیں اور وہاں کی دلچسپیوں میں اپنی جسمانی تھکن، پریشانیوں، الجھنوں، مشکلوں کو وقتی طور پر بھول جاتے ہیں اور گویا کسی دوسری خواب آور دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ کسی زمانہ میں داستان گوئی بھی اسی قسم کا مشغلہ یا فن تھا۔ اس کے نقائص و حدود سے واقفیت تھی اور آج بھی ہے لیکن

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

(باقی) کلیم الدّین احمد

# اسعد الاخبار آگرہ (۱)

یہہ سلسلۂ مضامین اسعد الاخبار کے حسبِ ذیل نمبروں کے مطالعے پر مبنی ہے: ۱۲۶۵ھ: نمبر ۸۰ (۱۴ محرّم مطابق ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء) تا نمبر ۱۲۰ (۲۶ ذی حجہ مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء)۔ ۱۲۶۶ھ: نمبر ۱۲۹ تا نمبر ۱۶۲ (۱۶۱ اور ۱۶۲ کے آخری ورق غائب ہیں)، نمبر ۱۶۴، نمبر ۱۶۷ (۲۵ رمضان مطابق ۵ اگست ۱۸۵۰ء)۔ ۱۲۶۷ھ: نمبر ۱۸۳ (۲۷ محرّم مطابق ۲ دسمبر ۱۸۵۰ء) تا نمبر ۱۹۲ (۱ ربیع الآخر مطابق ۲۳ فروری ۱۸۵۱ء)، نمبر ۱۹۴، نمبر ۱۹۵، نمبر ۲۰۱ تا نمبر ۲۰۶ (۹ رجب مطابق ۱۲ مئی ۱۸۵۱ء)۔ سب پرچے ایک ہی جلد میں ہیں، اور جناب سید حسن عسکری صاحب کی وساطت سے مستعار ملے ہیں۔ میں اُن کا نہایت ممنون ہوں۔

اسعد الاخبار آگرہ سے نکلتا تھا، اور اس کے مہتمم قمر الدّین خاں تھے۔ پہلا نمبر[1] غالباً دوشنبہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۶۴ھ مطابق، جون ۱۸۴۸ء کو نکلا تھا۔ عبارتِ ذیل سے جو ضروری تغیّر کے ساتھ ہر ہفتے اخبار کے پہلے صفحے پر ہوا کرتی تھی اخبار کی قیمت، یومِ اشاعت وغیرہ کا حال معلوم ہوگا:

یا رحیم | اسعد الاخبار | نمبر ۸۰ جلد اوّل | تاریخ چودھویں محرم ۱۲۶۵ھ مطابق گیارہویں دسمبر روز دوشنبہ | یہہ اخبار ہفتے میں ایک بار دوشنبے کے دن چھاپا جاتا ہے۔ قیمت اس کی آٹھ آنے مہینا، اور محصول ڈاک ذمّہ خریدار۔ نمبر ۸۰ میں اس عبارت نے صفحۂ اوّل کا قریب قریب نصف لے لیا ہے۔ اخبار کا کاغذ سفید تقطیع ۱۱½ × ۷½ انچ، صفحات ۴ اور ہر صفحے میں دو کالم ہوا کرتے تھے۔ اس اخبار کا صفحۂ اوّل و دوم اسلامی تاریخ کے لیے وقف ہوتا تھا، عبارت ذیل بہ طورِ عنوان ہر ہفتے چھپا کرتی تھی اس اخبار میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہٖ وسلّم کے زمانۂ متبرکہ کا حال واقعہ اصحاب فیل سے شروع کر کے تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھاپا جاتا ہے، جب بفضلہ یہہ حال تمام ہو چکے گا تو اہل بیت طاہرین اور خلفاے راشدین اور معرکۂ جگر سوز کربلا اور دوازدہ امام علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے حالات بے کم و کاست بہ تدریج و تفریق لکھے جائیں گے تا خلائق کو ان حالاتِ فیض سمات پر بہ خوبی آگاہی ہو۔ نمبر ۸۰ میں سریۂ رجیع کی کیفیت۔ اور حضرت عاصم کی شہادت کا ذکر ہے۔ نمبر ۲۰۶ میں محاصرۂ طائف کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے۔ عبارت ذیل نمبر ۹۹ سے نقل کی جاتی ہے:

---

[1] نمبر ۸۰، ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء کو نکلا تھا۔ اس حساب سے بہ شرطے کہ کوئی ہفتہ ناغہ نہ ہوا ہو، پہلے نمبر کی تاریخ اشاعت ۲۶ جون ۱۸۴۷ء ٹھہرتی ہے۔ پیشِ نظر نمبروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تہواروں کے موقع پر بھی یہہ اخبار برابر نکلا کرتا تھا۔

[2] عرض و طول دونوں میں کچھ کاغذ جلد بندی میں کٹ گیا ہوگا۔

"غزوۂ خندق ایک عجب مصائب خیز محاربہ تھا کہ مشرک بڑی شوکت وحشمت سے نوبت بہ نوبت لڑنے آتے اور آں حضرت کے خیمے کا قصد کرتے تھے، لیکن، اللہ تعالیٰ ان کو اتنی فرصت وقابو نہ دیتا کہ خندق سے اتر آئیں۔ بہادران اسلام راہ خدا میں جاں بازی پر آمادہ ہوکر ان کا مقابلہ اور آں حضرت بنفس نفیس راتوں کو خندق کے بعض مواضع کی نگہ بانی میں مصروف رہتے۔ چناں چہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایام غزوۂ خندق میں سعد ابن وقاص نے بڑی بڑی کوششیں کیں اور خندق میں ایک ایسا موضع تھا کہ تعجیل کے سبب اُسے اچھّی طرح نہ کھود سکے تھے، سو ادھر سے دشمنوں کے آجانے کا خوف تھا۔ حضرت رسالت پناہ ہر شب آپ اس موضع پر جاکر وہاں کی حفاظت کیا کرتے۔ جب سردی سے دست و پا ٹھٹھرنے لگتے تو خیمے میں میرے پاس آتے۔ میں اُن کے تاپنے کو آگ جلاکر انھیں گرم کردیتی۔ حضرت سردی رفع کرکے پھر وہیں چلے جاتے۔ ایک رات آپ خیمے میں گرم ہونے کے لیے آگ تاپ رہے تھے کہ باہر کسی شخص کے اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ سنی گئی۔ آپ نے پوچھا کہ یہہ کون ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ سعد ابن ابی وقاص ہے، آپنے فرمایا کہ آج کی رات خندق کے اس موضع کی حفاظت سعد ابن ابی وقاص ہی کرے۔ سعد نے قبول کیا، اور وہاں چلے گئے۔"

اخبار کے تیسرے صفحے کے پہلے کالم میں (کبھی نصف کالم کبھی، اس سے زیادہ) پہلے حکماے متقدمین کے حالات و مقالات شائع ہوتے تھے۔ پھر حکماے متاخرین کے حالات و مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جب یہہ بھی ختم ہوگیا تو کتاب اخبار الاخیار سے اخذ کرکے صوفیہ کے حالات لکھے جانے لگے۔ اقتباس ذیل نمبر ۷، ۸ سے ماخوذ ہے:

"اس نے (یعنی جالینوس نے) کہا ہے کہ جس آدمی میں عقل نہ ہو علم اُسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور کہا ہے جو بیمار کہ اشتہاے طعام رکھتا ہو بہتر ہے اُس تن درست سے جو اشتہا نہ رکھتا ہو' اور کہا ہے بدترین لڑکوں کا وہ لڑکا ہے جسے شرم و حیا نہ ہو۔ اور کہا ہے جو کہ اپنے تئیں عاقل ترین مردم سمجھتا ہو وہ بےعقل ترین مردم ہے اور فرمایا کہ حلیم اور بردبار وہ آدمی ہے کہ ظلم وستم کرنے پر قادر ہو اور نہ کرے اور زیردستوں کا جور اٹھائے۔ ایک دن حکیم نے ایک بڑے جسیم و فربہ آدمی کو دیکھا کہ لوگ اس کی نہایت تعظیم کررہے تھے۔ پوچھا کہ اس شخص میں کیا بزرگی ہے جو تم اس کی اتنی تعظیم کرتے ہو۔ لوگ بولے اس نے ایک مری ہوئی گائے کو کمر پکڑ کر زمین سے اٹھا لیا تھا۔ حکیم بولا کہ اگر اسی میں بزرگی ہے تو تم گائے کی تعظیم کیوں نہیں کرتے جو ہمیشہ اپنے جسم کو لیے پھرتی تھی گر

خبروں، اشتہاروں، گورنمنٹ گزٹ کے اقتباسوں اور نظموں وغیرہ کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ جو اس اخبار میں نکل سکتی تھی وہ ۳ ½ کالم تھی۔ اپنے ناظرین کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھنا اخبار کا پہلا فرض ہے۔ یہہ فرض کس طرح انجام دیا جاتا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوگا:

دہلی سے متعلق خبریں: ۱۸" ایک بلاک ٹرین یعنی بیل کی ڈاک گاڑی دہلی اور انبالہ کے درمیان جاری ہوئی ہے اور سنا جاتا ہے کہ لدھیانہ تک مقرّر کی جائے گی"۔ الحقائق۔

۱۰۳ مہاراجہ ہندو راؤ نے بہ تقریب شادیانہ فتح پنجاب کے جشن کیا اور شہر دہلی اور چھاؤنی کے سب صاحب لوگوں کو اپنے ہاں بلاکر ضیافت کی' دہلی اردو اخبار

۱۰۴ اخبار الحقائق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ منشی عمو جان جو پہلے دہلی کی ایجنسی میں سررشتہ دار تھے، اور اب سدرلینڈ صاحب کی سفارش سے راجا الور کے مختار تھے۔ ان دنوں الور سے دہلی میں آئے، الور کے کارپردازوں نے اُن کی غیبت میں راجا کے آگے اُن کی رشوت ستانی اور غبنِ مالِ سرکار کی بہت سی بدیاں کیں (کرم خوردہ) نے انھیں دہلی سے بلاکر قید کرلیا، اور بلا ثبوت جرم دس لاکھ روپیا تاوان اُن سے مانگا اور حکم دیا کہ دہلی کا رہنے والا کوئی ملازم تا انفصالِ مقدمہ الور سے کہیں جانے نہ پائے۔

۱۰۵ ان دنوں دہلی میں فقیروں بھکاریوں کی کثرت ہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ زیور (کرم خوردہ) گلی کوچے میں تنہا پاکر پھسلاے جاتے ہیں۔ ہر شہر و قصبہ میں شرفا کو چاہیے کہ لڑکوں کی احتیاط کریں یا زیور نہ پہنائیں۔ ممکن ہے کہ ایسے فقیر اور شہر و قصبات میں بھی پہنچیں۔ (الحقائق)

۱۱۹ حضور والا نے بہ سبب کثرت باراں اور سرسبزی دشت و بیاباں کے موادِ عشرت و شادمانی دیکھ کر ۱۰ شوال کو پھول والوں کی سیر پھر مقرر فرمائی، کیوں کہ پہلی سیر میں بہار کے یہ سامان نہ تھے چناں چہ پھول والوں کے چودھری کو پنکھے کی تیاری کا حکم دیا، اُس نے فوراً تیار کیا اور ۱۰ شوال کو پنکھا چڑھا' اور کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے، دہلی اُردو اخبار۔

۱۲۱ از روے خطِ دہلی کے معلوم ہوا کہ منشی عمو جان ریاست الور میں تین لاکھ رُپے ادا کرچکے ہیں اور اب تک اُن کی رہائی نہیں ہوئی اور رُپیا طلب ہوتا ہے۔ ستم رسیدگانِ الور شہر دہلی میں مکانات اور زیور بیچ بیچ کر زرِ تاوان ادا کرتے ہیں، الحقائق۔

۱۲۴۔ بادشاہ دہلی نے ایک خط واسطے مقرر ہونے ولی عہد کے ملکہ معظّمہ انگلستان کے نام پر لکھا تھا، سو وہ خط نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ملاحظے میں گزرا۔ انھوں نے اس خط کو صاحب ایجنٹ دہلی کے پاس واپس بھیج کر لکھ بھیجا کہ بلا واسطہ خط و کتابت فی مابین ملکہ و بادشاہ ناممکن ہے۔ نواب لفٹنٹ گورنر ۲۰ اکتوبر کو دہلی میں داخل ہوں گے اور دو روز وہاں قیام کرکے بہ سبیل ڈاک آگرہ میں آئیں گے۔ الحقائق

۱۲۶۔ ۲ ذی حجہ کو حضور والا خواجہ صاحب سے تشریف لاکر باغِ روشن آرا میں رونق افروز ہوئے۔ دہلی اردو اخبار

۱۲۷۔ بہ موجب حکم اعلی سرکار کے خاص کوتوالی میں یا اس کے قریب ایک عدالت مقرر ہوئی ہے جس میں ایک صاحب اسسٹنٹ مجسٹریٹ اجلاس فرماتے ہیں' اور انھیں اجازت ہے کہ وہاں ہر روز

جلوس فرماکر مقدمات خفیفہ ہر روز فیصل کریں آج کا کام دوسرے دن پہ نہ رہے اور چوں کہ اہل مقدمات کو صاحب مجسٹریٹ کی کچہری میں شہر باہر جانا پڑتا تھا تو آمد و رفت میں بڑی تکلیف اور ہرج ہوتا تھا، اور جو لوگ کہ اکثر اوقات ناحق حوالات اور قید میں دو چار روز رہ جاتے تھے۔ اُن کے لیے یہہ بندوبست مفید ہوگا، اور صاحب مجسٹریٹ کو بھی شہر میں رہنے کا حکم ہے۔ اور ان دنوں حکام طبیعت[۵] انسداد قمار بازی پر ازبس متوجہ ہے اور اس باب میں احکام سخت جاری ہوئے ہیں۔ دہلی اردو اخبار۔

۱۴۷ دہلی اردو اخبار میں مجمع الاخبار، بمبئی سے منقول ہے کہ درخواست نواب گورنر جنرل بہادر کی درباب موقوفی ولی عہد شاہ دہلی اور موقوف کرنے خطاب بادشاہی کے اس خاندان سے اور انقطاع آداب و القاب مناسب بادشاہی کے دارالسلطنت لندن میں بھیجی اور وہاں کے اعیان و ارکان کے ملاحظے سے گزری۔ سو مرکوز خاطر ملکۂ معظمۂ انگلستان کا یہہ ہے کہ خطاب القاب اور آداب بادشاہی خاندان تیموریہ میں قائم رہے، اور تقرر ولی عہد کا بموجب مرضی بادشاہ دہلی کے ظہور میں آئے۔ لیکن، اعیان سرکار کمپنی بہادر اس باب میں انکار رکھتے ہیں، اور اس مقدمے میں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ مرضی جناب ملکۂ معظمہ کی قائم رہتی ہے یا خواہش سرکار کمپنی کی۔

۱۵۳ حضور والا نے صاحب رزیڈنٹ کے نام حکم دیا ہے کہ قطب صاحب سے روشن چراغ دہلی کی درگاہ تک اثنائے راہ میں پُل اور سڑک تیار کرا دیں، جو کچھ اس میں خرچ پڑے، بادشاہی جاگیر سے مجرا لے لو۔ زبدۃ الاخبار

۱۵۸ اخبار الحقائق میں مرقوم ہے کہ بانڈی باز لوگ جو ماخوذ عدالت ہوئے تھے الحال پیش گاہ صاحب مجسٹریٹ سے ان کے واسطے حکم قید شش ماہی اور دو دو سو روپے جرمانے کا صادر ہوا۔

۱۸۴۔ صادق الاخبار میں لکھا ہے کہ ان دنوں بدرالدین علی خاں، مہر کن نے جو اس فن میں وحید العصر ہیں، بموجب فرمایش ملکۂ معظمۂ انگلستان و ایمائے جناب صاحب اجنٹ دہلی کے دو مہر کندہ کی ہیں، ایک تو ملکۂ معظمۂ انگلستان کے نام کی، دوسری شاہ زادہ البرٹ شوہر ملکۂ معظمہ کے نام کی۔ ملکۂ معظمہ کی مہر میں یہہ عبارت ہے: شہنشاہ سلیمان جاہ کیواں بارگاہ، خاقان الدہر، سلطان البحر، مورد الطاف ایزد رحمٰن، پادشاہ انگلستان و ایرلنڈ، فرمان فرمائے ملک ہند ناصر دین مسیحا، ملکۂ معظمہ وکٹوریا، اور شاہ زادۂ موصوف کی مہر میں یہہ عبارت ہے: "المؤید بہ تائید الٰہی فخر خاندان شہنشاہی برنسوک، انیس معزز ملکۂ معظمہ رفیع القدر، والا شان، سرآمد بارگاہ انگلستان البرٹ فرانسس، الگستس، چارلس ایمان وئل" از زبدۃ الاخبار

**قاضی عبدالودود**

---

۵؎ قمار بازی کے جرم میں غالب کو سزا اسی زمانے میں ملی تھی۔

۵ب؎ دہلی سے متعلق تقریب قریب کل خبریں جمع کر دی گئی ہیں جن میں خطوط غالب میں ان کا نام آتا ہے۔

# لذت آزار

"ماں۔ سندری بوا نے لوٹا پٹخ کر پچکا دیا" رجھنی دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آکر شکایت کرنے لگی۔

"بلا تو اس ما لجادی کو۔ ای تو میرا گھر ناس کر دے گی"

سندری کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کوئیں سے برتن مانجھ کر واپس آ رہی تھی۔ برتنوں کو تلے اوپر جھا کر اس نے سر پر رکھ لیا تھا۔ رجھنی ساتھ تھی چلنے میں سندری کے کاندھے سے آنچل سرک کر زمین پر لوٹنے لگا۔ رجھنی اسے پکڑ کر گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچنے لگی۔ کھینچا تانی میں لوٹا کھسک کر زمین پہ آ رہا۔ سندری کو چچی سے اس دن بہت مار کھانا پڑی۔ اپنے قصور سے زیادہ بے گناہ رجھنی کا نام لگانے پر!

سندری ۶ سال کی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت اسے چچی کو سونپ دیا تھا جب سے وہ چچی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس عورت کے اپنے کئی بچے تھے اور ان کے رہتے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سندری کی پرورش کا بار بلا معاوضہ اپنے سر لیتی۔ بچوں کے کپڑے دھونا ان کے کھانے کے برتن صاف کرنا اور پھر انکی جھڑکیاں انکی بے سبب مار پیٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ انہیں خدمتوں کی بدولت سندری کو دو وقت کھانا مل رہا تھا۔ ان کی انجام دہی میں اک ذرا کوتاہی سندری کو مار جھڑکیوں کے علاوہ فاقہ کی سختی برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی۔

پڑوس والے کہتے کہ سندری گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت ہے۔ سندری کی چچی کو انکی یہ بات کبھی اچھی نہ لگتی۔ وہ ہمیشہ سندری کے مقابلہ میں اپنی بیٹی کی خوش سلیقگی اس کی فرزانگی اس کا بھولا پن اور موہنی صورت کا ذکر کرنے لگتی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ سندری کی یتیمی پر رحم کھا کر یہ لوگ اسکی تعریفیں کرتے تھے گو حقیقت میں سندری کسی قابل نہ تھی۔ اور پھر "وہ حسد سے بھی تو ایسی باتیں کرتے تھے۔ نفرزدی سندری سے انہیں کس بات پر ڈاہ ہونے لگتی"۔ اسے سندری سے نفرت سی پیدا ہو جاتی۔ آخر پڑوس والوں کی اس نا انصافی کا بدلہ تو اسے کسی سے لینا ہی تھا۔ وہ سندری کے قصور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسے سزا و ملامت کا نشانہ بنا کر اپنے دل کا بخار نکالتی۔ سندری کے لئے اس کی سب سے سنگین سزا اسے بھوکا رکھنا ہوا کرتی یہی سزا سندری کے لئے حقیقی طور پر ایذا رساں تھی۔ ورنہ جھڑکی اور مار کی تو وہ کب سے عادی ہو چکی تھی۔ ہر صبح جس طرح اسکی نظریں سورج کی کرنوں سے دو چار ہوتیں اسی طرح اس کا کوئی دن لعن طعن کی باتیں گالیاں اور تھپیڑ سے خالی نہ جاتا۔ سورج کی کرنوں ہی کی طرح اس کے نزدیک

انکی کوئی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ بلکہ بسا اوقات تو یہ مار اور جھڑکیاں اس کے لئے نوید جاں بخش بنجاتی تھیں۔ وہ انکی مشتاق سی رہتی اس لئے کہ جس دن اس کی چچی کا غصہ تیز ہو جاتا اسے اپنے ہاتھ اور زبان کی کارکردگی پر اعتماد نہ رہتا اور وہ خموشی سے دو دو وقت سندری کا کھانا بند کر دیتی۔ سندری کوئی قصور کرتی تو چچی کی گالیوں اور مار کی بے چینی سے منتظر رہتی اور اگر کبھی وہ ان سے محروم رہ جاتی تو پیٹ کی مار کا تصوّر اس کے جسم کا سارا خون خشک کر دیتا۔ اف دو دو وقت کا فاقہ! گھر کے سارے لوگ اسکی نظروں کے سامنے بھر پیٹ کھاتے ہوتے۔ وہ ان کے آگے کھانیکی چیزیں لا کر رکھتی۔ جوٹھے برتن صاف کرتی لیکن بچا کھچا کھانا اسے دکھا کر گلی کے کتوں کی نذر کر دیا جاتا۔ اور وہ پیٹ کی آگ پر پانی انڈیل کر رہجاتی۔ اس سزا کے تصور سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔ "چچی اسے مار مار کر ادھ مواکر دیتی لیکن بچا کھچا کھانا تو دیدیتی" رفتہ رفتہ سندری کو چچی کی مار اور جھڑکیوں سے انس سا ہوتا جارہا تھا۔ انہیں کی بدولت تو اسے کھانا ملتا تھا! انکی خاطر اکثر اس سے کچھ نہ کچھ بھول چوک ہوجاتی۔ کوئی نہ کوئی ہلکا سا قصور۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے بغیر اسے تسکین نہ ہوتی تھی۔ جیسے کسی شراب پی کر گلیوں میں روندے جانے کی عادت پڑجاتی ہو۔

سندری کا چچیرا بھائی چھکو ماں کا اکلوتا ہونے کی وجہ سے گلی کے کتوں کی طرح جنکے اچھے بُرے کوئی نظر نہیں ڈالتا آزاد پل رہا تھا۔ گھر والوں کی مجال نہ تھی کہ اسکی کوئی ممکن خواہش رد کر سکیں۔ وہ جس کو چاہتا مار بیٹھتا جس سے چاہتا اس کے منہ کا نوالہ چھین کر ہڑپ کر جاتا۔ اس کی بازپرس کوئی نہ کر سکتا تھا۔ خصوصاً سندری تو اسکی مشق ناز کے لئے وقف تھی۔ اور بچوں کی شکایتیں چھکو کی ماں کے چہرہ پر شکن پیدا کر دیتی تھیں لیکن سندری کی تو مجال نہ تھی کہ لب تک ہلا سکے۔

اور خدمتوں کے علاوہ سندری کو اکثر پہروں جاگ کر چھکو کے پاؤں بھی دابنا ہوتا تھا۔ اک ذرا اس کی آنکھیں جھپکیں کہ چھکو کی گالیاں اور بے پناہ چٹکی اسے بیدار کر دیتی۔ ایک شب سندری حسب معمول چھکو کا پاؤں داب رہی تھی۔ گھر کے سارے لوگ سو چکے تھے۔ سندری کو بھی نیند آ رہی تھی لیکن چھکو ابھی تک سویا نہ تھا اور جب تک نیند اسے بے دست و پا نہ کر دیتی سندر کو پیر دابتے رہنا تھا پاؤں دابتے دابتے سندری اکبارگی اونگھ کر زمین پر گر گئی۔ چھکو کو نیند آیا ہی چاہتی تھی۔ آہٹ پا کر وہ چونک اٹھ بیٹھا اور سندری کا ہاتھ جھٹکے سے اپنی طرف کھینچکر مروڑنے لگا۔ پھر اس نے اس زور سے اس کی چٹکی لی کہ سندری چیل کر رہگئی۔ چھکو نے اسی پر بس نہ کی۔ اس نے سندری کو ایک ایسی لات لگائی کہ وہ چیت ہو کر زمین پر گر گئی۔ چھکو اپنی خشمگین نگاہیں سندری کے بکھرے ہوئے اعضا پر جمائے تھا لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے پہلی بار سندری کے شباب کی خبر ملی۔ اس کے بہیمیہ جذبات اکبارگی

جاگ اُٹھے اور وہ بھوکے شیر کی طرح سندری پر ٹوٹ پڑا۔ سندری اضطراری طور پر مدافعت کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ چھکو نے اپنے آہنی بازوؤں کی مدد سے اسے زیر کرلیا اور اس زور سے اسے اپنی آغوش میں لیا کہ سندری کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ سندری بے قابو ہوگئی اور چھکو کی ہوسناکی نے اسے پہلی بار ایک نہایت جانگسل لیکن لذت تاب تجربہ سے آشنا کیا۔

چھکو اسی طرح سندری کے شباب پر چھاپے مارتا رہا۔ اس کے ہر اقدام میں ویسی ہی خشونت اور سخت گیری ہوتی جیسے پھول کو پاؤں تلے روندنے کے بعد اُسے پلٹ کر اٹھا لیا جائے

سندری پوری جوان ہوچکی تھی لیکن چھکو کی ماں کو ابھی تک اس کے بیاہ کا خیال نہ ہوا تھا شاید اس کی خدمتگذاری سے فائدہ اُٹھانیکی خواہش اسکی چچی کو اس کا سوچ نہ پیدا ہونے دیتی تھی۔ ہمسایہ الیاں اُسے ٹوکتیں تو کہکر ٹال دیتی کہ " اس کے بیاہ کی سوچ میں تو ہمکو رات بھر نیند نہیں آتی مگر ہم کیا کریں۔ کہیں سے بات بھی تو آئے۔ لڑکے کا معاملہ ہوتا تو ہم اپنے سے کہیں پیغام بھیجتے۔ کہیں لڑکی والے بھی بات چلاتے ہیں ؟" کچھ دنوں تک تو اس جواب سے کام چلتا رہا لیکن رفتہ رفتہ محلہ والیوں کو بھی شک ہوگیا کہ چھکو کی ماں سندری کو اپنے گھر کام کاج کے لئے بٹھائے رکھنا چاہتی ہے۔ چھکو کی ماں کو راہ چلتے طعنے ملنے لگے۔ ہاں رے پرائے کی بیٹی کا تو کو چھکر کیا۔ مہنت کی لونڈیا مل گئی ہے۔ چلی جائے گی تو گھر کا کام کون سنبھالیگا "

چھکو کی ماں اگر سندری کا بیاہ نہ کرتی تو کوئی اس کا کرہی کیا سکتا تھا۔ کوئی تھانہ پولس کی بات تو تھی نہیں کہ چھکو کی ماں کو مجبور ہوجانا پڑتا۔ پھر سندری اسکی بھتیجی تھی۔ محلہ والیوں کو کیا کہ سندری کا بیاہ ہو یا نہ ہو۔ وہ بن بیاہی رہکر ان کے بھات پر تھوڑا ہی گذر رہی تھی ؟ پھر بھی اس طرح کے خیالات چھکو کی ماں کے دماغ میں پیدا نہ ہوتے تھے اور اسے محلہ والوں کی بات پر کان دھرنا ہی تھا۔ نیچ طبقہ والے ہی تو سماج کے دیوتا کی رکھشا کرتے ہیں۔ شہری قوانین کے آگے بھی تو خدائی احکام کی لاج رکھنے والے ہیں پھر چھکو کی ماں کو سندری کے بیاہ کی فکر کیونکر نہ ستانے لگتی۔ لیکن واقعی — ننگی بچّی سندری سے بیاہ کرنے پر کون آمادہ ہوتا۔ چھکو کی ماں بیاہ کا خرچ اٹھانے کو تیار نہ تھی۔ اسے اپنی بیٹی کے بیاہ کا بھی تو خیال تھا۔ گھر میں جو کچھ تھوڑا بہت پسماندہ تھا اس نے بیٹی کے بیاہ کے لئے الگ رکھ چھوڑا تھا۔ ایک جگہ سے بات آئی بھی تو لڑکے والوں نے پہلے ہی سے دان جہیز کی تفصیل دریافت کرنی شروع کردی۔ چھکو کی ماں نے صاف کہدیا کہ وہ ایک ٹکا بھی جہیز میں نہیں دیسکتی۔ "گھر کا بھات کھلا کھلا کر پوس دیا اب کیا اس کے پیچھے گھر بار بیچ کر بھیک مانگتے پھریں ؟" اس طرح بے گہنا زیور کی بہولیجا کر کس کو ناک کٹوانی تھی ؟ بات وہیں ختم ہوگئی۔ اس کے بعد پھر کہیں سے کوئی پیام نہ آیا۔ لیکن محلہ والیوں کے

اعتراضات کی بوچھار بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اپنی صفائی پیش کرتے کرتے چھکو کی ماں کے ناک میں دم آگیا تھا۔ آخر تنگ آکر اس نے چپکے چپکے ایک بات پکی کرلی۔ لڑکا دو اہ تھا۔ پاس کے گاؤں میں کھیت باری بھی رہی تھی لیکن سب کچھ شراب کے پیچھے تباہ کرچکا تھا۔ اب قلیل تنخواہ پر ایک چھاپہ خانہ میں کام کرتا تھا۔ اور کمائی کا بیشتر حصہ شراب کی نذر کردیتا۔

جمائی سندری کو بیاہ کر اپنے گھرلے آیا۔ سندری کی زندگی میں اس اہم تغیر نے بھی کوئی فرق پیدا نہ کیا۔ دن بھر گھر کا کام کرنا۔ اسی طرح چولھا پھونکنا، برتن مانجھنا، پہر رات گئے تک جمائی کے بدن دابنا اور اسکی گالیوں اور لاتوں کی تواضع قبول کرنا۔ جمائی جب شراب کے نشہ میں گھر آتا اور اسکی تکا بوٹی کرکے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا تو اسے چھکو کی دست درازیاں یاد آجاتیں وہ اسی طرح پوری طاقت سے مدافعت کی کوشش کرتی اور اسی طرح وحشیانہ حملوں کے مقابلہ میں زیر ہوکر بے بس ہوجاتی۔ انجام کار اسی لذت گیر لیکن اذیت ناک تجربہ کی سرشاری!

جمائی ایک رات بہت زیادہ شراب پی کر واپس آرہا تھا کہ رستہ میں بے موقعہ ٹھوکر کھاکر اسے سر میں سخت چوٹ آئی اور چند دن بیمار رہکر مرگیا۔

جمائی کی موت کے بعد سندری کی زندگی میں اور زیادہ کٹھنائیاں پیدا ہوگئیں مسلسل فاقوں کی تکلیف سے وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ اس کا گورا رنگ اس کے پچکے ہوئے گالوں پر کفن کی سی منحوس بے رونقی پیدا کر رہا تھا۔ اس کی رس بھری آنکھوں کی تابانی ناپید ہوگئی تھی اور ان کے گرد گہرے حلقے پڑگئے تھے جیسے مفلسی کھنڈر کے سوراخ سے جھانک رہی ہو۔ سندری اس تکلیف ومصیبت سے جلد نجات پا چکی ہوتی اگر مینا نے اسے کلکتہ لیجاکر ایک نئی دنیا میں داخل نہ کردیا ہوتا،

سندری اس ماحول میں سانس لے رہی تھی جہاں عورت کا ظاہر احسن اور دلآویزی اسے نسائیت کی مجبور و مرہون توجہ شخصیت سے آزاد کرکے اس کی مٹی میں مرد کی تقدیر ڈال دیتی ہے۔ جیسے سنہری کملا کی آب وتاب پہاڑی مزدوروں کے پاؤں تلے روندے ہوئے کردٹن کو شہر کے لکھ پتی کی قیمتی توجہ پر چھاپہ مارنے کے قابل بنادیتی ہو۔ سندری اس نئے عالم میں بڑی تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہی تھی۔ اس کی تقدیر کروٹ لے رہی تھی جیسے کسی بنجر اور ناقابل اعتنا زمین کے نیچے سے خزانہ نکل آئے۔ اس کے گلے کی فطری نے استاد کی فنکارانہ پرداخت سے بہت جلد سریلی بانسری بنگئی اور اس کے نغمے کی مقناطیس کلکتہ کے اونچے محلوں سے زروجواہر کے انبار کھینچنے لگی۔ سندری کی شہرت فلمی دنیا میں بھی پہونچ گئی اور ایک ممتاز فلم کمپنی نے اسکی فطری دولتوں کا خزانہ لوٹنے کے لئے اسے ایک بڑی تنخواہ پر رکھ لیا۔

سندری بہت کم عرصہ میں ہندوستان کی مشہور ترین ایکٹرس میں شمار کی جانے لگی۔ اس کے
چہرہ کی فنکارانہ تراش اس کے گندمی رنگ کی قیامت خیز ملاحت۔ اس کے اعضا کا ملکوتی تناسب
اس کے انداز کی سحر آگیں کرشمہ سازی۔ اس کی لوچدار آواز کی بانسری۔ ان ساری خصوصیتوں کے
بعد اسکی باکمال اداکاری! شاید ہی کسی فلم اسٹار کے اندر ان ساری دلآویزیوں کے سامان یکجا
بہم ہوتے ہونگے۔ وہ جسوقت فلم کے پردہ پر نمودار ہوتی تو معلوم ہوتا کہ انسانی دماغ کے نازک ترین
شہکاروں میں جان پڑ گئی ہو۔ جیسے غیر مرئی تصورات کو گوشت پوست کے سانچے میں ڈھال دیا
گیا ہو۔ اب اسے کوئی سندری کے نام سے نہ جانتا تھا۔ وہ مس اندرا دیوی تھی جس سے دو
باتیں کرنے کی تمنا معصوم سے معصوم دلوں میں بھی کروٹ لینے لگتی۔

سندری کی گھناونی شخصیت مس اندرا بن کر سوسائٹی کی نگاہ میں قابل رشک ہو گئی تھی
جیسے گندہ نالی کے سڑے ہوئے پانی کو فلٹر کر کے کارلس باڈ کی بوتل میں بھر دیا جائے۔ پہلے وہ صرف
اوباش طبع امرا اور غیر متمدن تجار کی توجہ کا مرکز تھی لیکن اب اسکی صحبت کے چند لمحے ترقی یافتہ اور
باوقار شخصیتوں کے لئے بھی باعث ناز تصور کئے جاتے تھے۔ وہ کسی نئے شہر میں چلی جاتی تو اسٹیشنوں پر
تماشہ بینوں کا ہجوم برسات میں سڑک کی برقی روشنی کے گرد پتنگوں کی یورش جیسا معلوم ہوتا تھا
کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ اس کے پاس فلم پرستاروں کے رومان خیز خطوط نہ پہونچتے ہو۔ اس کے
حسن کے مقابلہ میں قلوپطرہ کا روایتی نقشہ الفاظ کے کینوس پر کھینچکر نیچا ثابت کیا جاتا۔ اس کی آواز
کی دلکشی کو حیات آفریں معجزہ سے تعبیر کیا جاتا اس کی لاثانی اداکاری خدائے فن کے اعلیٰ ترین
کرشمہ کی حریف بتلائی جاتی۔ سندری رفتہ رفتہ ان اصطلاحات کے معنی سمجھنے لگی تھی۔ فلمستان
میں قدم رکھنے کے بعد اس نے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ لیکن ان خطوط سے اسے کوئی دلچسپی
نہ پیدا ہوتی۔ وہ انہیں پڑھتے ہی ردی کے ٹوکرہ میں پھینک دیتی جیسے وہ اس کے لئے کوئی مفہوم
نہ رکھتے ہوں۔ اسوجہ سے نہیں کہ وہ انکی کثرت و عمومیت سے اکتا گئی تھی۔ ان میں بعض
خطوط ایسے بھی ہوتے جنکی رومان انگیزی کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
سندری کی روح کا کوئی تار بھی ان سے مرتعش نہ ہوتا تھا۔ خطوط کے علاوہ اونچے اونچے عہدوں
اور بڑی بڑی پوزیشن کے لوگ اسکی ملاقات کو آتے۔ اسکی خوبصورتی اور فلمی صلاحیتوں کی
پرخلوص داد دیتے۔ بعض اس کے حسن کی قربانگاہ پر اپنی زندگی نچھاور کرنے لئے سربکف نظر آتے
اپنا سب کچھ اس کی قدموں پر بھینٹ چڑھانے کا مدعا ظاہر کرتے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سندری پر
ان ساری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ جیسے وہ ایک بے جان پتلا بن گئی ہو۔ فلم کے اسٹیج پر

اس بجلی کی طرح تھرکتی ہوئی تیتری کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر انہیں سخت حیرانی ہوتی اسکی روح کے لطیف روحانی تار کو متحرک کرنے کی وہ مختلف ترکیب سے کوشش کرتے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوتی اور وہ عجیب پشیمانی اور تعجب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے۔ انہیں شبہہ ہونے لگتا کہ ان کی باتیں سندری کو بار خاطر ہو رہی ہیں اور وہ خموش ہو جاتے۔ پھر دونوں طرف کی خموشی فضا کو مکدر بنا کر انہیں آمادہ رخصت کر دیتی۔ لیکن انہیں ہمت نہ ہوتی کہ اس بے اعتنائی و عدم توجہ کا سبب سندری سے دریافت کر سکیں۔ رفتہ رفتہ سندری کے اس انوکھے انداز کا چرچا کافی پھیل گیا اور اسکی غیر فلمی زندگی کا جمود اوراور بے کیفی فلم پرستوں کے لئے ایک معمہ سی بنگئی۔

سندری ایک فلم کمپنی کے ساتھ نیا کنٹراکٹ کر کے کلکتہ سے بمبئی منتقل ہوگئی۔ کمپنی کے منیجر نے بڑی کوشش پیروی سے سندری کو حاصل کیا تھا۔ یوں تو سندری کے حصول میں منیجر کی کامیابی کمپنی کے لئے منیجر کی ایک بے لوث و مخلص خدمت تصور کی جاتی تھی لیکن حقیقت میں سندری کی محبت نے منیجر کو سندری کے حصول پر آمادہ کیا تھا۔ سندری سے کمپنی کی رونق بڑھے یا نہ بڑھے وہ تو اپنے دل کی دنیا روشن کرنا چاہتا تھا۔

منیجر رفتہ رفتہ سندری سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ سندری نے جس روز سے کمپنی میں قدم رکھا تھا وہ عرض مدعا کے لئے بے چین تھا لیکن سندری کا حسن اسکی مقبولیت فلمی دنیا میں اسکی پوزیشن یہ ساری باتیں منیجر میں اظہار مدعا کی تاب نہ پیدا ہونے دیتی تھیں۔

منیجر نے اپنی محبت کا اظہار کرنے کی غرض سے سندری کو ایک شب اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ سندری وقت مقررہ پر منیجر کے گھر پہونچ گئی۔ منیجر نے خلوت کا لطف اٹھانیکے خیال کسی اور کو مدعو نہ کیا تھا۔ کھانیکا انتظام باغ میں تھا۔ کھانا شروع ہوا۔ سندری منیجر کے روبرو بیٹھی تھی۔ چاندنی کا سفید جال فضا پر پھیلا ہوا تھا۔ اوائل اپریل کی خمار آلود ہوا نشہ کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ منیجر جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔ تمناؤں کے اٹھتے ہوئے طوفان نے اس کے دل کی حرکت تیز کر دی تھی۔ کھانے کے درمیان میں وہ ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ رہا تھا لیکن مطلب کی گفتگو شروع کرنے کی اسے جرأت نہ ہو رہی تھی۔ چاندنی کے پس منظر میں سندری کا حسن اور نکھرا جا رہا تھا منیجر پر رعب سا طاری تھا۔ آخر اس نے ہمت کر کے زبان کھولی۔

"اندرا دیوی آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ سے ایک بات کہوں"۔ "شوق سے کہئے" آپ برا تو نہ مانینگی؟" منیجر نے رکتے رکتے عاجزی سے سوال کیا۔

"میں نے آپ کو پہلی بار 'نئی دلہن' میں دیکھا۔ اف آپ مجھے کس قدر خوبصورت لگی تھیں۔ بلکہ

آپ حقیقت میں جتنی خوبصورت ہیں قلم میں اس کا ٹکڑہ بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اپنی کمپنی کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہو کہ آپ یہاں آگئی ہیں اور خصوصاً میری تو ......" اس کی زبان رک گئی۔ اس نے سندری کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سندری اسکی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لے رہی ہو۔

" آپ رُک کیوں گئے۔ کچھ بول رہے تھے نا" سندری نے غائت سنجیدگی سے سوال کیا

"شاید آپ میری باتوں سے ناراض ہو جائیں"۔ "آپ بولئے بھی تو" سندری نے جیسے چڑھ کر جواب دیا۔

"میں آپ کو تصویر میں دیکھ کر آپکا بن گیا تھا اور اس روز سے آرزو مند تھا کہ اپنی محبت کے ذریعہ آپ کو اپنا بنا لوں۔ اندرا دیوی میں اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کو تیار ہوں" منیجر نے جذبہ سے متاثر لہجہ میں کہا سندری نے کوئی جواب نہ دیا جیسے وہ کچھ اور سننے کی منتظر ہو۔ " اندرا دیوی کیا آپ میری درخواست قبول کرینگی" منیجر نے سندری پر ملتجیانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ سندری خموش رہی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ منیجر نے وارفتگی کے عالم میں اپنی کرسی سندری کے نزدیک سرکائی۔ سندری نے اپنے جسم کو ایک طرف جھکا کر اضطراری طور پر اپنا عریاں مونڈھا منیجر کے قریب کر دیا۔ اندرا دیوی آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟ منیجر نے بے چینی سے سوال کیا

سندری پہلے کی طرح خموش رہی۔ اس کے چہرہ سے مظلومی ظاہر ہو رہی تھی جیسے کوئی بچہ استاد کی ناگزیر تادیب کا منتظر ہو اسکی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے سانس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ منیجر کو سندری کی کیفیت پر تعجب ہو رہا تھا اسے توقع تھی کہ سندری جو اسٹیج پر بجلی کی طرح کوندتی ہوتی ہے اس کی درخواست کا جواب ایک فردوس رومان پرور انداز میں دیگی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ شاید اسکی گفتگو سندری کو ناگوار گذر رہی تھی۔ لیکن وہ شوق و جذبہ سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ہمت کر کے سندری کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ " اندرا دیوی" اس نے جذبات سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ سندری نے اسکی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اسکی نگاہیں خشمگیں معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی مجبور کو اپنی بے کسی پر غصہ آجائے۔ منیجر گھبرا سا گیا۔ سندری اسکی طرف دیکھتی رہی جیسے اسے منیجر کی جانب سے کسی اقدام کا انتظار ہو۔ منیجر کی نگاہیں اس کی نظروں سے دوچار ہونیکی تاب نہ لاسکیں اور اضطراری طور پر جھک گئیں۔ سندری کی انگلیاں اکبارگی منیجر کے کلے پر بجیں۔ منیجر طمانچہ کھا کر حیران ہو گیا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُسے سندری سے اس حرکت کی کبھی بھی توقع نہ تھی۔ وہ ڈر گیا۔ اسنے رکتے رکتے نظریں نیچی کئے کہنے کہا" اندرا دیوی۔ مجھے معاف کیجئے۔ میں ایسا سمجھا" اس کے چہرہ سے ندامت اور پشیمانی ظاہر ہو رہی تھی۔ سندری بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کرسی سے اُٹھ کھڑی ہو لی۔ اس نے [illegible] سے اپنی طرف کھینچا۔ ٹیبل پر رکھی ہوئی پلیٹیں زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ وہ غصہ سے کانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ منیجر سہما ہوا کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سندری نے پھر اسکی طرف نگاہیں کیں ان میں غصہ کے ساتھ نفرت بھی شامل تھی۔ منیجر کچھ سمجھ نہ سکا اور مبہوت سا کرسی پر بیٹھا رہا۔ سندری کرسیوں سے

ٹکراتی غضبناک طور پر آگے کو بڑھی اور تیز قدموں کے ساتھ منیجر کے مکان سے نکل آئی ۔

منیجر کے مکان سے نکل کر سندری والہانہ انداز میں پیدل ہی چلنے لگی وہ اسی طرح چلتی ہوئی کافی دور نکل آئی ۔ ایک رکشا والا بھونڈی آواز میں آلاپتا ہوا اس کے قریب سے گذرا ۔ سندری نے اُسے روک کر سوال کیا "چلوگے" ۔ "چلوگے" ۔ رکشا والے نے منہ چڑا کر جواب دیا ۔ جانا کہاں ہے ؟" "مالا بار" "پیسہ کتنا دوگی"

"جتنا کرایہ ہوگا ملجائے گا" "جاؤ جاؤ ۔ ہم ایسے نہیں جائیں گے ۔ کرایہ بتائیں گی نہیں اور پیچھے جھنجھٹ کرینگی" یہ کہتا ہوا رکشا والا آگے بڑھ گیا ۔" "اے روکو ۔ تم جو کہو وہی دونگی" "آٹھ پیسہ لگے گا خوشی ہو تو دو ۔ نہیں تو پاؤں گھسیٹتی جاؤ ۔ اس وکت اکم نہیں ہوگا ۔ ہونہہ ! چاہینگی کہ گاڑی پر چلیں اور پیسہ بھی کھرچ نہ ہو" "اچھا آٹھ پیسے ہی دونگی" سندری رکشا والے کے سراپا کو جیسے حریصانہ تکنے لگی ۔" "تو پھر کھڑی دیکھ کاہے رہی ہو ۔ بیٹھنا ہے تو جلدی بیٹھو"

سندری رکشا پر بیٹھ گئی اور رکشا والا پھر اپنی مکروہ اور بے سری آواز میں چیخ چیخ کر گانے لگا ۔ سندری نہایت محویت سے اس کا سمع خراش گانا سن رہی تھی جیسے اس کی آواز سے اُسے دیرینہ انس سا ہو ۔" "تمہارا نام کیا ہے جی" سندری نے اُس سے مشتاقانہ سوال کیا ۔" "نام وام کس واسطے پوچھتی ہو ؟" رکشا والا اکبارگی بگڑ گیا ۔ ہم کیا تم سے کچھ فجول پیسہ مانگتے ہیں ۔ اترو گاڑی سے" اس نے جھٹکے سے رکشا روکتے ہوئے کہا" ہم آگے نہیں جائیں گے ۔ بڑی نام پوچھنے والی ۔ ہونہہ !"

"ارے چلو ۔ میں تمہیں آٹھ نہیں سولہ پیسے دونگی ۔ میں تو یونہی تمہارا نام پوچھ رہی تھی" رکشا والا پھر آگے بڑھا ۔ سندری نے ایک بھٹی خانہ کے قریب رکشا روکا اور اتر کر برانڈی کی دو بوتلیں خریدیں ۔ پھر اس نے رکشا والے سے چوپاٹی چلنے کو کہا ۔"

"ہونہہ ! ای کیا بات ہے جی ؟ پہلے تو مالا بار چلنے کو کہا اور اب چوپاٹی چلو" اس نے منہ بگاڑتے ہوئے سوال کیا ۔ "ارے چلو میں وہاں چل کر تمہیں یہ پلاؤنگی" سندری نے رکشا والے کو بوتلیں دکھاتے ہوئے کہا ۔ "رکشا والا زبان چٹ پٹانے لگا ۔

"سچ" اس نے دانت نپسورتے ہوئے سوال کیا ۔" "ہاں ہاں ! تم یہ سب پی سکوگے ؟" "ہونہہ ! ای کا ہے ۔ اتنا تو ہم اکے گھونٹ میں پی جائیں ۔ تم بھی پیوگی اس میں سے ؟" "نہیں یہ سب تمہارے ہی لئے ہے ۔ جلدی چلو بھی"

رکشا والے نے تیزی سے رکشا بڑھایا ۔ اور جلد ہی چوپاٹی پہونچ گیا ۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور نو گرفتار محبت اپنے دلوں کی حسرتیں نکال کر واپس جا چکے تھے ۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا ۔ ایک طرف رکشا چھوڑ کر دونوں شراب کی بوتلوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر تک رکشا والا حریص نظروں سے بوتل کو تاکتا رہا پھر اس بے تامل بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور غٹا غٹ پینے لگا ۔ جب اس پر نشہ کی کیفیت طاری ہونے لگی تو اس نے سندری کو زور سے گھسیٹ کر اپنی آغوش میں کرلیا ۔ سندری نے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے پورا زور مارا لیکن اس نے اسے کچھ اس طرح دبوچ لیا کہ سندری کو اپنے اعضاء ڈھیلے ہی کر دینے پڑے ۔ جب اس نے اپنی جوش کا وحشیانہ وار سندری پر کیا تو سندری نے آسانی سے خود کو اس کے سپرد کردیا اور ایک گہری لذت کی سرشاری میں کھو گئی ۔

محمد محسن

# انوکھا روگ

ڈاکٹر دین دیال داس صرف ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر نہ تھے۔ بلکہ ہومیوپیتھک کے لئے ان کا شغف جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ ہومیوپیتھک لیلیٰ تھی اور وہ اس کے مجنوں۔ زندگی کے کسی مرحلے میں ہومیوپیتھک ان کا ساتھ نہ چھوڑتی۔ ان کا سونا بیٹھنا اوڑھنا بچھونا سب ہومیوپیتھک کی دوائیں اور کتابیں تھیں۔ ان کا بس ہوتا تو وہ کائنات کے ہر ذرہ کو اکونائیٹ برادینا بلیسٹلا بنا کر دم لیتے۔ غالب کو "عالم تمام حلقۂ دام خیال" نظر آیا تھا اور ہمارے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں "عالم تمام حلقۂ ہومیوپیتھک" تھا۔

غرض یہ کہ جب عشق ہومیوپیتھک سودا کی حد تک پہونچا تو دین دیال بابو نے اپنے موروثی مکان کو ہسپتال میں تبدیل کر دیا۔ اور سارے شہر میں مریضوں کو خوشامد کر کے، بہلا کے اپنے ہسپتال میں جمع کر لئے۔ ان کے ہسپتال میں مریضوں کی خاطر اس طرح ہوتی جیسے سسرال میں داماد کی۔ دوائیں مفت غذا مفت ڈاکٹر بندہ بیدام اور اس پر سے احسان گاتے ہیں۔ تو پھر بھلا ہسپتال کو ترقی کیوں نہ ہوتی شہر کیا دوسرے شہروں میں بھی اس کا شہرہ ہو گیا۔ دین دیال بابو کی مراد بر آئی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ خوش نہ تھے۔ دن بھر کی دوا دوش کے بعد جب وہ اپنے کمرہ میں آتے تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی۔ ان کی پہلی بی بی مر چکی تھیں۔ اس لئے ان کے تھکے ہارے دماغ کو سکون کی نعمت بخشنے والا کون تھا۔ انھیں ضرورت تھی اس کی کہ کوئی انکی جسمانی اور روحانی صحت کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ ہومیوپیتھک سے وہ جملہ امراض کا مداوی کرتے لیکن اپنے درد کی دوا ان کے پاس نہ تھی۔ آخر بہت دنوں بعد انھوں نے "ضرورت ہے شادی کی" والے کالم میں اشتہار دیدیا۔ ان کا نام شیطان سے بھی زیادہ مشہور تھا پھر لڑکیوں کی کیا کمی تھی "بنگالہ کے ایسا دختر خیز" ملک اور ڈاکٹر دین دیال جیسا متمول اور مشہور "لڑکا" (اگرچہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی زندگی کی دوپہر ڈھل چکی تھی) روز دس پانچ پیغام آنے لگے۔ بعض بعض روشن خیال باپ اپنی اپنی نور دیدہ "کو لئے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے دیدار کو پہونچ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب ان کا خیر مقدم کرتے خاطر کرتے۔ مگر شادی کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے پہلے ہی انھیں اپنے ہسپتال کی سیر کراتے۔ سب سے پہلے وہ انھیں اس کمرہ میں لیجاتے جہیں انکی مرحومہ بی بی رہتی تھیں۔ اس کمرہ کے دروازہ پر بڑا سا ایک بورڈ لٹکا ہوا تھا "مہربانی کر کے یہاں جوتے اتار لیجئے"۔ آنے والے احتراماً جوتے اتار کر اندر داخل ہوتے پھر وہاں سے ہسپتال کے ہر کمرہ میں گھومتے پھرتے۔ ڈاکٹر صاحب مریضوں سے حال پوچھتے جاتے اور اور نسخہ زبانی تجویز کرتے جاتے" اچھا آپکے خیالات منتشر ہیں۔ فاسفورس نمبر ۳۰ — ڈرولنے خواب ...

ہونہہ... کا سٹیکم دن میں تین بار ...... گھر کی یاد آتی ہے آپ کو... سائی لیسیا نمبر ۶....“ اور پھر اپنی ہونیوالی بی بیوں سے مخاطب ہوکر فرماتے ”دیکھا آپنے! یہ ہے میرا گھر۔ اسکی آپ کو دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ اب آپ اپنے لئے کوئی کمرہ منتخب کرلیں۔ لڑکیاں ”سوچتیں“ انتخاب! انتخاب کی گنجائش کہاں ہیں، یہاں تو سونے کے کمروں میں بھی مریضوں کا قبضہ ہے“۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب شادی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ایک خادمہ چاہتے تھے جو اُن کا گھر ان کے اشاروں پر چلائے۔ نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیاں اس تہہ کو فوراً پالیتیں اور پناہ مانگتی ہوئی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوتیں اس طرح جیسے کوئی دیوانے سے ڈر کر بھاگے۔ بھاگتے وقت وہ اپنے اتارے ہوئے جوتے ڈھونڈھتی تو جوتے ندارد۔ ... نہ جانے کون لے بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب چلا اٹھتے ”ہونہو یہ چرن کی حرکت ہے۔ کہاں گیا وہ مردود“۔ ڈاکٹر اپنے نوجوان بھتیجے چرن کے اس عجیب خبط سے واقف تھے۔ چرن کو زنانہ جوتے چرانے کا مرض تھا جہاں کہیں بھی وہ کسی عورت کے پاؤں میں جوتا دیکھتا تو اسکی نگاہیں ان سے الگ نہ ہوسکتیں۔ وہ عورتوں کے چہرے کا نہیں انکے جوتوں کا عاشق تھا۔ دیکھنے کے بعد وہ ہر ممکن کوشش کرتا اور جتنباب وہ جوتے اس کے ہاتھ میں نہ آجاتے اسے چین نہ آتا۔ ڈاکٹر صاحب اس مرض کی تشخیص کر چکے تھے۔ ”قطرب پاپوشی“ کے علامات ظاہر تھے۔ کیمو میلا اِم اس کی تیر بہدف دوا ہے۔ وہ بار بار چرن کو دوا کھانے کی تاکید کر چکے تھے مگر وہ شریر اس کان سنتا اس کان اڑا دیتا۔ بہرکیف وہ پورے لکچر کے بعد چرن کے کمرے کی طرف دوڑے۔

چرن داس ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ جس کا بدن سڈول آنکھیں بڑی اور رسیلی۔ یوں دیکھنے میں وہ بہت ذکی اور باحواس لڑکا تھا۔ سنجیدگی کے خلاف اس میں کوئی بات نہ تھی سوا اس خبط کے جو اُسے زنانہ جوتوں کے لئے تھا۔ جوتے ہاتھ لگ جاتے تو انھیں جھاڑتا پونچھتا انھیں نہایت صناعی کیساتھ سجاتا پھروں ان کو دور سے کھڑا ہوکر ایک آرٹسٹ کیطرح دیکھتا رہتا شاید ان حسین پنڈلیوں کے تصور میں گم جنھیں اس نے اپنے آغوش میں دیا تھا۔ آج بھی وہ اپنے اسی شغل میں محو تھا جبکہ ڈاکٹر صاحب ڈانٹتے ڈپٹتے اس کے کمرے میں داخل ہوئے داخل ہوتے ہی چیخے ”نامعقول! مردود! پھر وہی جوتوں کا خبط!“ چرن نے کہا ”چاچا دیکھو تو کیسے شاندار جوڑے ہیں۔ حسن کی مورت! صناعی کا کارنامہ!“......

ڈاکٹر صاحب ”چپ گدھے! لا جوتے واپس کر“۔ بیچارے چرن نے قہراً جبراً اپنا خزانہ ان کے حوالہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر چرن سے پوچھا ”کیوں دوا کھائی تھی! نہیں! بیہودہ! پاپی! افسوس اب کیمو میلا سے کام چلنے کا نہیں! اسٹرگنیم منڈر د کیسا رہیگا؟ چرن! آج یہ دوا ضرور کھا لینا“ پھر وہ خواتین کے طرف مڑے اور کہا ”آپنے دیکھا...؟“ لڑکیاں ہنس پڑیں اور ان کے باپ ناک بھوں چڑھا کر

دروازہ کیطرف چل پڑے۔ ڈاکٹر ان کے پیچھے ہولیئے اور ان میں سے ہر ایک کے مرض کی تشخیص اور اس کا علاج بتانے لگے۔ اس حرکت نے ان لوگوں کو اور پریشان کیا۔ وہ بھاگیں تو ڈاکٹر بھی لپکے۔ غرض یہ کہ پورا سین کامک ہوکر رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی سنجیدگی پر جتنا زور دیتے اتنا ہی زیادہ ان لڑکیوں کو ان کے خبطی ہونے کا یقین ہوتا گیا۔ وہ ایسا بھاگیں کے کہ پھر پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو فطرتاً صدمہ ہوا۔ انھیں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ان کا سہارا بننا نہیں چاہتا۔ وہ دنیا میں یکہ و تنہا بے یار و مددگار تھے۔ اس صدمہ کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے عہد کرلیا کہ اب شادی کا خیال بھی نہ کریں گا۔ اور دوسرے ہی دن اشتہار دیدیا کہ انھیں ہسپتال کے لئے نرس اور ایک مددگار نوجوان کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے سے فاقہ مست ملک میں بے روزگاروں کی کیا کمی۔ سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان مرد اور نوجوان لڑکیاں ڈاکٹر صاحب کے در دولت پر دوسرے ہی دن جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر کی نگاہ انتخاب نے نرس کی جگہ کے لئے ایک نوجوان چلبلی سی لڑکی امرتا کو پسند کیا اور اس کے ساتھ اسسٹنٹ کی حیثیت سے ایک نوجوان جھنگ کالی کو۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ دونوں ایک ہی ہومیو پیتھک اسکول کے تعلیم یافتہ تھے اس لئے کافی بے تکلف دوست تھے۔ ڈاکٹر صاحب انھیں اندر لائے تو ان لوگوں نے دیکھا کمرہ کا حصہ ایک خاصہ اشتہار خانہ ہے۔ دیوار پر چاروں طرف امتناعی دفائی مشادرانہ اشتہارات کے بورڈ "خاموش رہیئے"۔ "ہنسنا صحت کا دشمن ہے"۔ "زور سے بولنا اعضائے رئیسہ کو صدمہ پہونچاتا ہے"۔ از ین قبیل بیسیوں لٹکے ہوئے تھے۔ بیچ میں اسپتال کے قوانین کی ایک لمبی سی فہرست جلی حروف میں ٹنگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے قانون نمبر ۱ پر انگلی رکھی "خاموش رہیئے"۔ نو واردوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ قانون نمبر ۲ پر انگلی بڑھی "زور سے نہ ہنسیئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے تشریح کی ہنسنا اور وہ بھی زور سے بدترین دشمن صحت ہے" قانون نمبر ۳ "ہوتے باہر اتاریئے ان کے ذریعہ سے کیڑے پھیلتے ہیں" ڈاکٹر صاحب کے دونوں رنگروٹوں نے پھر آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب جب قانون نمبر ۳ کی تشریح بھی کر چکے تو بولے "بس بس کافی ہے۔ اب آؤ تم دونوں اپنا کام دیکھو۔ میرے عزیزو کام ہی حقیقی مسرت ہے اور دنیا میں صرف ہومیوپیتھی ہی ایک ایسی حکمت ہے جس سے جملہ امراض کا ازالہ ہوسکتا ہے"۔ یہ فرماکر وہ چلدیئے۔

نرس نے کہا "عجیب دلچسپی ہے! تم ہنستے ہو زور سے! ابھی نکالدیئے جاؤگے۔ اٹھ نچلے بیٹھو جی۔ ادھر ادھر کیا کر رہے ہو"۔

نوجوان بولا اف وہ کیا دوزخی جگہ ہے" نرس بول اٹھی! "ہش اتنی زور سے!" نوجوان نے کہا بھئی میری تو طبیعت گھٹ رہی ہے۔ تم تو یہاں سے چل ہی دو تو بہتر ہے اگرچہ اس شہر خموشاں میں تو میری تنہا مونس تم ہی تو ہو!

نرس نے خموشی سے اپنی انگلی قانون نمبر ا پر رکھدی "خاموش رہئے"۔ وہ ہنسنے لگا تو اس نے اپنی انگلی نمبر ۲ پر رکھدی "زور سے نہ ہنسئے" نوجوان بولا۔ "شکریہ آپکا۔ آپ تو بڑی تیز ہیں اتنی جلدی اپنا کام سمجھ گئیں"۔ اس کے بعد دونوں اپنی جگہ پر چلے گئے، ہسپتال کا قانون تھا کہ ہر حکم یا پیام ایک علحدہ چھپی ہوئی سلپ پر لکھ کر دیا جائے۔ دوا کے لئے خوراک کے لئے اور اسیطرح ہزاروں قسم کے کاموں کے لئے الگ الگ قسم کی سلپ چھپوا کر رکھی گئیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ان نئے مددگاروں نے ان سلپوں کا استعمال ہسپتال کے مقاصد کے علاوہ اور ضروری کاموں میں کرنا شروع کیا۔ مثلاً غذا والی ایک سلپ پر نوجوان مددگار نے یہ حکم تحریر فرماکر "آنکھیں حسن کے خوان نعمت سے آسودہ ہونا چاہتی ہیں" نرس کے سامنے پیش کردیا۔ جواب میں نرس نے ایک احکام والی سلپ پر یہ لکھا۔ "آنکھوں کو پھوڑ دینا چاہئے"۔ پھر دوسری سلپ آئی۔ "اندھا... خستہ حال.... اور تنہا" تو اس کے جواب میں نرس دوسری سلپ بھیجتی "ناکارہ... خدمات کی ضرورت نہیں۔ برطرف"۔ اور کبھی سارا دن کام کرنے کے بعد وہ سلپ لکھتا "تھک کر چور"۔ جواب میں نسخہ والی سلپ پر یہ ہدایت ہوتی "الکنیشیا ام"۔ غرض یونہی دن گذرنے لگے۔ ڈاکٹر دین دیال حسب معمول اپنے مریضوں میں مشغول رہتے چرن داس کبھی کبھی ان دونوں کو دیکھنے آجاتا اس لئے نہیں کہ اُسے ان دونوں سے کوئی سروکار تھا بلکہ صرف اس غرض سے کہ اسے خوبصورت نرس کے حسین جوتوں سے ایک دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ نرس کے چہرے کیطرف کبھی آنکھ اٹھاکر نہ دیکھتا مگر اس کے جوتوں کیطرف سے اپنی نظر کو ایک منٹ کے لئے بھی پھیر نہ سکتا۔ کبھی کبھی جب نوجوان مددگار اور نرس دونوں اپنی سرگوشیوں میں محو رہتے تو چرن دبے پاؤں آکر اس زنانہ جوڑے کو شوق سے ایک نظر دیکھتا اور زیرلب یہ کہتا ہوا چلدیتا کہ "آہ کیسے حسین جوتے ہیں... خواب کی دنیا کے بنے ہوئے"۔

ایک دن نرس اور نوجوان دونوں آپس میں اپنے اس ذاتی مرض کے متعلق بہت محویت کیساتھ مشورہ کررہے تھے تحقیق اور تشخیص کے بعد جس کا نام "عشق" تجویز کیا گیا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت دروازہ کے باہر ایک صاحب اور ایک شدید اور نئے قسم کے مرض میں گرفتار کھڑے تھے۔ یہ تھے حضرت چرن داس جو نرس کے چمکدار جوتوں کے چرالیجانے کی فکر میں غلطاں تھے۔

دیر ہورہی تھی... اس لئے نرس باہر آگئی۔ جوتے غائب دیکھکر اس کے حواس پراگندہ ہوئے شاید کسی نے ہمیں دیکھ لیا.. کوئی ضرور ہماری پوشیدہ ملاقاتوں کے راز سے واقف ہے.... ضرور بالضرور... ہائے رے بے عزتی... لیکن یہ ہے کون؟"۔ اس کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔

ادھر چرن کا مرض بڑھتا گیا۔ اُسے ان جوتوں کا عشق سا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے اسکا وجود سخت پریشان کن تھا۔ بار بار وہ لائیکوپوڈیم تجویز کرتے۔ مگر دواؤں سے چرن کے سر کا بھوت نہ اترنا تھا نہ اترا۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے سوچا اس کم بخت کی تیمارداری اور نگہداری کے لئے کسی نہ کسی کو مقرر کرنا لازمی ہے

آخرا نھوں نے ایک دن نرس کو اپنے پاس بلایا اور اُسے ساتھ لئے ہوئے چرن کے کمرے میں گئے۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی امرتا ششدر رہ گئی۔ اس کا وہی جوڑا جو رات چوری گیا تھا سامنے بہ کمال حفاظت و شفقت رکھا اور چرن صاحب سامنے کھڑے اس کی پرستش کر رہے تھے۔ "یہ جذبہ پرستش کیا جو توں ہی تک محدود ہے؟" امرتا نے ایک لمحہ تک سوچا۔ عورتوں کا نقطہ خیال غالباً یہ ہوتا ہے: "جو میرے جوتے سے اتنی محبت کرتا ہے وہ مجھسے کتنی محبت کرسکتا ہے"۔ امرتا پھر سوچنے لگی "دیوانہ ہے خبطی ہے... یا شاید عاشق بھی ہو... مگر عاشق ہو تو کچھ نرالے قسم کا..." ڈاکٹر صاحب نے اس سے مخاطب ہوکر کہا "دیکھا تم نے۔ یہ انوکھے قسم کا مریض ہے۔ خاص طور پر لائی کوپوڈیم کا میں اس کو تمہاری نگرانی میں دیے دیتا ہوں۔ اس کا خیال رکھنا"۔ نرس نے کہا "بسر و چشم۔ آخر میں تنخواہ کس بات کی پاتی ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے خوش ہوکر کہا "ٹھیک ٹھیک! لائیکوپوڈیم یاد رکھیگا نا؟" نرس نے کہا "ضرور"۔ چنانچہ ہسپتال کی سخت ڈیوٹی کے باوجود بھی امرتا اپنے اس انوکھے مریض کی دیکھ بھال میں فروگذاشت نہ کرتی۔ ایک دن اس نے جھنگ کالی سے کہا "نرالے قسم کا مریض ہے یہ چرن مگر بات چیت میں بہت دلچسپ ہے" کالی نے آنکھ مار کر کہا "ہوں! یہ کہئے"۔ امرتا بولی "افسوس ہے اتنا حسین نوجوان اور خبطی..." کالی نے طنز سے کہا "شریمتی جی مجھے آپسے ہمدردی ہے"۔ اس نے ناز سے جواب دیا "خاموش رہو" مگر اس کے دماغ پر فکر کی ایک ہلکی سی بدلی چھا گئی۔ پھر بھی دوسرے دن وہ چرن کے پاس گئی اور حسب دستور اسکی دلچسپ باتوں میں کھو گئی۔ وہ فکر کی بدلی چھٹ گئی اور اب وہ چرن پر بُری طرح فریفتہ تھی۔

ادھر ڈاکٹر صاحب اس خیال میں مگن تھے کہ نوجوان مددگار اور حسین نرس دونوں اپنے فرائض نہایت اچھی طرح بجا لا رہے تھے۔ ان کا ہسپتال اب دن دونی ترقی کر رہا تھا اور انکی ہومیوپیتھی کی دھاک بندھ گئی تھی پھر بھی وہ پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ دو باتیں ان کے لئے مستقل مرکز فکر و انتشار تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے بعد ان کے محبوب ہسپتال کا کیا حشر ہوگا دوسرے یہ کہ چرن کی خبرگیری کون کریگا۔ آخر انھوں نے ایک روز جھنگ کالی اور امرتا سے مشورہ کیا اور ایک وکیل کے پاس جاکر ایک وقف نامہ تکمیل کر ڈالا جس سے انکا ہسپتال ایک مالی وقف اور ڈاکٹر صاحب معہ اپنے دو مددگاروں کے اس کے مشترکہ متولی قرار پا گئے۔ جھنگ کالی کے بھاگ جاگ اٹھے۔ دماغ نے فوراً ایک تجویز پیش کردی۔ ڈاکٹر کو ہوا بتاؤ اور خود ساری ملکیت پر قبضہ کرلو سڑی سودائی تو وہ مشہور ہے ہی۔ اب رہگئی امرتا سو اس نے تو مجھے شادی کرنے کا وعدہ کر ہی لیا ہے۔ پھر چین ہی چین لکھا ہے۔ عدالت میں ایک درخواست، ڈاکٹر کو پاگل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس خوشخیالی کے بعد جب اس نے امرتا کو بہکا لینے کی کوشش شروع کی تو ادھر کی ہوا بدل چکی تھی۔ امرتا نے اسکی تجویزوں کو ٹھکرا ہی نہیں دیا۔ بلکہ اس کا بھی ایک طرح سے اظہار کردیا کہ اس کی توجہات کا مرکز اب چرن ہے، کہ اس کے جوتوں سے اسے زیادہ عشق رکھتا جتنا جھنگ کالی خود امرتا سے۔ جھنگ نے طیش میں آکر یہ ٹھان لی

کہ چچا اور بھتیجے دونوں کو تباہ کر چھوڑے۔ ایک دن ڈاکٹر سے اس نے آ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بڑی بُری خبر ہے ڈاکٹر صاحب!" چونک پڑے جیسے انھیں بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ ایک مرتبہ ہی گھبرا کر بول اٹھے "کیا ہوا کیا ہوا بری علامتیں ہیں؟ خطرناک حالت ہے؟" اور یہ کہتے کہتے انھوں نے اپنی مخزن الادویہ الماری سے کھینچی۔ کالی کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ کھیلی اور اس نے کہا "اسکی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ آپکے ہسپتال کی اخلاقی فضا خطرہ میں ہے"۔ ڈاکٹر صاحب بڑبڑانے لگے "تو آرسینک.... نہیں.... بلاڈونا.... نہیں.... پلسٹلا...." کالی نے جوڑ لگایا "ڈاکٹر صاحب ہسپتال کی نیک نامی کا خاتمہ ہونے والا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب چیخ اٹھے "بھئی کہہ بھی چکو صاف بات کیا ہے"۔ کالی نے کہا بات یہ ہے کہ چرن بابو زنانہ وارڈ کے مریضوں سے ایک ذرا زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں اور ان لوگوں کو یہ حرکت ناگوار گذرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھڑک کر اپنے سامنے کی تمام کتابیں دوات قلم سب کچھ پھینک ڈالا اور ڈانٹ کر بولے "بلاؤ ابھی بلاؤ یہاں اس ناشدنی کو"۔ کالی نے اپنا آخری تیر یوں سر کیا کہ کیا کہوں صاحب مجھے تو آپکی ساری محنت پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گرج کر پکارا "چرن! چرن! اس بدبخت نے ہرگز لائیکو پوڈیم نہیں کھایا"۔ یہ حرکت ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں طب ہومیاپیتھی کی کھلی ہوئی توہین تھی اور مجرم ہر طرح گشتنی سوختنی بلکہ قابلِ گردن زدنی تھا۔ اتنے ہی میں کالی نے پکار کر کہا "ڈاکٹر صاحب مہربانی کر کے ذرا ادھر تکلیف فرمائیے"۔ اتفاق سے اسوقت چرن امرتا سے میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول تھا۔ اسے آنے والے دھماکے کا گمان بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مرقع قہر و جلال دیکھکر اس کے حواس گم ہوگئے۔ اور ادھر آتے ہی آتے ڈاکٹر صاحب چنگھاڑ اٹھے "چرن! کمبخت شیطان! ابھی میرے سامنے سے دور ہوجا۔ نکل میرے گھر سے.... ہرگز نہیں میں ایک حرف سننا نہیں چاہتا۔ ابھی ابھی اسی دم دروازے سے باہر جا.... خبردار پھر کبھی ادھر رُخ بھی کیا تو تو جانے گا".... گرجتے چیختے اس کا ٹینٹوا لینے بڑھے ہی تھے کہ چرن باہر نکل گیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا عتاب اس پر بھی دیر تک اسے خطابات عالیہ عطا کرتا رہا۔ آخر جب چرن کی صورت نظر سے اوجھل ہوئی تو یہ بڑبڑاتے ہوئے اندر گئے کہ "میرے ہسپتال کی اخلاقی فضا کسیطرح بھی خراب نہیں کی جا سکتی.... میں بہر صورت اسے پاک رکھونگا"۔

امرتا نے بھنگ کیطرف ایک تیکھی نگاہ ڈالی۔ وہ شرارت اور نفرت ملی ہوئی مسکراہٹ کیساتھ زیر لب یہ کہتا ہوا سرک گیا "بڑے افسوس کی بات ہے۔ مجھے ہمدردی ہے...." امرتا کے لب سمٹے آنکھیں پھیلیں اور ہاتھوں سے اس نے برآمدے کی ریلنگ کو زور سے تھام لیا۔ پھر ایک خیال کے ساتھ وہ کھڑکی کی طرف لپکی اور وہاں سے سڑک کے طرف دیکھنے لگی.... "وہ چلا گیا.... شاید ہمیشہ کے لئے...."

بھنگ کالی کو جب پہلے مورچہ پر اتنی شاندار فتح حاصل ہوئی تو اُسے فوراً ہی دوسرے حملہ کی

تیاری شروع کردی۔ اس نے عدالت میں دوسرے ہی دن یہ درخواست دیدی کہ ڈاکٹر دین دیال مخبوط الحواس ہوگئے ہیں اس لئے عدالت سے یہ استدعا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کا کسی ماہر امراض دماغ سے معائنہ کرانے کا حکم دے۔ گواہان موجود تھے عدالت نے حسب خواہش حکم دیدیا۔ اور ایک دن صبح سویرے ڈاکٹر دین دیال کے ہاتھوں میں پولیس کی ہتھکڑیاں پڑگئیں۔ وہ گھبرا کر مدد کے لئے چیخے تو بھجنگ کالی نے آکر انھیں کورٹ کا آرڈر دکھلا دیا۔ چشم زدن میں ڈاکٹر پوری تہ کو پاگئے اور بھجنگ کے سامنے اپنے کو بے دست و پا سمجھکر انھوں نے فی الحال سپر ڈالنا ہی مناسب خیال کیا۔ ان کا چھوٹا سا شہر اس بڑے شہر سے بہت دور تھا جہاں وہ ماہر امراض دماغ رہتا تھا۔ چنانچہ رائے یہ قرار پائی کہ رات کی گاڑی سے ڈاکٹر صاحب پابدست دگرے وہاں لے جائے جائیں۔ صبح کو جب وہ وہاں پہونچے تو وہ ماہر فن کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ بھجنگ کالی نے ڈاکٹر کو ملاقاتی کمرے میں بٹھایا اور خود بھی وہیں ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ سفر کی تکان کیوجہ سے وہ تو فوراً خراٹے لینے لگا اور ادھر ڈاکٹر کی عقل جاگ اٹھی۔ انھوں نے بدقت تمام بھجنگ کی جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکالی اور دانتوں کی مدد سے ہتھکڑیاں کھول ڈالیں۔ پھر بہ تمام زیرکی وہی ہتھکڑیاں بھجنگ کے ہاتھوں میں لگا کر چابی اپنے جیب میں ڈال کر ٹہلنے لگے۔ اتنے میں وہ ماہر دماغ آپہونچا۔ ڈاکٹر نے نہایت نصاحت سے اپنے آنیکی غرض بتائی اور اشارہ سے سوتے ہوئے بھجنگ کو دکھلا کر کہا "حضرت یہ شخص یوں تو دیکھنے میں بات چیت کرنے میں نہایت سنجیدہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے جنوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے سوا دہ تمام آدمیوں کو سڑی سودائی سمجھتا ہے اور ہر شخص کو ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے مجبوراً اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال رکھی ہیں مجھے بیحد صدمہ ہے۔ غریب نوجوان بڑا مستعد اور محنتی تھا۔ میرا تو بس دست راست ہی تھا۔ آپ اسے اچھا کردیں تو میں بہت ممنون ہونگا"۔ ماہر دماغ نے کہا "آپنے بہت مناسب کیا" اور یہ کہکر اس نے بھجنگ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا بھجنگ کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً سمجھ گیا کہ دین دیال نے اسے الو بنایا۔ فوراً ہی چیخ پکار مچانے لگا اور دین دیال طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "دیوانہ وہ ہے۔ اسے پکڑو۔ گرفتار کرو" دین دیال نے صرف مسکرا کر ماہر دماغ کیطرف دیکھا اور کہا "دیکھئے حضرت میں نے کہا نہ تھا؟" غرض یہ کہ بھجنگ نے جتنا آسمان سر پر اٹھایا اتنا ہی اس ماہر دماغ کو اس کے پاگل ہونے کا یقین ہوتا گیا۔ دین دیال نے اسے معقول معاوضہ دیکر بھجنگ کو اس کے حوالہ کیا اور اپنا پتہ بھی اسے دیکر خود گھر کی راہ لی۔ امرتا حسب معمول اپنے کاموں میں مشغول تھی۔ کسی کو دوا دے رہی تھی اور کسی کو غذا ڈاکٹر آتے ہی اس پر برس پڑے "یہاں آؤ! تم دونوں نے ملکر ہمیں پاگل بنانا چاہا تھا نا! کیوں آخر کس قصور پر ہمنے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟" ۔ غریب امرتا بوکھلا گئی۔ ڈاکٹر کو واپس آتے دیکھکر خوش ہوئی تھی مگر اس پھٹکار کا مطلب وہ قطعاً نہ سمجھ سکی۔ نزدیک آئی تو ڈاکٹر نے اسے پرے ہٹا کر کہا "دور ہو میرے سامنے سے۔ بھجنگ کے ساتھ تو نے سازش کرکے مجھے پاگل بنانا چاہا تھا۔ افوہ؟ ... اے کاش اسوقت میرا چرن میرے پاس ہوتا۔ میں نے اسے گھر سے نکالکر کتنی بڑی حماقت کی ہے۔"

امرتا کو اب بات سمجھ میں آنے لگی۔ اُسے یاد آگیا کہ ادھر بہت دنوں سے جھنگ برابر اسکو یہی سنایا
کرتا تھا کہ ڈاکٹر کو خبطی ہو گیا ہے۔ سودائی ہے ورنہ اپنے بھتیجے کو وہ گھر سے کیوں نکالدیتا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ ایک دن
جھنگ نے اسے بہلا کر ایک درخواست پر دستخط بھی کرالئے تھے۔ اپنی حماقت یاد کرکے وہ رو پڑی۔ اسکی سمجھ میں
نہ آتا تھا کہ بڈھے ڈاکٹر کے ساتھ جو اس نے ظلم کیا ہے اسکی تلافی کیونکر کرے۔ آخر وہ ڈاکٹر کے پاؤں پر گر کر رونے
لگی اور اپنی تمام بیوقوفی کا اعتراف کرکے اس سے معافی مانگنے لگی۔ ڈاکٹر کو پہلے تو اسکی باتوں پر یقین نہ آیا۔
مگر اسکی معصومیت اور خالص خدمت نے آخر اسے موم کر دیا۔ امرتا بھی آخر میں نتیجہ پر پہونچ گئی کہ وہ اب تک جھنگ سا
اور چرن دونوں کے درمیان جھول رہی تھی مگر اب جبکہ واقعات نے جھنگ کی مکاری اور سیاہ دلی کو روشن کر دیا
تو اسے اپنی غلطی محسوس ہوگئی اور اس دن کے بعد جھنگ اسکی نظروں سے ہمیشہ کے لئے گر گیا۔

اب ذرا مسٹر جھنگ کالی کا حال زار سنئے۔ اس ماہر دماغ نے انہیں آٹھ دن تک زیر معائنہ رکھا
اور اس دوران میں خوبی قسمت سے انہیں دو اور دیوانوں کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں رہنا پڑا یوں جیسے دونوں
مجانین اعظم کے بیچ میں انکی سینڈوچ بنادی گئی ہو۔ ان دو میں سے ایک تو اپنے کو ہٹلر سمجھتا اور دوسرا اسی
مناسبت سے خود کو مسولینی۔ ہر ہٹلر جھنگ کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے اور کمانڈ دیتے "اٹینشن! اپ
مارچ کوئیک مارچ..." پھر یک بیک حقارت کے ساتھ ڈانٹ کر کہتے "بزدل! پست ہمت، یہودی"
اس پر سینر مسولینی تمکنت سے سر اٹھائے ایک ہاتھ سے فرضی توند سہلاتے شان سے آگے بڑھتے اور تقریر
فرماتے "دوستو! میری طرف دیکھئے۔ مجھپر اعتماد کیجئے۔ میں آپکو مصیبتوں سے، افلاس سے، تاریکی سے باہر نکال لیجاؤنگا
زندہ باد فاسزم۔ ہم لوگ رومن ہیں اور روما کو سب سے زیادہ طاقتور ہونا چاہئے۔ ہرا۔ ہرا" اور بولتے بولتے
شفقت سے جھنگ کے فرقدان پر ایک کوہستانی ٹیپ جھاڑ دیتے۔ جھنگ کو اس جلس پرایہ ان دونوں باکمالوں
سے کافی دلچسپی ہوتی مگر رہ رہ کر ٹیپ اور گھونسوں کی شکل میں انکا اظہار شفقت اس کے لئے عذاب الیم سے
کم نہ تھا۔ لیکن ان دو عظیم ہستیوں سے کسی طرح چھٹکارا ملنا بھی تو آسان نہ تھا۔ آدھی رات کو بھی غریب کو اٹھکر
مدد کیلئے چیخ پکار مچانی ہوتی۔ اکثر وہ اپنے صیاد ماہر دماغ سے ان دونوں کی شکایت اور اپنی نجات کی درخواست
کرتا مگر وہ حضرت مسکرا کر صرف اتنا فرماتے "بھئی تمہارے ہمجنس ہی تو ہیں یہی ایک ذرا تشدد پسند ہیں" غرض جھنگ
بیچارے کی بری حالت تھی۔ ایک دن اس نے نکل بھاگنا چاہا مگر دھرا گیا اور حفاظت خواہ مرمت ہوئی۔ ادھر روز کا
یہ معمول ہو گیا کہ آدھی رات کو دونوں ڈکٹیٹران اعظم اس کے کمرہ میں تشریف لاتے اور جھنگ کو خوب مضبوطی
سے پکڑ کے بستر پر سے کھینچتے مسولینی اپنی طرف اور ہٹلر اپنی طرف۔ مسولینی اس کے کان میں رازدارانہ ارشاد
فرماتے "ابی سینیا... بکریوں اور اونٹوں کا مالک... میرا..." ٹھیک اُسی وقت ہٹلر نعرہ مارتے کہ السیس لورین
سب میرا۔" پھر دونوں غریب جھنگ کے تن لاغر کو محاذ جنگ قرار دیکر نہایت مستعدی سے نبرد آزما ہو جاتے

دونوں چیختے کہ یہ میرا ہے اور پھر باضابطہ اعلان جنگ ہوجاتا بجھنگ کو رہائی ملتی اور وہ دونوں آپس میں گتھ جاتے لیکن ساتھ ساتھ اظہار محبت کے لئے "طرفہ گہرے دوست" "بھائی جان" کے نعرے بھی لگاتے جاتے۔

کبھی کبھی بجھنگ گھبرا کر اپنی نبض ٹٹولتا اپنے بدن میں چٹکیاں لیتا۔ اُسے شک ہونے لگتا کہ واقعی وہ کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا۔ کون جانے وہ دیوانہ تھا وہ دونوں عجیب ہستیاں۔ سوچتے سوچتے عاجز آکر وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگتا۔ وہ دونوں اسے دیکھکر خوب قہقہہ لگاتے اور چڑھاتے کہ چھٹکارا محال ہے۔ بجھنگ انھیں سر توڑنے کی دھمکی دیتا تو وہ دونوں بیک وقت شکاری کتوں کیطرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بجھنگ مدد کے لئے چیختا تو ایک صاحب تنکر اور ڈپٹکر اعلان کرتے "میں ہٹلر ہوں" دوسرے صاحب ٹیبل کو میز بناتے اور خطبہ دیتے "میں مسولینی ہوں" دونوں بجھنگ سے اظہار عبودیت کا مطالبہ کرتے۔ وہ بیچارہ مجبور ہوکر قواعد کرنا شروع کرتا اور ہاتھ کو تین بار اوپر نیچے جنبش دیکر خالص فسطائی سیلوٹ بجالاتا۔

غرض اس مشغلہ میں سات دن گذرے تو آٹھویں دن ماہر امراض دماغ کو بجھنگ پر رحم آیا اور اس نے اسکا باضابطہ معائنہ کیا تو اسے اچھا خاصہ باہوش انسان پایا۔ اس نے حیرت سے بجھنگ سے پوچھا "کیوں حضرت یہ دیوانگی کا سوانگ بھرنے کی ضرورت؟" بجھنگ نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! میں نے دیوانگی کا سوانگ خود نہیں بھرا بلکہ آپکو ایک دیوانے نے بیوقوف بنادیا۔ یہ دیکھئے میرے کاغذات دین دیال بابو کے متعلق عدالت نے حکم دیا تھا کاغذات دیکھکر ڈاکٹر کی آنکھیں کھلیں اور بولے "یہ کہئے تو دیوانے دراصل رہ گئے جو آپ کو دیوانہ بنا گئے طبی کتابوں میں اس قسم کے نوادرات درج ہیں۔ دیوانے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ خیر دیکھا جائے گا" چنانچہ اس ماہر دماغ اور بجھنگ دونوں نے دین دیال کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کردیا اور پولس کی مدد سے دین دیال بابو پھر کشاں کشاں لائے گئے۔ ماہر امراض دماغ کو دیکھکر دین دیال بابو نے کہا "ڈاکٹر تمہیں اس دیوانے (بجھنگ) نے پھر دھوکا دیا نہ؟" اس نے مسکرا کر کہا "ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ اب ذرا مہربانی کرکے ادھر تشریف لائیے۔ دین دیال نے بہ اصرار کہا "دیکھئے آپ اسکی باتوں میں نہ آئیے۔" وہ ہنستا ہوا بولا "ہرگز نہیں کبھی نہیں"۔ دین دیال کو ڈاکٹر کی شرارت انگیز ہنسی نے غصہ سے پاگل بنادیا۔ وہ چیخ کر بولے "یہ میری صریح بے عزتی ہے۔ آپ شریفانہ برتاؤ کریں یاد رکھیں۔" ڈاکٹر نے انھیں تھپکتے ہوئے کہا "دین دیال بابو غصہ نہ کیجئے میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہونچانا چاہتا ہوں۔ صرف ایک رسمی معائینے کے بعد آپ آزاد ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ....." دین دیال چیخ اٹھے۔

"کیا! کیا کہا میں پاگل ہوں سڑی سودائی ہوں۔ بدمعاش! پاجی! کمینہ!۔ ڈاکٹر نے ڈانٹ کر کہا "چپکے رہیے اور مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجئے۔" دین دیال نے چڑھ کر کہا "ہرگز نہیں۔ میں کبھی معائنہ کرنے نہ دونگا تم جیسے ہو اس پاجی بجھنگ کے آلہ کار ہو۔" ڈاکٹر اور بجھنگ دونوں نے انھیں رام کرنے کی بیحد کوشش کی مگر وہ نہ مانے تو ڈاکٹر نے چڑھ کر بے دیکھے بھالے عدالت کے کاغذ پر لکھدیا کہ دین دیال خبطی ہیں اور ان کو بجھنگ کی نگہداشت

میں اسوقت تک رکھنا چاہیے جبتک یہ پرامن رہیں اور جب یہ تشدد پر آمادہ ہوں تو انھیں رانچی بھیجدینا مناسب ہوگا"
عدالت نے اس رپورٹ پر بھجنگ کے حسب خواہش حکم دیدیا اور ڈاکٹر دین دیال اس دن سے اپنے مکان میں نظربند ہوگئے۔ بھجنگ کی نگہداری میں یہ نظربندی جلد ہی قید سخت میں تبدیل ہوگئی۔ امرتا غریب ڈاکٹر کی حالت دیکھکر کڑھتی مگر اسکا کچھ بس نہ تھا۔ دل ہی دل میں دعا کرتی کہ اے کاش چرن واپس آکر اسکو اور ڈاکٹر کو نجات دلائے۔ دین دیال بھی بار بار آکر اس سے پوچھتے "کیوں امرتا! میرا چرن کیا اب کبھی واپس نہ آئیگا؟" وہ حسرت سے سڑک کی طرف ٹکٹکی لگاکر دیکھتے اور بدبداتے "آجا واپس آجا میرے چرن! آہ میں نے ہی تجھے گھر سے نکالدیا!" امرتا پیار سے ان کا شانہ پکڑکر انھیں سمجھاتی "گھبرائیے نہیں۔ چرن بابو آئیں گے۔ ضرور آئیں گے"۔ وہ بول اٹھتے "نہیں امرتا نہیں، وہ اب واپس نہیں آنے کا۔ خیر تم سے ہوسکے تو کوشش کرو" یہ کہتے کہتے وہ بھجنگ کو دیکھکر چپ ہوجاتے بھجنگ ہمیشہ اس تاک میں رہتا تھا کہ یہ دونوں آپس میں مل نہ سکیں۔ کبھی کبھی امرتا بغاوت پر آمادہ ہوجاتی مگر بھجنگ کی مکاریوں سے وہ پیش نہ پاسکتی تھی۔

ایک رات آخرکار چرن واپس آہی گیا۔ ایک لامعلوم جذبے نے اسے اپنے چچا کی طرف جانے کیلئے مجبور کردیا۔ جسوقت وہ پہونچا ہے تو رات زیادہ جاچکی تھی اور مکان کے دروازے بند ہوچکے تھے۔ اس نے پشت کی دیوار پر کمند لگائی اور اندر اتر گیا۔ سارے مکان میں صرف بالا خانے کے ایک کمرے میں ایک روشنی جھلملا رہی تھی اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں کی روشنی ہے۔ فوراً اوپر چڑھ گیا۔ اس کے پاؤں کی چاپ نے امرتا کو چونکادیا اور اپنے حیرت وخوشی سے بیخود ہوکر چرن کے دونوں ہاتھ پکڑلئے اور پھر چشم زدن میں شرماکر چھوڑ دئے۔ بات کرنے کو اسکی زبان نہ کھلتی تھی آخرکار دیر کے بعد اس نے کہا "چرن جی ہم لوگ بڑی مصیبت میں ہیں" چرن نے تفصیل پوچھی تو اس نے دھیرے دھیرے اسے سارا حال کہہ سنایا۔ چرن نے کچھ سوچکر کہا "تو پھر تم بھجنگ کو روکتی کیوں ہو وہ جو چاہتے ہیں کرنے دو۔ امرتا نے کہا "نہیں نہیں یہ تو کسی طرح ہونے ہی نہ دونگی۔ اندھے ہوگیا چرن؟ بزدل نہ ہو ایشور کیلئے"۔ چرن نے رنج ہوکر کہا "میں اور بزدل؟" امرتا نے بڑی بیصبری سے کہا "ہاں ہاں سہل انکاری نکرو اس معاملہ میں فوری تدارک کی ضرورت ہے ایک دن کی دیر بھی مہلک ثابت ہوسکتی ہے" چرن نے قدرے پڑائی جتاکر کہا "بھئی سانپ سے کون کھیلنے جائے"۔ امرتا نے چڑھ کر کہا "ایشور! کس انسان سے پالا پڑا ہے۔ چرن تم انسان ہوکہ دودھ پیتے بچے"۔ چرن نے فخر سے کہا "دودھ پیتا بچہ! اچھا خیر دیکھا جائے گا۔ تو ہی جو اس حرامزادے کو مزا نہ چکھایا ہو۔ ہاں ذرا تم میرا ساتھ دیتی رہو۔ کیوں ساتھ دوگی نا!" امرتا یہ جانتی تھی کہ سادہ دل چرن شاطر بھجنگ کے مقابلہ میں خس وخاشاک سے زیادہ نہیں پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ اس نے چرن کی مدد سے بھجنگ کو اکھاڑ پھینکنے کا عزم کرلیا اور مسکراکر چرن سے کہا آؤ اب ہم تم بیٹھکر حملہ کا نقشہ تو تیار کرلیں۔ مگر اس نقشہ تیار کرنے کے پہلے ہی بھجنگ نے انھیں آلیا۔ اندھیری رات میں اس نے گھر کے اندر ایک آدمی کو گھستے

دیکھ لیا تھا۔ وہ تلاش کرتا ہوا امرتا کے کمرے تک آپہونچا اور وہاں حسب توقع چرن کو مصروف سازش پاکر بیحد
چراغ پا ہوا۔ اسے چرن کی واپسی کا دھڑکا ہمیشہ لگا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ سے امرتا کی ساری باتیں سنی اور پھر
اندر آکر چرن کا ٹینٹوا لیا اور بولا "کیوں بے کاٹھ کے الّو تو پھر بے حیا بنکر آگیا!" چرن نے اسے ڈانٹ بتائی "خبردار
ہاتھ نہ بڑھانا" اور یہ کہتے کہتے پینترا بدل کر الگ کھڑا ہوگیا۔ جھنگ نے کہا "میں بحیثیت یکے از مالکان مکان
کے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً اس گھر سے باہر چلے جاؤ" امرتا نے چیخ کر کہا "ہرگز نہیں میں بھی ایک مالک کی حیثیت سے
یہاں رہنے کی اجازت دیتی ہوں تم ہرگز اس مکان کو نہ چھوڑو"۔ جھنگ اسکی طرف حیرت سے دیکھکر مسکرایا۔ امرتا
نے چراغ پا ہوکر پھر کہا "مہربانی کرکے آپ میرے کمرے سے باہر تشریف لیجائیں"۔ جھنگ نے دونوں کی طرف
ایک تند نگاہ ڈالی اور خاموش چلدیا۔ امرتا نے کہا "میں سمجھتی ہوں اتنا کافی ہے"۔ چرن نے کہا "خیر ہوگا بھی...
یہ تو بتاؤ وہ تمہارے حسین جوتے کہاں ہیں۔ کتنے پیارے تھے وہ جوتے!" اور یہ کہکر اس نے حرارت سے آنکھ
ماری۔ امرتا نے بگڑ کر کہا "تمہاری عقل پر پڑیں وہ جوتے"۔

ڈاکٹر دین دیال کا یہ دستور تھا کہ وہ آدھی رات کو اٹھکر اپنے مریضوں کے کمروں میں گشت لگاتے
اور ان سے حال پوچھتے۔ ایک رات گشت میں ایک کمرے سے جھنگ اور ایک وکیل کی بول چال کی آہٹ ملی۔
انھوں نے کان لگا کر سنا تو یہ معلوم ہوا کہ جھنگ وکیل کی سازش سے چرن کو کسی چوری کی علت میں دھروا دینا
چاہتا ہے۔ جھنگ کمرے سے نکلا تو ڈاکٹر ایک پائے کی آڑ میں چھپ رہے۔ جھنگ نے جراحی کے کمرے سے بہت سے
آلات نکالکر چرن کے بستر کے قریب ایک الماری کی دراز میں چھپا دئے۔ ڈاکٹر صاحب سب کچھ دیکھکر چپکے
سے سرک آئے۔ دوسرے دن جھنگ نے پولیس میں اطلاع دیدی کہ ہسپتال کے بہت سے آلات چوری گئے۔
داروغہ صاحب آئے۔ تحقیقات ہوئی۔ دوران تحقیقات میں جھنگ نے چرن کیطرف شبہہ کا رُخ پھیر دیا اور
یہ ثابت کیا کہ یہ شخص آوارہ مزاج ہے اس کے چچا نے اسے اسی بنا پر گھر سے نکالدیا وغیرہ وغیرہ۔ چرن کی
بچنے کے لئے کوئی ثبوت نہ تھا۔ چرن کی کوئی بات داروغہ جی نے قابل سماعت نہ سمجھی اور اسے گرفتار کرکے
تھانے لے چلے۔ اتنے ہی میں دین دیال بابو کمرے سے باہر نکلے اور ڈانٹ کر پولیس کو روکا اور داروغہ سے کہا
میں آپ کو بتا سکتا ہوں آلات کس نے چرائے ہیں اور کہاں رکھے ہیں۔ جھنگ بیچ میں بول اٹھا "داروغہ جی
ان کی نہ سنئے یہ تو عرصہ سے پاگل ہوگئے ہیں"۔ امرتا نے کہا "ہرگز نہیں وہ کبھی پاگل نہیں ہوئے"۔ ڈاکٹر نے کہا
"ہونھ! میں اور پاگل" یہ کہکر انھوں نے درازوں سے تمام آلات نکالکر داروغہ جی کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔
جھنگ نے بات بناتے ہوئے کہا "تو یہ کہئے یہ آپکی کارروائی تھی۔ معاف کیجئے گا داروغہ جی میں نے آپ کو
خواہ مخواہ ایک پاگل کی سنک کیوجہ سے تکلیف دی"۔ اور ایک اظہار ترحم کے ساتھ اس نے داروغہ جی سے چرن کو
چھوڑ دینے کی التجا کی۔ ڈاکٹر نے چیخ کر کہا "ٹھہرئے! انصاف اور عدالت کے نام پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ

اس شیطان جھنگ کو گرفتار کر لیجیے۔ جھنگ نے دین دیال کو دھمکاتے ہوئے کہا " اگر آپ کو گھر کی پُر امن زندگی اور آرام عزیز ہے تو ڈاکٹر صاحب آپ اپنے کمرے میں تشریف لیجائیں "۔ داروغہ نے جب واقعات کا یہ رخ دیکھا تو اُسے فوراً گمان ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی سازش چل رہی۔ اور پھر جو اس نے سنبھل کر تحقیقات شروع کیں تو اُس کے تمام شبہات سچ نکلے۔ اس نے ڈاکٹر کے ساتھ بڑی ہمدردی دکھلائی اور وعدہ کیا کہ وہ عدالت سے ڈاکٹر صاحب کے دماغ کا دوبارہ معائنہ کی اجازت حاصل کرے گا۔ سب کچھ سمجھا کر جو اس نے جھنگ کیطرف توجہ کی تو وہ غائب ہو چکا تھا اس نے پھر تو چرن اور امرتا کو عدالت میں درخواست دینے کی فہمائش کی اور واپس چلا گیا۔

اپنی پہلی کوشش میں ناکام ہو کر جھنگ نے جھنجھلا کر ہسپتال کے مریضوں کے ساتھ بدعنوانی شروع کر دی اور انکی دوا اور غذا میں کمی کر دی۔ ڈاکٹر دین دیال یہ سب دیکھتے اور خون کا گھونٹ پیکر رہجاتے۔ کبھی کبھی بڑی بیچارگی کے ساتھ امرتا سے کہتے " کیوں امرتا؟ ان غریبوں کی جان بچانے کی کیا کوئی تدبیر نہیں ؟ " امرتا افسوس سے سر ہلا کر چپ رہجاتی۔

ایک دن ڈاکٹر نے بیٹھے بیٹھے بہت سی لذیز چیزوں کی فرمائش کر ڈالی اور تقاضوں کے بعد جب وہ چیزیں آگئیں تو انھوں نے پاگلوں کا سوانگ بھر کے وہ تمام چیزیں مریضوں کیطرف پھینکنی شروع کر دیں۔ امرتا انکا مقصد سمجھ گئی اور کافی مقدار میں لذیز غذائیں ان کو مہیّا کرنے لگی۔ لیکن جلد ہی جھنگ کی سمجھ میں یہ چال آگئی اور اس نے پھر کمر بستہ ہو کر وار کرنا شروع کیا۔ ہسپتال سے مریض نکالے گئے جو بیچارے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ انھیں مکان سے الگ ایک ٹین کے سائبان میں ڈالدیا گیا اور اب سارا مکان اس کے قبضہ میں تھا۔ ڈاکٹر دین دیال یہ سب کچھ پاگلوں کی سی خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ ان میں اب مقابلہ کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ جھنگ نے اسی پر دم نہ لیا۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے بھی ایک ایک کر کے تمام سامان ہٹا دیئے۔ امرتا نے اعتراض کیا تو اس نے نہایت شان سے اتنا کہدیا کہ " یہ سب میرا ہے "۔

ڈاکٹر نے ایک دن امرتا سے پوچھا " کیوں امرتا آجکل چرن دکھائی نہیں پڑتا "۔ اس نے کہا " آج کل وہ جھنگ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے میں منہمک ہیں ایشور چاہے تو ہم لوگ بہت جلد اس موذی کے پنجوں سے چھوٹینگے "۔ ڈاکٹر نے ایک نگاہ یاس سے اسکی طرف دیکھا تو وہ پھر بولی " آپ گھبرائیں نہیں اب انہیں وہ پہلا سا باؤلا پن نہیں۔ وہ بڑی مستعدی سے کام کر رہے ہیں "۔ ڈاکٹر نے کہا " اف یہ انتظار کی تکلیف کب تک سہی جائے "

کئی دن بعد جھنگ نے ڈاکٹر کے کمرے سے آکر ڈاکٹر ہنمین کی بڑی تصویر ہٹادی۔ ڈاکٹر کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ اس تصویر کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ تصویر ہٹتے دیکھکر آپے سے باہر ہو گئے۔ جھنگ کے اشارے پر نوکر نے ان کے سر پر ایک دھول جمادی جس نے ان کے رہے سہے حواس بھی چھین لئے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب نے کمرے کے اندر تاج محل کا ایک چھوٹا سا مجسمہ رکھا دیکھا۔ اُسے دیکھتے ہی ان کے حواس باختہ دماغ میں

یہ خیال سماگیا کہ وہ خود شاہجہاں ہیں اور یہ مجسمہ اصل وہ نادر عمارت تاج محل ہے جو اس نے اپنی بی بی ممتاز محل کی یادگار میں بنوائی تھی۔ انھوں نے کھڑے کھڑے بکنا شروع کیا "ممتاز! میری جان! میری طرف دیکھو بوڑھا خستہ حال ہوں کوئی پرساں حال نہیں ....." غرض یہ کہ مسٹر ڈی ال رائے کے شاہکار "شاہجہاں" کے تمام مناظر ان کے دماغ میں سما گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ وہ خود شاہجہاں ہیں اور اورامرتا اور بجھنگ دونوں جوان کے سامنے کھڑے تھے۔ جہاں آرا اور اورنگ زیب ہیں۔ امرتا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیا ہے بیٹی جہاں آرا! تم چپ کیوں ہو؟" بجھنگ نے اُنھیں ڈانٹ کر کہا "بس بس یہ اپنا سڑی پن رہنے دو"۔ تو بجھنگ کو دیکھتے ہی وہ اٹھے "آؤ آؤ میرے گستاخ مگر قسمتمند بیٹے! میرے لئے باعث فخر ونگ" اور یہ کہتے ہوئے اسے گلے لگانے بڑھے۔ بجھنگ نے انھیں ڈانٹا اور امرتا سے پوچھا "کیا یہ واقعی پاگل ہوگئے؟" بات کھلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کی کیفیت پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ وہ ہوش میں نہیں۔ بجھنگ کے بنائے کچھ نہ بنی۔ امرتا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے کھڑی رہی۔

ادھر چرن جب داروغہ سے دوبارہ ملا تو اس نے بڑی شفقت سے اسکی مدد کی اور عدالت میں درخواست دلوا کر وہاں سے حکم لے لیا کہ ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ تیسرے دن کمیشن کے آنے کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ چرن خوش خوش واپس آیا کہ امرتا کو اور ڈاکٹر کو یہ مژدہ سنائے لیکن ان کے کمرے کے دروازے پر پہونچتے ہی وہ دھک سے رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذی تاج سر پر رکھ لیا۔ پھٹے ہوئے کوٹ پر جامۂ شاہی کی جگہ ایک سیاہ کمبل ڈال رکھا تھا چرن کو دیکھتے ہی پکار اٹھے "جہاں آرا دیکھو میرا دارا واپس آگیا۔ شہنشاہ کا لڑکا لڑائی ہار کر چلا آیا" پھر چڑھ کر چرن سے بولے "جاؤ جاؤ ابھی جاؤ اور ان سب کو شکست فاش دیکر آؤ۔ لو یہ ہماری مہر شاہی لو اور اسیوقت واپس آنا جب تمام دشمنوں کا قلع قمع کر لینا"۔ چرن نے گھبرا کر امرتا کیطرف دیکھا اور اُس نے اشاروں ہی میں کہدیا کہ دماغ ٹل گیا ہے۔ چرن غریب کو ایک دھکا سا لگا اسکی تمام محنت پر پانی پھرتا نظر آیا۔ مارے مایوسی کے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر خاموش کھڑا رہا۔ امرتا نے اسے وہاں سے کھینچ کر ہٹایا اور کہا "ہوش بجا کرو۔ یوں کیسے کام چلے گا۔ ابھی جاؤ اس ماہر امراض دماغ کے پاس اور اس سے پوری حالت کہکر کوئی تدبیر پوچھو۔ چرن اس کے یہاں پہونچا تو حال سنکر اس ماہر دماغ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اسی کی نا عاقبت اندیشی کیوجہ سے غریب دین دیال بابو اس حالت کو پہونچے تھے۔ اس نے چرن سے کہا "بھئی ڈاکٹر صاحب کو بچانے کی صرف ایک صورت ہے۔ ان کے دماغ پر کمرے کا تمام سامان خصوصاً انہیں کی تصویر بنانے سے ایک بڑا جھٹکا پڑا ہے۔ جبتک وہ سارے سامان اسی صورت سے ان کے کمرے میں سجا نہ دیئے جائیں

وہ آپے میں نہیں آسکتے۔ تم جاؤ اور جہاں تک جلد ممکن ہو وہ تمام سامان بھر سے فراہم کرلو اور ان کے گرد پھر وہی فضا پیدا کردو جو پہلے تھی۔" اس نے تمام ہدایتیں کاغذ پر لکھ کر چرن کے حوالے کی اور اس نے بازار میں جاکر بدقت تمام تمام اس قسم کے سامان بہم پہونچائے۔ جو ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں تھے۔ ہنمین کی ایک تصویر بھی ایک کبڑے سے لی اور ہانپتا کانپتا اسوقت پہونچا۔ جب کمیشن والے ڈاکٹر صاحب کا معائنہ کرکے واپس جانا چاہتے تھے۔ انکے سامنے ڈاکٹر صاحب نے جی کھول کر اپنی شاہجہانیت کی داد دی تھی۔ کبھی کمیشن والوں سے ڈانٹ کر یہ مطالبہ کرتے کہ باادب با ملاحظہ نگاہ روبرو سواری ہز صاحبقران ثانی شاہجہاں شہنشاہ دہلی کی"۔ کبھی اپنی پیاری نور دیدہ جہاں آرا کو پکارتے اور فریاد کرتے کہ لوگ انکی تعظیم کیوں نہیں کرتے۔ فریاد کرتے کرتے بگڑ اٹھتے اور تمام باغیوں کے قتل پر آمادہ ہوکر اپنی زرہ اور تلوار مانگتے۔ پھر آسمان کی طرف آنکھ اٹھاکر بولے" اے خدا اگر تیری نیکا یہی حال ہے تو اسے قحط، بجلیاں طوفان وبائیں سب ملکر نیست ونابود کردیں۔ جلا ڈالیں خاکستر کردیں۔۔"

ادھر چرن کے انتظار میں امرتا کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہر ہر لمحہ ایک قیامت۔ بارے اتنے ہی میں چرن آپہونچا۔ کمیشن والوں نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق رائے قائم کرلی تھی۔ مگر چرن نے جب انھیں ماہرامراض دماغ کی تحریر دکھلائی تو وہ لوگ پھر بیٹھ گئے۔ چرن نے حسب ہدایت جب تمام سامان کمرے میں رکھ دیا اور ہنمین کی تصویر ڈاکٹر دین دیال کے سامنے رکھی تو وہ چونک سے پڑے اور پھر کچھ دیر خاموش دیکھتے رہے یوں جیسے کوئی گہری نیند سے جاگا ہو۔ انکی آنکھوں میں رفتہ رفتہ ہوش کی چمک پیدا ہوئی۔ انھوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پوچھا" یہ اتنے سارے لوگ یہاں کیوں ہیں۔ آپ حضرات کی تعریف؟" چرن نے کہا" کچھ نہیں آپ سے ملنے آئے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا" بہت خوب بہت خوب آپ لوگ تشریف رکھیں" چرن نے پھر کمیشن والوں سے الگ باتیں کیں اور صورت سمجھا کر ان سے لکھوا لیا کہ ڈاکٹر دین دیال اب ہر طرح ہوش وحواس میں ہیں۔ وہ لوگ یہ لکھکر چلتے ہوئے۔ ادھر چرن نے بھجنگ کیطرف توجہ کی۔ بھجنگ تو اپنی کامیابی پر بغلیں بجا رہا تھا مگر یکایک چرن کی واپسی اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ہوش میں آنے اس کے حواس گم کردیئے۔ چرن نے اس سے کہا" کیوں حضرت مارآستیں صاحب! اب فرمائیے"۔ بھجنگ نے دھتکارے ہوئے کتے کی طرح راہ فرار لی۔ اور پھر نظر نہ آیا۔ چرن نے اسے پکار کر کہا شاباش! اور پھر امرتا کی طرف مخاطب ہوکر اور آنکھوں میں شرارت بھر کر بولا" کیوں لیڈی صاحبہ وہ آپکے حسین جوتے کہاں ہیں؟" امرتا نے کچھ جھینپتے کچھ مسکراتے کہا" شریر! پاجی!"

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے دونوں کو دیکھا کہ ایک گوشہ میں محبت کے مسئلہ کو حل کررہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بخود کہا" عشق! اس کے لئے۔۔۔ آرسینک ہنڈرڈ۔۔ چرن نے کہا" نہیں کیپسیکم تھرٹی۔ امرتا بولی" یہ بھی نہیں پلسٹلا الکس" پھر سب نے ملکر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور بس ـــــــ ع بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا۔

(ترجمہ)

# کلام غلام علیؔ حیدری

غلام علیؔ حیدری کا ترجمہ تذکرۂ عشقی میں اس طرح درج ہے: حیدری دہلوی "اسمش حکیم غلام علی عرف شیخ جمعہ مردے مؤدّب و مہذب مستجمع محامد ذاتی وصفاتی ست۔ اوقات شریف بہ صوم وصلوٰۃ و افعالِ مستحسنات صرف می سازد، و باہمہ کس بہ اخلاق و اشفاق می پردازد۔ بالجملہ آں حمیدہ خصال در فن طبابت دست گاہے و در شیوۂ غزل پردازی طبع رسائی دارد۔ مدّتے در شہر عظیم آباد طرح استقامت انداختہ، الحال از چند سال در حسین آباد بہ رفاقت غلام حسین خاں وفا تخلّص، خلف نواب ہدایت علی خاں مرحوم بہ فراخی حال می گذارند، و برراقم آثم از قدیم شفقت دلی مبذول می فرماید" حیدری تخلّص کے ایک شاعر کا قلمی دیوان جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس میری نظر سے گزرا تھا۔ دیوان سے یہہ ثابت ہے کہ اسکا تعلق عظیم آباد سے رہا ہے عجب نہیں کہ یہہ دیوان غلام علیؔ حیدری ہی کا ہو۔ ذیل کے اشعار تذکرۂ عشقی سے ماخوذ ہیں:

اے صبح حشر تونے یہ کیا غل مچا دیا — آئی تھی آنکھ لگنے کو ناحق جگا دیا

نہ پایا بت کدے میں اور نہ بیت اللہ میں دیکھا — جو کچھ ہم ڈھونڈتے تھے سو دلِ آگاہ میں دیکھا

تیغ جس دم کہ علم کیجیے گا — پہلے ایدھر ہی کرم کیجیے گا

محفل تک اُس کی ضعف سے جایا نہ جائے گا — مرتے چلو ہیں کہ پھر آیا نہ جائے گا

شامِ غم سے شمع سال روتا ہے کیا — صبح تک تو دیکھ لے ہوتا ہے کیا

کس کی صورت پہ مبتلا ہیں ہم — اپنی صورت سے جو خفا ہیں ہم

اب تلک آپ قتل کرتے ہیں — اس تغافل پہ ہم تو مرتے ہیں

جب دیکھتا ہوں غیر کی محفل میں یار کو — کرتا ہوں یاد قدرتِ پروردگار کو

جو کچھ ترے جی میں ہو سو کر دیکھ — ظالم تو کسی طرح ادھر دیکھ

یوں تو جو بت نظر آتا ہے ادا رکھتا ہے — پر کہاں پائے جو وہ نام خدا رکھتا ہے

صنم جب سے تو ہم سے چیں بر جبیں ہے — شب و روز آنکھیں ہیں اور آستیں ہے

تیرِ نگاہ دل کے کہیں پار ہو چکے — ہونا جو ہو الٰہی سو یک بار ہو چکے

رسوا کیا خراب کیا کو بہ کو مجھے — اے عشق خوب تونے تو دی آبرو مجھے

کل کے کہاں وہ لطف کہاں جور آج کے — قربان جائیے ترے ایسے مزاج کے

درد دل پوچھے ہے یا سوزِ جگر پوچھے ہے — شمع رو یہہ تو بتا کس کی خبر پوچھے ہے
دل دیجئے بتاں کو نہ ہرگز یہ جی میں تھی پر کیا کریں رضائے الٰہی اسی میں تھی
آہِ سوزاں نے تو پھونکا تھا شرربار ہے — بچ گئے اشک ٹک اک تیری مددگاری ہے
بے طرح دل مرا اڈے ہے خدا خیر کرے — جوش پر آج یہ دریا ہے خدا خیر کرے
حالت کہیں آہ اپنی بیداری کی رباعی یا اس شب تیرہ کی جفا کاری کی
آنکھوں سے نکلنا تھا نگہہ کو دشوار اللہ شبِ فراق کی تاریکی
کل حشر میں مجمع ہیں جو سب آئیں گے ر ہم چشموں میں کیا آبرو ہم پائیں گے
پیدا نہ کیا دیدۂ حق بیں افسوس — اندھے جیے اور اندھے ہی مرجائیں گے
کہتا ہی جو اے شیخ مجھے تو گم راہ ر رتبے سے مرے بت کے نہیں تو آگاہ
آئے دو خدا کرے تو دیکھوں کیوں کر — کہتا نہیں تو دیکھ کے اللہ اللہ
کس آفت جاں سے دل لگایا ہم نے ر جو زیست سے اپنی ہاتھ اٹھایا ہم نے
کیا کہیے اسے قصور اس کا کیا ہے — جیسا کیا ہم نے ویسا پایا ہم نے

جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم یہہ مطلع فرمائیں کہ اشعار بالا دیوانِ حیدری میں ہیں یا نہیں۔

# کلام علی ابراہیم خاں خلیل و حال

نواب علی ابراہیم خاں خلیل و حال تخلص (سال وفات ۱۲۰۹ھ) نے کئی تذکرے لکھے ہیں، لیکن کسی میں اپنا حال اور کلام نہیں دیا۔ اُن کے اشعار بہت کم یاب ہیں ذیل کے اشعار تذکرۂ عشقی سے ماخوذ ہیں:

ترے لب کے آگے اعجاز مسیحا مات ہے بات کہتے جی کو لیتا ہے تری کیا بات ہے
جس طرف مائل ہو دل ادھر تغافل کی نگاہ — ہاں مرے صیاد اک صیدی کی یہہ بھی گھات ہے
مرے دیوانہ پن کو دیکھ کر زنجیر ہنستی ہے — یہاں تدبیر کرتے ہیں وہاں تقدیر ہنستی ہے
منہ لگا دامنِ صحرا کو کھڑا روتا ہوں حال میں تازی طرح رونے کی ایجاد کیا

قاضی عبدالودود

# جبل الطارق

(جبرالٹر)

ابیسینیا پر اطالوی حملے (۱۹۳۵ء) سے
پہلے جبل الطارق کی اہمیت کا صحیح اندازہ
مشکل تھا۔ یہہ چھوٹی سی پہاڑی نوآبادی
جسکی زراعتی یا معدنی پیداواریں اتنی
نہ تھیں کہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں
جنگ عظیم کے بعد کے پرسکون دور میں
سلطنت برطانیہ کی دوسری زرخیز اور
بیش بہا نوآبادیوں کے مقابلے میں کم
وقعت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اطالیہ کی بڑھتی
ہوئی بحری طاقت اور محوری طاقتوں کے
ہسپانیہ سے سازوباز نے جبل الطارق
کی اہمیت میں جنگی مصلحتوں کی بنا پر
بہت اضافہ کردیا۔
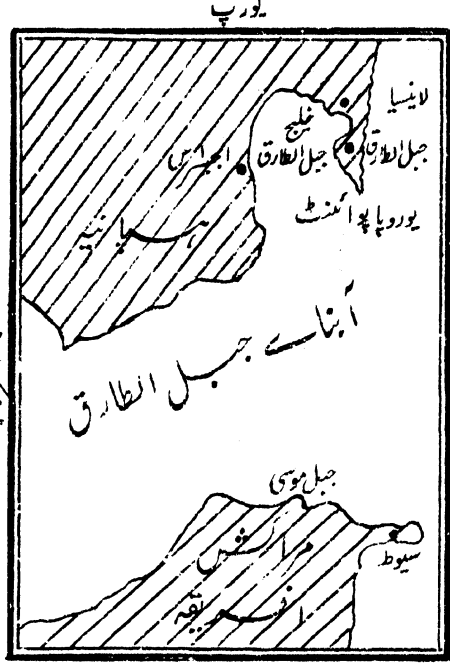
اس نقشے کا ایک انچ اصلی دس میل کے برابر ہے۔

اس نوآبادی کی سرزمین ایک پتلے راس کی شکل میں ہسپانیہ کے جنوبی
ساحل سے نکل کر آبنائے جبل الطارق میں کچھ دور تک چلی گئی ہے۔ اس کے بہت بڑے
حصے میں چونے کے پتھروں کا ایک عظیم الشان پہاڑ ہے جو جبل الطارق کے چٹان
(The Rock of Gibraltar) کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرزمین کا ایک چھوٹا
حصہ اس ریتیلے خاکنائے پر واقع ہے جو اسے ہسپانیہ سے منسلک کرتا ہے۔ یہہ چٹان
تقریبًا ڈھائی میل لانبا اور تین چوتھائی میل چوڑا ہے اور اسکی اونچائی کسی حصے میں چودہ سو
فیٹ سے زیادہ نہیں۔ اس چٹان کے اتر کا ریتیلا خاکنائے پہلے تو کسی کے قبضے میں تھا
لیکن پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں حکومت ہسپانیہ کی رضامندی سے اسے دو حصوں
میں تقسیم کردیا گیا اور اس کا نصف جنوبی حصہ جبل الطارق کی برطانوی نوآبادی میں

شامل کر لیا گیا۔ ان دونوں علاقوں کو ملا کر اب اس نو آبادی کا رقبہ دو مربع میل سے کچھ ہی کم ہے۔

جبل الطارق کے چٹان کی طاقتِ مدافعت کا راز اسکی ناہموار تشکیل میں پوشیدہ ہے۔ یہہ چٹان اتر طرف عمودی صورت میں ۱۴۰۰ فیٹ بلند ہو جاتا ہے اور اس طرح شمالی فاکنائے کے علاقے سے اس پر فوجی حملہ دشوار ہے۔ پورب طرف بھی یہہ چٹان ساحل سے یک بیک کافی بلند ہو جانیکی وجہ سے دشمنوں کی زد سے بڑی حد تک محفوظ ہے۔ پھر "یورپا پوائنٹ" (جو اس چٹان کا انتہائی جنوبی نقطہ ہے) کے آس پاس کی سمندری پہاڑیوں نے اس حصے کو بحری حملوں سے قطعی طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ اس پوری نو آبادی میں لے دے کر ایک ہی ایسا علاقہ ہے جہاں حملہ آور فوجوں کے اترنے میں قدرتی رکاوٹوں کی کمی ہے۔ یہہ علاقہ چٹان کا مغربی ساحل ہے جو نسبتاً ہموار ہے۔ اسی علاقے میں جبل الطارق کا شہر آباد ہے اور یہیں برطانیہ کی پرانی قلع بندیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن حال میں اس علاقے میں ایک زبردست فوجی بندرگاہ بنگئی ہے اور اس ساحل پر بھی غنیم کی فوجوں کا اترنا اب ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے۔

جبل الطارق کے چٹان کے مغربی ساحل پر سٹے سٹے مکانوں کی کثرت نظر آتی ہے اور جیسے جیسے چٹان کی ڈھال سیدھی ہوتی جاتی ہے مکان کی کمی زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ چٹان کے بلند حصّوں پر زیتون کے درختوں اور کہیں کہیں سدا بہار رومی جھاڑیوں کے سوا پیڑ پودوں کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے اور یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اس سنگلاخ خطے میں ساڑھے سترہ ہزار انسان آباد ہیں۔

## جبل الطارق کی مختصر تاریخ

۷۱۱ء میں اس علاقے پر مشہور و معروف اسلامی سپہ سالار طارق نے حملہ کیا اس تاریخ سے پہلے کے حالات قدیم رومی و یونانی مصنفین کی کتابوں میں کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن انکی تاریخی حیثیت کیا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔ طارق کے کامیاب حملے کے بعد ہی یہہ علاقہ جبل الطارق کے نام سے مشہور ہو گیا۔ مسلمانوں کا اس علاقے پر قبضہ کرنے کا غالباً یہہ مقصد تھا کہ یہاں سے ہسپانیہ اور یورپ کے دوسرے علاقوں پر انھیں حملہ آور ہونے میں زیادہ سہولتیں ہونگی۔ ۱۳۰۹ء سے لے کر ۱۳۳۳ء تک

مختصر مدت کو چھوڑ کر طارق کے اہم تاریخی حملے کے بعد سے ۱۴۶۲ء تک یہ علاقہ
مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد یہ ہسپانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا ۱۷۰۴ء
میں ایک برطانوی جنرل سر جارج روک نے ایک ہسپانی شہزادے پرنس ہنری کی
مدد سے جبل الطارق پر کامیاب حملہ کر کے اُسے برطانوی حکومت میں ملا لیا۔ اٹھارہویں
صدی کے پر آشوب دور میں جبل الطارق کی برطانوی فوجوں نے تین شدید ہسپانوی
محاصروں کا کامیاب مقابلہ کیا۔ ان میں سے آخری محاصرہ ۱۷۷۹ء سے لے کر ۱۷۸۳ء تک
جاری رہا۔ اس معرکۂ عظیم کا سہرا ایک مشہور برطانوی سپہ سالار سر جارج ایلیٹ کے
سر بندھا۔

جبل الطارق کی جنگی اہمیت کا پہلے پہل اسوقت احساس ہوا جب ٹرافلگر کی
معرکہ آرائی (۱۸۰۵ء) کے بعد برطانوی سپہ سالار نلسن کے فوجی بیڑے نے جبل الطارق کی
پرسکون اور محفوظ کھاڑی میں لنگر ڈالا۔

جنگی اہمیت کے علاوہ جبل الطارق کو اس دور میں جو تجارتی اہمیت حاصل
ہوئی اس کا مختصر بیان غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نپولین کی جدوجہد سے
یورپ کی بندرگاہیں برطانوی تاجروں کے لئے یکے بعد دیگرے بند ہوتی جا رہی تھیں اور
برطانوی ملاح اسکی تلافی کی دُھن میں نئی راہیں اور نئی منڈیوں کے انکشافات میں
نمایاں کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ جبل الطارق نے اس تگ و دو میں اس کا بہت
ہاتھ بٹایا۔ نپولین کی جنگ کے بعد بھی برطانوی تجارت اسی طرح پھلتی پھولتی رہی اور
بربری اور برطانوی علاقوں کی باہمی تجارت کے لئے جبل الطارق ایک اہم تجارتی
مرکز بن گیا۔ بحیرۂ روم کی دوسری تجارتی منڈیوں جیسے جنیوا، مالٹا، اور ہسپانیہ سے
بڑی تعداد میں تاجر یہاں آکر آباد ہوگئے اور ۱۷۹۱ء سے لے کر ۱۸۳۴ء تک کے
قلیل عرصے میں اس شہر کی آبادی تین ہزار سے سترہ ہزار تک پہنچ گئی۔

۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھلجانے سے جبل الطارق کی فوجی اور تجارتی خصوصیتیں
اور نمایاں ہوگئیں اور خلیج جبل الطارق میں ایک فوجی بندرگاہ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔
ساتھ ہی ساتھ مشرق بعید جانے والے جہاز اس بندرگاہ میں کوئلہ لینے کے لئے ٹھہرنے
لگے۔ ان حالات نے شہر کی آبادی میں اور اضافہ کر دیا اور ۱۹۰۱ء میں جبل الطارق
کی آبادی بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہی سے اس شہر کی آبادی میں

نمایاں کمی محسوس کیجانے لگی جس کے دو اہم سبب ہیں۔ ایک تو یہہ کہ یہہ علاقہ اب صرف ان برطانوی رعایا کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے جو وہیں پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے یہہ کہ مکانات کی قلت اور اسباب رہائش کی گرانی کے باعث اس نوآبادی کے کچھ لوگ پاس کے ہسپانی شہر لا لینیا میں جاکر بس گئے ہیں۔

## موجودہ آبادی

جبل الطارق کی شہری آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جنکے آباو اجداد ہسپانیہ، مالٹا، اور جینیوا سے آآکر صدیوں سے یہاں بستے رہے ہیں۔ لیکن اس مخلوط آبادی کا سیاسی نظریہ ایک ہی ہے۔ جسکا سب سے اہم عنصر سلطنت برطانیہ کی اطاعت ہے۔ ان میں کوئی جماعت ایسی نہیں جو موجودہ حکومت سے شاکی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے دور میں اس نوآبادی کی ایک کثیر تعداد کی ہمدردی جمہوریت پسند جماعت کے ساتھ تھی۔ لیکن یہہ ہمدردی اس حد تک نہ تھی کہ وہ اس جنگ میں شریک ہوکر اس جماعت کا ہاتھ بٹاتے۔ عام طور پر جبل الطارق کی شہری آبادی باہر کے سیاسی حالات سے بے نیاز ہی نظر آتی ہے۔

جبل الطارق کے چٹان کی قدرتی ساخت کے متعلق پہلے کچھ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ اس کی زمین کا بیشتر حصّہ بہت ناہموار اور سیدھا ڈھلواں ہونیکی وجہ مکان بنانے کے لئے بہت ہی ناموزوں ہے اور اسکی ساری آبادی اس کے مغربی ساحل کے نسبتاً ہموار علاقے میں سمٹ آئی ہے۔ جس کا رقبہ کسی حالت میں نوے ایکڑ سے زیادہ نہیں۔ ظاہر کہ اتنے مختصر رقبے میں تقریباً ساڑھے سترہ ہزار انسانوں کا رہنا سہنا آسان نہیں۔ مکانات ایک دوسرے سے بالکل ملحق اور ایک پر ایک بنائے گئے ہیں، پھر بھی ساری آبادی کے لئے ناکافی ہیں اور مزدوروں کے چھ سات آدمیوں کے ایک گھرانے کو ایک ہی دو کمروں پر اکتفا کرنی پڑتی ہے اور کرایہ بھی بہت زیادہ دینا پڑتا ہے۔ ان کے رہنے کے لئے مکانوں کی کمی کی ایک وجہ تو یہہ ہے کہ یہاں مکان بنانے کے لئے ہموار زمین ہی بہت کم ہے دوسری وجہ یہہ ہے کہ فوجی محکمے نے شہری آبادی کے بسنے کی جگہیں محدود کر دی ہیں۔ اس سے ایک یہہ فائدہ تو ہوا کہ غیر فوجی آبادی کا بڑھتا ہوا سیلاب تھم گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہہ نقصان بھی ہوا کہ بندرگاہ کی گودی (Dockyard) میں کام کرنے والوں کا بڑا حصہ ہسپانیہ کے شہر لا لینیا میں رہنے لگا جو بعض غیر معمولی حالات میں ضرر رساں ثابت ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں اتنا اور عرض کر دینا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رہایش کی دشواریوں کے
حل کی کامیاب کوششیں جاری ہیں۔ سعی کی جا رہی ہے کہ مزدوروں کے رہنے سہنے کا حسب دلخواہ
انتظام ہو جائے اور انھیں کم سے کم کرایہ دینا پڑے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی تدبیریں بھی کی
جا رہی ہیں کہ مزدوروں کو کچھ ایسے ہنر بھی آ جائیں جنکی مدد سے انکی خوش حالی بڑھے۔ ظاہر ہے کہ
موجودہ حالات میں فوجی ضروریات کی طرف زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ
آگے چلکر شہریوں کے اخلاقی اور معاشرتی حالات کے سدھارنے کی پوری کوشش کی جائے گی
جس سے یہہ فائدہ بھی ہوگا کہ یہاں کے لوگ اس اہم تجارتی اور جنگی بندرگاہ کے کام بہتر طور پر
انجام دے سکیں گے۔

## تجارتی ترقی

یوں تو جبل الطارق کی اہمیت کا دارومدار زیادہ تر اسکی فوجی خصوصیات پر ہے
لیکن اسکی تجارتی حیثیت بھی کافی اہم ہے۔ آبنائے جبل الطارق کے دونوں ہی ساحل پر خلیج
جبل الطارق سے اچھی کوئی اور قدرتی بندرگاہ نہیں۔ لیکن یہہ بندرگاہ ہسپانیہ سے سیاسی طور پر
عرصہ دراز سے بے واسطہ رہی اس لئے اسے اپنے قدرتی عقب ساحل (hinterland)
(ہسپانیہ) کی پیداواریں دوسرے ملکوں میں بھیجنے کے لئے میسر نہ آئیں۔ اس کمی کے باوجود بھی
اس بندرگاہ میں جہاز رانی کے لئے کوئلہ اور تیل کی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ برطانوی
جہاز جو بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں یا ایشیائے بعید کے ممالک کو جاتے ہیں یہیں ٹھہر کر کوئلہ یا تیل
کی کمی کو پورا کرکے آگے بڑھتے ہیں۔ موجودہ جنگ سے پہلے برطانوی جہازوں کے علاوہ یہاں
امریکی، ڈچ، نارویجین اور اطالوی جہاز بھی کوئلہ یا تیل لینے کیلئے ٹھہرتے تھے۔ جنکی آمد ورفت سے
یہاں کی تجارت کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا۔

جبل الطارق کی تجارت کے فروغ کا دوسرا اہم ذریعہ سیاحوں کی آمد و شد اور ان کا
قیام ہے۔ ان سیاحوں سے یہاں کے ہندوستانی تاجروں کو کافی فائدہ پہنچتا ہے۔ یہہ تاجر ہندوستانی
زیورات، جاپانی ریشمی کپڑے، فرانسیسی عطر اور مراکش کے چمڑے کے مال کا کاروبار کرتے ہیں۔ انکی
شہر میں چھوٹی بڑی متعدد دکانیں ہیں۔ جنکی تجارت کا دارومدار زیادہ تر سیاحوں پر ہی ہے۔

سردی کے موسم میں یورپ کے سرد و نم علاقوں سے برف باری اور مسلسل ابر و باد سے
گھبرا کر کچھ لوگ تبدیل آب ہوا کی غرض سے یہاں چلے آتے ہیں اور رومی آب و ہوا کے خطے کی
خوشگوار سردی، نکھری ہوئی دھوپ، کھلی ہوئی فضائیں، رنگ برنگ کے پھولوں اور طرح طرح کے

پھلوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ ان سے بھی مقامی تاجروں کو کافی منفعت ہوتی ہے۔

جبل الطارق اشیائے خوردونوش کے معاملے میں کلیۃً دوسرے ملکوں کا محتاج ہے لیکن اسکی اچھی بندرگاہ اور اس کے ہسپانیہ سے برّی الحاق کی وجہ سے اسے ان اشیاکے حصول میں زیادہ دقتیں پیش نہیں آتیں۔ گوشت۔ آٹا، گھی اور متعدد دوسری ضروری چیزیں برطانیہ یا ریاستہائے متحدہ امریکہ سے آجاتی ہیں اور تازہ پھل اور ترکاریاں ہسپانیہ سے۔

## جبل الطارق کی موجودہ فوجی اہمیت

آج جبل الطارق کا سب سے اہم فوجی مصرف یہہ ہے کہ اس کے بحری اڈّے سے برطانوی جنگی جہاز ان برطانوی تجارتی اور جنگی بیڑوں کی حفاظت کرسکتے ہیں جو آس پاس کے اٹلانٹک سمندر اور مغربی بحیرۂ روم میں آتے جاتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں اسے اس علاقے کے لیے مسلح بدرقہ (Convoy) کا مرکز بنادیا گیا تھا۔ اس کی بندرگاہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں بحیرۂ روم میں کام کرنے والے کل برطانوی بیڑے پناہ گزیں ہوسکتے ہیں اور بڑے سے بڑے جہاز بآسانی ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

اس بحری اڈے کی حفاظت کے لئے جبل الطارق کی چھاؤنی میں بہت بڑی فوج ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ قدرتی سہولتوں کے علاوہ مدافعت کے نت نئے انتظامات نے اسے کافی حد تک دشمنوں کی زد سے محفوظ کردیا ہے۔ لیکن جہاں قدرت اور انسانی دماغ نے اس بحری اڈّے کو اتنا محفوظ اور مستحکم بنا رکھا ہے۔ وہاں چند ایسے قدرتی حالات بھی موجود ہیں جن کی مدد سے، غیر معمولی حالات میں، دشمن اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ مراکش کے ساحلی علاقے، جبل موسیٰ، ہسپانیہ کے شہر الجیراس کے عقب کے پہاڑ اور جبل الطارق کے اتر کے ہسپانوی علاقے سینیا کاربونیرا سے اس فوجی بندرگاہ پر دور کے نشانہ لگانے والی توپوں سے گولہ باری کی جاسکتی ہے۔ پھر ہسپانیہ کے ہوائی اڈے۔ ملاگا، اور مراکش کے اڈے سیوطہ اور طیطوان سے بھی اسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہہ کہا جاسکتا ہے کہ جبل الطارق کی فوجی بندرگاہ کی مکمل حفاظت کے لئے ہسپانیہ سے برطانیہ کی دوستی اور مراکش کا دشمنوں کے پنجے سے بچا رہنا ضروری ہے۔ یہ ماننا پڑیگا کہ موجودہ دور کے ہوائی حملوں کی شدت اور ہمہ گیری نے جبل الطارق کو پہلے سے زیادہ غیر محفوظ کردیا ہے۔ لیکن یہہ حملے اگر کسی بالکل آس پاس کے ہوائی اڈے سے نہ کئے جائیں تو زیادہ نقصان رساں نہیں ثابت ہونگے۔

جبل الطارق کو اس بات کی بھی کمی ہے کہ یہاں ہوائی اڈّا بنانے کے لئے کافی مسطح

زمین نہیں ملتی۔ ہاں ہوائی بیڑوں کو اتارنے کے لئے ایک چھوٹا سا اڈا البتہ بنا لیا گیا ہے جو جبل الطارق کے چٹان اور ہسپانیہ کے سرحدی علاقے کے بیچ میں واقع ہے۔

جب تک ہسپانیہ غیر جانبدار ہے جبل الطارق برطانیہ کے ہاتھ میں بحیرۂ روم کی کامیاب جنگ کیلئے ایک زبردست بحری اڈا ہے جہاں سے بآسانی برطانوی بیڑوں کی حفاظت کی جاسکتی ہے اور دشمنوں کے جنگی بیڑوں کو آبنائے جبل الطارق میں داخل ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کہ موجودہ ہسپانوی حکومت کس حد تک جبل الطارق کو حاصل کرنے کی خواہشمند ہے یہ علاقہ ڈھائی سو سال سے برطانوی سلطنت میں شامل ہے اور اس سے زیادہ مدت کے لئے ہسپانوی حکومت میں بھی نہیں رہا۔ علاوہ بریں یہاں کے باشندے موجودہ نظام حکومت سے خوش بھی ہیں۔ ان حالات کے ماتحت عقلی طور پر تو اس کی امید نہیں کی جاسکتی کہ ہسپانیہ کی حکومت اس کا مطالبہ کریگی لیکن جذباتی طور پر اس شعلے کے بھڑک اٹھنے کے امکانات کو بالکل قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔

اوپر کے بیانات سے یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ جبل الطارق فوجی حیثیت سے برطانیہ کے لئے بہت ضروری اور اہم بحری اڈا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے مشرق بعید اور بحیرۂ روم کی اہم شاہراہوں کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ غالباً یہ بھی محتاج وضاحت نہیں رہا کہ اس سے اور سلطنتِ برطانیہ کے دوسرے علاقوں سے بہت ہی گہرے تجارتی تعلقات قائم ہوچکے ہیں اور موجودہ حکومت سے یہاں کے باشندوں کے عقیدۂ اطاعت اور وثوق کی بنیادیں کافی مستحکم ہوچکی ہیں۔ جس طرح پچھلے دور میں یہ نوآبادی برطانیہ کے نظامِ حکومت میں فروغ پاتی رہی ہے اُمید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی خاصکر موجودہ جنگِ عالمگیر کے بعد جب بین الاقوامی تعلقات بہتر ہوجائیں گے اور جبل الطارق کی فوجی ضروریات کی اتنی اہمیت باقی نہیں رہے گی اس نوآبادی کی ترقی کی تدبیریں اس سے بہتر طور پر جاری رہیں گی۔

سید عبد المجید

# جنگنامہ ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

(۳)

جنگنامہ کی تاریخی حیثیت کا کچھ اندازہ اس کے خلاصے سے جو اشاعت ماسبق میں مع ضروری اشارات کے پیش کیا گیا ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی تاریخی کتاب خواہ انگریزی ہو یا فارسی دستیاب نہیں ہوتی جسمیں فرخ سیر و جہاندار شاہ کی جنگ میں حصہ لینے والوں کی اتنی کثیر تعداد درج محض فرخ سیر کے رفقا و جاں نثاروں کی تعداد سو سے زیادہ ہے اور ان میں علاوہ سید برادران کے ایک درجن سے زیادہ ایسے حضرات کے نام آئے ہیں جنکے کارناموں کا تذکرہ مستند تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔ جہاندار شاہ کے رفقا کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے لیکن اسمیں وہ سب مشہور ہستیاں شامل ہیں جنکے اس جنگ میں شمول کی شہادت تاریخی اوراق میں پائی جاتی ہے۔ البتہ طرفین کے بہادروں میں دو ایک نام ایسے بھی ہیں جنکا ذکر تاریخوں میں موجود لیکن جنگنامہ میں مفقود ہے ابوالحسن خاں، بخشی عبداللہ خاں جس نے عبدالغفار خاں کی جنگ میں شرکت کی اور رضا قلیخاں داروغہ توپخانہ جسنے اپنے آقا معز الدین جہاندار شاہ پر اس جنگ میں اپنی جان نثار کی، خلاف توقع ہمارے شاعر کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے برعکس جنگنامہ میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ سری دھر عرف مرلی دھر نے اکثر حضرات کے ذاتی و خاندانی تعلقات اور فرخ سیر کے عطا کردہ خطابات سے ہمیں آگاہ کیا ہے اس ضمن میں اس کے بیانات کی صحت میں شک وشبہہ کی بہت کم گنجائش ہے اس لئے کہ انمیں چند ایسے بھی ہیں جنکے باہمی تعلقات اور خطابات کا پتہ تاریخی اوراق میں بھی ملتا ہے۔ شاعر نے طرہ باز۔ دوپٹہ باز۔ شوکد (خوش قد) ساڑھے تین ہاتھ کا قد وغیرہ فقرات سے بعض حضرات کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ اعظم خاں بخشی اس کے بھائیوں اور ہمراہیوں کے آگے بھیجے جانے اور ارسلان خاں کی پیش قدمی کا تذکرہ ہمیں کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ سید عزت خاں کی مناصبت بہار کا ذکر تو اکثر مورخین نے کیا ہے لیکن ابراہیم حسین کا تذکرہ اور اس کے حکومت بھاگلپور پر تقرر کا حال ہمیں سری دھر کے سوا کوئی دوسرا ہم عصر مصنف نہیں بتلاتا۔ فرخ سیر کی پٹنہ سے روانگی اور منزل بہ منزل کوچ کا تفصیلی بیان مسٹر اردن نے اپنی مشہور کتاب متاخرین مغل جلد اول میں جمع کر دیا ہے لیکن چند ایسے مقامات بھی ہیں جن کے متعلق اکثر تفصیلات جنگنامہ ہی میں ملتی ہیں۔ میر جملہ کے خطوط اور شیر دمن داس متوطن سانڈی کی طویل عرضی جنگنامہ کی خصوصیات ہیں

روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی لیکن اصل ہندی کتاب کے تومار چھند کے ۱۲ مصرعوں میں جہاں سے یہہ مفہوم مستخرج ہوتا ہے کسی جگہ پٹنہ کا نام تک نہیں آیا ہے۔ متعلقہ اشعار یہہ ہیں ؂

یہہ حکم کری نشہ وکہت (وقت) دھری چھتر بیٹھے تکہت (تخت) سب شاہ کے ولوج (دلوی جانثار) تب لگے راکھن پہوج (فوج)۔ سجی عبداللہ کہاں۔ کئے پر تہم پہلے کوپ غصہ پابان کوچ (کوچ) ہو بہ رہوام شاہ کو ارشاد۔ پہونچا الہ آباد۔ صوبہ دبہئے سرکار۔ سب کیا عمل ادوار (مضبوط) اچھے وقت میں فرخ سیر نے یہہ حکم دیکر۔ چتر بلند کیا۔ تخت پر بیٹھا۔ بادشاہ کے سب جانثار اب فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ عبداللہ خاں نے بھی تیاری کی۔ غیض میں آکر کوچ کیا۔ بادشاہ کا ارشاد ہوا یہہ الہ آباد پہونچا صوبہ سرکار سب پر دخل جمایا۔ یہہ صحیح ہے کہ اسوقت فرخ سیر پٹنہ میں تھا لیکن یہہ ضروری نہیں کہ اس کے کل ہوا خواہ بھی پٹنہ میں موجود ہوں اور عبداللہ خاں نے پٹنہ سے ہی الہ آباد کا رخ کیا ہو۔ دوسرا اعتراض بھی تمامتر صحیح نہیں۔ دوہرہ چھند کے اول دو مصرعے جسمیں اس کا ذکر ہے یہہ ہیں ؂

خان میر جملہ۔ بیر بدھی (عقلمند)۔ گہیر۔ باہو (بازو) بل سبل (برتا)۔ موڑی رھیو موج دین کی۔ کٹک (فوج) گہی (پکڑا)۔ کرپال (تلوار)۔ موڑی رھیو موج دین کی کٹک کا ترجمہ مسٹر اروِن نے غلط کیا ہے Mir Jumla ... fought Muizzuddin's army موڑی رھیو کے معنی دراصل ملی رھیو یعنی مل کرکے رہا ہیں۔ سنسکرت میں ر ل سے مبدل ہو جاتا ہے اور معنی میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ بابو کرشن داس نے بھی لکھا ہے کہ موڑی رھیو کا مطلب یہہ ہے کہ "میر جملہ میل کرکے معزالدین سے ملگیا تھا اور وہاں سے سماچار فرخ سیر کو لکھتا تھا"۔ اب رہا میر جملہ کی جہاندار سے مخالفت کا واقعہ تو حاشیہ میں عبرت نامہ کی عبارت نقل کی جاچکی ہے۔ خود مسٹر اروِن متاخرین مغل جلد اول صـــ میں لکھتے ہیں کہ شریعت اللہ عرف میر جملہ عظیم الشان کے ساتھ لاہور میں تھا اس کے مرنے پر بنگال جانے اور آقا زادہ (فرخ سیر) سے ملحق ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ جہاندار شاہ کے حکام سد راہ ہوئے اور اکبر آباد (آگرہ) میں اسے روک رکھا ..... اسوقت اس نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر خفیہ طور پر سرداران مغلیہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی چین قلیج خاں اور محمد امین خاں نے اسکی ترغیب سے متاثر ہوکر آمادگی ظاہر کی کہ طرفین میں جب جنگ واقع ہوگی تو یہہ شریک نہ ہونگے۔ یہہ واقعہ ہے کہ ان مغل سرداروں نے اس جنگ میں "تن نداوند" جسکے صلے میں چین قلیج خاں کو نظام الملک کا خطاب ملا اور صوبہ داری دکن عطا ہوئی اور محمد امین خاں اور اس کا بیٹا قمر الدین خاں بخشی دوئم وسوم مقرر ہوئے البتہ عبدالصمد خاں تورانی اس سازش میں شاید شریک نہ تھا۔ تیسرا اعتراض نہایت اہم اور بظاہر ناقابل تاویل معلوم ہوتا ہے۔ حاشیہ میں عرض کیا جاچکا ہے کہ سری دھر کا بتایا ہوا دن۔ بدھ۔ بالکل صحیح ہے تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے۔ سمبت سال ۱۷۶۹ کی صحت میں بھی مطلق شبہہ کی گنجائش نہیں۔ پروفیسر جیکوبی کی تقویم جو

ایپی گرافیکا انڈیکا جلد اوّل میں شایع ہوئی بتاتی ہے کہ سمبت ۶۹، اپورنیما پوس بدھ ۱۱ جنوری ۱۸۱۲ء کے مطابق ہے اور یہی انگریزی تاریخ مسٹر اروِن نے بھی بتائی ہے لہذا ہمارے شاعر نے سمبت سال ہندی مہینے اور تاریخ و دن میں بالکل غلطی نہیں کی البتہ عربی ماہ و سال و تاریخ یقیناً غلط ہیں اگر کتابت کی غلطی کی بنا پر ۲۳ کو ۲۲ سمجھا جائے۔ تب بھی ایک سال کی کمی رہجاتی ہے اور محرم کا مہینہ تو کسی صورت سے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خفی خاں۔ شاہنواز خاں اور محمد علی انصاری جیسے مورخین نے بھی ۱۱۲۴ ہجری بتا کر ٹھوکر کھائی ہے ۲۳ ماہ الٰہی آذر بھی صحیح نہیں خفی خاں ۱۹ اور مسٹر اروِن ۲۲ ماہ الٰہی قرار دیتے ہیں الغرض ہمارے ہندو شاعر سے اسلامی تاریخوں کے بتانے میں یقیناً چوک ہوگئی ہے لیکن ہندی تاریخیں صحیح ہیں لہذا محض اس فروگذاشت کی بنا پر ہم جنگنامہ کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کرسکتے۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کی ادبی اور لسانی خصوصیات سے بھی ناظرین معاصر کو روشناس کرایا جائے۔ ہندی نقادنے تیرھویں سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے شاعروں کو تین طبقوں میں منقسم کیا ہے۔ چارن۔ بھگتی۔ ریتی۔ پہلے طبقے میں بھاٹ شاعروں کے گروہ داخل ہیں بھاٹوں کی رزمیہ شاعری نے ہندی ادب میں چار چاند لگائے ہیں۔ اس میں بیر رس (بہادرانہ جذبات) کی فراوانی ہوتی ہے اس کی زبان میں اوج یعنی زور و شوار ترک بھڑک ہوتی ہے ادب میں اسکی ڈینگل بھاشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری قسم بھگتی شاعروں کی ہے ان کے دو گروہ ہیں ایک بزرگوں دوسرے شگون اول الذکر اوتار کے قائل نہیں ہوتے اور تمام عقیدے کے خلاف خدا کو تشبیہ و تجسّم سے منزہ قرار دیتے ہیں جیسے کبیر جائسی وغیرہ اور آخر الذکر مورتی پوجا اور پورانی روایات کو عقیدتاً تسلیم کرتے ہیں جیسے تلسی داس سورداس وغیرہ۔ بھگتی شاعری کو پنگل بھاشا کہتے ہیں کیونکہ اس کا طرز ادا نہایت نرم پاکیزہ۔ دل آویز اور دلگداز ہوا کرتا ہے۔ اخلاق معرفت و تصوف بھگتی شاعری کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔ ریتی شاعری میں عشقیہ مضامین کا عنصر غالب ہوتا ہے اور قواعد عروض شاعرانہ نکات ندرت ترکیب دقت مضامین پر خاص توجہ رہتی ہے۔ خیالات سے زیادہ زبان کی نفاست پر زور دیا جاتا ہے رحیم بہاری وغیرہ اس زمرہ میں شامل ہیں سری دھر عرف مرلی دھر کا تعلق پہلے طبقے سے ہے۔ ہندی کے مشاہیر شعرا میں اس کا شمار نہیں کیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس کی تصنیفات منظر عام پر نہ آئیں اسکی شاعرانہ خصوصیات کا کما حقہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ محض جنگنامہ شایع ہوا لیکن جیسا پہلے عرض کیا گیا شائد نامطبوع موضوع کے کیوجہ سے اس کی ایسی ناقدری ہوئی کہ سوا ایک نسخے کے دوسرے کا پتہ تک نہیں ملتا اور جن ہندی نقاد اور تذکرہ نگاروں نے اس کے مصنف پر توجہ کی ضرورت سمجھی انہوں نے بھی شائد اصل کتاب کے مطالعہ کی زحمت

# مطبوعاتِ جدیدہ

گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو: مصنفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، صفحات ۱۲۹۔ تقطیع ۷×۵ انچ، قیمت عہ، شائع کردہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن۔ مصنف نے ۱۹۳۱ء میں گارساں دتاسی پر ایک مقالہ ہندوستانی میں چھپوایا تھا اور اسی زمانے میں اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا تھا۔ نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد وہی مقالہ کتابی صورت میں دوسری بار طبع ہوا ہے۔ کتاب کے ۱۰ صفحے دو دیباچوں نے لے لیے ہیں، ۸۰ صفحوں میں دتاسی اور باقی صفحات میں "اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو" کا ذکر ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ کہ یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جس میں دتاسی کی زندگی اور اس کے کارناموں سے بحث کی گئی ہے، غالباً صحیح ہے، لیکن افسوس ہے کہ سرسری طور پر لکھی گئی ہے۔ دتاسی کے کارناموں کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں اس سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ واقعات کے بیان میں بھی مصنف سے بعض ایسی فاحش غلطیاں ہوئی ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ناظرین نے سطورِ ذیل کے ملاحظے کی زحمت گوارا کی تو انھیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری رائے کس حد تک صحیح ہے:

(۱) "فرانسیسی علما اس کی مشکلات اور کام کی خوبی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی" کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی یعنی ۱۸۳۸ء میں گارساں دتاسی کو فرنچ اکیڈمی کا رکن بنا لیا۔ یہ وہ عزت ہے جو فرانس میں بہت کم ادیبوں اور محققوں کو اس عمر میں حاصل ہوتی ہے" ص۱۸۔ اس نام کی کوئی علمی یا ادبی انجمن فرانس میں نہیں۔ بہ ظاہر مصنف کی مراد اکادمی فرانسیز سے ہے۔ جس کا مصنف نے انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اکادمی میں مستشرقین کے لیے خواہ ان کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، کوئی جگہ نہیں۔ اس کے ارکان کی تعداد مقرر ہے اور وہی اصحاب اس کے رکن ہو سکتے ہیں جو ارکانِ اکادمی کی رائے میں اعلیٰ درجے کے ادیب ہوں۔ دتاسی جو فرانسیسی زبان کا تیسرے درجے کا ادیب بھی نہیں، اکادمی کا رکن کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ مصنف کے قول کے مطابق وہ ۱۸۳۸ء ہی میں رکن ہو چکا تھا، لیکن دتاسی کی ایک کتاب سے جو ۱۸۴۵ء کی شائع شدہ ہے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کے سرورق پر وہ اعزازات درج ہیں جو دتاسی کو اس وقت تک حاصل ہوئے تھے۔ وہ اکادمی کا رکن ہوتا تو ناممکن ہے کہ اس کا ذکر نہ ہوتا۔

(۲) مصنف نے ص۱۳ پر لکھا ہے کہ دتاسی کا "conseils auxmauvais poetes" میر کے "اژدر نامہ" کا ترجمہ ہے۔ خود دتاسی کا قول ہے کہ یہ "تنبیہ الجہال" (کسرہ دتاسی کا ہے) کا ترجمہ ہے۔ "تنبیہ الجہال" "اژدرنامہ" سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ میر مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور ۱۸۹۲ء ص۶۰۶ و ص۶۰۵

(۳) مصنف کا بیان ہے کہ (صفحہ ۱۹ و صفحہ ۲۴) کریم الدین کا طبقات الشعرا جو سنہ ۱۸۵۲ء میں شایع ہوا تھا دتاسی کی تاریخ ادبیات کا ترجمہ ہے۔ لیکن دتاسی تاریخ ادبیات طبع ثانی جلد اول (صفحہ ۱۰) میں اس دعوے سے بحث کرتے ہوئے کہ طبقات اُس کی کتاب کا ترجمہ ہے لکھتا ہے:

"Cest untravail tout a fait distinct"

(۴) مصنف کا قول ہے کہ تاریخ ادبیات کے تین ایڈیشن نکلے، آخری ایڈیشن کا سنہ اشاعت سنہ ۱۸۷۰ء تھا۔ سنہ ۱۸۷۱ء کی اشاعت ہمارے سامنے ہے، اس کے سرورق پر جلی قلم سے Seconde Edition لکھا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود مصنف نے صفحہ ۱۷ پر سنہ ۱۸۷۰ء کی اشاعت کو دوسرا ایڈیشن قرار دیا ہے۔

(۵) تذکرۂ فتح علی حسینی گردیزی کا نام کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اس کے ساتھ سنہ ۱۱۵۲ھ مرقوم ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا گردیزی سے کیا تعلق ہے۔ نہ گردیزی اس سال پیدا ہوا نہ اس سال مرا، اور نہ اُس نے اس سال میں اپنا تذکرہ لکھا۔

(۶) مصنف کا بیان ہے کہ "اس کی آخری کوشش "مسلمانوں کے نام اور خطاب" کے نام سے شائع ہوئی، آخری عمر میں اسلام اور مسلمانوں پر کام کرنے میں مصروف تھا۔" صفحہ ۲۵ مصنف نے اس کا سال اشاعت ۱۸۷۸ء بتایا ہے لیکن انھیں اس کی خبر نہیں کہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۵۴ء ہی میں شائع ہو چکا تھا (ملاحظہ لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد ۲ از گریرسن صفحہ ۱۴)

(۷) مصنف کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اُنھوں نے صفحہ ۲۲ سے صفحہ ۲۴ تک دتاسی کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے وہ اُن کے نزدیک مکمل ہے۔ کم از کم کوئی اہم کتاب مصنف کی ایسی نہیں جو اس میں داخل نہ ہو، لیکن اس فہرست میں بعض اہم کتابوں کے نام نہیں۔ مثلاً تاریخ شیر شاہی مصنفہ عباس بن علی سروانی جس کے اردو ترجمے کو دتاسی نے فرانسیسی میں منتقل کیا تھا۔ (تاریخ ادبیات جلد ا صفحہ ۳)

(۸) "دتاسی کی نظر سے ایک اردو ڈراما گزرا... اس نے غور سے پڑھا، اور... اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا صفحہ ۲۴ جو سنہ ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا صفحہ ۲۲ افسوس ہے کہ مصنف نے اس ڈرامے کو غور سے پڑھنے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا، ورنہ اُن کا بیان اس کی نسبت اس قدر مجمل نہ ہوتا۔

(۹) "دتاسی کی کتاب کی سب سے زیادہ مفید خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک سائنٹفک تاریخ ادبیات اردو ہے۔ ہمارے تذکرہ نویس شاعروں کے اصل حالاتِ زندگی اور خصوصاً اُن کی تاریخ پیدائش یا کتابوں کے سنین تصنیف کے اظہار میں ہمیشہ غافل رہے ہیں... ان تاریخوں وغیرہ کے لحاظ سے تو دتاسی کا یہ کام بے حد قابل قدر ہے" صفحہ ۱۰ دتاسی کی کتاب کو تاریخ کہنا ہی غلطی ہے، اصولی حیثیت سے اس میں اور خم خانۂ جاوید میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح خم خانۂ جاوید میں شعرا کے حالات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں، دتاسی کی کتاب میں بھی ہیں۔ اتنا اختلاف البتہ ہے کہ دتاسی کے یہاں شعرا کے علاوہ ناثروں کا بھی ذکر ہے۔ اور اردو ہندی دونوں کے مصنفین سے بحث کی گئی ہے۔ ابتدائے کتاب میں جو ۱۰ صفحوں کا مقدمہ ہے وہ بے شمار فاحش اغلاط سے مملو ہے، اور محض اُس کی بنا پر دتاسی کی کتاب کو تاریخ نہیں

کہا جا سکتا۔ سنین وفات وغیرہ دتاسی نے جہاں ہوسکا ہے دیے ہیں، لیکن عموماً تحقیق سے کوئی کام نہیں لیا
خواجہ میر درد اُردو کے مشہور ترین شاعروں میں ہیں اور ان کے سنہ وفات کے متعلق صحیح روایات
موجود ہیں، اس میں اختلاف کی مطلق گنجایش نہیں۔ دتاسی (جلد ۱ ص ۱۲۱) بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اُس کے
بیانات کہاں کہاں سے ماخوذ ہیں لکھتا ہے "سنہ ۱۲۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے سنین وفات
سنہ ۱۱۹۶ھ، سنہ ۱۱۹۹ھ اور سنہ ۱۲۰۱ھ بتائے ہیں" دتاسی نے سنہ ۱۲۰۹ھ کو دوسرے سنین پر ترجیح دی ہے۔ صحیح سال
وفات سنہ ۱۱۹۹ھ ہے۔ ایسے سنین کے دینے سے نہ دینا بہتر۔

( ) "گو اس میں (تاریخ ادبیات) بعض جگہ غلطیاں دکھائی دیتی ہیں، لیکن اُس زمانے کی معلومات کے
لحاظ سے ان غلطیوں کا پایا جانا ایک فطری بات تھی" ص ۱ اگر مصنف یہ بتائیں کہ اُن کے نزدیک دتاسی
کی کتاب میں زیادہ سے زیادہ کتنی غلطیاں ہوں گی تو یہ ثابت کر دینا کہ اس سے وہ چند غلطیاں اس میں
ہیں، ہمارے ذمے۔ دتاسی اُردو اور دوسری مشرقی زبانوں سے مبصرانہ واقفیت نہیں رکھتا، نہ وہ ان
زبانوں کے طرز بیان کی خصوصیات سے آگاہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیے سے مطلق ناآشنا ہے، مختلف فیہ
مسائل میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے حوالے غلط دیتا ہے اور اس کے
بیانات میں تناقض بھی ہے۔ ہم محض چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں، ناظرین اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کی
غلطیاں ہیں: (الف) جلد ۱ ص ۲۳ "عاشق: شیخ رکن الدین عرف مرزا کھنیا، دہلی میں پیدا ہوئے اور عظیم آباد میں
اقامت اختیار کی۔ گردیزی نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر ہندوستانی شعرا کے زمرے میں کیا ہے" اس بیان میں تین
غلطیاں ہیں: تخلص عشق    اور عرف مرزا گھسیٹا تھا۔ گردیزی نے اپنے تذکرے میں ان کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دتاسی کے پاس کوئی نسخہ ایسا ہوگا جو متداول نسخوں سے مختلف ہو، اس لیے کہ وہ اصل
نسخہ جس کی نقل دتاسی نے ہندوستان سے حاصل کی تھی ہماری نظر سے گزرا ہے (ب) جلد ۱ ص ۱۲۱ کلیان سنگھ
عاشق کی نسبت بھی یہ قول کہ گردیزی نے اُس کا ذکر کیا ہے صحیح نہیں (ج) جلد ۲ ص ۲؟ عشقی عظیم آبادی صاحب
تذکرہ کا نام رحمت اللہ لکھ دیا ہے۔ رحمت اللہ عشقی بالکل دوسرا شخص ہے۔ کسی تذکرہ نگار نے ان دونوں کو ایک
نہیں کیا۔ (د) جلد ۳ ص ۱ میر سعادت علی سعادت کو (جن کا انتقال تذکرۂ میر اور تذکرۂ قائم کی تالیف سے قبل
ہو چکا تھا) خلف عشرت بریلوی، شاگرد لطف لکھا ہے، حالانکہ دونوں کے زمانوں میں اسّی نوّے برس کا فرق ہے (ہ)
جلد ۱ ص ۲ جان صاحب مشہور ریختی گو کے متعلق دتاسی کا خیال ہے کہ وہ ایک فرخ آباد کی رہنے والی عورت تھی
(و) جلد ۱ ص ۲۹ و ۷ مثنوی قولِ غمیں مصنفہ مومن کو معز اللہ خاں کی تصنیف بتاتا ہے۔ غالباً کسی تذکرہ نگار نے
مومن کا ذکر کرنے کے بعد اُن کی طرف اشارہ کرنے کے لیے "خان معزی الیہ" لکھا ہوگا، دتاسی سمجھا کہ یہ کسی شاعر کا
نام ہے۔

مصنف نے دیباچے میں ڈاکٹر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے۔ خطبات دتاسی کے مقدمے میں دتاسی کے حالات مصنف کے مقالے سے لے کر درج کیے، لیکن، اس کا اعتراف نہیں کیا، اس کے بعد توقع تھی کہ کم از کم اس کتاب میں تو کوئی بیان ایسا نہ ہوگا جس کا حوالہ موجود نہ ہو؛ لیکن افسوس ہے کہ کتاب کے اُس حصے میں جو دتاسی سے متعلق ہے حوالے مطلق نہیں ملتے۔ ہم خاص طور پر یہ جاننے کے مشتاق ہیں کہ دتاسی کے بارے میں مصنف کا یہ قول کہ وہ اکادمی کا رکن تھا، کہاں سے ماخوذ ہے! ۔ ۹

ہماری قومی زبان: از سر تیج بہادر سپرو صفحات ۹۵ + تقطیع ۶×۴ ½ انچ، قیمت ۸، شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند

سر تیج بہادر سپرو نے مختلف مواقع پر اردو سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انھیں اس کتاب میں یک جا کر دیا گیا ہے، ان کی جو اہمیت ہے وہ زیادہ تر اس بنا پر ہے کہ ان کا ظاہر کرنے والا ایک سربرآوردہ ہندو ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے چند صفحوں میں سر تیج بہادر سپرو کا تعارف کرایا ہے، اس میں قصیدے کی شان پیدا ہوگئی ہے سر تیج بہادر سپرو نے ایک موقع پر (صفحہ ۲۷) یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "بعض اصحاب ایک نئی زبان ہندستانی کے رواج دینے پر تُلے ہوئے ہیں، میں نے اس کی اکثر شکایت کی ہے اور اب بھی اس کا اظہار کرتا ہوں کہ اس کے رواج دینے میں ڈاکٹر عبدالحق نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔ ہندستانی کوئی زبان نہیں۔ اس کا کچھ مطلب نہیں، تامل، تیلگو، بنگلہ گجراتی اور دوسری زبانیں بھی ہندوستانی کہی جا سکتی ہیں اگر ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جو میر، سودا غالب، اور آتش و ناسخ نے لکھی ہے اور جو پچاس برس پہلے یا اس کے بعد دہلی میں بولی جاتی تھی اور لکھنؤ میں رائج ہے تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ... ہندستانی کا کیا مطلب؟ میں ڈاکٹر عبدالحق سے پھر سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کا مطلب سمجھائیں"۔

سر تیج بہادر سپرو نے پائلیٹ کی طرح صرف سوال پر قناعت کی کاش وہ اس کا جواب بھی حاصل کرتے۔ سر تیج بہادر سپرو نے (صفحہ ۱۶) لکھا ہے کہ پروفیسر براؤن نے اس سوال کے جواب میں کہ ایران میں کس ہندستانی شاعر کی قدر کی گئی، صرف خسرو کا نام لیا، اور اُس پر یہ کہا کہ گو خسرو ہندوستانی تھے، یعنی یہ کہ ہندستان میں رہے اور وہیں انھوں نے انتقال کیا، لیکن نسل اُن کی ہندستانی نہ تھی" صفحہ پر اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ براؤن نے خسرو اور غنی دونوں کا نام لیا۔ یہ واقعہ دراصل کس طرح ہے؟ ۹

---

ے اعزازات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس میں انجمن اردو لاہور اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی رکنیت بھی شامل ہے۔ عـہ طبع ثانی صـ "یہ ایک بالکل الگ کتاب ہے" المعہ اس سلسلے میں خطبات دتاسی کا تبصرہ معیار بانکی پور میں دیکھا جائے۔

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدّین احمد

دائرہ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

| جلد ۴ | جولائی سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۳ |
|---|---|---|

| مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|
| روایات | محمد فضل الرحمن | ۱ |
| اردو زبان اور داستان گوئی | کلیم الدین احمد | ۱۳ |
| اسعد الاخبار، آگرہ | قاضی عبد الودود | ۲۰ |
| یادگزشتگاں | آزاد عظیم آبادی | ۳۰ |
| غیرت | سید نصیر حیدر نصیر | ۳۱ |
| لطیفہ | محمد زبیر انصاری | ۳۶ |
| کلام شایستہ | قاضی عبد الودود | ۴۰ |
| ایک دلچسپ توارد | عندلیب شادانی | ۴۱ |
| مطبوعات جدیدہ | مسعود عالم ندوی | ۴۵ |
| دیوان رضا | رضا عظیم آبادی (مرحوم) | ۲۵ تا ۳۲ |

چندہ سالانہ للعہ — فی پرچہ ۶ر

# روایات

شاید دنیا میں کوئی چیز اس قدر تغیر پسند نہیں جتنا یورپ میں عورتوں کے لباس کے فیشن ہر ہفتہ مصوّر اخبارات اور رسالوں میں نسوانی ٹوپیوں کی عجیب و غریب اور انوکھی تصویریں نکلتی رہتی ہیں اور شاید دنیا کی پوری سیاسی تاریخ میں اتنے انقلابات نہیں ہوئے جتنے عورتوں کے فیشن میں ایک سال میں وقوع پذیر ہوتے ہیں یہ فیشن ایک بڑی حد تک عورتوں کی جدت طرازی کی خواہش پر مبنی ہیں۔ لباس میں تقلید کا جذبہ عورتوں میں بالکل نہیں ہوتا۔ ظاہری صورت میں ہر ایک بے نظیری کا نمونہ پیش کرنا چاہتی ہے اور یہ ان کی فطری اُپج کے اظہار کی ایک شکل ہے۔ ایک حد تک اس میں جمالیاتی جذبات کا بھی لگاؤ رہتا ہے، لیکن بالعموم حسن کو بے مثالی پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کے لباس میں رنگ، تراش، وضع وغیرہ میں ترمیم کی بہت گنجایش رہتی ہے اس لئے بیک وقت ان میں بوقلمونی اور بو قلمونی کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ باوجود اس جدت پسندی کے بہت کم عورتیں ہیں جنکے لباس سے مذاقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ یا تو رنگ ایسا ہوتا ہے جو انہیں زیب نہیں دیتا یا تراش میں اپنے قدو قامت اور ڈیل ڈول کا لحاظ نہیں رہتا یا ہیٹ بدنوا رہ نظر آتا ہے۔ غرضکہ بالعموم جدّت طرازی اور مناسبت میں مماثلت نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں بے ذوقی کا ثبوت ضرور پیش ہوتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ لباس کی اصلی اور اساسی ماہیت میں زیادہ تبدل نہیں ہوتا۔ ایرپھیر ... بی جوتے، موزے، گون، بلاوز، ہیٹ ہی بہروپیوں کی طرح نئے نئے سوانگ بھر کر سامنے آتے ہیں لوازمات لباس میں درصل ایک بنیادی قدامت پسندی اور روایات کی تقلید سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ زندگی کے ہر رخ میں بنیادی چیزیں جو سالہا سال کے تجربات پر قائم ہیں بہت ہی سادہ اور عام ہوتی ہیں۔

اس مضمون کا مقصد ہرگز صنف نازک پر اعتراض نہیں۔ خدا اُن کا بھلا کرے، اگر وہ روز بیٹھ کر اپنی زینت اور آرائش کے لئے نئی نئی تدبیریں نہ کریں تو دنیا نہایت ہی پھیکی اور بے مزہ ہو جائے۔ یہ ان کی جبلی فطرت ہے اور اس میں قدرت کا بڑا راز مضمر ہے مقصد درصل بعض ادبی مشاہدات کے لئے ایک تمثیل پیش کرنا ہے۔ مصوروں اور شاعروں کی طبیعت مستورات جیسی حساس اور سیمابی ہوتی ہے۔ انھیں بھی جدت طرازی سے بہت شغف ہوتا ہے اور وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ہمیشہ نئی اور انوکھی راہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ہر بڑا شاعر اپنے ماحول کے خیالات درسومات سے مدد لیتا ہے۔ اور مروجہ زبان سے نئی نئی اور نادر ترکیبیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن مدعائے شاعری آج بھی وہی ہے جو آج سے تین ہزار برس پہلے تھا۔

اور شاعری اور فنون لطیفہ کے اصولی قوانین تمام دنیائے شاعری اور فنون لطیفہ کے لئے ایک ہی ہیں
ہاں، بعض دور میں یا کسی تمدن میں یا تو صحیح روایات کے فقدان کی وجہ سے یا معاشرتی اور تخیلی کمزوری
کی بنا پر یا شاعر کی جذباتی بدنظمی یا خامی کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اعلیٰ طرح کی شاعری کے بجائے
نہایت ہی بے جان یا سطحی طرح کی شاعری تخلیق کی جاتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس ملک یا دور میں
تنقید بھی جزوی اور سطحی عناصر میں الجھ کر اصولی چیزوں کو پس انداز کر دیتی ہے۔ اسی امر کو ہمارے
ہمعصر نقاد اکثر نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کا خیال ہوتا ہے کہ چونکہ اُن کے ملک یا زبان کے شعرا میں بعض
روایات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لئے وہ معیاری چیزیں ہیں اور پھر وہ کسی دوسرے معیار کو خاطر
میں نہیں لاتے وہ یہ نہیں کہتے کہ جذبات کی صورت اور اُن کے علامات مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں۔
وہ شاید یہ کبھی نہ کہیں گے کہ غم یا خوشی یا غصّہ کا اظہار مختلف ممالک میں بالکل مختلف طرح سے ہوتا ہے۔
لیکن اگر انہیں جذبات کا اظہار زبان کے واسطہ سے کیا جائے تو پھر وہ کہتے ہیں کہ مغرب کے اصولِ اظہار
دوسرے ہیں۔ مشرق کے دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ کسی الہامی وسیلہ سے ہندوستان میں جذبات کے اظہار کا
دوسرا سامان کیا گیا اور مافوق العادت طریقہ پر ایک نئے مذہب شاعری کی ایجاد ہوئی۔ کسی نقاد کے
خیالات کا قطعی رد نہ کرکے اُس پر مغرب زدگی کا الزام لگانا اور یہ سمجھنا کہ اس کے اعتراضات کا جواب طعنہ زنی
سے ہوگیا اپنی تنگ نظری اور اپنے تخیلات کے محدود اور شور ہونے کی دلیل پیش کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ
بعض ممالک شاعری کے لئے زیادہ زرخیز واقع ہوئے ہیں اور بعض کم۔ لیکن زرخیز ملک میں بھی عمدہ شاعری
بہت نایاب ہوتی ہے۔ اگر کوئی مغربی اصول نقد ہندوستان میں نقاد یا شاعر کی رہبری کے لئے پیش کرتا ہے
تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ انگلستان یا فرانس کے ہر شاعر کا دلدادہ ہے۔ ان ممالک میں بھی ہزاروں شعرا
ہیں جو اکثر سطحی قوانین شاعری کو اخذ اور استعمال کرتے ہیں اور انکی شاعری صرف ردیف و قافیہ کی
صحت تک محدود ہے۔ مثلاً الفرڈ نوائس اور مارٹن آرمسٹرونگ کو شاعر سمجھنے کے بعد کوئی کارآمد اور
تخلیقی تنقید ناممکن ہے۔ یہ ان کا اہم نقص ہے کہ نہ تو انہوں نے انگلستان کی ادبی روایات سے جائز
مصرف لیا نہ اپنے جذبات کے نقائص کو سمجھ سکے، نہ انہیں اپنی زبان سے زندہ دلچسپی رہی نہ انہوں نے
اپنے ماحول سے صحیح اور تخلیقی عناصر کو منتخب کیا۔ غرض کہ نہ شاعری بہت آسان ہے نہ فنِ نقد۔

روایات سے افادہ لینے کے معنی ہرگز پرانے مصوروں یا شعرا کی کورانہ تقلید نہیں۔ اگر
اس کا مفہوم صرف نقالی ہو تو اس سے زیادہ مضر شئے فنونِ لطیفہ کے حق میں اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور اگر
نظرِ بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماحول کے طرز خیال اور رسومات سے اسی بے دماغی سے مصرف
لینا بھی ویسا ہی مضر اور بے ثمر ہوتا ہے جیسا کہ روایات کا بیجا اتباع۔ غرضکہ روایات یا ماحول سے تخلیقی
اور مفید مصرف لینا شاعر کی ذہنی کیفیت پر منحصر ہے اور ان میں شاعر کے نقطۂ نظر سے دراصل اس قدر

فرق نہیں جیسا لوگ عموماً سمجھتے ہیں، ہر دور میں ماحول کے خیالات اور عقاید اور معاشرتی زندگی اور شاعر کی ذہنیت کے درمیان ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو دراصل ہر عہد میں قریب قریب ایک ہی ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے عہد کے اکثر مسائل کی عقدہ کشائی کرنی ہوتی ہے اور وہ ہمعصر خیالات پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے۔ اس میں اسے اپنی فطری اپج سے کام لینا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ماضی کے بڑے شعرا جنہوں نے کامیابی کے ساتھ ایسے ہی مسائل کو حل کیا اُن پر اپنی ذاتی اور تنقیدی رائے زنی کی انسان کی راہبری کرتے ہیں۔ ہر عہد کے شاعر کو طریق عمل کے مسئلہ میں قبل کے شاعروں سے مدد ملتی ہے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ اُن کے ادبی کارنامے تسلیم شدہ ہیں اور نسلوں کے تجربات کی کسوٹی پر پرکھے جاچکے ہیں۔ ہمعصر ادبا اور شعرا کے متعلق تیقن سے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس طرح کی فنی اہمیت رکھتے ہیں چونکہ ان کے کلام میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو ہمیں دلچسپ اور ضروری معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ دراصل ہمارے عہد کی فوری دلچسپی کی چیزیں ہوتی ہیں اور شاعری کے دوامی عناصر سے غیر متعلق۔ بہت سے شعرا ہیں جن کے بارے میں ان کے ہمعصر نقادوں نے بڑے بڑے ادبی دعوے کئے لیکن جنہیں یا تو آج کوئی جانتا نہیں یا جنکی فنی کمزوریاں ہم پر بہت ہی عیاں ہیں۔ کولرج جیسے صاحب بصیرت نقاد نے سدے (Southey) کی شاعری کو ملٹن اور دیگر بڑے شعرا کے کلام کے متوازن بتایا، آج سدے کو صرف بد مذاق لوگ ہی شاعر سمجھ سکتے ہیں۔ طریقت شاعری میں قدما کی رہبری اس لئے زیادہ مفید اور بارآور ثابت ہوتی ہے۔

روایات کی اہمیت غالباً شاعر کے اپنے ذاتی تجربات کی اصلیت سمجھنے سے زیادہ معلوم ہوگی عام خیال میں ماضی کا اطلاق بوسیدہ اور کہنہ خیالات، رسومات اور اشیا پر ہوتا ہے۔ لیکن دراصل حال ایک نہایت ہی عارضی کیفیت کا نام ہے کیونکہ ہر لمحہ، ہر آن ہر پل حال ماضی میں مبدل اور اس کی ریاست میں پیوست ہوتا جاتا ہے۔ حال تو دراصل ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک بہت ہی باریک خط کا نام ہے جو برابر ماضی سے مستقبل کی طرف بڑھتا رہتا ہے جس کے معنی ہیں کہ ہر سکنڈ مستقبل ماضی میں بدلتا رہتا ہے۔ زمانۂ حال میں ہم صرف چند احساسات اور مشاہدات کو جذب کرتے ہیں۔ ہمارے حواسِ خمسہ عالم مظاہرات کے اثرات کو ہمارے دماغ تک ہر وقت پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن جب تک اِن اثرات کی ایک مسلسل اور بامعنی زنجیر تیار نہ ہوجائے یہ دراصل کوئی تجرباتی وقعت نہیں رکھتے، حال کے واردات جب تک ماضی کے تجربات نہ بن جائیں عالم فن میں کسی طرح کارآمد نہیں ہوسکتے کیونکہ تجربات صرف تکمیل پانے کے بعد کیمیائے فن کے وسیلے سے شاہکار کی صورت میں جلوہ گر ہوسکتے ہیں۔ جب تک کوئی جذبہ یا تجربہ ہم پر گذرتا رہتا ہے شاعری کا موضوع نہیں بن سکتا کیونکہ یہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے تخلیقی عمل میں اپنے تجربات کو ایک آزاد شکل دے سکے یعنی وہ اُسے اپنی شخصیت سے علحدہ کرسکے۔ مجسمہ تراش کو سنگ مرمر کی ناتراشیدہ چٹان کے امکانات کو عملِ فن میں پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے حدود سے باہر نہیں جاسکتا۔ اسی طرح شاعر کو

ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبہ کو تول سکے اور اس کے امکانات کو سمجھ سکے اور یہ ممکن نہیں جب تک
جذبہ تکمیل پا کر ختم نہ ہو جائے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ شاعر کے اپنے تجربات اور اُن روایات میں جن سے وہ سبق لیتا ہے اور جو
اس کے تخیل اور ادراک کی نشوونما کرتے ہیں اور اُن کے عناصر بن جاتے ہیں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ماضی
کی چیزیں ہیں، ایک ذاتی اور دوسری (ایک حد تک خارجی (ایک حد تک اس لئے کہ دراصل وہ روایات جن سے
شاعر کو عمل تخلیق میں مدد ملتی ہے اُس کے تجربات کے اجزا ہیں) دونوں میں جو فصل ہے وہ عرصہ کا ہے۔ ایک
زیادہ مدت کا ہوتا ہے دوسرا کم مدت کا۔ دور اور عہد کا فرق ہوتا ہے اور بس

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے کہ تمدن میں جو کچھ ارتقا ہوتا ہے خواہ وہ
مادی ہو یا ذہنی اور دماغی اُس کا جذبات کی حقیقت اور فطرت پر کوئی ایسا بڑا انقلابی اثر نہیں پڑتا۔ جذبات
وہی رہتے ہیں جو کاوش آج کا سائنسداں کسی انقلابی ایجاد میں کرتا ہے اور جیسی امیدیں اسے عمل کے نتیجہ سے
وابستہ رہتی ہیں وہی کاوش اور وہی اُمیدیں قرون وسطیٰ کے کیمیاگروں میں نظر آئیں گی۔ آج سے چار ہزار سال
قبل ایک مصری بچہ مٹی کے کھلونے پا کر خوش ہوتا تھا۔ آج جاپان اور جرمنی کے متحرک مکانکی کھلونے پا کر ہندوستانی
بچے کو اسی طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ نہ اس کی عقل بڑھی ہے نہ اُس کی خوشی دوسری طرح کی ہو گئی ہے، نہ اُسے
اس بات کا احساس ہے کہ مٹی کے کھلونے مکانکی کھلونوں سے کم دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ قدیم مصری
بچے کے جذبات آج کے ہندوستانی بچے کے جذبات سے اس لئے جداگانہ ہیں کہ کھلونے بدل گئے ہیں اور ان میں
ارتقا ہوا ہے مہمل ہے۔

جذبات کا جو تعلق آرٹ کے ساتھ ہے اس کی وضاحت ضروری نہیں اس لئے اس بحث کو طول دینا
بیکار ہوگا۔ صرف ایک موٹی سی بات قابل غور ہے جو ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ معشوق کے تیر نظر نے
عاشق کے دل کو محمل ناقہ سے گھایل کیا یا کار کی پچھلی سیٹ سے بالکل جزئی اور غیر اہم تفصیل ہے دل کا گھایل
ہونا اہم ہے اگر واقعی گھایل ہوا ہو۔ اگر لیلےٰ کے زمانہ میں موٹر کار ہوتی اور اسے اسکی استعداد ہوتی کہ ایک
فورڈ ہی رکھ سکے تو محمل اور ناقہ کا قصہ ہی نہ آتا۔ کار کا رہنا اور نہ رہنا تو زمانہ کے انقلابات کا ایک ادنیٰ سا
کرشمہ ہے۔ شاعری میں اس کے ایک رسمی استعمال سے نہ شاعر کی اپج کا پتہ چلتا ہے نہ تخیل کا۔ ہاں لیلےٰ
اور مجنوں کے قصہ اور آج کی بعض نئی شاعری میں یہ فرق ضرور ہے کہ اگلے قصہ میں تخیل اور جذبہ دونوں سے
کام لیا گیا ہے۔ آج کی بعض مقبول شاعری میں دونوں مفقود ہیں کیونکہ دراصل اشعار تجربات بلکہ لیلےٰ مجنوں کے
پامال استعارات کو ذرا بھیس بدل کر پیش کر رہے ہیں۔ اگر دل دراصل گھایل ہوتا تو پھر آج بھی محمل اور ناقہ
سے وہ اثر پیدا ہو سکتا جو جذبات کی غیر موجودگی میں رولس رائس میں ممکن نہیں۔

ایک اور مثال غالباً بے جا نہ ہوگی۔ سترہویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر مارول [illegible]

اپنی اور اپنے محبوب کی محبت کو متوازی خطوط سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ سے اشعار میں نہ صرف ندرت اور اپج پیدا ہوگئی ہے بلکہ ان میں اس عہد کے بعض خاص طرزِ تخیل کی عکاسی ہوئی ہے۔ ماحول کا پورا اثر ان اشعار پر صرف اس تشبیہ سے پیدا ہوگیا ہے اور اس قسم کی ذہنیت سترہویں صدی کے ماقبل انگریزی شاعری میں بالکل نہیں نظر آتی۔ لیکن خطوط متوازی کی تعریف اقلیدس کے وقت سے چلی آرہی ہے اور عہد روما میں اسکول کے لڑکے اس سے کافی طور پر واقف تھے۔ غرضکہ ماحول کا اثر موثر اور ردیل کو اشعار میں ٹھونسنے سے ثابت نہیں ہوتا۔ روایاتی، معمولی یا عام فہم چیزیں شاعر کے ذاتی احساسات و ادراک و زیرکی سے کیمیائی تغیرات قبول کرکے نئی اور نادر صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ اگر یہ صفات شاعر میں نہ ہوں تو وہ سائنس کے جدید ترین ایجادات کا اپنی شاعری میں بھرمار کردے اور علم النفس کے تازہ ترین انکشافات کو کام میں لائے لیکن کسی صاحب بصیرت کو اس کی شاعری میں نہ ندرت معلوم ہوگی نہ تازگی نہ حقیقت بلکہ کہنہ اور لایعنی معلوم ہوگی۔

شاعری زبان پر موقوف ہے، اور زبان کے معنی نہ صرف الفاظ اور ان کے بدلنے والے معانی ہیں بلکہ ان کا التزام اور نظم۔ شاعر الفاظ سے نئے توالیف پیدا کرتا ہے اور اپنے خاص معانی میں استعمال کرتا ہے ایک حد تک تغیر و تبدل ممکن ہے لیکن الفاظ کو وہ بالکل نئے معانی میں جنکا تعلق ان کے مروجہ معانی سے نہیں ہے استعمال نہیں کرسکتا ہے۔ اگر وہ نئے الفاظ وضع کرے۔ تو اس کی شاعری مجذوب کی بڑ ہوگی جسے نہ کوئی اور سمجھ سکے گا نہ اپنے حواس کی حالت میں خود وہ سمجھ سکے گا۔ الفاظ کی شکل اور معنی میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے لیکن یہ اچانک بالکل نہیں ہوتا اور ہر ایک غیر شعوری اور اجتماعی عمل ہے۔ زبان کا تعلق اگلی روایات کے ساتھ ہے اور اسی طرح اگرچہ نئے بحور اور عروض کی نئی صورتیں نکلتی رہتی ہوں۔ وہ اگلی روایات ہی پر مستحکم ہیں۔ شاعری کی عمارت روایات اور ماضی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے۔ لفظ "کار" بھی نیا نہیں۔ قرون وسطےٰ کی فرانسیسی شاعری میں وہ "شار" (char) اور "شارٹ" (charette) کے بھیس میں نظر آتا ہے۔ غرضکہ وہ آج کی میم صاحب کا ہیٹ ہے جو بظاہر نہایت انوکھا اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہے در اصل وہی شئے جو پرانے زمانے کی مضحک عورتیں پہنا کرتی تھیں موٹر کار اور شار میں سطحی فرق ہے ورنہ اصل مفہوم وہی ہے کار مکانکی ہے۔ خوب تیز چلتا ہے، ہمیں اپنے عقل مند اور ترقی یافتہ اور ممتاز ہونے کا دھوکا دیتا ہے۔ بچارا "شار" ان صفات سے خالی تھا لیکن وہ بھی لوگوں کو مزے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا تھا۔ ہمارے رولس روائس اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ نہ رقص کرسکتے ہیں نہ فلسفہ پر درس دے سکتے ہیں۔ ذرا آب و تاب زیادہ ضرور ہے۔

یہ موٹی باتیں غالباً موضوع بحث سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں، لیکن میں نے انہیں اس تفصیل سے یہاں اس لئے پیش کیا ہے کہ آج شاعری میں تجدید اور اپج کے معنی ہیں کہ زمانۂ حال کے چند خصوصی ...

خیالات اور اصطلاحات کو نظموں میں بھر دیا جائے یا انہیں موضوع شاعری بنایا جائے گرچہ ذرا غور کرنے سے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اس قدر مروج ہو گئی ہیں کہ ان کی موجودگی کا احساس نہ ذکاوت طبع کی دلیل ہے نہ فطری اپج کی اور شاعری میں ان کا غیر ناقدانہ اور بے تخیلانہ استعمال نہ شاعر کی جدت طبع کا نمونہ پیش کرتا ہے نہ اُس کی دلیری اور آزادئ طبع کا ثبوت ہے بلکہ عموماً تخیل، نوعیت، اور فنّی جدت کے فقدان کو آشکار کرتا ہے۔ اگر روزمرّہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں اُن کا علم ہمارے بیانات سے ظاہر نہ ہو تو ہمارے حواس خمسہ کا رہنا یا معطل ہو جانا بالکل برابر ہے۔ ہاں ان کا شاعرانہ استعمال ایک بالکل دوسری چیز ہے۔

میں نے قبل کہا ہے کہ ہر عہد میں چند قسم کے فیشن ہوتے ہیں۔ لباس میں، طرز رہائش میں، اور ادب میں بھی ان کی موجودگی نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ لیکن انہیں نامناسب اہمیت دینا دماغی اور تخیلی کمزوری کی دلیل ہے اور ان کی ناجائز اور کورانہ تقلید یا تلقین اس سے بھی بدتر ہے۔ آج کل کئی نئے علوم ظہور میں آئے ہیں جن میں نفسیات سے نوجوانوں کو خصوصاً خاص دلچسپی ہے۔ اس کی اصلی وجہ شاید یہ ہے کہ علم النفس کی بحث سے اور اُسے گفتگو یا ادب میں لانے سے انہیں اپنی روایات سے آزاد ہونے اور رسمی طرز خیال سے پاک ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ نفسیات ایک [illegible] علم نہیں اور اُس کے انکشافات کا ریاضیات کے اصول موضوعہ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق انسانی خیالات، افعال اور [illegible] کے ساتھ ہے جو نظام شمسی یا کشش ثقل سے زیادہ پیچیدہ مبہم اور خود مختار ہیں۔ علم النفس کی کیفیت ایک نوزائیدہ بچہ کی سی ہے جس کی آغوش یا ہاتھ پاؤں پھیلنے یا چیخ پکار سے [illegible] کا گمان کر سکتے ہیں کہ وہ آسودہ ہے یا اسے بھوک لگی ہے یا نیند آ رہی ہے لیکن یہ کوئی بات ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ علم النفس کے حقیقی ماہر یا کم اس کا احساس ہے کہ اس دنیا میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے اور ابھی اس کا دائرۂ علم بہت ہی محدود ہے مگر:

رموز مملکت خویش خسروان دانند

اور لوگ اس کے انکشافات کو بالکل بدیہی معنوں میں تسلیم کرتے ہیں اور ایک آدھ مضمون کی کتابیں پڑھ کر اپنے علم کو تنقید کی کسوٹی قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ ہے کہ قبل کے ادبا، شعرا [illegible] دل نویس انہیں نہایت ہی کھوسٹ، کہنہ خیال اور لکیر کے فقیر سے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا کبھی خیال نہیں ہوتا کہ شاعری ایک فن ہے اور نفسیاتی تجزیے اس کے پرکھنے میں بالکل نامناسب اور لغو ہو سکتے ہیں۔ ادب کو نفسیات سے تعلق ضرور ہے لیکن ادب کو نفسیات کے اصول موضوعہ سے جانچنا حماقت ہے۔ ان کی سرحد جدا گانہ ہے۔ نئے خیالات اور نئے علوم بہت ہی اہم اور نادر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی ضرورت سے زیادہ وقعت ہوتی ہے۔ علم النفس کی قدر و منزلت آج کل اسی سبب سے ہے۔ اس کے انکشافات انوکھے ہیں اور انسانی افعال کے اصل مقصد اور نیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور چونکہ تقریباً ہر فعل گو وہ شہوانی نیات سے وابستہ [illegible] ہے ہمارے نوجوانوں کی نفسیات سے دلچسپی

دو بالا ہو جاتی ہے۔ اسے تجدیدیت کی بہترین راہ قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اخلاقی مسائل جو ترویج محرمات سے وابستہ ہیں نہایت ہی پرانے ہیں۔ نفسیات کے یہ مشاہدات یونانی ڈراما میں بکثرت نظر آتے ہیں اور جس تخلیقی خوبی سے انہیں سوفوکلیس نے پیش کیا ہے اس کی نظیر جدید شاعری میں بہت کم نظر آئے گی حتیٰ کہ نفسیات کے بہت سے اصطلاحات اس کے ڈراما سے وضع کئے گئے ہیں مثلاً Oedipus complex سوفوکلیس میں جذباتی متانت اور اخلاقی سنجیدگی ہے جس سے اخلاقی نقطہ نظر سے یہ تجربات بہت ہی مہتم بالشان معلوم ہوتے ہیں اور قاری کے تخیلات میں ہیجان اور انقلاب بپیدا کر دیتے ہیں برخلاف اس کے آج کل کے اکثر شاعر اور افسانہ نگار سمجھتے ہیں کہ ماں بیٹے اور بھائی بہن کے درمیان ہوسناک محبت کی داستان چھیڑے بغیر وہ لکیر کے فقیر سمجھے جائیں گے اور نہ اپنی اپج اور تجدیدیت کی نظیر نہ پیش کر سکیں گے وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آج کل ایسے افسانے اگر وہ جذباتی حقیقت پر مبنی نہیں ہیں لکیر کے فقیر ہونے اور رسمی ذہنیت رکھنے کا ثبوت دیتے ہیں۔ رسمیت کے معنی ہیں اپنے جذبات سے انحراف کرکے صرف انوکھا پن فیشن کی تقلید پر حقیقت کو قربان کر دینا۔ اگر جذبات صحیح ہوں تو پھر روایات کا اثر ضرور بہتر ہوگا۔ شاہ اڈیپس Oedipus Tyrannus اور اورستایا (Oresteia) سے بڑھ کر موجودہ شاعر کے لئے کوئی بھی راہبر نہیں ہو سکتا۔

ہر دور میں دو چار شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام میں حقیقی جدت اور نوعیت اور تخلیقی طرزِ عمل میں جدت اور اختراع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھیڑ کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے جو بغیر سمجھے بوجھے زمانہ جس طرف چلائے اسی طرف چلتے ہیں اور جو گت بجاتے اسی پر غیر ارادی طریقہ سے ناچتے ہیں۔ ہر فرد سمجھتا ہے کہ میری راہ نئی اور صحیح راہ ہے اور میرا ناچ نرالا۔ لطف تو یہ ہے کہ وہ دو چار جو تخلیقی طرزِ عمل میں انقلاب پیدا کرنے والے ہیں اور جو واقعی نئی راہ نکالتے ہیں وہ روایات سے بہت کچھ سیکھتے ہی نہیں بلکہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ بغیر قدما کی جائز پیروی کئے اس قسم کی جدت ناممکن ہے کیونکہ ہمارے تمام تر خیالات اور ہمارے تمدن کا تعلق ماضی کے ساتھ ہے۔ ہماری زبان لایعنی ہو گی اگر اس تعلق کو منقطع کر دیا جائے اور اس کے بغیر ہمارے جذبات رائگاں جائیں گے۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ حال تو ماضی سے صرف تعلق ہی نہیں رکھتا بلکہ ہمارے تمام احساسات، جذبات، خیالات اور افعال کی انفرادی حالت ماضی کے تجربات اور روایات کے سبب سے ہوتی ہے جو سنگ پارس کی طرح ہمارے تجربات کو ایک نئی اور نادر صورت بخش دیتے ہیں۔

تنقید اکثر غیر مفید اور سطحی اس سبب سے ہوتی ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ شاعر کیوں لکھتا ہے اور کون سی ضرورت ہے جو مصور کو تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے۔ عملِ تخلیق ایک حد تک ارادی ہے اور ایک حد تک غیر ارادی۔ اس میں شعوری اور غیر شعوری عناصر مخلوط رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں ارادہ یا شعوری افعال کا کہاں تک دخل ہے اور کس حد تک غیر شعوری عناصر ان میں تغیر پیدا

کردیتے ہیں۔ موسیقی سے یا شاعری میں نظم الفاظ سے جو کیفیت ہمارے جذبات اور دماغ پر طاری ہوجاتی ہے اس کی اصلی وجہ بتانا بھی آسان نہیں۔ شاعری اور موسیقی ان کیفیات کے عکس ہیں جنہوں نے شاعر یا ماہرِ موسیقی کو تخلیقی عمل پر مجبور کیا۔ نظم پڑھنے یا موسیقی سننے سے وہی کیفیتیں قاری یا سامع میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ شاعری کے ماخذ کا صحیح نقشہ بنانا بہت ہی دشوار ہے۔ لیکن ایک حد تک اس کا تجزیہ ممکن ہے۔ یہاں صرف دو چار پہلوؤں پر بحث ہوسکتی ہے۔

تمام فنونِ لطیفہ میں ایک جمالیاتی پہلو ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کا سب سے اولین مدعا ایک حسین شئے کی تخلیق ہوتی ہے۔ گرچہ آرٹ میں ہمیشہ جذبات کے اظہار کا ارادہ ہوتا ہے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جذبات کے اظہار کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جنہیں آرٹ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح حسن کے بہت سے نمونے اور مناظر ہیں جن پر آرٹ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ آرٹ میں جذبات اور حسنِ اظہار میں ایک قسم کی آمیزش اور مماثلت ہوتی ہے جس سے دونوں میں ایک نئی معنی خیزی ہوجاتی ہے شاعر یا اور دوسرے قسم کے آرٹسٹ کو ہمیشہ اسکی کاوش ہوتی ہے کہ عملِ تخلیق سے وہ ایک مناسب اور حسین چیز بنائے جس میں انفرادی خصوصیت ایک بڑی حد تک ہو۔ اس کا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کے تعمیر کردہ نمونہ فن میں بے نظیری اور یکتائی ہو۔ لیکن خوبصورتی کے ساتھ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کو تخلیقی عمل کی ضرورت ہی کیوں پڑتی ہے۔ وہ اس بات پر کیوں مجبور ہوتا ہے کہ بجائے دو چار آنسو بہانے کے الفاظ کو تناسب کے ساتھ نظم کرے کیونکہ بالعموم ہم اپنے جذبات کا اظہار ہنس کر یا رو کر یا غصہ ہوکے کیا کرتے ہیں۔ پہلا جواب ہوگا کہ شاعر میں یہ مخصوص قوت ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعہ نہ صرف ان جذبات کو بہتر طریقہ سے ادا کرسکتا ہے بلکہ انہیں دوامی زندگی بخش سکتا ہے قریب قریب بے خود مختارانہ طریقہ سے اس کا دھیان الفاظ کی طرف جاتا ہے اور اس کے دماغ میں ایک ترنم موجزن ہوتا ہے جس میں وہ الفاظ چسپاں کرکے نظم تیار کرتا ہے۔ اس کے قوائے حاسہ ہمارے قوائے حاسہ سے زیادہ نازک ہوتے ہیں اور ان کے اثرات زیادہ گہرے اور شدید۔ اس لئے اظہار جذبہ کے اور طریقے اسے نامناسب اور نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن یہ پہلے سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں۔ کوئی اور وجہ ہوتی ہے جو شاعر کو ہمیشہ ایک خاص طرح کے عمل پر مجبور کرتی ہے۔ غالباً تمام تخلیقی اعمال کی اصلی وجہ یہ ہے کہ شاعر کی ان تمام مشاہدات سے جو اسے دنیا میں جلوہ گر نظر آتے ہیں پوری تشفی نہیں ہوتی۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نظامِ عالم۔ اس کے روزمرہ کے تجربات، مروجہ خیالات میں کسی قسم کا تناسب نہیں ہوتا۔ ہر شئے درہم برہم اور نامرتب معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک سلیقہ مند عورت کو اس بات کی کاوش ہوتی ہے کہ اس کے گھر کی چیزیں قرینہ سے رہیں شاعر بھی اپنے تجرباتی اور دماغی فرنیچر کو سجاکر رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن شاعری صرف نظم ہی نہیں تخلیق بھی ہے۔ اور اس لئے ناقابلِ تشبیہ کافی نہیں۔ شاعر ایک بہتر عالم کی آفرینش کا مدعی ہوتا ہے۔ اپنے دور کے بہت سے خیالات اور

اور اعتقادات کے نقائص کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا دل ایک کسوٹی کی طرح ہوتا ہے۔ جس پر مروجہ خیالات اور عادات کے کھوٹے سکوں کے عیوب فوراً نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مادی ارتقا اور اس کی تہذیب ہم معنی نہیں۔ اور ہمارے پاس کار اور ریڈیو اور سائنس کے عجیب زنادر ایجادات ہوں، ہمارے دماغ بھی اور نئے علوم سے بھرے ہوں لیکن جذباتی اور تمدنی معاملات میں ہم میں ہزاروں سال قبل کی بربریت موجود رہ سکتی ہے۔

غرض کہ شاعر کو اپنے دور کی بہت سی باتوں سے جس پر کہ اور اصحاب نازاں رہتے ہیں تشفی نہیں ہوتی اور شکایت رہتی ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ بہتر نمونہ پیش کرے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض صدیوں میں تہذیب بھی اعلیٰ پیمانہ کی ہوتی ہے اور اس لئے شاعر کو زمانہ کے خلاف زیادہ جدوجہد نہیں کرنی ہوتی ہے لیکن اسے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ بہتر جذبات اور اخلاق کے نمونے پیش کر سکتا ہے۔ بعض عہدوں میں لوگوں کے خیالات اس قدر رسمی ہو جاتے ہیں، ان کے احساسات اس قدر کند اور تمام رجحان زمانہ اس قدر بےجہت ہو جاتا ہے کہ شاعر کو اپنے ماحول سے وہ مدد نہیں ملتی جو زیادہ خاطر خواہ زمانوں میں ملتی ہے اور اسکی شاعری کا لہجہ اکثر طنزیہ، تلخ اور مایل بہ ہجو ہو جاتا ہے۔ ہر زاد اپنی سے زیادہ کوشش کے ساتھ نئی راہ نکالنی ہوتی ہے۔

عرض ہو چکا ہے کہ معاصر مروجہ خیالات اور ادبی فیشن کو سمجھنے کے لئے خاص ذکاوت اور طباعی کی ضرورت نہیں۔ ریل گاڑی، موٹر کار یا ریڈیو سے واقفیت بھی کوئی ایسی معرکۃ الآرا بات نہیں اور شاعری میں ان کا تذکرہ قابل ستایش نہیں۔ نہ تو مزدور پر ظلم کا واویلا مچانے اور سرمایہ داروں کو گالیاں دینے میں کوئی جانفشانی قربانی، تخیل یا تخلیقی قوت کی ضرورت ہے، اور غالباً اس لئے آسان ہے۔ ادب اور شاعری کو ان مزخرفات سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غیر نافذانہ مامی بھرنا ایک قسم کی ذہنی اور حسی کمزوری کی دلیل ہے۔ جسے ہم شاعری مبرا کرنا چاہتی ہے۔ شاعر کی آنکھیں ایسے فوق البھڑک پردے سے مرعوب اور محظوظ نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس سے گذر کر اصل حقیقت کو دریافت کر سکتی ہیں اور اسکی تخلیقی قوت میں یہ سکت ہے کہ وہ ایک زیادہ کامل نمونہ تعمیر کر سکے۔

لیکن ہم اپنے تجربات سے باہر نہیں جا سکتے۔ مختلف تجارب اور اثرات سے نئی نئی ترکیبیں ممکن ہیں۔ نادر تمثیلیں بن سکتی ہیں لیکن کوئی انسان اپنے حواس خمسہ اور تجربات کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ شاعر کی نئی عمارت پرانی اینٹوں ہی سے خواہ نراش کر خواہ پوری کی پوری استعمال کرکے بن سکتی ہے۔ اور اس لئے اسے روایات سے بہت ہی مدد ملتی ہے۔ چونکہ عہد شیکسپیر میں اکثر ایسے ہی مسائل سے شاعر کو سامنا پڑا جیسے ہیں۔ [illegible] ہم شاعر کے پیش نظر ہیں اور ایک بصیر شاعر جانتا ہے کہ وہ [illegible] زیادہ بہتر شاعری نہیں کر سکتا اس سے اسے ہومر یا شیکسپیر [illegible] لفظ یا زردتی سے سبق سیکھنے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ عار تو چھوٹے لوگوں کو ہوتا ہے۔

ہمارا دور ایسا ہے کہ جس پر ہم نازاں ہوں اور [illegible] کارناموں پر ہمیں زعم ہو۔ ریڈیو اور سنیما

ہیں بہتر اور زیادہ ذکی الحس انسان نہیں بنا دیتے بلکہ مخرب ادراک ہیں اور اکثر مخرب اخلاق بھی۔ اس لئے آج دوسرے دوروں سے زیادہ ضروری ہے کہ اپنے ماحول سے نکل کر روایات کی تفتیش اور چھان بین کریں کہ ان کے سبق آموز عناصر سے ہم فایدہ اٹھا سکیں ماحول کا غیر شعوری اثر تو ضرور رہے گا لیکن اس میں خود کو کھو دینا بہت عقلمندی کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے انگریزی ادبا اور شعراء جنکے سامنے آج کی تہذیبی بد نظمی کا منظر زیادہ نمایاں طور پر موجود ہے برابر قدما اور روایات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیمس جوائس نے اپنی ناول یولیسیس میں موجودہ زمانہ کے نقائص کو قارئین کے ذہن میں زیادہ گہرا نقش کرنے کے لئے نہ صرف آج کی زندگی کا عہد عتیقہ میں یونانی زندگی سے موازنہ کیا ہے بلکہ پوری ناول کو ہومر کی شہرہ آفاق نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یولیسیس کے ہر واقعہ کے مطالعہ پر اس کے متوازی یونانی نظم کے واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اس مقابلہ سے دونوں میں جو فرق ہے زیادہ خوش اسلوبی سے پیش ہوتا ہے۔ غرضکہ ناول کی شکل اور اس کے نظم میں اوڈیسی کا تتبع کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ جوایس نے لکیر کے فقیر کی طرح غیر تخیلی تعلید کی ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہوگا۔ جوایس میں طرز تحریر اور طرز تخیل یعنی اسکی امتیازی شان بالکل انقلابی ہے اور ناول میں ہر جگہ اُسکی انفرادی خصوصیات کی جھلک ہے۔

اسی طرح الیٹ کی نظموں میں اکثر عہد الزبیتھ، یا قرون وسطےٰ یا کسی دوسرے قدیم عہد کی یاد زیادہ کی گئی ہے۔ پہلے کی نظموں سے یا کسی اور صنف ادب سے اقتباسات اور حوالوں کی بڑی تعداد الیٹ کی نظموں میں ہوتی ہے۔ شیکسپیر کے ایک مصرع یا سینٹ اگسٹین کی خود نوشت سوانح عمری کے ایک جملہ کی موجودگی سے قاری کی نگاہ تخیل کے سامنے بہت سی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس طرح گویا عہد حاضر اور دوسرے عہدوں کے نقشے دوش بدوش ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم ان تفرقات کا جائزہ لے سکتے ہیں، کبھی کبھی دو چار تغیر و تبدل سے کسی پرانی نظم کے ٹکڑے کی صورت ایک حد تک بدل دی گئی ہے اصل ٹکڑے اور اس "تصرف" کے مقابلے سے ایک طرح کا توازنی تجزیہ ممکن ہوتا ہے جس سے شاعر کے ناقدانہ نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ الیٹ کی شاعری ان بصیرت افزا عناصر سے معمور ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ روایات کا کیسا گہرا اثر اس کے تخیل اور اس کی طرز تحریر پر ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شاعر کو واقعی کچھ کہنا ہے۔ اگر اسے اخلاقی اور معاشرتی اور ادراکی زندگی میں بُرے بھلے کی حقیقی تمیز ہے تو اُسے شاید بالضرور روایات کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے کام لیتا ہے اور اس کی اصلی دلچسپی اپنے عہد کی روش کے ساتھ ہے لیکن اس کا مقصد ہوتا ہے کہ انھیں پرکھا جائے اور سچے اور کھوٹے کو علٰحدہ کیا جائے۔ اس عمل کے لئے اُس کے پاس دو کسوٹیاں ہیں۔ اپنے ادراک و احساسات کی اور روایات کی۔ حافظ کی شاعری بھی اس حقیقت کی گواہ ہے۔ سلمان ساؤجی

اور سعدی کے تاثرات حافظ کی شاعری میں بہت ہی واضح ہیں۔

یہ بہت ممکن ہے کہ گذشتہ زمانہ کے محاسن شاعر کو حقیقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نظر آئیں اور ان کے بیان وہ تعلی سے کام لے۔ یہ انسانی ذہنیت کی خصوصیت ہے کہ ماضی کی چیزیں اسے رومانی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جو ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کے اعلےٰ نمونوں پر مبنی ہیں ان میں نہ مبالغہ کا جز ہے نہ تعلی کا۔ کسی زمانہ کی شاعری کیوں نہ ہو اگر واقعی شاعری ہے تو اس میں خلوص اور حقیقت طرازی ضروری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعر اپنے ہمعصر خیالات، ادب اور فنون کے سحر افزا سراب سے بچ کر روایات کی حقیقت کی طرف رجوع کرتا ہے وہ کسی نئی حقیقت یا نئے خیال کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک اُسے نہ صرف اپنے تجربات سے بلکہ صدیوں کے تجربات سے پرکھ لے۔

اگر شاعر صرف ردیف و قافیہ کا بادشاہ ہے تو روایات سے وہ کسی طرح استفادہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ وہ صرف پرانی اور بوسیدہ ہڈیوں کو اکھاڑ کر اپنے دیوان میں دوبارہ دفن کرکے اُسے ایک بدنما قبرستان بنا دے گا۔ اصل کرامت اس ذہن کی ہوتی ہے جو شاعر یا فنون لطیفہ کے ماہر کو ملتی ہے اگر وہ ودیعت نہیں ہوتی ہے تو شاعری ایک طرح کی نظر بندی ہوگی جو سُست اور کمزور آنکھوں کو مسحور کرے گی مگر جس کا جادو تیز آنکھوں پر بالکل نہیں چل سکے گا۔ اس کے برخلاف شاعری ایک معجزہ ہے جسکی تخلیق ہر قسم کے امتحان اور تجزیہ کی متحمل ہے۔ شاعری میں ذاتی تجربات اور روایاتی تجربات میں اس طرح کی خلط ملط ہو جاتی ہے کہ پھر دونوں کو علیحدہ کرنا ناممکن ہوتا ہے اور ایک تیسری اور بالکل نئی شئے پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا اثر ہمعصر خیالات اور ذہنیت پر ہوتا ہے غیر شعوری طریقہ پر رسمی خیالات کی جگہ شاعر کے خیالات لے لیتے ہیں۔ لیکن اعلےٰ فن کا اثر ہمیشہ قائم رہتا ہے اور ہر عہد میں شعرا کی مدد کے لئے موجود۔

ایلیٹ اور پاؤنڈ، ایمپسن اور ڈلن ٹامس میں یہ صفات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی شاعر ہیں جن کے مداحوں کی جماعت بہت کافی ہے۔ لیکن جس شخص کو شاعری کا صحیح ذوق ہے اسے اس بات سے بالکل دلچسپی پیدا نہیں ہوسکتی کہ مسٹر آرمسٹرانگ کن شعبدوں کی تیاری میں مصروف ہیں اور جارج بارکر، انٹرمیٹر، اور فوائس کن کرتبوں میں مصروف ہیں کیوں کہ انھیں شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔

غالباً ایک مثال مباحث کے دفتر سے زیادہ کارآمد اور یقین دلانے والی ہوتی ہ
اس لیے زمانۂ حال کے شاعر ڈلن ٹامس کی ایک نظم سے اقتباس پیش ہے۔ اسطلاحات
وہی ہیں جو کار کی پچھلی سیٹ اور ریل کی راگ میں نظر آتی ہیں لیکن ذہنیت میں بعد المشرقین ہے:-

*In this our age the gunman and his moll,*
*Two one-dimensioned ghosts, love on a reel*
*Sta nge to our solid eye,*
*And speak their midnight nothing as they swell,*
*When cameras shut they hurry to their hole*
*Down in the yard of day.*

*They dance between our arclamps and our skull,*
*Impose their shots, throwing the nights away;*
*We watch the show of shadows kiss or kill,*
*Flavoured of celluloid give love the lie*

محمد فضل الرحمن

# اردو زبان اور فن داستان گوئی

(۲)

" لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ جیسے جیسے یاران صادق اور داستان ہوا خواہ شب کو وقت کہ پردہ دار عاشقاں کی ایک مقام پر جمع ہوتے۔ کوئی گنڈا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے۔ جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب پر لحن داد دی فرما رہے ہیں: 'لیکن خونخوار ظلماتی کی دختر بلند اختر ملکہ طاؤس پری چہرہ نہایت حسین سحر میں بھی زبردست نشۂ شراب حسن سے مست اپنے قصر میں جلوہ فرما تھی کہ اس کو خبر گزری کہ قید طلسم کشائی پردۂ ظلمات میں آئی ہے۔ یہ اپنے قصر پر آ کر بیٹھی تھی۔ اسد کو ارابے پر سوار کر کے ملازمان آتش بار قلعۂ ظلمات میں لائے ہیں۔ کہیں اگر اسد نے تنہا ارا ارابہ رکا۔ طاؤس پری چہرہ کی نگاہ آفتاب جمال اسد نامدار پر پڑی۔ عاشق ہوئی۔ راتیں تڑپ تڑپ کے کاٹیں۔ یکایک یہ خبر سنی کہ پدر فرزانہ طلسم کشا کو بیرون قلعۂ ظلمات قتل کریں گے عرض کیا تھا کہ ایک قصر پر آ کر بیٹھی تھی وہ وقت آیا کہ اسد کو زیر دار بٹھایا۔ طاؤس حیران تھی کہ میاں اس کو کیونکر بچاؤں۔' ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرش بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

ایسی فضا میں جس ادب کی تخلیق اور نشو و نما ہوگی اس میں باریکی، گہرائی اور پیچیدگی کا وجود ممکن نہیں۔ ان خوبیوں کو سمجھنے اور ان سے محظوظ ہونے کے لیے غور و فکر اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسی جگہ جہاں کوئی گنڈا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے۔ جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے... کہیں چائے تیار ہو رہی ہے۔ ایسی جگہ غور و فکر اور دقت نظر کا گزر نہیں ہو سکتا۔ داستان گو اس حقیقت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر واقف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی داستان میں ایسی چیزوں سے عموماً پرہیز کرتا ہے جو غور و فکر کے بعد سمجھ میں آئیں۔ وہ ساری خوبیوں کو اس صفائی سے سطح پر پیش کرتا ہے کہ انھیں ایک نظر غلط انداز بھی دیکھ لے سکتی ہے۔ وہ عروس سخن کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری پونجی بازار میں لے آتا ہے۔ سامعین بھی بچوں کی طرح سطحی جزئی پیش نظر حسن کے خواہاں ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسی قسم کے حسن کو سمجھنے اور اس سے لطف اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ جو حصہ وقتی طور پر پیش نظر ہو وہ دلچسپ ہو اور اس کی جزئیات حسین اور آسان فہم ہوں۔ مثلاً پہلے جملے کو لیجیے: "لیکن خونخوار ظلماتی کی دختر بلند اختر ملکہ طاؤس پری چہرہ نہایت حسین، سحر میں بھی زبردست نشۂ شراب حسن سے مست اپنے قصر میں جلوہ فرما تھی" "دختر بلند اختر" پہلا ٹکڑا ہے جس پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی صدا بلند ہوئی ہوگی۔ حالانکہ یہ فقرہ ایسا ہے جو ہر شخص کو سوجھ سکتا ہے اور اسی لیے

کسی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت کی ضرورت نہیں۔ پھر ملکہ طاؤس پر چہرہ کے متعلق تین تعریفی فقرے ہیں:
"نہایت حسین"، "سحر میں بھی زبردست" "نشۂ شرابِ حسن سے مست"۔ پہلا فقرہ "نہایت حسین" نہایت معمولی ہے
اور "بلند اختر" کی طرح یہہ بھی عام جاگیر ہے۔ یہہ ہر شخص کے ذہن میں فوراً آ جائیگا اور اس میں بھی جدت، باریکی، انفرادیت کا
نام و نشان نہیں۔ بہرکیف، اسی بات کی تکرار تیسرے فقرے میں ملتی ہے۔ جس میں "مست" "زبردست" کی رعایت سے
لایا گیا ہے اور بقیہ الفاظ "مست" کی رعایت سے۔ بظاہر اس میں "نہایت حسین" سے زیادہ ادبیت اور انفرادیت ہے
لیکن یہہ بھی "بلند اختر" ہی قسم کا ہے۔ "سحر میں بھی زبردست" محض ایک واقعہ کا اظہار ہے اور بس۔ الفاظ کی
نشست صاف اور بندش چست ہے لیکن اس قسم کی عبارت ہر پڑھا لکھا جسے لکھنے کا کچھ بھی ملکہ ہے
لکھ سکتا ہے۔ حسن اگر کچھ ہے تو محض سطحی۔ ایک مرتبہ سنکر یا پڑھ کر دوبارہ سننے یا پڑھنے کی خواہش نہیں
ہوتی اور اگر اسے دوبارہ سنا یا پڑھا جائے تو اس کے حسن میں اضافہ نہیں ہوتا اور کوئی نئی خوبی نہیں ملتی
سامعین اس سطحی حسن سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جیسے گنّا اور چائے ان کے کام و دہن کو عارضی لذت بخشتے ہیں۔
اسی قسم کی لذت داستان سے ان کے دماغ کو حاصل ہوتی ہے۔

واقعات کی ترتیب و ترقی، ان کے انتخاب و تناسب میں بھی یہی فوری حسن یہی معیار پیش نظر
ہوتا ہے۔ نفس واقعہ سے مطلب نہیں جس میں اکثر تخیل کی بے لگامی کی انتہا ہوتی ہے۔ یہاں واقعات کی تنظیم
اور ان کے باہمی تعلق سے بحث ہے۔ ان واقعات میں بھی جزئی حسن ہوتا ہے جو نظر کو فوراً جذب کر لیتا ہے۔
اور سبحان اللہ اور واہ واہ کی صدا بلند ہوتی ہے۔ واقعات صاف ہوتے ہیں اور بیان میں اتنی صناعی ضرور
ہوتی ہے کہ انھیں آسانی سے چشم تخیل دیکھ لے، لیکن ان کے انتخاب اور تنظیم میں باریکی، پیچیدگی، گہرائی،
رعنائی نہیں ہوتی وہ یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے ہیں اور اپنی اپنی جھلک دکھا کر روپوش ہو جاتے ہیں۔
اور انکی جگہ دوسرے واقعات لے لیتے ہیں۔ جیسے کسی فلمی تصویر میں۔ "تصویر" میں متفرق سین تیزی کے ساتھ
الگ الگ نظر کے سامنے آتے ہیں۔ ہر سین جاذب نظر ہوتا ہے۔ لیکن دیر تک نہیں ٹھہرتا۔ کسی دو سین
میں ربط تو ہوتا ہے لیکن یہہ ربط شرح و بسط کے ساتھ بیان میں نہیں آتا۔ ہر سین چلتا پھرتا ہو، دلچسپ ہو
ہماری آنکھوں اور ہمارے کانوں کو لذت بخشے۔ بس یہی اصل مدعا ہے۔ زمان و مکان گویا باقی نہیں رہتے۔
ان کی وجہ سے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ دو متواتر سین میں سالہا سال کا فرق اور سیکڑوں میل کا بعد ہو سکتا ہے۔
اس کی ضرورت نہیں کہ زمان و مکان کی خلیج پر پل بندی کی جائے۔ کچھ اسی طرح کی "ٹکنیک" داستان میں بھی
ملتی ہے، مثلاً "گلزار نسیم" کو لیجیے۔ اس کے مختلف حصے کسی تصویر کے مختلف سین سے کسقدر مشابہ ہیں!
ان حصوں کی سرخیاں ملاحظہ ہوں:- "داستان تاج الملوک اور زین الملوک بادشاہ مشرق کی"، جانا
چاروں شہزادوں کا بہ تجویز کحال تلاش گل بکاؤلی میں، غلام ہونا چاروں شہزادوں کا چوسر کھیل کر دلبر بیسوا سے
جیتنا تاج الملوک کا دلبر بیسوا کو اور چھوڑ کر روانہ ہونا تلاش گل بکاؤلی میں، پہنچنا تاج الملوک کا سرنگ کھدوا کر

باغ بکاؤلی میں اور گل لے کر پھرنا، آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کی تلاش میں پہنچنا تاج الملوک کا ایک اندھے فقیر کے تکیے پر اور آزمانا گل کا، ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھین جانا گل بکاؤلی کا تاج الملوک سے بینا ہونا چشم زین الملوک کا ... یہاں ہر سین ایسا ہے جیسے کسی تصویر میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے سین میں زین الملوک اندھا ہوتا ہے۔ سین بدلتا ہے اور اب ایک بڑا لشکر کسی میدان میں رواں دواں ہے۔ پھر سین بدلتا ہے اور شہر فردوس سامنے ہے۔ دلبر بیسوا چالاکی کرتی ہے اور پھر خود اپنے دام میں پھنس جاتی ہے۔ اب جو سین بدلتا ہے تو ایسا صحرا نظر آتا ہے جہاں

سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا | عنقا تھا نام جانور کا
مرغان ہوا تھے ہوش راہی | نقش کف پا تھے ریگ ماہی
وہ دشت کہ جس میں پر تگ دو | یا رنگ رواں تھی یا وہ رہرو

یہاں دیو سے معرکہ پڑتا ہے پھر دیو کی مدد سے تاج الملوک حمالہ دیونی کے پاس ارم میں پہنچتا اور دیووں کی مدد سے گل بکاؤلی پاتا ہے ... زمان و مکان جلد طے ہوتے ہیں۔ "پورب" سے "فردوس" اور پھر "ارم" پہنچنے میں نہ معلوم کتنے سال صرف ہوتے، کتنی مسافت قطع کرنی ہوتی، کتنی دشواریاں پیش آتیں لیکن یہ سب مرحلے فلمی مشین کے دستے کی ایک گردش میں آسانی سے چشم زدن میں طے ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال تمام داستانوں میں نظر آتی ہے۔ سامعین، "سینما بازوں" کی طرح خیالی تصویروں کو چلتی پھرتی، بولتی چالتی تیزی سے گذرتی ہوئی دیکھتے یعنی محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان جاذب نظر گزرنے والی تصویروں کا سلسلہ جاری رہے اور وہ ان دلچسپ خیالی تصویروں میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ انھیں دنیا و مافیہا کی بالکل خبر نہیں رہتی۔ انھیں اور کسی چیز کی مانگ نہیں ہوتی، سطحی الفاظ اور یہ دلچسپ چلتی پھرتی تصویریں بس یہی ان کا مدعا ہے اور یہ حاصل ہو جاتا ہے۔

"گلزار نسیم" یا کسی داستان کا تجزیہ کیا جائے تو داستان کے عناصر ترکیبی کا پتہ ملے گا۔ دوسرے افسانوں کی طرح، داستان میں بھی ایک ہیرو ہوتا ہے جو واقعات کا مرکز ہوتا ہے اور ایک ہیروئن ہوتی ہے یا ایک سے زیادہ مختلف واقعات میں جو ربط ہوتا ہے وہ ہیرو کی ذات کی وجہ سے۔ یہ ہیرو عموماً کوئی بادشاہ یا شاہزادہ اکثر کسی بادشاہ کا سب سے چھوٹا فرزند ہوتا ہے۔ اس انتخاب کی وجہ سے داستان میں ذرا شان و شوکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عام خیال یہ تھا اور ایک حد تک صحیح بھی تھا کہ بادشاہ کی زندگی میں رنگینی اور بوقلمونی زیادہ ہوتی ہے اور بادشاہو کو رزم بزم، غرض ہر قسم کے تجربات کے زیادہ مواقع ملتے ہیں اور انکی زندگی میں گردش لیل و نہار کے زیادہ باثر مرقعے ہاتھ آسکتے ہیں۔ ہاں تو یہ شاہزادہ کمر ہمت باندھ کر مختلف مہمیں سر کرتا ہے۔ وہ جری بہادر ہوتا ہے ہمیشہ تائید ایزدی اس کے ساتھ رہتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ آخر کار کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کا صرف یہی ماحصل نہیں ہوتا۔ وہ ایک عدیم المثال ہستی ہوتا ہے، سارے انسانی محاسن اس میں کھنچ آتے ہیں حسن میں بھی کوئی اس سے ہمسری نہیں رکھتا۔ اس کا نام بے نظیر ہو یا تاج الملوک یا جان عالم، وہ ایک ذات

کامل ہے۔ جملہ عیوب سے مبرا۔ ایسی ہستی جس کی مثال اس نامکمل اور ناقص دنیا میں ممکن نہیں۔ اس فوق الکامل کو کوئی سمجھدار شخص زندہ حقیقت تسلیم نہیں کرسکتا اور نہ اس کی کوئی انفرادی ہستی ہوتی ہے۔ وہ تکمیل کا محض ایک نشان ہے اور داستان کی بنیاد واقعیت اور حقیقت کے بدلے مثالیت پر قائم ہوتی ہے۔

اس کامل ہستی کو جہاں اور مہمیں سر کرنی ہوتی ہیں وہاں اُسے عشق کی دشوار گزار منزل سے بھی گزرنا ہوتا ہے۔ اور وہ اس "مہم" میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ غالباً عشق داستانوں کا اہم ترین عنصر ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں دلچسپی بڑھ جاتی ہے وہاں داستان گو کو مشکلیں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی طرز معاشرت مغرب کی طرز معاشرت سے جداگانہ ہے۔ یہاں مرد عورت آزاد نہیں پابند ہیں۔ اس لئے عشق اگر اسے ہوس پرستی کے الزام سے بچایا جائے تو عجب "ٹیڑھی کھیر" ہے اس مشکل کے احساس نے ایک ادبی رواج کی بنا ڈالی یہہ رواج اس "روشن خیال" زمانے میں غیر فطری اور مضحکہ خیز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا فیض ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں داستان میں ملتی ہیں جو اس کی عدم موجودگی میں ممکن نہ ہوتیں۔ عشق اور عشق کے لوازمات اسی کی دین ہیں۔ مختلف قسم کے جذبات، محبت، نفرت، رقابت، حسرت، تمنا، یاس، امید، غم و غصہ، ہنسی خوشی یہہ سب چیزیں داستان کی رنگینی اور دلکشی میں چار چاند لگاتی ہیں۔ بہر کیف، ہیرو یعنی وہی شہزادہ کسی حسین شہزادی پر عاشق ہوتا ہے لیکن یہہ عشق ملاقات، ربط، ذاتی کشش کا نتیجہ نہیں۔ عموماً یہ عشق نادیدہ ہوتا ہے۔ کسی شہزادی کے حسن کا شہرہ سنکر شہزادہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے یا کسی کی تصویر دیکھ کر یہہ جذبہ ابھرتا ہے۔ یا کسی غیر متوقع طور پر آمنا سامنا ہوتا ہے اور آنکھیں چار ہوتے ہی تیر عشق دل کے پار ہوتا ہے یعنی محبت "پہلی نظر" میں پیدا ہوتی ہے جیسے: "طاؤس پریچہرہ کی نگاہ آفتاب جمال آسد نامدار پر پڑی عاشق ہوئی" یہہ طریقہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس قدر خلاف فطرت نہیں جتنا تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں مرد عورت آزادی سے نہیں مل سکتے۔ جہاں ان کی زندگی کے دائرے عام طور پر الگ الگ رہتے ہیں وہاں شہرۂ حسن، تصویر، اچانک ملاقات یہہ چیزیں بآسانی محرکات زبردست محرکات کا کام کرسکتی ہیں۔

یہہ عشق کی مہم آسانی سے تو سر نہیں ہوتی اور نہ ایسا ہونا چاہیئے۔ ورنہ داستان وہیں ختم ہو جائیگی اور داستان بس اسی قدر ہوگی کہ ایک شہزادہ تھا وہ کسی شہزادی پر عاشق ہوا دونوں کی شادی ہوئی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔ ہر داستان کا ماحصل تو بس اسی قدر ہے لیکن داستان گو اس پر قناعت کیسے کرسکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایک ترکیب نکالی یعنی حصول مطلب میں روڑے اٹکائے۔ معشوق یا اس کے والدین کوئی ایسی شرط پیش کرتے ہیں جس کو پورا کرنا مشکل ہو جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ ہو جس کیلئے غیر معمولی جرأت و طاقت یا ذہانت کی ضرورت ہو۔ یا کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے کہ عاشق و معشوق جدا ہو جاتے ہیں اور عاشق آوارہ و پریشان و سرگرداں پھرتا ہے یا قید سخت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر مدتوں کے بعد مشکلوں کو حل کرتا یا قید سے نجات پاتا ہے۔ کبھی عاشق و معشوق دونوں مبتلائے بلا ہوتے ہیں اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر آخر

ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنی باقی عمر ہنسی خوشی بسر کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو داستان پھر فوراً ختم ہو جاتی اور اس میں کوئی دلکشی ممکن نہ ہوتی۔ اس لئے یہہ رکاوٹیں، دشواریاں، تکلیفیں قصے کو پیچیدہ بناتی ہیں اور اس کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں اور بہت سے ایسے انسانی جذبات کی نمائش کے لئے مواقع پیش آتے ہیں جو دوسری صورت میں ممکن نہ ہوتے۔

یہہ رکاوٹیں اکثر کسی فوق فطرت ہستی کی مداخلت سے پیدا ہوتی ہیں اور سچ تو یہہ ہے کہ داستان میں اس قسم کے عنصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ عموماً اس عنصر کی موجودگی داستان کے کم قیمت ہونے کی کافی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ کچھ داستانوں پر منحصر نہیں، ہر زبان میں اور غالباً ہر صنف ادب میں یہہ عنصر کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت میں ضرور پایا جاتا ہے۔ اس لئے محض اس وجہ سے داستان کو مورد الزام سمجھنا صحیح نہیں۔ اگر داستان میں زندگی اور انسانی تجربات وخیالات کا وہ نفیس، گہرا اور زبردست انکشاف ہوتا جو مثلاً شیکسپیر کے ڈراموں یا دانتے کی ڈوائن کومیڈی میں ملتا ہے تو پھر یہہ فوق العادت عناصر مضحک اور مورد الزام نہ سمجھے جاتے۔ بہر کیف، داستانوں میں مافوق العادت چیزوں کی زیادتی ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہہ ہے کہ ان چیزوں میں پہلے لوگوں کو یقین تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ خدا نے اس دنیا اور اس دنیا کے باشندوں کے علاوہ کوئی دوسری دنیا بھی پیدا کی ہے اور اس دوسری دنیا میں ایسی ہستیاں بستی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں لیکن جو اپنی مرضی کے مطابق ہمارے سامنے ظاہر بھی ہو سکتی ہیں اور ہمارے معاملات میں دخل در اندازی بھی کر سکتی ہیں۔ اس دنیا کا ایک نام کوہ قاف ہے جہاں پریاں بستی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہہ یقین وہ زندہ یقین نہ تھا جو یونانیوں کو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں میں تھا لیکن ایک قسم کا یقین [illegible] ضرور تھا۔ اس کے علاوہ یہہ دوسری دنیا اور اس کے باشندے سامعین یا قارئین کے مادہ تجسس کو بھڑکاتے اور ان کے تخیل پر تازیانہ کا کام کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ داستان میں رنگینی، پیچیدگی، بوقلمونی، دلچسپی کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پھر جب ہم ان جنوں، دیووں، پریوں کو انسان کی طرح بولتے چالتے، ہنستے روتے، محبت ونفرت کرتے ہمدردی وترحم یا غیظ وغضب کے جذبات سے متاثر دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک طرح کا اطمینان ہوتا ہے اور ہم اپنے جذبات وخیالات پر زیادہ اعتماد محسوس کرنے لگتے ہیں اور یہہ اجنبی ہستیاں انسان سے مختلف نہیں بلکہ انسان ہی جیسی مگر انسان سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ یعنی فرق بس اسی قدر ہے جتنا افریقہ کی وحشی قوموں اور مغربی اقوام میں۔ اگر کوئی مغربی قوم اپنی تازہ ترین ایجادوں کے ساتھ کسی ایسی قوم میں جا پہنچے جسے تہذیب اور تہذیب یافتہ قوموں سے ابتک کوئی تعلق نہیں رہا ہے تو غالباً اس وحشی قوم کی نظر میں وہ مغربی قوم جن پری جیسی معلوم ہوگی۔ ہاں تو کہنے کا مطلب یہہ ہے کہ اس مخصوص عنصر کی وجہ سے داستان کو بالکل نظرانداز کر دینا دانشمندی سے بعید ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم نہ کریں لیکن ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ جن دیو پری سامنے آئیں تو آنے دیجئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ وہ انسان سے مشابہ ہیں۔ کبھی داستان میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں تو کبھی مشکلوں کو آسان کر دیتے ہیں۔ کبھی

کوئی جن کسی شہزادی پر عاشق ہوتا ہے تو کبھی کوئی شہزادہ کسی پری پر مائل ہوتا ہے۔ جادو، طلسم، طلسمی اشیاء کی نیرنگی تو ہر جگہ ہے۔ غرض یہ سب چیزیں مستعمل ہوتی ہیں اور ان سے طرح طرح کا مصرف لیا جاتا ہے۔ کبھی ان کی وجہ سے داستان میں گتھیاں پڑ جاتی ہیں تو پھر انہی کی مدد سے کھل بھی جاتی ہیں۔ جب داستان گو کو مشکل پیش آتی ہے تو وہ فطری ذرائع کے بدلے ان غیر فطری یا غیر متوقع، خلاف قیاس ذریعوں سے مدد لیتا ہے اور اسے ان سے مصرف لینے کا حق حاصل ہے۔

بہرکیف، "بیس پچیس یاران صادق اور دوستان موافق" کا جمع ہو کر داستان سننا اور بات ہے اور اس کا بغور فرصت کے وقت مطالعہ کرنا اور بات ہے۔ جب ہم غور و فکر کے ساتھ پڑھتے ہیں، جب ہم کسی چیز کی جانب اپنی پوری توجہ مبذول کرتے ہیں تو ہمیں سطحی جزئی اور پیش نظر چیزوں سے تشفی نہیں ہوتی۔ ہم کچھ اور چاہتے ہیں اور فنی اور جمالیاتی معیار کو بروئے کار لاتے ہیں۔ داستان گو اس حقیقت سے واقف تھے اور وہ داستان گوئی کو اپنے حدود میں فنی طور سے برتتے تھے یعنی وہ چند اصول پیش نظر رکھتے تھے۔ ان اصول کو کسی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "ظاہر ہے کہ نفس قصص اور افسانہ کے واسطے چند مراتب لازم و واجب ہیں... اول مطلب مطول و خوشنما جس کی تمہید بندش میں توارد مضمون و تکرار بیان نہ ہو۔ مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں دوم بجز مدعائے خوش ترکیب مطلب دلچسپ کوئی مضمون سامعہ خراش و ہزل... درج نہ کیا جائے... سیوم لطافت زبان و فصاحت بیان چہارم عبارت سریع الفہم کہ سیکھے فن قصہ کے لازم ہے۔ پنجم تمہید قصہ میں بجنسہ تواریخ گزشتہ کا لطف حاصل ہو نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے" ان جملوں سے ظاہر ہے کہ داستان گوئی ایک دلچسپ مشغلہ ہونے کے ساتھ فنی حیثیت بھی رکھتی تھی اور ہر کس و ناکس داستان گو نہیں ہو سکتا تھا۔ داستان میں تخیل کی بے لگامی ایک اہم عیب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس بے لگامی کے سبب سے کوئی خرابی نہ ہوتی اگر اس کا برابر خیال رکھا جاتا کہ "تمہید قصہ میں بجنسہ تواریخ گزشتہ کا لطف حاصل ہو، نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے"۔ ان لفظوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قصہ گوئی کے اہم ترین اصول سے واقفیت تھی، قصہ کو قابل وثوق بنانے کے لئے ایسا طرز، ایسا رنگ، لہجہ اختیار کرنا چاہئے جس سے یہ معلوم ہو کہ کسی اصلی واقعہ کا [illegible] ہو رہا ہے اور شروع میں ایسی جزئیات ہوں جن میں واقعیت بدرجۂ اتم موجود ہو۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جو مستبعد یا ناممکن ہو اور [illegible] قابل وثوق فضا پیدا ہو جائے تو پھر قدم آگے بڑھے اور خیالی مرقعوں کو سامنے لایا جائے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ داستان گو ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھتے تھے اور نہ یہ کہ وہ ہمیشہ سچی فضا پیدا کر سکتے تھے لیکن یہی غنیمت ہے کہ وہ اس اصول سے ناواقف نہ تھے اور [illegible] حدود تک وہ اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ آج بھی اس اصول کی وہی اہمیت ہے جو پہلے تھی۔

دوسرا اہم نکتہ داستانوں کی دلچسپی سے تعلق رکھتا ہے اور اس نکتے سے بھی داستان گو باخبر تھے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ [illegible] ان کہانی کی طویل، پیچیدہ، بھاری بھرکم صورت ہے۔ طوالت اور پیچیدگی کی وجہ سے ایک خرابی کا احتمال ہے اور وہ تکرار ہے لفظی اور واقعاتی کسی چیز کی [illegible] سے سامعین یا قارئین کی طبیعت بہت جلد مکدر ہو جاتی ہے۔ اور کچھ ضروری نہیں کہ یہ تکرار کھلی ہوئی ہو۔ کسی لفظ، فقرے یا جملے کی صرف بھی بے فائدہ تکرار بے لطفی و [illegible] پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح کسی خاص واقعہ کو بار بار دہرانے سے بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ اکثر یہ تکرار کھلی ہوئی نہیں ہوتی یعنی کوئی ایک جملہ یا واقعہ بار بار پیش نہیں ہوتا بلکہ تکرار کی کسی حد تک پردہ پوشی کی جاتی ہے اور [illegible] اسی طرح کہ ایک ہی قسم کی باتوں کو ذرا بھیس بدل کر کہا جاتا ہے۔ لیکن اس بہروپ کے باوجود بھی حساس طبیعت اس نقلی [illegible] سے خوب واقف ہو جاتی ہے۔ بہرکیف، تکرار ظاہری ہو یا پس پردہ ایک عیب ہے اور اسے عیب شمار کیا جاتا تھا۔

اسی لئے کہا ہے کہ "تمہید و بندش میں تو ارد مضمون و تکرار بیان نہ ہو" اس تکرار سے دلچسپی میں نمایاں کمی ہوتی ہے اور داستان گوئی کا اصل الاصول یہہ ہے کہ دلچسپ ہو اور عجیب ہو اور برابر دلچسپ ہو۔ اتنی دلچسپ ہو کہ ابتدا سے داستان کے اختتام کے سامعین مشتاق رہیں"۔ اور وہ برابر "پھر کیا ہوا... پھر کیا ہوا" کی صدا بلند کرتے رہیں۔ نہیں کہہ سکتے کہ داستان گو اس مقصد میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً تکرار ایک ایسا عیب ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتے ایک ہی قسم کے مواقع، ایک ہی رنگ کے واقعات برابر پیش ہوتے ہیں اس لئے تکرار ناگزیر ہو جاتی ہے اور سچ تو یہہ ہے کہ ایک لمبی داستان میں اس قسم کی تکرار سے بچنا مشکل ہے اور داستان گو اس کی کوشش ضرور کرتے تھے کہ الفاظ کے رد و بدل سے تکرار کی پردہ پوشی کی جائے الفاظ سے داستان گو خاص دلچسپی رکھتے تھے جہاں تک ان سے ممکن تھا "وہ لطافت زبان و فصاحت بیان" اور اسی قسم کے محاسن کو اپنی انشا میں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ الفاظ ذریعۂ اظہار ہیں اور دلچسپ سے دلچسپ واقعہ بھی بے لطف معلوم ہو اگر اسے اچھے، خوبصورت لفظوں میں نہ بیان کیا جائے۔ ساتھ ساتھ ان کی نظر سامعین یا قارئین پر بھی تھی اور وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جو آسانی سے سمجھ میں آ جائیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ عبارت سریع الفہم ہو۔ شاید کسی دوسری صنف سخن کے لئے یہہ خصوصیت اس قدر اہم نہیں، جتنی یہہ قصہ گوئی کے لئے ہے۔ اگر ہر بات آسانی سے سمجھ میں نہ آ جائے تو پھر قصہ میں دلچسپی کا قائم رکھنا ناممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہو جائے۔ اکثر سریع الفہمی ... کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور داستان گو اردو شعرا کی طرح الفاظ سے کھیلنے لگتے ہیں اور لطافت زبان و فصاحت بیان" لفاظی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

بہر کیف داستان گوئی ایک فن ہے اور اپنے حدود و نقائص کے باوجود ایک دلچسپ فن ہے اور اس قدر کم قیمت نہیں کہ ہم اسے بکلقلم نظر انداز کر سکیں۔ افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس فن کے جاننے اور برتنے والے نہیں ملتے اور اب یہہ فن دنیائے ادب میں زندہ فن کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی جگہ ناول اور مختصر افسانوں نے لے لی ہے لیکن یہہ فن ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور کوئی دوسری صنف سخن اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم کولرج کے الفاظ پر عمل کریں تو داستانوں سے کافی لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی بے اعتقادی کو برضا و رغبت معرض التوا میں ڈالدیں۔ اگر ہم تخیل کی اس موہوم پیداوار کا عارضی طور پر اعتبار کر لیں تو ہمارے لئے ایک دلچسپ دنیا کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اس دنیا کی سیر محض تضیع اوقات نہ ہوگی بلکہ ہمارے تخیل، ہمارے دماغ کو تازگی اور فرحت بخشے گی۔

(باقی)

کلیم الدین احمد

# اسعد الاخبار آگرہ (۲)

اسعد الاخبار میں اودھ کے متعلق ذیل کی خبریں ملتی ہیں:

۸۳ "۱۰ جنوری ۱۸۴۹ء" دہلی اردو اخبار میں مرقوم ہے کہ کرنیل رچمنڈ صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ کلکتہ کو تشریف لے گئے، اور کپتان برڈ صاحب رزیڈنٹی کے کام کا انجام دیتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تقرر کرنیل سلیمن صاحب گورنمنٹ گزٹ میں نہیں چھپا، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک صاحب ممدوح عہدۂ رزیڈنٹی اودھ پر مقرر ہوں گے۔ ان دنوں انتظام مالی اس ریاست کا بہت ابتر ہے، اور خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے۔ اور اخبار الحقائق میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی ریاست کے دخل و خرچ میں ایسی کمی بیشی ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ اس سال کے آخر شاہ اود (اودھ) اپنا تھوڑا ملک سرکار کمپنی پاس گروی رکھیں اور کچھ روپیہ قرض لیں۔ اور افواہ سنا جاتا ہے کہ غلام رسول خاں جو سابق میں کوتوال تھے، بالفعل لکھنؤ میں بہ عہدۂ بخشی گری مقرر ہوئے"

۸۷ "ماہ صفر کی ۱۴ تاریخ کرنیل سلیمن صاحب بہادر جو بہ عہدہ رزیڈنٹی لکھنؤ مقرر ہوئے ہیں، لکھنؤ میں داخل ہوئے، اور چوں کہ دریں ولا، مزاج بندگانِ سلطانی[1] بیمار ہے، رزیڈنٹ بہادر سے اولاً ملاقات نہیں ہوئی، ولی عہد نے مراسم تعظیم و مدارات ادا کیے۔ بعد ازاں حضرت سلطانی سے ملاقات ہوئی۔"

۸۹ نواب سید حامد علی خاں[2] بہادر سخت پریشان خاطر ہیں کہ سلون اور بیسواڑہ سے روپیہ وصول نہیں ہوتا۔ سلون کے سرکش لڑائی کو تیار رہتے ہیں مگر روپیہ نہیں دیتے۔ سالِ گذشتہ کے کئی لاکھ روپیہ باقی تھے، سالِ حال کی قسطیں بھی رہ گئیں اور کارگزارانِ شاہی کا یہ حال ہے کہ اگر سرکش لوگ روپیہ دیتے بھی ہیں، تو کارگزار کھا جاتے ہیں۔ ان دنوں نواب ممدوح کی نسبت بادشاہ کا یہ حکم ہوا کہ اپنے قبائل لکھنؤ میں بلا لو، سو بادشاہ کو یہ دغدغہ ہوا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ زہر کھا کر چل دیں، اور حضرت سلطانی کسل و ناتوانی کے سبب محل سے نہیں نکلتے۔ بہت دنوں سے امراء اعیان کا سلام نہیں ہوتا۔ نواب[3] وزیر کبھی کبھی درِ دولت تک باریاب ہو جاتے ہیں، سو پس پردہ ہی سے سلام کر کے باہر چلے آتے ہیں۔ عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۹۱ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ طویلۂ خاص سلطانی کے سائیسوں نے جن کی آٹھ سات مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی متفق ہو کر وزیر الممالک کو دربار جاتے ہوئے گھیر لیا، اور جو کچھ اُن کے دل میں آیا سو کہا۔ آخر کار یہ ہوا کہ صبح کو ان کی تنخواہ بانٹ دی گئی تب جھگڑا رفع ہوا۔

---

[1] اس زمانے میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ تھے۔ [2] ان کے خسر اعتماد الدولہ فضل علی خاں جو نصیر الدین حیدر کے زمانے میں اودھ کے وزیر رہ چکے تھے۔ حامد علی خاں مرزا غالب کے احباب میں تھے۔ ان کا نام خطوط غالب میں آتا ہے۔ [3] علی نقی خاں وزیر تھے۔

۹۲ "نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر کو علاقۂ سلون و بیسواڑہ کا اجارہ ملا، اور انھوں نے اپنی طرف سے نواب ممتاز الدولہ غلام علی خاں بہادر کو دیا۔ ممتاز الدولہ نے اپنی خوش تدبیری سے ایسا بندوبست کیا کہ بیسواڑہ کے سب سرکشوں کو زیروزبر کر ڈالا، اور خراج سلطانی وصول کرکے نواب سید حامد علی خاں بہادر ناظم علاقہ کے واسطے سے خزانۂ عامرہ میں داخل کیا۔ اُن کی کارگزاری اعیانِ سلطانی کو بہت پسند آئی۔ سارے لشکر کی کمان افسری کا عہدہ نواب ممتاز الدولہ کے لیے تجویز کیا، اور یہ منصب ایسا ہے کہ سارے چکلہ دار اس کے مطیع ہوتے ہیں۔ نواب سید حامد علی خاں نے جب دیکھا کہ ممتاز الدولہ کی ترقی ہوئی، آتشِ رشک میں جلے، اور انواع و اقسام کے حیلے اٹھاکر نواب ممتاز الدولہ کو کان پور بھیجا اور نواب ممتاز الدولہ باوجودے کہ نواب سید حامد علی خاں سے انھیں کچھ سروکار نہ رہا تھا، مگر بہ پاسِ محبت اپنے فوائد سے قطع نظر کرکے کان پور کو روانہ ہوئے۔ جب وہ چلے گئے تو نواب سید حامد علی خاں نے صورتِ حال اپنے حسب مراد دیکھ کر وزیر الممالک سے عرض کیا کہ نواب ممتاز الدولہ نے میرے ساتھ دغا کی، اور زرِ خراج سلطانی لے کر کان پور چلے گئے اور مجھے مواخذے میں ڈال گئے اور اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لیے ضلع کان پور کی دیوانی کچہری میں ممتاز الدولہ کے نام نالش کروادی۔ اب دیکھیے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ افسوس صداقت و راستی بہت کم رہ گئی اور دغابازی و حیلہ سازی جہان میں پھیل پڑی۔ جب اعاظم و اکابر میں یہ معاملے ہونے لگے تو عوام الناس کا کیا اعتبار رہا" عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۹۳ "دریں ولا لکھنؤ کے خط سے معلوم ہوا کہ نواب سید حامد علی خاں بہادر نے ترتیب پانچ لاکھ روپے کے خزانۂ شاہی میں داخل کیے اور پانچ لاکھ روپے بہ سبب عدم گنجایش کے حضور والا نے از راہ پرورش و سادات پروری کے بہ سفارش بعض اراکین سلطنت کے معاف فرمائے، اور دو لاکھ روپیہ کی تخفیف سابق میں فرمائی تھی۔ بعد اس کے نواب علی نقی خاں بہادر نے نواب موصوف کو خلعت دلوا کر علاقے پر بھیجا" از اخبار الحقائق

۹۶ "سلون کا پرگنہ نواب سید حامد علی خاں بہادر کے اجارے سے خارج ہوگیا، اور مرزا قدرت اللہ بیگ خاں بہادر سے متعلق ہوا۔ اب اُن کی کوشش و تدبیر سے اُس پرگنے کی بدانتظامی کچھ کم ہوئی، اور سرکش لوگ راہ پر آئے اور سرکاری روپے ادا کرنے میں مستعد ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ وہاں کی بدانتظامی خوش انتظامی سے مبدل ہوجائے اور کچھ فتنہ و فساد باقی نہ رہے" عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۹۸ "اس شہر کے عمائدین سے ایک کے ہاں لکھنؤ کا خط آیا، اس سے معلوم ہوا کہ شاہ اودھ کو مرض لاحقہ سے صحت ہوئی، غسل صحت کے دن جمیع ارکان ریاست نے نذریں گزاریں۔ حضرت شاہ نے فقرا و مساکین کو بہت سی خیر خیرات دی۔ اور سنایا گیا کہ مرزا قدرت اللہ بیگ خاں سے پرگنہ سلون کا بندوبست نہ ہوسکا۔ ناچار کنارہ کش ہوکر اپنے تئیں صحیح سلامت جریدہ کان پور میں پہنچایا اور مواخذۂ سلطانی سے ایمن ہوئے" عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۰۲ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ بہ نسبت ایام گذشتہ کے بادشاہ کی بیماری کو افاقہ ہے، مگر ابھی

خوف یہہ ہے کہ مبادا جاتے وقت علاقۂ لکھنؤ کے راہ دار اور گذربان بادشاہی حکم کے بہانے سے آلات مطبع چھین لیں، سو اب اس تدبیر میں ہیں کہ رزیڈنٹ بہادر کا توسل پیدا کرکے وہاں سے نکلیں تا کان پور تک صحیح سلامت پہنچیں۔

۱۲۲ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ افواہاً سنا گیا کہ جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر نے اس بات کی مصلحت اندیشی کی راہ سے یہہ تجویز کی ہے کہ منصب وزارت نواب منورالدولہ احمد علی خان بہادر کو ملے، اور نواب شرف الدولہ بہادر نائب وزیر ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنی یہہ رائے نواب گورنر جنرل کے حضور لکھ بھیجی"

۱۲۳ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ ان دنوں صاحب رزیڈنٹ بہادر اور وزیر اعظم مدار الدولہ نواب علی نقی بہادر کے درمیان کچھ شکر رنجی ہے۔ وصی علی خاں جو صاحب رزیڈنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے نکالا گیا تھا، اور کان پور میں جا کر اُس نے قیام کیا تھا، بادشاہ سے پھر کچھ مخفی مخفی سازش کرکے لکھنؤ میں آگیا، وزیر اعظم صاحب کو صاحب رزیڈنٹ بہادر کی رنجیدگی کا بڑا رنج ہے۔ چاہتے ہیں کہ کسی طرح صفائی ہو جائے۔ اور خبر ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر تمام ممالک محروسہ لکھنؤ کا دورہ کریں گے، تا رعایا کا احوال اور ناظموں کا معاملہ بہ چشم خود دیکھیں۔ حضرت بادشاہ سلامت معاملات سلطنت سے بالکل دست بردار ہو کر رات دن محل میں عیش کرتے ہیں۔

۱۲۴ زبدۃ الاخبار میں ایک خط کی رو سے مرقوم ہے کہ نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر سرکار بادشاہی کے باقیات بابت جو بیس لاکھ سے زیادہ ہے محبوس ہوئے اور تمام اثاث البیت از قسم اسپ و فیل و نقرہ آلات و ملبوسات و شال و دوشالہ کے نیلام ہو گیا، اور اس کا زرقیمت بادشاہی خزانے میں داخل ہوا، مگر افسوس ہے کہ ہزار روپے کا مال سو کو اور سو کا دس کو بکا۔ نواب موصوف کا بڑا نقصان ہوا صاحب کے لیے ان کا نائب بھی بند بلا میں پڑ گیا، اور بھیواڑہ کا علاقہ نواب موصوف کی مستاجری سے نکل گیا؛ اور اُس کے تین حصّے کیے گئے۔ ایک حصّہ قطب الدّین خاں کو ملا اور دو حصّے اور دو آدمیوں کو کہ ان کے نام معلوم نہیں سپرد کئے گئے۔ حضرت بادشاہ رات دن رضی الدّولہ کے مکان میں جو ایک مطرب تنخواہی میں سے ہے۔ جلوس فرما رہتے ہیں، اور مہمات سلطنت کا حلّ و عقد وزیر اعظم مدار الدولہ نواب علی نقی خاں کے حوالے ہے۔ ممالک محروسہ میں ہر طرف لوٹ مار ہو رہی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ مسافر مارے نہ جاتے ہوں اور کوئی رات نہیں کہ دولت مندوں کے گھروں میں چور نہ پڑتے ہوں۔ اکثر مظلوم و ستم دیدہ لوگ نواب وزیر کی ڈیوڑھی پر داد فریاد کو جاتے ہیں، مگر ڈیوڑھی بان اور پہرے چوکی والے اُن بے چاروں کو نواب تک جانے نہیں دیتے۔

۱۲۵ ایک شخص لکھنؤ سے صاحب دہلی گزٹ کو یوں لکھتا ہے: تم نے جو دریافت کیا ہے کہ سرکار انگریزی

بعد بند و بست کردینے ملک اودھ کے وہ ملک آپ رکھے گی، یا نواب کو دے دے گی۔ میری یہہ رائے ہے کہ سرکار وہ ملک نواب سے جو ہمارا قدیم دوست ہے اور جنگ برما اور نیپال میں ہمارے شامل رہے اور دوستی رکھی اور کبھی ہمارے آزار کا خواہاں نہیں ہوا، نہیں لے لے گی۔ ہم نے یہہ ملک نواب کو ۱۷۶۵ء میں دیا تھا، اور سنہ ۱۸۰۱ء میں نواب سعادت علی خاں نے دوام کے واسطے کمپنی کو اپنا ملک دے دیا، کہ جس کا محاصل ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے سالانہ تھا، لیکن اب کمپنی کو اس میں دگنا بلکہ تگنا اُس سے وصول ہوتا ہے۔ اس سال میں بھی دوبارہ ملک باقی ماندہ نواب کو دیا گیا کہ وہ اور اس کے ورثا اُس پر قابض رہیں گے اور اپنا اختیار اُس پر رکھیں گے۔ ان مواثیق پر مہریں لارڈ ہنگز اور گورنر فرانس ویزلی اور لارڈ مورنگٹن کی ہیں، کیا ان لوگوں کے نہ ہونے سے اور وقت گزر جانے سے یہہ عہود اور مواثیق بھول جائیں گے؟ میرے نزدیک تو ایسا نہ ہوگا۔ علاوہ اس کے طریق کرنیل سلیمن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا یہہ ارادہ نہیں ہے۔ وہ فقط یہہ چاہتے ہیں کہ شاہ اودھ کو نصیحت نیک واسطے مقرر کرنے ایک اچھے وزیر اعظم کے دیویں اور اگر وہ نہ مانے تو بہ جبر ایک وزیر معقول مقرر کرادیں اور جس شخص کو کرنیل صاحب نے مناسب سمجھا ہے وہ حقیقت میں لائق اس عہدے کے ہے۔ یہہ سچ ہے کہ بیماری سے شاہ اودھ کی کرنیل سلیمن صاحب کو بہت سے خیال ہیں، لیکن جب کہ گورنر جنرل نے دوسرے بیٹے شاہ اودھ کو ولی عہد مقرر کیا تو اب کچھ اندیشے کی بات نہیں ہے' از اخبار النواح۔

۱۲۹ پہلے سماعی خبر مشہور ہوئی تھی کہ لکھنؤ کے چھاپے خانے جو بند تھے پھر جاری ہو گئے۔ اب اخبار باغ و بہار سے معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی، ہنوز ویسے ہی بند ہیں۔ غرہ ذی حجہ کو خلعت داروغگی مطبع سلطانی کا شیخ مذہب علی کو ہوا اور چھاپا خانہ حاجی محمد حسین کا بند ہو گیا، اور داروغہ جدید نے سب چھاپے خانے والوں کو بلا کے اُسی وقت حکم دیا کہ سب یا تو آکر سلطانی مکان میں چھاپیں، یا مچلکا دیں کہ تمام عمر اس شہر میں پھر کبھی نہیں چھاپیں گے۔ از اخبار الحقائق

۱۳۴ بعض معتمدین کی تحریر و تقریر سے معلوم ہوا کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر ملک کے انتظام پر متوجہ ہیں، اور نواب وزیر الممالک . . . ملک کا بند و بست امانی ساٹھ لاکھ سے زیادہ کر چکے ہیں' اور انتظام ملک پر مستعد ہیں۔ نائبان معزولین بہ سبب اپنی منفعت کے جو مستاجروں سے ہوتی تھی ملک کو امانی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اب جو مدار المہام نے بند و بست کیا، اور سرکار کے حکم کو اپنی منفعت پر مقدم سمجھ کر بند و بست امانی کیا سب اہل کار اُن سے برخلاف ہو گئے کہ ملک کے امانی ہونے سے اُن کی منفعت ہاتھ سے گئی۔ اور وصی علی خاں جو موافق حکم صاحب رزیڈنٹ بہادر کے فیض آباد چلے گئے تھے' نواب مدار الدولہ بہادر نے ان کے اہل و عیال کی سراسیمگی دیکھ کر صاحب رزیڈنٹ بہادر سے زیادہ از حد التماس کر کے انھیں فیض آباد سے بلا لیا، چنانچہ موصوف حسب الحکم دونوں سرکار کے لکھنؤ میں آئے۔ یقین ہے کہ جب صاحب رزیڈنٹ بہادر ان کی لیاقت

کارگذاری سے مطلع ہوں گے، موافق عرض نواب وزیر اور ارشاد حضرت بادشاہ کے حکم اُن کی بحالی کا صادر فرمائیں گے فقط۔

۱۴۱ لکھنؤ کا حال بھی کچھ حیدرآباد کی ریاست سے ابتری اور بے انتظامی میں کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہے۔ ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ نواب وزیر الممالک بہادر نے سپاہ وغیرہ کی تنخواہ بانٹنے کے لیے بارہ لاکھ روپے کی درخواست کی اور حضرت سلطانی نے عطاسے زر مطلوبہ وزیر الممالک بہادر کا خزانچی کے نام نافذ ہوا۔ ہنوز روپیا نکلنے نہ پایا تھا کہ انیس الدولہ و رضی الدولہ وغیرہ مقربانِ خاص نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کرکے حضرت سلطانی کے مزاج کو درہم برہم کردیا اور اس روپے کا ملنا موقوف کرایا۔ علیٰ ہذا القیاس اور امور سلطنت کا انتظام بھی کچھ ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ افسوس کی بات ہے کہ جب شاہ و وزیر کسی امر نیک کی صلاح و تدبیر ٹھہراتے ہیں مشیر بے تدبیر چکنی چپڑی باتیں کرکے بادشاہ کا مزاج اس طرف سے پھیر دیتے ہیں۔ عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۴۲ افواہ ہے کہ جناب رزیڈنٹ بہادر جو ماہ دسمبر ۱۸۴۹ء میں گھاگرہ کے اُس پار کے ملکوں کا دورہ کرنے کے لیے تشریف فرما ہوئے ہیں، آخیر فروری میں مراجعت فرماکے رونق افزائے لکھنؤ ہوں گے۔ ان کے تشریف لانے کے بعد عجب نہیں کہ اس ملک کا بہ وجہ احسن بند وبست کیا جائے اور ساری بے انتظامی اور خرابی رفع ہوئے۔ کہتے ہیں کہ صاحب رزیڈنٹ کا دورہ خالی از مصلحت نہیں ہے۔ ارباب گورنمنٹ کو وہاں کی بے انتظامی دیکھ دیکھ کر ایک مدت سے خیال لگ رہا تھا۔ اب خدا نے چاہا تو وہاں کی ساری خرابیاں اٹھ جائیں گی اور سپاہ و رعیت کو امن چین ملے گا۔ از زبدۃ الاخبار

۱۴۷ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ لکھنؤ کے خط سے معلوم کہ حکیم علی حسن کو جو اس سرکار کے ایک بڑے نامور معتمد و مقرب ہیں حسب رضامندی صاحب رزیڈنٹ کے ملتوسلی کے عہدے پر مقرر کیا، کیوں کہ رزیڈنٹ بہادر کو یہہ منظور تھا کہ اس خدمت پر کوئی ایسا شخص مامور ہو جو وزیر کے بے وساطت بادشاہ کے حضور جاسکے۔ سو حکیم مذکور کے سوا ایسا اور کوئی نہ ملا۔ اس لیئے انھیں کو اس خدمت پر مقرر کیا، مگر وزیر الممالک اُن کے تقرر سے ملدر ہیں۔ کیا کریں۔ صاحب رزیڈنٹ کی مرضی سے چارہ نہیں۔

۱۴۹ ایک خط سے معلوم ہوا کہ دیوہ جہاں گیر آباد کے علاقے میں جو صف شکن خاں پسر [illegible] خاں کے تحت حکومت ہے، زمین داروں نے بسبب گاؤکشی کے مسلمانوں پر بلوہ کیا، جدال و قتال کی نوبت پہنچی۔ مسلمان کم تھے مغلوب ہوئے۔ صف شکن خاں لکھنؤ میں تھا، یہہ حال سن کر جلد روانہ ہوا اور مفسدوں سے لڑائی ٹھان دی، جب یہہ خبر رزیڈنٹ کو پہنچی، تو دو توپ اور دو کمپنی چھاؤنی منڈیاؤں سے صف شکن خاں کی کمک کو رزیڈنٹ بہادر نے بھیجیں۔ نواب وزیر الممالک نے صاحب رزیڈنٹ سے کہا کہ

مفسدوں کی کثرت ہے، اور فوج سرکاری کم ہے۔ اس جماعت کثیر سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گی۔ فوج سلطانی کے تیار ہونے تک دونوں کمپنیاں متوقف رہیں صاحب رزیڈنٹ نے اس بات پر کچھ توجہ نہ کی، اور کمپنیوں کو روانہ کیا گیا۔ گیارھویں جمادی الاولیٰ کو خبر آئی کہ سپاہ انگریزی بھی بہت مقتول ہوئی اور سردار فوج بھی جو کمان افسر ہوکر گیا تھا، مارا گیا ۔ صاحب رزیڈنٹ نے برہم ہوکر ایک پلٹن بہت سے میگزین کے ساتھ روانہ کی، اور بادشاہی پلٹنیں بھی روانہ ہوئیں دیکھا چاہیے کہ اس فوج کے پہنچنے کے بعد کیا معاملہ ہوتا ہے۔
عن ایضاً (اخبار کا نام کرم خوردہ)

۱۵۱ وہاں کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ نواب گورنر جنرل کیلئے ضیافت کا سامان تیار ہو رہا ہے۔ نواب وزیر اپنے سفر کا سامان درست کرتے ہیں۔ جس وقت گورنر جنرل کانہ پور میں داخل ہوں گے، نواب وزیر استقبال کے لئے لکھنؤ سے کانپور جائیں گے ... دونوں ایک رات کو حضرت سلطانی وزیر الممالک کے گھر محفل جشن میں گئے ، وہاں جو حرکات کہ ملازمان حضرت سلطانی سے ہوئیں ان کے لکھنے کی ادب حجاب رخصت نہیں دیتے، یعنی جو کچھ مطرب لوگ کرتے ہیں اس سے ہزار درجہ بہتر بندگان حضرت عالی نے کیا
عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۵۳ باغیوں کی گڑھی پر جو انگریزی اور سلطانی فوج گئی تھی، اس کا حال مطلع الاخبار میں یوم مرقوم ہے کہ لفٹنٹ اندر ینصاحب اور دس سپاہی مقتول اور ۳۵ آدمی مجروح ہوئے، اور توپ خانے کے ۱۱ آدمی مقتول ہوئے، اور بادشاہی فوج میں سے ستر آدمی مارے گئے، اور باغیوں میں سے جو قریب پانسو آدمی کے تھے آدمی کام آئے، آخر کار رات کو باغی چھوڑ بھاگے فقط۔

۱۵۴ وہاں کے ایک خط سے واضح ہوا کہ ایک شخص گم نام نے ایک اینٹ پر چند سطریں لکھ کر صاحب رزیڈنٹ کی کوٹھی کے احاطے میں ڈال دی۔ اس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ جس وقت صاحب رزیڈنٹ بہادر ملک اودھ کے دورے کو گئے تو رعیت خوش تھی کہ اب خوب بندوبست ہوکر فتنہ موقوف ہو جائے گا، لیکن ایک مدت ہوئی کہ رزیڈنٹ ادھر ادھر سے پھر پھرا کر اپنے بنگلے میں آن بیٹھے، اور خلائق کو کچھ آسایش و بہبودی نہ ہوئی۔ پس صاحب رزیڈنٹ نے اس تکلیف کرنے سے کیا مصلحت سوچی تھی۔ الحاصل لوگ اس اینٹ کو صاحب رزیڈنٹ پاس لے گئے، انھوں نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کرکے گورنر جنرل کے پاس بھیجا اور اینٹ حضرت سلطانی کے پاس بھیج دی عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۵۷ اس ریاست کا مآلِ کار جو کچھ سال ہا سال سے عقلا[۵۵] اور دانش مندوں کے ذہن میں آیا کرتا ہے اب اس کے ظہور کا وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے، یعنی جو کچھ ہونا ہے غالباً اسی سال کے اکتوبر یا نومبر میں ہوگا۔

---

[۵۵] باہر والوں کو خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے، لیکن واجد علی شاہ کو اپنے دوسرے مشاغل سے اتنی فرصت کب تھی کہ ان امور سے باخبر رہتے۔

ارباب گورنمنٹ نے تو ہرچند از راہِ شفقت لکھنؤ کے رئیس کو سمجھایا، مگر کوئی نصیحت اثر پذیر نہ ہوئی۔ اب سرکار انگریزی کی جانب سے وہاں رفع شر ہونے کو جو تدبیر کہ عمل میں آئے گی مستحسن ہوگی۔
۲۴ تاریخ مئی کے ایک خط سے واضح ہوا کہ امرائے بادشاہی میں سے چھ شخص جو خلوت و جلوت میں ہر وقت بادشاہ کے انیس تھے قہرِ سلطانی میں مبتلا ہوکر محبوس ہوئے، اور ان کے گھروں کا سارا مال و متاع ضبط ہوگیا۔ محبوسوں کے یہہ نام ہیں۔ رضی الدّولہ، قطب الدّولہ، وحید الدّولہ، ثابت الدّولہ، نجیب الدّولہ، نشاط الدّولہ۔ اور اس خط میں لکھا ہے کہ عجب نہیں کہ چند روز میں انیس الدّولہ، مصاحب الدّولہ، مستقیم الدّولہ، مطیع الدّولہ، یہہ چاروں آدمی بھی کہ ہنوز مصاحبت سلطانی میں گرم ہیں مبتلائے بند و زنداں ہوجائیں۔ از زبدۃ الاخبار

۱۵۸ کہتے ہیں کہ نواب عالی جناب، امیر اعظم گورنر جنرل بہادر موسم زمستاں کے شروع میں ملک اودھ کی طرف تشریف لے جائیں گے اور ریاست کا بند و بست نئی طرز پر کریں گے، اور عجب نہیں کہ رایاتِ دولت و اقبال حدود بیباں تک جائیں، اور اُس ملک کے مفسدوں سے بھی اطمینانِ کلّی حاصل کی جائے۔ از زبدۃ الاخبار

۱۶۶ رضی الدّولہ وغیرہ مصاحبان شاہ اودھ جو موقوف ہوئے۔ سو ایسا مسموع ہوتا ہے کہ حضرت ظلّ سبحانی ان لوگوں کے فراق میں ایسا رویا کرتے ہیں کہ رونے کی آواز محل کے باہر تک جاتی ہے۔ از دہلی اخبار

۱۶۷ درین ولا بہ مقام موہان علاقہ لکھنؤ کے خلیل خاں صاحب اہلِ تسنّن اور غلام محمّد خاں اہلِ تشیع سے نزاع و جنگ ہوئی۔ خلیل خاں کی تلوار سے غلام محمّد مارا گیا۔ اور خلیل خاں قید ہوا۔ یہہ مقدمہ مجتہد کے سپرد ہوا ہے اور خلیل خاں پر انواع انواع ایذا رسانی ہوئی ہے۔ دیکھا چاہیے انجام کیا ہو۔ از مطلع الاخبار

۱۸۶ درمیان رزیڈنٹ بہادر و حضرت سلطانی کے جو ایک شخص متوسط رہا کرتا تھا سو اب یہہ عہدہ موقوف ہوا۔ مگر اس خبر میں اختلاف ہے، بعضے کہتے ہیں کہ حضرت سلطانی ہی کو متوسّط کا رکھنا منظور نہ تھا، اور بعضے کہتے ہیں کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کو متوسّط کا عہدہ اور اس کا رہنا پسند نہ تھا، اس سبب سے موقوف ہوا۔ بادشاہ کو تو اس عہدے کا قائم و برقرار رہنا منظور تھا۔ بہ ہر حال اس بات کی صداقت پیچھے سے معلوم ہوجائے گی۔ نواب اعتماد الدولہ سیّد حامد علی خاں بہادر کا معاملہ بھی عن قریب طے ہوگا اور مطالبہ و مواخذہ سے نجات پائیں گے۔ از زبدۃ الاخبار۔

۱۹۰ وہاں کے خط سے معلوم ہوا کہ ان دنوں سرفراز و کنچنی کے گھر مسّی کی تقریب سے بڑی دھوم دھام کی محفل تھی حضرت سلطانی بھی وزیر الممالک سمیت اُس کے ہاں تشریف لے گئے اور شہر کی ساری کنچنیاں میں اُس کی قدر و منزلت بڑھائی۔ فی الحقیقت حضرت سلطانی کا رتبہ تو کچھ کم نہ ہوا مگر اس کنچنی کا مرتبہ بلند ہوگیا۔ بہ قول سعدی علیہ الرحمت: ز قدر و شوکت سلطان نہ گشت چیزے کم الی آخرہ۔ جب حضرت سلطانی وہاں سے مراجعت کر آئے تو باغ دل کشا میں اُس کنچنی کو بلوا کر عیش و سرور کی خوب

داد دی، عن ایضاً (زبدۃ الاخبار)

۲۰۵ ان دنوں حضرت سلطانی مہمات سلطنت کی طرف کچھ توجہ فرماتے ہیں۔ اور یہہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ وزیر اعظم نواب علی نقی خاں بہادر سے انتظام سلطنت کا بوجہ احسن نہیں ہو سکتا، اس واسطے یہہ مرکوز خاطر ہے کہ جو شخص لائق اس منصب بزرگ کے ہو، اس خدمت پر مامور اور ممتاز فرمایا جائے، اور لکھنؤ میں مشہور ہے کہ عن قریب نواب روشن الدولہ بہادر کانپور سے طلب فرمائے جائیں گے اور خلعت وزارت کا عنایت ہوگا، مگر یہہ بات ابھی معتبر نہیں ہے۔ عن زبدۃ الاخبار

۲۰۶ وہاں کے خط سے معلوم ہوا کہ ان دنوں بادشاہ کی طبیعت وزیر سے ناراض ہے، اور ناراضی کے سبب مختلف سُنے جاتے ہیں۔ بقول شخصے جتنے منہ اتنی باتیں، مگر قوی تر سبب یہی ہے کہ وزیر سے ملک کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ حاصل مُلک بہت کم وصول ہوتا ہے اور جو کچھ وصول ہوتا بھی ہے تو بے جنگ و جدل نہیں ہوتا اور لڑائی بھڑائی سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے سو فوج کشی میں خرچ ہو جاتا۔ الحاصل وزیر و امیر، عامل و ناظم سے جو ہے سو آلودہ غرض ہے، مُلک کی سود و بہبود سے کسی کو کچھ کام نہیں۔ اس صورت میں ملک کا بندوبست کہاں سے ہو۔ از زبدۃ الاخبار۔

قاضی عبدالودود

---

۵۔ اسعد الاخبار میں 'چھپیا' کا [illegible] ہوگا [illegible] اور کبھی کبھی اس کے ساتھ فعل جمع آنے پر بھی اس کی جمع نہیں دی
اس کی مثالیں غالب کے خطوط میں مل سکتی ہیں۔

---

**تصحیح**

بشارۃ الامامتہ میں ولایت علی خاں مرحوم کی نسبت جو لکھا گیا تھا، اُسے پڑھ کر جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ "آخرِ عمر میں ولایت علی خاں کو نواب بہادر کا خطاب ملا تھا، جلسۂ تہنیت میں میں خود شریک ہوا تھا"

جون کے "معاصر" میں جو افسانہ "اُف گھاروگ" شایع ہوا ہے اس کے مترجم رضا مظہری صاحب ہیں۔

# یادِ گزشتگاں

نہ وہ دل رہا نہ وہ اہلِ دل نہ وہ جوشِ ذوق فزا رہا
وہ سماں رہا نہ وہ صحبتیں، نہ وہ صحبتوں میں مزا رہا
وہ گزشتگان کی جو یاد ہے کچھ اسی سے دل کو سواد ہے
یہی اک وظیفہ جو یاد ہے یہ رہا بھی یاد تو کیا رہا
نہ ہے بے خودی شبِ وصل کی کہ جو صبح ہوتے جدا ہوئے
تو کسی نے ہم سے جو کچھ کہا ہمیں یاد کچھ نہ ذرا رہا
وہ شبِ فراق کی حسرتیں وہ شبِ وصال کے ولولے
درِ شکوہ باز جدا رہا، درِ ناز باز جدا رہا
نہ کسی سے صحبتِ روز و شب نہ کسی سے صاف الگ تھلگ
جو ملا، ملا، نہ ملا، نہیں، مرا ڈھنگ سب سے جدا رہا
نہ حکایتیں نہ شکایتیں نہ روایتیں نہ ہدایتیں
نہ تعلیاں نہ تجلیاں، جو رہا وہ رنگ نیا رہا
یہ مرا مقام سکوں نہیں نہیں ایک وہ جو زبوں نہیں
نہ قرار ہے نہ قیام ہے، جو وہ آ رہا تو یہ جا رہا

آزاد عظیم آبادی

# غیرت

آؤ نجمہ جھولا جھولیں، ہنس کر، کچھ تو بچپن کی تاد تازہ ہو جائے گی۔

باغ میں ایک تناور درخت پر ایک خوبصورت جھولا ہچکولے لے رہا تھا، جس میں ریشم کی ڈوریں پڑی ہوئی تھیں اور تختے پر مخمل کے گدّے استوار کسے ہوئے تھے

نجمہ کی نظر بے ساختہ جھولے پر جا پڑی اور وہ مسکرا کر رہ گئی، کیوں کیا ہوا نجمہ، یہ تم مسکرا کر کیوں رہ گئیں،

کیسی باتیں کرتے ہو شمس، اب بھلا جھولنے کا کون سائل ہے کیوں؟

یہ کھیل تو کچھ بچپن ہی میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ معصومانہ شغل ہو اور معصوم زندگی سے وابستہ رہنے ہی میں اس کا وقار ہے، ہمارا تمہارا سن اب جھولا جھولنے کا نہیں ہے،

شمس انسانی زندگی کے تمام کھیل جھولے سے مماثل ہیں۔ اس لئے زندگی کے ہر دور میں، انسان کو اس نوع کے چکّر سے گذرنا ہوتا ہے۔ جھولا ہمیں زندگی کے جزر و مد اتار چڑھاؤ سے نزدیک کرتا ہے، اس میں سن کی کوئی قید نہیں، سچ پوچھو تو جوانی ہی میں جھولا جھولنے کا مزا ہے۔ مصنوعی جھولے پر زندگی کی پینگ کچھ ... دے جاتی ہے۔

نجمہ اب تم ضلع جگت پر اتر آئے، مجھے تو اب جھولے پر چڑھنے میں بھی شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ پھر کہا

آفتاب اپنی شعاع قرمزی کا چتر لگائے گنبد دوار کے جھولے سے نیچے اتر رہا ہے۔ تاریکی پھیلتی جارہی ہے۔ باغ میں سوا نجمہ اور شمس کے دوسرا کوئی نہیں ہے۔

نجمہ اور شمس کالج کے دوست ہیں اور دونوں بی۔ اے کر چکے ہیں چوں کہ نجمہ شباب کے رنگین وادیوں میں کافی نمو حاصل کر چکی تھی اس لئے کالج کی جذبات آفریں فضا اس کے حق میں مسموم خیال کی گئی، مگر شمس ام۔ اے کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ شمس نجمہ پر بری طرح گرویدہ تھا، مگر نجمہ ایک حسین تتلی تھی ... اپنے ہر نوجوان اور حسین دوست سے کرتی مگر محبت، اصلی محبت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ نجمہ کا دل تو ضرور تھا، مگر اس میں گداختگی نہ تھی، دوسرے کے دلوں سے کھیلنے میں وہ برق تھی ... نمناک میں اسے کافی سرور ملتا، اس میں شک نہیں کہ اس کو اپنے جذبات پر کافی قدرت تھی، وہ اپنے ... سے آزادانہ بے تکلفی برتنے پر بھی نسوانی محبت کے خطرناک راستے سے الگ تھلگ رہتی، اس لئے نجمہ کی الفت اک خواب تشنۂ تعبیر اک شاعرانہ تخیل ہو کر رہ گئی، سراج حسن کے موتی پروانے رفتہ رفتہ نابود ہو گئے، شمس البتہ اس آستانِ حسن کی چوکھٹ پر انعکاس ضیا کرتا رہا، پھر بھی نجمہ کا غرور حسن مقام محمود پر بدستور قائم رہا، ہونے والی نہیں رکتی، نجمہ کی شادی اقبال ایک بیرسٹر سے ہو گئی مگر وہ نجمہ کی میزان حسن پر سبک ثابت ہوا،

اقبال ایک ایسا نوجوان تھا، جس میں رومانی زندگی کا لذت آفریں احساس نہ تھا، وہ زن وشو کے تعلقات کا مفہوم گھریلو زندگی کے اصول پر سمجھا تھا، یہی وجہ تھی کہ نجمہ اور اقبال میں بہت ہی جلد ان بن ہوگئی تاہل کی زندگی اگر محبت کے تحت میں قائم ہو جائے نورٌ علیٰ نور ہے، مگر بدقسمتی سے اس میں کچھ ایسے ایسے الجھاؤ پڑ جاتے ہیں کہ تمام عمر کوفت اور سرگرانی میں تیر ہو جاتی ہے۔

شوہر سے نا چاق کے بعد نجمہ اپنے گھر لوٹ آئی، امارت اور تنہائی چین کی زندگی میں معین ہوئی، نجمہ نے نئے سرے سے سماج کو نوازا اور اس کی رونق بڑھانے لگی، تعلیم، دولت، حسن اور جوانی نے اس کی عشرت پسند زندگی میں چار چاند لگا دئے، ناکتخدائی کے ایام میں جو جھجک تھی وہ شادی کے بعد جاتی رہی اب دل پھینک یاروں کا مجمع اس کے آستانے پر موجود رہنے لگا۔

اسی سلسلے کی یہ ایک کڑی تھی کہ آج نجمہ اور شمس تنہا باغ میں جھولے کے قریب اپنی دلچسپیوں میں اضافہ کر رہے تھے شمس کی فطرت تلوّن طبعی کی بوقلمونیوں سے رنگین تھی وہ

"کہ ہر دم برگلے دیگر سرایند"

کے مقولے پر عامل تھا، بہت جلد خیال کر بیٹھا کہ نجمہ شوہر سے برانگیختہ ہونے کے باعث اس کی ہوس رانیوں کا شکار ہو جائے گی، نجمہ کی بے تکلفی، بڑھتا ہوا اخلاق، اور گونہ بے باکی نے شمس کے حسن ظن میں کافی اضافہ کر دیا، باوجودیکہ نجمہ نے جھولا جھولنے سے انکار کر دیا تھا مگر وہ اپنی جگہ پر کچھ اور سمجھے ہوئے تھا، نجمہ کے انکار کو وہ ناز معشوقانہ پر محمول کر رہا تھا، نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ جھولے کی جانب بڑھا اور اسے جھولے پر چڑھا دیا، پینگ چلی اور جھولا متلون مزاج معشوقوں کی طرح کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ہچکولے لینے لگا شمس نے ہلکے سروں میں الاپنا شروع ہوا:

تیری آنکھیں ہیں مجھے مست بنانیوالی    بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلانے والی

شمس موسیقی کا استاد نہیں تو ماہر ضرور تھا، نجمہ کو بھی گانے سے خاص لگاؤ تھا، وہ پیانو پر ہندی گیت اور غزلیں بہت خوبی سے بجا اور گا سکتی تھی، شمس کے دل میں اترنے والی آواز نے سناٹے کے عالم میں جبکہ پھولوں کی خوشبو ہوا میں محیط ہو کر مشام جان کو معطر کر رہی تھی اک عجیب سماں پیدا کر دیا، مرغانِ چمن ساکت ہوگئے، بلبل اپنا نغمہ بھول گئی، شاما کی سریلی آواز خاموش تھی کوئل کی گھگھی بندھ گئی، نجمہ پر اس دل آویز نغمہ، رسیلی آواز اور سامعہ نواز زیر وبم نے گویا جادو کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے موسیقی کی فضا میں محو ہوگئی، اسے خبر تک نہ ہوئی کہ گانا کب ختم ہوا اور جھولا کب رکا، شمس نے جب سہارا دے کر جھولے سے نیچے اتارا تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ اسی محبت کے عالم میں وہ گول کمرے میں پہونچی وہاں پہونچ کر وہ ایک عاشق کے دل کی طرح وسیع کوچ میں داخل ہو کر کھوگئی۔

شمس پاس ہی اک کوچ پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے اپنا مرتعش ہاتھ بڑھا کر نجمہ کی سیمیں انگلیوں میں

اپنی انگلیاں پیوست کر دیں، نجمہ نے کوئی مزاحمت نہ کی، اس کی خاموشی شمس کی جرأت میں معین ہوئی، اور اس نے نجمہ کی حسین انگلیوں پر اپنے گرم گرم ہونٹھوں کو ثبت کر دیا۔ نجمہ نے چونک کر ہاتھ کھینچ لیا

شمس کیوں کیا خفا ہوگئیں نجمہ ؟

نجمہ شمس میں تم کو اپنا گہرا دوست سمجھتی ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، دوست کی محبت اور شوہر کی الفت میں امتیاز کرنا، صنف نازک کی بہترین صفت ہے، دوستی کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں سے شوہر کی محبت کی ابتدا ہوتی ہے، میں نے کبھی بھی تم کو اپنے شوہر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا ہے، ورنہ میں اس وقت تمہارے جائز پہلو میں ہوتی، میں جانتی ہوں کہ اپنے حلقۂ احباب میں، ایک حسین تتلی خیال کی جاتی ہوں اور مجھے ان سے اتفاق بھی ہے کیوں کہ میں اپنے پہلو میں ایک ایسا دل رکھتی ہوں جس پر دست رسی مشکل ہے

شمس نجمہ نجمہ میں کوئی لکچر سننے نہیں آیا ہوں "گھٹنے ٹیک کر" میری صورت سوال ہے اور میری زندگی تمہارے ہاتھ ہے۔

نجمہ ہاں! ہاں! شمس یہ کیا کرتے ہو، آخر تم نے سوچا بھی ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے، اور تم مجھ چاہتے کیا ہو

شمس میں تم کو چاہتا ہوں، بس تم کو چاہتا ہوں نجمہ

نجمہ شمس، لیکن ذرا یہ تو کہو کہ تمہاری رطب اللسانیوں میں واقعیت کا رنگ کہاں تک غالب ہے تم خوب جانتے ہو کہ اب میں کسی طرح تمہاری نہیں ہو سکتی تو پھر ان مظاہروں کا مطلب ؟

شمس نجمہ میں بس اسی قدر جانتا ہوں کہ میں تم پر مرتا ہوں، جس عنوان سے بھی ہو، تم کو میری ہونا چاہیے

نجمہ میں دیکھتی ہوں کہ تم اب دائرہ تہذیب سے گذرتے جا رہے ہو، تمہارا جھوٹا جادو مجھ پر نہیں چل سکتا، ذرا اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ تو کہو کہ تم نے کتنی حسین عورتوں کے سامنے یہ رٹا ہوا سبق دہرایا ہے اور کتنی الھڑ، البیلی، ناتجربہ کار دوشیزوں پر اپنی طاقت لسانی کا جادو جگایا ہو۔

شمس یہ تم کیا کہہ رہی ہو نجمہ

نجمہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سب سچ ہے نام سنو گے۔ ناہیدہ، جمیلہ، رابعہ اور سعیدہ سب کی سب تمہارے پنجۂ ہوس کا شکار ہو چکی ہیں" تم صحیح معنوں میں ہر دیگی چمچہ ہو"

شمس غلط میں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا ہے، ہمارے اُن کے تعلقات محض دوستانہ تھے اور ہیں،

نجمہ تو پھر میرے ساتھ بھی اپنا تعلق دوستانہ ہی رکھو

شمس تمھاری اور بات ہے نجمہ، تم میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے،

نجمہ میں ہرگز اس نظریہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں، یہ سب کی سب میری جیسی شریف اور مجبور

بڑھ کر حسین اور جمیل ہیں، آخر مجھ میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔

شمس یہ تو میرے دل سے پوچھو، آہ۔ میں تو اس کم بخت دل سے مجبور ہوں۔

نجمہ بس اب خاموش رہو، تم نے نہ معلوم کتنی ناکتخدا معصوم لڑکیوں کو شادی کا سبز باغ دکھا کر انکی عصمت کو ناس کیا اور پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلیں۔ بیاہی عورتوں کو جھوٹی محبت کے افسانے ریا کے آنسو اور مصنوعی آہوں کا طلسم کھڑا کرکے ان کی آب رو موتی جیسی پاکیزہ آب رو خاک میں ملادی اور پھر کوئی اعتنا نہ کی میں تمہارے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں تمہارا مصنوعی جادو مجھ پر چل نہیں سکتا۔

شمس نجمہ ہمارے خلاف تمہارے کان ضرور کسی دشمن نے بھر دئے ہیں، میری جان اب مجھ میں تاب صبر نہیں، لو بس اب زیادہ نہ ستاؤ۔

یہ کہہ کر شمس نے نجمہ کو اپنی جانب کھینچا، بے خبر نجمہ بے ساختہ شمس کی گود میں کھنچ آئی، شمس اپنے ناپاک لب نجمہ کے معصوم گالوں پر رکھنا ہی چاہتا کہ نجمہ سنبھل گئی اور سنبھل کر اُس نے شمس کے لپکتے ہوئے منھ پر اک تھپڑ اس زور سے کھینچ ماری کہ سارا کمرہ گونج اٹھا۔ شمس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور نجمہ بدستور کوچ پر بیٹھ گئی۔ شمس کے غصّہ اور ندامت کا پارہ اعتدال سے کئی ڈگری اوپر کو سرک گیا وہ دیوانوں کی طرح اٹھا اور چاہتا تھا کہ نجمہ کو زبردستی اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لے کہ یکایک اس کی نظر دروازے پر جا پڑی، وہاں ناہیدہ، جمیلہ، رابعہ اور سعیدہ کھڑی زیر لب مسکرا رہی تھیں، شمس تیورا کر پھر وہیں بیٹھ گیا۔

نجمہ آؤ بہنو۔ مسٹر شمس سے ملاقات تو کرلو، یہ تم لوگوں ہی کا انتظار کر رہے تھے،

ناہیدہ بہن نجمہ یہ ایک سریلی آواز گول کمرے میں کیسی گونجی تھی؟

نجمہ شمس صاحب کی ملاقات کی خوشی میں مَیں نے ایک ہلکی سی تالی بجائی تھی۔

اس پر اک زبردست قہقہہ پڑا اور شمس گردن جھکا کر تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

..........

اقبال نجمہ کے چلے جانے کے بعد اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگا، ابتدائے ازدواج سے یوم جدائی تک کے کل واقعات اور معاملات کو سلجھا سلجھا کر اپنے دماغ کے سامنے رکھ کر اس نے ان کی تشریح، تنقیح اور تنقید کی اس تجزیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ صنفی تعلقات کے تحت میں اسے اپنی فلسفیانہ روش کی غلطی کھلی کھلی نظر آنے لگی، نجمہ کی حسین، پاک اور بے لوث محبت کی زندہ تصویر اقبال کی آنکھوں میں گردش کرنے لگی۔

اُدھر نجمہ شمس کی بے عنوانیوں کے بعد اپنے سائے سے بھی گھبرانے لگی اپنی حسین ہستی میں

اُسے اک ایسی نازک اور معصوم شئے کے وجود کا احساس ہوا جو کہ ایک مرتبہ کھو جانے کے بعد پھر کبھی ہاتھ نہیں آتی، اس پر روشن ہو گیا کہ عصمت کی حفاظت فرض ہے اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امانت اُس کے حقیقی محافظ کو سونپ دی جائے۔

انھیں جذبات کے تحت میں نجمہ نے اقبال کو ایک معذرت نامہ لکھ بھیجا۔

اِدھر نجمہ کا خط ڈاک خانہ پہونچا اُدھر اقبال گھر سے روانہ ہوا۔

نجمہ باغ میں جھولے کے پاس سر جھکائے بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی اُس کے چہرے پر کبھی تبسّم اور کبھی فکر اور تردد کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کا استغراق اتنا گہرا ہے کہ اسے اپنے ماحول کی کچھ بھی خبر نہیں۔ دفعتًا اس کی آنکھوں پر پس پشت سے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دئے وہ سہم کر چونک گئی اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے وسواس ہوا کہ ہو نہ ہو شمس اس کی عصمت دری کے لئے آج پھر تیار ہو کر آیا ہے۔ ڈر اور غصّہ کی دو متضاد کیفیتیں اس پر طاری ہو گئیں جی کڑا کر کے اُس نے ہاتھ جھٹک دئے اور تن کر آمنے سامنے کھڑی ہو گئی، آنکھیں چار ہوتے ہی نجمہ کی نگاہیں نیچی ہو گئیں اور نجمہ کے پاؤں کی جانب کوئی لرزتی ہوئی شئے بڑھتی نظر آئی نجمہ نے پاؤں تو کھینچ لئے لیکن اپنے حسین مگر عرق آلود گالوں کو اس کے سینے پر رکھ کر آہستہ سے بولی 'اقبال'

سید نصیر حیدر نصیر

# ہلمٹ

"۔۔۔ لیکن چچا جان ۔ مجھے تو اس سے محبت ہے" "خاموش !"
" اسے مجھے سونپ دیجئے " " فضول بکواس مت کرو "
" وہ میرے لئے وجہ حیات ہے" " باجی ! کیا دنیا میں یہی ایک لڑکی ہے ؟
" خدا کے لئے ۔۔۔۔۔"

اُن کی پشت میری جانب تھی ، وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ مڑے ، غصہ سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور سارا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔

"نہیں ہرگز نہیں !" میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہا ، میری ملتجی نگاہیں اب بھی رُوز کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ میں سراپا پیکر نیاز بنا ہوا تھا اور معصومانہ انداز میں خاموش کھڑا تھا۔

"ذرا آئینہ میں اپنی شکل دیکھو ۔۔۔ بیوی رکھیں گے ! پاس میں ایک ٹکا نہیں، چہرے پر افلاس برس رہا ہے اور میں اپنی بیٹی دے دوں ! چلو ، ہٹو !"

مزید روستائی بے فائدہ تھی ، میں چچا جان کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا ، ان کی ہٹ تریاہٹ سے بھی پرے تھی ، دل ٹوٹ گیا ، آنکھیں نم ہوگئیں ، اک آہ سرد بھر کر دل کو تسلّی دی اور ایک زنگ آلود سرٹی سے تلوار کو صاف کرنے لگا ۔ وہ دکان کیا تھی ایک میوزیم تھا ، دیوار پر عہد وسطیٰ کی ایک ٹوٹی ہوئی شمشیر آویزاں تھی ، اس کے اوپر ایک ترکی خنجر کا دستہ اور دستے کے دائیں جانب عہدِ نپولین کی ایک صندوق تھی جس کی لبلبی ٹوٹی ہوئی تھی ، سب سے اوپر عورتوں کی چند نیم عُریاں تصویریں تھیں جنھیں اُسی کے قدیم آرٹ کا نمونہ کہا جاتا تھا ، گوشے میں اونچے سے میز پر سینٹ جان کا سنگ مرمر کا چھوٹا سا مجسمہ تھا جس کا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا ۔ میز کے نزدیک ہی شیشے کی الماری تھی جس میں چند میلی میلی انگوٹھیاں یاقوت اور سنگ سُرخ کے چند ٹکڑے ، کچھ تمغے ، کچھ سکّے ۔۔۔۔ شام کے وقت جب آفتاب کی حسین شعاعیں ان کو جھانکنے آتیں تو رُوز کی آنکھوں میں جیکا چوند سی پیدا ہو جاتا اور میں اکثر اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہوتا۔ تو یہ دوکان چچا جان کی ساری کائنات تھی اور اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ ۔۔۔ محلے کے لوگ پر کافی رعب تھا۔ میونسپل کونسلر تھے ، جسیم تسیم ، جتنے لمبے اتنے ہی چوڑے ، چھوٹی گردن ، بڑا پیٹ اور ناک پر غصہ ۔ میں نے جب اپنے اسکول کو خیرباد کہا تو انھوں نے بڑی شفقت سے مجھے اپنی اس قلمرو کا واحد حکمراں بنا دیا ۔ لیکن چچا جان کی سب سے بڑی دولت جس پر بجا طور سے انھیں ناز کرنا چاہئے تھا رُوز تھی ۔۔۔ ایک پیکر رعنائی ، یکسر شعر و شباب کا مجسمہ ، جس کی ہر اک نظر میرے لئے ایک نوید حیات اور تبسم معراج زندگی تھا۔

میں اس زنگ آلود تلوار کو رگڑتا جاتا اور دزدیدہ نگاہوں سے روز کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ گملے میں پانی دے رہی تھی۔ چچا جان خوردبین لگائے ایک پرانے تمغے کا معائنہ کر رہے تھے، یک بیک انھوں نے سر اٹھایا، پانچ بج رہے تھے۔ "اف! کونسل" اس لفظ کو انھوں نے ایک مخصوص انداز میں ادا کیا۔ اس طرح پر کہ دونوں گال پھول گئے اور لہجہ غیر معمولی طور پر کرخت تھا، لیکن فوراً ہی کچھ سوچنے لگے، انگشت شہادت پیشانی پر تھی" اوہ، اجلاس تو کل سے شروع ہوتا ہے لیکن ۔۔۔۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے" کرسی سے اُٹھے، خوردبین دراز میں ڈال دی" روز، میری چھڑی اور ہیٹ لانا تو" پھر میری طرف مخاطب ہوئے" دیکھو آج کی گفتگو بھول نہ جانا اور خبردار روز سے ایک بات بھی کی تو کان پکڑ کر یہاں سے نکال دوں گا" روز چھڑی اور ہیٹ لے کر آئی، چچا جان نے اس کی درخشاں پیشانی کا شفقت سے بوسہ لیا اور میری طرف غرّاتے ہوئے نکل گئے۔

میں ابتک اسی زنگ آلود تلوار کو رگڑ رہا تھا، روز میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی" آج کیا ہوا ہے؟ ابا جان خفا معلوم ہو رہے ہیں" میں نے اس کی طرف دیکھا، سیاہ سیاہ آنکھیں جنمیں شراب کی سی مستی انگڑائیاں لے رہی تھی، پیشانی پر کچھ پسینہ کے قطرے قلبی ہیجان کی غمازی کر رہے تھے، وہ اس وقت انسان نہیں بلکہ مجسم رحم و کرم کا فرشتہ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ساری باتیں کہہ سنائیں جیسے جیسے میں کہتا جاتا اس کے رخسار کی سفیدی رفتہ رفتہ سرخی میں تبدیل ہوتی جاتی بالکل اسی طرح جیسے شام کے وقت مغربی افق پہلے سفید رہتا ہے پھر رفتہ رفتہ قرمزی اور گلابی جوڑا پہن لیتا ہے۔

"کیا تم رنج ہو گئیں" میں لرزنے لگا" روز کیا تم رنج ہو گئیں"۔ روز نے اپنا گورا گورا ہاتھ فرطِ محبت سے میری جانب بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پنکھڑی جیسے لبوں پر وفورِ شوق مہرِ محبت ثبت کر دی۔" بخدا تم میری ہو کر رہو گی" لیکن روز کا گلاب سا چہرہ مرجھا رہا تھا، محبت کا مبہم مستقبل اس کے سکون قلب کو تاراج کر رہا تھا" میں جانتا ہوں کہ چچا جان ضدی ہیں لیکن میں ان سے زیادہ ضدی ہوں، یقین جانو میں انھیں مجبور کر دوں گا"

"لیکن کیسے؟" روز کی لرزتی ہوتی آواز میں والہانہ دلکشی تھی اور دبے ہوئے جذبات کی لپکی۔ اتنے میں دروازہ پر کسی بھاری بھرکم پاؤں کی چاپ سنائی دی، جیسے بلّی کی آواز سے چوہے بھاگیں فوراً ہی ہم لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، میں اپنے زنگ آلود تلوار کو صاف کرنے لگا اور روز بھی اپنے گون کے دامن سے الماری کا شیشہ صاف کرنے لگی۔

چچا جان اندر آگئے۔ ہمیں ایک ہی جگہ دیکھ کر رک گئے اور بڑی بڑی خوفناک آنکھیں نکال کر گھورنے لگے۔ کبھی مجھ پر کبھی اس پر، لیکن ہم دونوں اپنے اپنے کام میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف تھے اور آنکھیں بھی نہ اٹھائیں۔

"ادھر آؤ، یہ پارسل کھولو" میں نے پارسل ان کے ہاتھوں سے لے لیا، بہت بڑے سائز کا ہلمٹ خود، تھا، گویا معمولی ہلمٹ کا تین گنا۔ نہایت وزنی۔ میں نے درمیانی پیچ کھولنا چاہا۔

"احمق! زنگ لگا ہوا ہے زنگ۔ کل اسے صاف کرنا ہوگا" چچا جان نے ڈانٹ کر کہا۔

"بہت اچھا" میں نے دبی زبان سے جواب دیا اور ڈر سے نظریں نیچی کر لیں۔

رات کے وقت میں سویرے ہی بستر پر دراز ہوگیا اور معاملہ پر تنہائی میں ہر ممکن طریقہ سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ تین گھنٹہ تک کوئی ممکن صورت ذہن میں نہ آئی۔ اضطراب میں گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہا اور اسی ادھیڑ بن میں نہ معلوم کس وقت آنکھ لگ گئی۔ صبح تک عجب عجب خواب پریشاں دیکھتا رہا۔ دیکھا کہ روز کی شادی ہو رہی ہے۔ رنگ برنگ کے زرق برق کپڑوں میں وہ ایک حسین گڑیا معلوم ہوری ہے۔ پھر یک بیک دیکھا کہ چاندنی رات ہے۔ بہت سی زنگ خوردہ تلواریں اور پرانے فولاد کے بڑے بڑے ہلمٹ پڑے ہوئے ہیں اور چچا جان سب کا معائنہ کر رہے ہیں اور میں ایک زنگ آلودہ تلوار رگڑ رہا ہوں"۔

دوسرے روز — ہاں دوسرے ہی روز میں دوکان میں بیٹھا ہمہ تن اس ہلمٹ کی صفائی میں مصروف تھا۔ چند گھنٹہ کی کامل ورزش کے بعد وہ براق سا چمکنے لگا۔ چچا جان پاس ہی بیٹھے پائپ کا کش لگا رہے تھے ان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میری اس ہلمٹ پر۔ لیکن گاہے گاہے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتا اور سہم جاتا، مناجاتیں کرتا جاتا کہ خدا ان کے دل میں رحم ودیعت کر دے۔

تین بج گئے، روز کو کسی ضرورت سے باہر جانا تھا اور شب کے کھانے کے پہلے وہ نہ آسکتی تھی، دروازے کے باہر چچا جان کی نظروں سے اوجھل وہ چند لمحہ تک مجھے معصومانہ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ میں بھی اسے دیکھا کیا "کتنا رگڑ رہے ہو صاف تو ہوگیا" چچا جان کی کرخت آواز نے چونکا دیا۔ انہوں نے میرے ہاتھوں سے ہلمٹ لے لیا "کتنی عمدہ چیز ہے لیکن اف کچھ وزنی ... ہے"۔ وہ کہنے گئے اور نہ معلوم کیا جی میں آئی کہ جھٹ ہلمٹ سر پر ڈال لیا "کیا بھونڈی سی شکل نکل آئی" میں نے دل میں سوچا۔ اتنے میں ایک آواز آئی۔ ہلمٹ کی اسپرنگ نکل پڑی ... نیچے والا حصہ گردن میں پھنس گیا۔ چچا جان کی آنکھیں نکل آئیں اور منہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت بن گئی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں ہنستے ہنستے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ چچا جان کا چہرہ تو ہلمٹ کے اندر تھا لیکن وہ برابر ڈانٹ رہے تھے "پیچ والا پیچ، پیچ والا پیچ احمق" وہ چلاتے رہے "تم نے ہنسنا کب سیکھا گدھے!" لیکن ہلمٹ ان پر مسلط تھا اور اس کے اندر سے انکی آواز کی صدائے بازگشت اس انداز میں باہر آتی تھی کہ میری ہنسی ضبط سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس وقت سامنے کے ہوٹل کی گھڑی میں پانچ بجنے کی آواز سنائی دی "میونسپل کونسل" چچا جان ہلمٹ کے اندر سے چلا رہے تھے "جلدی کرو اس لعنت آہنی شیطان کو میرے سر سے اتارو۔ جلدی کرو۔ ہم لوگ اپنا معاملہ کسی نہ کسی طرح طے کر لیں گے۔

"معاملہ"! اچانک مجھے اپنی بات یاد آگئی۔ ایک شرارت سوجھی اور سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی۔ جنوں عشق کبھی کبھی عقل و فرزانگی پر بھی سبقت لے جاتا ہے۔ "نہیں!" میں نے جواب دیا۔ چچا جان غصہ میں دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ہلمٹ کے اندر ہی سے غرائے "میں اس وقت تک اس آہنی ویوت مخلصی ولانے کے لئے تیار نہیں جب تک میری روز مجھے نہ سونپ دیجئے" اس پنجرہ کے اندر سے گرجنے کی آواز آئی مگر میں نے مطلق کان نہ دھرے۔ "میں صرف اس پنجرہ میں مقفل ہی رکھنے پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ ہمسایہ کے لوگوں کو اور میونسپل کونسل کے کل ممبروں کو یہ قابل دید تماشہ دکھلانے کے لئے بلا لاؤں گا۔"

"تم پھانسی پر لٹکائے جاؤ گے موذی" چچا جان پھر گرجے "جلد فیصلہ کیجئے کوئی آرہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"تو... تو... اچھا... میں رضامند ہوں مگر جلدی کرو" ہلمٹ میں نے ہٹا دیا۔ چچا جان کا چہرہ نکل آیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک دوسرا میونسپل کونسلر دوکان میں داخل ہوا۔ "کیوں، اجلاس شروع ہو گیا ہو گا" اس نے کہا

"میں بالکل تیار ہوں" بغیر میری طرف دیکھے ہوئے چھڑی اور ہیٹ اٹھایا اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے دروازے سے نکل گئے۔ جب میں نے سارے معاملے پر غور کیا تو چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یہ میں نے کیا کیا؟ چچا جان مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ پھانسی...

کھانے کے وقت میں ان کے داہنی طرف بیٹھا۔ بہت کم کھایا اور کچھ نہ بولا۔ روز برابر میری طرف دیکھتی رہی مگر میں مارے خوف کے اس سے آنکھیں برابر نہ کرتا۔ چچا جان نے پائپ سلگایا، سر اٹھایا اور اس کے بعد — "روز! ادھر آؤ" روز ان کے پاس گئی "تم کو معلوم ہے کہ کل اس چھوکرے نے مجھ سے کیا کہا" میں درخت کی پتّی کی طرح کانپنے لگا اور روز بھی لرزنے لگی "کہ میں تمہیں اسے سونپ دوں، تمہیں منظور ہے؟" روز نے گردن جھکالی۔ "بہتر، اب تم سنو" میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب گیا۔ دیکھ رہا تھا کہ مبادا طمانچہ نہ رسید کیا جائے "فرمائیے" میں نے کہا اور پھر دبی زبان سے "مجھے معاف کر دیجئے میں نادم ہوں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے — "اب وہ تمہاری ہے، گدھے!"

"اوہ......... چچا جان" "اوہ......... ابا جان"

ہم دونوں ان سے لپٹ گئے "آپ کتنے اچھے ہیں" میں نے کہا

"میری دلی تمنّا ہے کہ تم لوگ خوش رہو" اور میرے کان میں انھوں نے یہ بھی کہا "احمق! میں نے تو پہلے ہی سے یہ جوڑا پسند کر رکھا تھا لیکن دیکھو کل والی بات کسی سے نہ کہنا"

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے وہ "کل والی بات" کسی سے نہ کہی۔ صرف میری جان تمنّا روز جانتی ہے۔ اگر آپ کو اس دوکان سے کبھی گزرنے کا اتفاق ہو تو میں آپ کو وہ ہلمٹ دکھاؤں گا لیکن آپ اسے خریدنے کا ارادہ نہ کریں — اب وہ بے بہا ہے — ہماری محبّت کی یادگار —

محمد زبیر انصاری

(ترجمہ)

# کلامِ ثابت و یوسف عظیم آبادی

ثابت تخلّص موسوم بہ اصالت خان، از قوم افاغنہ۔ مردے سنجیدہ وضع و خوش اخلاق از ریختہ گویانِ شہر عظیم آباد بود و در طریقۂ گرم جوشی و فروتنی ثباتِ قدم داشت۔ در اوائل مشق فکر اشعار بہ حسبِ استعداد بالطبع می کرد، در آواخر خود را بہ سلکِ شاگردانِ مرزا... فدوی.. در آوردہ، در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشت ہجری ازیں جہانِ گذراں درگذشت۔ از دست۔

وقت مرنے کے مرے پاس وہ موجود ہوا — اپنے جی ہی کا زیاں اپنے تئیں سود ہوا

روشن ہے میرے سینۂ سوزاں میں داغ ایک — تاریک گھر میں جلتا ہو جیسے چراغ ایک

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہو دل اب کیا کام کریں — شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

آئینے سے جو منہ چھپا بیٹھے — کہو کوئی اُس کے پاس کیا بیٹھے

اب پیار کرو ہو ہم کو کیا ہے — پیارے کہیں دل تو نہیں لگا ہے

عاقبت تم نے بے وفائی کی — واہ کیا خوب آشنائی کی

جسے کہتے ہیں سب کہ کیا خوب ہے — وہ نام خدا اپنا محبوب ہے

بگولے کا کبھی صدمہ کبھی صرصر کی زحمت ہے — ہماری خاک یوں اڑتی پھرے اے ابرِ رحمت ہے

آبِ حیات میں یہ شعر کسی دوسرے شاعر کی طرف منسوب ہے (حالات و کلام ماخوذ از تذکرۂ عشقی)۔

---

**یوسف**: عشقی نے لکھا ہے کہ یوسف علی خاں نام تھا اور ثابت کے بھانجے تھے۔ کچھ دنوں حاجی پور میں انگریزوں کی طرف سے تھانہ دار تھے، لیکن زمانۂ تالیف تذکرۂ عشقی میں اس عہدے سے دست بردار ہو چکے تھے:

یہ خطِ سبز تیرے منہ پر آیا — کہ جس سے حسن دونا لہلہایا

تو دل سے مرے نہیں ڈرے گا — کیا گھر میں خدا کے گھر کرے گا

کوئی دل سے غافل ہو پند ہے — کہ اس شیشے میں اک پری بند ہے

(ماخوذ از تذکرۂ عشقی)

**قاضی عبدالودود**

# ایک دلچسپ توارد

توارد کے لغوی معنی تو "باہم ایک جگہ اترنا" ہیں لیکن شعرا کی اصطلاح میں دو شخصوں کا مضمون باہم لڑجانا توارد کہلاتا ہے۔ ایک ہی موضوع پر فکر کرنے والوں کے ذہن میں کسی ایک ہی خیال کا آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشقیہ شاعری خصوصاً غزل میں توارد کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ توارد اگر بلا ارادہ واقع ہو تو متاخر شاعر پر سرقہ کا الزام لگانا صریح ظلم ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دورانِ مطالعہ میں کوئی نیا خیال یا کوئی خوبصورت مضمون شاعر کی نظر سے گذرا اور اس کے دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ لیکن ایک زمانہ گذرنے کے بعد وہ بھول گیا کہ یہ مضمون کس کا تھا اور کہاں دیکھا تھا۔ اب جو غزل لکھنے بیٹھا تو بلا ارادہ وہی مضمون نظم ہو گیا۔ ایسی حالت میں بھی اُسے سرقہ کا مجرم ٹھہرانا اور نشانۂ ملامت بنانا انصاف سے بعید ہے کیونکہ اُس نے بالقصد چوری نہیں کی۔

چونکہ عالم الغیوب صرف خدا کی ذات ہے اور دلوں کے بھید اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اس لئے کسی کی نیت اور ارادہ کے متعلق یقینی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ چونکہ عموماً حسنِ ظن سے کام نہیں لیتے اس لئے جب کسی پرانے استاد کا کوئی خاص مضمون کسی نئے شاعر کے یہاں دیکھتے ہیں تو فوراً اُس پر سرقہ کا الزام لگا دیتے ہیں۔ اس سوءِ ظن کا ایک خاص سبب ہے۔ وہ یہ کہ توارد شاذ و نادر اور سرقہ اکثر و بیشتر واقع ہوتا ہے اگرچہ سرقہ کرنے والا اپنی چوری کھل جانے کے بعد ہمیشہ اُسے توارد ہی سے تعبیر کرتا ہے۔

میر صاحب نے ولی دکنی کا ذکر کرتے ہوئے "نکات الشعرا" میں لکھا ہے کہ: "ولی دہلی بھی آئے تھے۔ جب وہ میاں گلشن صاحب سے ملنے گئے اور اپنے کچھ اشعار انھیں سنائے تو میاں صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے یہ تمام مضامین بیکار پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے ریختہ میں نظم کر لو۔ کون تم سے باز پرس کرے گا"

ولی نے میاں گلشن صاحب کے اس مشورے پر کس حد تک عمل کیا ہمیں معلوم نہیں لیکن شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جس نے بقدر استعداد فارسی شعرا کے کلام سے استفادہ نہ کیا ہو حتیٰ کہ ہمارے مشاہیر اساتذہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے لیکن قیامت تو یہ ہے کہ حضرات شعرا دوسروں کے افکار و مضامین کو اپنا زادۂ طبیعت بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل سوءِ ظن کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

شعرائے اردو میں فارسی زبان سے طبعی مناسبت اور ادبیات فارسی کا گہرا مطالعہ مرزا غالب کی طرح شاید کسی دوسرے کا نہ تھا۔ ہندیوں میں بیدل اور ایرانیوں میں نظیری، ظہوری وغیرہ کا رنگ اُن کے کلام میں صاف طور پر جھلکتا ہے اور اُن کے یہاں ایسے متعدد اشعار پائے جاتے ہیں جو کلیتہً یا کسی حد تک فارسی اشعار سے

ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ توارد ہے یا سہواً یا ارادۃً غالب نے ان مضامین کو فارسی سے اخذ کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پیامی:۔ بیم از دفا مدار بدہ وعدہ کہ من ۔۔ از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم
(تو مجھ سے وعدہ کرلے۔ اس کی فکر نہ کر وعدہ پورا کرنا بھی پڑے گا کیونکہ تیرے وعدے کی خوشی سے میں آج ہی شادی مرگ ہو جاؤں گا۔ کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا جو ایفائے وعدہ کی نوبت آئے)

غالب:۔ تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۔۔ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لاادخاتون:۔ من اگر توبہ زمی کردہ ام اے سرو سہی ۔۔ تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی
(اے سروِ سہی، اگر میں نے میخواری سے توبہ کی ہے تو تو نے تو مجھے شراب پلانے سے توبہ نہیں کی۔ پھر تو کیوں نہیں پلاتا)

غالب:۔ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۔۔ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہلالی:۔ از شوقِ تو صد بوسہ زنم بر دہنِ خویش ۔۔ ہر گاہ کہ نام تو بر آید ز زبانم

لاادعلم:۔ زیں نام چو ترکنم زباں را ۔۔ جاں بوسہ دہد سرِ زباں را
(جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح میری زبان کو چوم لیتی ہے)

غالب:۔ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ۔۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حامدی:۔ ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیالِ تو ۔۔ چناں بینم کہ افتد چشمِ غیرے بر جمالِ تو
(اگر تیرا خیال میرے دل میں گذرے تو مجھے اپنے دل پر بھی رشک آنے لگتا ہے۔ پھر بھلا میں یہ کیونکر دیکھ سکتا ہوں کہ کسی غیر کی نظر تجھ پر پڑے)

غالب:۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۔۔ میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خیام ۔۔ گر میل تو با بے خرد و نا اہل است ۔۔ من نیز چناں اہل و خردمند نیم
(اے آسمان اگر تو احمقوں اور نالائقوں کی طرف مائل ہے تو میں بھی تو کچھ ایسا دانشمند اور لائق نہیں ہوں)

غالب:۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ۔۔ کس لئے ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لاادعلم ۔۔ ز خضر عمر فزونست عاشقانِ زاں را ۔۔ اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را
(اگر فراق کے دن بھی عمر میں شمار کئے جائیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے)

غالب:۔ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۔۔ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

جامی:۔ آسماں جام نگوں داں کز مے عشرت تہی ست ۔۔ جستنِ مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی ست
(آسمان کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شرابِ عیش سے خالی ہے۔ خالی جام سے شراب چاہنا بیوقوفی کی علامت ہے)

غالب: مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے — لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

نظیری: راز دیرینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ — حال ما شہرہ بہ انشائے غزل ساخت دریغ

(ہائے پرانا راز افشا ہو گیا۔ غزل نگاری کی بدولت ہمارا حال سارے شہر میں مشہور ہو گیا)

غالب: کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

میر معز فطرت: ہر عضو من ز دستِ تو دارد شکایتے — چوں ارغنوں لبالبم از نالہ ہائے زار

(میرا ہر ہر عضو تم سے گلہ مند ہے۔ ارگن کی طرح میں نالہ ہائے زار سے پُر ہوں)

غالب: پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

لا اعلم: سرت گردم بزن تیغ و درے بر روئے دل بکشا — دلم تنگ است و کار از زخم پیکاں بر نمی آید

(تیرے قربان، تلوار لگا اور دل کے سامنے ایک دروازہ کھول دے۔ میرا دل بہت تنگ ہے پیکان کے زخم سے کام نہیں چلے گا)

غالب: نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں — وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

صیدی طرانی: چہ بہرہ از گل رویش ہوس گداختہ را — بہار فیض نہ بخشد جنون ساختہ را

(ہوس کے مارے ہوئے کو اس کے گلِ عارض سے کیا ملے گا۔ مصنوعی دیوانگی کو بہار کوئی فیض حاصل نہیں سکتا)

غالب: وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد — جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

غالباً مرزا غالب کے اسی قسم کے اشعار پر حریفوں نے حرف گیریاں کی ہونگی چونکہ مرزا غالب کوئی سنجیدہ جواب اس قسم کا نہیں دے سکتے تھے کہ بدگمان طبیعتیں مطمئن ہو جائیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ مرزا کے یہاں سرقہ نہیں توارد ہے۔ اس لئے مرزا نے اپنے ظریفانہ انداز میں ایک ایسی بات کہی جس نے سرقہ اور توارد کا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ بلکہ شعرائے متقدمین ہی کو سرقہ کا مجرم بنا دیا۔ فرماتے ہیں:۔

### قطعۂ مرزا غالب

ہزار معنی سرجوش خاصِ نطقِ من است — کز اہلِ ذوق دل و گوے از عسل بُردست

(ہزاروں معنی بلند خاص میرا حصہ ہیں جنہوں نے اہلِ ذوق کا دل چھین لیا اور جو شیرینی میں شہد سے بھی بڑھ گئے)

ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رہ داد — مداں کہ خوبی آرائشِ غزل بُردست

(اگر اگلے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے غزل کے حُسن میں بٹا لگ گیا)

مراست ننگ و لے فخر اوست کاں بہ سخن — بہ معنی نگرِ رسا جا بداں محل بُرد است

(یہ بات میرے لئے باعث ننگ ہے لیکن اُس کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ اپنی فکرِ رسا کی کوشش سے اس مقام تک پہنچا جہاں میری رسائی ہوئی)

مبر گمانِ توارد یقیں شناس کہ دزد — متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بُرد است

(توارد کا تو گمان بھی نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ چور میرا مال خزانۂ ازل سے چرا لے گیا)

گویا متقدمین کے بعض مضامین اگر غالبؔ کے یہاں پائے جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت یہ مضامین ازل میں غالبؔ ہی کے حصے میں آئے تھے۔ وہ لوگ وہیں سے چرا لے گئے۔ اب اگر غالبؔ نے ان مضامین کو اپنے نام سے پیش کیا تو کیا گناہ کیا۔ کیونکہ دراصل وہ اسی کا مال تھے۔ شاعرانہ انداز میں توارد کی یہ توجیہہ لطف سے خالی نہیں مگر مزا یہ ہے کہ یہاں بھی مرزا غالبؔ کو ایک زبردست توارد ہوا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے: مُلّا حسین واعظ کاشفی نے جو نویں صدی ہجری کے ایرانی مصنفین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور اپنی تصانیف کثیرہ خصوصاً انوار سہیلی کی بدولت عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، ایک کتاب "لطائف الطوائف" بھی لکھی ہے جس میں مختلف طبقاتِ انام کے لطائف و ظرائف جمع کیے ہیں۔ اسی لطائف الطوائف میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:-

مولانا مظفر در زمانِ ملکانِ ہرات قصیدہ گوئے زبردست بودہ و در اشعار تتبع خاقانی می کرد۔ در مدح ملک معزالدین حسین قصیدہ غرا گفتہ۔ روزے قصیدہ بر ملک می خواند۔ چوں بدیں بیت رسید:

زیرِ قدرِ تو نہ قبۂ خضرا و خور ✤ تودۂ چند از رماد است درخشاں اخگرے

ملک بوے تعریض کرد و گفت ایں معنی را خاقانی در قصیدہ گفتہ: خاقانی:

چیست مہر و سپہر با قدرش ✤ اخگرے درمیانِ خاکستر

مولانا ہم برآمد و منفعل شد و گفت ایں معنی از من بُردہ ملک حسین گفت ایں سخن چوں راست آید و حال آں کہ خاقانی عمر ہا پیش از تو وفات یافتہ۔ مولانا گفت اے ملک، معانی را کہ در ازل از مبدءِ فیاض متوجہ مدح من بود خاقانی آں را دزدیدہ بنام خود کردہ۔ ملک بخندید و براں قصیدہ مولانا را صلۂ لائق داد۔

شاہانِ ہرات کے عہد میں مولانا مظفر ایک زبردست قصیدہ گو تھے اشعار میں خاقانی کا تتبع کرتے تھے۔ انہوں نے معزالدین حسین، بادشاہ ہرات کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھا۔ ایک دن وہ قصیدہ بادشاہ کو سنا رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے:

"آسمان کے نو گنبد اور آفتاب ممدوح کے مرتبہ کے سامنے ایسے ہیں جیسے راکھ کے چند ڈھیر اور اُنہیں ایک ٹمٹی ہوئی چنگاری"۔ بادشاہ نے ٹوکا کہ یہ مضمون تو خاقانی نے ایک قصیدے میں باندھا ہے: "ممدوح کے مرتبہ کے مقابلہ میں آسمان اور سورج ایسے ہیں جیسے راکھ کے اندر چنگاری" مولانا مظفر چڑھ گئے اور جھینپ کر بولے کہ خاقانی نے یہ مضمون میرا چرایا ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ کیونکر ممکن ہے۔ خاقانی تو آپ سے پہلے گذرا ہے۔ مولانا نے کہا حضور والا! بات یہ ہے کہ جو مضامین ازل ہی سے خدا کی طرف سے میرے لئے مخصوص ہو چکے تھے خاقانی نے انھیں چرا لیا اور اپنے نام سے منسوب کر دیا۔ بادشاہ ہنس پڑا اور اس قصیدے پر مولانا کو معقول انعام دیا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرزا غالبؔ نے مذکورہ بالا قطعہ کا مضمون یہیں سے لیا ہے اور اگر یہ بھی توارد ہے تو غالباً توارد کی ایسی نادر مثال شاید ہی اور کہیں مل سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ: توارد کے سلسلے میں ایرانی اساتذہ کے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں انہیں سے آمدی اور جلال کے شعروں کو چھوڑ کر باقی تمام اشعار میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی کی کتاب "غالب شکن" سے ماخوذ ہیں "غالب شکن" میں اس قسم کے اور بھی بہت سے اشعار درج ہیں جو غالب کا ماخذ بتلائے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی ترتیب کے دوران میں تذکرہ شمیم سخن میں یاسمن (کنیز و شاگرد انشا) کا یہ شعر نظر سے گذرا:-

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت ✤ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ✤ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہ توارد بھی لطف سے خالی نہیں

عندلیب شادانی

# مطبوعاتِ جدیدہ

**الف لیلہ و لیلہ حصۂ دوم:** مترجمۂ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔ صفحات ۵۵، تقطیع اِنچ۔ قیمت تین روپے۔ شایع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند)، دہلی۔

الف لیلہ کی کہانیوں سے کون واقف نہیں۔ ان کی اصلیت جو کچھ بھی ہو، لیکن یہ مغربی زبانوں میں عربی راتیں Arabian Nights ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمیں اس وقت ان کہانیوں کے ماخذ اور 'عربیت' کی تحقیق کرنا نہیں ہے مگر سرسری طور پر اتنا اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ یہ افسانے کم از کم خالص عربی نہیں، اور ان کا کافی حصہ ایرانی اور ہندی داستانوں سے ماخوذ ہے۔ مشہور عربی مورخ مسعودی (ف ۳۴۵ھ یا ۳۴۶ھ) کے بیان کے مطابق "یہ افسانے ایرانی، ہندی اور یونانی ماخذوں سے لیے گئے ہیں"، اُس نے اس سلسلے میں ایک فارسی کتاب 'ہزار افسانہ' کا نام بھی لیا ہے (مروج الذہب: ۴، ۸۹، طبع یورپ)۔ دوسرے محققوں کی رائے یہ ہے کہ ان کہانیوں کا کچھ حصہ ایرانی اور ہندی داستانوں سے ماخوذ ہے، اور کچھ عربی ماحول کی پیداوار ہے، اور کچھ پر مصری چھاپ نمایاں ہے [تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: مقالہ الف لیلہ: تاریخ ادبِ عربی[1] (جرمن) از بروکلمن: ۲، ۵۸-۶۲، نیز ذیل (Supplement): ۲، ۵۹-۶۳، معجم المطبوعات (سرکیس)، ص ۱۹۹۶-۱۹۹۲]

بہرحال اتنا متیقن ہے کہ یہ افسانے عربی زبان میں عرصے سے پائے جاتے ہیں [کم از کم مسعودی (ف ۳۴۵-۶ھ) سے پہلے یہ کسی نہ کسی صورت میں مرتب ہو چکے تھے] اور دنیا کی دوسری زبانوں میں اسی کے واسطے پہنچے ہیں، گو ان کی زبان بھی بہت معمولی ہے، کہیں کہیں رکاکت بھی آجاتی ہے۔ یعنی عامیانہ زبان (اللغۃ الدارجۃ) سے اس کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔

یہ کہانیاں جو اصل عربی میں الفُ لیلۃٍ ولیلۃٌ (ایک ہزار ایک راتیں) کہلاتی ہیں۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں، لیکن ہماری زبان میں اب تک ان کا کوئی مکمل اور مستند ترجمہ نہیں تھا، خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اس کی اہمیت محسوس کی اور عربی کے ایک لائق پروفیسر ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد (مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ) کے ذمے ترجمے کا کام کیا، اب تک دو جلدیں انجمن کے اہتمام سے شایع ہو چکی ہیں۔ جو عربی ایڈیشن [چار جلدیں: کلکتہ ۱۸۳۹ء] کی پہلی جلد کے ترجمے پر مشتمل ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت ترجمے کا دوسرا حصہ ہے، جو عربی ایڈیشن: جلد اول کے صفحوں ص ۹۱-۳۹۰ (اکیانویں رات سے دوسو انیسویں رات تک) کو حاوی ہے۔

جہاں تک ترجمے کے متعلق اجمالی رائے کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رواں اور صاف ہے، لیکن اصل عربی سے مقابلے پر معلوم ہوا کہ اصل کی آسان عربی کے باوجود ترجمے میں فروگذاشتیں رہ گئی ہیں، پوری کتاب کا مقابلہ کرنا تو مشکل ہے، نمونے کے طور پر بالکل ابتدا (اکیانویں رات) سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

---

(۱) Geschichte der Arabischen Litteratur by e. Brockelmaun

(الف) "اصبر حتی اصلح شان الجنین و اصلح شانی دار فی الخلاص" (۱: ۳۹۹) = "لیکن ذرا صبر کر کہ میرے رحم کی حالت ٹھیک ہو جائے اور میں تندرست ہو جاؤں" ۔ یہاں جنین کا ترجمہ رحم صحیح نہیں، پھر یہ جملہ اصل مطلب واضح بھی نہیں کرتا۔

(ب) اغبرت سحنتہ (ص ۳۹۹) = اس کا چہرہ غباری رنگ کا ہو گیا (ص ۱۲)، تکدر یا غصہ کے مفہوم میں غباری رنگ ہوگا۔

(ج) یا ولد الزنا و تربیۃ الخنا (ص ۳۹۹) = "اے ولد الزنا اور رذیل تربیت" ص ۱۲، رذیل تربیت کی جگہ بد تربیت تھا۔

(د) اخذ ثدیہا و ہی میتۃ (ص ۴) = اس نے ماں کا دودھ پیا حالانکہ وہ مر چکی تھی (ص ۱۲)، اخذ ثدیہا سے دودھ پینا لازم نہیں آتا۔ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اس نے ماں کی چھاتی سے منہ لگایا حالانکہ وہ مر چکی تھی۔

(ہ) فانکشف ذلک الغبار و بان من تحتہ عسکر جرار (ص ۴) = جب یہ غبار بیٹھا تو اس کے نیچے ایک جرار لشکر نظر آیا (ص ۱۲) اسے یوں ہونا چاہیے "جب گرد بیٹھی (یا کم ہوئی) تو ایک جرار لشکر نظر آیا"۔ اور اگر من تحتہ کے مقابلے میں کوئی لفظ لانا ضروری ہی سمجھا جائے تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔ گرد کم ہوتے ہی، پیچھے سے ایک بڑی فوج نظر آئی'۔ یہاں پر من تحتہ کا لفظی ترجمہ 'نیچے' کرنا، مکھی پر مکھی مارنے کے مرادف ہے۔

یہ فرو گزاشتیں پر نظر ترجمے کے ایک صفحے (ص ۱۲) میں نظر آئیں۔ الٹ پلٹ کر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر صفحے میں کچھ نہ کچھ جھول ضرور ہے۔ دوسری جگہ سے ایک مثال پیش ہے:

تاج الملوک اور تاجر (ایک سو گیارہویں رات) کے قصے میں عربی جملہ "جرت دموعہ و بکی و ان و اشتکی و صعد الزفرات" (۱: ۵۶۵) آتا ہے، پھر وہی جملہ ذرا بدل کر یوں استعمال ہوا ہے۔ "بکی و ان و اشتکی و اکثر من الانات (۱: ۵۶۶) مترجم نے دونوں جملوں میں اشتکی کا ترجمہ "شکوہ شکایت کرنے لگا" کیا ہے (ص ۱۹۵-۱۹۷)، اشتکا کے معنی شکوہ شکایت کے بھی آتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ 'اظہار الم' [لسان العرب: الاشتکا، اظہار ما بک من مکروہ] کے لئے مستعمل ہے۔ اور اس جملے میں تو 'شکوہ شکایت' کے معنی ہو ہی نہیں سکتے، آنسوؤں کا بہنا (جرت دموعہ) رونا (بکی) آہیں بھرنا (صعد الزفرات) چیخ و پکار (ان و اکثر من الاناد)۔ ان سب چیزوں کے ساتھ 'اظہار الم' ہی کھپ سکتا ہے۔

ترجمے کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے یہ نمونے کافی ہیں۔ اس عام خامی کے علاوہ دو باتیں اور قابل گرفت ہیں:

(۱) اشعار بالکل چھوڑ دیے گئے ہیں کہیں کہیں ایک آدھ شعر کا ترجمہ دے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بانویں رات (اردو ترجمہ ص ۱۱: عربی ایڈیشن: ۱، ۳۹۹) میں گیارہ شعر بالکل غائب ہیں، اسی طرح دو سو انیسویں رات (ترجمہ ص ۵۵۳: عربی ص ۹۰۶) میں بھی گیارہ شعروں کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ ترجمے کی "امانت" کا تقاضا تھا کہ شعروں کا ترجمہ بھی دیا جاتا۔ (۲) ان کہانیوں کا عربی نام الف لیلۃ و لیلۃ (ایک ہزار ایک راتیں) ہے، اردو میں الف لیلہ زبان زد ہے، راقم کے خیال میں اردو ترجمے کا نام الف لیلہ کافی تھا، لیکن مترجم نے الف لیلہ و لیلہ (اعراب اور نقطوں کے بغیر) نام رکھا ہے۔ اگر اصل عربی نام دینا تھا تو اس کی صورت بھی عربی ہونا چاہیے تھی، یہ ادھا تیتر آدھا بٹیر تو ٹھیک نہیں۔ ان کوتاہیوں کے باوجود یہ ترجمہ غنیمت ہے اور ہماری زبان کے ذخیرے میں اچھا اضافہ ہے کوتاہیاں ایسی ہیں کہ دوسرے ایڈیشن میں آسانی سے اصلاح کی جا سکتی ہے۔

مسعود عالم ندوی

ماہنامہ

# معاصر

مدیر:- عظیم الدّین احمد

دائرۂ ادب، بانکی پور پٹنہ

# فہرست

| جلد ۴ | اگست سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۴ |
|---|---|---|



چندہ سالانہ للعہ — فی پرچہ ۶؍

# اسے بھول جا بُھلا دے

یہ سمجھ لے خواب دیکھا تھا نشاطِ زندگی کا
یہ سمجھ لے وہ محبّت نہیں کھیل تھا کسی کا
کہ بھرا تھا اِک کھلاڑی نے سوانگ عاشقی کا
ہوا ختم جب تماشہ تو نہ پردہ کیوں گرا دے
اسے بھول جا بُھلا دے

وہ نگاہیں اِن نگاہوں سے دو چار کب ہوئی تھیں
وہ کلائیاں گلے کا ترے ہار کب ہوئی تھیں
وہ لگاوٹیں محبت کا سنگار کب ہوئی تھیں
یہ تصورات باطل کے نقوش ہیں مٹا دے
اسے بھول جا بُھلا دے

یہ نہ پوچھ اُس سے ناداں کہ ہو مجھ سے سرگراں کیوں
رہی جاتی ہے ادھوری یہ وفا کی داستاں کیوں
یہ سکوت منفعل کیا؟ یہ حجاب درمیاں کیوں
جو سوال "پردہ در" ہو تو جواب کوئی کیا دے
اسے بھول جا بُھلا دے

یہ چراغ تیز جھونکوں میں جلا کرے گا کیونکر
بے وفا پہ ناز تجھ کو تو وفا کرے گا کیونکر
جو حقوق ہیں محبت کے ادا کرے گا کیونکر
نہ وہ دل کو زندگی دے نہ وہ غم کو حوصلہ دے
اسے بھول جا بھلا دے

جو چُبھے ہیں دل میں کانٹے وہ کھٹک کے کیا کریں گے
جو ٹپک رہے ہیں آنسو تو ٹپک کے کیا کریں گے

جو لپک رہے ہیں شعلے تو لپک کے کیا کریں گے
ہو خودی ذرا بھی تجھ میں تو اس آگ کو بجھا دے
اسے بھول جا بھلا دے

یہ وہ سوز ہی نہیں ہے یہ وہ لاگ ہی نہیں ہے
جو بسا نہ ہو محبت کی وہ آگ ہی نہیں ہے
تری بانسری کے سینے میں وہ راگ ہی نہیں ہے
جو کسی کے دل کی سوئی ہوئی اگنی جگا دے
اسے بھول جا بھلا دے

جسے ہوش ہو اشاروں پہ جنوں کے وہ چلے کیوں؟
نہ رہا کوئی تعلق تو جفائیں وہ کرے کیوں؟
جو تپش کا ہو نہ قائل وہ جلائے کیوں جلے کیوں؟
جو وفا کو جرم سمجھے وہ وفا کا کیا صلہ دے
اسے بھول جا بھلا دے

یہ کمال بے نیازی یہ مآل زندگانی
کہ سراب کی پرستش میں گزار دی جوانی
تو وہ تشنہ کام دل ہے کہ ملا نہ جسکو پانی
تری گمرہی کی فطرت تجھے داد دے تو کیا دے
اسے بھول جا بھلا دے

کئے قرض ادا محبت کے یہ التزام تو نے
کہ جبیں کی ہر شکن کا کیا احترام تو نے
لیا زندگی کے بدلے یہ غم دوام تو نے
دل نامراد اس عبادت کی خدا تجھے جزا دے
اسے بھول جا بھلا دے

جمیل مظہری

# اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی

## (۳)
## طلسمِ ہوش رُبا

اردو میں داستان گوئی کی معراج "داستان امیر حمزہ" ہے "فرصت کہاں" کہ کوئی اس کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کا مفصل جائزہ لے سکے۔ پھر "معاصر" کی تنگ دامانی تفصیل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے "داستان امیر حمزہ" کی صرف ایک کڑی یعنی "طلسم ہوش ربا" پر کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا جائے گا۔ لیکن یہ تفصیل بھی مجمل سی ہوگی "طلسم ہوش ربا" میں "داستان امیر حمزہ" اپنے اوج کمال پر ہے اس لئے "طلسم ہوش ربا" پر جو بحث ہوگی اس سے "داستان امیر حمزہ" کی خصوصیتیں واضح ہوجائیں گی۔ "طلسم ہوش ربا" کی سات جلدیں ہیں۔ اگر اس کے سارے محاسن و معائب پر روشنی ڈالی جائے تو ایک بھاری بھرکم کتاب تیار ہوسکتی ہے میں صرف چند اہم پہلوؤں کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

جب ہم اس داستان کو پڑھتے ہیں تو اپنے کو کسی دوسری دنیا میں پاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی روح کی کسی سرحد سے گزر کر ہم ایک ایسے مقام میں جا پہنچے ہیں جو اجنبی سا ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ جہاں ہر شئے نئی، حیرت انگیز اور پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ اس سلطنت کی سرکاری ہے۔ قوانین نئے ہیں۔ ساری فضا انوکھی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ چیزیں جانی بوجھی بھی ہیں۔ شروع میں اچنبھا تو ضرور ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ ہماری حیرت مٹنے لگتی ہے اور ہم مختلف چیزوں کو پہچاننے لگتے ہیں گویا کبھی پہلے، سیکڑوں برس پہلے اپنی روح اس دنیا میں بستی تھی یا کبھی اس نے اس ملک کی سیر کی تھی۔ لیکن اسے مدت ہوئی اور زمانہ کی رفتار، وقت کی پرواز نے جانے ہوئے نقوش کو دل سے بھلا دیا تھا، مگر یہ نقوش بالکل مٹنے نہ پائے تھے۔ حافظہ میں محفوظ تھے اور پھر ابھر آئے۔ یا ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے کوئی دلچسپ خواب دیکھا ہو اور یکایک وہ خواب حقیقت سے بدل گیا ہو اور اس کی جاگتی ہوئی آنکھوں کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہو۔

عموماً اسے داستان کا اہم ترین عیب خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک خیالی دنیا کی تخلیق ہوتی ہے ایسی دنیا جو انسانی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ جس میں بظاہر واقعیت اور حقیقت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے جس میں ہر چیز غیر فطری ہوتی ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں واقعیت اور حقیقت پر انتہا سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور جہاں بظاہر واقعیت نہیں، جہاں بظاہر حقیقت کی کار فرمائی نہیں، ایسے کارنامے کو بیکار، مہمل، از کار رفتہ اور تضیع اوقات کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ اور جس نظم میں، جس افسانہ میں بظاہر واقعیت و حقیقت کا وجود ہوتا ہو اسے ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً "جگ بیتی"۔ اس مثنوی میں فضا نرالی ہے یعنی اردو کی دوسری

مثنویوں سے اس کی فضا مختلف ہے۔ اس کی بنا بقول مصنف واقعیت اور حقیقت پر قائم ہوئی ہے محض اسی وجہ سے بعض حضرات اس مبتذل مثنوی کو "معنی خیز" اور وقیع سمجھتے ہیں۔ انھیں اس کے فنی نقائص کا احساس ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس میں بدلتے ہوئے ماحول کی جھلک ہے۔ اس سے پتہ ملتا ہے کہ مثنوی "بدرمنیر" یا "گلزار نسیم" سے اردو دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ انھیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ایک مردہ کارنامے میں کسی قسم کی "معنی خیزی" نہیں ہوسکتی اور اس کی کوئی اہمیت ممکن نہیں۔ ہر فنی کارنامہ "معنی خیز" ہوتا ہے۔ اہم ہوتا ہے۔ وقیع ہوتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ زندہ ہے۔ جہاں زندگی نہیں وہاں معنی خیزی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ دوسری مثال ترقی پسند نظموں کی ہے۔ بھوکے مزدوروں کے گیت کا ایک حصہ ملاحظہ ہو :-

| مزدور | میٹ |
|---|---|
| کیسے بھائی | گاڑ لینا |
| ہیّا ہیّا | ایسے بھائی |
| بوجھ اٹھایا | بوجھ اٹھالو |
| ہاں ہاں بھائی | محل سرا کا |
| بوجھ اٹھایا | بوجھ اٹھالو |
| ہیّا ہیّا | اونچا کر لو |
| ہیّا ہیّا | بوجھ اٹھالو |
| ہیّا ہیّا | بوجھ اٹھایا |

دیکھا! واقعیت وحقیقت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مزدور ہیں (اور بغیر مزدوروں کا ذکر کئے ہوئے واقعیت وحقیقت پر دسترس ممکن نہیں)، مزدوروں کی بولی ہے، گاڑ ہے، بوجھ ہے، محل سرا کا ذکر ہے۔ واقعیت اور حقیقت میں کوئی کسر باقی نہیں۔ پھر اسے ہم بیسویں صدی کی شاعری کا شاہکار کیوں نہ تصور کریں؟ یہہ ہے آج کل کی ذہنیت۔ لیکن جسے ذرا بھی فن سے، شاعری سے، سمجھ سے لگاؤ ہے۔ وہ ایسی "نظموں" کو معنی خیز، اہم، وقیع نہیں سمجھ سکتا ہے۔ جسے ظرافت سے دور کا بھی لگاؤ ہے وہ "اس نظم" کو پڑھ کر بے محابا قہقہہ لگائے گا۔ اگر پڑھنے والا سنجیدہ ہے تو وہ متبسم ہوگا اور یہہ قہقہہ یا تبسم شاعر اور اس کی غلط، مضحک حرکت پر ہوگا۔

یہہ جملۂ معترضہ تھا۔ اپنا موضوع ترقی پسند نظمیں نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہہ ہے کہ سطحی اور محدود نقطۂ نظر کی وجہ سے "طلسم ہوش ربا" کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی اور بغیر تحقیقات کے اسے لائق تحریر سمجھ لیا جاتا ہے۔ بہرکیف "طلسم ہوش ربا" کو پڑھنے سے پہلے کوئی فیصلہ قائم کرلینا انصاف سے بعید ہے اور اسے کسی پہلے سے قائم کئے ہوئے معیار سے جانچنا بھی غلطی ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ "طلسم ہوش ربا" کی دنیا اجنبی معلوم

ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید اس دنیا سے کچھ اگلی شناسائی بھی ہے۔ ان متناقض باتوں کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ بات یہہ ہے کہ ہر شخص دو قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک تو وہ ہے جسے روزمرہ چوبیس گھنٹوں کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ہر شخص صبح کو اٹھتا ہے۔ نہاتا ہے، ناشتہ کرتا ہے اور دوسری ضروریات کو رفع کرتا ہے پھر اپنے کام میں جس سے اس کی روزی وابستہ ہے۔ لگ جاتا ہے مزدور محل سرا کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ ڈاکٹر مریض کا علاج کرتا ہے۔ وکیل عدالت میں اپنی چرب زبانی دکھاتا ہے پروفیسر طالب علموں پر اپنے علم و فضل کا رنگ جماتا ہے۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے کام میں دن بھر منہمک رہتا ہے جب وہ اپنے فرائض کو انجام دے کر گھر لوٹتا ہے تو گھر کے کاروبار، بیوی کی فرمائشیں، بچوں کی علالتیں، نوکروں کی ڈکیتی، یہہ چیزیں اسے منہمک رکھتی ہیں۔ ان ہنگاموں کے بعد اسے تفریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ جسمانی اور دماغی تفریح کے ذرایع مہیا کرتا ہے۔ شطرنج اور چوسر ہو یا ٹینس، اور فٹ بول، اُدے شنکر اور رسادھونا بوس کا ناچ ہو یا رینوکا دیوی اور دیویکا رانی کی تصویر، کسی واعظ کا وعظ ہو یا کوئی سیاسی تقریر، غرض کوئی نہ کوئی تفریح کا ذریعہ اسے ملتا ہے یا وہ مہیا کرتا ہے۔ اور اس کھیل یا ناچ یا تصویر یا تقریر میں وہ وقتی طور پر اپنے کو کھو دیتا ہے۔ اپنے روزمرہ کے کام کو وہ وقتی طور پر فراموش کر دیتا ہے اس طرح اس کے دماغی اور جسمانی اعضاء آرام و سکون حاصل کر لیتے ہیں اور پھر وہ "دوسرے دن" کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور پھر وہی سلسلہ از سر نو شروع ہوتا ہے۔ یہہ ہے ہماری روزمرہ، چوبیس گھنٹوں کی زندگی۔ ظاہر ہے کہ یہہ زندگی تنوع اور رنگینی سے خالی ہوتی ہے اور اپنی کبھی نہ بدلنے والی یکسانی کی وجہ سے غیر تشفی بخش۔ بعض خوش قسمت ایسے بھی ہیں جن کی زندگی دلچسپ رنگین و متنوع ہے۔ جن کی زندگی ایک زندہ افسانہ ہے لیکن ایسے خوش قسمت بہت کم ہیں۔ عموماً زندگی دلچسپی سے خالی ہوتی ہے اور اس کی یکرنگی پریشان کن بظاہر ہم مطمئن نظر آئیں لیکن ہر شخص کے دل میں بے اطمینانی کا ایک بیج ہوتا ہے۔ ممکن ہے وہ اس سے واقف نہ ہو۔ اور ذرا سی آبیاری سے یہہ بیج سرعت کے ساتھ ایک بار آور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے

ہماری زندگی کی بے رنگی اور ہماری بے اطمینانی مسلم ہے۔ بوقلمونی تجربات پر ہمیں دسترس نہیں جو تمنائیں دل میں ابھرتی ہیں، جو اولوالعزمی دماغ محسوس کرتا ہے جو اطمینان روح ڈھونڈھتی ہے وہ اس دنیا میں میسر نہیں۔ زندگی اس محدود اور بے درد دنیا میں بیکار اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بیرنگی، یکسانی، بے لطفی وبال جان ہو جاتی ہے۔ اس لئے کسی راہ نجات کی تلاش ہوتی ہے اور یہ راہ نجات ہمیں وہ دوسری زندگی دکھاتی ہے جو ہم اپنی چوبیس گھنٹوں والی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ بسر کرتے ہیں یہہ دوسری زندگی زیادہ رنگین اور متنوع اور دلچسپ ہوتی ہے۔ یہ محدود نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ یہاں ہماری ساری تمنائیں اور اولوالعزمیاں پھلتی پھولتی ہیں۔ یہاں ہماری روح سکون کامل محسوس کرتی ہے۔ اور یہہ زندگی مہمل و بے معنی نہیں ہوتی۔ اس میں معنی خیزی ہوتی ہے۔ لطافت

ہوتی ہے، حقیقی مسرت ہوتی ہے۔ اسے خیالی زندگی یا خواب کی زندگی کہتے ہیں۔ اس میں ایک تازگی وشادابی ہوتی ہے، ایک جان ہوتی ہے جو روز مرہ کی زندگی میں میسر نہیں۔

ہر شخص کو اتنی فرصت نہیں ہوتی اور اتنی طاقت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اس خیالی زندگی کو۔ اس کی ساری نیرنگیوں، دلچسپیوں، لطافتوں کے ساتھ اپنے تخیل کی مدد سے بسر کرسکے۔ اس کے روزآنہ فرائض اسے اس قدر منہمک رکھتے ہیں، اسکی محنتیں اور پریشانیاں اس کا اس قدر خون چوس لیتی ہیں کہ اس میں زیادہ سکت باقی نہیں رہتی اور وہ صرف چند لمحوں کے لئے اس دوسری زندگی کی روح فزا لطافتوں سے متمتع ہوسکتا ہے اور یہہ حظ بھی نامکمل اور غیر تشفی بخش ہوتا ہے۔ گویا وہ اس زندگی کی جھلک سے آشنا ہوتا ہے لیکن پردہ اٹھاکر اسکی رعنائیوں سے محظوظ نہیں ہوسکتا اور اطمینان کے ساتھ اس کے حسین گلی کوچوں میں چل پھر نہیں سکتا۔ اگر سکت ہو بھی تو اکثر اس کے تخیل میں یہہ زور نہیں ہوتا کہ وہ اسے کامل تشفی دے سکے۔ بہرکیف، ہر شخص نے اس دنیا کی جھلک دیکھی ہے اور شاید اس سے باضابطہ روشناس ہونا چاہتا ہے۔ یہہ تمنا "طلسم ہوش ربا" کے ذریعہ برآتی ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں یہہ دوسری دنیا اپنی وسعتوں کو لئے کھڑی ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں یہہ دوسری زندگی اپنی جملہ نیرنگیوں، لطافتوں، رعنائیوں کے ساتھ مسکراتی ہے اور ہمیں دعوت نظارہ دیتی ہے۔ اس دوسری دنیا میں اپنی معمولی دنیا کی جانی ہوئی چیزوں کی تلاش دانشمندی سے بعید ہے۔ اس دوسری زندگی میں اپنی معمولی زندگی کی پریشان کن مشکلیں اور تکلیفیں کہاں سے آئیں؟

اگر یہہ بات تسلیم کرلی جائے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ "طلسم ہوش ربا" خواب کی دنیا ہے اس میں خیالی زندگی۔ خواب کی زندگی کی تصویر کشی ہے تو پھر اسے "واقعیت وحقیقت" کے معیار سے جانچنا غلط ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ یہاں "واقعیت اور حقیقت" سے یکقلم کنارہ کشی اختیار کی گئی ہے۔ اس میں بھی "واقعیت وحقیقت" ہے لیکن نفسیاتی، جس کا بیان ہوچکا ہے۔ ہاں تو "طلسم ہوش ربا" خواب کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں کے اصول وقوانین مختلف ہیں۔ اور پہلے یہہ کچھ اجنبی اور حیرت انگیز نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر شئے کی وضع، تراش خراش انوکھی، ہر پھول کا رنگ نیا، غرض جو چیز ہے وہ ایک نرالا بانکپن رکھتی ہے۔ لیکن حیرت کے بعد ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہہ جگہ دیکھی ہوئی ہے اور یہہ لوگ جانے ہوئے ہیں، کیونکہ "طلسم ہوش ربا" میں اس مطلب کی زندگی نے جسے ہم چند لمحوں کے لئے بسر کرتے تھے، جسکی ہم نامکمل جھلک دیکھا کرتے تھے۔ اس خواب نے حقیقت اور پایداری کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور ہمارا استعجاب دراصل صرف اسی وجہ سے ہے۔ اب وہ زندگی حباب کی طرح نازک، اجل درکنار نہیں بلکہ پہاڑ کی طرح ٹھوس، اٹل اور پائدار ہوگئی ہے۔

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں۔ وہاں زندگی پابند ہے۔ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ تنگ

تاریک زنداں میں مقید ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں زندگی اس قید و بند سے آزاد ہے، سمندر کی موجوں کی طرح، ہوا پر اڑنے والے بادلوں کی طرح، تیز و تند ہواؤں کی طرح منہ زور، آفتاب کی طرح آزاد ہے۔ یہاں کوئی ہر روز کا معمول نہیں، کوئی مقرر دستور العمل نہیں۔ یہاں ہر روز ایک ہی قسم کے فرائض کی انجام دہی فرض نہیں۔ یہاں ایک ہی قسم کے کام کی روزانہ تکرار بے لطفی اور تنگ دلی کا سبب نہیں ہوتی۔ یہاں ہماری امنگوں، ہمارے حوصلوں کو ٹھکرایا نہیں دیا جاتا۔ غرض اس دنیا میں وہ روح فرسا چیزیں نہیں جن سے زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ غیر متوقع واقعات اس دنیا کا قانون ہیں۔ حیرت انگیز کرشمے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ یکسانی کے بدلے بوقلمونی، حیرت انگیز، ناقابل یقین بوقلمونی ہے۔ ہر روز ہر ساعت، ہر لمحہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ دلچسپ اور عجیب ہوتا ہے۔ نئے تجربات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جس سے رنگینی اور دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی یہاں زندگی ایک چمکتا ہوا قوس قزح ہے، جس کے حسن میں ہونے والے طوفان اضافہ کرتے ہیں۔ طوفان آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ قوس قزح مٹتا نہیں بلکہ الگ اور اوپر، اٹل برابر نظر آتا ہے اور ہر طوفان اس کے مختلف رنگوں کو زیادہ رنگین اور چمکیلا بنا دیتا ہے۔

بہرکیف، "طلسم ہوش ربا" میں زندگی آزاد اور رنگین اور چمکیلی ہے۔ یہاں اولوالعزمی کا میدان ہے، جرأت و ہمت و طاقت کی آزمائش ہے، امن و امان کے بدلے خطروں سے سابقہ ہے۔ اپنی ہمت اپنی قوت کے مطابق ہر شخص ناموری حاصل کر سکتا ہے۔ وہ مختلف مہمیں، مشکل، خطرناک مہمیں سر کر سکتا ہے۔ یہاں صلائے عام ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ جانب داری نا انصافی نہیں۔ میدان سامنے ہے ہر شخص اپنی شجاعت و طاقت ظاہر کرتا ہے اور اپنی شجاعت و طاقت کا صلہ پاتا ہے اور اپنی ذاتی خوبیوں، اپنے زور بازو سے بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے، ملک و مال کسی کی ملکیت خاص نہیں۔ اگر کوئی نا اہل ہے تو پھر بہت جلد وہ اپنا ملک کھو بیٹھتا ہے اور اُسے اپنے مال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ یہ دنیا تنگ نہیں، محدود نہیں اس لئے اس کی گنجائشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں اور اولوالعزمی، بلند حوصلگی کے اظہار اور تشفی کیلئے کبھی نہ ختم ہونے والے مواقع کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک تخت پر قبضہ کرنے کے بعد دوسرے ملک کی طرف نظر پڑتی ہے۔ ایک ظالم کو شکست دے کر دوسرے کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ ایک طلسم فتح کرنے کے بعد دوسرے طلسم سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ڈر نہیں کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور پھر عالی ہمتی کے اظہار کا رستہ مسدود ہو جائیگا۔ ایک اسد، ایک ایرج، ایک نورالدہر کے آگے تیمور لنگ، سیزر، نپولین، ہٹلر کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس دنیا میں بس ایک ہی تیمور لنگ، ایک ہی سیزر، ایک ہی نپولین ایک ہی ہٹلر ہے۔ دوسروں کو مواقع نہیں ملتے۔ ان کی تمنائیں دل کی دل میں رہ جاتی ہیں۔ وہ کبھی پھولتی پھلتی نہیں۔ لیکن "طلسم ہوش ربا" میں ہر شخص اسد یا ایرج یا نورالدہر ہو سکتا ہے سب کے لئے

رستہ برابر کھلا ہوا ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ "طلسم ہوش ربا" میں صرف شجاعت، زور و طاقت کا امتحان ہے اور یہاں ہر شخص صرف خطرناک زندگی بسر کر سکتا ہے۔ زندگی خطرناک ہے اور اس لئے دلچسپ ہے، پھیکی اور بے لطف نہیں۔ لیکن زندگی کا یہی ایک رُخ نہیں۔ ایک دوسرا لطیف و نرم و ملائم پہلو بھی ہے۔ اگر ہم جنگ کا استعارہ جاری رکھیں تو یہاں دوسری قسم کی مہمیں بھی ہیں یعنی عشق کی۔ اور یہ مہمیں بھی کسی خاص فرد کی جاگیر نہیں۔ اور ان کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے اور یہ سلسلہ کوئی علٰحدہ چیز نہیں۔ یہ دوسرے سلسلہ کے ساتھ اس طرح گوندھا ہوا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ہاں تو عشق کی مہمیں بھی ہیں اور کیسی! ایک طرف شجاعت کی آزمائش ہے تو دوسری جانب محبت کا، جوانی کا، جوانی کی امنگوں کا امتحان ہے۔ جذبات کا ابھار ہے، جذبات کی کشمکش ہے۔ ولولہ ہے۔ جوش ہے، جنت سامان مسرتیں ہیں۔ تمنائیں ہیں، حسرتیں ہیں، بے تابیاں ہیں، ناکامیاں اور ناامیدیاں ہیں۔ غرض جذباتی دنیا بھی وسیع ہے اور جذباتی تجربات ہر قسم کے جذباتی تجربات کا ایک بڑھتا ہوا سلسلہ جاری ہے۔ اور یہ تنگی، کمی، معاشرتی قوانین کی بندشیں نہیں جو ہماری تمناؤں کو اس دنیا میں بارور نہیں ہونے دیتی۔ "حسینان جہاں" کی کمی نہیں "ایسے جانان دلفریب و رہزن صبر و شکیب غارتگر متاع خرد و ہوش" یہاں ملتے ہیں اور اس کثرت سے ملتے ہیں کہ جس کی مثال کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ ہمت شرط ہے۔ پھر دامن کو گلہائے مراد سے بھرنے میں کوئی مشکل نہیں۔ پھر یہاں ایک ہی پھول پر قناعت لازمی نہیں۔ گلہائے رنگ رنگ سے اس "چمن" کی زینت ہے۔ اور گلچینی اپنا کام ہے، سبھی پھول اپنے ہیں۔ ایک ملکہ مہ جبین الماس پوش پر اسد کو قناعت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ملکہ لالان فون قبا اور کتنی مہ جبینیں اسد کی جذباتی دنیا کی تزئین کا سامان ہیں۔

رزم کی اگر خواہش ہے تو ہیں گوے وہیں میداں۔ کوئی شے مانع نہیں۔ بزم کی طرف میلان ہے تو سامان عیش و عشرت دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ کہیں جنگ کا ہنگامہ ہے، میدان کارزار، خونی کشمکشیں ہیں، پہلوانان پیل تن اور بہادران صف شکن کا جماؤ ہے۔ کسی طرف "معشوقان عاشق خصال" کا جمگھٹا ہے۔ عشق کی رنگیں کارفرمائیاں ہیں۔ کبھی میدان جنگ و جدل میں جرأت کا امتحان ہے تو کبھی عشق کی بھول بھلیاں میں حیرانی و پریشانی ہے۔ گردش لیل و نہار کے نقشے ہیں ابھی عیش و عشرت کا سامان ہے تو ابھی رنج و الم، درد و مصیبت کی دشوار گذار گھاٹیوں سے گزرنا ہے۔ بدلنے والے مناظر بھی ہماری آنکھوں کو مسرت بخشتے ہیں۔ یہاں بھی تنوع کی کمی نہیں کہیں ایسا خوفناک صحرا ہے جسے دیکھ کر فرشتے بھی پناہ مانگیں تو کہیں ایسا سبزہ زار۔ ایسے پھول کھلے ہوئے ہیں

جو اپنے رنگ و بو سے نئی زندگی عطا کرتے ہیں :-

لکھی جو لے جاہ داستان یہ عجب مزے کی حکایتیں ہیں
کہیں ہے جنگ و جدل کا ساماں کہیں ہے عیاریوں کا چرچا
کسی جگہ پر صفت مکاں کی کہیں یہ تعریف شہر کی ہے
کہیں پہ آمد ہے لشکروں کی کہیں لڑائی کا ہے سراپا
کہیں ہے نیرنگی طلسمی کہیں ہے اس میں بیان جادو
کہیں ہے وصف بہار گلشن کہیں بیان صفات صحرا
کہیں ہے جھگڑا جو عاشقوں سے تو نازنینوں کی پیاری باتیں
کہیں سراپا ہے حسن دلبر کہیں ہے میلے کا اس میں جلسہ
کہیں کسی پر کوئی ہے عاشق تو لطف الفت لکھا گیا ہے
بیان ہجرت جو کوئی دیکھے تو غم کا ساماں لکھا ہے کیسا

تعلی برطرف، "طلسم ہوشش ربا" میں تنوع ہے۔ ہماری تفریح کا بے شمار سامان ہے۔۔ لیکن یہ تنوع، یہ ساز و سامان اہم نہیں" جنگ و جدل کا سامان" "عیاریوں کا چرچا"، مکان کی صفت شہر کی تعریف، لشکروں کی آمد، لڑائی کا سراپا، طلسم کی نیرنگی، جادو کا بیان" وصف بہار گلشن" یا بیان صفات صحرا"، عاشقوں سے جھگڑا، نازنینوں کی پیاری باتیں، حسن دلبر کا سراپا، میلے کا جلسہ لطف الفت، غم کا سامان - یہ چیزیں اہم نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں ہم اپنی خشک و سادہ و بیرنگ زندگی کی خشکی، سادگی، بیرنگی سے نجات پا لیتے ہیں - زندگی کی تنگی وسعت سے، مجبوری آزادی سے بدل جاتی ہے۔ یہاں زمیں سخت اور آسمان دور نہیں - اگر ہو بھی تو زمیں کو نرم بنا سکتے ہیں اور آسمان کو نزدیک کھینچ لا سکتے ہیں۔

یہ بھی فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی سے مطمئن نہیں رہتا۔ اسے ہر قسم کا آرام میسر ہو مال و دولت، جاہ و جلال سے اسے بہت کچھ حاصل ہو، ساری دنیا اس کی قسمت پر رشک کرے لیکن وہ کامل اطمینان کی زندگی نہیں بسر کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے جملہ اوصاف سے صحیح مصرف نہیں لیا۔ کتنے اچھے مواقع آئے جن سے اس نے فائدہ نہیں اٹھایا اور کتنی ایسی باتیں اس نے کیں جن سے پرہیز لازم تھا غرض وہ سمجھتا ہے کہ زندگی کے دوراہے میں وہ غلط رستہ پر چل کھڑا ہوا۔ اس لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ چاہتا ہے کہ کاش اسے پھر ایک مرتبہ موقع مل جائے تو وہ اپنی زندگی کو بہتر زیادہ خوشگوار و اطمینان بخش بنا سکے۔ اگر وہ ڈپٹی مجسٹریٹ ہے تو اس کی تمنا ہے کہ وہ ہائی کورٹ کا جج ہو جائے اور اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اگر اسے دوسرا موقع ملجائے تو اس کی تمنا بر آئے گی۔ اس دنیا میں جو ہو چکا وہ پتھر کی لکیر کی طرح پھر مٹ نہیں سکتا۔ اگر ہم کسی غلط رستہ پر چل کھڑے ہوئے تو پھر ہم لوٹ نہیں سکتے۔ اس لئے ہم اپنی زندگی از سر نو نہیں گزار سکتے اور اسے زیادہ حسین، خوشگوار اور چکیلی نہیں بنا سکتے۔ غالباً اگر ہمیں دوسرا موقع مل بھی جائے تو کوئی فرق نہ ہوگا۔ بہرکیف، ہر شخص کے دل میں اس قسم کی تمنا موجزن ہوتی ہے اور یہ تمنا "طلسم ہوش ربا" کی دنیا میں پوری ہو جاتی ہے۔ اس دنیا میں وہ نت نئی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ایک موقع کے بدلے اسے بے شمار مواقع اپنی زندگی کو بدلنے، اسے بہتر بنانے کے ملتے ہیں۔ وہ آسودہ ہو سکتا ہے

عمرو عیار ہو سکتا ہے، آفراسیاب ہو سکتا ہے، کوکب روشن ضمیر ہو سکتا ہے۔

ارسطو نے کہا تھا ٹریجڈی ہمیں جذبات کی زیادتی اور شدت سے نجات دیتی ہے۔ دردمندی اور خوف کے ذریعہ سے ہمیں جذبات کی زیادتی اور شدت سے نجات ملتی ہے اور ہماری طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہہ ہے کہ زندگی، روزمرہ کی زندگی ایسی بے لطف، یکساں ڈھیلی ہوتی ہے کہ جذبات کی زیادتی اور شدت کی نوبت ہی نہیں آتی۔ دل جذبات سے لبریز نہیں، تقریباً خالی نظر آتا ہے اس لئے ٹریجڈی یا کسی صنف ادب سے جذبات کی "اصلاح" نہیں ہوتی۔ ایک انگریز نقاد نے لکھا ہے کہ ٹریجڈی روزہ نہیں روزی ہے، دعوت ہے۔ اسی طرح "طلسم ہوش ربا" معمولی کھانا نہیں بلکہ ایک عظیم الشان دعوت ایک شاہی دعوت ہے اور شاہاں جہاں کے لائق۔ ہر چیز کی افراط ہے، کسی شے کی کمی نہیں۔ اور پھر یہہ چند خوش قسمت لوگوں کے لئے نہیں بلکہ یہہ دعوت دعوت عام ہے۔

ادب زندگی کی عکاسی کا دوسرا نام نہیں، آرٹسٹ نقال نہیں۔ وہ زندگی کی نقل نہیں اتارتا اس کی حساس طبیعت، باریک بیں آنکھیں، جب اپنے گرد و پیش دیکھتی ہیں تو اسے ایک قسم کی بے اطمینانی ہوتی ہے۔ ہر طرف اسے بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت، بدصورتی، تنگی، فشار عدم تکمیل کی مثالیں نظر آتی ہیں اور وہ ان نقائص کو رفع کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت کے بدلے بہتر ترتیب، بہتر نظم، تناسب و موزونیت کے نمونے پیش کرتا ہے۔ وہ بدصورتی، عدم تکمیل سے منغص ہو کر ایک حسین اور مکمل دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ تنگی اور فشار کو وسعت اور آزادی سے بدل دیتا ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں بھی اس قسم کی کوشش عمل میں آئی ہے۔ یہاں بھی بے ترتیبی، بدنظمی، ناموزونیت کا نام و نشان نہیں (صناعی کے نقائص سے اور یہہ بہت ہیں سر دست بحث نہیں) یہاں زندگی کی ایک بہتر ترتیب و تنظیم پیش کی گئی ہے۔ زندگی حسین، مکمل اور تشفی بخش ہے۔ تشفی بخش اس لئے کہ یہاں ہماری امنگیں، ہماری تمنائیں، ہماری اولوالعزمیاں کھلنے سے پہلے مرجھا نہیں جاتیں۔ وہ پھولتی پھلتی ہیں، اور ہمیں محرومیوں، شکستوں، مایوسیوں سے ہمیشہ سابقہ نہیں پڑتا۔ مکمل اس لئے کہ زندگی کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا ہوتا۔ زندگی اپنی پیچیدگی، اپنی ساری نیرنگیوں کے ساتھ ترقی پاتی ہے اور پروان چڑھتی ہے حسین اس لئے کہ زندگی اپنے نقائص و حدود اپنی بدصورتی و ناموزونیت سے نجات پا کر ستارہ کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(باقی)

کلیم الدین احمد

# اسعد الاخبار آگرہ(۲۳)

دہلی اور اودھ کے متعلق خبریں نقل کی جا چکی ہیں، اب ہندوستان کے دوسرے حصوں، ممالک اسلامی اور یورپ کے متعلق خبروں کا انتخاب دیا جاتا ہے:

۸۴ "ایک راجا یا رئیس نے پانچ روپے درماہے کا ایک شخص نوکر رکھ کر رزیڈنٹی کے دربار میں برسم وکالت حاضر رہنے کو مقرر کیا اور مؤکل صاحب خود بھی دربار جایا کرتے تھے۔ ایک دن مؤکل خود نہ گئے۔ صاحب رزیڈنٹ نے اس سے پوچھا کہ آج تمہارا مؤکل کیوں نہیں آیا۔ وکیل صاحب اول دفعہ تو کچھ نہ سمجھے خاموش بیٹھے دیکھا کیے جب صاحب نے دوسری دفعہ پوچھا تو وکیل بہادر نے جواب کہا کہ "ہوں" وہ اس لفظ سے ادا کیا اس کی کیفیت کا درک سماعت تلفظ پر منحصر ہے۔ صاحب رزیڈنٹ نے ان کی "ہوں" سن کر انھیں دربار سے نکلوا دیا۔ جب راجا یا رئیس ... پانچ روپے کا وکیل دربار میں رکھیں تو بجز ایسے شخص کے کون اس تنخواہ پر ایسا عہدہ قبول کرے گا اس کا یہ نتیجہ نکلے۔" از دہلی اردو اخبار

۸۵ "جس دن سے سراج الملک بہادر مہمات وزارت سے دست کش ہوئے ہیں اطراف و جوانب حیدرآباد میں بڑی بے انتظامی ہے۔ چناں چہ نواب اعتضاد الملک کے تعلقے میں افاغنہ نے یورش کرکے قلعے کو اپنے تصرف میں کرلیا اور قلعہ دار کو اسیر کرلیا اور دو لاکھ روپے کا مال و متاع جو قلعے میں فراہم تھا سب پر قابض ہوئے۔ بڑی خرابی اور کشت و خون سے پھر قلعہ ہاتھ آیا۔" زبدۃ الاخبار

۸۷ "... محمد ... کوتوال ... نے خود پسندی کی راہ سے جوانان عرب کو شہر (حیدرآباد دکن۔ د) کے دروازہ پر تعین کر کے حکم دیا کہ انگریز داں کو شہر میں مت آنے دو۔ رزیڈنٹ بہادر نے یہ خبر سن کر بندگان عالی کو اطلاع کی۔ حضور کوتوال پر بہت خفا ہوئے اور ... چار ہزار روپے جرمانہ کیا۔ مشہور ہے کہ حضرت بندگان عالی کو نواب سراج الدولہ بہادر کی معزولی سے سخت حسرت و پشیمانی ہے۔ دوسرا کوئی انھیں ایسا نہیں ملتا جو سر انجام امورات کر سکے۔" زبدۃ الاخبار

۹۱ حلیۂ دیوان مولراج "عمر ۳۲ سال کم و بیش، پانچ فٹ ساتھ انچ دراز قد، دست، پا متوسط گندم رنگ، بلند پیشانی، چھوٹی آنکھ، وضع سے وقار و تمکین ظاہر اور چہرے سے عزت نمایاں ریشمی نارنجی قبا پہنے اور رنگین پگڑی باندھے تھا، ایک اس کا مامور سردار پیچھے اور دو افسر بائیں بیار اور میجر سیٹر صاحب (کذا) اس کے داہنے ہاتھ ..."

۱۰۰ ایک اخبار سے معلوم ہوا کہ شاہ حال ایران نے شاہ مرحوم کے شہزادوں کو اضلاع مختلفہ ایران کے تقسیم کر دیے ہیں، اور چوں کہ شاہزادے قریب چار سو کے ہیں، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ ہر ایک شہر

.. تحتِ حکومت ان شاہزادوں کے ہوگیا ہوگا۔ سو یہ امر انتظام رعایا کے حق میں بہت مضر تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ غالباً اب رعایا پر ظلم بہت ہوگا" دہلی اردو اخبار

۱۰۱ مجمع الاخبار سے صاحب زبدۃ الاخبار لکھتے ہیں کہ قیصر روم اور شہنشاہ روس کی مصالحت کی میعاد گزر گئی سو اب شاہ روس نے .. لڑائی پر کمر باندھی ہے اور روس کی تین لاکھ فوج نے قسطنطنیہ کا عزم کیا ہے۔ سلطان روم بھی جنگ کا سامان کر رہے ہیں اور جمیع سلاطین فرنگستان خصوصاً ارکان دولت ملکۂ معظمہ انگلستان اور وزرائے سلطنت فرانس و اسپین و اسطریہ (کذا) وغیرہ سلطان روم کی مدد کو تیار ہوئے ہیں اور جمیع سلاطین کے ایلچی بیچ بچاؤ کرنے کو آئے ہیں تاکہ پھر نئے سر سے مصالحت کرا دیں... اللہ تعالیٰ ان سب کی کوشش کا نتیجہ بخشے اور خلق اللہ کی خون ریزی نہ ہو، اور اگر ان کی سعی کارگر نہ ہوئی تو لڑائی ہوگی اور فرنگستان کے سب سلاطین شاہ روم کی طرف ہو کر روسیوں کی لڑائی بھاگا کریں گے۔

۱۰۲ تعبیر خواب مہاراجا رنجیت سنگھ متوفی: صاحب زبدۃ الاخبار مرقوم فرماتے ہیں کہ ہمیں خوب یاد ہے کہ ۱۸۳۳ء میں کلکتے کے ایک انگریزی اخبار میں لکھا تھا کہ انھیں دنوں مہاراجا ..نے خواب میں دیکھا کہ ایک جوان فریدون فربا سپاہ بے کراں مشرق سے نکل کر پنجاب پر حملہ آور ہوا اور سکھوں کو متواتر شکست دے کر سارا ملک پنجاب لے لیا اور سکھ لوگ .خستہ و زبون ہوگئے، اور خود مہاراجا بھاگ کر آوارۂ دشت بیاباں ہوا ہے اور ایک پہاڑ تلے مغموم کھڑا ہو کر ہر چند روتا چلاتا ہے مگر کوئی اُس کی نہیں سنتا۔ مہاراجا ..یہ خواب دیکھ کر بہت پریشان خاطر اٹھا، اور مصاحبوں سے یہ واقعہ بیان کیا۔ سب نے دلاسا دی اور خواب کی تعبیر بالعکس بیان کی۔ اللہ تعالیٰ نے سولہ برس بعد اب وہ تماشا دکھا دیا اور اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی کہ لشکر انگریزی کی قوتِ قاہرہ سے تمام ملک پنجاب مسخر و مفتوح ہوا اور سکھوں کی حکومت تمام ہوئی"

۱۰۲ خبر مدراس: اخبار الحقائق میں مرقوم ہے کہ اس مقام میں لوہے کا راستہ تیار ہونا شروع ہوا ہے مگر مزارعین بسبب نقصان اراضی و کشت کاری کے متعرض ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس کے فوائد سے آگاہ نہیں، ورنہ متعرض نہ ہوتے۔

۱۰۳ خبر فرنگستان.. ملکۂ اسپین نے پوپ کی کمک کو اور رعایائے رومن کی تنبیہہ کو سپاہ بے کراں روانہ کی ہے، کیوں کہ رعایائے رومن نے پوپ کو سلطنت سے خارج کر دیا ہے۔

۱۰۴ بمبئی: زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار سے منقول ہے کہ ان دنوں بحر قلابہ کے کنارے ایک سڑی ہوئی مچھلی نکلی.. اس کے دو دانت مثل دندان فیل منہ سے باہر نکلے دکر م خوردہ)، طول اس کا ۶۰ فٹ اور عرض ۱۶ فٹ تھا۔

۱۰۵ صاحب اخبار الحقائق نے اس جواہر بیش بہا کوہ نور کا حال شملہ اخبار سے مفصل لکھا ہے

احمد شاہ کابل میں لایا، شاہ شجاع الملک کے ہاتھ لگا... جس وقت شجاع الملک نے لاہور میں آکر رنجیت سنگھ
کے پاس پناہ لی، رنجیت سنگھ نے شاہ کا کھانا پانی بند کرکے پہرا گھر پر بٹھلا کے یہہ ہیرا.. چھین لیا۔ اب
وہی .. صاحبان عالی شان انگریز بہادر نے بہ زور شمشیر اُس کی اولاد سے لے لیا اور تمام ممالک پنجاب
کو خس و خاشاک سے پاک کرکے عدل و داد سے معمور کیا۔ وہ ہیرا ملکۂ معظمہ کی نذر کو بھیجا جائے گا، کیا
خوب ہو اگر سرکار یہہ حکم دے کہ لیجاتے وقت لاہور سے کلکتہ تک ہر ایک بڑے شہر میں وہاں کے باشندوں
کو دکھاتے جائیں.."

۱۰۶ "کوئی شاہزادہ خاندان تیمور سے کہ اپنے تئیں مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا بیان کرتا ہے ٹونکے حال
سے وارد بھوپال ہوا ہے، کربلائے معلیٰ اور مکہ معظمہ میں جانے کہتا ہے، مختار ریاست نے چالیس روپے زادِ راہ
دیے، عمر حضرت کی ساٹھ برس کی ہوگی۔ بدن لاغر اور قویٰ ضعیف ہیں" مطلع الاخبار

۱۰۷ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ ایک خط حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا ہے کہ ساہوکاران ناموروں در
دولت پر حاضر ہوئے اور.. اپنے قرض کا روپیا مانگا۔ حضور نے ہر ایک کو فہمایش کرکے فرمایا کہ دو مہینے اور
صبر کرو.. فوج کے لوگ رات دن دولت پر دھرنا دئے تنخواہ کے لیے واویلا کرتے ہیں۔

۱۰۹ نابھہ: نواب گورنر جنرل بہادر.. والی نابھہ کی خدمت گذاری سے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ راجا صاحب نے
مبلغ ساٹھ (کذا) لاکھ روپے لودھیانہ کے خزانے میں داخل کیے۔ حق تو یہہ ہے کہ ممالک پنجاب کے راجوں میں سرکار
انگریزی کا ایسا دلی خیر خواہ اور خالص دوست کم ہوگا۔ خداوندگان نواب گورنر جنرل بہادر نے بھی.. اُن کے القاب
میں نسبت سابق تعظیم و تکریم زیادہ فرمائی چنانچہ سابق "رفعت و والا مرتبت خصوصیت و محبت دستگاہ سلمہ ربہٗ"
لکھا جاتا تھا، اب.. یہہ القاب مقرر کیا" رفعت و عوالی مرتبت استظہار مخلصان راجا بھرپور سنگھ راجا نابھہ سلمہ اللہ تعالیٰ"

۱۰۹ بمبئی: فوائد الناظرین میں ٹیلی گراف سے منقول ہے کہ.. اِن پانچ لاکھ جو بیس ہزار ایک سو اکیس آدمی ہیں۔

۱۰۹ کلکتہ: سلطان الاخبار مطبوعہ یکم جولائی سے معلوم ہوا کہ حاکمان فوجداری کلکتہ نے حکم دیا ہے کہ کوئی ہتھیار
باندھ کر شہر میں نہ نکلے مگر اجازت لے کر اور ہر قوم کے امیر و فقیر ہندو مسلمان اپنے تعزیے اور بت اور برات کو
ڈھول اور نقارہ بجا کر نہ نکالیں، خصوصاً دریا کنارے اور بہو بازار اور قصاب ٹولہ اور چورنگی محلہ کے چاروں
طرف، کیوں کہ ان مقاموں میں انگریزان نامور رہتے ہیں اور باجے کی آواز سے ان کی طبیعت ملول اور نیند اُچاٹ
ہوتی ہے۔"

۱۱۴ فرینس سے ایک فوج واسطے بچانے پوپ کے.. گئی ہے .. اہل روم نے اس فوج کو بار بار شکست دی
اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ رومیوں نے تمام مکانات عالی کے نیچے نقب کھودی ہیں اور یہ ارادہ پختہ باندھا ہے کہ
درصورت نصیب ہونے شکست کے شہر کو اڑا دیویں گے۔ دیکھا چاہیے کہ شوق آزادی کے یہہ معنی ہیں کہ اُس کے
حاصل ہونے کی خاطر آدمی جان و مال کا بھی دریغ نہیں کرتا ہے مگر برعکس اس کے بعض جگہ ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ

مال و دولت کی طمع سے لوگ نعمت آزادی کو ہاتھ سے ڈال دیتے ہیں۔ الحقائق

۱۱۴ فہرست آباد ی شمالی مغربی اضلاع: یہی ایک لاکھ، ۳۲ ہزار اسو ستہتر۔ بنارس ۱۸۳۴۵۱ تمام ممالک مغربی ہیں۔ ایک کروڑ پچانوے لاکھ ۹ ہزار ہزار دو ۳۷ لاکھ سینتالیس ہزار مسلمان ہیں۔

۱۱۵ نرخ غلہ جو الحقائق میں لکھا ہے: گندم ۱۲ سیر، نخود ۲۴ سیر، برنج ۱۶ سیر ارد ۲۰ سیر، مونگ ۲۰ سیر ارہر ایک من دس سیر، موٹھ ۳۰ سیر، جوار ایک من، باجرا ۲۰ سیر جو ایک من ۱۰ سیر، سرسوں ۲۱ سیر تل ۲۰ سیر، مسور ۳۰ سیر، ...

۱۱۶ اخبار انگریزی سے واضح ہوا کہ روم فرانسیسیوں کے تصرف میں آگیا۔ الحقائق۔

۱۱۸ "پرچہ اسعد الاخبار مطبوعہ ۲۹ رمضان نمبر ۱۱ میں مرقوم ہوا ہے کہ روم فرانسیسیوں کے تصرف میں آگیا۔ اس کو بعض ناظرین اخبار ولایت روم کی خبر سمجھے سو ایسا نہیں بلکہ یہ لفظ روم ایک شہر کا نام ہے جو قوم رومن کا تلک کے پوپ کا دار الحکومت ہے۔"

۱۱۹ دیوان مولراج: جزیرہ سنگاپور میں قید رہے گا کہ مدت العمر وہیں اپنے ملک و دیار کی مفارقت میں بسر کرے۔ زبدۃ الاخبار

۱۲۲ فی الحال انگلستان میں ایک ایسی کل بنی ہے جس سے خود بخود روٹی پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ الحقائق و تعلیم الخلائق۔

۱۲۶ الحقائق سے واضح ہوا کہ کئی برس سے ایک شخص امریکہ سے برف جہاز پر لاد کر کلکتہ میں لاتا تھا اور دو آنے سیر بیچتا تھا، اب ایک اور بھی سوداگر لانے لگا اور اس نے ایک آنے سیر کر دی، تعجب کی بات ہے کہ برف سی چیز آٹھ دس ہزار کوس سے کس کس حکمت و احتیاط سے لاتے ہیں اور کیسی سستی بیچتے ہیں۔"

۱۲۷ الحقائق میں مسطور ہے کہ مسٹر اندرسن صاحب نے جو لندن میں ایک بڑا نامور بازی گر ہے ملکہ معظمہ کے روبرو عجیب عجیب تماشے اور بازیاں کیں۔ شاہزادہ البرٹ کا رومال لے کر سب کے روبرو آگ میں ڈال دیا رومال جلکر خاک ہو گیا۔ تھوڑی دیر وہی رومال بدن کا توں آگیا۔ میں سے نکال کر شاہزادے کے ہاتھ میں دیا، دوسری یہ کہ شاہزادے کی ٹوپی اپنے ہاتھ میں لے کر رنگ برنگ کے کھلونے اور انواع انواع پھول ٹوپی میں سے نکال کر سب کو دکھائے۔ تیسری یہ کہ ایک پیالے قہوہ سے تمام حاضرین کو پیٹ بھر بھر پلایا اور پیالہ ویسا ہی بھرا رہا... عہد جہانگیری میں ہندوستان کے بازیگروں نے حضور شاہی میں بھی ایسی ایسی بازیاں اور شعبدے کئے تھے جو اندرسن کی بازیوں سے بہ مدارج غریب تر تھے۔ از زبدۃ الاخبار۔ اس تیسری بازی کی کیفیت ہمیں خوش نہ آئی، کیونکہ بازی گران مشعبد پیشہ کے ایسے کھیل جو بزرگ گزرے ایزدی کے افعال سے مشابہ ہوں ہیں، یہ۔ نہ نہیں غالب کہ صاحبان پادری ہماری اس رائے کو پسند فرمائیں، کیونکہ ایسے کھیل دیکھ کر یہود... کو حضرت عیسیٰ... کے بعض افعال کی تکذیب کے لئے ایک لاجواب حجت ہاتھ آتی

اور اُن کی گمراہی بڑھتی ہو۔ پس اے مسلمانو اور اے ہنود و عیسائیو تم دنیا کے کھیل کو دلہو و لعب ہیں بہت ہوشیاری سے کام کرو، اپنے اپنے بزرگان دین کے افعال کی نقل کرکے ٹھٹھے اور ظرافت میں مت اڑا لو حضرات ملوک و امراے والاشان جو بہ ظاہر ایسے امور پر توجہ فرماتے ہیں.. تو اُن کو اسی ذریعے سے غریبوں کی پرورش منظور ہوا کرتی ہے۔

۱۳۰ گوالیار : الحقائق میں مالوہ اخبار سے منقول ہے.. کہ ۲۱ تاریخ کو خریطہ اسمی مہاراجا صاحب کا پڑھا گیا اس میں لکھا تھا کہ مہاراجا صاحب کی مہر کلاں میں "فدوی شاہ عالم بادشاہ" درج ہے سو اب بجاے ان الفاظ کے "فدوی شاہ انگلستان" لکھوانا چاہیے۔

۱۳۷ ۲۶ تاریخ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو.. کورٹ آف ڈائرکٹرس میں ایک صاحب انگریزوں جلیل القدر میں سے بہ طور تذکرہ یہہ بات بیان کی کہ امیران سندھ کو ناکردہ گناہ مجرم... قرار دے کر اوج حکومت اور ریاست سے گرا دیا اور بہ کمال بے رحمی.. جلا وطن کیا... اگر قصور اُس کا ثابت ہو تو لے لینا اُن کے ملک و مال کا بجا ہے اور اگر ان کی بے قصوری ظاہر ہو تو.. اُن بے چارے بے گناہوں کو مُلک و مال ان کا پھیر دینا اور ہر ایک کو ان کے وطن مالوف میں پہنچا دینا عین عدل و انصاف ہے دہلی اردو اخبار

۱۴۱ حیدرآباد دکن : اُس طرف کی تحریرات سے واضح ہوا کہ شہر صفر سنہ حال کی ۲۹ تاریخ اُس دارالحکومت میں بڑا فساد مچا.. جوانان لشکر مسلح ہو کر آستانِ دولت پر چڑھ آئے اور لوگوں کی آمد و رفت بند کر دی، اور اپنی تنخواہ کے لیے دھنّا دے کر بیٹھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی سائیس اور فیل بان اور رتھ بان بھی اکٹھے ہو آئے اور.. رستہ رک گیا، صبح سے شام تک ایک قیامت مچی رہی، آخر الامر عمدۃ الدولہ بہادر نے ان سب کی تسلی کی اور.. دو دن کا وعدہ کیا.. لیکن، بہ اسباب ظاہر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی کہ یہہ وعدہ صورت ایفا دیکھے، کیوں کہ جب اہالیان سرکار.. نے دو سال تک کچھ تدبیر تقسیم تنخواہ کی نہیں کی تو دو دن میں کیا کریں گے۔ بالجملہ وہاں.. بڑی ابتری اور بے انتظامی ہو رہی ہے۔ زبدۃ الاخبار

۱۴۵۔ جو فتنہ اور فساد کہ آپس میں سلطان روم اور شہنشاہ روس کے واقع تھا بڑی کوششوں اور تدبیروں سے ایلچیان کارداں اور وزیروں خرد مند نے باہم صلح کروا دی ...! از زبدۃ الاخبار

قاضی عبدالودود

# کلام ضیا و ثابت عظیم آبادی و فدوی دہلوی

۶ محرم کی شب کو ایک ہونہار اور شوقین شاعر علی رضا المتخلص بہ ضیا نے اسی عارضے (یعنی ہیضہ) میں اپنا منہ کفن سے چھپایا ... شاید اکیس بائیس برس کا سن ہوگا۔ مگر عجب بے چین اور چوٹ کھائی ہوئی طبیعت پائی تھی، جو شعر نکلتا تھا درد انگیز اور معنی خیز۔ فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حضرت شوق نیموی کے شاگرد رشید تھے۔ اگر زندہ رہتے تو خدا جانے کیا ہوتے۔ مرحوم کا پھڑکتا کلام کبھی بھجوا دیا جائے گو تم نے عاشقانہ کلام چھاپنے کی قسم کھائی ہے مگر میری خاطر سے اس کو چھاپ دو اور مجھ پر احسان کرو:

کوچے سے نکلواتے ہو عبث ہم ایسے وطن آواروں کو ‏ رہنے دو پڑے ہیں ایک طرف دکھ دیتے ہو کیوں بیچاروں کو

ہم مشکل کسی مژگاں کے جو تھے تو دل میں ہمارے چبھنا تھا ‏ افسوس کہ اے صحرائے جنوں چبھنا بھی نہ آیا خاروں کو

نکلے ہیں جو نالے پہلے پہل جی اور بھی اس سے ڈرتا ہے ‏ اللہ کرے یاد آئے نہ گھر غربت میں وطن آواروں کو

کچھ اشک بہ رنگ شمع کہیں آنکھوں سے بہانا بیٹھے ہوئے ‏ ہو بزم طرب یا بزم عزا ہے ایک سی غم کے ماروں کو

تھوڑی سی ہی ہو رات ضیا کچھ مانگ دعائیں خالق سے — بہتر ہے اسی میں ہو جو سحر پھر شام سے گننا تاروں کو

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے — ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

مرے ضبط نے تو چاہا کہ نہ ڈوبے نام میرا ‏ مگر آنکھوں سے یہ ٹپکا کہ ہے گریہ کام میرا

کہاں نامہ بر کو بھیجوں کوئی نالہ دل سے کھینچوں ‏ ترے کانوں تک جو پہنچے ہے وہی پیام میرا

یہ نصیب کی ہیں باتیں رہوں جس کی بندگی میں ‏ نہ وہ سر اٹھا کے دیکھے نہ وہ لے سلام میرا

تجھے اپنا وعدہ ظالم کہیں یاد آ بھی جائے ‏ ارے ہو چلا ہے آخر کوئی دم میں کام میرا

بہت انقلاب دیکھے تری چشم فتنہ زا کے — مگر آج تک بن آیا نہ بگڑ کے کام میرا

تنہائی فرقت سے جان اب بہت اکتائی ‏ دل ڈھونڈتا ہے اپنا اک دوسری تنہائی

اول تو کلی دل کی کھلنے ہی نہیں پائی ‏ ایسا بھی ہوا اکثر کھلتا تھا کہ مرجھائی

ہم کو تو شب فرقت لینے کو اجل آئی ‏ ہم کس پہ تجھے چھوڑیں اے عالم تنہائی

گو درد رسیدہ ہوں دل پھر بھی بہت خوش ہے ‏ سو چوٹیں نہیں کھائیں اک چوٹ کڑی کھائی

دنیا سے جدا ہوگا دنیا میں مرا ماتم ‏ پیٹے گی پس مردن مجھ کو مری تنہائی

سوچا جو مآل اپنا دنیا سے ہوئی نفرت ‏ یعنی تری فرقت میں جینے سے قسم کھائی

آئے جو دم آخر احسان کیا لیکن ‏ محشر پہ اٹھا رکھی اب اپنی مسیحائی

کہہ جائیے ضیا جو کچھ کانوں سے فقط سنیے — کم بخت ہے سودائی اور آپ کا سودائی

اقتباس بالا ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۰۱ء (مطابق محرم ۱۳۱۹ھ) کے الپنچ سے ماخوذ ہے۔ ضیا کا دیوان چھپ گیا ہے اور میں نے اسے دیکھا بھی ہے، لیکن اب کم یاب ہے، اور اس وقت پیش نظر نہیں۔ ضیا یقیناً ایک ہونہار شاعر تھا، اُس کے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ اُس کا ایک مطلع "اک قبیس جگر الخ" خاص و عام کی زبان پر ہے اور میر کے رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ بعض اصحاب اسے میر ہی کا سمجھتے ہیں۔

---

ثابت عظیم آبادی کے اشعار ذیل گلزار ابراہیم (قلمی) سے ماخوذ ہیں :

جز تیری گلی پیارے ہم بے سر و پاؤں کو ۔۔۔ پھرنا نہ کہیں چلنا، آنا نہ کہیں جانا

الفت شہر نہیں اس دل دیوانے کو ۔۔۔ چل کے آباد کریں اب کسی ویرانے کو

یاں تلک دل تو ترے دل سے ملایا ہم نے ۔۔۔ پر جو اپنے تئیں ڈھونڈا تو نہ پایا ہم نے

غزل انوری و فکر ہلالی دیکھی ۔۔۔ پر یہہ ابرو کی تری بیت نرالی دیکھی

---

محمد علی فدوی دہلوی مقیم عظیم آبادی کے اشعار ذیل مسرت افزا سے ماخوذ ہیں :

بہ رنگ غنچہ دل صد چاک صبح و شام ہوتا ہے ۔۔۔ ترے آگے ہنسی ہے یہہ ہمارا کام ہوتا ہے

ہستی اسی قدر ہے کسی کو خبر نہیں ۔۔۔ مثل شرارہ ادھر نظر آئے، اُدھر نہیں

درد دل قابل بیان نہیں ۔۔۔ ورنہ کس کے میاں زبان نہیں

لگی کو دل کی دل ہی جانے ہے ۔۔۔ چوٹ کا اس کی کچھ نشان نہیں

میں زلف و رخ کو ترے دے چکا ہوں دل اپنا ۔۔۔ یہہ اب سیاہ کرے اس کو یا سفید کرے

قضا ہی آئے یا صبر آئے یا وہ گل عذار آئے ۔۔۔ خداوندا کچھ ایسا کر مجھے جس میں قرار آئے

زخم دل بے حد ہیں ظالم اور مت بیداد کر ۔۔۔ ہم سے کس منہ سے ملے ہے اپنی باتیں یاد کر

آغوش میں ہم اپنی مہتاب دیکھتے ہیں ۔۔۔ یا رب یہ واقعی ہے یا خواب دیکھتے ہیں

کام یاں اس سے ہے جس سے کام لے سکتے نہیں ۔۔۔ منہ میں اُس کا نام ہے اور نام لے سکتے نہیں

ق ۔ ع ۔ و

# موت اور زیست کی روز آصف آرائی میں

بڑھا موہنا مر رہا تھا۔ اسکی آنکھوں کے کونوں تک زہ مفت کی بن مانگی ہلدی ہو گئی تھی ۔ چھت اگلنی، سنداس، بچوں اور سابوں کی طرف دیکھنے کی بے بضاعت اور بے سود کوششوں سے ظاہر تھا کہ اس ساون سو کھے نہ اساڑھ ہرے جسم میں زندگی کی حرص وہوا اب تک باقی ہے۔ بڈھے کی نگاہ وہیں عزیزوں کو ہمدردی نہیں تھی، نفرت تھی۔ آخر جو آدمی ہفتہ بھر سے روز جیتا ہو، روز مرتا ہو۔ نہ جانے اسکی کون سی نگاہ نگہہ واپسیں ہوتی ہے۔

باہر، اسلحہ خانے کے برابر ایک تنہا ٹرام، شرابی کی طرح لڑکھڑاتی، کھڑکھڑاتی، شور مچاتی گذر رہی تھی۔ یا قریب ایک رکشا قلی زور زور سے گھنگرو رکشا کے بمبوں پر مار رہا تھا۔ اسے اپنی سیپٹک موتی اگلنے کی جلدی تھی۔ اور وہ یوں تیزی سے بھیڑ کو چیر رہا تھا جیسے تیز قصابی چھری کراچی مچھلی کے گداز جسم میں سے گذر جائے ..... باچو، باچو ہٹے پوشے ... اور ایک ہجوم ہنستا، کھیلتا اور روتا کھر۔ تھیٹر اور جہنم کی طرف جا رہا تھا اور موہنا کا بتیس سالہ بیٹا راجا، اپنے دونوں بیٹوں اور آدھی بیٹی یعنی لنگڑی چھوکری کو بچانے کے لئے ایک پھٹے ہوئے ڈھول کی آواز میں چیختا حتی کہ اسکی رفیقہ حیات جو بچے پیدا کرنے اور پھر انھیں فحش گالیاں دینے کی حد تک ہی راجا کی رفیقہ تھی اپنی رفاقت کا پورا حق نبھاتی ۔ اوطون مارو، ہیضہ کے توڑو، مٹ جاؤ دنیا سے ... ارے سارے جمانے کے کلٹی نکل رہی اور ان کے کلٹی بھی تو نا کلتی — گویا بچے ٹرام کے نیچے آکر تو نہ مریں البتہ طاعون، ہیضہ اور چیچک، نہیں بھلے سے لے جائیں۔

راجا نے ایک طویل سی جمائی لی اور آخ کی ایک آواز کے ساتھ اپنے اٹھے ہوئے بازوؤں کو نیچے گرا دیا۔ دو چھوٹے بھائی، ایک بہنوئی اور ایک مسلمان پڑوسی پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ بٹوال سے بڑے دکھائی دیتے تھے اور پانی بے تحاشہ بہ رہا تھا جیسے آنکھوں کی دکھتی رگوں پر کوٹا ہوا۔ پھونکا جلاجست باندھ دیا گیا ہو۔ ان لوگوں میں سے جب کوئی ایک آدھ ٹکا نکالیتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے جست کے باوجود اسکی آنکھوں پر بالائی باندھ دی گئی ہو۔ سب کی خواہش تھی کہ موہنا ایک طرف ہو۔ اب جبکہ وہ بالٹیوں کا تابھی نہیں نکانا۔ کچھ اس لئے کہ سب بول دبراز چارپائی پر ہی ہونا تھا۔ اور کچھ اسلئے کہ اچانک چارپائی پر مر جانا بیٹوں کے لئے بھاری ڈنڈ تھا۔ اس ہفتے میں موہنا بابو کو چھ سات بار زمین پر رکھا گیا اور اس کے ہاتھوں پر آٹے کا دیا رکھ کر سورگ کا راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی۔ ابھی کانوں کی لویں سیاہ اور سرخ تھیں اور روشنی آر پار چلی جاتی تھی اور ابھی ناک کے قریب کانسے کی تھالی رکھنے سے کچھ مرطوب سے بخارات جم جاتے۔ موہنا کے دماغ کے کسی کونے میں امید اور لوحقین پر مایوسی سی چھا جاتی

زمین کچی تھی اور ٹھنڈی یونہی جان نکل جاتی۔ موہنے کا مرنا تو سب چاہتے تھے لیکن اذیت دینے سے گھبراتے تھے۔ کچھ گندم اُبال رکھی تھی۔ کچھ دان کیا تھا لیکن بے سود۔ ابھی موہنا مرا، ابھی جی اٹھا۔

راجاکی بہو نے باہر جھانکا، سرطانی سورج صبح سے کھوپریاں چٹخا رہا تھا۔ لیکن اب کہیں سے اپنے آپ بادل نمودار ہوگئے۔ اگر بارش ہوگئی تو بڑی مصیبت ہوگی۔ وہ ٹہلنے لگی۔ ننھوا اس کا بیٹا جسے گلے کی شکایت تھی اور جس کے حلق کا کوا نیچے گر گیا تھا بڑی رغبت سے چاٹ کھا رہا تھا۔ راجانی نے اسے دیکھا لیکن کچھ نہ کہا صرف بازار سے رائی لے آنے کا حکم دے دیا۔ رائی سرہانے رکھنے سے جان جلدی اور آسانی سے نکل جاتی ہے۔ ننھوا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں ٹرام کے نیچے آجاؤں گا، ماں!۔ اور راجانی منہ میں کف پیدا کرتی ہوئی بولی۔ تو..... تو تو مرتا بھی نا، تجھے تو ڑے سیلا، تیرا مرجا باوا... اور اسی زبان سے بچکارتے ہوئے بولی۔ ایسے لے ادھنی۔ دیکھ ہماری سرکاری نے نئی ادھنی بنائی ہے۔ اب سونے کی ادھنیاں بننے لگی ہیں.. جیتا رہ، دیکھ ٹین کی بھانٹ پر پیر نہ رکھ دیجیو۔ پھر جائے گی پاؤں میں تلوار کی مانک

جب راجانی اندر آئی تو ایک دفعہ پھر موہنا کو اتار کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا گیا تھا راجا کے چھوٹے بھائی نے پھر جلدی سے، ایک پھٹے ہوئے تکیے میں سے روئی نکالی ہات میں مل کر جلدی سے بتی بنائی اور راجانی کے بنائے ہوئے آٹے کے دیئے میں رکھ دی۔ راجانی نے جلدی سے بناسپتی گھی ڈالا اور ایک بناسپتی روشنی کوٹھری کی تاریکی میں چھپنے لگی۔ پھر سے دیا باوا کے ہاتھ پر رکھا۔ مسلمان پڑوسی نے سوچتے ہوئے پاؤں کو ہاتھوں سے چھوا۔ پہلے وہ ٹھنڈے تھے لیکن اب معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گرم ہو رہے ہیں معاً ٹخنوں پر ایک شریان ہلنے لگی۔ قرآن پاک کی قسم، وہ بولا، موہنا باوا جی رہا ہے۔ میں شرط بدتا ہوں ...اور پھر بغیر اضطراری طور پر جیب کے پیسے کھنکھناتے ہوئے بولا۔ بولو کتنے کتنے — بیٹے ایک دفعہ پھر مسکرا دیئے اور پھر ایک پژمردگی سی، ان کے چہروں پر چھاگئی۔

راجانی نے جھاڑو اٹھایا اور سنداس اور پھوس کی دیوار کے درمیان آدھا کچا اور آدھا پکا میدان صاف کرنے لگی۔ راجا نے حلقے کے سکھ تھانیدار کے لئے ٹین کا حمام بنایا تھا۔ ڈھانچا گول ہوا میں پڑا تھا۔ انگیٹھی کی ٹوپی بھی بن گئی تھی۔ اب سب کچھ تپائی پر ٹکا نا تھا اور لوہے کی ریٹیں لگانی تھیں تپائی چوکی کے قریب پڑی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ایک نٹ کنٹیل کئی دفعہ ہوگیا تھا لیکن اس نئی مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہوتا تو حمام مکمل ہوتا۔ ٹین کی ننھی ننھی کترنیں ہاتھوں سے اٹھا راجانی سنداس کے پاس ڈھیر لگانے لگی۔ کھٹیک منڈی کے نواح سے ایک گھاگھر آیا کرتی تھی اور سب بکھرا ہوا ٹین اور بے کار، بے مصرف لوہا کسی بیدار ملک میں لیجانے کے لئے سمیٹ لے جاتی۔

پہلی ٹرام نے مسجد کے قریب اپنے مسافر چھوڑے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اس سے ابھی پرے جانے والے تھے۔ اور کچھ سوار ہونے کو تھے۔ ٹرام والا ہتھی پر ہاتھ رکھے خلا میں گھور رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے

ضرورت بلا ضرورت گھنٹی بجا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے بنانے والے نے خوب اس کا مضحکہ اڑایا ہے۔ بس سارا دن شہر میں چکر لگانا اور پھر وہیں... یا کبھی کبھی کوئی کتا نیچے آکر مر جاتا ہے اور پھر منتظمان کمپنی کو بنگالی میں "ڈرائیونگ" کے بیان دینے پڑتے ہیں۔ اس ہموار، ساکن زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ کلپ کلپ کلپ کلپ۔۔ اور چیکر بے تحاشہ ٹکٹیں مسافروں کے ہاتھوں میں ٹھونس دیتا ہے۔ بس اس کا کام ہے ٹکٹیں دینا اور پھر ٹھیک سے دام وصول کرلینا۔ اس کی زندگی کا ارتعاش یہی ہے کہ پانچ سال سے بڑا بچہ بلا ٹکٹ سفر نہ کرے.... اور اس کی ساری زندگی میں صرف ایک حسین واقعہ پیش آیا تھا۔ منیاری چوک سے ایک کنبے کا کنبہ چڑھا اور ان کے ساتھ ایک نوخیز لڑکی بھی تھی جسے وہ مفت لے جانا چاہتے تھے۔ ارے ابھی یہ تو بچی ہے۔ ایک زرد رو باپ اور ایک سرخ رومال چلائی... دیکھو... دیکھو.. بھلا یہ چھوکری جوان ہے؟ ریل میں مفت سفر کرتی ہے چیکر کہنا چاہتا تھا۔ کیا یہ جوان نہیں ہے۔ پھر وہ اس بات پر بحث کرنا چاہتا تھا لیکن وہ جھینپ کر، پائدان اور سیٹوں کے درمیان ساگوانی پستوں میں پاؤں اڑائے کھڑا لوگوں کے بے معنی فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔ ماں باپ نے دو پیسوں کی بچت کے لئے چھوکری کو دو سیٹوں کے وسط میں کھڑا کر دیا اور نمائش شروع کر دی۔ دیکھو! یہ جوان ہے؟ ہے کوئی انصاف پسند... ایک نوجوان نے کھڑکی میں سے باہر سر نکال کر مسکرا دیا اور یوں اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیا ــــ اور اس دن چیکر کو زندگی کچھ بامعنی معلوم ہوئی۔ پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کلپ کلپ اور چیکنگ کو اس نے زندگی کا ایک حصہ تو بنا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس سے بے طرح غیر مطمئن تھا ــ یا ایک اور واقعہ پیش آیا ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑنے آئی۔ اتنے مسافروں کے سامنے وہ اپنے راجا سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ راجا کسی دوسرے دیس میں جانے کے لئے سٹیشن کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اسباب پہلے بھیج چکا تھا۔ عورت نے کہا۔ اب کب ملوگے؟ مرد نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی ــ جب پرماتما ملائیں گے اور اور ٹریم چلدی۔ اس کے آہنی قبضوں اور چوبی نشستوں کو کسی کے آنسو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اور وہ عورت بے بسی کے عالم میں اپنی کھوئی کھوئی، بیکار نگاہوں سے سڑک پر بچھی ہوئی لوہے کی چار لکیروں کی لامحدود تنہائی کی طرف دیکھتی رہی..............

اب رانی بھی سرہانے رکھ دی گئی تھی۔ تین گھنٹے اور بڈھا بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اب کنپٹی کے پاس ابھری ہوئی رگ پھڑکنے لگی۔ موہنا کے منہ میں پانی کا ایک چمچہ ڈالا گیا۔ آغ، آغ... اور اس کے بعد موہنے نے پانی پی لیا۔ راجا نے اپنا ہاتھ اسکی نبض پر رکھا۔ نبض چل رہی تھی اگرچہ ہولے ہولے اس کے بعد ایکا ایکی جیسے سب کچھ ساکن ہو گیا۔ لیکن پیشانی گرم تھی اور پھر وہ بانس کی ٹانگیں بھی گرم تھیں۔ راجا نے برافروختہ ہو کر کہا۔ " بابو کو رکھدو چارپائی پر"

"کیسے رکھ دیں چارپائی پر؟" راجانی پوچھنے لگی۔

"کیسے رکھدیں"؟ راجانے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے اسے نیچے رکھ دیا ہے ــــ اب یہ نہیں مرے گا، ساری جندگی نہیں مرے گا۔" "اور ڈنڈ تیرے بڑے دیں گے جو مرگیا چارپائی پر"

راجانے خشمگیں ہوکر چھاتی پر ہاتھ مارا اور بولا "ڈنڈ سالا میں دونگا۔ مجھے سوگند درگا مائی کی کبھو نہ مرے گا یو بڈھا"

چھوٹے بھائی چاہتے تھے کہ بابا ٹھنڈے فرش پر محض ٹھنڈک کی وجہ سے نہ مرے لیکن چارپائی پر مرنے کے ڈنڈسے وہ بھی گھبراتے تھے۔ بھائی کے چھاتی ٹھونکنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ راجاکے جسم پر سے ایک پھٹے پرانے پیوند لگے کمبل کو علحدہ کرتی ہوئی راجانی بولی ــ ہم تو کبھی ڈنڈ نہیں دینے کے۔ ہماری جندگی بھی تو ایک ڈنڈ رہی۔ چھوٹوں کو پالا پروسا، بیاہا مرا۔ اب آنکھیں دکھاتے ہیں۔ جو کسی سے بید ندا دھاما لیا وہ یہ دینے ہار نہیں۔ اب چارپائی کا ڈنڈ دے۔ بڑا امیر آیا ہے نا۔

پھر راجانی نے راجاکو چڑاتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ جھٹ چھاتی ٹھونکنے لگتا ہے.... راجا دبک کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ مسلمان پڑوسی اشارے سے ان کو بک بک جھک جھک منع کرنے کے علاوہ منہ میں کچھ ورد کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسکی طبیعت اکتانے لگی۔ وہ کوئی فرض پورا کر رہا تھا۔ اُسے بار بار اپنی زخمی گھوڑی یاد آجاتی تھی۔ اُسکی جان نہیں نکلتی تھی اور اسکی بیوی اور بچے تھان کے قریب کھڑے رو رہے تھے آخر راجانی نے کسی کو بلاکر گیتا کے اٹھارویں ادھیائے کا پاٹھ کروایا اور جونہی پاٹھ کرنے والے آخری شبدوں پر پہنچے تو گھوڑی نے اپنے پران دے دیئے اور گھوڑی کی آتما راجانی کو سورگ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی اور اب جب کہ موہنا کا گھیڑا، بلکہ گدھا جس نے ساری زندگی باربرداری اور زمین کوٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا مر رہا تھا تو مسلمان پڑوسی کو بھی لازم تھا کہ وہ منہ میں کچھ ورد کرکے اسکی جان نکال دے اور ہوسکے تو اسکی روح کو بہشت روانہ کردے۔ لیکن کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ رائی سرھانے سے نکل کر دروازے تک بکھر گئی۔ آخر جب سبنے مل کر موہنا کو چارپائی پر لٹا دینے کا فیصلہ کیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھایا تو اسکی آنکھوں کی تتلیاں پھر گئیں۔ اور وہ فرش اور چارپائی کے درمیان ہی مرگیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ مشرق سے سیاہی پھوٹ رہی تھی ــ موہنا کا مقدر تھا۔ وہ زمین پر مرا نہ آسمان پر۔ اس وقت دن تھا نہ رات۔

راجانے چارپائی کے نیچے گھس کر ایک بڑا سا سرکنڈہ نکالا۔ اُس کو چھلکے سے صاف کیا اور لاش کے برابر کا ناپ کر اُسے موہنا کے پاس رکھ دیا تاکہ ناپ رہے اور رات کو مُردے کے جسم میں کوئی بھوت پریت نہ داخل ہو جائے۔ اس کے بعد راجا خود بخود جھینپ گیا۔ "کب لائے تھے تم سرکنڈہ، راجا بھیا"؟ چھوٹے بھائی نے پوچھا "ابھی لایا ہوں" راجانے صریحاً جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، ابھی نھوا کے ہات منگوایا ہے" سب کھیل مار کر ہنس دیئے۔ یہ سرکنڈہ دو ہفتے سے یہاں پڑا تھا۔ اتنی دیر سے اِن لوگوں کو موہنا با وا کے مرگیاش ہونے کی توقع اور خواہش تھی۔ اس کے بعد راجانی ثابت کرنے لگی کہ اس کا راجا پھوش کے لئے نمونہ لایا تھا۔

مگر سب بے سود تھا۔ کھلی اور بھی اونچی ہو گئی۔

اگلی صبح برادری کی رائے سے بابا کو بڑا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آخر پوتوں والا آدمی تھا۔ زندگی کے سب فرائض سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اس کا جلوس نکالنے، اسے بڑا کرنے سے بیٹوں ہی کی عزت تھی۔ بہوؤں کی مانگوں میں سیندور ڈالے گئے۔ حلوان کشمیرے کی چادر، کفن اور جھنڈیوں وغیرہ کے لئے چندہ ڈالا گیا۔ چھوٹے بھائی نے جذبات میں منجھلے اور بڑے کی نسبت زیادہ روپے دیئے اور من ہی من پچھتاتا رہا۔ اس کے بعد مشترکہ رقم میں سے جلوس کے لئے جھنڈے، چھوہارے اور میٹھے چنے وغیرہ منگوائے گئے اور صبح بوان اٹھایا گیا۔

آج پھر ٹرام والوں کے لئے ایک حسین واقعہ تھا۔ ایک بوان شمشان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے گھنٹیاں بج رہی تھیں اور پیچھے کپڑے رنگے ہوئے، سر منڈائے دو تین آدمی تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے مرد اور عورتیں گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ایک گانا گا رہی تھیں۔ یہ گھنٹی اور یہ سواریاں۔ اور یہ جنازہ برادر......
گویا یہ جلوس بھی ایک سُست رفتار ٹرام تھی جو کہ بغیر ریل کے ایک زمین راستہ پر جا رہی تھی سارا دن شہر کا چکر لگانے کے بعد شمشان کے باہر رک جاتی تھی۔ کچھ سائیکل والے اتر پڑے۔ ایک صاحب نے اپنا ہیٹ اٹھایا۔ ایک مسلمان جو بیٹھا تھا تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ ٹرام والے نے کچھ دیر کے لئے بریک لگا کر ٹرام روک لی اور خلا کی۔ بابا نے سرخ حلوان اور کشمیری چادر میں لپٹے ہوئے جسم کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ اس بوڑھے کے اپنے بچے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اس وقت بوان کے اوپر سے میٹھے چنوں اور باداموں کی چھوٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بادام ٹرام میں بھی آ گرتا۔ ایک ماں بچے کو سیٹ پر بٹھا نیچے اتر آئی اور کچھ میٹھے چنے ہاتھ میں لے آئی اور واپس اپنے بچے کے قریب آتے ہوئے بولی — لے بیٹا، لے، کھا لے، تیری عمر بھی اتنی ہی ہو جائے گی۔ اس بڈھے کی عمر سے بھی زیادہ......

ٹرام کے ڈرائیور، چیکر اور ایک زندگی سے بے حد غیر مطمئن، مایوس بابو نے عورت کی اس حرکت کی طرف دیکھا اور پھر تینوں نے اچک کر بوان پر سے گری کے چنے اور چھوہارے اتار لئے اور رغبت سے انہیں کھانے لگے...... اس کے بعد "چل میرے بھیا" کی آواز آئی اور ٹرام تینوں کے ایک جال میں الجھنے کے لئے چل دی۔

راجندر سنگھ بیدی

# سچّی بات

میاں بیوی کی زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب ان کے دل کے شیشے محبت کی شراب سے چھلکنے لگتے ہیں اور اس سرشاری کے عالم میں وہ اپنی محبت کی وسعت اور گہرائی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خواہ مخواہ کا ایثار، ناممکن وعدے، طرح طرح کی قربانیاں، غرض ہر قسم کی حماقتیں اسی وقت سرزد ہوتی ہیں۔ اور اکثر اسی لئے وہ خود اپنی مصیبتوں کا سبب بن جاتے ہیں۔

ہمارے للیت اور کلیانی کی زندگی میں بھی ایسا ہی ایک لمحہ آیا تھا۔

چودھویں رات تھی۔ للیت دفتر سے لوٹتے وقت گل شبو کا ایک گلدستہ خرید لایا تھا جو پاس ہی ایک گلدان میں سجا ہوا تھا۔ چھت پر دری بچھا کر دونوں میاں بیوی پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ للیت ابھی ابھی صابن سے نہا کر آیا ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو اور کلیانی کے سنورنے کی پھبن، گل شبو کی خوشبو کے ساتھ ملکر فضا میں ایک عجیب مستی سی بکھیر رہی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں گویا خواب کی دنیا بیدار ہو رہی تھی۔

چھوٹا سا مکان، دوسرا کوئی کرایہ دار نہیں۔ ایک ماما۔ سو وہ بھی نیچے سو رہی ہے۔ فضا میں سکون اور خاموشی۔ اچانک کلیانی نے للیت کے گلے میں باہیں ڈالکر کہا، زندگی میں اتنی مسرت ہے یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اف شادی کے وقت میں کیسی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی؟ ہمت نے جواب دے دیا تھا ورنہ میں تو خودکشی کر لیتی!

اس کو زور سے بھینچتے ہوئے للیت نے آہستہ سے پوچھا، کیوں رانو پہلے کیا میں تمہیں پسند نہیں آیا تھا؟ کلیانی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیسی موٹی عقل ہے تمہاری بھی۔ میں نے تمہیں پہلے دیکھا ہی کب تھا۔

بے شک! للیت نے اس کے جوڑے میں منہ ڈالکر کہا۔ پھر اس سے پہلے کیا کسی اور کو پسند کیا تھا؟ بولو نا؟ بتاؤ! کلیانی نے وفور مسرت میں ہاتھ پیچھے لے جاکر للیت کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس سے ہم آغوش ہو گئی۔ پھر بولی، شریر! دھوکا دیکر میرا راز جاننا چاہتے ہو کیا؟ ...... تمہارے کارنامے سنے بغیر میں ایک بھی نہ بتاؤں گی۔

اس کے بعد پیاری مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔ ہاں بتاؤ نا۔ شادی سے پہلے تم نے کتنی لڑکیوں سے محبت کی ہے؟ کبھی کبھی اس کے جاننے کا شوق ہوتا ہے لیکن تم کو دیکھتے ہی سب بھول جاتی ہوں اس لئے کبھی پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی ....

للیت نے جواب دیا، ہاں، بس تمہارے پوچھنے ہی کی دیر تھی .... اب بتا سکتا ہوں ...... اب کوئی رکاوٹ نہیں۔

پُرفریب ہنسی سے کلیانی کا چہرہ دمک اٹھا۔ تو اب کہو نا تین، چار یا اس سے بھی زیادہ۔
بناؤ ٹی آہ بھر کر للیت نے کہا، اتنی میری تقدیر میں کہاں؟ صرف ایک۔ میری آپا کی نند!
پٹنہ سے آکر ہمارے یہاں دو مہینہ رہی تھی۔ خوب چاہت کے پینگ بڑھے۔ ایک ہی گھر لیکن خط وکتابت
ہر وقت ہوتی تھی۔ جب وہ چلی گئی .... تو میں نے اماں سے کہا۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا
سنا ہے کہ اُس نے بھی اپنی بہن سے یہی کہا تھا، میں ان کو نہ پاسکی تو خودکشی کر لوں گی۔
پھر؟ للیت نے ہنس کر کہا، پھر اور کیا؟ جو عموماً ہوتا ہے وہی ہوا۔ اب وہ بھی اپنے بال
بچّوں کے ساتھ مزہ میں گھر گرہستی کر رہی ہے ..... اور میں بھی تمہیں سینے سے لگائے پڑا ہوں۔
کلیانی نے کہا، یہ سچ ہے۔ اس وقت ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے بھیّا کے
ایک دوست کو دیکھکر مجھے بھی ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کے بغیر میری زندگی تباہ ہو جائیگی، میں مر جاونگی۔
دل ہی دل میں ساوتری کی طرح عہد کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ اس کے سوا میرا اور کوئی سوامی نہیں ہے۔
پھر ذرا رک کر کہنے لگی، اف کیا کیا خیال باندھتی تھی اپنے دل میں! کیا کیا ڈرامے دل میں
کرتی تھی اب تو ٹھیک یاد بھی نہیں ..... وہ کمبخت بھی ویسا ہی تھا۔ صرف مجھے دیکھنے کے لئے مکان کے
چاروں طرف چکر کاٹا کرتا تھا۔ سزا بھی خوب ملی۔ "فرسٹ یار" ہی میں دو بار فیل ہوا۔ اب تو سنا ہے کہ
لکھنا پڑھنا چھوڑ کر کہیں ملازمت کرتا ہے۔
دونوں ہی ذرا ہنس پڑے۔ اس کے بعد چند منٹ بالکل چپ چاپ گذر گئے۔ دونوں ہی کچھ سوچ
میں پڑ گئے تھے۔ کچھ ذرا دیر بعد کلیانی للیت کا گلا چھوڑ کر اس کی گود میں سر رکھکر لیٹ کر کہنے لگی، لڑکپن میں
سب لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایں نا!
للیت کچھ کھویا ہوا سا تھا۔ اس نے اسی طرح جواب دیا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں لڑکپن ......
پھر کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ جوش کا جو طوفان اٹھا تھا وہ تھم گیا۔ اب پورا سکون تھا۔
کوئی دس منٹ بعد دونوں کو اپنی خاموشی کا احساس ہوا۔ للیت نے ذرا آواز کے ساتھ جمائی لی؟
کلیانی نے کہا، ہوا بالکل نہیں ہے۔ دیکھتے ہو؟ دوپہر کو کیسا طوفان تھا اب پتّا تک نہیں ہلتا! کچھ گرمی سی معلوم ہو رہی
ہے۔ ایں نا۔ کلیانی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے للیت نے کہا، تمہارا سر تو پسینہ میں بھیگ گیا! ....
ٹیبل فین لگا لو نا! رہنے دو اب کون اٹھے
اس کے بعد اچانک اس نے سوال کیا۔ تم کہہ رہے تھے کہ آئندہ جمعہ کو تمہاری چھٹی ہے؟
اسی طرح بے ربط بات چیت ہونے لگی۔ جانے کس طرح ان کی باتوں میں ایک ذرہ سا جھجک سی
پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کی وجہ دریافت کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔
چند منٹ اور گذر گئے تو للیت نے کہا، چلو، کھانا کھالیں۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔

کلیانی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن کہنے لگی، میرے بڑے بھاگ! تم تو کبھی بارہ سے پہلے کھانا ہی نہیں چاہتے! آج اسی ڈر سے میں نے ماما کو پہلے کھلا دیا ورنہ وہ تو نوکری چھوڑ دینے پر تلی ہوئی ہے!

للیت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ پھولوں کا دستہ لے کر نیچے اتر گیا۔

دوسرے دن صبح کو للیت کھانا کھا رہا تھا۔ کلیانی پنکھا ہاتھ میں لے کر سامنے آکر بیٹھ گئی پھر بولی، مجھے ایک بار پٹنہ لے چلوگے؟

متعجب ہو کر للیت نے کہا پٹنہ! سب جگہوں کو چھوڑ کر تمہیں پٹنہ جانے کا شوق کیوں چرّایا؟

کلیانی نے سر نیچا کر کے کہا، یونہی ۔۔۔ کم سے کم ایک بار اس لڑکی کو تو دیکھ لیتی۔ اور زیادہ متعجب ہو کر للیت نے کہا، لڑکی؟ کون لڑکی؟ وہی تمہاری بہن کی نند۔ اچھا۔ للیت ہنس پڑا۔ اچھی عقل ہے تمہاری بھی۔ وہ کیا پٹنہ میں رہتی ہے؟ اس کی کیا شادی نہیں ہوئی؟ سسرال نہیں ہے؟

کلیانی نے کہا، کہاں ہے اسکی سسرال؟ مچھلی سے کانٹا نکالتے ہوئے للیت نے جواب دیا، ہوگی کہیں اسی طرف دربھنگہ یا موتی ہاری، مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔ کلیانی چپ ہوگئی۔ للیت نے اس وقت اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن دفتر میں فرصت کے اوقات میں اُسے اس بات کا خیال آتے ہی اِس کے تہہ میں کلیانی کا رشک کا جذبہ صاف نمایاں ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ للیت کو ایک عجیب شرم سی محسوس ہوئی۔ کلیانی کی ذہنیت بھی کتنی پست ہے۔ توبہ۔

وہ ذرا متانت کے ساتھ گھر آیا۔ کلیانی نے پنکھا کھول دیا۔ حسبِ معمول اس کے ہاتھ سے کرتا بنیان تو لے لیا لیکن وہ پہلی سی گرم جوشی مفقود تھی۔ نہ جانے کیا مذاق کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے بدلے کوئی دنیاوی بات چھیڑ دی، سنتے ہو، اگلے مہینے ماما دیس جانا چاہتی ہے۔۔۔۔۔

—— تو پھر؟ کیا وہ اپنی جگہ کسی اور کو رکھ کر نہیں جا سکتی؟ کلیانی نے کہا۔ وہ تو انکار ہی کرتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے عجیب مشکل ہے

اس روز بھی چاند نکلا۔ لیکن وہ چھت پر نہیں گئے۔ للیت کمرہ میں ایک کتاب لیکر لیٹ گیا۔ کلیانی کا باورچی خانہ کا کام بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔ تو وہ بھی سلائی کا کام لے کر للیت کے پاس آکر بیٹھ گئی کل رات ہی کی طرح پہلو بہ پہلو مگر وہ دلداریاں کہاں! کلیانی نے کچھ کہا، للیت نے کتاب پڑھتے پڑھتے ہی جواب دیا۔ اسی طرح کھانے کا وقت ہو گیا۔

دوسرا دن بھی یونہی گزرا۔ اس دن دونوں نے بے تکلفی برتنی چاہی، مذاق کرنے کی کوشش بھی کی لیکن خدا جانے کہاں اور کس طرح بار بار سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔ آخر دونوں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اب ہر کام پہلے کی طرح آسانی سے نہیں ہو رہا ہے۔ زندگی کے ساز میں نہ جانے کس نے کہاں ایک بے سُرا تار لگا دیا ہے۔ دونوں کو غصہ آیا۔ کیا معمولی سی بات بھی معمولی طور پر نہیں کہی جا سکتی؟ وہ

تو کتنے دنوں کی بات ہے! اس کے بعد زمانہ نے کتنی کروٹیں لیں! وقت کی بات ہے ورنہ وہ خود بھی تو گویا بھول ہی گئے تھے۔ غصہ زیادہ تر للیت ہی کو آیا کیونکہ اُس نے اپنی شرمندگی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کلیانی نے خواہ مخواہ اس پست ذہنیت کا اظہار کیا۔ اتنی محبت کے باوجود بھی وہ اس معمولی سے واقعہ کی بنا پر اس سے بدگمان ہوئی! تعجب ہے!

کلیانی نے بھی اس کو منانے کی کوشش نہیں کی اور نہ اسے اپنے قصور کا احساس ہوا رفتہ رفتہ جو پردہ دونوں کے درمیان حائل ہوتا جا رہا تھا اس کے سمجھنے میں بھی اس نے غلطی کی۔ اس نے سوچا روٹھنا مجھی کو چاہیے۔ تکلیف یا ہتک ہوئی ہے تو میری ہی ہوئی ہے۔

اسی طرح چار، پانچ دن گذرنے کے بعد شرمندگی یا غصہ جب ایک طوفانی صورت اختیار کر رہا تھا، تو ایک دن اچانک شام کو للیت کلیانی پر برس پڑا۔ کلیانی اس وقت باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھی۔ وہاں آ کر اس نے چیخ کر کہا، تم نے میرے کاغذات کو کیوں الٹ پلٹ کیا؟

کلیانی گویا چونک سی گئی۔ چند لمحے ٹھہر کر ہچکچاتے ہوئے بولی، کس نے کہا؟ للیت نے درشت لہجے میں کہا، کس نے کہا اس سے بحث نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم نے میرے کاغذات کو ہاتھ کیوں لگایا؟

کلیانی نے کڑھائی میں کسی چیز کو چلاتے ہوئے جواب دیا، میری ایک ضروری چٹھی نہیں مل رہی تھی، خیال ہوا کہ شاید تمہارے کاغذوں میں ہو۔ جھوٹ، کہہ رہی ہو، للیت نے کہا، تم میری پرانی چٹھیوں کا بنڈل کھول کر اس لئے دیکھ رہی تھیں کہ ......

کلیانی گویا شعلہ کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے مُڑ کر جواب دیا، تو پھر کیا کرو گے تم اس کے لئے؟ مارو گے؟ للیت نے کہا۔ ماروں گا نہیں۔ لیکن تم کتنی ذلیل ہو، مجھے حیرت ہوتی ہے۔

میں ذلیل ہوں، کلیانی نے چیخ کر کہا، اور تم؟ کیا تم نے بھیا کے پاس جا کر ان کا البم دیکھنا نہیں چاہا؟ تم سمجھتے ہو میں کچھ نہیں جانتی؟ للیت کچھ سخت جواب دینا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔ اس نے دو ایک بار بولنے کی کوشش کی۔ پھر ذرا بے ربطی کے ساتھ ہی کہنے لگا، خوب خوب، تم نے تو جاسوسی بھی شروع کر دی؟ تو ایک کام کرو نا پولیس میں درخواست دیدو، اچھی ملازمت مل جائیگی۔

وہ اور نہیں ٹھہرا۔ اوپر چلا گیا۔ کلیانی بھی وہیں منہ لپیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس رات دونوں نے فاقہ کیا۔ واقعہ کی بیہودگی پر للیت کو سخت ندامت تھی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے جوں جوں وہ غور کرتا تھا۔ اتنا ہی اسے اپنے قصور کا احساس ہوتا جاتا تھا۔ قصور اس کا بھی کچھ کم نہیں تھا اسی نے سب سے پہلے کلیانی کو سخت سست کہا۔ اس کی ندامت کی انتہا نہ رہی دوسرے ہی دن خود پیش قدمی کرکے کلیانی سے معافی مانگ کر صلح کر لی اس کے بعد پھر آسانی کے ساتھ زندگی کا قافلہ روانہ ہوا لیکن وہ پہلا سا اطمینان نہ تھا۔ کسی طرح بھی دل کا پیمانہ پہلے کی طرح لبریز نہ ہوتا تھا۔ وہ اگلی سی بات پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ جانے کہاں کون سا جوگ ہو گیا تھا۔

مہینہ بھر بعد للیت نے اچانک ایک ٹیوشن کر لیا۔ پہلے یار دوستوں کی ہزاروں منت سماجت کے باوجود بھی وہ اس کام کے کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ کلیانی نے فریاد آمیز لہجے میں کہا ایک تو دفتر کی محنت اس پر یہ ٹیوشن۔ اپنی صحت کا تو خیال کرو۔

للیت نے کہا، محنت کچھ زیادہ نہیں ہوگی۔ لڑکا تیز ہے۔ معاوضہ بھی خاصہ ہے ذرا کوشش تو کرنے دو.......

کلیانی چپ ہو رہی۔ وہ جلد ہی سمجھ گئی کہ للیت شام کی فرصت کو یوں اس سے دور بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ٹھنڈی آہ بھری۔ لیکن اس کے دن کیونکر کٹینگے؟ بال بچے نہیں اور نہ کچھ ایسا زیادہ کام کاج...... اکیلے گھر میں دس بجے تک وقت کاٹنا پہاڑ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تنہائی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے، جی بھر آتا ہے اور آنکھیں برسنے لگتی ہیں۔ آخرکار ایک دن اس نے للیت سے اس کا ذکر کر ہی دیا۔ بولی، ہمارے نیچے کے کمرے تو بیکار ہی رہتے ہیں۔ وہاں کوئی شریف کرایہ دار نہیں آسکتا کیا؟ صرف میاں بیوی... ایسا کرایہ دار نہیں ملے گا کیا؟ متعجب ہو کر للیت نے کہا، ملے گا کیوں نہیں۔ لیکن اس چھوٹے سے مکان میں غیر لوگوں کے آنے سے تم اطمینان سے رہ بھی سکو گی؟ نہیں، نہیں، تمہیں تکلیف ہوگی.....

کلیانی نے کہا، لیکن میں اکیلی اکیلی اس مکان میں کیسے دن گذاروں، کہو نا؟ مجھ سے اب یہ کہا نہیں جاتا!

للیت دیر تک مبہوت بنا رہا۔ بہت دنوں کے بعد کلیانی کو سینے سے لگا کر اس نے چپکے سے پوچھا، میں بھی اب سہہ نہیں سکتا۔ اتنی اتنی رات تک باہر مارا مارا پھرنا مجھے مارے ڈالتا ہے.... رانی تم مجھے پھر بلا لو نا....

آنکھوں میں آنسو بھر کر کلیانی نے کہا، تو کیا میں نے تمہیں نکالا ہے؟ زور سے سر ہلا کر للیت نے کہا، نہیں نہیں قصور میرا بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مگر ذرا سوچو تو کتنی معمولی سی بات پر ہمارے سکھ کا سنسار اجڑ گیا! کلیانی نے اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا، سچ ہے، جانے مجھ کمبخت کو کیا ہو گیا تھا کہ میں ایسی باتیں کرنے لگی۔ اس سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آئی۔ کیا ہم ان باتوں کو بالکل فراموش نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں۔

زبردستی کلیانی کا منہ اوپر اٹھاتے ہوئے للیت نے کہا، لیکن اس سے پہلے تم میری ایک بات کا یقین کر لو کہ اس رات کو میں نے سولہ آنہ جھوٹ کہا تھا۔ میرے کندھوں پر شیطان سوار تھا۔ میں نے جوش میں آکر ایک کہانی گڑھ دی

کلیانی للیت کے سینہ ہی میں رہکر چونک سی گئی۔ اس کی اشک آلود آنکھیں روشن ضرور ہوئیں لیکن کچھ دیر تک وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے للیت کے چہرہ کو دیکھکر اس نے کہا، اُف ایک بے بنیاد بات کی وجہ سے ہم دونوں کو کیسی تکلیف ہوئی...... اگر تم اس روز بھیا سے البم نہ مانگ کر سیدھا سیدھا سوال کرتے تو تم کو پتہ چلتا کہ بھیا کے کسی دوست سے کبھی میری ملاقات ہی نہیں ہوئی، محبت تو در کنار.... جوش میں آکر میں نے بھی یونہی ایک بات بنائی تھی۔ للیت زور سے ہنس پڑا اُس نے کلیانی کو اور زیادہ زور سے بھینچ لیا۔ کلیانی نے بھی آنسوؤں اور خوشی سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس کے گلے میں باہیں ڈالکر اسکے سینہ پر سر رکھ دیا۔ اسی طرح وہ دونوں پچھلی رات تک بیٹھے بے تکلفی کے ساتھ دنیا بھر کی بات چیت کرتے رہے۔ دونوں نے امکان بھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب ان کے دلوں سے ساری رنجشیں دور ہو گئی ہیں۔ آج وہ پھر پہلے کی طرح ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی دونوں نے دل ہی دل میں اقرار کیا کہ دونوں میں سے کوئی بھی آج کی "سچی بات" کا پوری طرح یقین نہیں کر سکا۔

گجیندر کمار مِتر

مترجمہ محمد رضا تسنیم جہانگیر نگری

# کشیدہ تعلقات

میشا نے ضد والی خاموشی کو جاری رکھا۔ اسے بولنے کو ذرا بھی جی نہیں چاہتا تھا اور جب اُسے کھانے پر بلایا گیا تو اس نے قطعی طور پر انکار کر دیا:

"میں کچھ بھی نہیں کھانا چاہتا....."

جب اسے چائے پر بلایا گیا تو اسنے نہایت سنجیدگی سے اور اپنے لہجے میں ایک کامل یقین پیدا کرتے ہوئے کہا: "تم اپنی چائے یا کافی جو بھی ہو پیو لیکن مجھے رہنے دو میں کچھ بھی نہیں کھانا چاہتا" اس جواب پر میشا کی بہن ایک غیر فطری زوردار ہنسی ہنسی اور بولی "تمہاری پرواہ ہی کون کرتا ہے، چاہو تو کھانا پینا بالکل ہی چھوڑ دو، ہماری بلا سے۔"

یہ بولتے ہوئے وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی مگر میشا نے اس بڑھائی ہوئی بے پرواہی کے جواب میں اور اس کے نمائشی چلے جانے میں اپنے لئے ایک جان کر چھپائی ہوئی ہمدردی کا اظہار پایا۔ یقیناً وہ بن رہی تھی اور یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس کے ماں باپ پرواہ ہی نہیں کرتے کہ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے اور نہ چائے ہی پی ہے.....

...ان کو فکرمند ہونے دو۔ یہ تو انھیں کی غلطی تھی.... لاطینی میں صرف ایک ہی نمبر لانا اتنا بڑا جرم تو نہ تھا کہ سب کے سامنے اسے ذلیل کیا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ تو صرف موچی ہونے کے لائق ہے۔ موچی ہونے کے متعلق تو خیر وہ پرواہ ہی نہیں کرتا، لیکن کچھ بھی ہو وہ کھانا نہیں کھائے گا۔

میشا ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ایک رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اور بغل والے کمرے کی چہ میگوئیاں بھی سُن رہا تھا۔ یقیناً وہ اُسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ بھوکا ہی رہے گا اور یہ بھی کہ وہ ایک چالاک لڑکا ہے۔

"میکائیل کہاں ہے......... ابھی تک مُنہ پھلائے ہوئے ہے کیا؟" یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

"وہ غصہ ہے"۔ نیلا آہستہ اور عمداً بولی

"بہرحال ہمیں اس کے لئے کچھ نہ کچھ دینا چاہئے"۔ یہ اُس کے باپ کی گہری آواز تھی۔

میرے لئے کچھ رہنے دو..... اُنھہ..... جیسے کہ مجھے اس کی ضرورت ہی ہے!" میشا نے کہا:

ایک دو [illegible] چیزیں رکھی جاتی ہیں"

"میکائیل" اُس کے باپ نے پکارا۔ میشا خاموش رہا۔ اس کے باپ نے پھر پکارا۔
"آپ کیا چاہتے ہیں" میشا نے بارعب لہجہ میں اپنے رسالے پر جھکتے ہوئے جواب دیا۔
یہاں آؤ۔ منھ پھُلانا اب بہت ہو چکا"
"میں مُنھ پھُلائے تو نہیں ہوں۔ میں پڑھ رہا ہوں، موچی اس لائق نہیں ہوتے کہ وہ ٹیبل پر کھانا کھائیں" "کرٹھ مغزہ"
"بہت اچھا! تب میں کرٹھ مغزہ ہوں؟" میشا نے چلا کر جواب دیا اور پھر آہستہ سے بھنبھنایا۔
"آپ لوگوں کو کچھ سننے کا ارادہ ہو رہا ہے" "وہ غصّہ ہے" اُس کی بہن نے زور سے کہا۔
"چُپ رہ بیوقوف کہیں کی" میشا نے آہستہ سے کہا۔ اور اُسے اپنی بہن سے سخت نفرت ہونے لگی۔ وہ اُس سے انتقام لینا چاہتا تھا........ اگر اس کا باپ وہاں نہیں ہوتا........
.... اُس نے کیوں خواہ مخواہ ٹانگ لڑائی، کسی نے اس کی رائے تو پوچھی نہ تھی۔ وہ غصّہ سے کھانسا اور رسالے کو میز پر دے مارا۔ پھر اپنی جیب سے ایک پنسل نکال کر ایک تصویر جس میں ایک جوان مرد ایک بنچ کے نیچے تھا اور ایک لڑکی نزدیک ہی کھڑی تھی۔ تصویر کی نیچے تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرد بنچ کے نیچے اس لڑکی کا نام کھود رہا ہے۔ چونکہ اوپر سارا بنچ بھر چکا تھا۔ میشا نے یہ لکھ دیا۔" یہ نیلا اور راسکی ہیں: دو عظیم الشان بیوقوف"۔ اس نے رسالہ کا وہی صفحہ کھول کر رکھ دیا تاکہ ہر شخص دیکھ سکے اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے نیلا کا ہیٹ جو کہ اس کی میز پر رکھا تھا زمین پر پھینک دیا۔" میں یہ واہیات خرافات اپنے ٹیبل پر رہنے نہیں دے سکتا"۔ وہ چلایا، حالانکہ اُس کا سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔
میشا کو ہر ایک سے دشمنی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھر دو مخالف پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک جانب صرف وہ اکیلا اور دوسری طرف سارا گھر۔ اِس لئے جب دائی اُس کے کمرے میں آکر اس سے مخاطب ہوئی تو اُس نے اُس سے سخت ترشروئی دکھلائی۔

"میکائیل"

"بھاگ دور ہو"

"تم سے کوئی ملنے آیا ہے"

"میں کہتا ہوں کہ تو نکل جا"

"تم نے کچھ کھایا نہیں ہے اسی سے خفہ معلوم ہوتے ہو۔ اب سمجھی میں"

میشا اچھی طرح جانتا تھا کہ دائی اُس کے پاس بھیجی گئی ہے، اسے افسوس ہوا کہ وہ اس سے خفا ہو رہا تھا لیکن وہ بچّہ تو نہ ہے... ان کو فکرمند ہونے دو لیکن حقیقتاً وہ بھوکا تھا۔ کیا باورچی خانہ ہی میں چلا جائے؟ نہیں یہ اس کے شایانِ شان نہیں، باورچی اس کی خبر دائی کو کردے گا اور دائی پھر سارے گھرانے کو اور پھر وہ لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔ اس لئے بھوک کو برداشت ہی کرنا اس کے لئے بہتر ہے"۔ اگر اس کی ماں یا اس کا باپ آکر کہتا "مت غصہ ہو میشا........ تم جانتے ہو کہ اگر تم نہ کھاؤ گے تو بیمار ہو جاؤ گے اور ہم لوگوں پر خواہ مخواہ مصیبت آجائیگی مجھے افسوس ہے کہ ایسا واقعہ پیش آگیا اب ایسا پھر کبھی نہیں ہوگا" تب میشا مَن جاتا اور جلدی سے کھانے کے کمرے میں چلا جاتا، ان لوگوں نے یقیناً اس کے لئے کچھ رہنے دیا ہوگا۔

آج کے دن اس کے لئے سوپ بنا تھا۔ میشا کے منہ میں پانی آگیا۔ وہ دروازے کے پاس جاکر اپنی ماں کے پاؤں کی آہٹ کو سننے لگا۔ اس کا باپ تو آ ہی نہیں سکتا تھا، مگر اس کی ماں تو آکر اپنے افسوس کا اظہار کرسکتی ہے۔

مگر اس کی ماں نہیں آئی اور اس کی بھوک ہر لمحہ زیادہ ہوتی جارہی تھی، متوقع سفیر کے بدلے فالسٹاف جو کہ ایک خوبصورت شکاری کتا تھا اس کے دروازے کے سامنے نظر آیا۔ وہ ہلکے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور اس کے پاس آکر دُم ہلانے لگا۔ فالسٹاف اس کے باپ کا چہیتا کتا تھا اس کی جگہ خاص آفس ٹیبل کے نیچے، اس کے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں تھی۔ وہ یہاں کیوں آیا؟ اپنے مالک کے پاس جاکر کیوں نہیں دم ہلاتا۔ اس نے اس قدر کھا رکھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب پھوٹ پڑیگا۔

"نکل جا"! میشا نے بے اختیار غصہ ہوتے ہوئے کہا اور اسکو ایک لات ماری وہ دبی آواز میں غرّایا اور اس انداز سے دُم ہلائی جیسے کہ اس کے پندار کو ٹھیس لگی ہو اور وہ پھر آہستہ سے باہر چلا گیا۔ اور میشا وہ تو اب اور بھی بھوکا تھا،

بہت دیر تک وہ اپنے بائیں انگوٹھا کو چوستا ہوا اپنی حالت پر غور کرنے لگا: آخرکار اُسے ایک بڑی اچھی ترکیب سوجھی جو اسے اپنے دشمنوں سے کسی قسم کی مصالحت سے بچا سکتی تھی۔ الیکسی نے ایک دفعہ اپنے بھائی کے الجبرا کی کتاب کو بیچ کر ایک چاقو خریدا تھا۔ اور میشا بھی اپنی گذشتہ سال کی کتابوں کو

بیچ کرنا نبائی کی دکان سے پیسٹری اور دوسری چیزیں لا سکتا تھا۔ وہ تو دودھ کی دکان پر بھی جا سکے گا ...... اور یہاں لوگ گھبرائے ہوئے ہوں گے .... بلا سے ان لوگوں کو پریشان ہونے دو، یہ تو انہیں کی غلطی تھی ..... وہ آئندہ اچھی طرح پیش آئیں گے

مِیشا اپنی کتابوں کے شلفوں کو ڈھونڈھنے لگا اور ایک نیلی کتاب نکالی مجھے اس کی ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن بہت ہی جلد نہیں .... اس وقت تک وہ بھول جائیں گے کہ یہ کتاب میرے پاس تھی اور پھر مجھے نئی خرید دیں گے، مِیشا نے سوچ کر آخر اسے بیچ ہی دینے کا فیصلہ کیا۔

وہ کھانے کے کمرے سے ہو کر گذرنا نہیں چاہتا تھا .. وہ تمام لوگ وہیں تھے اور خیال کریں گے کہ وہ صلح کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے ... وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ دوسرے رستے سے آسانی کے ساتھ باہر نکل جا سکتا تھا۔

وہ دریچہ سے کود کر کتاب کو چھپائے ہوئے بازار کیطرف روانہ ہو گیا۔ شام ہو رہی تھی اور دکانیں اب جلد ہی بند ہو جائیں گی۔ اسے جلدی کرنی چاہئے۔ مِیشا ہوا کی طرح بھاگا ...... وہ راستہ کو مختصر کرنے کے لئے کئی نصف تعمیر شدہ مکانات سے گذرا جسکی وجہ سے اس کے جوتے میں ایک نمایاں سوراخ پیدا ہو گیا۔ کسی اور وقت وہ اس واقعہ سے بہت پریشان ہو جاتا چونکہ جوتے نئے تھے اور اسے تنبیہہ کیساتھ دئے گئے تھے کہ وہ انکا کافی خیال رکھے ... لیکن اسے اسوقت تو کسی کی بھی پرواہ نہ تھی، انہیں نیا خرید نے دو، لیکن وہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ اسے موچی کی طرح ننگے پاؤں ہی رہنے دو۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ خرید ہی دینگے چونکہ ایک وکیل کے بیٹے کیلئے ننگے پاؤں رہنا نہایت ہی ذلت کی بات تھی ...... گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی وہ خرید ہی دینگے۔ اتنے میں بازار آ گیا۔ یہاں نہایت ہی چہل پہل تھی۔ شور غل، جھگڑے لڑائیاں مار پیٹ، گالی گلوچ، یہ تو ایک مستقل بھوتوں کی مجلس تھی

"گرم گرم سموسے" ایک چوڑے منہ، جھکتی ہوئی ناک والا اپنی تلیا ہی آواز سے چلایا۔ اس نے مِیشا کو دیکھکر پوچھا "کیا تمہیں کوئی سموسا چاہئے"

"کس چیز سے بنے ہوئے ہیں" مِیشا نے سوال کیا۔

"مجھ سے خریدیئے بابو، اس کے تو ٹھنڈے ہو گئے ہیں، میرے دیکھئے کتنے گرم گرم ہیں" یہ ایک عورت کی آواز تھی جو کہ اپنا مٹی کا برتن اور سموسے دکھلا رہی تھی۔

"میں فوراً ہی خرید ونگا ۔ مجھے ابھی سردست وقت نہیں ہے" اور پھر میشا گندے بھیڑ کو چیر کر نکل گیا ۔ اور پرانی کتابوں کی دکان تک پہنچ گیا اور بڑی گھبراہٹ کیساتھ ایک دوکاندار کے پاس گیا ۔ دوکاندار انتظار کے انداز میں اپنی دکان کے کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا ۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس سے سنجیدگی ٹپکتی تھی ۔ وہ ایک دوکاندار سے زیادہ ایک پروفیسر معلوم ہوتا تھا ۔ لڑکے کو دیکھ کر وہ اپنے کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گیا اور ایک کتاب کھولکر پڑھنے کا بہانہ کرنے لگا ۔

"کیا تم کتابیں خریدتے ہو؟"

"تمہیں کوئی کتاب بیچنی ہے کیا"؟

"ایشیا ۔ افریقہ ۔ امریکہ ، بالکل نئے" میشا ہانپتے ہوئے بولا

"سمر نو کا"

"ہاں"

"اگر یہ یورپ ہوتا تو میں ابھی خرید لیتا ۔ لیکن میرے پاس یہ کتابیں بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں ۔ اور پھر یہ پرانا ایڈیشن ہے ..... میں تو تمہیں اس کے لئے صرف دس کاپک ہی دونگا"

"مجھے اسے بیس کاپک سے کم میں فروخت کرنے کو نہیں کہا گیا ہے" میشا نے ہچکچاہٹ کیساتھ کہا دکاندار نے جمائی لیتے ہوئے میشا کو کتاب واپس کر دی ۔

"تب پندرہ ہی دیدو ......... یہ بالکل ہی نئی ہے"

اس پر دکاندار نے کوئی جواب نہ دیا

"بہت اچھا میں دس ہی کاپک لونگا"

"تمہیں اس میں بہت نفع ہو رہا ہے" دکاندار نے پھر جمائی لیتے ہوئے کہا ۔ پھر دس کاپک کاؤنٹر پر رکھ دئے اور کتاب کو لاپرواہی سے شلف پر پھینک دیا'

"شائد میں یورپ بھی لاؤں" میشا نے جیب میں پیسے رکھتے ہوئے کہا

"ضرور .... کیا وہ اسی کی طرح ہے ، اگر نہیں تو میں اسکی قیمت دس کاپک نہیں دونگا ۔ اور ایک بات اور سنو تم اپنے دوستوں کو بھی میرے یہاں بھیج دیا کرو ۔ میں دوسروں کی نسبت زیادہ قیمت دیتا ہوں"

"اچھا میں یقیناً کوشش کرونگا"

میشا دکان سے نکل کر کھانے کی چیزوں کو دیکھنے لگا ۔ ان سموسوں تک پہنچے سے

قبل اسے حلوا اور دوسری مٹھائیوں کو دیکھ کر منہ میں پانی آگیا۔ اس نے تھوڑا سا تین کا پاک میں خرید لیا اور بڑی رغبت کیساتھ فوراً ہی چٹ کر گیا۔ وہ بھوکا تھا۔ پھر وہ سموسے والی عورت کے پاس آیا۔

"وہ کس قسم کے ہیں؟"

"مشروم گوشت اور گاجر کے"

"مجھے گاجر پسند نہیں۔ مجھے ایک سموسا گوشت کا اور ایک مشروم کا دو"

دونوں سموسوں کو کھانے کے بعد اُسے پیاس محسوس ہوئی۔ اس لئے اسنے بچے ہوئے دو کاپک سے شربت خریدا۔ وہ دوسرا گلاس بھی نہ ختم کرنے پایا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ شربت نہایت ہی خراب اور بہت ہی زیادہ میٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی چھوڑ دینا اس کے لئے اس حالت میں بڑی مشکل بات تھی۔

"اُف" میشا دوسرا گلاس بڑی مشکل سے ختم کرتے ہوئے بول اٹھا

"کیا ہوا کیا یہ تمہارے سر پر چڑھ گیا ہے" دوکاندار سے بڑی تمکنت والی آواز سے پوچھا اور پھر زور سے چلانے میں مشغول ہو گیا۔

"میٹھے تازگی دینے والے شربت"

جب وہ گھر پہنچا تو اُسنے اپنی میز پر ایک رکابی میں ٹھنڈا گوشت، کچھ روٹیاں ایک گلاس دودھ اور تین کلچے رکھے ہوئے پائے۔ اُسے صرف کلچے دیکھکر لالچ ہوا۔ وہ اُنھیں بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ مگر اسوقت اسکی شان اس بات کو گوارا نہ کرسکتی تھی کہ وہ کھائے۔ اگر اُسے یقین ہوتا کہ انھیں یاد نہ ہوگا کہ انھوں نے دو رکھے تھے یا تین تو وہ شائد ایک انئیں سے کھا لیتا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ہر ایک میں سے ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر کھا لیا اور پھر ایک گھونٹ دودھ پی لیا۔ یہ بہت ہی لذیز تھا۔ مگر نہیں! وہ اور زیادہ نہیں کھائیگا۔

شربت یقیناً اس کے دماغ پر چڑھ گیا تھا اور حلوا مشروم اور خراب گوشت کے ٹکڑے اسے بہت تکلیف دے رہے تھے۔

"اف! تکلیف دہ!" وہ غصّہ سے بڑبڑایا اور بار بار فرش پر تھوک پھینکنے لگا۔

"تم کہاں گئے ہوئے تھے؟" نیلا نے دروازے کے پاس آتے ہوئے پوچھا

"تمہیں کیا غرض۔ میں تو تم سے نہیں پوچھتا کے تم کہاں کہاں ماری پھرتی ہو"

جاتے ہوئے نیلا نے ٹیبل پر دیکھا۔ میشا کا کھانا ویسا کا ویسا ہی دھرا رکھا تھا۔

"ماں نے کہا ہے کہ تم گوشت ضرور کھالو"
"مجھے کھانیکی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک کرمٹھ مغزا اور موچی ہوں"
"پھر جیسی تمہاری خواہش"
"بہت اچھا۔ تم جاؤ اپنے رانسکی کے ساتھ سیر کرو، مجھے کیوں خواہ مخواہ تنگ کرتی ہو"
"احمق" اسنے ترخ کر کہا اور چلی گئی۔
میشا نے محسوس کیا کہ اسمیں طاقت ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے ہار نہ مانے اور ان کے جملوں کا جواب کھانے کے مکمل انکار سے دیتا رہے۔ اس نے کافی کھا لیا ہے۔ وہ یقیناً اس کی مدد کے لیئے کافی سے زیادہ تھے۔
شائد یہ حالت بہت دیر تک قائم رہتی اگر ایک اتفاقی واقعہ ان کشیدہ تعلقات کو نہ ختم کر دیتا۔ میشا کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور یہ درد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ درد نے اسے مجبور کر دیا کے وہ تکیہ میں منہ ڈال کر لیٹ جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکی اس کمزور حالت کا پتہ ان لوگوں کو چل جائے اس لیئے وہ بہت دیر تک درد کو برداشت کرنیکی کوشش کرتا رہا اور کراہوں کو تکیہ میں چھپانے کی سعی خام بھی لیکن بازار کی چیزیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ وہ زور سے کراہنے لگا اور تکیہ پر ہاتھ پٹکنے لگا۔
"اف کیسی سزا ملی" اس نے یہ بار بار پریشان آواز سے کہا اور بار بار پیر پٹکتا رہا
شام کو جب یہ درد برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ زور سے چلایا اور اس کے تمام دشمن اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب سوائے اس کے باپ کے جو کہ عموماً اسوقت کلب میں ہوا کرتا تھا۔ اسکی ماں نے اس کا بخار دیکھا، اسکی بہن نیلا نے مالش کا تیل لایا۔ دائی ڈاکٹر کو بلانے کے لیئے بھاگی۔ یہاں تک کہ فالسٹاف بھی اس لاچار آدمی کو دیکھنے آیا اور لوگوں کو چیرتا ہوا غمگین اور ہمدردانہ انداز سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے میشا کو دیکھا۔
"تم نے کیا کر رکھا ہے" ماں نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس نے زہر نہ کھا لیا ہو کیونکہ وہ اکثر قبل بھی ایسے کشیدہ تعلقات کی حالت میں اس کی دھمکی دیا کرتا تھا۔
"کیا تم نے کچھ کھا لیا، میشا تو بتلاؤ پیارے جلد بتلاؤ۔" "اماں اف! اماں میں نے ایشیا افریقہ امریکہ بیچ کر مشروم کے سموسے کھائے تھے۔
"کیا حال ہے میشا! میرے خدا یہ تو پاگل ہو رہا ہے۔ کلب سے اسکے ابا کو بلواؤ"
ماں میشا پر جھکی اور اسکی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بوسہ لیا اسکی بہن ڈبڈبائی ہوئی

آنکھوں کیساتھ کمروں کے چاروں طرف پھر رہی تھی اور بار بار دریچہ سے پریشان نظروں تے ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ آخر ڈاکٹر آگیا۔

"جوان آدمی بتلاؤ تو کہاں درد ہے۔ ذرا پلٹ تو جانا۔"

میشا نہایت فرماں برداری سے پلٹ گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔

"تم نے آج کیا کھایا ہے"

"ڈاکٹر صاحب اس نے آج کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ بلکہ کل سے جب سے کہ وہ اسکول سے واپس آیا ہے۔"

"یہ بات ٹھیک نہیں۔ خیر کچھ بھی ہو۔ صاف صاف بتلاؤ تو تم نے کیا کھایا ہے؟"

"ہاں میں نے مشروم کے سموسے کھائے ہیں۔ میں نے ایشیا افریقہ بیچ دیا ہے۔"

"کیا بات ہے" گھبرائے ہوئے باپ نے گاڑی پر سے اترتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی فوراً ہی کلب سے ایک نامکمل بازی چھوڑ کر آیا تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد سارا گھر خاموش تھا۔ میشا کے پیٹ پر پٹی لگی ہوئی تھی اور وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ اسکے پاس ماں اور اسکی بہن تھی۔ وہ لوگ ایک پاؤں پر ناچ رہے تھے اور میشا کی ہر خواہش کو نہایت ہی فرانبرداری سے پوری کر رہے تھے۔ درد اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میشا کو بالکل تشفی ہوگئی تھی۔ یہ تھا کشیدہ تعلقات کا اختتام!

(ترجمہ) سید فضل احمد

# گلۂ گذشتہ

کل کہتے تھے تم کہ وہ حالت نہیں رہی
وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

جلتی ہے شمع اب بھی مگر وہ جلن کہاں
اب سوزِ عشق میں وہ حرارت نہیں رہی

اٹھتی نہیں ہے یاد کی ٹیس اب وہ دم بدم
دل میں مرے تمہاری امانت نہیں رہی

ٹھنڈی پڑی ہے دیر سے خاکسترِ حیات
مٹی میں التہاب کی حالت نہیں رہی

مجھکو تمہارا ناز اٹھانے میں شاید اب
وہ گرمیٔ نشاط و مسرت نہیں رہی

سنجیدگی نے شوق کو بے روح کر دیا
بے باکیاں نہیں ہیں وہ جرأت نہیں رہی

باتوں میں رات کٹتی تھی وہ بات اب کہاں
کچھ دیر بیٹھنے کی بھی فرصت نہیں رہی

جسکے بہانے سیکڑوں پھیرے تھے رات دن
شاید کہ اب وہ تم سے ضرورت نہیں رہی

شکوے یہ سب بجا مگر اتنی ہے التماس
سب جس سے تھا وہ چشم مروت نہیں رہی

حالات ہی کچھ ایسے ہیں ناساز گار اب
مجھکو جواب دینے کی ہمت نہیں رہی

میرے ہی سر کی کھا کے قسم کہہ تو دو مگر
وہ ہم نہیں رہے وہ محبت نہیں رہی

رضا مظہری

# جنگنامہ ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

(مسلسل)

جنگنامہ کی لسانی خصوصیات بھی ہمارے لئے کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ اس کا مصنف الہ اباد کا رہنے والا تھا لیکن بجائے اودھی کے جو اس علاقہ کی سب سے مشہور ادبی زبان ہے برج بھاشا کا رنگ اس کی نظم پر غالب ہے اسلئے ہم اسے برج بھاشا کی نظم قرار دے سکتے ہیں حقیقت یہہ ہے کہ ہندی کی رزمیہ شاعری کی جس کا ایک قابل قدر نمونہ جنگنامہ میں ہمیں ملتا ہے زبان برج بھاشا ہی ہے۔ لیکن مری دھر نے کسی ایک زبان میں شاعری نہیں کی اسماء و افعال وضمائر میں برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی اور اودھی اس کی نظم میں مخلوط نظر آتی ہیں۔ اگر تفصیلی زبان سے قطع نظر کیجائے تو ہندی کی کتابیں۔ زیادہ تر تین زبانوں برج بھاشا اودھی اور کھڑی بولی میں پائی جاتی ہیں ان میں سب سے اہم اور بڑی حد تک صحیح نمایندہ قدیم شورسینی زبان کی برج بھاشا ہے۔ برج بھاشا کے بد مشرقی ہندی کی سب سے مشہور شاخ اور اردھ میگدھی کی بیٹیوں میں سب سے زیادہ اہم بولی اودھی ادبی حیثیت سے ممتاز ہے قدیم برج بھاشا اور شورسینی میں جو آگے چل کر مگدھی اور ان تمام بولیوں کی سرچشمہ ثابت ہوئی جسے مشہور ماہر السنہ سر جوج گریرسن نے مغربی ہندی کے تحت میں شمار کیا ہے بہت کم فرق ہے شورسی دیس متھورا کے آس پاس کے خطوں کو کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اطراف میں بولی جانے والی پراکرت سورسینی پراکرت اور اس سے جو اپابھرنش یعنی بگڑی شکل یا عام بول چال کی زبان نکلی سورسینی اپابھرنش کے نام سے موسوم ہوئی موجودہ دور کے ایک ہندی نقاد پروفیسر جگر ناتھ رائے اور بنگالی ماہر السنہ ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ سب زبانوں کیطرح اپابھرنش کا بھی دو روپ تھا۔ ادبی اور بول چال کی زبان اور ایک وقت سارے آرین انڈیا یعنی گجرات اور مغربی پنجاب سے بنگال تک ایک ہمہ گیر ادبی زبان رائج تھی جسے شورسی اپابھرنش کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی متعدد شکلیں تھیں جو قصباتی حضرات کی بولیوں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ ظہور پذیر ہوئیں یہی ادبی شورسینی اپابھرنش ایک زمانہ میں لنگوا فرانکا کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی جگہ موجودہ کھڑی بولی نے لے لی ہے کھڑی بولی یا ہندوستانی کی دو شکلیں ہیں ہندی اور اردو۔ ریورنڈ رڈ ایف ہرنلے نے ۱۸۷۲ء کے جنرل ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک مضمون شایع کیا تھا جسمیں برج بھاشا کو ہندی اور اردو کا ماخذ بتایا گیا تھا۔ شاید ان کے تتبع میں گارسن وتاسی اور شمس العلما محمد حسین آزاد مرحوم نے اردو کو برج بھاشا کی بیٹی بتلایا لیکن یہہ صحیح نہیں۔ علامہ محمود شیرانی کا خیال صحیح ہے کہ برج بھاشا اور اردو (کھڑی بولی) میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا دونوں نے شورسینی اپابھرنش کی گود میں جنم لیا گو ان کے "خدو خال" خصائص اور صرف ونحو میں فرق نمایاں ہو تا گیا لیکن یہہ کہنا صحیح نہیں کہ اردو یا کھڑی بولی کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ قدیم ہندی

بہرکیف یہاں دو ایک شعر مثالاً پیش کیے جاتے ہیں بیلاس جھنڈ کا ایک شعر ہے ؎ حکم شاہی کو یے گل گئے او
+ کتب الملک واھنے سجے او۔ یہاں گئے اور سجے او خالص اودھی ہیں۔ ہرگیا پھنڈ کا شعر ہے ؎ دوہوں
اور (طرف) بھوجین ساجی یو + گل گاج (گرجکر) ھتّ (مادر) تھار ہے یہاں ساجی یو صاف برج بھاشا۔
دوہوں اور گل گا بھی برج کے الفاظ ہیں۔ پہونچیں کھڑی بولی کی ترکیب ہے اگر پہونچن ہوتا تو برج
بھاشا اسے کہتے بجائے بھی برج بھاشا ہے۔ ایک جگہ شاعر لکھتا ہے ؎ مہراب سر پر گیدھ کیے
گنی (جھنڈ) یوں بڑھواوت پات (آفت) ہیں۔ یہاں گدھ کے گن کے وغیرہ کھڑی بولی کی خبر دیتے
ہیں۔ اوت پات بڑھون ہیں برج بھاشا کی مثال ہے۔ دو ایک اور اشعار لیجئے ؎ پھڑک سیر (فرخ سیر)
سمت (منتخر انہ) شاہ شاہان دل سجیو (۲) یہ کام ہوک کی یو۔ دی یو۔ کہری چھوکرا مردانہ ہے۔
(۳) جلف کار کہاں۔ بچھوری سب بھیج دگا۔ کی یہ۔ پہنا۔ ان مصرعوں میں سجیو۔ کی یو۔ دی یو برج بھاشا
ہیں اودھی میں سجی او۔ دی۔ کی او۔ دی او ہوئے اور کھڑی بولی کی شکلیں سجا اور کیا۔ دیا ہوتیں۔ بچھوری
برج بھاشا ہے اور اودھی بھی کھڑی بولی میں یہ لفظ پچھڑ کر ہوتا۔ چھوکرا کھڑی بولی ہے۔ برج بھاشا میں
چھوہرا ہوتا۔ یہ اور ہے کے الفاظ بھی قابل غور ہیں اغلب ہے کہ ہے اور تھا پر بھی راج رہا ہو۔ مصنفہ
چاند برادائی کے ان حصوں میں جو متفقہ طور پر اصلی اور قدیم تسلیم کیے گئے ہیں مفقود ہیں تھا کی جگہ ہوتو چاند
ہر جگہ استعمال کیا ہے جیسا کہ آنجہانی مسٹر بیمس اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں مختلف بولیوں کا کافی اشتراک پایا جاتا ہے برج بھاشا
اودھی اور کھڑی بولی کی آمیزش زمانہ قدیم سے شروع ہو چکی تھی جس زمانہ میں برج اودھی وغیرہ کا ادب
معراج کمال پر پہونچا ہوا تھا کھڑی بولی یا ہندوستانی آہستہ آہستہ اپنا رنگ جما رہی تھی امتداد زمانہ سے
برج بھاشا اور اودھی کا رنگ تو پھیکا پڑ گیا موجودہ دور میں تو کھڑی بولی کا ہی بول بالا ہے۔ برج بھاشا
میں شاعری اب بہت کم کی جاتی ہے اور اودھی میں تو قریب قریب نا پید ہے معلوم ہوتا ہے کہ اودھی نے
بتدریج برج بھاشا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس میں ضم ہو کر رہ گئی یہی وجہ ہے کہ برج بھاشا اور
اودھی میں فی زمانہ فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ اصول ماہرین لسان کے سب کے بس کی بات نہیں بہر حال
عرصہ دراز تک مصنف جیسا مرنے قدیم روش پر چلنے کی کوشش کی اس کے زمانہ میں اودھی برج بھاشا
اور کھڑی بولی تینوں کا رواج تھا لیکن برج پیش پیش تھی اودھی کا کل ہندوستانی کھڑی بولی کھلاں پڑتی لیکن
سنسکرت زبان کا ماہر الہ آباد کا برہمن رزمیہ نظم کا مصنف اور چاند برادائی جیسے شاعروں کا مقلد برج بھاشا
کے بغیر کیوں کر قدم اٹھا سکتا تھا۔ دربار اور گرد و پیش کی چلتی ہوئی زبان کھڑی بولی تھی وہ اس سے بھی
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کھڑی بولی میں اس نے نظم لکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن جیسا ہم آئندہ عرض
کریں گے اس کا رنگ اس کی زبان پر چڑھ گیا۔ فارسی و عربی کے الفاظ اس نے بکثرت استعمال کیے ہیں اور گا

اثر زبردست ہوتا ہے اور پھر جنگنامہ کا موضوع بھی ایسا تھا کہ مسلمانوں کے لائے ہوئے الفاظ کے استعمال کے بغیر اسے چارہ نہ تھا الفاظ کے ذخیرے کے علاوہ اس کے لب ولہجے اور قواعد میں بھی کسی حد تک وہ عناصر پائے جاتے ہیں جو موجودہ ہندوستانی کے جزو لاینفک ہیں اس کی زبان پر غالب رنگ تو برج بھاشا ہی کا ہے لیکن کھڑی بولی اور اودھی کے عناصر بھی دوش بدوش نظر آتے ہیں قبل اس کے کہ ہم اس کے کلام کا کچھ نمونہ نذر ناظرین کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سر جارج گریرسن کی مشہور اور ضخیم مجلدات جائزہ السنہ ہندوستان ہندی بیاکرن مصنفہ بابو کامتا پرشاد گرو اور علامہ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو کی مدد سے کچھ باتیں ان تین زبانوں کی جو زیر بحث ہیں بعض امتیازی خصوصیات کے متعلق پیش کردیں تاکہ جنگ نامہ کی زبان کے خصائص کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔

برج بھاشا اودھی اور کھڑی بولی کی شناخت الفاظ کے آخری حروف سے کیجاتی ہے کھڑی بولی کے آخر میں ا۔ آ۔ یا۔ برج بھاشا میں یو۔ اَوْ اور اودھی میں اے یو یا اوٗ آتے ہیں مثلاً سچی اوکری او۔ دیا او۔ اودھی۔ ساج یو۔ بھیجیو۔ کی یو۔ دی یوٗ۔ برج بھاشا اور ساجا۔ کیا۔ دیا کھڑی بولی ہیں۔ برج بھاشا کے بھی کئی روپ ہیں۔ اسکی اسٹینڈرڈ شکل متھورا آگرہ علی گڈھ وغیرہ میں بولی جاتی ہے آگرہ کے مشرق یعنی دھولپور قرولی اور گوالیار کے اطراف میں لب ولہجہ اسٹینڈرڈ برج کا سا ہے علی گڈھ کے شمال میں بلند شہر ہے جہاں ہندوستانی یا کھڑی بولی اور برج کے لہجے میں بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ کہیں کہیں آو۔ یو اور او سب مستعمل ہیں کہیں تو اسما کے آخر میں بجائے او کے اُ ہی آتا ہے مثلاً گھوڑا۔ نہ گھوڑو۔ لیکن بالعموم جہاں کھڑی بولی اپنے اسمار و افعال و اسمائے صفات کے آخر میں الف لاتی ہے برج بھاشا کے آخر میں ایک واو مجہول کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے اپنا سے اپنو چلا سے چلیو کہیں واو معروف کا بھی استعمال ملتا ہے جیسے بستت سے بستو۔ جن ضمائر میں आ\ یا आँ یعنی یا آ آتا ہے اس کا برج میں او ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی او جیسے میرا کا میرو۔ میرو ( یا واو معروف ومجہول) جیسا کا جیسو۔ جتنا کا جتنو اسمار صفات اور افعال کا بھی یہی حال ہے اور اکثر اسمائے صفات میں لام کی جگہ رے لاتے ہیں جیسے کالا کے بجائے کارو۔ چلنا کے بجائے جرنا۔ پرایا کا پرائیو۔ پیلا کا پیرو۔ ترچھا کا ترچھو۔ اونچا کا اونچو۔ نیا کا نیو وغیرہ جہاں تک افعال کا تعلق ہے گیا کی جگہ ہم گیو۔ دیکھا کی جگہ دیکھو۔ پاتے ہیں لاحقہ گا کی جگہ گو ملتا ہے جیسے ماروں گا سے مارونگو۔ جاؤنگا سے جاؤنگو۔ برج میں میں کرتا کی جگہ میں کرتو بولتے تھے اور جانا کی جگہ جایبو۔ مارتا کی جگہ ماریو۔ مارت۔ مارتو لاتے تھے۔ مارہوں۔ مارے ہوں۔ ماری ہو کا استعمال بھی برج میں بکثرت پایا جاتا۔ کھڑی بولی ہے کی جگہ ہوں با واو مجہول اور ہوں با واو معروف بہت لاتے تھے۔ برج میں بعض مصادر بو، وو یا نو آخر میں لگانے سے بنتے تھے جیسے ہونا کی جگہ ہوئیو۔ بوجھنا کی جگہ بوجھبو۔ چلنا کی جگہ چلبو واحد وجمع تذکیر وتانیث کے اعتبار سے کھڑی بولی اور برج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب کسی اسم کو

جو واحد مذکر ہو جمع میں لانا چاہیں تو برج میں ای۔ اِن اور انی آخر میں استعمال کریں گے جیسے دولہی دولہن۔ دولہنی۔ ٹھکرائن کی ٹھکرانی شکل ہو گی۔ کھڑی بولی میں یوں اور یاں لاتے ہیں جیسے گلیاں۔ ٹھکرانیاں۔ ٹھکرانیوں۔ برج بھاشا کی ان اور انی کی جگہ ہم ن استعمال کرتے ہیں جیسے جالن (برج بھاشا)، جالوں (کھڑی بولی) نرن (برج بھاشا) نروں (کھڑی بولی)۔ لیکن جمع کے لئے برج میں اسم کے آخر میں اکثر نوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے موتی کی جگہ موتن دن کی جگہ دنن پھول کی جگہ پھولن۔ علامات جارہ میں کا کی جگہ 'کو' کا استعمال ملتا ہے۔ مثلاً گلے میں پھولوں کا ہار" برج میں گل پھولن کو ہار ہو جائے گا۔ اسم فاعل کے لئے کھڑی بولی اور برج دونوں میں 'نے' کا استعمال پایا جاتا ہے۔ لیکن کھڑی بولی کے برخلاف اکثر لاحقہ 'نے' افعال لازمی کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے اور یہ بات کھڑی بولی میں پائی نہیں جاتی جیسے بیٹا چلا کی شکل برج بھاشا میں بیٹا چلیو ہو گی۔ اضافی حرف جارہ برج بھا میں کئی ہیں جیسے کو۔ کر۔ کیرا ان کی شکل کھڑی بولی میں کا اور کی ہے مثلاً راون کیر اموت یعنی راون کی موت رام کو باتیں تے ہی کربا تمن یعنی اس کی باتیں۔ کھڑی بولی 'سے' کی جگہ برج میں 'تین' اور 'سوں' ملتے ہیں کے لئے کی جگہ برج میں کہاں۔ کون۔ ہیں کو حاصل ہے۔ کھڑی بولی کا 'کو' برج بھاشا میں 'کون کہاں' کی شکل میں ہمیں ملتی ہے۔ کھڑی بولی میں میں کی جگہ برج میں مان۔ ماہی۔ مانہہ۔ منہ ملتی ہے جیسے من مانجھ یعنی من میں برج میں واؤ اکثر اوقات میم سے بدل جاتی ہے جیسے وہاں کا مہان۔ جادیں کا جامیں ایک اور فرق کھڑی بولی اور برج میں یہ ہے کہ اکثر الفاظ میں حرف علت کو جب کہ حرف ثانی ہو اول الذکر میں حذف کر دیتے ہیں لیکن برج میں الف لاتے ہیں جیسے مٹی کی جگہ ماٹی۔ کنکر کی جگہ کانکر۔ پتھر کی جگہ پاتھر وغیرہ لیکن جنگنامہ میں ہم لاکھ کی جگہ لکھ ہی پاتے ہیں۔

(باقی)

سید حسن عسکری

# اشارات

(۱) معاصر (اگست ۱۹۴۲ء) میں دو قطعے شائع ہوئے ہیں، جن میں سے ایک تپاں اور دوسرا راسخ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ بعض اصحاب جو راسخ کو تپاں کا شاگرد قرار دیتے ہیں، یہ بظاہر انھیں قطعوں کی بنا پر۔ اگر یہ اصحاب تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے سوالاتِ ذیل کے جواب عنایت فرمائیں تو تپاں اور راسخ کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے:

۱۔ تپاں کا سالِ ولادت ۱۱۶۳ھ بتایا گیا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے؟ ۲۔ تپاں کی تصنیف سے اس وقت کون کون سی کتابیں موجود ہیں، اور کون کون کتابیں ایسی ہیں، جن کا معاصر یا قریب العصر لوگوں نے ذکر کیا ہے، لیکن اب ناپید ہیں؟ ۳۔ معاصر میں تپاں کے جو اشعار شائع ہوئے ہیں، کیا ان کے علاوہ بھی ان کے اُردو کے شعر موجود ہیں؟ ۴۔ کیا معاصر کے شائع کردہ اشعار میں کچھ ایسے بھی ہیں، جو خود تپاں یا ان کے کسی معصر یا قریب العصر شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں؟ ۵۔ راسخ کے علاوہ اور کون کون شاعر تپاں سے اپنے اردو کلام میں اصلاح لیا کرتے تھے، اور ان کا ذکر کن کتابوں میں ملے گا؟ ۶۔ کیا تپاں کا ذکر اردو گو شاعر کی حیثیت سے کسی ہم عصر یا قریب العصر مصنف نے کیا ہے؟ ۷۔ اس دعوے کا کیا ثبوت ہے کہ معاصر کے شائع کردہ قطعے تپاں اور راسخ کے ہیں؟ ۸۔ کیا ان قطعوں کے علاوہ کوئی اور ثبوت بھی اس دعوے کا ہے کہ راسخ تپاں کے شاگرد تھے؟ ۹۔ کہا جاتا ہے کہ راسخ فدوی اور میر کے شاگرد تھے، اگر یہ صحیح ہے تو تپاں کی شاگردی کا زمانہ ان دونوں کی شاگردی کے زمانے سے مقدم ہے یا مؤخر؟

(۲) "مرثیہ گو خود رو کر مرتبۂ شاعری سے گر جاتے ہیں، اور بہادروں کو رُلا کر ان کے مراتب میں داغ لگاتے ہیں" اس قول پر اعتراض کیا گیا ہے۔ لیکن میر علی محمد شاد مرحوم اس سے متفق ہیں، فرماتے ہیں: "اوّل تو ایسے مضامین مذہباً کب صحیح ہو سکتے ہیں جن سے بے صبریِ اہلِ بیت نکلے، دوم، عقلاً بھی یہ بات ممنوع، پھر خلافِ واقعہ بھی ہے۔" مکتوبات ۲۵ "مولوی صاحب ممدوح نے بہ نفرتِ ظن مجھ سے کہا کہ میر انیس کی شاعری کا کیا کہنا ہے، مگر حیرت ہے کہ اس قدر ناتہذیب اور بے صبری کے مضامین میر صاحب کیوں نظم کرتے ہیں، اگر امام حسین و اہلِ بیت ایسے ہی بے صبر تھے تو اس مذہب کو میرا سلام ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بہت سے جواب تو دیے، لیکن حق بات تھی، دل پر اثر کر گئی۔ اپنے ... استاد سے عرض کیا۔ حضرت نے بھی تصدیق فرمائی" مکتوبات ۳۹

(۳) فروری کے معاصر میں عبرتی پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اس میں عبرتی سے متعلق شاد کی کسی تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے جسے ندیم نے ۱۹۴۲ء میں چھاپا تھا۔ اس سلسلے میں اسی موضوع پر شاد نے ۱۹۰۵ء میں جو کچھ لکھا تھا، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ نوائے وطن میں عبرتی کا حال اس طرح درج ہے: "میر وزیر علی صاحب مرحوم عبرتی

تخلص، باڑھ کے سید زادے تھے، سنِ شعور میں عظیم آباد آکر راجا پیارے لعل الفتی کے شاگرد ہوئے۔ راجا صاحب دہلی کے درباری اہل کار تھے، فارسی زبان میں مسلم الثبوت مانے جاتے تھے۔ میر صاحب کو قواعد اس کے خوب بتائے اور تعلیم میں حد بھر کوشش کی۔ ایک زمانے کے بعد فارسی انشا پردازی میں ایسے نام بر آوردہ ہوئے کہ سیکڑوں امیر زادے ان کی تعلیم گاہ تک پہنچنے لگے۔ شاگردوں میں ان کے دو چار نامی بھی ہوئے۔ میر عبداللہ صاحب مرحوم کے خاندان میں سب لوگ انھیں مانتے تھے۔ نواب سہراب جنگ و نواب فیروز جنگ مرحوان نے بھی ان سے پڑھا تھا، راجا مہیپت سنگھ مہاراجا شتاب رائے والے نے بھی ان سے پڑھا تھا، اور بہت عزت کرتے تھے۔ کچھ دنوں میر صاحب نے صدر اعلائی میں نظارت بھی کی۔ تصنیف سے ایک محبت خاص تھی، سیکڑوں چھوٹے بڑے رسالے لکھ ڈالے، مگر افسوس ہے کہ وہ کل کتابیں نہ چھپیں اور ناقدر دانیوں کے عارضے میں مبتلا ہو کر مر گئیں۔ صاف اور سلیس زبان میں ان کی عبارت بہت کم دکھائی دی۔ شاید محاورات فارسی کی دست گاہ بہ طورِ اہل زبان کم تھی، اور حقیقت میں بھی اہل ہند کے لیے یہ بات مشکل ہے۔ مسجع اور رنگین عبارتوں کے مالک تھے، شاعر بھی تھے، ان کی اکثر غزلیں ہماری نظر سے بھی گزری ہیں، گو کہ ان کے شعر عاشقانہ نہ ہوں مگر ترکیب، بندش و مضمون آوری کہے دیتی ہے کہ اس طرز کو پسند کرتے تھے۔ خوش مزاج، لطیف، ظریف باوضع آدمی تھے۔ ۱۳۰۲ھ [۱۸۸۵] ہجری یا ۱۳۰۳ھ [۱۸۸۶] ہجری میں لاولد انتقال کیا۔ اُن کے نامی شاگردوں میں سید امیر جان صاحب، فرقتی تخلص (بڑے بھائی حاجی سید نواب جان صاحب ذاکر وزائر عظیم آبادی کے) اور لالا بندا پرشاد اور ہمارے استاد، شیخ آغا جان صاحب اور میر تصدق حسین صاحب نظمی مشہور ہیں۔ میر صاحب کے ہم مشاعرہ اکثر زمانے میں یہ حضرات تھے، مرزا امان علی صاحب، ذبیح (جو کہ ایک نامی شاعر اور میاں مصحفی کے شاگرد تھے) مرزا غلام حسین صاحب قمر، میر نواب مرحوم، مہدوی، نوروز علی خاں یکتا۔ خدا ان بزرگوں کو جنت نصیب کرے"

یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے ۱۸۵۳ء تک عبرتی خود شاد کے نزدیک بھی سید تھے۔ نہ معلوم وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر شاد نے بعد کو یہ لکھا کہ وہ کسی کھتری یا کالستھ کے بیٹے تھے۔ عبرتی کا سال وفات ۱۲۹۶ھ تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، لیکن اس بارے میں شاد کا جو قول نوائے وطن میں ہے ناقابل اعتنا نہیں۔

قاضی عبدالودود

---

تصحیح: گارسان دتاسی کے متعلق ایک کتاب پر جو تبصرہ شایع ہوا تھا، اُس میں گریرسن کے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد ۲ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جلد ۲ کی جگہ جلد ۹ حصہ ۱ ہونا چاہیے۔

# مطبوعات جدیدہ

انوار : مصنفہ جناب علی اختر، اختر۔ صفحات ۱۶۰، تقطیع ... قیمت عہ
شایع کردہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن۔ انوار، اختر کے اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس میں بیشتر غزلیں اور کمتر دوسری اصناف سخن کے نمونے ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس مجموعے میں بیشتر وہ غزلیں ہیں جنھیں میں نے کبھی کبھی زندگی کی سنجیدگی سے اکتاکر یا پھر مشاعروں یا تفریح کے لئے کہا تھا۔۔ میرے بعض احباب اسے گوارا نہ کرسکے کہ ان اچھی خاصی غزلوں کو خواہ مخواہ ضائع کردیا جائے کیوں کہ بہرحال میری کہی ہوئی ہیں" اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ غزلیں "اچھی خاصی" ہیں اور باوجود اس کے کہ زندگی کی سنجیدگی سے "اکتاکر" یا محض تفریح کے لئے کہی گئی ہیں، ان کا لہجہ سنجیدہ ہے، لیکن بیسویں صدی میں غزلوں کے کسی مجموعے کی اشاعت کے لئے صرف اسی قدر کافی نہیں۔ غزل گویوں کے جو مختلف عیوب ہیں وہ اختر کی غزلوں میں بھی موجود ہیں۔ کسی خاص نقطۂ نظر کا فقدان بھی نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حقیقت غم دل تجھ سے کیا کہوں اے دوست — خدا یہ دولت سرمد تجھے عطا کرتا
غم حیات کو اختر سمجھ لیا جس نے — دعائے مرگ نہ کرتا تو اور کیا کرتا
خوشا اے ہجوم غم عالم گداز — مجھے موت کا آسرا ہو گیا
جیسے عشق لذت غم نہ دے اسے کیوں حیات گراں نہ ہو — جو پیام دل بھی نہ سن سکے وہ نوائے روح سنے گا کیا
غم مجھ کو دینے والے فطرت مری بدل دے — یعنی مجھے سکھا دے احساس غم نہ کرنا

انوار میں جابجا غالب کے اشعار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن، غالب غزل گو ہونے کے باوجود بھی ایک بڑا شاعر ہے اور اختر کسی صنف سخن میں متوسط درجے سے آگے نہیں بڑھے،

اختر: بھلا نہ ہم صفیر مجھے کیسے مان لوں — بجلی گری ہو جس پہ مرا آشیاں نہیں
غالب: قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس مجموعے میں ایک نظم ہے جس کا عنوان "یاد ماضی" ہے یہ ذیل میں مکمل نقل کیجاتی ہے:

۱ دل دردمند وفا چاہتا ہوں — محبت کی شیریں جفا چاہتا ہوں
۲ وہ گزرا ہوا عہد شوق فراواں — پھر اُس عہد کی ابتدا چاہتا ہوں
۳ سکون مسلسل سے گھبرا گیا ہوں — وہی صبر دور مضطر آزما چاہتا ہوں
۴ مجھے لذت زندگی جس نے بخشی — وہی تلخ جام فنا چاہتا ہوں

| | | |
|---|---|---|
| ۵ | سنہری تھیں جس سے محبت کی راتیں | وہی بادۂ جاں فزا چاہتا ہوں |
| ۶ | وہی جلوۂ ماہتاب و لب جو | وہی شام کیف آشنا چاہتا ہوں |
| ۷ | وہی جام صہبا وہی دست سیمیں | وہی صبح دانش رُبا چاہتا ہوں |
| ۸ | وہی ابر سرخوش وہی عہد مستی | وہی روح پرور قضا چاہتا ہوں |
| ۹ | مری ہر رگ دل کو تڑپانے والی | وہی شوخ طرز حیا چاہتا ہوں |
| ۱۰ | مجھے دولت شوق جس نے عطا کی | وہی غمزۂ دل رُبا چاہتا ہوں |
| ۱۱ | ہوئی جس سے تکمیل درس محبت | وہی ناز پرور ادا چاہتا ہوں |
| ۱۲ | غم دل کو جس نے کیا عیش سرمد | وہی کاوش دل کشا چاہتا ہوں |
| ۱۳ | وہی بے حجابانہ شکر محبت | وہی شکوۂ برملا چاہتا ہوں |
| ۱۴ | جو ہر کامیابی سے بیگانہ کر دے | وہ محرومی مدّعا چاہتا ہوں |
| ۱۵ | وہی زہد دشمن پرستار صہبا | وہی پھر دل بے ریا چاہتا ہوں |
| ۱۶ | شراب و نشاط و نگار و ترنم | وہی رحمتیں اے خدا چاہتا ہوں |
| ۱۷ | اگر ہو خریدار کوئی تو آئے | کہ میں دین و دل بیچنا چاہتا ہوں |
| ۱۸ | کہیں عہد ماضی پلٹتا ہے اختر | میں دیوانہ ہوں ہائے کیا چاہتا ہوں |

اختر پر غزل اس قدر مسلّط ہے کہ ایک مسلسل نظم میں بھی متضاد خیالات کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتے۔ چوتھے اور چودھویں شعر کو اس نظم کے اور اشعار سے کوئی تعلق اس کے سوا نہیں کہ ایک ہی بحر اور ایک ہی زمین میں ہیں۔ ابجدی

---

شوق نیموی کے سو شعر: منتخبہ جناب فوقانی نیموی۔ صفحات ۳۲ تقطیع .... انچ، قیمت ۴ر شایع کردۂ جناب فوقانی نیموی۔ نیمی، ڈاکخانہ فتوحہ ضلع پٹنہ۔ حضرت شوق نیموی صوبۂ بہار کے ایک مشہور عالم دینیات، زباں داں اور شاعر تھے۔ مذہبی موضوعات پر اُن کی بعض کتابیں اب تک درس میں ہیں۔ اُن کا دیوان مدّت ہوئی طبع ہوا تھا، لیکن اب کم یاب ہے۔ وہ ابتدا میں شمشاد لکھنوی کے شاگرد تھے، اور انھیں کے رنگ میں کہتے تھے۔ لیکن بعد کو تسلیم کے شاگرد ہو گئے تھے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

| | |
|---|---|
| کسی کو دیکھ کر قابو سے کب اے دل نکلتا تھا | بلا سے چوٹ کھائی تھی سر محفل سنبھلتا تھا |
| دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچّھا | ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچّھا |
| پنکھا کبھی جھلتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ | اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچّھا |

مرے ہوتے ہوئے کیوں غیر کی محفل میں بیٹھے ہو — تمہارا گھر مرا دل ہے یہاں آؤ وہاں کیوں ہو
ستم و جور کی فریاد سے ہم درگزرے — ایسے گھبرائے ہوئے تم سر محشر کیوں ہو

---

ادارۂ ادبیات اُردو ۱۹۲۱ء عیسوی میں: مرتبۂ خواجہ حامد الدین صاحب شاہد، صفحات ۱۰۶، تقطیع ۸ انچ قیمت ۱۰/ — رویداد شعبۂ اردو امتحانات ۱۹۲۱ء: از سید علی اکبر صاحب ایم اے کینٹب، مفت۔ ہر دو شایع کردہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن: ادارۂ ادبیات اُردو گیارہ بارہ سال قبل وجود میں آیا، اور اُس نے دکن میں خاص مقبولیت حاصل کر لی ہے، لیکن، یہہ اس پر قانع نہیں اس کی آرزو ہے کہ ایک دن ہندوستان گیر ادارہ بن جائے (صفحہ ۲)۔ جس زمانہ میں اس کی داغ بیل ڈالی گئی تھی انجمن ترقی اُردو ہند کا مستقر بھی دکن تھا۔ خبر نہیں ڈاکٹر محی الدین قادری اور اُن کے احباب کو انجمن سے الگ ہو کر ایک ادارہ قائم کرنے کی ضرورت کا کیوں احساس ہوا، اور انجمن نے دکن کے نوجوان خادمان اُردو کی ہم دردی اور اعانت حاصل کرنے کی کیوں کوشش نہ کی۔ ایک ہی مقصد سے جو ادارے قائم ہوں اُنکا ایک دوسرے سے الگ رہ کر حریفانہ طور پر کام، کسی طرح مفید نہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی ایک سالہ روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقسیم عمل کے اصول پر کار بند ہو کر بارہ شعبے قائم کر لیے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ امتحانات اُردو کا ہے اور اس کی ایک سالہ روداد بھی ہمارے سامنے ہے۔ بظاہر یہہ ادارۂ ادبیات اُردو کے امتحانات دکن میں مقبول ہوتے ہیں اور یہہ شعبہ مفید کام کر رہا ہے۔ باقی شعبوں میں صرف ایک شعبۂ اشاعت کتب ایسا ہے، جس کے کارناموں کے متعلق باہر والے بھی صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس شعبے کی شایع کردہ کتابوں میں سے چند کے متعلق معاصر میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس موقع پر ہم صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ ادارے کے ارباب حل و عقد کو محض اس کا خیال نہیں رکھنا چاہیے کہ سال بھر میں کتنی کتابیں شایع ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کتابوں کا مرتبہ کیا ہے۔

ابجدی

ماہنامہ

# معاصر

مدیر:۔ عظیم الدّین احمد

دائرۂ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

## ستمبر و اکتوبر ۴۲ء

| جلد ۴ | ستمبر ۱۹۴۲ء | نمبر ۵ و ۶ |
|---|---|---|




چندہ سالانہ للعہ — فی پرچہ ۶ر

# روتا ہوں میں

کیوں پوچھتا ہے مجھ سے تو
اے دوست! رونے کا سبب؟
آتے ہیں، رہ رہ کر، تجھے
گذرے ہوئے دن یاد جب
کیا تو کبھی روتا نہیں؟

بچپن کی وہ آزادیاں
وہ عہد رفتہ کے مزے
وہ شوخیاں، سرشاریاں
وہ قہقہے، وہ چہچہے
پُر لطف بے فکری کے دن
دل غم سے جب آزاد تھا
وہ مست سرشاری کے دن
جب پھول سا دل شاد تھا
وہ خواب رنگیں اب کہاں!

اے دوست! تجھ سے کیا کہوں
کس بات پر روتا ہوں میں؟
کیوں چپکے چپکے، آنسوؤں
سے اپنا منہ دھوتا ہوں میں؟
اکثر شب مہتاب میں؟
اے دوست! یونہی، جب کبھی
کرتا ہوں اگلی زندگی
کو یاد تو روتا ہوں میں!

، عمار حسن

# اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی

(طلسم ہوش ربا مسلسل)

(۴)

کہتے ہیں کہ شیطان نے ایک دن اپنے جی میں سوچا کہ اگر دنیا میں اس کا کوئی نمائندہ ہوتا تو وہ لوگوں کو بہکا کر جہنم کی آبادی میں اضافہ کرتا ۔ خوب سوچ بچار کے اس نے ایک یتیم دوشیزہ کو چُنا جو حسین بھی تھی اور پارسا بھی ۔ اس حسین دوشیزہ پر قابو پانا کچھ آسان نہ تھا ۔ اس کی نیکی اس کی حفاظت کی ذمہ دار تھی ۔ لیکن شیطان نے اُسے کچھ ایسا ستایا کہ ایک رات وہ خدا کی رحمت سے ناامید ہو کر اندھیرے میں سو رہی ۔ پھر کیا تھا ، شیطان نے اپنی شکل ایک حسین نوجوان کی بنائی اور جب وہ دوشیزہ سوئی ہوئی تھی اس کے پاس گیا ۔ صبح کو وہ نوجوان لڑکی اپنے حال زبوں سے آگاہ ہوئی ۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ وقت بھی آیا جب یہ بھید طشت از بام ہو گیا ۔ ملک کے قانون کے مطابق اسے زنداں میں مقید کر دیا گیا اور دو عورتیں اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہوئیں ۔ جب بچہ ہوا تو اس کا نام مرلن رکھا گیا ۔ ماں نے بچہ کو گود میں لے کر پیار کیا اور کہا : ”اے میرے پیارے بچے ! تیری بدولت مجھے سزائے موت ملے گی حالانکہ میں معصوم ہوں“ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ پھر یوں گویا ہوا : ”میری وجہ سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا“ جب مقدمہ پیش ہوا تو عدالت نے اس لڑکی کو سزائے موت کا حکم سنایا لیکن مرلن بول اٹھا : ”اگر میری ماں سزا کی مستحق ہے تو پھر کوئی عورت بھی زندہ رہنے کے لائق نہیں کیونکہ سبھی گناہ گار ہیں“ پھر اس نے جج سے کہا : ”میں تو جانتا ہوں کہ میرا باپ کون ہے کیا جناب بھی یہ کہہ سکتے ہیں ؟“ حاضرین کے استعجاب کا اندازہ ممکن نہیں ۔ جج نے اپنی ماں کو طلب کیا اور مرلن نے ایسی پتے کی باتیں کہیں کہ آخر اسے اقرار کرنا ہوا کہ جج حقیقت میں ایک پادری کے نطفہ سے ہے ۔

اسی زمانہ میں اس ملک کا بادشاہ مر گیا ۔ اس کے وزیر نے بادشاہ کے بڑے لڑکے کو قتل کر کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ، بادشاہ کا چھوٹا لڑکا بچ نکلا ۔ اس وزیر نے اپنی حفاظت کے لئے ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کرنا چاہا ۔ لیکن جب وہ قلعہ کچھ بلند ہوتا تو گر جاتا ۔ تین مرتبہ ایسا ہوا تو اس نے نجومیوں کو بلایا ۔ انھوں نے طویل غور و فکر کے بعد حل نکالا کہ اگر کسی سات سال کے ”بے باپ کے بچے“ کا خون بنیاد میں ڈالا جائے تو پھر قلعہ تعمیر ہو سکتا ہے ! چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے اور آخر مرلن کو دربار میں حاضر کیا گیا ۔ مرلن نے کہا : ”اے بادشاہ تیرے نجومی جھوٹے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ

یہاں زمین کے اندر بڑے بڑے پتھروں کے نیچے دو اژدھے سوتے ہیں۔ جب انھیں قلعہ کے بوجھ کا احساس ہوتا ہے تو وہ کروٹ بدلتے ہیں اور قلعہ گر جاتا ہے" زمین کھودی جانے لگی آخر ایک دن دو بڑے پتھر نظر آئے۔ انھیں سرکایا گیا تو دو عظیم الشان، ہیبت ناک، آتش خوار اژدھے دکھائی دیئے۔ ایک سفید اور دوسرا سرخ۔ نکل پڑے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ یہ خوفناک جنگ جس کے تصور سے دل دھڑکنے لگتا ہے، دن بھر، رات بھر، دوسرے دن دوپہر تک جاری رہی۔ آخر کار، سفید اژدھے نے اپنے منہ سے، ایک ایسا شعلہ پھینکا کہ سرخ اژدھا جل گیا۔ اس کے بعد سفید اژدھا بھی مر گیا مرلن نے بادشاہ سے کہا:" ہاں اب قلعہ تعمیر ہو سکتا ہے۔"....

جس داستان کی ابتدا ایسی ہو اس کی مجموعی حیثیت کا اندازہ آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس داستان میں کم سے کم حقیقت طرازی کا گذر ممکن نہیں۔ یہاں تو تخیل کی آزاد جولانی ہی بھلی معلوم ہو سکتی ہے۔ اور حقیقت طرازی کے فقدان کے باوجود بھی اس میں دلچسپی ممکن ہے۔ ہاں اس قسم کی دلچسپی تو البتہ ممکن نہیں جو مزدور اور کسان والے افسانوں کی جاگیر ہے جن میں سرمایہ داروں کی بیرحمی اور اپنی جنسی بےراہ روی کا شعوری اور غیر شعوری انکشاف ہوتا ہے۔ بہرکیف جس داستان کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ ایسی گئی گذری تو نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کیا جا سکے۔ اس کا اثر دوسرے انشا پردازوں اور شعرا پر بہت گہرا پڑا۔ یہی حقیقت اس کی اہمیت اور اس کے مفید ہونے کی کافی دلیل ہے۔ کنگ آرتھر کے نام سے دنیا واقف ہے۔ مرلن اس کا محافظ و رہنما تھا عہد وسطےٰ کے فرانس میں اس شہنشاہ اور اس کی "گول میز" کے متعلق داستانوں کا بے شمار ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ انھیں داستانوں کو میلری نے کافی اختصار کے ساتھ اپنی مشہور کتاب "مورٹ ڈارتھ" میں بھی بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نام کا کوئی بادشاہ انگلستان میں نہیں گزرا ہے اور اگر گزرا ہو بھی تو وہ جس کنگ آرتھر سے ہم آپ واقف ہیں بالکل مختلف تھا۔ یعنی آرتھر کی شخصیت محض خیالی ہے اور وہ تخیل کی ایک حسین، مکمل اور پسندیدہ پیداوار ہے۔ اس کے کارنامے خیالی ہیں، اس کی گول میز خیالی ہے۔ مرلن اور گول میز کے نائٹ سب تخیل کے کرشمے ہیں۔ یعنی آرتھر اور اس کے متعلقات کو "حقیقت" و "واقعیت" سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ان داستانوں کی فضا ہماری جانی ہوئی فضا سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ جس دنیا میں آرتھر اور اس کے نائٹ سانس لیتے ہیں وہ ہمیں اجنبی اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جس قسم کی زندگی وہ بسر کرتے ہیں وہ رنگین، متنوع، خطرناک اور دلچسپ ہے ہماری زندگی کی طرح سادہ بے لطف اور پھیکی نہیں۔ آرتھر ایک بے مثل بہادر ہے اور اس کے گرد و پیش جانبازوں کا حلقہ ہے۔ جرأت و طاقت۔ فنون سپہ گری کے ساتھ ساتھ یہ جانباز اخلاقی محاسن سے بھی آراستہ ہیں۔ ترحم و ہمدردی۔ فیاضی، انسانیت اور اسی قسم کی زم دلا...

نیکیاں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، مظلوم کی فریاد ان کے لئے تازیانۂ عمل ہے۔ صنفِ نازک
کی خدمت، حفاظت، دستگیری ان کا شیوہ ہے۔ دنیا سے ظلم، بیدردی، ناانصافی، بدی کو
نیست و نابود کرنا ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ دنیا میں اس قسم کی چیزوں کی کمی نہیں۔ اس لئے
شجاعت کے امتحان کا میدان کھلا ہوا ہے۔ جہاں دیکھئے جرأت و طاقت کی آزمائش ہے۔ یہ
جانباز کبھی کسی دیو سے زور آزمائی کرتے ہیں تو کبھی کسی خوفناک اژدہے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ظالموں
کے پنجے سے مظلوموں کو چھڑاتے ہیں۔ غرض، مختلف طور پر اپنی بہادری کا دلوں پر سکہ جماتے ہیں
اور پھر بہادری کا صلہ بھی پا لیتے ہیں۔ جنگ آزمائی کے ساتھ محبت کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ رزم کے
بعد وہ بزم میں شریک ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داستانِ کنگ آرتھر اور "طلسم ہوش ربا" میں بہت کچھ
مشابہت ہے۔

آرتھر ایک ذاتِ کامل ہے۔ اس کی شخصیت میں بہادری اور انسانیت کا کامل امتزاج ہے
امیر حمزہ کی شخصیت بھی انھیں عناصر سے بنی ہے۔ آرتھر کے گرد چمکتے ہوئے ہالے کی طرح اس کے
نائٹ ہیں۔ امیر حمزہ کے گرد بھی جانباز سرداروں کا جماؤ ہے۔ آرتھر کے قبضہ میں ایک طلسمی تلوار ہے
امیر حمزہ کے پاس ایسے کتنے حربے ہیں، وہ صاحب "اسمِ اعظم" اور "حرزِ ہیکل" ہیں۔ ان کے قبضہ میں
بارگاہِ سلیمانی ہے اور انکا مرکب اشقر دیوزاد ہے۔ آرتھر دیووں سے جنگ آزما ہوتا ہے اور
انھیں قتل کرتا ہے۔ امیر حمزہ کوہ قاف جاتے ہیں اور دیووں کو شکستِ فاش دے کر سارے کوہ قاف
کو اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں۔ آرتھر اور اس کے نائٹ مظلوموں کی دستگیری اپنا فرض سمجھتے ہیں
امیر حمزہ اور ان کے سرداروں کا بھی یہی شیوہ ہے۔ آرتھر مختلف ممالک فتح کرتا ہے۔ امیر حمزہ
بے شمار ممالک میں اسلام کی روشنی پھیلاتے ہیں اور اتنی بڑی سلطنت قائم کرتے ہیں جس کا
تصور بھی مشکل ہے۔ آرتھر کے نائٹوں میں ایک سے ایک جانباز ہے۔ لانسلوٹ، بوہیں، گوین
گیرہتھ، وغیرہ وغیرہ۔ فرزندان و سرداران امیر حمزہ میں بھی ایک سے ایک جانباز ہے۔ بدیع الزماں
نور الدہر، اسد، علم شاہ، قاسم، ایرج، لندھور، بہرام۔ یہ سب آرتھر کے بہترین نائٹ لانسلوٹ
سے کم نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ لانسلوٹ نور الدہر یا ایرج یا آسد کی گرد کو بھی نہیں
[illegible] کارنامے نمایاں یہ آئے دن کرتے رہتے ہیں وہ لانسلوٹ اور خود آرتھر کے
[illegible] سے بھی باہر ہیں۔

کہتے ہیں کہ آرتھر ایک مرتبہ جہاز پر اپنے کمرہ میں سو رہا تھا کہ اس نے ایک عجیب و غریب
خواب دیکھا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوفناک اژدھا پچھم سے اڑتا ہوا آیا۔ اس اژدھے کا سر نیلم
کی طرح چمکتا تھا اور اس کے بازو گویا سونے کے بنے ہوئے تھے۔ اس کا شکم تھا کہ ایک حیرت انگیز

زنگ کی زرہ تھی، اس کے پیر سیاہ اور پنجے زرّیں تھے۔ اور اس کے مُنہ سے ایسا زبردست شعلہ نکلتا تھا کہ گویا زمین اور پانی دونوں میں آگ روشن ہے۔ پھر آرتھر نے کیا دیکھا کہ پورب سے ایک مہیب سور، قیر کی طرح سیاہ، نمودار ہوا۔ وہ نہایت ہی خونخوار اور کریہہ المنظر تھا۔ اس کی گرج سے کان کے پردے پھٹے پڑتے تھے۔ اژدھا سور کو دیکھتے ہی اس پر جھپٹا۔ وہ ہوا میں تیر کی طرح اڑتا ہوا سور پر حملہ آور ہوا۔ دونوں میں چوٹیں چلنے لگیں۔ اژدھے نے سور کو ایسی ضرب لگائی کہ اس کے ہزاروں ٹکڑے تمام سمندر میں بکھر گئے۔ آرتھر جاگ اٹھا اور اس خواب کی وجہ سے وہ بحرِ تحیّر و تفکر میں ڈوب گیا۔ آخر اس نے ایک ہوشمند کو طلب کیا اور خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس نے کہا: "اے بادشاہ! وہ اژدھا جو تو نے خواب میں دیکھا ہے، دراصل تیری ذات ہے اور اس کے بازوؤں کے رنگ سے مراد وہ ممالک ہیں جن پر تو نے قبضہ حاصل کیا ہے۔ وہ سور جسے اژدھے نے مار ڈالا کوئی ظالم ہے جو لوگوں کو ستاتا ہے یا کوئی مہیب، خونخوار دیو ہے جس سے تجھے لڑنا ہے۔ لیکن اے بادشاہ! کچھ خوف نہ کر کیونکہ فتح تیری ہے"

داستان کنگ آرتھر اسی خواب کی تعبیر و تشریح ہے۔ یہ خواب حیرت انگیز و ناقابل یقین ہے۔ اس خواب میں چمکیلے رنگ ہیں اور رنگین چمک ہے۔ ایسی چمک، ایسے رنگ جو اس دنیا میں میسر نہیں۔ وہ شعلہ فشاں اژدھا اور وہ رعد آسا سور دونوں ایک ایسی سطح پر سانس لیتے ہیں جو سطح دنیا سے بہت بلند ہے۔ اگر کوئی شخص ہم سے کہے کہ اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے یہ خوفناک شکلیں دیکھی ہیں تو ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ لیکن خواب میں سبھی ممکن ہے۔ خواب کی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ اور جب ہم خواب دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر شئے سچی، معمولی، بدیہی معلوم ہوتی ہے داستان کنگ آرتھر کی فضا بھی گویا خواب کی فضا ہے۔ یہاں بھی ہر شئے سچی، معمولی اور بدیہی معلوم ہوتی ہے۔ ممکنات و ناممکنات میں یہاں تفرقہ ممکن نہیں ان کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں "طلسم ہوش ربا" کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں بھی یہی رنگ، یہی چمک، یہی سچائی ہے۔ بہرکیف اس خواب میں جو دو شکلیں ہیں وہ معنی خیز ہیں۔ وہ اژدھا نیکی ہے اور وہ سور بدی ہے۔ اژدھے اور سور کا لڑنا، دراصل نیکی اور بدی کی طاقتوں کا تصادم ہے۔ یہ دنیا ایک میدان ہے جہاں یہ جنگ جاری ہے۔ آج سے نہیں۔ اس وقت سے جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے پہلی مرتبہ بدی کی بنیاد رکھی۔ یا شاید اس سے بھی پہلے جب شیطان نے قدرت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ابتدا کچھ بھی ہو، یہ کشمکش آج بھی جاری ہے۔ اور ادب میں اس کشمکش کی تصویر نظر آتی ہے۔ آرتھر محض ایک انگریزی بادشاہ نہیں، وہ ایک مخصوص بہادر، مہذب فیاض ہستی نہیں۔ وہ تو نیکی کا حامی ہے۔ دیو اژدھے بدکار نائٹ جن سے وہ جنگ آزما ہوتا ہے۔ سبھی بدی کے مجسمے ہیں۔ اور جو معرکے ہوتے ہیں وہ

معنی خیز ہیں۔ ان میں نیکی اور بدی، روشنی اور تاریکی، سفیدی اور سیاہی کی کشمکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے
یہی بات "طلسم ہوش ربا" میں بھی ملتی ہے۔ امیر حمزہ اور ان کے سردار نیکی کے پتلے اور نیکی کے حامی
ہیں۔ افراسیاب اور لقا اور ان کے سردار و مددگار دراصل بدی کی طاقتیں ہیں۔ اور نیکی بدی کی طاقتوں
میں نہایت زبردست تصادم ہوتا ہے۔ ایسا تصادم جس کے تصور سے تخیل کانپتا ہے۔ "طلسم ہوش ربا" محض
ایک دلچسپ داستان نہیں۔ اس کی قدر و قیمت اور ان کہانیوں کی قدر و قیمت، میں جن سے بچپن میں
ہم اپنا دل بہلاتے ہیں، کوئی مماثلت نہیں۔ "طلسم ہوش ربا" میں جو معنی خیزی ہے وہ اردو ناولوں یا
افسانوں میں کہیں نہیں ملتی۔ "طلسم ہوش ربا" کے سامنے موجودہ افسانے مہمل، بے لطف، بے معنی، مردہ
معلوم ہوتے ہیں۔ اس معنی خیزی کی وجہ سے ہر شکل، ہر واقعہ، ہر چیز میں ایک جان پڑ گئی ہے۔ بہرکیف
یہاں بھی روشنی اور تاریکی، سفیدی اور سیاہی کی کشمکش کی عکاسی ہے۔ وہی کشمکش جو شیکسپیئر کے ڈراموں
اور انیس و دبیر کے مرثیوں میں بھی ملتی ہے۔

شیکسپیئر کے ذکر سے غلطی کا احتمال ہے۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ جس کشمکش کی "طلسم ہوش ربا"
میں آئینہ دار ہے وہ ادبی نقطہ نظر سے شیکسپیئر کے تخیلی کارنامے کی ہم پایہ ہے۔ ہرگز نہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں
میں نیکی بدی کا تصادم، روشنی اور تاریکی کی زور آزمائی ہے لیکن یہ تصادم۔ یہ زور آزمائی
محض خارجی نہیں۔ "طلسم ہوش ربا" میں نیکی کے حامی ایک جانب صف آرا ہیں اور بدی کے نمائندے
دوسری جانب۔ دونوں صفیں بڑھتی ہیں اور ایک زبردست تصادم ہوتا ہے۔ امیر حمزہ اور
انکی فوج ایک طرف، لقا اور اس کی فوج دوسری طرف یعنی نیکی اور بدی کی کشمکش ہے۔ یہی
کشمکش مرثیوں میں بھی ہے۔ امام حسینؑ، حضرت عباس، حضرت علی اکبر نیکی کے پتلے ہیں۔ ابن زیاد
شمر اور اس کے سپاہی بدی کے مجسمے ہیں۔ سفیدی اور سیاہی کی جنگ آزمائی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں
میں نیکی کے پتلے اور بدی کے مجسمے الگ الگ نہیں۔ نیکی اور بدی ایک فرد یعنی ہیرو کی ذات میں
مجتمع ہیں اور اس کی روح اس کے دل اس کے دماغ میں طاقت آزمائی کرتی ہیں۔ یہ اندرونی
کشاکش خارجی کشمکش کی آئینہ دار ہے۔ یہاں ایک مخصوص، ذاتی، روحانی طوفان ہے جو مخصوص
بھی ہے اور عام بھی۔ ذاتی بھی ہے اور عالمگیر بھی۔ روحانی بھی ہے اور مادی بھی۔ یہی حقیقت
بے شمار ادبی محاسن سے قطع نظر، شیکسپیئر کے ڈراموں کو "طلسم ہوش ربا" اور مرثیوں سے اعلیٰ اور
ارفع بناتی ہے۔ "طلسم ہوش ربا" کی دنیا شیکسپیئر کے ڈراموں کی دنیا سے قدر و قیمت میں بہت
کم ہے۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں لیکن جہاں تک اس نکتے کا تعلق ہے "طلسم ہوش ربا" کا مرتبہ
مرثیوں سے بلند ہے۔ مرثیہ کی حیثیت مناقب داری کی ہے۔ وہ ایک جماعت کے محاسن کو چمکاتا ہے
جہاں کسی خامی کا گذر ممکن نہیں اور وہ دوسری جماعت کی سیاہی کو شب دیجور یا قبر یا جہنم سے بھی

زیادہ سیاہ بنا تا ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں بھی جانب داری ہے۔ یہاں بھی امیر حمزہ اور ان کی جماعت کے محاسن کو چمکایا جاتا ہے اور لقا اور افراسیاب اور انکی جماعتوں کو سیاہ رنگ میں رنگا جاتا ہے لیکن یہہ سیاہی اس قدر گہری نہیں اور یہاں دوسرے رنگوں کی بھی جھلک نظر آجاتی ہے۔ لقا اور اسکے سخن تکیہ "من چہ تقدیر کردم" پر ہم ہنستے ہیں۔ لیکن افراسیاب کی شوکت و حشمت۔ اس کے سرداروں کی جرأت و طاقت کا ہم اعتراف بھی کرتے ہیں۔ مخالفین امام حسینؑ میں ایک بھی جری بہادر نہیں۔ لیکن افراسیاب خود ایک زبردست شہنشاہ ہے اور اس کے سرداروں میں ہر شخص اپنی آپ مثال ہے یعنی "طلسم ہوش ربا" میں اسد کے مخالفین کو گرایا نہیں گیا ہے۔ اس لئے کشمکش میں لطف زیادہ، واقعیت زیادہ ہے افراسیاب مخالفین امام حسینؑ کی طرح بزدل، کمینہ، کمزور نہیں۔ وہ ایک اشارے میں دنیا کا تختہ الٹ دے سکتا ہے۔ مرثیہ گو انتہائی مرثیہ کو انسانی سطح پر رکھتا ہے۔ پھر اس قدر مبالغہ سے کام لیتا ہے کہ تصویر ناقابلِ یقین ہو جاتی ہے۔ "طلسم ہوش ربا" میں یہ نقص بھی موجود نہیں۔ یہاں ابتدا ہی سے ایک دوسری بلند وسیع و کشادہ دنیا کی تخلیق کی گئی ہے۔ اس لئے جو ہستیاں یہاں سانس لیتی ہیں، جو واقعات یہاں ہوتے ہیں وہ ایک عظیم الشان پیمانہ پر ہیں۔ یہاں یقین و عدم یقین کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں تو "طلسم ہوش ربا" محض ایک داستان نہیں۔ اس کا مقصد صرف ہماری دلبستگی نہیں۔ یہ ایک خواب آور دوا نہیں جو ہمیں میٹھی اور گہری نیند سلا دے۔ یہہ صحیح ہے کہ اس میں ہماری دلچسپی کا سامان ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا اول اور اہم مقصد سامعین یا قارئین کی دلبستگی ہے۔ لیکن یہاں کچھ اور بھی ہے۔ اس کا تفریحی پہلو بھی اہم ہے۔ ذریعۂ تفریح کی حیثیت سے بھی یہہ کافی بلند پایہ ہے۔ بہت کم داستانیں دنیائے ادب میں اس پایہ کی ملیں گی۔ جنہیں غور و فکر کی عادت نہیں، جو داستان کی رنگیں دلچسپیوں میں گم ہونا پسند کرتے ہیں، جو اس دنیا کی کلفتوں سے تنگ آکر وقتی طور پر کسی خیالی حسین و دلفریب دنیا میں پناہ گزیں ہونا چاہتے ہیں، انھیں "طلسم ہوش ربا" کے تفریحی عناصر کامل تشفی بخشتے ہیں۔ لیکن جس دماغ کو غور و فکر کی عادت ہے۔ جسے بصیرت ہے۔ اسے سطحی دلچسپیوں سے کامل تشفی نہیں ہوتی وہ تفریح کے بعد کسی سنجیدہ معنی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اس اندرونی معنی کا کھوج لگاتا ہے جو "طلسم ہوش ربا" میں موجود ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کی دنیا ہماری جانی ہوئی دنیا سے مختلف بھی ہے اور اس کی آئینہ دار بھی۔ وہ نیکی اور بدی کی طاقتیں جو ہمارے گرد و پیش جنگ آزما ہیں لیکن جن کی کشمکش سے ہم اکثر واقف بھی نہیں ہوتے، انھیں طاقتوں اور ان کی کشمکشوں کی "طلسم ہوش ربا" میں تخیل کی مدد سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور تخیلی نظم و ضبط اور آرائش کی وجہ سے یہہ تصویر معنی خیز ہو گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایک "آئیڈیل" زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس زندگی سے ہم واقف ہیں۔ جو زندگی ہم بسر کرتے ہیں۔ وہ کامل نہیں۔ اس کی خامیوں اور تنگیوں کی وجہ سے ہماری روح کو

اطمینان نہیں نصیب ہوتا۔ اس لئے آرٹسٹ ایک حسین و کامل زندگی کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہاں مردانگی، انسانیت، فیاضی، دوستی، محبت، ترحم و ہمدردی، نیکی۔ غرض سارے انسانی و اخلاقی محاسن کے نمونے پیش نظر ہیں۔ اور اس حسین اور اچھی زندگی کے حسن، اس کی اچھائی کو دوبالا کرنے کے لئے بزدلی، شقاوت، ظلم، گناہگاری، بدی کے بھی نمونے پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ ہم حسن اور اچھائی کو پسند کرتے ہیں اور برائی سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح ہماری زندگی زیادہ حسین اور زیادہ اچھی ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ امیر حمزہ اور ان کی جماعت والے نیکی کے پتلے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ "طلسم ہوش ربا" میں جتنے "کیرکٹر" ہیں وہ کسی مخصوص شخصیت کے حامل نہیں۔ یہ درست نہیں۔ جتنے اہم اشخاص ہیں ان میں عام مشابہت تو ضرور ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا لیکن اس عام مشابہت کے ساتھ ان کی چند ذاتی خصوصیات بھی ہیں جو انھیں ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہیں۔ ہاں "طلسم ہوش ربا" میں اس قسم اور اس پایہ کی کردار نگاری تو البتہ نہیں جو ہمیں شکسپیر یا سوفوکلیس کے ڈراموں میں ملتی ہے۔ وہ تو چیزے دیگر" اور اس "دوسری چیز" کا "طلسم ہوش ربا" میں وجود ممکن ہی نہیں۔ پھر بھی اشخاص قصہ ایک سانچے میں بنے ہوئے نہیں ہیں۔ امیر حمزہ کو لیجئے۔ ان کے ظاہری و باطنی اوصاف انھیں دوسروں سے کس قدر بلند مرتبہ اور ممتاز بناتے ہیں! اگر باطنی اوصاف نہ بھی ہوتے تو بھی چند خارجی علامتوں کی وجہ سے ان کی ذات دوسروں سے ممتاز نظر آتی۔ وہ حربے جو انھیں بزرگوں سے ملے ہیں۔ اسم اعظم اور حرز ہیکل جن کی وجہ سے ان پر جادو نہیں اثر کر سکتا، بارگاہ سلیمانی، اشقر دیوزاد، ان کا نعرہ جس کی آواز چونسٹھ کوس تک جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں انھیں کے ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح سرداران دست راست میں بدیع الزماں، نورالدہر، اسد اور سرداران دست چپ میں علم شاہ، قاسم، ایرج اپنی۔ الگ الگ شخصیت رکھتے ہیں۔ لندھور بن سعدان، بہرام، شاہزادہ کرب۔ مقبل امیر حمزہ کے قدیم وفاداروں اور جاں نثاروں میں ہیں اور ایک دوسرے سے ظاہری و باطنی خصوصیات میں مختلف ہیں۔ غرض امیر حمزہ اور ان کے اہم سرداروں کی شخصیتیں قصہ کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کافی طور پر واضح کردی گئی ہیں۔ یہ "کیرکٹر" انفرادی بھی ہیں اور عالمگیر بھی۔ اس وجہ سے ان کی دلچسپی اور معنی خیزی بہت بڑھ گئی ہے۔

(۵)

موجودہ زمانہ میں ہر حکومت جہاں مختلف شعبوں کے ذریعہ سارے کاروبار کا انتظام کرتی ہے وہاں وہ ایک نہایت اہم شعبہ بھی قائم رکھتی ہے۔ جس کا ذکر کبھی زبان پر نہیں آتا۔ اس شعبے کے اراکین اس کے فرائض۔ اس کے اخراجات کے متعلق آپ کو اخباروں میں کبھی کوئی رپورٹ نظر نہیں آئیگی۔ بہت

ممکن ہے کہ اس شعبہ کا کوئی رکن آپ کا دوست ہو لیکن آپ کو ہرگز یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ اس شعبے سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ وہ دیکھنے میں ہم آپ جیسا معلوم ہوگا لیکن اس کی زندگی کے اہم ترین لمحے، اس کے کارنامے تحت الارض فضاؤں اور گوشوں میں پرورش پاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے ساتھ چائے پینے سے کچھ ہی پہلے اسے کسی مہلک واقعہ سے سابقہ پڑا ہو۔ کسی نے اس کی گردن دابی ہو یا اس نے کسی کے خون میں ہاتھ رنگین کیا ہو لیکن اس کی بات چیت، اس کے انداز سے آپ کو کسی ایسے واقعے کا گمان بھی نہ ہوگا۔ وہ اور دوسرے اراکین اسی طرح پس پردہ، گمنامی میں کام کرتے ہیں ہاں تو اس شعبے کے سارے متعلقات و لوازمات، اس کی جملہ کارروائیوں پر ایک گہرا، تاریک بادل چھایا رہتا ہے اور آفتاب کی کوئی کرن بھولا بھٹکا کر یہاں نہیں آسکتی۔ اس شعبے کا نام خفیہ محکمہ یا Secret Service ہے۔ یہ محکمہ وزارت خارجہ سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اور حکومت کی خارجی "پولیسی" بہت حد تک ان معلومات پر مبنی ہوتی ہے جو یہ محکمہ مہیا کرتا ہے۔ اس محکمہ کا فرض ہے کہ وہ دوسری حکومتوں کے متعلق معلومات مہیا کرے، وہ معلومات جنھیں یہ حکومتیں دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہیں، جن سے ان کا بھرم کھل جائے جو ان کی حقیقی طاقتوں اور کمزوریوں، انکے رجحانات کو روشن کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، یہ مشکل بھی ہے اور مہلک بھی۔ کیونکہ کوئی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ کوئی دوسری حکومت اس کے راز سے واقف ہو جائے۔ اس لئے وہ اس راز کی حفاظت کرتی ہے۔ اپنی پوری طاقت اسے محفوظ رکھنے میں صرف کرتی ہے، اور جو اس راز کا کھوج لگاتے ہیں انھیں جان جوکھوں کرنا ہوتا ہے۔ وہ جان دیتے ہیں اور جان لیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی ملک کے سائنس داں نے کوئی نئی چیز ایجاد کی۔ ایسی چیز جس سے جنگ میں مصرف لیا جاسکتا ہے۔ جس کی مدد سے دشمنوں کو بہ آسانی شکست دی جاسکتی ہے۔ یہ ایجاد بہت ممکن ہے کہ کوئی گیس ہو، نئی قسم کا ہوائی جہاز ہو یا نئی طرح کی آب دوز کشتی۔ دوسرے ملکوں کے خفیہ کارکنان تو اسی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ جہاں انھیں خبر ملی پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی صورت سے، ڈرا دھمکا کے رشوت دے کر، چوری یا خون کے وسیلے سے وہ اس راز کو حاصل کرلیں اور جب تک وہ کامیاب نہیں ہوتے وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آتے۔ کبھی یہ ہوا کہ کسی فرماں روا کو ملک گیری کی ہوس ہوئی۔ اسے اپنے ہمسایہ کی زرخیز زمینیں کوئلہ یا لوہے کی کانیں، کشادہ بندرگاہیں پسند ہوئیں اور انھیں لینے تصرف میں لانا چاہا۔ لیکن وہ فوراً اعلان جنگ نہیں کرتا، پہلے وہ اپنے ہمسایہ کی بری، بحری، ہوائی طاقتوں کا اپنے خفیہ محکمہ کی مدد سے جائزہ لیتا ہے۔ اس کی رعایا میں پھوٹ کا بیج بوتا ہے۔ اس کے مدبروں کو بھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس طرح جب اسے فتح کا یقین کامل ہو جاتا ہے تو پھر جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جنگ ساری دنیا دیکھتی ہے لیکن وہ حقیقی جنگ جو پس پردہ صلح کے زمانے میں ہوتی رہتی ہے اس سے ہم واقف نہیں ہوتے۔ اصل فتح و شکست ان خفیہ محکموں کے میدان میں ہوتی ہے۔ اور اس جنگ میں مرد کے ساتھ عورتیں بھی

حصہ لیتی ہیں۔ اور رائفل، ہوائی جہاز، ٹینک کے بدلے اپنے ناوک مژگاں، خنجر ابرو برق تبسم سے اپنے ملک کی شکست کو فتح سے بدل دیتی ہیں۔ اپنی میٹھی باتوں، اپنی دلکش اداؤں، اپنے نازک ہاتھوں اور نازک تر لبوں کی مدد سے وہ ایسے رازوں کا پتہ لگا لیتی ہیں جن سے فرشتے بھی آگاہ نہیں ہو سکتے۔

ہٹلر نے ابھی تک جو اتنی حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کا ایک بڑا سبب اس کا خفیہ محکمہ ہے۔ ایک طرف تو وہ آلات حرب کا ڈھیر لگاتا اور اپنی قوم کو جنگجو بناتا رہا اور دوسری جانب دیگر یورپی ممالک کے متعلق جنگی معلومات بہم پہنچاتا رہا۔ مثلاً۔ اسے معلوم تھا کہ پولینڈ یا فرانس کی بری، بحری اور ہوائی طاقتیں کتنی اور کس پایہ کی ہیں۔ اور یہ کتنے دنوں تک اس کے حملہ کی مدافعت کر سکیں گی۔ فرانس کی مشہور "مژینولائین" کا نقشہ اس کے پیش نظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مخالفین کے پاس آلات حرب کس قسم کے ہیں اور انھوں نے اپنے بچاؤ کا کیا سامان کیا ہے۔ اسے خبر تھی کہ یہ قومیں جنگ کے متعلق تیار نہ تھیں لیکن ہٹلر نے صرف انھیں معلومات پر قناعت نہیں کی تھی۔ اس کے ایجنٹ ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے اور وہ اندر سے بیخ کنی کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جڑیں ہر جگہ کھوکھلی تھیں۔ اسی وجہ سے چکوسلواکیا، پولینڈ، ہولینڈ، بلجیم، فرانس یہ سب ممالک یکے بعد دیگرے بوسیدہ عمارتوں کی طرح ایک طوفان میں مسمار ہو گئے۔ لیکن انگلینڈ اور رشیا کو وہ اس قدر جلد تباہ نہ کر سکا۔ ان کے متعلق اس کا خفیہ محکمہ صحیح معلومات حاصل نہ کر سکا۔ ہٹلر کو یہ تو خبر تھی کہ انگلینڈ جنگ کے لئے مطلق تیار نہیں یہاں بھی ہتھیار کی وہی کمی تھی جس کی وجہ سے فرانس اس ذلت کے ساتھ تباہ و برباد ہوا۔ لیکن ہٹلر کو انگلینڈ کے عزم و استقلال کا صحیح اندازہ نہ تھا اور اس کے ایجنٹ یہاں وہ اندرونی بیخ کنی نہ کر سکے جو انھوں نے دوسرے ممالک میں اس کامیابی کے ساتھ کی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ انگلینڈ اپنی جگہ پر استقلال کے ساتھ جما رہا۔ جب شکست کی ہولناک شکل قریب آ گئی تھی جب امید کی ایک کرن بھی نظر نہ آتی تھی، انگلینڈ نے ہمت نہ ہاری۔ اس لئے جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اسی طرح رشیا کی طاقتوں کا ہٹلر کو صحیح اندازہ نہ تھا۔ ہر خفیہ محکمہ میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کا فرض یہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کو معلومات حاصل نہ کرنے دے۔ یہ شعبہ دوسری قوموں کے کام کرنے والوں کا پتہ لگاتا ہے۔ انھیں صحیح معلومات حاصل نہیں ہونے دیتا اور انھیں غلط خبریں دیا کرتا ہے۔ رشیا کے اس شعبہ نے اپنا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر رشیا میں جا کر پھنس گیا اور ابھی تک الجھا ہوا ہے۔

الغرض یہ خفیہ محکمہ اور اس کی کارروائیاں تو کوئی خیالی چیز نہیں۔ یہ بھی ایک حربۂ جنگ ہے۔ نہایت اہم اور کامیاب طلسم ہوشربا میں بھی یہ محکمہ موجود ہے اور اپنی پوری اہمیت اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ فرق صرف یہ ہے کہ اسے خفیہ محکمہ نہیں کہتے۔ اس کا نام "عیاری" ہے اور اس محکمے کے ارکان کو "عیار" کہتے ہیں۔ اس محکمۂ عیاری کے بانی اور سردار عمرو عیار ہیں۔ اور اس کے اہم ارکان چالاک، برق، مہتر قران

جانسوز بن قران اور ضرغام ہیں، عموماً ان عیاروں کی عیاری پر ہم ہنستے ہیں اور انھیں خیالی باتوں
جن و پری کے افسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن فنی نقائص سے قطع نظر، یہ عیاری کا سلسلہ
موجودہ اقوام کے خفیہ محکموں سے کس قدر مشابہ ہے۔ یہ عیار اسی طرح کے فرائض انجام دیتے ہیں جو ہٹلر کے
ایجنٹ انجام دیتے ہیں۔ اگر عیار نہ ہوتے تو پھر امیر حمزہ یا اسد ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔ اگر عمرو عیار نہ ہوتے
پھر امیر حمزہ ملک گیری میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے اور اتنی عظیم الشان سلطنت قائم نہ کر سکتے جس کا تخیل بھی
مشکل ہے۔ اگر عمرو عیار، برق، مہتر قران کی امداد نہ ہوتی تو پھر اسد سے کبھی "طلسم ہوش ربا" فتح نہ ہوتا۔
یہ بات قابل غور ہے کہ "طلسم ہوش ربا" فتح کرنے کے لئے اسد یعنی ایک جنرل اور پانچ عیار روانہ ہوتے
ہیں۔ کوئی فوج ساتھ نہیں، کسی قسم کا سامان جنگ موجود نہیں۔ کوئی خفیہ حربہ پاس نہیں اور مقابلہ ایسی
قوموں سے نہیں جو جنگ کے لئے بالکل تیار نہیں۔ یہاں مقابلہ شہنشاہ جادوگران سے ہے۔ جس کا ہر
افسر ایسے ایسے آلات حرب رکھتا اور بنا سکتا ہے جن کے آگے ہٹلر کے سارے ٹینک، ڈائیو بومبر
یو بوٹ پشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پھر بھی ایک اسد اور پانچ عیار طلسم ہوش ربا پر قبضہ کر لیتے ہیں۔
جب اسد طلسم میں داخل ہوتے ہیں تو خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ بعض جلیل القدر
جادوگر افراسیاب سے علحدہ ہو کر اسد کے شریک ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی جماعت زور پکڑنے لگتی ہے
لیکن پھر بھی اس جماعت کی افراسیاب کی عظمت کے آگے کوئی وقعت نہیں۔ اگر عیار نہ ہوتے تو پھر یہ
جانب داران اسد بہت جلد نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اسد داخل طلسم ہونے کے بعد گرفتار ہو جاتے ہیں
اور مدتوں گرفتار رہتے ہیں۔ اگر عیار نہ ہوتے تو پھر اسد کی فوج کے شیرازے بہت جلد بکھر جاتے۔
عمرو سبھوں کو سنبھالتے ہیں اور اپنی حکمت عملی سے ایک طاقتور بادشاہ کو اپنا شریک بنا لیتے ہیں۔
جب ہٹلر نے روس کے علاوہ گویا ساری یورپین طاقتوں پر قبضہ پا لیا تھا۔ جب برطانیہ کا یورپ میں
کوئی مددگار باقی نہ تھا۔ اس وقت سر اسٹیفورڈ کرپس نے اپنی بے مثل "ڈپلومیسی" سے رشیا کو برطانیہ کا شریک
بنایا۔ اگر جرمنی اور رشیا میں جنگ نہ شروع ہوتی تو پھر برطانیہ کا خدا ہی حافظ تھا۔ اسی قسم کی بے مثل
"ڈپلومیسی" عمرو عیار نے کی اور شہنشاہ کوکب روشن ضمیر کو اسد کی مدد پر آمادہ کیا۔ اگر عمرو عیار اپنے
اس مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تو پھر عمرو عیار کی حیرت انگیز چالاکی اور اسد کی بے مثل بہادری کے باوجود بھی
لشکر اسلام کو کامیابی نہ ہوتی۔ یہ عمرو اور ان کے شاگرد ہیں جو دشمنوں کے خفیہ حربوں کا پتہ لگاتے ہیں۔
انھیں برباد کرتے۔ یا انھیں دشمنوں پر پلٹ دیتے ہیں۔ یہ عیار بڑے بڑے جادوگروں کو قتل کرتے ہیں
ایسی ایسی جگہ جا پہنچتے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ ایسے جانباز ہیں کہ افراسیاب سے بھی نہیں
ڈرتے ہیں اور اس پر بھی عیاری کر گذرتے ہیں۔ حجرہ ہفت بلا کی سات خوفناک بلاؤں کو بھی ناک چبواتے ہیں۔

خفیہ ایجنٹ بھیس بدلنے میں مشاق ہوتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے روپ بدل کر اپنے مخالفین کو دھوکا دیتے اور کام کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ اگر وہ اس فن سے واقف نہیں تو پھر وہ اپنے فن میں پورے نہیں۔ عیار اس فن میں کامل ہیں۔ وہ ایسے حیرت انگیز روپ بھر سکتے ہیں جن کا تصور بھی مشکل ہے اور انکی کامیابیوں کا ایک اہم سبب ان کا اس فن میں کمال ہے۔ کبھی ایک حسین عورت کی شکل بنتے ہیں اور اپنی اداؤں اپنی دلکش باتوں سے کسی جادوگر کا شکار کرتے ہیں۔ کبھی پیرزال کی صورت میں کسی کو دھوکا دیتے ہیں۔ مزدور، خدمت گار، کمسن لڑکا، جادوگر، فقیر، غرض ہر مرتبہ نئے شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کبھی نوشہ بنا کر ایک عظیم الشان بارات کے ساتھ آتے ہیں تو کبھی خداوند جمشید کے روپ میں لوگوں کو اپنا درشن دکھاتے ہیں اور ہر مرتبہ ایسی حیرت انگیز عیاری کرتے ہیں جس پر دشمن بھی عش عش کرتے ہیں۔ وہ اس قدر بیباک ہیں کہ افراسیاب کا روپ بھر کر اسکی ملکہ حیرت کو اور حیرت کی صورت میں افراسیاب کو دھوکا دیتے ہیں۔ افراسیاب ان کے مقابلے کے لئے اپنی عیار بچیوں کو طلب کرتا ہے۔ سرصر شمشیر زن، صبا رفتار، شمیمہ نقب زن، صنوبر کمند انداز، تیز نگاہ خنجر زن۔ یہ پانچ عورتیں، کم سن، حسینہ و جمیلہ، بانے عیاری کے جسم پر آراستہ۔ کئے جوڑے ترچھے باندھے کاتیاں دوپٹہ کی مارے پائیچوں میں گرہ لگائے، پاؤں میں تنظورے اور پیتاوے پہنے، گوپھنیں بازو پر باندھے کمندیں سر سے لپیٹے، پتھر کا توبڑا اور کسوت عیاری لگائے، تیغچے اور خنجر بران ہاتھوں میں لئے، تیر و ترکش اور سپر سے درست، زر و زیور سے آراستہ، مانگ ہر ایک نکالے، اپنے سائے سے بھڑکتی۔ اچھل کود اور جست و خیز کرتی" آتی ہیں۔ عیاروں اور عیار بچیوں میں خوب عیاریاں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ عیار بچیاں عیاروں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

لشکر اسلام میں عیار تو بہت ہیں اور سب اپنے فن میں کامل۔ لیکن چار عیار، عمرو، مہتر قران، برق اور چالاک اپنی مخصوص شخصیت رکھتے ہیں۔ برق کی تیزی، چالاک کی چالاکی انھیں دوسرے عیاروں سے ممتاز بناتی ہے۔ مہتر قران صاحب بغدہ گراں کی شخصیت بقائے دوام کی ذمہ دار ہے۔ لیکن سب سے ممتاز ہستی عمرو عیار کی ہے۔ ان کی عجیب و غریب صورت۔ ان کی لالچ اور بخالت۔ ان کا امیر حمزہ اور امیر حمزہ کے فرزندوں سے عشق۔ ان کا لحن داؤدی انکی حیرت انگیز پرواز۔ یہ سب چیزیں انھیں کی ذات سے وابستہ ہیں۔ وہ عجب "مجموعۂ اضداد" ہیں۔ تمسخر اور سنجیدگی، بزدلی اور جانبازی، سنگدلی اور نرم دلی بیک وقت ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔ سب، دوست و دشمن۔ ان پر ہنستے ہیں اور وہ سبھوں کو ہنساتے ہیں اور ہنسنے دیتے ہیں پھر انھیں بیوقوف بنا کر ان پر خندہ زن ہوتے ہیں کبھی وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ اپنا سارا وقار کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی ایسا رعب و دبدبہ، ایسی شان و شوکت دکھلاتے ہیں کہ ان کی عظمت دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ بزرگان دین نے انھیں ایسی ایسی چیزیں دی ہیں جو کسی کو

میسر نہیا، زنبیل، گلیم عیاری، جال الیاسی، کمند آصفی۔ دو جامہ اور کتنی نادر چیزیں اُن کے قبضہ میں ہیں ان کی عجیب و دلچسپ ہستی ہے۔ حقیقت یہہ ہے کہ عمرو عیار کی تخلیق ایک کارِ خیر ہے۔

(۶)

موجودہ نقطۂ نظر سے "طلسم ہوش ربا" کا غالباً سب سے اہم نقص یہہ ہے کہ اس میں جادو، جادوگر اور جادوگری کی ناقابل یقین داستان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی بات اس کی دلکشی کا سب سے بڑا سبب ہے۔
آئیے ایک لمحہ کے لئے اپنے تخیل سے کام لیکر ہم یہ تصور کریں کہ امیر حمزہ موجودہ جنگ یورپ کے تماشائی ہیں یا وہ لقا کے تعاقب میں جرمنی جا پہنچے ہیں اور افراسیاب کے بدلے ہٹلر نے لقا کو پناہ دی ہے۔ امیر حمزہ اور ان کے سرداروں کو ہر چیز نئی انوکھی جادو کا کرشمہ معلوم ہوگی۔ جب وہ ٹینک یعنی آہنی پہاڑیوں کو چلتے اور آگ اگلتے دیکھیں گے، جب انہیں گیس کے بموں کا سامنا کرنا ہوگا، جب مختلف قسم کے ہوائی جہاز ان کی فوج پر موت کی بارش کرینگے تو کیا وہ ان چیزوں کو طلسمی کارخانہ نہ سمجھیں گے؟ لیکن ہم آپ جانتے ہیں کہ یہہ چیزیں طلسمی نہیں انہیں جادو سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہہ سب جادو نہیں سائنس کے کرشمے ہیں۔ سائنس نے ایسی ہوش ربا ترقیاں کی ہیں، اس کی بدولت ایسی نادر ایجادیں ہوئی ہیں جن کا اگلے لوگوں کو وہم و گمان بھی تھا۔ عہد وسطیٰ میں کسی نے خواب میں بھی یہہ خیال نہ کیا ہوگا کہ بس۔ ٹریم، ریل کی مدد سے ہم آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکیں گے۔ کیا انھیں کبھی یہہ وہم و گماں ہوا تھا کہ انسان چند صدیوں کے بعد ہوا میں اڑتا پھرے گا اور زمین اور پانی کے اندر سفر کرسکیگا؟ لیکن آج اسے ہم نہایت معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اگلے زمانے میں لوگ سائنس اور اس کی طاقتوں سے واقف نہ تھے اس لئے وہ قصہ کہانیوں میں اپنے تخیل سے کام لیتے تھے اور طلسمی قالین یا اڑنے والے گھوڑے کے کرشموں سے اپنی کہانیوں کی دلچسپی میں اضافہ کرتے تھے۔ آج جادو سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہم آپ آسانی سے ہوا میں اڑ سکتے ہیں اور میلوں کا سفر قلیل مدت میں طے کرسکتے ہیں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ آج کل ظاہری واقعیت و حقیقت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں جادو یا کسی مافوق العادت چیز یا واقعہ کا بیان ہوا تو پھر ایسی نظم یا ایسے افسانے کو فوراً کم قیمت یا بے قیمت سمجھ لیا جاتا ہے اور کسی مزید غور و فکر، جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ یہہ خام ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اصل یہہ ہے کہ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں نہیں ہوا جب اُردو میں محض خیالی باتوں کے طوطا مینا بنائے جاتے تھے اور انکھیں ادب کا ماحصل سمجھا جاتا تھا۔ ادھر مغرب کے اثر سے ادب، اسکی ماہیت، اس کے موضوعات۔ اسکے اصول سے کچھ واقفیت ہوچلی ہے۔ ادر منجملہ اور باتوں کے ایک بات جو اُردو انشا پردازوں نے سُن پائی ہے وہ یہہ ہے کہ ادب میں "زندگی کی حقیقتوں" کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس لئے اب جہاں

انھیں کسی غیر فطری، حقیقت سے دور، محض خیالی چیز سے سامنا ہوتا ہے تو وہ اسے بے سوچے سمجھے
یکقلم گردن زدنی تصور کرنے لگتے ہیں۔ جب بچپن کی اقلیم سے گذر کر انسان سن وشعور کی سرحد
میں قدم رکھتا ہے تو سب چیزیں جن سے وہ بچپن میں دلچسپی رکھتا تھا کھلونے، قصے، کہانیاں
کبڈی، آنکھ مچولی، جھولا، پہیلیاں۔ اسے طفلانہ معلوم ہوتی ہیں اور انھیں وہ نظر حقارت سے
دیکھتا ہے اور ان میں حصہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ یہہ اس کے ذہن کی خامی کی
نشانی ہے۔ پہلی بات تو یہہ ہے کہ یہہ چیزیں حقیر نہیں بلکہ نہایت مفید ہیں۔ دوسری بات یہہ ہے
کہ انسان بلوغ کے بعد بھی ان چیزوں سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔ شکلیں تو البتہ بدل جاتی ہیں لیکن
ان کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ گڑیوں کے بدلے وہ ریڈیو یا موٹر کار سے کھیلتا ہے۔ کبڈی
اور آنکھ مچولی کے بدلے ٹینس اور گولف سے دل بہلاتا ہے۔ پہیلیوں کے بدلے معمون Crossword
Puzzles) سے شغل کرتا ہے۔ جھولے کے بدلے گاڑی میں سیر کیلئے نکلتا ہے۔ قصے کہانیوں کے
بدلے سینما اور تھیٹر میں وقت برباد کرتا ہے بہر کیف کہنے کا مطلب یہہ ہے کہ عموماً ہم بے بغیر سوچے سمجھے
رائے قایم کرلیا کرتے ہیں۔ ادبی نکتوں اور مسئلوں کے متعلق غور و فکر اور وقت، نظر کی ضرورت ہے
یہاں جلد بازی یا سطحی نقطۂ نظر کا نتیجہ لازمی طور پر غلطی، فاش غلطی ہے۔

یہہ پیش پا افتادہ بات ہے کہ ادب میں "واقعات" حقیقی افراد کا بیان نہیں ہوتا۔ ان چیزوں
کی جگہ تاریخ میں ہے، وہ ڈرامہ ہو یا ناول یا افسانہ، اس میں تخیلی واقعات، تخیلی کیرکٹر کی نمایش
ہوتی ہے۔ یہہ تخیلی واقعات ہونے والے واقعات سے زیادہ صحیح اور قابل وثوق ہوتے ہیں۔ یہہ
تخیلی کیرکٹر ہم آپ سے زیادہ حقیقی اور زندہ نظر آتے ہیں۔ یہہ واقعات اور کیرکٹر فوق فطرت قسم
کے بھی ہوسکتے ہیں۔ قارئین کو صرف یہہ دیکھنا چاہیے کہ یہہ واقعات اپنے مخصوص ماحول میں کس حد تک
قابل وثوق ہیں اور یہہ ہستیاں اپنی مخصوص فضا، اپنی مخصوص دنیا میں زندہ ہیں یا مردہ۔ اگر یہہ
واقعات قابل وثوق اور یہہ ہستیاں، زندہ نظر آئیں تو پھر ان کا فوق فطرت ہونا نہ ہونا خارج
از بحث ہے۔ یہہ ضرور ہے کہ جو کارنامے صرف اس کم سے کم شرط کو پورا کرتے ہیں ان کا مقابلہ مثلاً
شیکسپیر کے ڈراموں سے نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ اس قدر حقیر بھی نہیں کہ انھیں پس پشت ڈالدیا جائے۔
اگر اس حجت کے بعد بھی آپ جادو کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو جادو کا حقیقت و واقعیت کی روشنی میں
مطالعہ کیجئے۔ جادوگر جادو کرتے ہیں تو سفید، سرخ، سیاہ یا زرد رنگ کا ابر نمودار ہوتا ہے اور اس ابر
سے کبھی تیر و خنجر برستے ہیں تو کبھی آگ برستی ہے، ایسی بوندیں پڑتی ہیں جن سے ہوش گم ہو جاتے ہیں
یا جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ آج طرح طرح کے ہوائی جہاز آسمان پر بادل کی طرح چھا جاتے ہیں،
اور کبھی پھٹنے والے گولے برساتے ہیں تو کبھی آگ یا کسی زہریلی گیس کی بارش کرتے ہیں۔ نتیجہ واحد ہے

جادوگر اپنے جادو سے ایک ایسا عفریت طلسمی یا اژدھا بناتے ہیں جو لوگوں کو کھا جاتا ہے اور کوئی حربہ اس پر اثر نہیں کرتا۔ آج ٹینک عفریت طلسمی یا اژدھے سے زیادہ خونخواری دکھاتے ہیں۔ جادوگر ایسا گولا پھینک مارتے ہیں جو مخالف کے سینے کے پار ہو جاتا ہے۔ آج دستی بم (hand grenades) اس سے زیادہ پُر زور ثابت ہوتے ہیں۔ جادوگر اپنے یا اپنی فوج کے گرد ایک حصار کھینچ دیتے ہیں کہ ان کے دشمن اس حصار کے اندر نہ آ سکیں۔ آج ہم "مزنیو لائین" بناتے ہیں۔ جادوگر اپنے سحر سے ایک طائر بناتے ہیں اور یہ طائر سحر سینکڑوں میل ایک لمحہ میں طے کر کے ضروری خبر پہنچاتا ہے۔ آج "وائرلس" سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ طوالت مانع آتی ہے۔ ورنہ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تعجب خیز و ناقابل یقین باتیں جنہیں ہم خواب و خیال سے زیادہ نہیں سمجھتے حقیقت میں تعجب خیز و ناقابل یقین نہیں۔ یہ حیرت میں ڈالنے والے شعبدے اب شعبدے نہیں رہے۔ سائنس کی معمولی ایجادیں ہیں۔ یعنی جن خیالی چیزوں کو اگلے مصنفین نے زور تخیل سے پیدا کیا تھا اور جو ہمیں استعجاب میں ڈالتے تھے انھیں سائنس نے واقعیت کا جامہ پہنا دیا ہے گویا ایک خواب تھا جو حقیقت سے بدل گیا ہے۔ ٹینک کو ہم خیالی کارنامہ تصور نہیں کرتے اور اسے لغو و لاطائل سمجھ کر اس کی راہ میں نہیں کھڑے ہو جاتے اگر ٹینک ہو جائیں تو ہم پہلے ہیں اس کی "واقعیت" کا ثبوت مل جائے۔ لیکن عفریت طلسمی کی واقعیت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اور اسی قسم کے شعبدوں کی وجہ سے "طلسم ہوش ربا" کو مہمل واز کار رفتہ اور تضیع اوقات کا سبب سمجھتے ہیں حالانکہ اس زور تخیل، اس بلند پروازی ستائش لازم ہے جس نے ایسے ایسے تصورات کے نقشے بنائے جو آج تصورات نہیں واقعات بنے ہوئے ہیں۔ کیسے "پیش بیں" تھے یہ اگلے مصنفین کہ انھوں نے آنے والی چیزوں کی "تشکیلیں" اتنا پہلے اور اس صفائی کے ساتھ دیکھ لی تھیں۔

"طلسم ہوش ربا" میں بے شمار جادوگر ہیں اور وہ نئے نئے قسم کے جادو ایجاد کرتے ہیں بعض ممتاز جادوگر مخصوص اور نہایت رنگین جادو کے مالک ہیں مثلاً جہاں ملکہ بہار نے جھوم کر گلدستہ مارا تو پھر فوراً غبار زرد بلند ہوتا ہے پھول برسنے لگتے ہیں، ہوائے سرد چلتی ہے۔ غنچے مسکراتے ہیں پتیاں تالیاں بجانے لگتی ہیں شاخوں کو وجد ہوتا ہے۔ دشمن جھومنے لگتا ہے۔ زمین سے پھول اٹھا کر سونگھتا ہے۔ جوش عشق بہار میں دیوانہ وار اشعار آبدار پڑھتا ہے اور ملکہ بہار کا بندۂ بے دام ہو جاتا ہے اور بہار اس سے اپنے دشمنوں کو قتل کراتی ہے۔ برآں کا اختر مروارید چلتا ہے جس سے نئے نئے جادو پیدا ہوتے ہیں۔ رعد چیختا ہے اور اس کی چیخ سے مخالفین کے سر پھٹ جاتے ہیں مشعل۔ آنکھ ملا کر روح قبض کرتا ہے۔ اشتقاق نقارہ بجاتا ہے۔ جو سنتا ہے وہ جان سے ہاتھ دھوتا ہے

جادو کی بوقلمونی کا احاطہ ممکن نہیں۔ اور پھر بڑے جادوگر اپنی منفرد شخصیت رکھتے ہیں۔ جانب داران اسد میں مہرخ، بہار، مخمور، رعد، زلزلہ، باغبان قابل ذکر ہیں اور جب خواجہ عمرو اپنی حکمت عملی سے کوکب کو اپنا شریک بنا لیتے ہیں تو پھر بے مثل جادوگران کی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں اور کب روشن ضمیر، کوکب کا استاد نور افشاں، برجیس، تراں، مجلس، بلور چہار دست، معمار قدرت، جہاندار شاہ، ملکہ مشتری، ماہ طلعت، سب انفرادی ہستی رکھتے ہیں۔ مخالفین اسد میں تو اتنے ممتاز جادوگر ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ افراسیاب اور حیرت، آفات، ماہیان زمرد پوش، مصور صورت نگار، مشعل، اختفاق، شہنا نواز، یاقوت، تاریک شکل کش غرض کس کس کا ذکر کیا جائے۔ یہ سب زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اردو ناول اور افسانوں میں جو کیرکٹر ملتے ہیں وہ ان جادوگروں کے مقابلہ میں بے لطف و بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جادوگر تخیل کی جاندار پیداوار ہیں اور انھیں فنا نہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، تاریک شکل کش سے عمرو عیار کی پہلی ملاقات ملاحظہ ہو:-

دیکھا ایک گنبد انتہا کا تاریک ایک جانب آگ جل رہی ہے ایک جانب پلٹ کر ایک دیونی کو دیکھا سر مثل گنبد، سیاہ چہرہ، نیلی کرتی، نیلی تھان کا لہنگا از سر تا ناخن پا بصورت دل کافر سیاہ ... زبان منہ سے نکلی ہوئی رال ٹپک رہی ہے۔ دونوں ہاتھ زمین میں ٹیکے ہوئے بیٹھی جھوم رہی ہے، دس جوان ایک جانب سر جھکائے مثل برگ بید کانپ رہے ہیں ... ایک پہلو میں مٹکے شراب کے،، مٹکا شراب کا اٹھا یا منہ سے لگا یا غٹ غٹ پی گئی ایک جوان کی ٹانگ پکڑ کے مع استخوان چبانا شروع کیا"۔ اس کے لڑنے کا یہ عالم ہے: "اپنے مقام سے تاریک اٹھی، دیونی نے ڈکار لی، لپکتی کو جھاڑتی ہوئی طرف لشکر اسلام چلی ... جس کو پکڑا اجھرا تا مار کر چیر ڈالا چبانا شروع کیا ... اگر کسی خیمے کے قریب پہونچی طناب پکڑ کے ایک مارا خیمہ گر گیا، سردب گئے جو کوئی زندہ بچ کے نکلا تاریک نے پکڑ کے چیر ڈالا ... نہ کوئی اسم سحر پڑھتی ہے نہ سنگریزے پھینکتی ہے۔ پامال کر رہی ہے صفوں کو الٹ دیا سحر کسی کا تاثیر نہیں کرتا، جب چار سو سرداروں نے مل کر سحر کئے ایک یا دو زخم جسم پر اس کے اور چھچے آ سکے ... چشم زدن میں خون کے دریا بہہ گئے جس کو نوجوان دیکھا۔ چیر پھاڑ کر کھا گئی۔ اگر ضعیف سامنے آئے ان کو چیر کر پھینک دیا منہ بھی نہ لگایا بچے کے پاس منہ لگا کے خون پی گئی۔ جب ڈکار لیتی ہے دھواں منہ سے نکلتا ہے" ... جادوگرنی کیا ہے ایک بھیانک خواب ہے۔ ایسا خواب جو کبھی فراموش نہ ہو سکے۔ جادوگروں کے ساتھ ان کے بعض قصے بھی زندگی جاوید کے مستحق ہیں۔ عفریت طلسمی خصوصًا قابل ذکر ہے: "جب بے حیا نے چنگل مارا جیسے کوئی انسان کھیلوں کے پھنکے مارتا ہے۔ اسی طرح دو سو کو اٹھایا پھنکا مار گیا چبا تا چلا گیا ... کسی کا سحر اس کے جسم پر تاثیر نہیں کرتا۔ جتنے گرز مارا پھنک کر پڑا ترنج پڑا جسم پر

اس کے دھیان بھی نہ آیا۔ آگ بڑی شعلہ خو کو خبر بھی نہ ہوئی دریائے آب موج مار کر آیا چلو لگا کر پی گیا .. ملکہ لعل نے دو گھڑی کا حال سوچا کیا آگ کا دریا ہوا یا عفریت عمداً اس آگ میں چلا نہ پڑا راہ میں ایک چشمہ ملا ملکہ لعل نے قریب چشمے کے جا کر چشمے پر نگاہ تیز ڈالی چشمہ ابل کر دریا بن گیا .. وہ الو چلو بھر بھر پینے لگا دریا کی تہہ تک چاٹ گیا۔ ہر چند کہ وہ دریائے سحر تھا پانی میں شمشیر آبدار کی روانی تھی اس کو کچھ معلوم نہ ہوا نہنگان خونخوار اس دریائے تہ دار سے نکلے منہ کھول کر عفریت پر گرے یہ ان کو بھی چیر پھاڑ کر کھا گیا۔

جادوگر جادوگر بھی ہے اور انسان بھی۔ وہ بھی بولتا چالتا، کھاتا پیتا، جاگتا سوتا انسان اس کے پہلو میں بھی انسانی دل ہے۔ وہ بھی محبت و نفرت کرتا ہے۔ غمگین و مسرور ہوتا ہے عیش کرتا یا تکلیفیں سہتا ہے۔ نیک دلی، فیاضی، رحم و کرم، انصاف سے کبھی کام لیتا ہے تو کبھی بدی، بے رحمی سختی، ناانصافی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس میں جمال اور جلال کے اوصاف بیک وقت مجتمع ہو سکتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اس کا مشغلہ جادوگری ہے لیکن محض اس مشغلہ کی وجہ سے وہ انسان کے زمرہ سے خارج نہیں ہو جاتا۔ جادوگری انسان کا قدیم مشغلہ رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں اور سائنس کی ترقی کے باوجود بھی جادو اور جادو میں یقین آج تک باقی ہے اور غالباً جب تک انسان کی ذہنیت بالکل بدل نہ جائے یہ یقین باقی رہے گا۔ اگر "روشن خیال" حضرات جو کتنے ہاتھی نگل جاتے ہیں۔ اس ہاتھی کی دم کو نہیں نگل سکتے تو جادوگری کو پس پشت ڈال کر "طلسم ہوش ربا" کے دوسرے خصائص سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ دو عظیم الشان طاقتوں کا تصادم، بہادروں کی جانبازی، عیاروں کی حکمت عملی حسن و عشق کی کشمکش، عیش و عشرت کا کارخانہ، حیرانی و پریشانی کی تصویر، ماحول کا نقشہ غرض ہزار چیزیں ان کی دلچسپی کا سامان ہو سکتی ہیں۔ بہشت شرط ہے۔

(باقی)

کلیم الدین احمد

# اسعد الاخبار (آگرہ)

۱۴۴ - معلوم ہوتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے مقرر ہونا بورڈ ایڈمنسٹریشن ملک پنجاب کا ناپسند فرمایا۔ کیونکہ اس کے انتظام اور بندوبست سے کچھ سرکار کو فائدہ حاصل نہ ہوا۔ غالب ہے کہ جناب شوکت مآب لفٹنٹ تامسن صاحب بہادر ملک پنجاب میں بھی مدار المہام مقرر ہوں۔ اخبار النواح۔

۱۴۶ - حیدرآباد دکن: معلوم ہوا کہ پانچ لاکھ روپیہ سپاہ انگریزی کی تنخواہ کی بابت جو سرکار حیدرآباد کی طرف ہے.. باقی ہے۔۔ ان دنوں صاحب رزیڈنٹ بہادر نے [illegible] کپتان [illegible] صاحب کو راجا رام بخش بہادر کے پاس بھیج کر یہہ کہلا بھیجا کہ آج تک بہتیرے وعدے ہوئے اور ایک بھی پورا نہ ہوا یہ سب لوگ گھبرا گئے ہیں۔۔ زر نقد نہ ہو سکے تو صوبہ برار میں سے تھوڑا سا ملک علیحدہ کردو کہ اس کے محاصل سے زر قرضہ وصول کر لیا جائے گا۔ ... ابھی یہہ حال نہیں کھلا کہ حضور والا نے اس باب میں کیا ارشاد فرمایا

۱۴۸ - خبر مدرسہ اکبرآباد: جمعرات کے دن جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مدرسے میں تشریف لا کے امتحان سالانہ کی رپورٹ سنی... بعد اس کے پہلے دخانی گاڑی کا بیان کیا گیا اور پھر وہ گاڑی مدرسے کے احاطے کے اندر آہنی سڑک پر چلائی گئی۔۔۔ سب ہندوستانی و انگریز یہہ تجربہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔

۱۴۹ - اخبار النواح میں بحوالہ.. انگلشمین کے مرقوم ہے کہ نواب رضا حسین خاں والی مرشدآباد کی بی بی بعارضہ چیچک فوت ہوئی۔ بی بی کے غم میں نواب صاحب بہادر بھی زہر کھا مرے اور یہہ بھی لکھا ہے کہ ڈھائی برس ہوئے کہ اس نواب کی والدہ بھی اسی طرح مری تھی۔

۱۵۰ - حیدرآباد: رفعا صاحب میر امام علی اور میر [illegible] علی روہیلوں کے جمعدار کے درمیان بڑی خانہ جنگی ہوئی امام علی اپنے [illegible] بھائیوں کے ساتھ مارا گیا۔ زبدۃ الاخبار

۱۵۱ - خبر لاہور: تبرکات [illegible] جو توشہ خانہ مہاراجا صاحب میں ہے بحکم سرکار انگریز بہادر کے کسی مسجد کو مرحمت ہوگا۔ زمانہ سابقہ میں اس تبرکات کے عوض کسی نواب نے کئی لاکھ روپے مہاراجہ صاحب کو دینے تجویز کیے تھے۔ مگر مہاراجا صاحب نے تبرکات کو علیحدہ کرنا پسند نہ کیا تھا۔
اخبار اتفاق۔

۱۵۲ - رفعا صاحب سید قربان علی رئیس اترولی کو ۱۲۶۳ھ میں منصفی کی سند ملی تھی۔ ۳ مئی سنہ ۱۸۵۱ء کو حکام صدر نے انہیں عہدہ وکالت صدر عطا کیا۔ وکالت کا کام ہر شخص کر سکتا ہے لیکن یہہ ہر شخص کا کام نہیں کیونکہ وکیل میں قناعت، خلوص، اتحاد یعنی مؤکل کے فائدے کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھنا، اعتماد، دینداری، علم، متانت، تحریر، خوش تقریری، وجاہت ظاہری، راست گفتاری

یہ سب ہونی چاہیں اور ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ سید قربان علی صاحب ان سب صفات کے مستجمع ہیں۔

۱۵۵ اکبر آباد: مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ مرحوم کا مقدمہ جو بہ صیغۂ اپیل صدر نظامت میں دائر تھا، تمام ہوا اور ان کے حق میں دو نے سے جو سات برس کی قید بامشقت پابجولاں کا حکم ہوا تھا سو وہ حکم بحال رہا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔

۱۵۹ مجمع الاخبار بمبئی میں انگریزی اخبار لنڈن سے منقول ہے کہ ملکۂ معظمہ کے وزیروں کا اختیار و اقتدار روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ اور ارباب پارلیمنٹ کے حضور ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اس بات سے سب کو معلوم ہوتا ہے کہ عن قریب ان وزیروں کی تغیر و تبدیل ہوا چاہتی ہے۔ زبدۃ الاخبار

۱۶۰ زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار بمبئی سے منقول ہے کہ عمدۃ التجار حبیب ابن یوسف نے حاجیوں کی آسائش و آسانی کے لیے دخانی جہاز مقرر کیا ہے جس سے ساڑھے تین مہینے میں حج و زیارت سے بہرہ اندوز ہو کر پھر آیا کریں۔ سو ایسا ہوگا کہ غرہ ذیقعدہ ۱۲۶۶ھ کو بمبئی سے جہاز کا لنگر اٹھے گا اور بیسویں پچیسویں تک جدہ میں پہنچ جائیں گے... جہاز کا کرایہ اس تفصیل سے ہوگا کہ دیوسہ (؟) کا فی کس ... ہوتا ہے فی سفر ڈیڑھ سو روپیہ، اور مقام چھتری فی کس سوا سو روپیہ، اور بالا سے ... پچیس روپیہ۔

۱۶۶۔ ان دنوں ڈاکٹروں نے میسمریزم کا ہنر ایجاد کیا ہے اس سے جس کو چاہیں بے ہوش کر کے تمامات کا حال پوچھ لیں۔ چنانچہ ایک دن اسی ہنر سے ایک لڑکی کو بے ہوش کیا پھر اس سے شہر ... اور وہاں کی کیفیت پھر شہر اس کا ... جو فرنگستان میں بڑا نامی شہر ہے حال پوچھا لڑکی نے سب جگہ کا حال پتا وار بتایا۔ کہتے ہیں کہ میسمریزم کا کمال یہ ہے کہ جس وقت کسی کو بے ہوش کر کے رومال سے اس کی آنکھیں باندھ دیں اور جس علم اور جس زبان کی کتاب کو اس کے آگے رکھ دیں وہ اسے پڑھ لے اور اوروں کو اس کا مطلب سمجھا دے۔ زبدۃ الاخبار۔

۱۸۰ حیدر آباد دکن: نظام الملک نے ایک نہایت عمدہ کوچ اور ۶ کرسی ہاتھی دانت کی کہ جس پر تحریر طلا بہت صفائی سے منقوش ہے ملکۂ معظمہ کو بطور تحفے کے بھیجے ہیں۔ (اخبار الحقائق)

۱۸۵ حیدر آباد دکن: ان دنوں حضرت بندگان عالی نے جمیع اعیان و ارکان سلطنت پر جو ملازم قدیم ہیں تاکید کی ہے کہ سب مل کر دینی ... دست کے ... زر نقد داخل خزانہ حضور کریں، یہاں تک کہ پچاس لاکھ روپے جمع ہو جائیں تاکہ... رزیڈنٹ کے تقاضے سے نجات حاصل ہو۔ چنانچہ اکثر ملازمین نے روپیہ داخل کیا ہے اور راجا رام بخش پر سزا دلی متعین ہیں۔ راجا مذکور کا یہ حال ہے کہ روپیہ دینا ان پر دشوار ہے۔ زبدۃ الاخبار

۱۸۶ لاہور: مسٹر الیٹ صاحب سکرٹری اعظم نے تواریخ کی کئی کتابیں پرانی اور خوش خط مہاراجا رنجیت سنگھ کے کتب خانہ کی کئی سو روپے کو خرید کی ہیں اور ایک ... صاحب موصوف جناب

نشہر سید نور الدین احمد کے گھر جا کر ان کے کتب خانے میں سے چند جلد تواریخ عاریتہً لے آئے۔ اخبار الحقائق

۱۹۳ ۔ صاحب زبدۃ الاخبار تحریر فرماتے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ اعیان و ارکان سلطنت انگلستان کو منظور ہے کہ گورنمنٹ آگرہ کا اختیار و اقتدار نسبت سابق کے زیادہ تر ہو جائے۔ سو نواب عالیجناب امیر کبیر فرمانروائے کشور ہند کو ایما کیا ہے کہ ریاست ہائے عظیمہ راجستان جو نربدا اور ستلج کے اس پار واقع ہیں ان سب کے معاملات کو آگرہ کی گورنمنٹی سے متعلق کر دیں جیسے کہ پہلے بہ عہد حکومت لارڈ منٹیدف صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر آگرہ کے متعلق تھے۔ خدا کرے کہ یہ خبر سچ ہو۔ کہ اس محکمۂ جلیلہ کے اقتدار کی ترقی جیسا آبادی اکبر آباد متصور ہے۔

۱۹۴ ۔ احمد آباد: اخبار آفتاب عالمتاب میں یوں لکھا ہے کہ ایک مہاجن ۔۔ نے واسطے تعلیم ہندو لڑکوں کے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہا۔ جب اس بات کی اطلاع صاحب کلکٹر کو ہوئی تو صاحب مذکور نے اس کو بہت تحسین و آفرین کی اور ۔۔۔ بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اخبار الحقائق۔

۲۰۰ ۔ حیدر آباد: اخبار گلشن میں بہ حوالہ ایک چٹھی آمد حیدر آباد کے مرقوم ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر نے نواب نظام الملک بہادر کو واقف کر دیا ہے کہ اگر زر قرضہ تاریخ مقصودہ پر ادا نہ ہوگا تو ۔۔ صاحب رزیڈنٹ کو حکم ہے کہ بہ ۔ س معاملے میں شریک نہ کریں۔ عوام کی رائے یہ ہے کہ بعد اس کے کچھ ممالک من جملۂ قلمرو نواب صاحب پر سرکار اپنا دخل کر لے گی۔ اخبار النواح

۲۰۱ ۔ اکبر آباد: جناب ولایت حسین خان صاحب بہادر قاضی القضات صدر جو اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر بہ حصول پنشن تعلقات سے کنارہ کش ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ مولوی محمد اسد اللہ صاحب مفتی عدالت فتح پور مقرر ہوں گے۔ زبدۃ الاخبار

۲۰۲ ۔ حیدر آباد دکن: کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ۔۔ حیدر کو شامل کرنا ممالک سرکاری میں نامنظور کیا۔ اخبار النواح

۲۰۴ ۔ جو تحفے کہ راجا گلاب سنگھ نے لاٹ صاحب کو پیش کش کیے تھے لاہور میں سب کا نیلام ہو گیا۔ دہلی اردو اخبار

۲۰۵ ۔ ان دنوں ڈاکٹر سپرنگ صاحب پرنسپل مدرسہ کلکتہ نے چاہا تھا کہ علم طبیعی اور جغرافیہ اور فارسی ۔۔۔ طلبہ کو سکھایا جائے لیکن طلبہ نے نہ مانا اور مقابلہ کیا۔ ارباب کونسل تربیت نے اس بات پر سرکش لڑکوں کو ۔۔۔ مدرسے سے نکال دیا لیکن وہ بہ ہیئت مجموعی آکر اپنی اپنی جگہ پر ۔۔ بیٹھ گئے اور آخرکار ارباب پولیس نے انھیں نکال دیا۔ دہلی اردو اخبار

۲۰۶ ۔ حیدر آباد دکن کے خط سے واضح ہوا کہ ظفر یار جنگ کی جمعیت کے سپاہیوں نے کئی برس ۔ تنخواہ نہیں پائی تھی ناچار تنگ ہو کر ۔۔ در دولت پر مجمع کر کے داد فریاد کرنے لگے۔ ان کی

دیکھا دیکھی لشکر کے اور لوگ بھی مثل افغانوں اور سکھوں کے جو تنخواہ کو ترستے تھے ... درِ دولت پر حاضر ہوئے ... حق بہ جانب لشکریوں کے ہے کہ جب برسوں سے تنخواہ نہ پائیں تو بھوک کے مارے بلوہ نہ کریں تو کیا کریں۔ لیکن بندگان عالی نے اُن بیچاروں کے حال تباہ پر رحم نہ کرکے حکم دیا کہ ان لوگوں کو درِ دولت سے نکال دو۔ جب وہ نہ نکلے تو توپ خانہ منگوا کر اُن کے اڑا دینے کا حکم دیا اور ایک باڑھ بھی چلوادی کئی آدمی جہنم رسید ہوئے ... باقی لشکر نے جب یہ حال دیکھا تو اپنی اپنی چھاؤنیوں کو چلے گئے۔ بعد ازاں حضرت نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو موقوف کرو اور تنخواہ دے کر نکال دو۔ زبدۃ الاخبار

(۵۸) شہر کلکتہ کے نافہم لوگوں میں مشہور ہے کہ ڈاکٹری مدرسے میں موٹے اور جسیم آدمیوں کو پکڑ کر خون اور چربی اور مغز نکالتے ہیں کہ اس سے کچھ ایسی شئے بنائیں گے جس سے ملتان فتح ہو جائے سو اس خوف سے جسیم اور فربہ آدمی چھپے پھرتے ہیں۔ ایک دن چند کہاروں کے پکڑنے کو برق انداز دوڑے۔ کہار ڈرے کہ ہمیں چربی نکالنے کو پکڑیں گے بازار کی طرف بھاگے اور اُن کے بھاگنے اور غل شور کا ہنگامہ برپا ہوا کہ بازار لٹ گیا۔ واہ کلکتہ کے لوگ بھی کیسے بے وقوف ہیں۔ رسالہ سلطان الاخبار ۱۲ دسمبر

(۴۹) اُس طرف کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ جزیرۂ امریکہ میں ایک ملک ہے مکسیکو، وہاں کے رہنے والوں اور امریکہ کے لوگوں میں ایک سال سے لڑائی تھی آخر اہل امریکہ غالب آئے، اور ایک ملک کالیفورنیا چھین لیا۔ وہاں ایک دن ایک سوداگر نے کسی کام سے گڑھا کھودا، سو مٹی میں سونے دانے نکلے۔ لوگوں کو تعجب ہوا۔ سوچنے لگے کہ شاید یہاں سونے کی کھان (کذا) ہو۔ تلاش و جستجو کی تو ایک خطہ پچاس کوس لمبا اور اُسی قدر چوڑا ایسا پایا گیا اس میں جہاں کھودا خالص سونے کے دانے نخود کے برابر سے لے کر آدھ سیر کے ٹکڑے تک نکلے ... سرکار انگریز بہادر نے اب تک اُس ملک بندوبست نہیں کیا، کیونکہ پایہ تخت سے بہت دور اور نیا قبضے میں آیا ہے، غالب کہ چند روز بعد کچھ بندوبست کیا جائے۔

قاضی عبدالودود

# نعرۂ جنگ

(وطن کی حفاظت کے واسطے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہونے والوں کے لئے)

اٹھو کہ یہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

(۱)

گو فتنہ یہ سب فرنگ کا ہے — نقشہ دنیا کی جنگ کا ہے
خطرہ آسام و بنگ کا ہے — ڈر وادی سندھ و گنگ کا ہے
یہ وقت بڑی ترنگ کا ہے — مردوں کے لئے امنگ کا ہے
شمشیر و سنان و سنگ کا ہے — طیارہ و توپ و ٹنگ[۱] کا ہے

اٹھو کہ یہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

(۲)

یہ وقت برا ہے، ہاں خبردار — ہیں اہل زمانہ ایک عیار
[illegible] ایک کے اب آثار — ہے ایک کو دوسرے سے تکرار
بھائی کٹا ہے بھائی سے خار — لٹ جائیں نہیں سب کے گھر بار
ہیں ان میں چھپے بہت سے غدار — دشمن ہو کہ دوست سب سے ہشیار

ہشیار! کہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

---

[۱] ہوائی جہاز، ٹنگ بمعنی ٹینک (انگریزی) لکھا گیا ہے۔ جو بہ عربی میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر ٹنگ کا لفظ زیادہ سہل ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس جدت کو پسند کریں گے۔

(۳)

دیکھو کیا حال ہے تمہارا — کس سمت خیال ہے تمہارا
گر اکل حلال ہے تمہارا — گر صدق مقال ہے تمہارا
یہ عہد کمال ہے تمہارا — یہ وقت جلال ہے تمہارا
یہ ماہ یہ سال ہے تمہارا — یہ ملک یہ مال ہے تمہارا

اٹھو کہ یہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

(۴)

اٹھو خاک وطن سے اٹھو — اٹھو باغ عدن سے اٹھو
اٹھو گنگ و جمن سے اٹھو — پورب پچھم دکن سے اٹھو
ہر دشت سے ہر چمن سے اٹھو — ہر بزم ہر انجمن سے اٹھو
اٹھو کوہ و دمن سے اٹھو — اٹھو جنگل سے بن سے اٹھو

اٹھو کہ یہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

(۵)

اٹھو وحدت کا جام لیکر — دل میں کیفیت مدام لیکر
اٹھو غیرت سے کام لیکر — ہاتھ میں ننگ و نام لیکر
الفت کا نیا پیام لیکر — آزادی خاص و عام لیکر
حب قوم کا جام لیکر — اٹھو اللہ کا نام لیکر

اٹھو کہ یہ وقت جنگ کا ہے
تیغ و تبر و تفنگ کا ہے

[illegible]

# گدھا

یوگو ڈاسانتا صوفیا دسیرونا کا باشندہ تھا یوں تو وہ سارے علوم وفنون میں دسترس رکھتا تھا لیکن ستاروں کے متعلق تحقیقات کرنے میں وہ اتنا منہمک رہتا کہ سارے ملک میں اسکی شہرت ہوگئی تھی۔ وہ سیارے ہوں یا ستارے، ثابت یا گردش کرنے والے، وہ انکی نقل وحرکت کے متعلق بہت گہری واقفیت کی ڈینگیں مارتا اور بڑی آسانی سے ان کی چالوں کے متعلق پیشین گوئی کیا کرتا۔ لوگوں کی نقل وحرکت یا ان واقعات کے متعلق جنکے ہونیکا احتمال بہت زیادہ ہوتا بے خوف وخطر پیشین گوئی کرتا رہتا۔

اُس نے روبرٹ بادشاہ کی موت اور ایک عورت کے جانشینی کی پیشین گوئی کی۔ اُس نے یہ بھی پیشین گوئی کی کہ ہنگری کی سرحد یونان تک بڑھ جائیگی اور کچھ دنوں بعد یہ حد تڑالے تک پہنچ جاسکتی ہے۔ اُس نے اُس خوفناک وبا کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو یاد رکھنے والے سال ۱۳۴۸ء کی غارتگری کی صورت میں رونما ہوا۔ بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اُس کے پیشین گوئی کے صحیح ہونیکی وجہ سے اس کی شہرت سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اور کوئی شاہزادہ بھی اس کی قابل رائے لینے کے بعد کسی کام کے کرنے میں پس وپیش نہ کرتا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کٹنی کے زمانہ میں وہ اپنے دیہات گیا ہوا تھا، کیونکہ اُسے غلہ کے کھلیان اور اُن کے جمع کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ اتنے میں اُس کا ایک معمر تجربہ کار دیہاتی ہمسایہ اس کے پاس ایک نہایت اہم خبر لے کر آیا جسے وہ اس موسم کے لئے نہایت ضروری اور اہم سمجھتا تھا۔ لنگڑے ہونیکی وجہ سے وہ ایک خوبصورت گدھے پر سواری کیا کرتا تھا وہ یوگو کے دروازہ پر اتر پڑا۔

"یوگو میں تمہارے یہاں ادھر سے گذرتے ہوئے اتر پڑا ہوں کیونکہ اس بدلتے ہوئے موسم میں اُن غلوں کی جو بہت دنوں سے کٹے ہوئے ہیں حفاظت کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک گھنٹے کے اندر ایک نہایت سخت طوفان آنے والا ہے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ سارا آسمان ہمارے سروں پر ٹوٹ پڑیگا"

ہمارے نجومی نے غور کرنا شروع کیا کہ آخر اس کے ہمسایہ کو اس راز کا کس طرح پتہ چلا۔ اُس نے آسمان کی چاروں طرف نگاہ دوڑائی وہاں گرد وغبار کا کوئی اثر نہ تھا جو طوفانوں کے قبل اکثر پایا جاتا ہے اس ایک حقارت آمیز نظر اُس نیک دیہاتی پر ڈالتے ہوئے کہا: "آسمان بالکل صاف ہے۔ سورج میں بھی تمازت نہیں، پہاڑوں پر بدلیاں بھی نہیں پھر کیسے تمہیں طوفان کی پیشین گوئی کرنیکی ہمت ہوئی؟ دیکھو ہلکی ہلکی دکھنی ہوا چل رہی ہے آفتاب بھی اپنے ٹھیک زاویہ پر ہے، سوا کسی معجزہ کے اور کسی طرح بارش نہیں ہوسکتی۔ اسوقت تو فطرت بھی پانی نہیں برسا سکتی۔ خدا کی قدرت یقینی ایسا کرسکتی ہے

لیکن موجودہ حالات میں بارش ہونا ناممکن ہے"۔

اس موضوع پر وہ دیہاتی سے بہت دیر تک بحث کرتا رہا لیکن اس کا اُس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کا وہ صرف یہی جواب دیتا کہ اس بحث میں فضول وقت ضائع کرنے سے بہتر یہی ہے کہ یوگو اُن غلوں کو جلد جلد مکان میں رکھنے کا حکم دیدے، کیونکہ آنیوالا طوفان صرف غلہ ہی کو برباد نہیں کریگا بلکہ درختوں کو اکھاڑ پھینکیگا، گلوں کو منتشر کر دے گا اور مکانوں کی بنیادوں کو بھی ہلا دے گا

اس دیہاتی کی ضد پر یوگو کو اتنا طیش آیا کہ قریب تھا کہ وہ اُسکی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کرتے لیکن اُس نے اپنے غصہ پر قابو پالیا اور دوربین اور قطب نما کے ذریعہ اُس فضا کا ایک بار پھر بغور مطالعہ کیا لیکن پھر وہ اُسی نتیجہ پر پہونچا کہ بارش کے ہونے کا کم از کم اُس دن کوئی امکان نہیں، لیکن ہر لمحہ وہ اُمید کرتا تھا کہ شاید وہ پہاڑوں کو وادی کے برابر دیکھے یا دریاؤں کو پہاڑوں پر بہتا دیکھے"

یہہ دیکھکر کہ اس کی ساری کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ وہ دیہاتی آخر وہاں سے روانہ ہو گیا اور ابھی وہ اپنے مکان پر مشکل سے پہونچا ہی تھا کہ افق پر سیاہ غبار کا دھبہ نظر آنے لگا جس نے تیز ہوا میں بڑھتے بڑھتے آفتاب کو چھپا لیا۔ اُتر کی طرف بجلی چمکنے لگی ہوا کا رُخ بدلتے بدلتے پُروا ہو گیا۔ بارش ہلکی ہلکی بوندوں کی جگہ تیز فواروں کی طرح پچھم کی طرف چھوٹ پڑی۔ جو کہ فطرتی قانون کی تصادم سے خود چکنا چور ہو چکا تھا جیسے ہی بارش بڑھی بجلی کی کڑک اور فضا کی چمک بجائے کم ہونیکے ایسا معلوم ہوتا کہ اپنی دوگنی طاقت سے کام کر رہی ہو اسے اُس گرج سے تشبیہہ دیجا سکتی تھی جو یونانیوں کو اپنے دیوتا کے غصہ کی حالت میں سنی پڑی تھی۔ اونچے اونچے مینار اور کنگورے زمین کی سطح کے برابر ہو گئے۔ بڑے بڑے شاہ بلوط کے درخت گر پڑے، دریائے اڈیج نے اپنے پُرانے بندوں کو توڑ دیا، عظیم الشان محلات اپنے شاہی مکینوں کے ساتھ کانپ اُٹھے گویا وہ ہنگامہ خیز دنیا کی بربادی کے منتظر تھے! لیکن اسوقت یوگو اپنی ساری نجومی تحقیقات کے ساتھ کہاں تھا اور اُس کے بکھرے ہوئے غلوں کا کیا حشر ہوا؟

اس واقعہ سے اُس کے مال و متاع اور غرور دونوں کو کاری ضرب لگی کاش وہ کبھی ستاروں کے علوم سے واقف ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ اس موسم نے نہایت ذلت آمیز طریقے اُس کی آنکھوں میں دھول اڑائی تھی۔ اُس کے غلے اِن غضبناک عناصر کا شکار بنکر۔ اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے اور وہ اپنے ہمسایہ کی نیک صلاح کو ٹھکرا دینے پر پچھتا رہا تھا کیونکہ اوسکی جو کسی سے وہ بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

اُس نے غصہ کے عالم میں سارے قطب نماؤں اور دوسرے نجومی آلات کو دور پھینک دیا اور بڑے غور سے طوفان کی تیزی کو دیکھتا رہا۔ ایک ایک لمحہ اُسکے لئے ایک طویل مدت معلوم ہوتی تھی طوفان اتنا کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے ایماندار ہمسایہ کے پاس جا کر معافی مانگے اور دریافت کرے کہ کس علم کے ذریعہ وہ اِس خوفناک طوفان کی پیشین گوئی اس وقت کر سکا

# جانباز موت

فینشیلو قابل تعریف اداکار اور ولیعہد کا عزیز ترین دوست بھی تھا، لیکن ان شخصوں کے لئے جو ذاتی رجحانات کے زیر اثر کلیتہً نشاطی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں زندگی کے اہم مراحل مہلک جاذبیت کے حامل ہو جاتے ہیں، گرچہ یہہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ آزادی کی فکر اور وطنیت کا سودا والہانہ طور پر کسی اداکار کے دماغ کو اپنا لے، لیکن ایک دن ایسا ہی ہوا اور فینشیلو چند باغیوں کی سازش میں شریک ہو گیا، تمام دنیا میں کچھ نہ کچھ ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جو حکومت کو مہلک مذاق فکر رکھنے والے افراد سے، جنکی نیت شہنشاہیت ختم کرکے ایک نئے سماج کے قائم کرنے کی ہوتی ہے آگاہ کر دیا کرتے ہیں، اسی طرح اس سازش کے شرکاء کار بھی فینشیلو کے ہمراہ گرفتار ہو کر موت کا انتظار کرنے لگے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ ولیعہد کو فینشیلو کی شرکت کا حال سن کر ملال ہوا، اور یہہ بھی کہ ولیعہد اور حکمرانوں کی طرح اتنے اچھے نہیں تو برے بھی نہ تھے، لیکن حسیات کی شدت اور نزاکت اکثر موقع پر انہیں بے رحمی اور ستمگری کی طرف مائل کر دیتی۔ وہ فنون لطیفہ کے زبردست دلدادہ تھے اور نکتہ رس ہونے کے علاوہ، دلچسپیوں کے بے حد حریص تھے۔ انسان اور اخلاقیات سے بے نیاز مخلص فنکار ہوکر انہیں کسی اور اندیشہ کی متعلق اس قدر فکر نہیں تھی، جتنی غیر دلچسپ بیکاری اور اس سے بچنے میں ان کی ساری کوششیں صرف ہوتی تھیں، ولیعہد کی سب سے بڑی بدنصیبی یہہ تھی کہ اسے اپنے ادراک کے مظاہرہ کی وسعت نصیب نہیں تھی، ایسے کتنے افراد موجود ہیں جو اپنی محدود دنیا میں سب طرح کے امکانات کے حامل ہیں، مگر دنیائے مستقبل ان سے ناواقف رہ جائے گی، اس ولیعہد کو بھی قسام ازل نے محدود دولت سے بہت زیادہ ادراک کی دولت ودیعت کی تھی۔

ایک روز اچانک یہہ خبر گرم ہوئی کہ ولیعہد سب مجرموں کو معاف کر دینا چاہتے ہیں اور اس افواہ کی بنا ایک زبردست تماشے کی اطلاع قرار دیگئی جس میں فینشیلو اپنی مخصوص کامیاب تماشے کو اپنے دوستوں کی مدد سے پیش کرنیوالا تھا۔ بظاہر یہی وہ علامت تھی جس کی وجہ سے عام معافی کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی، پھر بھی ولیعہد جیسے وہمی شخص سے ہر چیز، تا اینکہ رحم اور نرمی کا بھی امکان تھا، اور ان سب کے علاوہ اگر اس کی امید کسی غیر قرین قیاس لذت کی طرف اپنے عمل سے بندھ گئی تو پھر ساری باتیں ممکن ہو جاتی ہیں، لیکن ان لوگوں کے نزدیک جو میری طرح اس عجیب پراگندہ شخص کی روح سے بھی واقف ہو چکے تھے، یہہ بات زیادہ قرین قیاس تھی کہ ولیعہد کی نیت ایسے شخص کے

احساسات و عمل کو جاننے کی تھی جنہیں موت کا فیصلہ سنایا جا چکا ہو، اس کے علاوہ اس خاص موقع سے اسے ایک آزمائش کا زبردست لطف لوٹنے کے ساتھ ساتھ اس کی تحقیق بھی کرنی تھی کہ کسی خاص فنکار کے طبعی رجحانات اس عجیب نوعیت ہی کسی غیر معمولی واقعہ سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں، چہ جائیکہ یہہ سوال کہ ولیعہد کے دل میں کم و بیش نرمی کی حیثیت تھی اور یہہ وہ مسئلہ ہے جو آج تک کسی سے بھی حل نہ ہو سکا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا، چھوٹا سا محل آرائش سے جگمگا اٹھا بغیر دیکھے ہوئے اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ کہ کس کس طرح اس چھوٹی سی ریاست کے تمام امرائے عظام اپنے اپنے محدود دائرۂ آرائش میں شان و شوکت کا اظہار کر رہے تھے، خصوصًا جب یہہ موقع دو زاویہ نگاہ، ایک طرف آرائش کی فراوانی اور دلفریبی اور دوسری جانب اخلاقی اور ذہنی دلچسپی سے اہم تھا، اس روز ماہر فنکار فینتشیلو گونگوں یا کم سخنوں کے سوانگ بھرنے میں حد درجہ کامیاب رہا، اور ایسی اداکاریاں ان تمثیلوں کے لئے جنہیں زندگی کے رموز اشاروں سے نقل کئے جاتے ہیں اہم بھی ہوتی ہیں۔ وہ کمال سنجیدگی اور آسانی سے نمایش گاہ میں داخل ہوا جسکی بنا پر تماشائیوں کے دلوں میں اس کی شرافت کا خیال کرتے ہوئے معافی کے جذبات بھی جاگ اٹھے، جب بھی کسی نقال کے متعلق یہہ رائے قائم کی گئی کہ یہہ نہایت ہی کامیاب اداکار ہے تو ساتھ ساتھ یہہ بھی مطلب ہوتا ہے کہ اس کی اداکاری سے پرے ہیں، اس کا اپنا کردار بھی صاف طور پر نمایاں ہے، یعنی اس کا فن، اس کے ارادے اور اس کی کوششیں تمام اپنی اپنی طور پر علحدہ علحدہ نمایاں ہیں، اور جب ایک اداکار کسی کردار کی نمایندگی میں پوری پوری طرح کامیاب ہے تو وہ در اصل بذات خود نہایت ہی حیرت انگیز، گرم جوشش، جیتی، جاگتی، چلتی پھرتی، ہمارے قدیم، عام اور منتشر تصورات کی یادگار بنجاتا ہے اور اسی طرح اس کی اہمیت ایک نادر اور یکتائے روزگار مثال کی سی ہو جاتی ہے۔

اس شام کو فینتشیلو ایک مستقل تصور بنا ہوا تھا، جس کے وجود، امکان اور سچائی کا انکار قطعی ناممکن تھا، وہ آیا گیا، ہنسا، بولا، گھوما پھرا، مگر اس کے سر کے گرد ایک خوفناک ہالہ ایک اگنی چکر تھی، جو میرے سوا اوروں کی نظروں سے اوجھل تھی، جسکی روشنی اس کی شہادت کی شان اور اس کے فن کی شعاعوں سے مل کر ایک عجیب آمیزش پیدا کر رہی تھی، میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کن کن خوبیوں سے فینتشیلو نے حقائق اور عجائب کی گنجائش اپنے اس شدید مسخرہ پن میں ایک ہی جگہ پیدا کر لی، ہمارا قلم کانپ جاتا ہے، اور ہماری آنکھوں میں جذبات جاوید کے آنسو بھر آتے ہیں، جب میں اس ہونے والی شام کا تذکرہ تم سے کرنا چاہتا ہوں، فینتشیلو نے آخری اور قطعی طور پر یہہ ثابت کر دیا کہ فن کا نشہ اور دن سے کہیں زیادہ گہرا پردہ ہو لناکیوں پر ڈالتا ہے، ماہرین فن قبر کے کنارے

بھی تمسخر میں شدید لطف لیتے ہیں جبکی مسرت قبروں کو دیکھنے بھی نہیں دیتی، ساتھ ساتھ ان مسرتوں میں وہ کچھ ایسے کھو جاتے ہیں کہ موت اور بربادی کا وہم بھی ان کے ذہن میں نہیں آتا ۔ سارے تماشائی، آسودہ یا تشنہ کام، اس فنکار کی قدر کے دلدادہ ہو چکے تھے. کسی کے ذہن میں بھی موت' مصائب' اور آلام کی گنجائش نہ تھی، ہر کس و ناکس اس ماہر فنکار کے زندہ شاہکار کے لذائذ میں محو تھا، جوش مسرت کی لہریں بار بار [illegible] عمارت کی بنیاد کو گرمجوشی سے جھکولے دے رہی تھیں، خود مسرت سے سرشار ولیعہد کی صدیے [illegible] اور بادل کی بازگشت میں شریک تھی، پھر بھی دور بین نظروں میں اس کا لشتہ کسی اور ملاوٹ سے [illegible] تھا، کیا وہ اپنی جبروت میں کسی طرح کی شکست محسوس کر رہا تھا؟ کیا اسے اپنے جذبۂ دل آزاری اور [illegible] میں اسی طرح فروتنی کا احساس تھا کیا اس کی امیدیں یاس سے بدل چکی تھیں اور اس کے ارادے [illegible] پہلے تھے یہ قیاس آرائیاں نہ تو پا مکمل تھیں اور نہ قطعی طور پر بے جا، میرے ذہن میں ہو رہی تھیں اس [illegible] ولیعہد کی صورت دیکھ رہا تھا، اور دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کی فطری ملاحت پر ایک خاص رنگت طاری ہو رہی ہے جیسے برف کی رنگت اولوں کی شکل میں ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونٹھ سخت سے سخت تر ہو گئے، اس کی آنکھیں حسد و کینہ کی داخلی آگ سے جل اٹھیں، اسوقت بھی وہ اپنے پرانے دوست اس عجیب و غریب فنکار کی اداکاریوں کی داد دے رہا تھا، اور وہ نہایت تیزی اور کامیابی سے اپنی موت کا مذاق اڑانے جا رہا تھا، پھر میں نے ولیعہد کو اپنے ایک خواجہ کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا جو پاس ہی کھڑا تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے کانوں میں اس سے کچھ کہا بھی، اس نوخیز کے چہرے پر [illegible] ایک لہر دوڑ گئی، اور وہ مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے کسی فوری حکم کی تعمیل کرنی ہو۔

چند لمحے کے بعد ایک اونچی سنسنی خیز چیخ نے، فینشیلو کے کامیاب ترین لمحے میں جھیر ڈال دی اس کے دل و دماغ میں انتشار پیدا کر دیا اور پھر اسی طرف سے جہاں یہ خلاف قیاس بدنما صدا کے نفرہا بلند ہوئی تھی، ایک نوخیز تیزی سے رہگذر کی طرف بھاگ رہا تھا، فینشیلو یکایک چونک اٹھا جیسے کسی خواب سے اس نے آنکھیں جو یکایک چمک سے خیرہ ہوگئی تھیں بند کرلیں، وہ منہ پھاڑ پھاڑ کر ہانپ رہا تھا۔ اس کے پیروں کو لغزش ہونے لگی، وہ پتھر کی طرح سرد اور مردہ اسٹیج پر گر پڑا، کیا اس چیخ کی تیز دھار سفاکی میں جلاد سے بھی زیادہ تھی کیا ولیعہد نے خود اس خون کی ساری سازش تخلیق کی تھی؟ ایسے شبہات کی گنجائش نہ تھی کیا واقعی اپنے بے نظیر دوست فینشیلو کے لئے ملول ہوا، ایسے عقیدے خوشگوار ہیں، ان شریف مجرمین نے آخری بار تمسخر کی اداکاری کے کمالات دکھائے اور اسی رات حرف غلط کی طرح صفحہ حیات سے مٹا دئے گئے، جب سے اور اور جگہوں سے مشہور بہروپیے دربار میں تمثیلوں کی نمائش کے لئے آتے رہے، لیکن کوئی بھی فینشیلو کے حیرت انگیز کمالات کی یاد نہ تازہ کرسکا، اور نہ اس پایہ کی مقبولیت تک پہونچ سکا۔

(ترجمہ)

ظفر احمد

# شکایت

وہ نازنیں کہ جس کی متانت میں شوخیاں — اور شوخیوں میں جس کی متانت ملی ہوئی

گیسو کہ جن پہ شب کی سیاہی کا ہو گماں — رخ، ریشم و رنگ جس میں ملاحت ملی ہوئی

جسمِ گداز خرمنِ نسرین و نسترن — ابرو نہیں، کمانِ فراست ملی ہوئی

ملبوس مشتری کی دُلائی سے خوب تر — ہر ہر ادا میں روحِ نفاست ملی ہوئی

وہ قہقہے کہ ساغر و مینا ہوں لاجواب — اور مسکراہٹوں میں نزاکت ملی ہوئی

آنکھوں کی روشنی میں ذہانت کی جھلکیاں — سنجیدگی کے ساتھ ظرافت ملی ہوئی

رُخسار سے نیاز کی شادابیاں عیاں — سطحِ جبیں میں ناز کی رنگت ملی ہوئی

میرے مشامِ جاں نہ معطر ہوں کس لئے — ہے زلفِ یار میں تری نکہت ملی ہوئی

اِک بات پوچھتا ہوں خدائے جمال سے — لہجہ میں ہے اگرچہ شکایت ملی ہوئی

سینہ میں ہر گلاب کے "کانٹے" کا دل یہ کیا؟ — بوئے جفا بحدِ نہایت ملی ہوئی

ظاہر کی ناز کی مری نظروں کو دے فریب
دِل کی سرشت میں ہو شقاوت ملی ہوئی

خورشید الاسلام

# چند غیر مطبوعہ خطوط

ذیل میں وہ چند خطوط درج ہیں جو سر سید احمد، مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی نے مولانا اشرف علی صادقپوری اور شمس العلماء مولانا امجد علی صادقپوری کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ یہ خطوط اب تک شایع نہیں ہوئے ہیں۔ میں جناب سید احمد جعفری اور جناب سید حامد جعفری کا نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے اِن نایاب خطوط کے شایع کرنے کی اجازت مجھے دی۔

مولانا امجد علی صاحب مرحوم کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ آپ مولانا یحییٰ علی مرحوم صادقپوری کے بیٹے تھے۔ آپ عربی میں ایم۔ اے تھے۔ بنارس۔ علیگڈھ اور الہ آباد کے میور سنٹرل کالج میں پروفیسر رہے۔ آپ کو عربی زبان پر اسقدر عبور تھا کہ آپ عربی میں فی البدیہہ بات چیت اور خط و کتابت کرتے۔ آپ کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد قرآن شریف کا حفظ کیا۔ آپنے ۲۱ ربیع الاوّل ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء بوقت ۶ بجے صبح انتقال کیا۔

**محمد سلمان صدیقی**

(۱)

مخدوم و شفیق من مولوی سید اشرف علی صاحب ایم۔ اے

بوقت مراجعت پٹنہ سے آپ ضرور مجھسے ملتے جائیے گا۔ ایک امر آپ سے کہنا ہے اور بغیر زبانی کہے طے نہیں ہو سکنے کا۔ مولوی امجد علی صاحب کو شادی کی مبارکباد دیتا ہوں معلوم نہیں کہ آپ کو بھی دوں یا نہیں۔ یہاں سب دوست منتظر ہیں کہ مولوی امجد علی صاحب تشریف لاکر بہت بڑی دعوت شادی کی تقریب میں کرینگے۔ مولوی محمد حسن صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ مولوی امجد علی صاحب کی خدمت میں بشرطیکہ ان کا ارادہ علیگڈھ میں آکر دعوت کرنے کا ہو، سلام

والسّلام خاکسار

سیّد احمد

علیگڈھ ۶ جولائی

(۲)

مولانا (۱)

آپ کے فضل و کمال کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا۔ باوجود اس کے میں نے انجمن اُردو میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس طرف آپ کے میلان کا

(۱) مولانا شبلی نعمانی

کوئی ذکر نہیں سُنا تھا۔ آج ایک صاحب کے خط سے کچھ امید بندھی تو یہ عریضہ لکھتا ہوں،
رو داد انجمن ارسال خدمت ہے۔ سب سے بڑا کام لغات علمیہ کا ترجمہ ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا نے
سات جلدوں میں سائنٹفک لغت تیار کرلیا لیکن ہمارے ہاں کون کرے۔ انگریزی داں عربی
سے کورے ہیں و بالعکس۔ مصطلحات کلسٹر الگ چھپوا لئے ہیں وہ بھیجتا ہوں۔ کیا آپ اس کا
کوئی حصہ ترجمہ فرما دینگے؟ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق کا جو انگریزی
میں ترجمہ ہوگئی ہے۔ ترجمہ کیا جائے تاکہ موازنہ ہوسکے کہ مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا،
دوسرا کام میں کردونگا۔ لیکن کیا آپ پہلا کام کر دینگے۔ غرض آپ اس مد میں جو کچھ کرسکیں اس سے
مطلع فرمائیں۔

شبلی حیدر آباد ۴ مئی ۱۹۰۲ء

(۳)

جناب مولانا مولوی سید امجد علی صاحب ایم۔ اے

آپ کا نامہ عنایت اگرچہ دل خراش[1] تھا جو کچھ مصائب و ترددات و پریشانی کا ذکر فرمایا
سب بجا ہے۔ بہرحال "از تن برضائے قضا دادن چارہ نیست" قبل آنے عنایت نامہ آپ کے تاریخ
(کرم خوردہ) مقرر ہوچکی ہے (کرم خوردہ) ۲۱ رجولائی روز یکشنبہ معلوم نہیں کہ آپ کی حالت کے مناسب ہے
یا نہیں بہرحال یہ تاریخ مقرر ہوگئی۔ کاغذات معمولی چھپ گئے ہیں۔ دو تین روز میں روانہ ہونگے

والسّلام، خاکسار سید احمد علیگڈھ ۸ر جون ۱۸۹۴ء

محمد موسیٰ[2] کا حال معلوم نہیں کس طرح ہے اور آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔

(۴)

مخدومی مکرمی مولوی سید محمد امجد علی صاحب

۲۱ رجولائی کو (کرم خوردہ) کا اجلاس ہوگا۔ اُمید کہ آپ اُس میں شریک ہونگے۔ مگر اب تک
آپ نے اطلاع نہیں دی کہ کس وقت اور کس تاریخ آپ تشریف فرما ہونگے۔ اگرچہ وقت
اجلاس گیارہ بجے لکھا گیا ہے مگر ہم ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کریں گے تاکہ دہلی سے جو لوگ
آنیوالے ہیں وہ بھی آجادیں۔

والسّلام۔ خاکسار، سید احمد، ۱۷ر جولائی ۱۸۹۴ء

---

[1] اگست ۱۸۹۴ء میں مولانا امجد علی مرحوم کے دو جوان بیٹوں اور دو بیٹیوں کا تین دن کے وقفہ میں بعارضہ ہیضہ انتقال ہوگیا تھا۔ سرسید کا اشارہ اِس المناک واقعہ کی طرف ہے۔

[2] مولانا موصوف کے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں۔ اس وقت آپکی عمر ۸۶ سال ہے۔

(۵)

مخدومی مکرمی مولوی سید امجد علی ایم - اے -

میری چٹھی پہونچنے کے بعد مسٹر تھیبو[1] پرنسپل کالج نے کیا کہا۔ میری رائے جو اُردو میں چھپی ہوئی ہے اس کو کس سے سنا اور (کرم خوردہ) یا یونہی ڈالدی - اگر آپ ازراہ مہربانی بقیہ سو روپیہ اپنی بخشش کے اسی مہینہ میں بھیجدینگے تو میں آپ کا نہایت ممنون ہونگا۔

والسلام

علیگڈھ ۴ر اکتوبر ۱۸۹۶ء

خاکسار سید احمد

(۶)

آگرہ ۱۱ر جنوری ۱۸۹۶ء

میرے مکرم اور معظم عنایت فرما

میں نہایت خوشی سے آپ[2] کو شمس العلما کا خطاب پانے کی مبارکباد دیتا ہوں اگرا ایسی سطری مبارکباد سے کچھ کام نہیں چلتا۔ آپ کے دوستوں کو ضرور ہے کہ عام جلسہ خوشی کا کریں۔ ڈنر ہو۔ اسپیچیں ہوں لیکن افسوس کہ میں وہاں موجود نہیں ہوں۔ لہذا اسی خط مبارکباد پر اکتفا کرتا ہوں۔ بڑے دن میں برابر بیمار رہا اور سخت۔ اس سبب سے نہ مل سکا

خادم و معتقد

اکبر حسین

---

[1] پرنسپل میور سنٹرل کالج الہ آباد یہ سنسکرت زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔
[2] شمس العلما ر مولانا امجد علی صاحب۔

# جنگنامہ۔ ایک کمیاب ہندی منظوم تاریخ

(۵)

گو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب سری دھر نے اپنے نتائج فکر جنگنامہ اور دیگر متعدد تصانیف کی شکل میں پیش کئے سیاسی اعتبار سے کچھ سراہنے کے قابل نہیں اسلئے کہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے جو اس بات کی خبر دے رہے تھے کہ مغل اعظم کی ہندوستان گیر سلطنت کا شیرازہ بہت جلد بکھرنے والا ہے لیکن ہندو مسلمان کے باہمی تعلقات کی وہ خوشگوار فضا جس سے ایک ایسی زبان کی تخلیق ہوئی جو دونوں قوموں کی مشترکہ تمدن کی مایہ ناز یادگار رہے ابھی ناپید نہیں ہوئی تھی وہ مبارک تھا وہ دور جب ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگم ایک متحدہ قومیت کا بیج بو رہا تھا۔ جب مسلمان اپنی زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے اسے شوق و محبت سے بولتے تھے۔ اس میں رسالے اور کتابیں لکھتے تھے جب ہندوں کے طبائع کا عام رجحان اس حد تک تغیر پذیر نہیں ہوا تھا کہ اُن کا جذبہ تنفر کل اسلامی اثرات کے بائیکاٹ کی شکل اختیار کرے۔ جب فارسی و عربی الفاظ خالص ہندوستانی زبانوں مرہٹی پنجابی اودھی برج بھاشا کی تصانیف میں بکثرت دانستہ و نادانستہ طور پر داخل کئے جا رہے تھے۔ جب زبان کے معاملہ میں تنگی رونما نہ ہوئی تھی جب ادبیات کا ایک ایسا سلسلہ جاری تھا جس میں ہندو مسلمانوں کی مدح سرائی کو ننگ نہیں سمجھتے تھے اور اسلامی موضوع پر کتابیں لکھتے تھے اور مسلمان خالص ہندوانہ مباحث پر اپنے قلم کو جولاں کرتے تھے اور جس میں ہندی اور اسلامی الفاظ محاورات خیالات کے بالقصد ازالہ و اخراج کی مذموم تحریک جاری نہیں ہوئی تھی، جب ہندو مسلمان لسانی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہے تھے تلسی داس جی کو تو جانے دیجئے کیونکہ یہ اکبر اعظم کے ہم عصر تھے اس لئے اگر نہ صرف ان کی مشہور مقدس کتاب رام چرتر مانس بلکہ "بنے پتریکا" میں بھی جس میں انہوں نے اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر اپنے مالک سے دعائیں مانگی ہیں اور دل کھول کر رکھدیا ہے۔ خالص عربی و فارسی الفاظ مثل وسیلہ داد وغیرہ بلا تکلف استعمال کیا ہے لیکن بھوشن جنہیں شیوا جی مرہٹہ کا مداح اور ہندو جاتی کو اپنی ولولہ خیز نظموں سے ذریعہ بیدار کرنے والا بھی ان الفاظ کا جنہیں اسلامی کہا جاتا ہے ترک کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ولانکر نے مرہٹی زبان پر فارسی کے اثرات کے عنوان سے تو ایک مستقل رسالہ ہی پیش کر دیا ہے۔ حالانکہ مرہٹوں کا مذہبی غلو اور اسلامی حکومتوں کی ان کے ہاتھوں تباہی و بربادی سب کو معلوم ہے جہاں تک سری دھر کے ہم عصروں کا تعلق ہے۔ اگر ہم ایک طرف تلسی داس کی ہندو [illegible] ذاتی اور تاریخی نظموں بالخصوص گورنمنٹ کی پالیسی پر نظر کرتے ہیں تو دوسری جانب متعدد اہل قلم اور شاعر [illegible]

ہوتے ہیں جو اپنے کلام میں مسلمانوں کی تعریفیں کرتے اور فارسی و عربی الفاظ بکثرت اور بلا تامل لاتے ہیں
اس ضمن میں ایک شاعر گنجن نامی کا ذکر ہمارے خیال کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے یہ ذات کا برہمن
گجراتی مسل اور کاشی بنارس کا رہنے والا تھا اس نے ایک کتاب "کمرالدین کھاں ہولاس" کے نام سے
سمبت ۱۷۸۶ء یعنی ۱۷۲۹ء میں تصنیف کی جس میں قمرالدین خاں اعتماد الدولہ اول یعنی محمد شاہ
رنگیلے کے تورانی وزیر اعظم کی مدح سرائی کی ہے ایک جگہ شاعر اپنے ممدوح کے محل، جھروکوں روشنی
مسند و قالین کے متعلق کہتا ہے ؎ بنا کے جس پر زر باف در پردہ ہیں جلتی ہنڈوں (فانوس) میں
روشنی چراغ کی + گل گلی گلیم گرک زرق آب پگ (یعنی ہیرا) ہوت + جہاں بچھی مسند لالن (لعل)
کے دام کی + رتی رتنی، جھنا ب موکھی، کھچت (آراستہ) جواہرن + گنجن سو (اچھا) کبی کہیں پوری
اپکلی رنگ (پریم) کی + اعتماد الدولہ کمرالدین کھاں کی مجلس سی سرد (جاڑا) میں گرمی (گرمی)
بہار بھی بھاگ کی دبڑی خوش قسمتی) ان اشعار میں جتنے الفاظ اشودھ بولیوں کے مستعمل ہوئے ہیں
ان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اب نہ ایسے مداح ہیں اور نہ ایسے ممدوح۔ اس مختصر اقتباس میں
علاوہ فارسی و عربی الفاظ کے کھڑی بولی کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حالانکہ کتاب کی زبان برج بھاشا
کھڑی بولی برج بھاشا پر غالب نظر آ رہی ہے

تقریباً یہی حال جنگنامہ کی زبان کا بھی ہے جیسا کہ ہم کسی جگہ پیشتر عرض کر چکے ہیں سری دھر نے
خاص عربی و فارسی الفاظ بکثرت اپنی کتاب میں استعمال کئے ہیں یہ الفاظ مفرد بھی ہیں اور مرکب بھی اپنی
اصلی صورت میں بھی منظوم ہوئے ہیں اور خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بھی علاوہ اُن الفاظ کے جن سے
دنیائے اُردو کافی روشناس ہے لیکن جو ہندوستان کی قدیم زبانوں کی صدائے بازگشت ہیں سری دھر
اپنی نظم میں تقریباً ہر جگہ اور بلا تکلف ایسے الفاظ بھی لاتا ہے جنہیں موجودہ ہندی دنیا کے ایک خاص لیکن
روز افزوں گروہ کے نزدیک درجہ قبولیت شاید حاصل نہیں حالانکہ ہمارے شاعر کے لیے یہ روزمرہ کا
حکم رکھتے تھے۔ اتمام۔ ماہرو۔ شہادت۔ حریف۔ گریباں۔ اعتبار۔ حضرت۔ شاہنشاہ۔ سیاہ رو
گمراہ۔ دلسوز۔ جانباز۔ زیب۔ صدر الصدور۔ بخشی۔ سرکش۔ عظیم۔ سمند۔ الست۔ مغرور۔ منصوبہ
منصب غضب۔ رفیق۔ عماری۔ تفنگ۔ بخت۔ ترکش۔ شمشیر۔ نقارہ۔ فتح۔ خویش (داماد) قاصد۔ تجویز
عنایت۔ ولی عہد۔ عمر خاں۔ سرخرو۔ بے شمار۔ آبرو۔ غنیم۔ سراپا۔ مقام۔ مجلس۔ اقبال۔ کرم۔
ہم دست۔ ہمراہ۔ وطن۔ بیشمار۔ شامل۔ غافل۔ یلغار۔ غدار۔ مغرور۔ بندگی۔ خطاب۔ صف جنگ
تعنایت۔ نیک نام۔ ملازمت۔ شتاب۔ آتش۔ غلبہ۔ نیک قدم۔ قائم پائدار وغیرہ۔ ان الفاظ
سے سری دھر کی نظم بھری پڑی ہے۔ اب آئیے اس زمین کے رہنے والے برہمن راسخ العقیدہ
ہندو سنسکرت کے عالم اور بھاشا کے مسلم الثبوت شاعر کی عام فہم زبان پر ہم نظر کریں گے (۱) تلسی کہیو عبد اللہ

کہاں گلہ بھیو اوت داودھر، شاہ کا + پاؤں جواب میں نیاک (کچھ) ہوں کری حکم شاہنشاہ کا + اکبال پھرک سیر کو دسے، ارد داور، کرم اک اللہ کا رن ووری توڑوں اجو ہیں (آج ہی) بسل موج دین کی باہنہ کا۔ یعنی عبداللہ خاں نے ہنس کر کہا کہ اودھر کے بادشاہ نے غلبہ حاصل کر لیا ہے (تو کیا) اگر میں شاہنشاہ کا ذرا بھی حکم پاؤں تو فرخ سیر کے اقبال اور اللہ کے کرم سے آج ہی میدان جنگ میں دوڑ کر معز الدین کے بازوں کی قوت توڑ دوں۔ اس میں اوت۔ نیاک۔ ہوں کے علاوہ کل الفاظ آسان ہیں۔

(۲) سُرکھر د آپ بھیو۔ آبرو۔ دلیس پایو + ماہرو رپہیاک (رفیق) بھیو کھالف (مخالف) سیاہ رد۔ اس میں صرف دلیس کا لفظ محتاج تشریح ہے یہہ مرکب ہے دلی اور سنسکرت "ایش" یعنی مالک سے

(۳) دن اور سے (دوسرے دن) کتب الملک بولے بولائی صاحب رائے سو (کو) + لکھ عرج شاہنشاہ کو سب بھید بات بتائی سو + بھائی حسین علیہ کہاں، لکھو سب سمجھائی سو + جے ہیں۔ آئے۔ ایہاں ایلکار پھونچے ساج پھوج او پائی سو

(۴) پھر سیپھد الدین (سیف الدین) علی کھاں پھنع (فتح) کئے آئے جھپئے + آئے سبھے سردار نجم الدین علی کھاں سنگ ساتبئے (تب)

(۵) کہوں لرت سید باربا ہتی (مالک)، رتن چند کھوں لڑیں + کھون لرت برکنداج د برقنداز) کہاں کہوں، نرحسن کہاں اڑیں

(۶) ہسبح عنایت اللہ کھاں جہاں + شجاع شجاعت اللہ کھاں کھاں۔

(۷) مجموں سنی تجویز کر لی کری + پھری (پھر) اپنے کر (ہاتھ) لیو یہاں صرف کر سنسکرت کا ایک لفظ ہے جس سے ہم آشنا نہیں

(۸) موج دین کے ایسے ہوتے اعتباری امرائی + حجرتی کے اکبال سوں سکے نہ رن ٹھرائی۔

ممکن ہے کہ یہہ چند اشعار جو مختلف مقامات سے لئے گئے ہیں مستثنیات میں شمار کئے جائیں لہذا ہم ہندی نسخے کے گیتا چھنڈ سے چند مسلسل ابیات کو نذر ناظرین کرکے لفظوں کے اعتبار سے انکا تجزیہ کرتے ہیں ملاحظہ ہو نا اصل جہاندار شاہ کی محفل کا ایک ایسا مرقع جسکی حقیقت تاریخی اوراق سے بھی واضح ہوتی ہے اور جسے شاعر نے قطب الملک کے کایستھ گماشتہ شیرومن داس متوطن سانڈی کی زبان میں پیش کیا ہے سے ات (یہاں) موج دیں مگرور مست لست عملیں کھائی کے + سیگرے (سارے، کلاونت) بھئے امیر بھرے رہے چت (من) چاہی کے + آوے نہ آدے مننھی من بھولے رہیں اک بھائی سے + ماہی مراتب علم۔ پنجہ توگ (تیغ)، نوبت پائی کئے + وارد سو وارد بھرت گولی عمل گولی رنگ کی مرونگ ڈھولک توپ اور سرنائی ریت (طریقہ)، تو پھنگ (تفنگ) کی + پیارہ پلیتہ (فلیتہ) سو بھری کے تہاں جیتی موجیں بھنگ کی + دن رات یہ ہی چرچا رہے تت بسرا اور نہ جنگ کی سب کمل لوچن (آنکھ) دکھ موچن (مٹانے والی)، کام روپ اگو ہرا (پیش پیش) + اتی (بہت) چتور۔ نیرت (رقصان)

کوئی صورت پناہ کی نظر نہیں آتی ... ایک روز معز الدّین بیٹھا ہوا شراب کی موجیں اڑا رہا تھا اور نہایت خوش تھا اور پھول کر حکم دے رہا تھا کہ نوروز کی تیاریاں کیجائیں کہ اس اثنا میں خبر پہونچی کہ فرخ سیر قنوج تک پہونچ گیا اور اعز الدّین مع ساری فوج کے بھاگ نکلا - اعز الدّین کے جنگ سے فرار اور اس کی کل فوج کی پسپائی کو سنتے ہی معز الدّین کی مجلس پر رنج و اندوہ طاری ہوگیا۔ جن کے منہ میں پان کے بیڑے تھے وہ زہر معلوم ہونے لگے اور گیت گالیاں ہوگئیں نازک اداؤں کے صاف و شفاف جسموں کی لالی زائل ہوگئی - تدبیریں سوچی جانے لگیں غم و غصہ کی لہر اٹھی کہاں تک قصہ کو طول دیا جائے ساری باتیں اور طریقے نئے نئے تھے جو ہوا کرتے ہوئے کلاونت [illegible] سے عورتوں پر بے ہوشی طاری ہوگئی ڈھولوں کی آواز اور گھونگروں کے تال کی کسی کو سودھ بودھ نہ رہی شراب کا سب نشہ ہرن ہوگیا اور آدھی آدھی دہی دئی کی رٹ لگ گئی -

مندرجہ بالا اشعار سے سری دھر کا شاعرانہ کمال قوت بیانیہ دلاویز طنز اور حقیقت شناسی کا کس حد تک اظہار ہوتا ہے ہندی کی رزمیہ شاعری کے متعلق ایک کتاب "بیر کاویہ سنگرہ" نامی الٰہ آباد سے تقریباً دو سال ہوئے شائع ہوئی۔ ناچیز اپنے فاضل دوست پروفیسر جگن ناتھ رائے کا شکر گذار ہے کہ موصوف نے نہ صرف اس کتاب کی طرف توجہ مبذول کی بلکہ اپنے مفید مشوروں سے اس مقالے کی آخری قسطوں کے لئے کچھ مواد فراہم کرنے میں امداد کی بہرکیف اس نئی ہندی کتاب کے مصنفین بابو بھاگیرتھ پرشاد دکشت اور بابو ادنے نرائن تواری نے جنگنامہ پر بھی نظر کی ہے اس میں سے کچھ انتخاب اپنی کتاب میں درج کیا ہے مندرجہ بالا اقتباس کے سات مصرعوں کو خاص جگہ دی ہے اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

[illegible] کا اتنا [illegible] کرنے میں بہت کم کوی [illegible] ہوئے ہیں' یعنی خوف کا ایسا عمدہ نقشہ کھینچنے میں بہت کم شاعر اس طرح کامیاب ہوئے ہیں ان اشعار میں کئی باتیں جاذب نظر ہیں لیکن ہمیں تو ان شاعر کی لسانی خصوصیات کو واضح کرنا مقصود ہے۔ ان اقتباس میں خالص سنسکرت کے الفاظ بنا کر ہیں چیت - سو - دیپتا - کمل لوچن - دکھ موچن - شمبھو - چھتو - آتی - گننی - نول - انوراگ - سکھ اور [illegible] - ہی تعداد تقریباً فارسی و عربی الفاظ کی بھی ہے جنہیں گنانا ضروری نہیں۔ برج بھاشا کے تحت حسب ذیل الفاظ لائے جاسکتے ہیں - سیگرے - کلاونت - جیسے پائی کے آدے [illegible] - [illegible] - [illegible] - پائی گئے - [illegible] - ایسان - [illegible] - [illegible] - [illegible] اور [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] - کلاونت - [illegible] [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] [illegible] - [illegible] [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] - [illegible] کی ہیں اور ان کی تعداد

برج بھاشا سے تقریباً سوائی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چند اور مقامات سے اشعار دے کر انکا تجزیہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ نومار۔ چھنڈ کے ۱۰ مصرعوں میں جو اس مقالہ کی تیسری قسط (معام جون سنہ ۴۲ء صفحہ ۱۳۱) میں درج کیئے جا چکے ہیں (۱) ہمیں کری۔ دھری۔ بیٹھو۔ راکھن۔ لو۔ پھونچو۔ ہوپ (۷) برج بھاشا یا اودھی اور پربیھم کوپ۔ پایاں۔ اودار۔ رن۔ بانکورا۔ بلواں (۷) سنسکرت اور وقت۔ حکم۔ تخت شاہ دلسوز۔ فوج۔ ارشاد۔ عمل۔ سرکار۔ قائم (۱۰) فارسی و عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح ہرگیتا چھنڈ کے ۳۷ مصرعوں (۹۴ - ۱۱۲) میں ہمیں کھڑی بولی کے ۲۲ سنسکرت تت سم و تدبھو کے ۴۳ برج بھاشا کے ۴۴ اور اسما کی تعداد ۲۵ ملتی ہے۔ بیلاس چھنڈ کے چند مصرعوں میں (۲۱ - ۹۱۸) سنسکرت تت سم و تدبھو کے ۸ اور کھڑی بولی اور فارسی کے ۱۱ اور برج بھاشا کے ۷ الفاظ آئے ہیں۔ اشعار طوالت کے خیال سے نظر انداز کیئے جاتے ہیں۔ اس تجزیہ سے جنگنامہ کی لسانی حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

برج بھاشا اور کھڑی بولی دونوں ہی ہیں ہندسے دیئے گئے ہیں۔ ایک۔ اک۔ دو۔ دواو۔ دوئے۔ تین۔ تینھوں۔ تینی۔ چو۔ چھوں۔ چاری۔ چارئے۔ پانچ۔ آٹھ۔ دس۔ دسھون دساک۔ مختلف مقامات پر مستعمل ہوئے ہیں۔ ایک جگہ فارسی 'نہ' سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ مثلاً دہ ئے لاکھ یہ نہ ہزار پوت۔ ٹھرائی کے۔ ایک جگہ ساتوں کا استعمال کیا ہے ۹ سری دھر تماہی بھر اسیر ساتوں دیپ سرحد ہند کی ملا یو تھے۔

شاعر نے اکثر شعر کا وزن درست کرنے کے لئے الفاظ تلفظ کو بگاڑ ڈالا ہے اور انکی صورت بدل دی ہے۔ مثلاً کھوج (خواجہ) سید (سید)، موج دین (معزالدین) ایجودین (معزالدین) شجاعتی (شجاعت) حسین علیہ کہاں۔ بعض نام تو اس قدر مسخ شدہ صورت میں پیش کئے ہیں کہ انکی صحیح شکل ذہن میں نہیں آتی۔ جیواج۔ کہاں۔ عبدالغفار کو ابو الگفار اور غازی الدین حیدر فیض خاں (ریاست حیدر آباد) کو چیلیکچ کہاں لکھا ہے۔ پھر یہاں پھینوج کر۔ بھتیج داں۔ بھنوجنی حریھین تیت بیر پات شاھفی کی انوکھی ترکیبیں اکثر جگہ پائی جاتی ہیں۔ سری کا تعظیمی لفظ اکثر مسلمانوں کے نام کے شروع میں آیا ہے۔

بعض اوقات خالص سنسکرت کے مختصر الفاظ نہایت خوبی سے منظوم ہوئے ہیں مثلاً ۲۵۹ میں انت پتر۔ راجت۔ اندرا سی۔ پرھوتا براجت۔ کبھی کبھی متروک سنسکرت الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے جیسے ۱۱۵ میں دردھر (بھیانک) جو دراصل ددر دھرش ہے کہیں کہیں بے معنی الفاظ بھی آئے ہیں لیکن اسکی جو مثال مصنفین ویر کا دیہ سنگرہ نے دی ہے۔ صحیح نہیں کٹاری (؟) کراکری تراتری تیہر کی۔ کٹار کی کرکراہٹ اور تیروں کی ترتراہٹ سے ایک مضمون پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر ہندی شعرا کی طرح مصنف جنگنامہ ضائع بدائع کا

اکثر استعمال کرتا ہے ۔ ایک خاص صنعت جسے ہندی میں انوکرن واچک اور انگریزی میں Onomatopoeia کہتے ہیں اور صوتی تکرار کی متعدد مثالیں جنگنامہ میں ملتی ہیں۔ راقم السطور نے مولانا نجم غنی کی نہر الفصاحت کے اوراق اولٹ ڈالے ۔ لیکن فارسی عربی و اردو کے اشعار سے اس خاص صنعت کی مثالیں نہیں ملیں، حالانکہ فردوسی و نظامی کے کلام میں ایسے الفاظ جنکی ساخت اور صوت سے ان کے معنی اور صفات کا اظہار ہوتا ہو مفقود نہیں۔ جنگنامہ میں ایسے الفاظ اور صوتی تکرار کی بہتات ہے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں (۱) دھونسا کی دھوکارنی ۔ دھکمکی اٹھی دھرتی (۲) دھمک سوں دھمکیں دھرا (۳) ڈھینگت ڈھول کی لاگا چھپ جھرا نوگٹ پیٹ اودھرکی سلیتا رخون) بڑھی تکرار اصوات کی تو جنگنامہ میں بہتات ہے جیسی چھپا (ابیات ۱۳۴) میں سنجوگت انکچھر (اتصال حروف) کی مثالیں بے شمار نظر آتی ہیں (۵) سرسوں ۔ تتر ونت (خون) دھار ۔ منہ ہوں ۔ پہاڑ یوں جھرنا جھرے (۱۴۰) یعنی سر سے خون کی دھار بہہ رہی ہے ۔ جیسے پہاڑ سے جھرنا جھرنے ۔ (۱) چھہ ۔ چھہری برچھہ ۔ جہہ بی زر ۔ سود چھہ ۔ چھہ لکت ۔ کوپ پہ تب ۔ پکری ۔ پیا ایک ۔ یہ بہی کہن دھوندہ دھلکت (۲) تے ہاں رنگ رتے ہیں ورتتے رن میں چھتے جے نباہیں + باتی مدمتے ۔ گھمرتے ۔ مدپرکتے پرائیں یعنی وہ بہادری کے رنگ میں مست رنگ گئے ہیں اور جو رن میں فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں جوش میں بھرے ہوئے ہیں ہاتھی متوالے ہوئے ہیں اور گھاؤ کھا کر (ملار) جولاتے (برساتے) ہوئے بھاگے جاتے ہیں یہاں رنگ رتے ۔ تتے چھتے کے الفاظ قابل غور ہیں (۳) گرھی ۔ جبر ۔ منتر کرے ۔ تھہتر برسے و یرتھ دتھہ دتے + اوبھی ستھہ باد بسمہتہ ہے ایک متھ گئے بن جھتہ دھے یعنی توی ہیکل ہاتھیوں کو لے کر جو جنگ کر رہے تھے وہ بغیر ہتھ کے ہوگئے اور حالت دگرگوں ہوگئی اور جوز بردست ہاتھیوں کے سہارے قوی ہیکل گئے تھے بغیر سر کے ہوگئے ۔ صنعت ذومعنیین کی مثالیں ہم اس کتاب میں اکثر جگہ پاتے ہیں (۱) اوت (اودھر) ہی اونکو کہاں دورا ۔ ایتہ (ادہر) ہی ہجی یہ کہاں دورا رخاندوراں ، دستگ کینک کہاں دورا + منہ موا انو) اُن کو کہاں دورا ۷۶ ۔ ۳۰ ، ۴ ۔ (۲) تب جلفکار (ذوالفقار) گہہو رکپڑا) مہابل جلفکار امتیبکر ۔ جھمکی دو دھاتی ۔ سار سار وودار دھیبریں دھیرسے ۔ یعنی تب بہادر امیر ذوالفقار نے ذوالفقار پکڑا اور اس کو چلایا ۔

نُزری دھرکو زبان پر بڑا قابو ہے تشبیہات و استعارات صنائع بدائع سے اسکی کتاب مملو ہے گو نازک خیالی اور بلند پروازی کی مثالوں سے جنگنامہ خالی نہیں لیکن نُزری دھر خیالات سے زیادہ زبان کی نفاست اور صنائع بدائع پر زیادہ متوجہ ہے اس کے بیان میں تسلسل شگفتگی واقعیت اور تکمیل پائی جاتی ہے یہ جس چیز کا ذکر کرتا ہے ۔ اس کے متعلق بہت معلومات پیش کر دیتا ہے ۔ اس کی زبان قواعد سے انحراف نہیں کرتی گو "نگی ملکھہ بیہش سی" اور گیت گا رہی سی لگی" میں لکھہ اور گیت کو موجودہ قواعد کے خلاف اس نے ۔

انھیں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور انکی مانگی چال چھوٹ گئی ان کے تلوے زخمی ہوگئے۔ ہوش غائب ہوگئے
اصیل فصیل عورتیں اور سہیلیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پکاریں کہ اے خدا تو نے ہمیں
کس آفت میں ڈالدیا انکا گلا بھر آیا۔ گاہ جھانکتی ہیں گاہ جھجھکتی ہیں غصہ میں آپے سے باہر ہو رہی
ہیں اور سب کی سب معزالدین کو آنکھوں میں آنسو بھر کر کوس رہی ہیں۔

**لوٹ اور آتش زنی کی کیفیت** ۲۴-۶۱۰ میں بیان کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎
جہ ہوں سُنج لو نجالی (لے) آگی لائی + مہابھیم (بیتھاک) پھیلی دھوان کی اندھیاری + کہوں بانس کی
گانٹھی پھوٹیں ٹپاک کیں + چٹاچٹ پا کہاں بھاری ٹپاک کئیں..... کھوں ہوت موتی و رتن (اچھا) چور
چونا... جریں اور نوٹیں چیر (کپڑا) چیرا (پگڑی) جری (زر) کے + بڑے موٹ کے موٹ لوئیں پر ہی گئے
کیتی تیجریں (تجارتی) ہائے ہائے رٹ لاگی پتنی کامنی دامنی روپ بھاگی (کئی ایک برق وش عورتوں
کی شکل بدل گئی)۔

**گھوڑوں کے متعلق شاعر کہتا ہے** ۶۰-۵۴۵ کچھی پیٹھ پوٹھوں۔ پلے نیر (پانی) راوی + بجے صندلی ادسمندو
مرنگے + کبوتونئے پھولواری سودنگے + سجے اوج سنجاف نیلے ہریلے + موسوئی۔ سنج۔ سنج کلیاں پیلے +
بجے پکھروں ہکرےالکھ گھوڑے + منو بھانوجی (لورج) کے رتھی جوڑ جوڑے سے ہلے چائی سون۔ چنچلے چال بانکی۔
دریائی نوردکی۔ تجلیے عراقی + کریں پون (ہوا) سی پون کی پائداری + ... گرئی۔ گہریلے۔ کھمباری +
بڑے ڈیل کے کان چھوٹے نویلے + سو چوری کھوری چاکری چالو سبنے + بڑے چنچلے بین کے موکھ سانچے
کھوریں۔ بال جھومیں۔ گھنے دوش بانچے۔

**توہمات** (۱) معزالدین کی دہلی سے روانگی اور بدشگونیاں۔ جب سوار ہو کہو دگھٹا گھومری۔
(چھاگئی) بڑے پاھنی (پتھر) گھور ہو + بدشگون لکھی (دیکھ کر) سب کہیں؟ ہیہ کالی کا کوپ غصہ ہو +
داھنے گہر (گدھا) چیلہ سن موکہ (سامنے) بائیں بولیو کاگ ہے۔ اردگئی گاٹی گلی بیلی (بلی) تہت (کہری)
رانڑ (بیوہ) رودت راگ ہے + ات پتھر نشاں کہنڈت (خراب) ڈنڈ (بھالا) بھرم (بہت) اہاگ ہے +
جب سودار موج دین ہو بدشگوں لاگا لاگ ہے + دن گنگک (فوج) مانجھہ (بیں) اولوک (الو)
بولت لوک (ستارے) ٹوٹت رات ہے۔ کھوں سوواں (کتا) رودت موری (لور لگاکر) سوں
کہوں سیار (لومڑی) گن (جھنڈ) پھکرات ہے + مڑرات سر پر گیدھ کے گن یوں بڑھوادت
پات (خلفشار) ہے + دھوے سپاھی سوپن (نیند) میں سب بھاگ گیو بہ ڈرات ہے (۲) شہنشاہ
(فرخ سیر) تب سودن (اچھادن) سو وچھ (خوب) دھری + بسے اور تہل (جگہہ) پیئے پڑا دکرے (۳)
ہو ہو ہو کرنائی باجت + شہنشاہی شگون ساجت وغیرہ

**اداب شاہی** تب سید عبداللہ کہاں لیہو سو ادب بجائے + دہ حکم سردھریے۔ سو میری (خیال کرتے)

پربھو کو پائے یعنی فرخ سیر کا فرمان پاکر عبداللہ خاں نے اسے تعظیماً سر پر رکھا اور بادشاہ کا دل میں تصور کرکے نقارہ بجانے کا حکم دیا (۲) آجم کہاں ہجی چھوج سوں پرسے (چھورا) پربھو کے پائے یعنی آعظم خاں نے اپنے آقا (فرخ سیر) کا قدم چھووا۔ یہ ایک ہندوانہ رسم ہے۔ اگر پرسے کو درسے یعنی درشن پڑھا جائے تو قباحت نہیں رہتی۔

سری دھر نے ہندوؤں کی پرانی روایات اور دیومالا کیطرف اکثر جگہ نہایت خوبی سے اشارہ کیا ہے ۵۵۵ - ۵۶۵ - ۹۱۱ - ۹۱۲ - ۱۱۳۰ وغیرہ میں شیش ناگ۔ کورم (کچھوا) اور درگپال کا ذکر جو زمین کا لنگر سنبھالے ہوئے ہیں پایا جاتا ہے۔ ایک مثال کافی ہے ۵ آتی (زیادہ) سوز (سورج)، جھنپت (چھپ گیا) کورم کنپت شیش کی بلتا (قوت) گھٹی۔ اس ضمن میں ۵۸۰۵۰۵ ۱۱ کے اشعار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۵ تب گریور (پہاڑ) کر (ہاتھ) دھری گریور (سری کرشن جی) دھر شری دھر بھنت (کہتا ہے) ورج منڈل کی چھانہ (سایہ) بھو + اب گریدھر لال بہادر بہ شمشیر گہی (پکڑ کر) کرپات شاہی کے پناہ بھو۔ ان مصرعوں میں دیومالا تشبیہہ و استعارہ، ترنم تکرار صوت سب کچھ موجود ہے۔ تاریخی اشارہ بھی قابل توجہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانہ قدیم میں سری کرشن جی نے پہاڑ کو ہاتھ پر سنبھال کر برج منڈل کو بچالیا اور اس زمانہ میں گردھر لال (ناگر) بہادر، شمشیر ہاتھ میں لے کر بادشاہ (فرخ سیر) کے پشت و پناہ ثابت ہوئے۔ روایت ہے کہ ایک بار سری کرشن جی اور اندر دیوتا کے درمیان نزاع واقع ہوئی اندر نے غصہ میں آکر پانی برسانا شروع کیا تاکہ برج منڈل غرقاب ہوجائے۔ کرشن جی نے سارے باشندوں کو پہاڑ پر جانے کا حکم دیا اور جب تک پانی برستا رہا اس پہاڑ کو ایک انگلی پر اٹھائے رہے۔ آخر میں اندر نے ہار مان لی اور اس وجہ سے کرشن جی کا نام گردھاری یا گمریور پڑا۔

(باقی)

سید حسن عسکری

# راسخ عظیم آبادی کا غیر مطبوعہ کلام

راسخ کے کچھ غیر مطبوعہ اشعار معاصر میں شایع ہو چکے ہیں۔ ذیل کے اشعار بھی دیوان مطبوعہ میں نہیں، اور راسخ کے اس دیوان سے ماخوذ ہیں جو خود اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ق۔ ع۔ د

رشکِ محبوبانِ عالم غیرتِ خوباں ہو تم
یعنی وے انجم ہیں اور ان میں مہِ تاباں ہو تم

ہے تمہارے ساتھ ربطِ معنوی میرے تئیں
میں بھی اک دل ہوں سراپا جملہ تن گر جاں ہو تم

گھر تو یہ دونوں نے ہیں یاں ہی آ جایا کرو
دل میں رہتے ہو تو پھر آنکھوں سے کیوں پنہاں ہو تم

ہے مناسب بود و باش اس میں مسافر کی طرح
یہ جہاں مہماں سرا ہے اور یاں مہماں ہو تم

فقر میں بھی عجیب راسخ تم کو شاہوں کا سا ہے
گیروی کفنی پر اپنے کس قدر نازاں ہو تم —

کب تلک دل بستگی دنیائے بے حاصل کے ساتھ
سعی کر اس میں کہ پیدا ہو علاقہ دل کے ساتھ

وہ جو ہے محمل نشیں تن اُسے ٹک سیر کر
تن تو محمل اُس کا ہے مت باندھ دل محمل کے ساتھ

ڈوب کر دیکھا تو بے پایاں ہے دریائے عشق
آشنائی ہی نہیں اس بحر کو ساحل کے ساتھ —

عشق اس بت کی ہے سب کو خوش ادائی کے ساتھ
ہے رقابت سی مجھے ساری خدائی کے ساتھ

زر داغ دل عاشق ہے ترے عہد میں قلب
یعنی نسبت ہی نہیں اس کو روائی کے ساتھ

ایسا لذت سے اسیری کی ہوا ہوں محظوظ
کہ علاقہ نہ رہا ذوق رہائی کے ساتھ

پشت پا مارد ں ہوں دنیا پہ دے ہے مجھ کو
کو نہی بخت کی ہمت کی رسائی کے ساتھ

گو زلف کی سیہ ایسی نہیں کیوں کر اسے
دیجیے تشبیہ شب تار جدائی کے ساتھ

کف پا اُس کے بہت سرخ ہوں گر برگ حنا
پیسیں تر کر کے مرے اشک حنائی کے ساتھ

صد بیابان خطرناک ابھی طے کرنا ہے
تیرے سرگشتہ کو اس آبلہ پائی کے ساتھ

میر صاحب کے تو شاگرد ہیں راسخ پر انھیں
ہے گا دعوائے مساوات شفائی کے ساتھ —

جس جا کہ ترا جلوہ ہے واں حور نہیں کچھ
مہ کا ترے آگے رخ پُر نور نہیں کچھ

ہے عاشق و معشوق وہی ایک حقیقت
محبوب و محب ناظر و منظور نہیں کچھ

منصور کے پردے میں انا الحق کہا جس نے
وہ سب میں ہے یہ راز تو مستور نہیں کچھ

گو عاصی ہوں پر میرے گنہ بخش دے یارب
نزدیک کرم کے ترے یہ دور نہیں کچھ —

بہے خوں ہو کے ایسا دل نہ جس کو بے قراری ہو
وہ آنکھیں بند ہوں جن سے نہ جوئے اشک جاری ہو

یہ ظلم اے وائے بے حد ہے ہنسے تو حال پر اُن کے
جنھوں کا حال جائے نالہ و فریاد و زاری ہو

فنا اُن کو کرے مرگ طبیعی یہہ نہیں ممکن
رگ و پے میں جنھوں کے عشق جا کے روح ساری ہو

خیال طرح صد ایوان ہے اس ناپائداری پر
بنا کیا کیا رکھیں ہم گر امید پائداری ہو

نہ پوچھو آہ کیا ہے عشق اک سنگ گراں ہے یہ
وہی اس کو اٹھائے جس کو اپنی جان بھاری ہو

بجا ہے گر نہیں ہے خلق سے راسخ کو آمیزش —
اُسے ہو رابطہ کس سے جسے کچھ تجھ سے یاری ہو

کہتا ہے کون شیخ کہ تو بت شکن نہ ہو
پر دیکھیو شکستہ دل برہمن نہ ہو

سوزش ہے آفتاب میں بھی پر یقین ہے یہہ
اس دل کے داغ کی سی تو اس میں جلن نہ ہو

دولت یہ فقر کی مجھے کافی ہے اے ہما
تو سر پہ مجھ فقیر کے سایہ فگن نہ ہو

ہے اُس کا خط سبز بھی کیا ہی بہار پر
رونق تو اس خزاں کی بہار چمن نہ ہو

ہے گی خجالت اس کو لب یار سے بہت
کس طرح سرخ رنگ عقیق یمن نہ ہو

تو ہے کنار جو تو یہی جانتا ہے رشک
آغوش آب جو میں ترا عکس تن نہ ہو

ہو جس کو شوقِ سایۂ دیوار یار وہ
مشتاق سایۂ گل و سرو و سمن نہ ہو

شیریں ہے سنگ دل تو ہے فرہاد کوہ کن
یہہ سنگ دل نہ ہوئے تو وہ کوہ کن نہ ہو

اے بو الہوس سمجھ کے ٹک اس میں در آئیو
پیشہ یہ عشق کا ہے کوئی اور فن نہ ہو

راسخ کی نعش ڈھونڈو ہو کوچے میں یار کے —
اغلب ہے بعد مرگ میاں کفن نہ ہو

کون خوبوں میں مرے دل کا خریدار نہیں
آئینہ کون سے محبوب کو درکار نہیں

ہے وہ آزاد جو زنجیری پندار نہیں
عجب آزادی کے زنداں میں گرفتار نہیں

محو حسن اپنے ہی وہ درہمی زلف کا ہے
اُس کو کچھ میرا غم برہمی کار نہیں

سیج پھولوں کی مبارک ہو تمہیں ہم رہ غیر
فرش خواب اپنا تو غیر از خس و خار نہیں

سیری حاصل نہیں نظارے کو ورنہ اُس کا
کون سا جلوہ ہے دیکھا جسے سو بار نہیں

ایک شب دیکھی تھی میں تیری نگہہ کی گردش
بے خودی چھوڑتی اب تک مجھے اے یار نہیں

نقص یہہ حسن کا اُس کے ہے کہ عاشق جس کا
خوار و رسوائے سر کوچہ و بازار نہیں

کوہ آئینہ کا تختہ ہے نظر ہو گر صاف
پھر کوئی پردہ حجاب رخ دلدار نہیں

اچھی صورت پہ غرور اتنا بھی نا زیبا ہے
تم سا صاحب کوئی کیا اور طرحدار نہیں

نہ بھرو کیوں کے دم سرد کہ ساتھ ان میں
گرم جوشی نہیں اخلاص نہیں پیار نہیں

قطعہ

اس خرابے میں بنا ظلم کی مت رکھ منعم
پائداری و ثبات اس کو تو زنہار نہیں

صاحب قصر جو تھے قیصر و کسریٰ نہ رہے
سب وہ روپوش ہوئے کوئی نمودار نہیں

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدین احمد

دائرۂ ادب بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

جلد ۴ | اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۶





| چندہ سالانہ للعہ | فی پرچہ | ۶ر |
| --- | --- | --- |

# اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی

## طلسم ہوش ربا (مسلسل)

(۷)

"طلسم ہوش ربا" عجب مجموعۂ اضداد ہے۔ ایک طرف تو اس میں تخیل کی آزاد جولانی ہے۔ طلسم ہے، طلسمی اسپا، ہیں، جادوگر ہیں اور عجیب و غریب جادو کے کرشمے ہیں، یعنی ایک ایسی دنیا ہے جسے ہماری جانی ہوئی دنیا سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں۔ دوسری جانب اس آئینہ میں واقعی اور حقیقی چیزوں کی جلوہ گری ہے۔ ایک مخصوص عہد کے طرز معاشرت کی تصویریں ہیں۔ مقامی رنگ ہے۔ تخیل کی بیباک خلاقی کے پہلو بہ پہلو اپنے گرد و پیش کی دیکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس تضاد سے "طلسم ہوش ربا" میں کسی قسم کا نقص نہیں پیدا ہوتا اور نہ قارئین کی دلچسپی میں کمی ہوتی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ یہاں ہم ایک ایسے عالم میں جا پہنچتے ہیں۔ جہاں ساری تضادیں مٹ جاتی ہیں، تلخی اور کرختگی میٹھے اور سریلے بول میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

امیر حمزہ اور ان کے فرزند عرب کے باشندے ہیں۔ اور ایک حد تک وہ ان اوصاف کے حامل ہیں، جو عربوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ جری بہادر ہیں۔ نڈر، بے مثل لڑنے والے ہیں۔ حمیت فیاضی، مہمان نوازی، یہ خوبیاں گویا انھیں کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک مخصوص پہلو ہندی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور اس عہد کی یاد تازہ کرتا ہے جب بادشاہوں اور امیروں میں عیش پسندی آگئی تھی، جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور جب جانبازی کی جگہ عیاشی نے لے لی تھی۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب لوگوں کی رگیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور خون کی گرمی سرد ہو گئی تھی، "جہاں بانی اور جہاں بینی" دونوں سے کوئی واسطہ باقی نہ رہا تھا اور جی کھول کر "دادِ عشرت" دی جاتی تھی! "طلسم ہوش ربا" میں یہ "شیرانِ عرب" بھی خوب "دادِ عشرت" دیتے ہیں وہ جس سمت بھی نکل جاتے ہیں انھیں کوئی ملکہ، شاہزادی، حسینہ ملجاتی ہے جس کی زلفِ رسا سنبل کے دھویں اڑاتی ہے۔ پیشانی میں اس کی وہ چمک کہ صدقہ جس پر آفتاب فلک، بھویں اس کی خمدار شمشیر دودم جو کریں اشارے میں قتل عالم،... نرگس ان آنکھوں کو دیکھ کر آنکھیں چرائے اور غزال ختن صدقے ہو جائے ... لب لعلیں پر لعل بدخشانی ہیرا کھائے، گوہر دنداں کی چمک کے آگے موتی بے آبرو ہو جائے۔ سینہ اس کا... گول گول ابھرا ہوا کڑا نوکیلا اونچا گنجِ خوبی کا ڈبہ قبۂ نور حسن سے معمور ... رگ گلبرگ سے زیادہ تر پتلی اس کی کمر... بارہ پندرہ برس کا سن زیور الماس میں غرق آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، گلے میں موتیوں کا مالا، ماتھے پر افشاں چنی ہوئی، ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی، پور پور میں

چھلّے... ہاتھوں میں دست بند بازوؤں پر نورتن، کان میں بالا ہلال کی طرح پڑا، پاؤں میں گھنگھروں کی چھاگل... فطری طور پر شیر عرب اس حسینہ پر شیدا ہو جاتا ہے اور وہ حسینہ بھی اس شیر عرب پر مائل ہوتی ہے پھر کیا ہے" دور جام بے دغدغہ نیرنگیٔ ایام" چل نکلتا ہے۔ ملکہ طوائفوں کو بلاتی ہے اور ناچ گانا شروع ہوتا ہے۔ یعنی بجنسہ وہ سماں ہے جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں ہر طرف نظر آتا تھا۔

یہ پیش پا افتادہ بات ہے کہ اردو ادب میں ہندوستان کے مخصوص طرز معاشرت کی وجہ سے عشق کی داستان اگر اسے عشقبازی کے الزام سے بچایا جائے تو غیر فطری ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں پردہ کا رواج ہے اس لئے مرد عورت آزادانہ مل جل نہیں سکتے۔ مرد جن عورتوں سے آزادی کے ساتھ مل سکتے ہیں وہ عموماً بیسوا ہوتی ہیں یا نیچے طبقے کی۔ "طلسم ہوش ربا" میں بھی داستان گو نے یہی دقت محسوس کی تھی۔ اسلام میں پردہ ہے لیکن جس قسم کا پردہ "طلسم ہوش ربا" میں رائج ہے وہ اسلامی نہیں ہندوستانی ہے۔ اس لئے ایک مسلمان جانباز کسی مسلمان خاتون سے نہیں مل سکتا۔ اس لئے یہ آسان ترکیب نکالی گئی کہ ہر ملکہ، شاہزادی یا حسینہ غیر مسلم ہوتی ہے اور جب وہ مسلمان ہو جاتی ہے تو پھر وہ محل کے اندر بھیج دی جاتی ہے۔ اس کی آزادی کے دن ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن شیران عرب کو دوسری غیر مسلم شاہزادیاں مل جاتی ہیں! اور یہ شاہزادیاں اپنی کمسنی او رمعصومیت کے باوجود بیسواؤں کی سی حرکتیں کرتی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ لیکن ہر جگہ یہی عالم ہے:۔ "غضنفر اس حور جنت کو دیکھ کر غش کر گیا اس نازنین نے گلاب اس کے منہ پر چھڑکا کہ اس کو ہوش آیا۔ اٹھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ مسکرا کے ناز و انداز دکھا کے کر کولے کا عالم دکھاتی چلی اور غضنفر کو بارہ دری میں لاکے مسند پر بٹھایا کشتی شراب کی طلب کی جام مئے ارغوانی سے بھرا اور پنجۂ حنا آلود رشک پنجۂ آفتاب پر رکھ کر دیا غضنفر نے کہا کہ اے ملکہ ؎

اگر شاہی ترا آخر چہ نام است      وگر ماہی ترا منزل کدام است

اس نے ہنس کر کہا کہ میں ملکۂ سرخ موے کاکل کشا کی بیٹی ہوں میرا نام سلطان عنبریں مو ہے... غضنفر نے جام اس کے ہاتھ سے لے کر پیا پھر تو دور جام بے دغدغہ نیرنگیٔ ایام چل نکلا باتیں محبت آمیز ہونے لگیں۔ شہزادہ نے گلے میں ہاتھ ڈال دئے اور ملکہ کے بوسے لئے۔ ملکہ کا شرم سے عجب حال ہوا پسینہ آ گیا۔ شرما کر سر جھکا لیا"... ہر جگہ اسی قسم کی عشقبازی کی مثالیں ہیں۔ جانبازی اور عیاشی یہ "طلسم ہوش ربا" کا خلاصہ ہے۔ جانبازی کی تصویر زور تخیل کی مدد سے کھینچی گئی ہے، کیونکہ گرد و پیش میں یہ چیز عنقا ہو گئی تھی لیکن عیاشی کا نقشہ واقعیت پر مبنی ہے۔

جس طرح مثنوی بدر منیر میں اس عہد کے طرز معاشرت کی عکاسی ہے۔ اسی رنگ کی تصویر ایک وسیع پیمانہ پر ہر جگہ "طلسم ہوش ربا" میں دعوت نظارہ دیتی ہے اور یہ مقامی رنگ بڑی اور چھوٹی دونوں قسم کی چیزوں پر چھایا ہوا ہے۔ زندگی کا جو "آئیڈیل" یہاں پیش کیا گیا ہے وہ خالص عرب نہیں۔ اس میں ہندی رنگ ہر جگہ جھلکتا ہے۔ دربار اسلامی کے آداب میں اسلام کی سادگی نہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی

خلافت کے زمانہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنا سفیر بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ وہ امیر عرب کی دولت طاقت اور ان کے رویہ کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچائے۔ جب یہہ سفیر مدینہ پہنچا تو اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، ہاں ایک امیر البتہ ہے۔ اور وہ امیرالمومنین عمرؓ بن خطاب ہیں۔ اس سفیر نے کہا وہ کہاں ہیں مجھے ان کی خدمت میں لے چلو"۔ لوگوں نے مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ سفیر وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ مسجد کے گرم زینوں پر سر ٹیکے ہوئے سو رہے ہیں اور ان کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہے۔ وہ سفیر یہہ عالم دیکھ کر خوفزدہ ہوا اور بول اٹھا۔ اس فقیر کے آگے شاہان جہاں نے سر تسلیم خم کیا ہے۔ یہہ دنیا کی عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے جس قوم کا سردار ایسا ہو تو دوسری قومیں کیوں نہ ماتم کریں"۔ یہہ ایک تصویر تھی۔ اب دوسری تصویر ملاحظہ ہو سعد بن قبا دبادشاہ اسلام اسلام برآمد ہوتے ہیں، جلوس سواری بادشاہ نکلنے لگا۔ چوبدار برچھی بردار بلم بردار وغیرہ سب جلوخانہ سے باہر نکلے۔ سامان باد بہاری آگے بڑھا... فرنگیوں نے بگل بجایا... ارمنی بیلا بجانے لگے کوس دو ہل گڑگڑائے روشنی نمودار ہوئی۔ لڑکے حسین و خوبصورت... منقلوں کو جلائے گزر گئے۔ زنانی ڈیوڑھی تک زنانہ سامان آکر بھر گیا کہاریاں پیادی پیادیاں زیور طلائی میں غرق ... ہوادار بادشاہ کا کاندھے پر اٹھائے قریب پردۂ سرخ پہونچیں، کہاروں نے بڑھ کر تخت بدلوایا۔ حضور عالم کے برآمد ہوتے ہی مردھوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم شور و غل مچایا۔ امیر نے مجراگاہ پر جاکر اول مجرا کیا" فرق بیّن ہے کسی حاشیہ کی ضرورت نہیں۔

باغ کی تصویر کشی، لباس و زیورات کی رنگا رنگی اور چمک دمک۔ بارات کی آرائشیں۔ شادی کے رسوم، غرض ہر چیز ہندی تخیل کی پیداوار ہے اور ہندی ماحول سے اس کی تصویر اتاری گئی ہے۔ یہہ تصویریں دلچسپ ہیں اور تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہیں کیونکہ اب زمانہ نے نئی کروٹ بدلی ہے اور یہہ تصویریں دھندلی ہوگئی ہیں۔ لیکن ان چیزوں سے زیادہ دلچسپ یہہ ہے کہ بول چال، لب ولہجہ میں لکھنؤ کی شان اور بانکپن ہے میں ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں۔" کیا مردوا باتیں بناتا ہے عورتوں کا مکر مشہور ہے لیکن اس نے اپنے بھی کان کاٹے۔ ایک بولی کہ نام خدا سے ایسے ننھے ہیں کہ راہ نہیں جانتے ہیں۔ دوسری نے کہا۔ مکاری تو دیکھو کہتے ہیں کہ میں آپ سے نہیں آیا کوئی ان کو گود اٹھا لایا ہے تیسری نے کہا کسی کی بلا کو کیا غرض تھی جوان کو اٹھا لاتا ذرا اپنی صورت تو آئینہ میں دیکھو کچھ ایسے خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی دیکھا ہوگا... چل مردوئے جو اس میں آمنہ منوا ایسی باتیں کبھی مالزادی سے کریو صاحبو کیا ہماری شامت ہے جوان کی شکل پر ریجھیں گے میں سچ کہوں مجھے تو جھوٹے دیدوں بھی میاں تم نہیں بھاتے۔ ایک ان میں سے پھر تڑاق کر بول اٹھی بوا جتنا تم اس مردوئے کو منہ لگاتی ہو یہہ جانتا ہے جو میرے وہ راجہ کے نہیں اور زیادہ اتراتا ہے"...

کہاں عرب اور کہاں انیسویں صدی کا لکھنؤ! بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

میں کہہ چکا ہوں کہ "طلسم ہوش ربا" میں بے شمار فنی نقائص ہیں، بنیادی اور جزئی۔ اگر کسی دوسری تصنیف میں اتنے نقائص ہوتے تو وہ ان کے بوجھ سے ہمیشہ کے لئے غرق گمنامی ہو جاتی۔ یہ "طلسم ہوش ربا" کی بڑائی کی دلیل ہے کہ وہ ان نقائص کے بوجھ کے باوجود بھی سطح پر نمودار ہو کر قلو بطرہ کے بجرے کی طرح سمندر میں آگ لگاتی ہے۔

"طلسم ہوش ربا" میں دلچسپی کے دو اہم مرکز ہیں۔ ایک مرکز تو پورا لشکر اسلام ہے جس کے بادشاہ سعد بن قباد اور سپہ سالار امیر حمزہ ہیں۔ یہ لشکر خداوند لقا کے مقابلہ میں جما ہوا ہے اور اُسے پے در پے شکست دیتا ہوا "طلسم ہوش ربا" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دوسرا مرکز "طلسم ہوش ربا" کے اندر ہے۔ اسد اور عیار اور ان کے مددگار افراسیاب اور اس کی عظیم الشان سلطنت کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین کی آنکھیں کبھی لقا کی شکست و ذلت کا تماشا دیکھتی ہیں تو کبھی جادو کی نیرنگیوں سے محظوظ ہوتی ہیں۔ ان اہم مرکزوں کے علاوہ چند غیر اہم مرکز بھی ہیں۔ اسد یا ایرج یا نور الدہر یا قاسم مختلف طلسموں کو فتح کرتے ہیں۔ اسی طرح قاری کی توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور وحدت اثر میں نمایاں کمی ہوتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ "طلسم ہوش ربا" میں مختلف جداگانہ قصے ہیں اور ان قصوں میں کوئی لگاؤ نہیں۔ کوئی قصہ بھی اپنی آزاد جداگانہ ہستی نہیں رکھتا اور سب قصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہیں۔ اس سلسلہ کی چند کڑیاں یہ ہیں۔ بدیع الزماں، فرزند امیر حمزہ "طلسم ہوش ربا" میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اسد اور چار عیار ان کی رہائی کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح فتح طلسم ہوش ربا محض ایک ضمنی قصہ ہے۔ اصل قصہ تو امیر حمزہ سے متعلق ہے۔ وہ لقا کی شکست کے درپے ہیں اور انہوں نے یہ عہد کیا ہے کہ جہاں بھی لقا جائیگا وہ پیچھا کریں گے۔ اگر بدیع الزمان طلسم میں نہ پھنس جاتے تو پھر فتح طلسم کی نوبت ہی نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ فتح طلسم محض ایک ضمنی بات ہے لیکن اس ضمنی قصہ نے وہ اہمیت اختیار کرلی ہے کہ وقتی طور پر یہ اصل قصہ سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جزو نے کل سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے اور یہ اہم فنی نقص ہے۔ بہرکیف شکست لقا اور فتح طلسم میں ربط ہے اور وہ ربط بدیع الزّمان کی گرفتاری ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف صورتیں ان دونوں قصوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے عمل میں آئی ہیں۔ لقا بار بار افراسیاب سے مدد طلب کرتا ہے اور طلسم ہوش ربا سے بڑے بڑے جادوگر لقا کی مدد کے لئے جاتے ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں۔ خواجہ عمرو لشکر اسلام میں عین وقت پر پہونچتے ہیں اور اُسے تباہی سے بچاتے ہیں۔ مخمور سرخ چشم اور ملکہ بہار بھی آتی ہیں ایرج، نور الدہر، قاسم، چالاک بن عمرو یکے بعد دیگرے داخل طلسم ہوتے ہیں اور آخرکار لقا کے تعاقب میں سارا لشکر اسلام داخل طلسم ہوتا ہے۔ جنگ مغلوبہ ہوتی ہے اور افراسیاب قتل ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ چھوٹے چھوٹے طلسم جو اسد، ایرج، نور الدہر، قاسم فتح کرتے ہیں، ان میں اور

طلسم ہوش ربا میں بھی اسی قسم کا ربط ہے۔ مختلف مرکز ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں اور ختم قصہ پر ہم اسی نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے روانہ ہوئے تھے یعنی امیر حمزہ اور لشکر اسلام۔ اس طرح دائرہ مکمل ہو جاتا ہے اور احساس تکمیل ہوتا ہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود بھی "طلسم ہوش ربا" میں وہ وحدت اثر نہیں جو ہم شیکسپیر یا سوفوکلیس کے ڈراموں میں پاتے ہیں۔ یہاں مختلف اجزا میں وہ ربط و اتحاد نہیں جو ایک حسین پھول کے مختلف عناصر میں ہوتا ہے، وہ عضویاتی نمو اور ترکیب و تنظیم نہیں جن سے ہمارے جمالیاتی ذوق کی مکمل تسکین ہو۔ یہاں فن نسبتاً خام، ناقص اور محدود قسم کا ہے۔

مختلف اجزا میں ربط و اتحاد کی کمی کا ایک سبب تخیل کی بے لگامی اور بدلگامی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ داستانوں میں تخیل کی آزاد جولانی ضروری ہے اور واقعیت وحقیقت کی نقالی سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آزادی اور زیادتی یا بیراہ روی میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ تخیل کی بلند و تیز آزاد پرواز نے "طلسم ہوش ربا" میں نہایت دلکش نتائج ظاہر کئے ہیں لیکن اسی تخیل کی بے اعتدالی نے عجیب گل کھلائے ہیں۔ یہ بلند پرواز کرتا ہے لیکن بلندی پر زیادہ دیر تک قائم نہیں کر سکتا۔ یکایک وہ اپنی طاقتِ پرواز کھو بیٹھتا ہے اور سرعت کے ساتھ بلندی سے پستی میں آجاتا ہے۔ اس لئے دلچسپ، پسندیدہ، خوشگوار اور لائق تعریف تصویروں کے ساتھ ناگوار، ناپسندیدہ، مضحک تصویریں بھی مرتب ہو جاتی ہیں۔ اس حسن و بدصورتی کے اجتماع سے ناگوار اثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصور میں زور تو ہے لیکن تمیز نہیں اس لئے اچھی اور بری چیزوں میں کوئی تفرقہ ممکن نہیں۔ اکثر جب وجدان کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو بھی قلم نہیں رکتا۔ نتیجہ لازمی طور پر نقالی ہے اور نقالی بھی اپنی۔ گویا دو قلم حرکت میں ہیں۔ ایک وجدان کی ترجمانی کرتا ہے اور دوسرے کو وجدان سے کسی قسم کا واسطہ نہیں۔ یہ محض نقالی سے واقف ہے اور جو نقلیں یہ اتارتا ہے وہ بدنما ہوتی ہیں۔ پھر ان نقلوں کی زیادتی ہے۔ اگر کوئی نقش اچھا ہو تو بھی اس کی کثرت کوئی اچھی بات نہیں۔ "طلسم ہوش ربا" میں اکثر رخنوں کی اس قدر زیادتی ہے کہ جنگل نظر نہیں آتا۔ مکمل نقشہ دھندلا ہو جاتا ہے اور صفائی کے ساتھ ذہن میں نقش نہیں ہوتا۔ کردار، واقعات نقوش، الفاظ سبھوں کی فراوانی ہے۔ گویا ایک سیلاب ہے کہ رواں ہے اگر اس سیلاب کا روکنا ممکن ہوتا اگر اُسے کسی مخصوص رستہ میں رواں کیا جاتا تو داستان زیادہ مؤثر ہو جاتی۔

تخیل کی بے لگامی کے ساتھ احساس تناسب کی کمی بھی لازمی ہے۔ یہ نقص بھی اہم ہے اور ہر جگہ "طلسم ہوش ربا" میں موجود ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ یہاں ایک ضمنی قصہ نے اس قدر وسعت اختیار کر لی ہے کہ اصل قصہ کو پس پشت ڈال دیا ہے یعنی ایک جزنے ایسا غلبہ کیا ہے کہ وہ کُل پر محیط ہو گیا ہے۔ یہ احساس تناسب کی کمی سے روشن مثال ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اگر "طلسم ہوش ربا" کو "داستان امیر حمزہ" سے علٰحدہ نہ کیا جائے

یہہ نقص اس قدر نمایاں نہ ہوگا۔ اور یہہ صحیح ہے لیکن یہہ ضمنی داستان مکمل ہے اور اُسے بالکل تو نہیں لیکن کسی حد تک پوری داستان سے علٰحدہ کیا جا سکتا ہے۔ "طلسم ہوش ربا" سے پہلے اور اس کے بعد رنگین داستانوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ اس لئے اسے یک قلم دوسری داستانوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن "داستان امیر حمزہ" کے مختلف حصے سب اپنی اپنی جگہ پر کم و بیش مکمل ہیں۔ اس کے علاوہ جو تناسب کی کمی "طلسم ہوش ربا" میں ہے وہی کمی پوری داستان میں بھی ملتی ہے۔ بہر کیف، اس نقص کے نتائج داستان کے ہر شعبہ میں ملتے ہیں۔ کردار نگاری میں، واقعات میں، تصویروں میں، بیانات میں، الفاظ میں غرض ہر جگہ ناموزونیت کی وجہ سے بدنمائی کی مثالیں بکھری پڑی ہیں کیرکٹر کی خصوصیات اور انکی تعداد، ان کی گفتگو میں، واقعات کی ماہیت اور تعداد اور ترتیب میں، بیانات و تصاویر میں، الفاظ کے استعمال میں اکثر بدسلیقگی سے کام لیا گیا ہے۔ ضروری باتیں حذف کر دی گئی ہیں اور غیر ضروری چیزوں کی بھرمار ہے۔ آخر الذکر نقص زیادہ ہے کتنے کیرکٹر ہیں، کتنے واقعات ہیں، کتنے بیانات و تصاویر ہیں۔ کتنے جملے اور الفاظ ہیں جو محض بیکار اور غیر ضروری ہیں۔ جن کی موجودگی سے حسن داستان میں اضافہ نہیں کمی ہوتی ہے۔ اعتدال اختصار کفایت شعاری کے گُر سے بالکل واقفیت نہیں۔ اچھی تصویریں بھی بے اعتدالی، ناموزونیت کی وجہ سے خراب اور بھدی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

غیر ضروری چیزوں کی بھرمار سے جو بُرا اثر نمایاں ہوتا ہے اسے تکرار کی زیادتی زیادہ بدنما بنا دیتی ہے اور یہہ تکرار نت نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ سطحی اور ظاہری تکرار یعنی کسی ایک واقعہ یا لفظ کی تکرار تو نہیں ہوتی لیکن ایک ہی رنگ، وضع، تراش خراش کی چیزوں کی کمی نہیں۔ الفاظ یا جزئیات کے رد و بدل سے تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہہ کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ جنہیں بصیرت ہے اور سطحی تنوع کے پردے میں تکرار کا جلوہ دیکھتے ہیں اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں۔ اس نقص سے داستان بھری پڑی ہے اور یک نگاہ غلط انداز بھی اس سے بہ آسانی واقف ہو جاتی ہے۔ اسد، نور الدہر ایرج نہیں معلوم کتنی مہ جبینوں سے یکے بعد دیگرے ملتے ہیں اور ہر مرتبہ ایک ہی قسم کا واقعہ پیش آتا ہے۔ شہیر عرب اور وہ مہ جبین ایک دوسرے پر نظر پڑتے ہی عاشق ہو جاتے ہیں۔ پھر نتیجہ معلوم! اس رنگ کے واقعات کا شمار ممکن نہیں۔ انھیں بہ آسانی حذف کر دیا جا سکتا ہے۔ کم سے کم مفصل بیان کی مطلق ضرورت نہیں۔ عیاروں کی عیاری میں بھی یکسانی نظر آتی ہے۔ خواجہ عمرو تو البتہ عجیب و غریب قسم کی عیاریاں کرتے ہیں جن کا تصور معمولی تخیل نہیں کر سکتا۔ لیکن "طلسم ہوش ربا" میں بے شمار عیاری کے مواقع پیش آتے ہیں۔ آخر عیار اور داستان گو دونوں انسان ہیں۔ ہر مرتبہ نئی اپج ممکن نہیں۔ لازمی نتیجہ تکرار ہے۔ لیکن اگر واقعات کی اس قدر زیادتی نہ ہوتی تو تکرار میں نمایاں کمی ممکن تھی۔ امیر حمزہ اور فرزندان و سرداران امیر حمزہ بے شمار کافروں کو قتل کرتے یا ان کے دلوں کو نور اسلام سے منور کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات میں بھی یکرنگی ہے۔

مختلف جادوگر چند مخصوص قسم کے جادو رکھتے ہیں۔ ملکہ بہار بہار کو بلاتی اور دشمنوں کو دیوانہ بناتی ہے۔ باراں کا اختر مروارید چلتا ہے۔ رعد چیختا ہے، زلزلہ زمین کا تختہ ہلا دیتا ہے۔ جہاندار شاہ قلعہ بناتا ہے، مختلف برقیں اپنی چمک دکھاتی ہیں۔ یہ سب بار بار میدان کارزار میں اپنی جانبازی دکھاتے ہیں۔ نتیجہ وہی تکرار ہے۔

"طلسم ہوش ربا" کی سات ضخیم جلدیں ہیں۔ اور یہ بھی ایک اہم نقص ہے اور غالباً اسی نقص کی وجہ سے اس داستان کی وہ قدر نہ ہوئی جو اس کا حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں عجلت کی ہر شعبہ میں کارفرمائی ہے۔ انسانی سرگرمیوں کا میدان نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ ہماری دلچسپیوں کا حلقہ پھیل گیا ہے۔ بے شمار چیزیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس لئے فرصت کی نمایاں کمی ہے اور ہم کسی کام کو اطمینان کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے۔ "طلسم ہوش ربا" کو پڑھنے اور اس سے لطف حاصل کرنے کے لئے فرصت کی ضرورت ہے تو آج ہمیں میسر نہیں اس لئے اگر کبھی اس طرف توجہ مبذول بھی ہوتی ہے تو بہت جلد بےصبری ہماری توجہ کو کسی دوسری جانب پھیر دیتی ہے۔ مجھے اس عجلت، اس بےصبری، اس بے اطمینانی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ اسی حالت کا نتیجہ ہے کہ آج تہذیب و تمدن کی اگلی آب و تاب پہلی قدر و قیمت باقی نہیں۔ بہرکیف، طوالت بجائے خود کوئی بری شئے نہیں لیکن "طلسم ہوش ربا" ضرورت سے زیادہ طویل ہے۔ اور یہ طوالت اہم ترین فنی نقص ہے اس سے ہماری دلچسپی میں نمایاں کمی ہوتی ہے۔ اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو اس کے محاسن اجاگر ہو جاتے اور اس کی فنی قدر و قیمت زیادہ بلند ہو جاتی۔ ضرورت ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کا ایک انتخاب شایع کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ تین چار جلدوں میں ایک اچھا انتخاب ہو سکتا ہے۔ اس انتخاب کی صورت میں داستان کے حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اور اس کی اہمیت بہت بڑھ جائیگی۔ کیا انجمن ترقی اردو اس طرف توجہ کر سکتی ہے؟

میں نے قصداً "طلسم ہوش ربا" کے چند اہم ترین نقائص کی طرف اشارہ کرنے پر قناعت کی ہے اور یہ اشارہ عام لفظوں میں ہے۔ اگر اس بحث میں تفصیل سے کام لیا جاتا اور مثالیں گنائی جاتیں تو پھر یہ بہت طویل ہو جاتی۔ اب رہی زبان تو عموماً اُسے بھی "طلسم ہوش ربا" کے نقائص میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں مرصع عبارت ملتی ہے، سطحی و ظاہری محاسن کو اصلی و باطنی محاسن پر ترجیح دی گئی ہے نقوش، استعاروں، تشبیہوں، فقروں اور لفظوں کی تکرار بدنما تکرار بھی ہے۔ سادگی، صفائی، باریکی نفاست، گہرائی سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے۔ اور اکثر عبارت گنجلک اور بھدی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود بھی "طلسم ہوش ربا" کی زبان مجموعی حیثیت سے قابل تعریف ہے۔ اس کا اپنا علحدہ رنگ ہے اور اس رنگ میں کامیاب ہے۔ جس طرح "طلسم ہوش ربا" کی دنیا غیر فطری بھی ہے اور دیکھی ہوئی بھی۔ اسی طرح اس کی زبان غیر فطری بھی ہے اور فطری بھی۔ اس میں تصنع بھی ہے اور اصلیت بھی، سطحیت بھی ہے اور گہرائی بھی یہ سرد و بیجان نہیں بلکہ زندہ ہے اور زندہ رہنے والی ہے۔ یہ شعوری کانٹ چھانٹ، تراش خراش

تنظیم و آرائش کے باوجود بھی خود رو، پُرنمو، وسیع باغ ہے جسے فطرت نے لگایا ہے اور جس میں ہر پودا، ہر پھول، ہر پتہ شاداب و زندہ ہے۔

"طلسم ہوش ربا" ایک کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ اگر اُردو انشا پرداز اس طرف متوجہ ہوتے تو انھیں بے شمار نقوش تصاویر، تلمیحات پر دسترس ہوتا اور ان چیزوں سے مصرف لیکر اپنی تصنیفوں کو سجا سکتے۔ ہر زبان میں اساطیر اور داستانوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے شعراء اور انشا پرداز اس ذخیرہ کی قیمتی چیزوں کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ قدیم داستانوں، اعتقادوں سے عقبی زمین کا مصرف لیتے ہیں انہیں نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں اور بے شمار نقوش اور تشبیہوں سے اپنی عبارت کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں، یونانی اساطیر، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں اور انکی دلچسپ کہانیوں کا اثر یورپ کے ہر ادب میں نمایاں ہے۔ اردو میں "داستان امیر حمزہ" اور خصوصاً طلسم ہوش ربا سے یہی مصرف لیا جاسکتا تھا اور اگر مصرف لیا جاتا تو پھر اُردو ادب اور اُردو زبان میں ایک جان پڑ جاتی۔ لیکن اردو ادب میں داستان امیر حمزہ سے بالکل عدم واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ شاید کہیں ایک آدھ مثال ملجائے، سینۂ بیرا غم گیتی سو عمرو کی زنبیل لیکن یہہ نہونے کے برابر ہے۔ ایک عمرو ہی کو لیجئے۔ ان کی صورت، ان کی زنبیل، گلیم عیاری، ان کا لحن داؤدی، ان کی ظرافت اور خصوصاً ان کی حیرت انگیز عیاریوں سے ہم بے شمار نقوش و استعارے اختراع کر سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ "داستان امیر حمزہ" سے مختلف قصے لے کر انھیں سیدھی سادھی، آسان زبان میں کامل اختصار کے ساتھ بچوں کے لئے لکھا جائے۔ اس طرح یہہ چیزیں ہماری زبان، ہمارے شعور میں رچ جائیں گی پھر بہ آسانی یہہ ادب کا جزو بن جائیں گی ــ

کلیم الدّین احمد

# اسعد الاخبار آگرہ (۴)

۱۰۷ : (خلاصہ) اخبار الحقائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ موراج کے مقدمے کی کارروائی اُردو میں ہوتی تھی (بعض الفاظ کرم خوردہ)

۱۱۵ : زبدۃ الاخبار میں دہلی اُردو اخبار سے مرقوم ہے کہ .. لاہور سے عن قریب اس مضمون کے اشتہار جاری ہوں گے کہ پنجاب کی ساری رعیت .. ہتھیار - سرکار میں داخل کرے اور جو یکم اکتوبر سنہ حال تک کسی کے گھر میں ہتھیار نکلیں گے اُسے سزا ہو گی اور قید کیا جائے گا۔

۱۱۵ : حکام الٰہ آباد نے بہ نظر دور اندیشی کوتوالی الٰہ آباد کی ایک انگریز کو دی ہے' اس واسطے کہ وہ طرفدار نہ مسلمان کا ہوگا نہ ہندوؤں کا۔ اور کوتوال حال نے حکم دیا ہے کہ جامع مسجد میں .. لوگ بھیڑ بھاڑ سے نماز پڑھنے نہ پائیں۔ باعث اس حکم کا فسادِ سال گذشتہ ہے .." اخبار الحقائق۔

۱۱۷ : زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ رمضان کی ۱۰ تاریخ .. کو صاحب رزیڈنٹ بہادر حسب الطلب .. دربار میں تشریف لے گئے اور دو گھنٹے تک .. مشورہ کرتے رہے۔ اس خلوت میں نواب وزیر الممالک شمس الامرا بہادر بھی باریاب نہ ہونے پائے .. جب صاحب ممدوح رخصت ہوگئے حضور والا نے نواب شمس الامرا کی نسبت حکم دیا کہ آج سے تم اپنے تئیں معزول سمجھو اور اپنے گھر بیٹھو' دربار میں آنا ضرور نہیں .."

۱۲۲ : " .. دانایان فرنگ نے اب نئی وضع اور انداز کا اوزار چھاپنے کا ایجاد کیا ہے .. نئی کل بلا وسیلے آدمی کے خود بہ خود بہ زور دخان کے چلتی ہے اور ۲۵ ہزار سے کم کاغذ ایک دن میں نہیں نکلتا۔ (زبدۃ الاخبار)

۱۲۸ : خبر حیدرآباد : جماعت افغان نے .. جو قدیم نوکر ہیں، تنخواہ کا تقاضا کر کے .. در دولت پر مستعد خون ریزی ہوئے .. بعض سرداران صلاح اندیش نے .. دم دلاسا دے کے در دولت سے ٹالا۔ راجا رام بخش نے ساٹھ لاکھ روپیا جو بندگان عالی کو نذرانہ دینا مقرر کیا ہے اُس کی ادا کا دو مہینے وعدہ کیا ہے۔ (زبدۃ الاخبار)

۱۴۰ : اُسی مہینے (فروری ۱۸۵۰ء) کی ۱۸ تاریخ کو شاہ سلطان بخش صاحب .. جو دنیا و مافیہا سے دست بردار اور بڑے عامل زبردست تھے .. طرف ملک بقا کے روانہ ہوئے .. نعش .. بہ سبیل ڈانک (کذا) گھڑگھڑیا روانہ فرخ آباد ہوئی۔"

۱۴۱ : رعایائے کشمیر مہاراجا گلاب سنگھ .. کے ہاتھوں بہت تنگ آگئی ہے .. محصول .. مال اور زمین وغیرہ پر اب دوگونہ لیا جاتا ہے۔ شال بافوں پر تو یہ تباہی آئی ہے کہ پھٹی پرانی کملی بھی اُن کے پاس نہیں رہی۔ کہتے ہیں کہ مہاراجا .. شال اور چاول .. آدھی قیمت پر مول لے کر دور دور ملکوں کو بھیج دیتے ہیں۔ (خلاصہ : شکایت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مہاراجا نے یہ جواب دیا کہ اگر اس طرح تم راضی نہیں تو انگریزی کلکٹر تم پر مقرر کرا دیں گے' زبدۃ الاخبار۔

۱۴۲ : خلاصہ : زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار کے حوالے سے لکھا ہے کہ کلکتہ میں ایک نیا قانون مرتب ہوا ہے کہ تبدیل مذہب سے کوئی شخص محروم الارث نہیں ہوسکتا۔ اس قانون کے جاری ہونے میں بڑی بڑی قباحتیں ہیں" لوگ اس کی تردید و تنسیخ کی کوشش کررہے ہیں۔

اسعد الاخبار خبروں کی بہم رسانی کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتا تھا۔ مقامی خبروں کو چھوڑ کر اس کی قریب قریب کل خبریں دوسرے اردو اخباروں سے ماخوذ ہوتی تھیں۔ قمر الدین خاں غالباً انگریزی نہیں جانتے تھے اس لئے انگریزی اخباروں سے براہ راست استفادہ بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسعد الاخبار میں بہ ظاہر اس کا التزام تھا کہ کسی اخبار سے کوئی خبر بغیر حوالہ دیے ہوئے نقل نہ ہو۔ اس کے دفتر میں غالباً کل اردو اخبار بھی نہیں پہنچتے تھے۔ اکثر خبروں کے آغاز میں اس قسم کا کوئی فقرہ نظر آتا ہے۔ " فلاں اخبار میں فلاں اخبار سے مرقوم ہے"۔ خبریں اکثر باسی ہوا کرتی تھیں، اور اس میں ان کے لیے اتنی کم جگہ تھی کہ اکثر اہم خبریں چھوٹ جایا کرتی تھیں۔ صرف اس اخبار کو پڑھ کر کوئی شخص اپنے ماحول سے باخبر رہنے کا مدعی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسعد الاخبار کو بیرونِ ہند کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ دل چسپی تھی، اور برطانوی ہند کے مقابلے میں یہ اخبار دیسی ریاستوں کی خبریں زیادہ دیا کرتا تھا۔ جنگ کی خبریں بھی بالالتزام دی جاتی تھیں۔ یورپ کی خبریں باوجود اس کے کہ یورپ میں اس زمانہ میں سیاسی بے چینی بہت زیادہ تھی، کم ملتی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں ہندوستانی یورپ کے حالات سے اس قدر کم واقف تھے کہ تشریح و تفسیر کے بغیر خبروں کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ممالک اسلامی کی خبروں سے کسی غیر معمولی دل چسپی کا اسعد الاخبار سے پتا نہیں چلتا۔ باوجود اس کے کہ وہ زمانہ روم و روس کی لڑائی کا تھا، اس جنگ کی کم خبریں اس اخبار میں ملتی ہیں۔ عجائب و غرائب اور جدید ایجادات کا ذکر اخبار میں بہت ہے۔ اور خبروں کے کالموں سے وکلا اور حکام کی مدح سرائی کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ اسعد الاخبار میں مقالات افتتاحی نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی خبروں کے ساتھ رائیں بھی ہوا کرتی تھیں، ان کا نمونہ اوپر گزر چکا ہے۔

اسعد الاخبار کو سیاسیات سے (حکام کی وقتاً فوقتاً مدح سرائی کے سوا، اور یہ بھی زیادہ نہیں) دل چسپی نہ تھی۔ لیکن بعض دوسرے اخباروں کی رائیں جو اس اخبار میں نقل ہوئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ سیاسی آزادی کے تصور سے لوگ قطعاً نا آشنا نہ تھے۔ انگریزوں کی زر پرستی اور ہوس ملک گیری سے بے خبر نہ تھے، گو محض دبی زبان سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ دیسی ریاستوں میں رعایا پر جو ظلم ہوتا تھا، اس کے متعلق زیادہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا تھا۔

ذیل کے اقتباسات سے یہ معلوم ہوگا کہ اس اخبار میں ادبی دل چسپی کا کیا کیا سامان ہوتا تھا' اور ادب یا ادیبوں سے متعلق کون کون سی خبریں شائع ہوئی تھیں :

میرزا غالب ۹۲ : ۹۳ میں پنج آہنگ غالب کا منظوم اشتہار درج ہے، اس کے متعلق مہتمم اسعد الاخبار بیان ہے کہ "یہہ اشتہار بسبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا" یہہ اشعار بظاہر غلام نجف (حکیم غلام نجف خاں) کے ہیں، لیکن اُن کے شاعر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ عجب نہیں کہ یہہ اشعار خود میرزا غالب کے ہوں۔" نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ نثر مصنفہٗ حضرت مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب جو اپریل مہینے میں قیمت بھیجے وہ تین رُپے اور جو اس کے بعد بھیجے گا چار رپے دینے پڑیں گے۔ نظم:

مژدہ اے رہ روانِ راہ سخن ۔۔۔ پایہ سنجان دست گاہ سخن
طے کرو راہ شوق زود از زود ۔۔۔ آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر ۔۔۔ دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کو سواد ارزانی ۔۔۔ چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا ۔۔۔ جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہ راہ دہلی ہے ۔۔۔ مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ ۔۔۔ گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ
ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار ۔۔۔ بار در جس کا سرو گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں ۔۔۔ نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر ۔۔۔ اخذ کرتا ہے آسمان کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری ۔۔۔ حبذا رسم و راہ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم ۔۔۔ ہے مقرر جو اب پے تعلیم
اُس کے فقروں میں کون آتا ہے ۔۔۔ کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے ۔۔۔ اُن کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
ورزش قصۂ کہن کب تک ۔۔۔ داستان شہہ دکن کب تک
تا کجا درس نثر ہائے کہن ۔۔۔ تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری وعرفی و طالب ۔۔۔ اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے ۔۔۔ اسداللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے دوست ۔۔۔ "ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے ۔۔۔ شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہہ قدر دان معنی ہے ۔۔۔ پادشاہ جہانِ معنی ہے

نثر اُس کی ہے کارنامۂ راز — نظم اُس کی نگار نامۂ راز
دیکھو اس دفتر معانی کو — سیکھو آئین نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ در ہوگا — سینۂ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تین بھیجے رُپے دو بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پے حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمہ انطباع جاری ہے — ابتدائے ورق شماری ہے"

دیوان تفتہ ۸۱ : ان دنوں دیوان تفتۂ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہہ دیوان تفتہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۶۴ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدم فرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔۔ شعرائے متاخرین میں ایسا فارسی کلام کسی کا کم دیکھنے میں آیا۔ اُس کی فصاحت کے اعتبار سے اگر تفتہ کو صائب وقت اور اُس کے وطن سکندر آباد کو اصفہان کہیے تو بجا ہے اور اس کا چھاپا اس کیفیت سے ہوتا ہے کہ ولایتی لیٹر[ؔ] کا غذ نہایت شفاف و آب دار اور اکیس سطر کا صفحہ بہ خط نستعلیق بہ قلم متوسط لکھا جاتا ہے۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزو سے زیادہ ہوگی اور اشعار پندرہ ہزار سے زیادہ ہیں۔۔ اس کی قیمت بالفعل چار رپے ہیں اور آج سے دو مہینے کے بعد چار رُپے آٹھ آنے اور پھر دو مہینے کے بعد پانچ رُپے ہو جائیں گے ... درخواست مع قیمت کے اس مطبع میں بھیج دیں۔ دیوان موصوف بعد اختتام طبع .. بہ سبیل ڈاک بہ صیغۂ بیرنگ بھیجی جائے گی (کذا) اور اس دیوان میں .. ہر غزل دو غزلہ" (ایک زمین کی دو غزلیں دی ہیں۔ دوسری غزل کا مقطع یہہ ہے:

ساقی بیار مے کہ نہ من تفتہ ام کنوں — نواب عہد خویشم و با خانم آشنا

لفظ "خانم" کے متعلق لکھا ہے کہ دریں لفظ چہ خوش ایہام ست۔ یہہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ منشی محمد ظہور علی خاں صاحب بہادر نائب و مختار کل ریاست ٹونک نے دیوان کے چھپوانے میں مالی مدد دی تھی، اور رائے جگل کشور وکیل محکمۂ عالیۂ صدر دیوانی نے بہ نظر اعانت مصارف طبع ۲۰

جلدوں کی قیمت اشاعت سے پیشتر ادا کردی تھی) نمبر ۱۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء تک دیوان ربع سے کچھ زیادہ چھپ چکا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ہی ثنا خواں ہیں" نمبر ۱۲۸ سے پتا چلتا ہے کہ بارھویں نومبر ۱۸۴۹ء تک ۳۰۴ صفحے چھپ چکے تھے۔ اس نمبر میں نمونۂ کلام بھی ہے۔

غلام امام شہید: نمبر ۱۱۶ میں یہ خبر درج ہے، بہ ظاہر اس کا تعلق اس مقدمے سے ہے جس کا ذکر نمبر ۱۲۱ وغیرہ میں ہے "۱۰ اگست کو محکمۂ صدر دیوانی میں نو اشخاص بڑے ذی عزت کہ بعض اُن میں اپنے عہدے کی رو سے سر رشتے کے ایک رکن رکین تھے، مراد آباد کے کسی مقدمے میں بہ اشتباہ رشوت ستانی حوالات میں گئے اور کہتے ہیں حکم یہ ہوا ہے کہ تحقیقات کے لیے مراد آباد بھیجے جائیں۔ امید کہ بعد تحقیقات کے بہ ثبوت بے جرمی کے رہائی پائیں" ۱۲۵ "ہولسن صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ مراد آباد اکبر آباد میں داخل ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اب یہاں رہ کر عملۂ صدر کے مقدمات کی تحقیق کریں گے" ۱۲۶ "ہولسن صاحب.. جس کام پر.. مامور ہوئے ہیں اُس کی تحقیقات میں سرگرم ہیں"۔

۱۳۴ "منشی رسول بخش اور نہال الدین محرر نے جو عملۂ صدر سے مراد آباد کی فوج داری میں ماخوذ ہو کر دورہ سپرد ہوئے تھے دورے سے سزا پائی۔ منشی موصوف چار سال کی میعاد اور محرر مذکور کو تین سال کو بلا مشقت قید ہوئی۔ اور اور لوگ جو ہولسن صاحب کے حسب الطلب مراد آباد گئے ہیں اُن کا مقدمہ وہاں در پیش ہے۔ نہیں معلوم انجام کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے"

۱۴۱، " یہ کمترین.. (یعنی مہتمم اسعد الاخبار) جو بہ تقریب ادائے شہادت نیک معاشی مولوی آل حسن صاحب منصف کے مراد آباد کو گیا تھا سو بعد ادائے شہادت مراد آباد سے رخصت ہو کر ہفتۂ گذشتہ میں وارد اکبر آباد ہوا" ۱۴۸ "عمال صدر کا مقدمہ جو مراد آباد میں دائر تھا صاحب سشن جج کے محکمے میں اس نہج سے فیصل ہوا۔ مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و مولوی غلام امام صاحب پیش کار و منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں تین سال، اور مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن صاحب منصف دو دو سال۔ اب ان صاحبوں کا اپیل صدر میں دائر ہوا اور مسل مقدمہ مراد آباد سے صدر میں طلب ہوئی۔ اللہ اپنے فضل و کرم سے سب صاحبوں کو بری کرے" ۱۵۳ (۶ مئی ۱۸۵۰ء) "عملۂ صدر ماخوذۂ مراد آباد کا مقدمہ جو صدر نظامت آگرہ میں اپیل ہوا تھا، اس میں تین شخصوں کی بہ اتفاق رائے دو حاکم کے رہائی ہوئی، وہ تینوں اشخاص یہ ہیں: مولوی سید آل حسن صاحب منصف، مولوی غلام امام صاحب شہید پیش کار صدر، منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں صدر۔ اب تین اشخاص مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و منشی سراج الدین صاحب پیش کار و مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں جو باقی رہے، بفضلہ تعالیٰ

حاکم سوم کی رائے سے یہ بھی رہائی پائیں گے" ۱۵۵" مولوی سید آل حسن .. و منشی سید محمد قاسم جنھیں .. رہائی ہوئی ہے داخل اکبر آباد ہوئے۔ اغلب کہ اب اپنے اپنے کام پر بحال ہوں مولوی غلام امام صاحب .. بالفعل مُراد آباد سے رام پور کو چلے گئے ہیں، جس وقت کہ یہاں آئیں گے غالباً وہ بھی اپنے کام پر بحال ہوں گے" ۱۵۶" مولوی غلام جیلانی .. اور منشی سراج الدین .. اور مولوی بدر الحسن .. کے حق میں فیصلہ ضلع کا بحال رہا۔ اکثر اشخاص اس سانحے کا ملال و افسوس کرتے ہیں۔ اب ظاہرا ان کی بریت کی بجز اس کے کہ فضل ایزدی شامل حال ہو اور اپیل ولایت سے رہائی کا حکم ہو اور کون صورت باقی ہے۔ اللہ ان بزرگواروں کی مشکل آسان کرے۔"

گلدستۂ انجمن مصنفۂ منشی واجد علی خاں صاحب مہتمم زبدۃ الاخبار۔: ۹۰" ہر ایک خاص و عام پر ظاہر ہے کہ ایک مدت سے حکام وقت کی کچہریوں میں تحریر زبان اُردو کی جاری ہے اور کاغذات معاملات و مقدمات دیوانی و فوجداری و کلکٹری اس زبان میں لکھے جاتے ہیں اور تحریر فارسی یک قلم موقوف ہوگئی ہے مگر اہل دفتر کہ نوشت و خواند فارسی کے عادی تھے جو کچھ مطلب اور مضمون زبان اردو میں لکھتے ہیں وہ بعینہٖ گویا ترجمہ فارسی کا ہوتا ہے اور اُردو کے محاورے اور روز مرّے کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ زبان اُردو زبان اہل ہندوستان کی ہے مگر تحریر اور تقریر میں بہت فرق اور تفاوت ہے .. ہر ایک زبان کے اہل علم جب کچھ مطلب لکھتے ہیں تو بہ نسبت ان کی تقریر کے تحریر کی فصاحت اور بلاغت کچھ اور ہی ہوتی ہے اور وہ .بغیر پڑھے کسی کتاب کے کہ جس میں قاعدے اور اصول اور محاورات اور اصطلاحات اور کنایات وغیرہ منضبط ہوں ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔ زبان اُردو میں بہت سی مثنویاں اور دیوان اور قصے کہانی کی کتابیں تصنیف ہوئیں اور ان کتابوں میں مصنفوں نے محاورات .. کو بڑی خوبی و لطافت سے بیان کیا ہے مگر ایسی کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہوئی کہ جس کے پڑھنے سے جو لوگ کہ زبان اُردو سے ناواقف ہیں اور شوق سیکھنے کا رکھتے ہیں ان کی زبان درست اور آراستہ ہو اور محاورات سے بخوبی واقف ہوں اور جو کہ محاورات اردو سے واقف ہیں ان کی بھی آنکھیں کھل جائیں۔ اس واسطے اس خاکسار .. مہتمم زبدۃ الاخبار نے ایک کتاب کہ جس سے وہ سب فائدے حاصل ہوں تصنیف کی اور نام اس کا "گلدستۂ انجمن" رکھا ہے۔ خوبی اور لطافت اس کتاب کی دیکھنے پر موقوف ہے اگر ہم کچھ اپنی زبان سے بیان کریں تو مناسب اور زیبا نہیں ہے ... اور اس کتاب کی تیرہ سطر کے صفحوں سے بیس جز کی ضخامت ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس ہفتے سے مطبع زبدۃ الاخبار میں اس کتاب کا چھاپا شروع ہوگا اور کوئی مانع پیش نہ آئے تو دو اڑھائی مہینے میں چھپ کر تیار ہو جائے گی ... قیمت اس کی آج کی تاریخ سے پندرہویں رکذا، مارچ سنۂ حال تک کہ

ایک مہینا کامل ہو چار رُپے ہیں اور بعد اس کے کچھ بڑھ جائے گی۔۔ اس کتاب کی اس قیمت قلیل میں نہایت ارزاں سمجھیں۔۔ اس کی خریداری سے دریغ نہ فرمائیں کہ اس خاکسار نے کیا کیا خون جگر کھا کر۔۔ اس گوہر بے بہا کو مرتب کیا ہے اور لوگوں کے فائدے کے واسطے قیمت اس کی کم کر کے نقصان اپنے ذمے لیا ہے۔ اگرچہ میر انشاء اللہ خاں مرحوم نے ایک رسالہ کہ نام اس کا دریائے لطافت ہے، محاورات اُردو میں تصنیف کیا ہے اور جان گلکرسٹ صاحب نے چند اوراق قواعد صرف و نحو اُردو میں لکھے ہیں۔ اگر ہم اس کی شرح کریں تو زیبا نہیں، مثل مشہور ہے چھوٹا مُنہ بڑی بات مگر جن صاحبوں نے دریائے لطافت اور رسالۂ جان گلکرسٹ کو ملاحظہ فرمایا ہے جب اس گلدستۂ انجمن کو بچشم انصاف مطالعہ فرمائیں گے تو اس وقت حقیقت ہر ایک کی اُن پر بہ خوبی ظاہر اور روشن ہو جائے گی۔ تفصیل اس کتاب کے بابوں کی۔ پہلے باب میں حروف تہجی کے قاعدے ہیں اور ہندی کے مصدروں کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ہندی مثلوں کا بیان ہے جو اہل اُردو کے محاورے میں آتی ہیں تیسرے باب میں مصدروں اور لغات محاورہ کے معنیوں (کذا) کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اصطلاحات اور کنایات کا بیان ہے پانچویں باب میں ہندی صرف و نحو کا بیان ہے۔ چھٹے باب میں علم معانی و بیان کا ذکر ہے۔ ساتویں باب میں علم حساب کا بیان ہے۔ آٹھویں باب میں مراسلات و مکاتبات ہیں نویں باب میں دلی اور لکھنؤ کے ہر ایک فرقے کے محاورات کا بیان ہے" ۹۱ اس نمبر میں مہتمم اسعد الاخبار نے گلدستۂ انجمن کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ اس کے چند فقرے یہہ ہیں: "تحصیل قواعد زبان اُردو کے لئے ایسی کتاب اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔۔ مخفی نہ رہے کہ زبان اُردو کا عجب حال ہے اگرچہ یہہ زبان اہل ہند کی بولی ہے مگر اس کی تحریر میں اکثر اشخاص عاری ہیں" مولوی منشی واجد علی خاں صاحب نے جن کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا حال ہندوستان میں ہر فرد بشر خصوصاً اہل علم پر اظہر من الشمس ہے ایسی کتاب تصنیف کی کہ گویا اُردو کی شاہ راہ میں ایک چراغ روشن کر دیا" [illegible] اس نمبر میں کتاب کا تبصرہ مہتمم اسعد الاخبار کی طرف سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا [illegible] حسب [illegible] مطبوع نہ ہو سکا۔ چند فقرے یہہ ہیں "گلدستۂ انجمن۔۔ جو [illegible] اہتمام جناب مصنف کے طبع ہوئی تھی اور کئی بار اخبار ہذا میں اس کے اوصاف حمیدہ سے کچھ کچھ مرقوم ہو چکا ہے اب۔۔ [illegible] ساری کتاب تیرہ سطر کے صفحے سے ۲۷ جز کی ضخامت ہوئی۔۔۔ پہلے باب میں حروف تہجی [illegible] مصادر ہندی کا بیان ہے۔ دوسرے میں ضرب المثل ہندی تیسرے میں مصادر و لغات ہندی۔ چوتھے میں اصطلاحات و کنایات اُردو پانچویں میں تذکیر و تانیث لغات عربی و فارسی و ہندی بہ موجب محاورہ اُردو چھٹے میں اردو صرف و نحو۔ ساتویں میں علم معانی و بیان۔ آٹھویں میں حساب کے اصول و ضوابط۔ نویں میں علما و حکما و شعرا وغیرہ کے محاورات۔ دسویں میں آداب تحریر مراسلات و مکاتبات علی حسب مراتب

.. جناب مصنف کی ہمت اور سیر دلی یہاں تک ہے کہ ہر چند کہ ضخامت دونی ہوگئی لیکن .. وہی پہلی قیمت رکھی"۔ ۱۲۲ ۔ اس نمبر میں گلدستۂ انجمن سے ایک خط بہ طور نمونہ نقل کیا گیا ہے:

میر صاحب عالی قدر سلامت، ایک ہنگی آنب (کذا) جو بہ کمال شفقت سیکشن کہار کے ہاتھ آپنے بھیجا ہے بہ سلامت پہنچے۔ رقعے میں جتنے دانے کہ شمار میں لکھے تھے وہ سب گنتی میں درست نکلے حق یہہ ہے کہ کہار ہنگی کو بڑی خبرداری سے لایا کہ ایک دانے کو بھی اُن میں سے ضائع دخراب ہونے دیا سبحان اللہ کیا خوب آنب ہیں کہ اُن کی شادابی و چاشنی کے بیان سے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے اور حلاوت و شیرینی کے بیان میں لب سے لب وصل ہو جاتا ہے۔ اگر حوران بہشتی دنیا میں آکے ایک قاش اُس کا کھائیں تو اس قدر محو لذت ہو جائیں کہ دنیا سے بہشت بریں کو ہرگز پھیر (کذا) نہ جائیں۔ سیندریا اگرچہ چاشنی دار و نہایت لذیذ ہے مگر ہر پل کچھ اور چیز ہے۔ اس لطف و ذائقہ کا آنب آج تک اس دیار میں کھانے میں نہیں آیا اور نہ کسی جگہ سُراغ و نشان اُس کا پایا۔ وصف میں اُس کے دل میرا مسرور ہے اور ادائے شکر میں اس نعمت کے زبان میری معذور ہے۔ حق تعالیٰ کی عنایت سے خانۂ شفقت آباد اور دل آپ کا ہمیشہ خرّم و شاد رہے فقط زیادہ والسّلام"

اس نمبر میں ایک قطعۂ تاریخ اختتام کتاب خود مصنف کی تصنیف سے شائع ہوا ہے۔ آخری بیت یہہ ہے: سر وجد سے عقل نے دی نشاں جہاں میں یہہ گلشن بے خزاں (۱۲۵۹+۶)

مطلع العلوم و مجمع الفنون مصنفۂ منشی واجد علی خاں: اس نام کی ایک کتاب مطبوعۂ مطبع زبدۃ الاخبار کا اشتہار نمبر ۸۸ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اواخر دسمبر ۱۸۴۸ء میں یہہ کتاب چھپ کر تیار ہوگئی تھی اور اس کی قیمت دس رُپے تھی۔

دیوان نیاز بریلوی فارسی و اُردو: ۸۶ میں سید جعفر علی بے تاب اکبرآبادی طالب علم مدرسہ اکبرآباد کی طرف سے یہہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ نیاز کا دیوان مطبع قطب الاخبار میں خط شیخ احمد حسین ناز (خوش نویس کامل شاعر شیریں زبان) اور بہ اہتمام منشی محمد امیر خاں چھپنا شروع ہو گیا ہے۔ ربیع الاوّل کے آخر تک قیمت ایک رپیا، ربیع الآخر تک سوا روپیا، اور اس کے بعد ڈیڑھ رپیا مقرر کی گئی تھی۔ ۹۵ میں اس کے بارے میں یہہ لکھا ہے کہ ضخامت قریب ۷ جز کے ہے اور نصف کے قریب چھپ چکا ہے۔ ۱۰۳ (جمادی الاخریٰ ۱۲۶۵ھ) سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک چھپ چکا تھا، لیکن قیمت صرف ایک رپیا تھی۔

سکندر نامہ اُردو سید اعظم علی: ۱۳۱ میں یہہ اشتہار مہتمم اسعد الاخبار کی طرف سے مندرج ہے: "سکندر نامہ بہ نظم اُردو (کرم خوردہ) جناب سیادت مآب عمدۂ رؤسائے شہر اکبرآباد سید اعظم علی صاحب

ـــــــــــــــ

۵ ۸۱ میں یہہ اطلاع ہے کہ چھپ کر تیار ہے "تمام علوم و فنون سے اس میں بحث کی ہے"۔

میر منشی سابق مدرسۂ سرکار جو ابتدا میں بہ مطبع اکبری واقعۂ آگرہ چھپنا شروع ہوا تھا اور قریب بہ نصف وہاں چھپا، بعد ازاں اس مطبع میں آیا تھا، اب اختتام کو پہنچا۔۔ جن صاحب کو خریدنا منظور ہو تا عرصۂ یک ماہ فی جلد تین رُپے۔۔ بعد یک ماہ فی جلد چار رُپے قیمت ہو جائے گی، اور لطف کیفیت کتاب اُس کے دیکھنے پر منحصر ہے۔ جناب مترجم نے۔۔ گویا سحر کیا ہے کہ ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کیا ہے۔"
مفتاح التواریخ مصنفۂ بیل ؛ ۱۱۹ میں اس مشہور کتاب کے طبع اوّل کا اشتہار درج ہے جس کے اقتباسات یہہ ہیں : نسخۂ دل پسند مفتاح التواریخ جو اس مطبع میں منطبع ہوتا تھا اختتام کو پہنچ کر مجلد و مرتب ہوگیا۔۔ تیاری میں دیر جو واقع ہوئی اُس کا سبب یہہ ہے کہ۔۔ مسٹر طامس ولیم بیل صاحب ملازم محکمۂ صدر بورڈ کو اوّل تو یہہ منظور ہوا کہ۔۔ ملتان کے حال پر تمام کریں سو فتح ملتان کے انتظار انتظار میں مسودے کا اتمام ملتوی رہا۔۔ بعد ازاں فہرست بنانے میں دیر لگی ورنہ یہہ کتاب اوائل ۱۸۴۹ء میں تمام ہو جاتی۔۔۔ اب تک اس کی قیمت فی جلد آٹھ رُپے تھی، جس جس نے قیمت پیشگی داخل کی تھی اب اُن کے پاس بھیجی جائے گی اور آیندہ سے فی جلد عـ۵ قیمت ہوئی۔ اس کی تقطیع شیورام پوری کاغذ کے تختے کے چار ورق ہیں اور ۲۵ سطر کا صفحہ ہے۔"
تذکرہ گلشن بے خزاں مصنفۂ حکیم قطب الدین باطن اکبر آبادی ؛ اس ہیچ مداں نے ایک تذکرۃ الشعرا گلستان بے خزاں نام بہ جواب تذکرۂ گلشن بے خار تالیف نواب محمد مصطفٰے خاں دہلوی شیفتہ تخلص کے تالیف کیا ہے اور طرز اس کی برعکس طرز گلشن بے خار کے ہے کہ اُس کے مؤلف نے بہ راہ استغنا مزاجی کے شعرا کی تحقیر اور اکثر ترک اسم نویسی شاعران ذوی الاقتدار اور صفت اپنی اور اپنے دوستوں کی لکھی ہے اور اس احقر نے۔۔ سب کو حسب مراتب بہ تعظیم یاد کیا ہے۔۔ وے صاحب جن کی نظر سے۔۔ گلشن بے خار بھی گزر گیا ہوگا وہ جا نیں گے کہ مؤلف تذکرۂ ثانی نے مؤلف اوّل کے کلام کو کس منصفی و لطافت سے رد کیا ہے۔۔ اس کی ضخامت تخمیناً ۲۴ جزو اور قیمت فی جلد ۳ رُپے ہوگی۔۔ جس کو اس کی خریداری منظور ہو خالی درخواست بلا زر ثمن بہ طور پوسپیڈ (کذا) بہ پتہ (کذا)، و نشان تاج گنج محلہ کٹرۂ عمر خاں کے میرے پاس بھیج دیں جب اس کا چھپنا شروع ہوگا تو قیمت اہل درخواست سے منگوالی جائے گی۔" ۱۱۹

قاضی عبدالودود

# انجام تصور

(۱)

شب غم تصور نے تصویر کھینچی — شبیہ درستیٔ تقدیر کھینچی
یکایک اجالا ہوا میرے گھر میں — کوئی ہنس رہا تھا لباس قمر میں
قیامت کی میٹھی رسیلی ہنسی تھی — جوانی کے پانی سے بھیگی ہوئی تھی
اداؤں کا انداز بدلا ہوا تھا — حیا سوئی تھی بانکپن جاگتا تھا
اُن آنکھوں کے ڈورے جو تھے ارغوانی — ٹپکتی تھی پلکوں سے پیہم جوانی
وفا کی اُن آنکھوں میں ہلکی جھلک تھی — چمکتی ہو جیسے کہیں دُور بجلی
کھلے بال کاندھوں پہ لہرا رہے تھے — مقدر کے الجھاو سلجھا رہے تھے

(۲)

اٹھے ہاتھ مشتاق کے بے تحاشا — کہ آ! اے سکون دل مضطرب آ!
اُتر جا مرے دل کی گہرائیوں میں — پہونچ جا تصور کی پہنائیوں میں
مری روح سے آکے پیوست ہو جا — میں پاؤں تجھے اور تو مجھ میں کھو جا

(۳)

بڑھی اور سینے سے تصویر لپٹی — گرانی نیرنگ تقدیر لپٹی
دبی بار احساس سے ناتوانی — بنی سنگ غم جو گھٹے کی گرانی
بہم پٹریاں ٹوٹ کر مل رہی تھیں — تصور کی چاروں حدیں ہل رہی تھیں
نہ چاند اور نہ اسکی ہنسی کا سماں تھا — وہی رات اندھیری وہی آسماں تھا
رہے حسب دستور دل کے سہارے — وہی چند آنسو وہی چند تارے

محمد مصطفی جوہر

# تاریکی و روشنی

دور مغربی افق پر آفتاب ڈوب رہا تھا اور وقتاً فوقتاً جب آسمان پر اڑتے ہوئے سیاہ و سفید بادلوں کے ٹکڑے اُس کو اپنے دامن میں چھپا لیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ قیصر کے مکان کی اُس کھڑکی سے، جو پچھم کی جانب کھلتی تھی، چند شعاعوں کی لکیریں داخل کر کے، اس کی خوابگاہ کو کچھ دیر اور روشن رکھنے کے لئے بیتاب ہے۔

اُس وقت، قیصر اپنے کمرہ میں سے اس قرمزی رنگ کی شاہراہ کا جایزہ لے رہا تھا جو پورب سے بل کھاتی ہوئی آتی تھی اور نہ جانے پچھم میں کہاں تک چلی گئی تھی اور جس کے کنارے چند نیم کے نوخیز درختوں کی قطار بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ کمرہ میں کھڑکی کے سامنے چوکی پر صاف ستھرا فرش تھا اور چوکی کی دائیں بائیں کی دیواروں سے متصل دو پلنگ رکھے ہوئے تھے جن پر نہایت سلیقہ سے بستر لگا ہوا تھا۔ اُس کمرہ میں اور دوسری چیزیں بھی مختلف جگہوں پر اس طرح رکھی گئی تھیں کہ دلکش معلوم ہو رہی تھیں اور آراستہ کرنے والے کے ذوق سلیقگی کا بین ثبوت تھا۔

قیصر نے ابھی ابھی عصر کی نماز ختم کی تھی اور وہ جا نماز ہی پر بیٹھا تھا کہ اُس نے محسوس کیا، مشرق سے تیز ہوائیں بہنے لگی ہیں اور اُن ہواؤں کے ساتھ ساتھ قرمزی شاہراہ کے قرمزی غبار اڑنے لگے ہیں۔ اُس کی نگاہوں نے اُن اڑتے ہوئے غبار کا تعاقب کیا اور جب ان کا پیچھا نہ کر سکیں تو نیم کی ان شاخوں کی طرف مبذول ہو گئیں جو رہ رہ کر اس طرح خم کھا رہی تھیں جیسے وہ گرد و غبار سے ملوّث ہونا ناپسند کرتی ہوں ـــــ اور اس کو خیال ہوا کہ مشرق سے یہ تیز ہوائیں کیوں آرہی ہیں؟ یہ غبار مغرب کی طرف کیوں اڑے جا رہے ہیں؟ اور یہ آفتاب کیوں ڈوب رہا ہے؟ اور یہ روشنی کیوں معدوم ہوا چاہتی ہے؟

ـــــ اُس کا جی چاہا کہ ہوا رک جائے، غبار اڑنا بند ہو اور آفتاب نہ ڈوبے!

مگر نہ ہوا رکی، نہ غبار نے اڑنا بند کیا، اور آفتاب جس کا چہرہ غالباً تاریکی کے خوف سے زرد ہو رہا تھا، آہستہ آہستہ ڈوب گیا اور تاریکی اپنا قدم جمانے کی سعی میں مصروف ہو گئی!!

---

اُس نے ارادہ کیا کہ وہ آج مغرب کی نماز نہیں پڑھے گا۔ گذشتہ بیس برسوں میں اتفاق ہی سے اُس کی نمازیں قضا ہوئی تھیں۔ خدا کا خوف، پرہیزگاری، توکل، محنت اور استقلال ـــــ ان چیزوں کی خاطر اُس نے رنج و الم کو پاس بھٹکنے بھی نہ دیا تھا۔

مشکلات اُس کے سامنے آئی تھیں اور اُس نے اُن کا مقابلہ کیا تھا۔ کبھی اُس کو شکست

ہوئی تھی اور کبھی فتح، جب اُسے کامیابی ہوتی وہ خوش ہوتا اور اس کا اعتماد اپنے میں اور اپنے خدا میں بڑھ جاتا۔ ناکامیابی سے وہ ہمت نہ ہارتا، بلکہ اس کو بھلا دیتا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی میں سکون اور لطف پیدا کرنے کا واحد راز جفاکشی اور اپنے کو مشغول رکھنے میں ہے۔

لیکن آج اُس کا ایمان متزلزل اور استقلال لرزہ براندام ہو رہا تھا۔ آج اُس کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔ مرحوم والد کے جمع کئے ہوئے روپئے ختم ہو رہے تھے اور اس کی وکالت اتنی کامیاب نہ ہو سکی تھی جتنی وہ چاہتا تھا۔ اُس کی معاشی حالت کا معیار کافی بلند تھا اور تجارت سے بھی اُس کو سخت نفرت تھی۔

کیا اُس نے اپنی ساری زندگی کوششوں میں صرف نہیں کر دی تھی؟ کیا وہ کبھی بھی پست ہمتی کی طرف رجوع ہوا تھا؟ کیا اُس نے اپنی شادی ایک مالدار کی بیٹی سے کرنی نامنظور نہیں کر دی تھی؟ اور کیا اُس نے غریب عندلیبہ سے بیاہ اس لئے نہیں رچایا تھا کہ سماج کی درستگی ہو سکے؟ اور کیا اُس نے کبھی بھی خدمت خلق سے مُنہ موڑا؟؟ —— یہ تھے وہ سوالات جو قیصر کے دل میں اُمنڈ رہے تھے۔ کاش! سرکاری وکیل کا عہدہ مجھے مل جاتا!" اس کے دل میں بڑی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ اور پھر اُس نے محسوس کیا کہ اس کا کوئی بھی مددگار نہ تھا۔ سب اُس کے دشمن تھے اور منیرؔ، اس کا سب سے عزیز دوست اور "خدام ملت" کا صدر، بھی تو اُس کے خلاف کارروائیاں کر رہا تھا! اور اُس کو وہ منظر یاد آ گیا جب کہ منیرؔ اُس سے چشم پوشی کرکے دوسری طرف چلا گیا۔ باوجودے کہ وہ اُس سے کچھ باتیں کرنی چاہتا تھا۔

خیالات کے ہجوم میں وہ اپنا ارادہ بھول بیٹھا۔ شاہراہ پر اور افق پر تاریکی پھیل رہی تھی اور مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ نماز میں مشغول ہو گیا۔ مگر فوراً ہی اُسے اپنا ارادہ یاد آ گیا اور اُس نے چاہا کہ سلام پھیر کر تحریمہ توڑ دے۔ پھر اُس نے سوچا: تین رکعتوں کو ختم کرنے میں دیر ہی کیا لگے گی"! —— لیکن بیچارا انسان جب شبہات و گمراہی کے سمندر میں ہچکولے کھاتا ہوا ہوتا ہے تو اُس کا نیکی کی طرف رجوع ہونا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے! قیصر، تصورات کے بے پناہ سیلاب میں پھر بہہ گیا۔ اُس کی زبان چل رہی تھی، آیات قرانی ادا ہو رہے تھے۔ مگر صحیح یا غلط اس کا اُس کو کچھ علم نہ تھا۔ اُس وقت تو اس کو اپنے والد کا وہ جملہ یاد آ رہا تھا جو انہوں نے موسم بہار کی ایک شام میں، سرخ گلاب کی جھاڑیوں کے نزدیک، گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ہوئے کہا تھا۔ "بیٹے! کامیاب زندگی اُسی کی ہے جو اندھا دھند کوشش کرتا ہے اور نتیجہ کی فکر نہیں کرتا ...... اور تم قرآن پاک کی ہدایتوں کو بھی دل سے قبول کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو قرآن کو اپنا رہبر بناتا ہے ہم اس کا راستہ نیکی کی طرف آسان کر دیتے ہیں" —— قرآن کا خیال آتے ہی ایسا

معلوم ہوا جیسے قیصر کے ہوش نے پلٹا کھایا ہو۔ اور خدا اور خدا کے احکام کا خیال کرکے، مذہبیت کا وہ ابدی جذبہ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں تھا، جاگ اٹھا۔ اور اُس نے کوشش کی کہ وہ نماز خشوع وخضوع سے ادا کرے۔ مگر آیندہ کی اقتصادی و معاشی مشکلات، سرکاری وکیل کا عہدہ، اور دوست و دشمن کا معاملہ اُس کا پیچھا آسانی سے کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ عقرب کی نیش کا نشان آسانی اور جلدی سے تھوڑا ہی غائب ہو سکتا ہے۔

فرض کے بعد آج اُس نے دعا بھی نہ مانگی۔ اُس وقت اس کو خیال ہو رہا تھا: "وہ کس سے رحمت کا طلبگار ہو؟ اور اُس کا جی بالکل نہ چاہا کہ دو رکعتیں سنت کی بھی وہ پڑھ ڈالے — اور قرمزی شاہراہ کو وہ پھر بغور دیکھنے لگا، شاید یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تاریکی روشنی پر کس طرح چھا جاتی ہے! وہ تاریکی سے مسحور ہوا جا رہا تھا!

---

کچھ ہی وقفہ کے بعد کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک بلوریں ہاتھ نے دروازے پڑے ہوئے گلابی سبز رنگ کے کریپ کے پردہ کو ایک طرف آہستہ سے سرکا دیا۔ یہ عندلیبہ تھی جو قیصر کو خیالات میں غرقاب دیکھ کر ایسے استعجاب میں پڑ گئی جس میں پریشانی کا بھی عنصر شامل تھا۔

اُف رے قیصر کے خیالات اور عندلیبہ کا استعجاب!!

عندلیبہ نے ایک ساعت اور انتظار کیا اور پھر کچھ خیال آتے ہی اُس نے پردہ کو تھام کر، ہاتھ کو اس انداز سے متحرک کیا کہ سُبک و نازک چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں اور کمرہ میں ایک عجیب ہلکی سی جھنکار پھیل گئی جیسے جھانجھ کی آخری لے آہستہ خرام ہوا کے دوش پر بہت دور تک چلی گئی ہو۔

قیصر نے گھوم کر دروازہ کی طرف دیکھا:۔ وہ برآمدہ سے آتی ہوئی روشنی کے عکس میں مُسکرا رہی تھی اور اُس کے کانوں میں مینا کاری کئے ہوئے آویزے اس طرح جھوم رہے تھے، جیسے وہ اُس پیکر جسم کے شباب کی شمیم سے وجد میں آگئے ہوں، وہ آبِ رواں کی ہلکی سبز ساری میں ملبوس تھی — اُس نے سر کے آنچل کو ایک خاص انداز سے سنبھالا اور اپنی پشت کو دروازہ کے پلڑے سے لگا کر پھر مسکرائی اور بولی:۔ میں تو یہاں کھڑی ہوں اور آپ مجھے تصورات کی کن دنیاؤں میں ڈھونڈ رہے ہیں؟ ۔ چوڑیاں ایک بار پھر ٹکرائیں اور کمرہ میں ایک بار پھر جھنکار پیدا ہوئی شاید اس لئے کہ وہ اُس کی آواز کی موسیقیت سے ہم آہنگ ہونا چاہتی تھیں!

قیصر کے جذبات کی موجوں کا رخ یکایک بدل گیا۔ کیونکہ عندلیبہ کی اُس محبت بھری آواز نے جو ہندوستان کے شریف مسلمان گھرانوں کی تعلیم یافتہ اور ہوشمند بہو بیٹیوں کی خاص

چہرے پر، بہت گہرا اثر کیا تھا۔ عندلیبہ کی فسوں ساز آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں: "آج محبت کے دیوتا کی چمک تمہارے چہرے سے کیوں غائب ہے؟" قیصر کا دل بھر آیا ساری کائنات میں صرف وہی اُس کی ہمدرد و غمگسار تھی اور صرف اُسی پر اعتبار و اعتماد کر سکتا تھا سب دشمن تھے، اور کسی منطقی کا کہنا کتنا درست تھا" خدا کی ذات ایسی نہیں جو انسانوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دخل اندازی کرتا ہے!

جذبات کا طوفان جو ابھی تک دل کی گہرائیوں تک محدود تھا بڑھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے جسم میں دوران خون رُک گیا ہو۔ اُس کے تمام اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور اُسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کی طبیعت بے اختیار چاہی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عندلیبہ انداز گریہ دیکھکر اُس کے نزدیک رکھی ہوئی کرسی کی طرف لپکی اور خوشی کی چمک اپنے چہرہ پر پیدا کرتی ہوئی بولی:۔ "آج میں آپ کو ایک خوشخبری سناؤں؟" وہ خاموش رہا۔ عندلیبہ نے فوراً" اضافہ کیا: ".... لیکن ابھی تو آپ کو بتانا مناسب نہیں ہے!۔؟

"وہ کیوں؟" قیصر بولا، اُس نے اپنے کو رونے سے روک لیا تھا۔

"اس لئے کہ وقت سب سے اچھا مخبر ہے!—" وہ ایک لحظ خاموش رہی اور پھر قیصر کی شخصیت پر تبسم کی شعاعیں نچھاور کرتی ہوئی بولی:۔ "خدا کا کرنا ہوا تو اب ہم لوگ اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ [illegible] میں ننھے کے لئے ایک خوبصورت سا جھولا ضرور خرید دوں گی۔ ہاں! میں ابھی تجھے [illegible] کی کرامت!"—

قیصر کو ایسا معلوم ہوا جیسے سوکھی شاخوں پر کونپلیں پھوٹ پڑی ہوں۔ مری ہوئی امید زندہ ہو گئی [illegible] یہ خیال تیزی سے رینگتا ہوا آیا۔" کہیں سرکاری وکیل کے عہدے کے متعلق کوئی بات تو ہوئی!" لیکن اُس نے اپنی اس خواہش جستجو کو دبایا۔ ایک نہایت ہلکی سے مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ اور اُس نے کہا: "خبر تو آپ پیچھے سنائیں گی۔ لیکن پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ روشنی کیوں نہیں جلاتیں؟ — اور جب کہ عندلیبہ بجلی کی روشنی کا بٹن دبا رہی تھی اُس نے پوچھا کہ ننھا کہاں ہے؟

عندلیبہ نے اپنی سحر انگیز آنکھیں قیصر کی آنکھوں میں ڈال دی اور مسکرا پڑی۔ وہ اپنی [illegible] پر نازاں و مسرور تھی! فوراً بولی:۔ "جمنا کی گود میں اور کہاں؟" اور جس وقت عندلیبہ نے "اور کہاں؟" کے الفاظ کو اپنی گردن کو ذرا خم دیکر، ادا کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے نیلے آسمان پر کالی گھٹا کی اوٹ سے، چاند جھانک کر یہ کہہ رہا ہو کہ میری نرم و نازک اور سکون آمیز شعاعیں صرف اس لئے ہیں کہ تم میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھو!— قیصر کی زرد مسکراہٹ، حسین و لطیف و نشاط تبسم میں بدل گئی اور اُس نے پوچھا:۔ "خیر۔ وہ کون سی

خوشخبری ہے ؟ ذرا میں بھی تو سنوں !

"واہ !! کیوں کہوں ؟ سنی سنائی بات کا بھی کوئی ڈھنڈورا پیٹتا ہے ! ـــ اللہ جانے صحیح ہے ، یا غلط !"

"ذرا کہہ دیجئے ! اور اگر آپ ڈھنڈورا پیٹنے سے گھبراتی ہیں تو سرگوشی ہی کے لہجہ فرمائیے"

"بات صرف اتنی سی ہے کہ آپکے کچہری چلے جانے کے بعد کلیم بھائی مجھ سے ملنے آئے تھے' وہی کہہ رہے تھے کہ سرکاری حلقہ میں عام خیال ہے کہ سرکاری وکیل کے عہدہ کے لئے آپ سے زیادہ کوئی بھی موزوں نہیں" !

"خوب کہی ! میاں کلیم کو سرکاری حلقہ کی باتیں کیسے معلوم ہوگئیں ؟"

"کہیں معلوم ہوگئی ہوگی ! یہ بھی کوئی بات میں بات ہے ۔ لیکن میں نے تو پہلے ہی کہا کہ بات سنی سنائی ہے ـــ ہاں ایک بات آپ کو معلوم ہے ؟ میں نہ کہتی تھی کہ آپ کے مُنیر صاحب کے لچھن اچھے نہیں ! جانتے ہیں' وہ آپ کے خلاف ہیں اور کسی دوسرے کے لئے کوشش کر رہے ہیں !

مُنیر کا نام آتے ہی قیصر پژمردہ ہوگیا ۔ اور اُس نے نہایت سنجیدہ ہوکر کہا کہ" خیر جو کچھ ہونے والا ہے وہ تو ہو ہی گا' مُنیر سر پٹکا کریں' اس سے کیا ہوتا ہے ؟ ـــ ذرا کھانا منگواؤ "

عندلیبہ باورچی خانہ کی طرف یہ کہتی ہوئی روانہ ہوگئی : "کیسا دھوکہ دیا اُس نے آپ کو"

قیصر نے اُٹھ کر چھوٹی سی میز پر سے سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور سگریٹ جلاتا ہوا اپنے بستر پر چلا گیا اور لیٹ کر دھُوئیں کے دائرے اپنے مُنہ سے نکالنے لگا ۔ سیاہ و سفید دائرے' چکر کاٹتے اور لرزتے ہوئے چھت کی طرف جانے لگے ۔ قیصر کی نگاہوں نے ان کا پیچھا کیا ۔ شاید وہ اُن کی انتہائے پرواز معلوم کرنا چاہتا تھا اور جب وہ سیاہ و سفید ہالے چھت کے نزدیک پہنچ کر اور زیادہ لرز رہے تھے' اس کی نظریں چھت سے چمٹی ہوئی بے حس و حرکت چھپکلی پر جم گئیں ۔ وہ کچھ دیر تک چھپکلی کا یونہی مشاہدہ کرتا رہا اور پھر یکایک چھپکلی کا وجود' مُنیر کی شکل و صورت میں جذب ہو کر اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مُنیر اُس کے حق میں کتنی دشمنی کر رہا ہے ؟ اُس کی بدولت وہ عوام میں مشہور ہوگیا تھا ۔ اور اُس کی مدد سے وہ "خدام ملت" کا صدر ہوگیا تھا ۔ اور اسی کی بدولت اُس کی اقتصادی و معاشی حالت اچھی ہوگئی تھی ، وہ پچھتا رہا تھا کہ جب لوگ اُس کے پاس آئے تھے اور اس سے صدر بننے کے لئے استدعا کر رہے تھے تو اُس نے سچی خدمت خلق کا نمونہ پیش کرنے کے لئے صدارت کے معزز عہدہ کو کیوں قبول نہیں کیا تھا ؟ اور پھر اُس نے مُنیر کا نام کیوں پیش کر دیا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مُنیر کو لوگ پسند نہیں کرتے ہیں ۔ کاش کہ وہ آج "خدام ملت" کا صدر ہوتا تو سرکاری وکیل کا عہدہ اسکو کس آسانی سے ملجاتا ! اس کو مُنیر پر غصہ آ رہا تھا اور اُسکی خواہش ہو رہی تھی کہ مُنیر کسی طرح "صدارت

کے عہدہ سے نکال دیا جاتا وہ اس کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ منیر، مہیش پرشاد کے لئے کیوں کوشش کر رہا تھا، حالانکہ وہ جانتا تھا اور دوسرے لوگ بھی جانتے تھے کہ مہیش پرشاد کی صلاحیت اُس کے مقابلہ میں بالکل صفر تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر مہیش پرشاد کو سرکاری وکیل کی جگہ مل گئی تو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو وہ دو ہزار کے نوٹ غالبًا دس دس کے دو سو نوٹ، یا سو سو کے بیس نوٹ، پاکر کتنا خوش ہوگا اور اسکی زندگی کتنی اچھی ہوگی۔ اُس وقت قیصر نے تصور میں دیکھا کہ تعصب زمانہ کی وجہ سے اس کی دکالت بہت دب گئی ہے اور مقدمات اُس کو بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں۔ اور اس کی آمدنی گھٹتی جارہی ہے ننھا کافی بڑھ گیا ہے مگر اس کے لئے چھوٹا سا خوبصورت جھولا نہیں خریدا جاسکا اور ننھے کے جسم پر بوسیدہ کپڑے ہیں اور عندلیبہ بھی غربت کا مجسمہ ہے اور اُس نے اپنے جسم پر میلی کچیلی ساڑی ڈال رکھی ہے اور اُس کے بال بغیر کنگھی کے گندے ہو رہے ہیں اور وہ خاموش ہے اور بہت خاموش ا وہ کچہری ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے ہوئے اور تھکن سے چور گھر واپس آیا ہے، اور ننھا یہ دیکھکر کہ اس کے لئے گیند نہیں آیا ہے رونے لگتا ہے اور عندلیبہ اس کو چمکارتی ہوئی بولی "نہ روؤ اچھے لڑکے نہیں روتے آج شام کو ابا ضرور گیند لادینگے" حالانکہ وہ جانتی ہے کہ ایک چھوٹا سا گیند بھی خریدنا ناممکن سا ہے اور۔ اس وجہ سے اس کے خشک پپوٹے آنسوؤں میں بھیگ گئے ہیں۔

اس درمیان میں سگریٹ جل کر بہت مختصر ہوگیا اور جب قیصر کی انگلیوں میں آگ کی دھاہ محسوس ہوئی تو وہ چونک پڑا۔ سفید و سیاہ ہالے غائب تھے اور چھت سے چمٹی ہوئی چھپکلی کے گرد پرواز کرتے ہوئے پروانوں کو لقمہ بنانے کی فکر میں بے قرار نظر آرہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پروانہ کچھ دم لینے کے لئے دیوار پر بیٹھا ہی تھا کہ چھپکلی، دبے پاؤں دوڑی، بڑھی، لپکی اور غریب پروانہ کو ہضم کرگئی۔ اُس نے غور کیا کہ اور دوسرے پروانے بھی چھپکلی کی آتش گرسنگی کا شکار ہوکر رہ گئے۔ اس نے سوچا بجلی کی روشنی کے گرد چکر لگانا بھی کس قدر بے سود ہے! روشنی تو بے حس و حرکت جل رہی تھی، اور پروانوں کے اظہار تعشق سے اُس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ پروانوں کی کوشش لمس بھی کس قدر فضول ہے!— والد کے الفاظ کتنے کھوکھلے تھے:۔ کامیاب زندگی اُسی کی ہے جو اندھا دھند کوشش کرتا ہے اور نتیجہ کی فکر نہیں کرتا"۔ زندگی اور زندگی کی کوششیں! یہ سب کتنی بے معنی ہیں۔ پروانہ اور انسان، انسان اور پروانہ! سب برابر ہیں۔ سب ایک مرکز لایعنی کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ یہ لغویت کیا ہے؟ یہ چکر کیوں ہے؟ اس چھپکلی کو غریب پروانے کو نگل جانے کا کیا حق حاصل تھا؟ سب ہی تو چکر پر ہیں اور سب چکرا کر گر پڑیں گے!!— اور خدا کی خوشنودی؟ یہ چیز بھی کس قدر ہے! انسان چکر کاٹ رہا ہے، انہی پروانوں کی مانند، مگر اس میں ایک لہر بھی محبت و ہمدردی کی پیدا نہیں ہوتی! وہ تو اس روشنی کی طرح بے حس و حرکت ہے، اس کو کیا غرض کہ ہم چکر کاٹتے کاٹتے نہنگ مرگ کے

منہ میں جائیں یا نہ جائیں۔ اور عاقبت، روزِ حشر، سوال و جواب — یہ سب کیا ہیں؟ مہملات! فریب! بیوقوف انسانوں کو دھوکہ دینے والے تصورات!!——

وہ یک بیک بستر پر سے اٹھ گیا۔ اور کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان سے اُس قرمزی شاہراہ کی طرف دیکھنے لگا جو تاریکی سے ڈھکی ہوئی تھی اور جس کے کنارے دور نیم کے درخت کے پاس ایک مدھم سی روشنی جل رہی تھی اس طرح جیسے وہ تاریک شب کے خوف سے تھرتھرا رہی ہو۔ اور اس نیم کے درخت کی طرف نظر کئے ہوئے اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا:۔ یہ تاریکی کیا چیز ہے؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ آفتاب کہاں غائب ہو گیا ہے؟ وہ اڑتا ہوا قرمزی غبار کہاں لاپتہ ہو گیا؟ اور اب یہ نیم کی شاخیں کیوں نہیں ہل رہی ہیں؟

اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے آکر اُس کو کچھ کہہ دیا ہو۔ اُس نے سوچا تاریکی ہی ہر چیز کا راز ہے "تاریکی ہی ہمارا گہوارہ تھا، تاریکی ہی ہم پر سایہ فگن ہے" اور شاید اس سے بھی زیادہ تاریکی کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں! شام کے آفتاب کی طرح، قرمزی غبار کی مانند — اور نہنگ مرگ ہماری مدد کے لئے ہمیشہ سامنے ہے!

اور اُس وقت قیصر نے یہ محسوس کیا کہ کوئی اُس کو اُکسا رہا ہے کہ "چل آگے بڑھ، نہنگ مرگ نیم کی بے حس و حرکت شاخوں پر تیرا شدت سے انتظار کر رہا ہے!" وہ کھڑکی سے پلٹا اور اس نے ایک محراب دار طاق سے ایک مضبوط رسی کا کافی لمبا ٹکڑا اٹھایا اور پھر اپنے گلے کے لحاظ سے ایک پھندا بنایا۔ مگر اس وقت جمنا ننھے کو لے کر کمرہ میں آگیا۔ اُس نے متانت سے اس کو چوکی کے نیچے رکھ دیا اور پھر ننھے کو گلے سے لگا کر بھینچنے لگا۔ اور اُس نے جمنا کو حکم دیا کہ وہ کل صبح کو عندلیبہ کو یاد دلا دے کہ ننھے کے لئے جھولا اور گیند بازار سے آجائے۔ اتنے میں عندلیبہ بھی آگئی اور قیصر کی آنکھوں میں ایک دہشت انگیز سفیدی دیکھکر سہم گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ قیصر کی آنکھوں کی درخشانی غائب ہے! پہلے وہ بہت گھبرائی لیکن پھر قیصر کی معمولی اور سیدھی سادھی گفتگو سے اُس کے دل کا خوف جاتا رہا۔ مگر کھانے اور ضروری کام کاج کے بعد وہ بستر پر گئی تو اسے خیال ہو رہا تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ آج اتنی طنزیہ گفتگو اور زندگی کی بے ثباتی کی طرف مبہم اشارے کیوں کر رہا تھا؟ اسی ادھیڑ بن میں اسکی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اور جب شب کافی گذر چکی تھی تو اُس نے دیکھا کہ قیصر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے شاہراہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی اٹھ بیٹھی۔ اور اُس نے قیصر سے اس غیر معمولی بات کی وجہ پوچھی۔ مگر قیصر کوئی خاص جواب نہ دیکر پھر لیٹ گیا۔ اور عندلیبہ حیرت و پریشانی کے سمندر میں ڈوب گئی جب اُس نے دیکھا کہ قیصر بار بار بچھاون سے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اُس کو جگا ہوا دیکھکر پھر شاہراہ کی طرف، جہاں دور ایک مدھم سی روشنی جل رہی تھی اور جہاں نیم کا درخت بے حس و حرکت نظر آرہا تھا ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالکر پھر سو جانے کا بہانہ کرتا ہے۔

آخر کار جب عندلیبہ نے گھبرا کر ٹھنڈا تیل قیصر کے سر میں مصر ہو کر ڈال دیا تو قیصر کو نیند آ گئی ۔

---

صبح کو، گہری نیند میں پڑے رہنے کے بعد قیصر کے منتشر اور پراگندہ خیالات غائب ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دل و دماغ میں سکون محسوس کر رہا تھا اور خاور مشرق کی تابناک کرنیں درختوں کے پتّوں سے چھن چھن کر برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے خیال :۔ تاریکی کے بعد پھر روشنی آ گئی ہے! کیا گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں ہم لوگ، دُنیا کے محور کے گرد چکر لگا کر پھر ایک بار اُسی جگہ پر آ گئے ہیں جہاں کہ ہم کل صبح تھے؟ اور وہ اس خیال پر کہ آفتاب ڈوب جانے کے بعد پھر کہاں سے نکل آیا؟ مسکرا دیا اور اس کو محسوس ہوا کہ صبح کی روشنی اور دل خوش کن ٹھنڈک، رات کی بھیانک تاریکی کے مقابلہ میں بہت دلکش تھی!

اُسی وقت عندلیبہ صبح کا اخبار لئے ہوئے آ گئی۔ وہ خوشی سے چہک رہی تھی اور قیصر کے ہاتھ میں اخبار دیکر بولی :۔ "اللہ کتنا بڑا کارساز ہے!؟ اور اُس نے جلدی سے ننھے کو گہری نیند سو اٹھا کر قیصر کے بستر پر رکھ دیا۔

قیصر اخبار کی چند سطروں کو پڑھنے کے بعد ننھے کو گود میں اٹھاتا ہوا بولا : "اللہ واقعی بڑا کارساز ہے!!" اور پھر اس کی نگاہیں رسی کے اُس ٹکڑہ کا جو چوکی کے نیچے ابھی تک پڑا تھا، جائزہ لیتی ہوئی نیم کی ان شاخوں پر گئیں جو بادِ سحر کی موسیقی سے متاثر ہو کر وجد و سرور میں تھیں، اور پھر عندلیبہ کی ان پُرمحبّت آنکھوں پر جم گئیں جن میں نشاط کی لہریں ابھر ابھر کر شاید یہ کہہ رہی تھیں کہ "زندگی اسی کی کامیاب ہے جو اندھا دُھند کوشش کرتا ہے اور نتیجہ کی فکر نہیں کرتا، اور اللہ کتنا بڑا کارساز ہے! اور یہ کہ فجر کی نماز اس نے ابھی تک کیوں نہیں پڑھی ہے"؟

محمد جنید

# نونا

کاؤنٹ ریمنڈ اوف ڈیلیر پر دیر سے غشی طاری تھی۔ آخر وہ ہوش میں آیا اور آہستہ آہستہ اپنے اعضا کو پھیلا کر اس نے کہا: "اللہ کا شکر ہے کہ میں اب اچھا ہوں" ایک ضعیف آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "میرے پیارے غریب دوست"۔ کاؤنٹ کی آنکھیں اس ڈاکٹر کی آنکھوں سے جا ملیں جو غم و مسرت سے بھری ہوئی تھیں۔ کاؤنٹ اس کی غمگین آواز سے چونک سا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا اگر تم چاہو تو میں تمہیں ساری خوفناک حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ کاؤنٹ: تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ ڈاکٹر: "نہیں نونا" کے آثار ہیں۔ کاؤنٹ: نونا! یہ کس مرض کا نام ہے؟" ڈاکٹر: یہ ایک عجیب خوفناک مرض ہے پہلے بیہوشی طاری ہوتی ہے پھر بظاہر تین گھنٹوں تک مریض تندرست معلوم ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ یک بیک مر جاتا ہے۔ کاؤنٹ: "خدا رحم کرے! ڈاکٹر: تم اس قدر ڈرتے کیوں ہو۔ زندگی کا کیا بھروسا؟ دنیا رہنے کے لائق نہیں۔ تم بہادر ہو اور مرنے سے نہیں ڈرتے۔ پیارے دوست خدا حافظ! خدا حافظ!

ڈاکٹر نے مریض کو تنہا چھوڑ دیا اس لئے کہ اپنے فرائض کو انجام دے سکے۔ کاؤنٹ فوراً اٹھ بیٹھا اور احتیاط کے ساتھ کپڑے پہننے لگا۔ اس نے اپنے بال سنوارے، ناخنوں پر بہترین پالش کی۔ پھر سگار کی نرم تھیلی اٹھائی اور ایک عمدہ سگار لے کر "سوفا" پر دراز ہو گیا۔ اُس نے سوچا۔ افسوس۔ یہ اس کا آخری سگار ہے۔ کاؤنٹ بہادر آدمی تھا وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ قسمت نے اس کے ساتھ نہایت بیرحمی کی۔ کل اُسے موت کا یقین تھا۔ جب مرض کی شدت تھی تو اس نے وکلا کو بلایا اور اپنے سارے کاغذات کو جلا ڈالا۔ اس کے بعد وہ بستر پر یہ سمجھ کر لیٹ گیا کہ اب وہ اس دنیا میں کبھی بیدار نہ ہوگا۔

اب اس کی حالت اس مجرم کی طرح تھی جسے سزائے موت کا حکم سننے کے بعد پھانسی کا انتظار کرنا ہوتا ہے اور جب اس کی ساری امیدیں کافور ہو جاتی ہیں اور ایک مہیب خواب حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

جون کا آدھا مہینہ گذر چکا تھا۔ دنیا میں ہر جگہ رنگ و بو، رونق اور خوشی کی لہریں تھیں۔ امراء اچھی اچھی پوشاکیں پہنے شانزلیزے میں چل پھر رہے تھے۔ تمام گلی کوچوں میں ان لوگوں کا ازدحام تھا جو زندگی کا بھرپور لطف اٹھا رہے تھے۔ اس وقت کاؤنٹ بھی تندرست معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کے قول کے مطابق کل صبح کو یہ سارا منظر اس کی آنکھوں سے نہاں ہو جائے گا۔ اس کے لئے تو صرف تابوت کی سواری تھی اور سیاہ پوش عزاداروں کا جلوس۔ ساری چیزیں جن سے اُسے محبت تھی۔ جان سے زیادہ عزیز صورتیں، زندگی کی خوشیاں، رومانی واردات اور رنگین جذبات۔ یہ سب کچھ بھی باقی

نہ رہیں گے۔ اُسے اپنے سگار کے بل کھاتے ہوئے دھوؤں میں اس کی زندگی کے سارے واقعات گذرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ طفلی کی پرانی باتیں نئے خواب کی طرح ابھر آئیں۔ پھر عہد جوانی اور عشق و حسن کی رنگین داستانیں سامنے تھیں اور آخر اُس نے اس خوشگوار مہینہ کو یاد کیا جو شادی کے بعد گزرا تھا۔
کاؤنٹ ریمنڈ کو ان دنوں کی خالص خوشیوں کا لمحہ لمحہ یاد تھا۔ اس کی شادی کے بعد کیسی مسرت و شادمانی اس کا حصہ تھی! اس کی بیوی ہر جگہ تعریفوں کا مرکز بن رہی۔ کاؤنٹ اس سے خوش ہوتا اور اس کی محبت ترقی کرتی گئی۔ پھر اُسے اپنی حماقت پر تاسف بھی ہوا۔ وہ حماقت جس نے اسکی مسرت کا یکقلم خاتمہ کر دیا اور کاؤنٹ اور کاؤنٹس کے درمیان علیحدگی ہوگئی۔ یوں وہ دونوں اکثر ملتے رہے اور بے لوث محبت دونوں کے دلوں میں باقی رہی لیکن اس بے لوث محبت کا کسی کو یقین نہ ہوتا تھا۔ اسی محبت کی وجہ سے اس وقت جب وہ دنیا سے رخصت ہو رہا تھا کاؤنٹ کے خیالات کاؤنٹس کی طرف رجوع ہوئے۔ وہ اس کو ایک بار پھر دیکھے بغیر مر نہیں سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت غرور سے وہ دونوں کام نہ لیں گے۔
کاؤنٹ ریمنڈ نے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ ناکامیاب رہا تو اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ ٹیلیگرام کا فارم لیکر اس نے چند الفاظ لکھے اور نوکر کو بلا کر تاکید کی اُسے فوراً بھیجدے۔ اس نے اپنی گھڑی سامنے رکھ لی۔ ابھی زندگی کے دو گھنٹے باقی تھے اور اتنا کافی وقت تھا کہ وہ آسکتی۔ لیکن کیا وہ آئے گی؟ کیا یہہ درخواست جو موت کے وقت لکھی گئی ہے۔ ایک عورت کے دل کو موثر کرنے میں کامیاب ہوگی؟ یا اس کا نسوانی غرور اس اندوہگیں موقع پر بھی رحم کرنے سے انکار کرے گا۔ اس کا دل امید و بیم کے متضاد جذبات سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اس کا مقابلہ صبر و استقلال کے ساتھ کرے گا، لیکن اس کی نبض ڈوبنے لگی۔
جیسے جیسے اس کے چند مختصر لمحے گذرتے وہ خوفزدہ نگاہوں سے گھڑی کو دیکھتا جاتا۔ ایک قیمتی گھنٹہ ختم ہوگیا۔ وہ بیچین ہوکر اٹھا اور اپنی ماں کو سب حال لکھنے لگا۔ وہ امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ رہا تھا کہ دروازہ کی گھنٹی بجی، زور سے بجی اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ نوکر نے کاؤنٹس اوفلیر کے آنے کی خبر دی۔ اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ کرسی سے اچھل کر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا "اودیت" لیکن آنے والی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھی، وہ دروازہ کے پاس کھڑی تھی۔ اور کاؤنٹ پر نظر پڑتے ہی غصہ کا شعلہ اس کے چہرہ پر بھڑک اٹھا۔ اس نے نفرت کے ساتھ کہا: تم نے مجھے اتنی بیرحمی کے ساتھ دھوکا دینے کی کس طرح ہمت کی؟ کاؤنٹ: تمہیں... دھوکا.. کس طرح" کاؤنٹس "تمہارے تار سے مجھے معلوم ہوا کہ تم علیل اور جاں بلب ہو لیکن تم یہاں تندرست بیٹھے خط لکھ رہے ہو۔ کاؤنٹ: پیاری ایک لمحہ کے لئے ٹھہرو۔ مجھے کچھ کہنے تو دو۔
وہ غصہ سے کمرے سے باہر جانے لگی۔ کاؤنٹ نے اس خط کو اٹھایا جو اس نے اپنی ماں کو

لکھا تھا اور اُسے زبردستی کاؤنٹس کے ہاتھ میں دے دیا اُس نے کہا کم سے کم اسے پڑھو۔ کاؤنٹس نے خط لیا اور اُسے غور سے پڑھنے لگی۔ لیکن وہ زیادہ پڑھنے کی تاب نہ لاسکی اور روتی ہوئی اس کے بازوؤں سے لپٹ گئی اور کہا: میرے پیارے! میرے بیکس! کیا یہہ سچ ہے؟"

کاؤنٹ اس سے بغل گیر ہوا اور وہ دونوں انتہائی صدمہ اور خوشی کی موجوں میں ہم آغوش رہکر کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گئے۔ ان کی خوشگوار زندگی کی یاد تازہ ہوگئی اور حماقت اور غرور کے تباہ کن نتائج پر پچھتانے لگے۔ اس نے کاؤنٹس کو صوفا پر بٹھا لیا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ جذبات سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال نہ سکتے تھے۔

آخر کچھ دیر کے بعد کاؤنٹ نے مذاقاً مسکراکر کہا: میں سمجھتا ہوں کہ مجھے فخر کرنا چاہئے۔ میں نے ایک نئی فیشن کی بنا ڈالی ہے۔ اب تمام پیرس میں یہہ بیماری مشہور ہو جائیگی" لیکن اودت ایسی باتوں کو برداشت نہ کرسکی اور جب کاؤنٹ نے دیکھا کہ کاؤنٹس کو اس سے تکلیف ہوئی تو پھر وہ خموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد خوشی کے گذرے دنوں کے متعلق وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اس احساس کی وجہ سے کہ وہ موت کے کمرے میں تھے۔ پہلے آہستہ آہستہ گفتگو ہوتی رہی لیکن ان یادوں کے سامنے جو اس کمرے کی جانی ہوئی چیزوں کو دیکھکر تازہ ہوگئی تھیں۔ وہ خوف رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور وہ گذرے ہوئے پیارے لمحوں کو یاد کرکے مسکرانے لگے۔ ایک شکار کی تصویر نے انھیں وہ دن یاد دلایا جب وہ شکاری کتوں کے ساتھ نومبر کی ٹھنڈی صبح کو باہر شکار گئے تھے۔ پھر انھیں وہ رات یاد آئی جب وہ پہلی مرتبہ ایک ساتھ رقص میں شامل ہوئے تھے۔ اکثر صبح کو یہہ دونوں شہر بوا میں درختوں کے نیچے گھوڑوں کی پشت پر سیر کرتے۔ پولین میں ناشتہ کرتے اور شانیلیزے کے رستے سے واپس آتے اور چند گھنٹوں کے لئے سوسائٹی کی تکلیف دہ رسموں کی وجہ سے علٰحدہ ہو جاتے۔ لیکن وہ پھر ملتے کبھی رقص کے موقع پر۔ کبھی زیادہ اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے کے گھر پر۔ ان خیالی تصویروں نے ریمنڈ اور اودت کو سب کچھ بھلا دیا۔ وہ یہہ بھی بھول گئے کہ کس چیز نے انہیں بچھڑنے کے بعد پھر ملا دیا تھا۔ یکایک گھنٹی کی آواز نے اُنھیں چونکا دیا۔ اور وہ پھر ماضی سے حال میں آگئے اور ایک دوسرے کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

نوکر داخل ہوا اور اُس نے ڈاکٹر ڈارلوئی کے آنے کی خبر دی۔ ڈاکٹر نے حیرت کے ساتھ کہا" کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں۔ لیکن ... میں تو اس لئے آیا تھا کہ ..."

کاؤنٹ: ہاں آپ کس لئے آئے تھے؟" ڈاکٹر": خدا کا شکر کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں تو صرف یہہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ مرگئے یا نہیں۔ کاؤنٹ (مسکراکر) آپ بہت مہربان ہیں۔"

کاؤنٹس نے پوچھا: کیا... وہ.. زندہ... رہیں گے؟

ڈاکٹر: ضرور۔ اب اس میں کوئی شک نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ انھیں نمونیا کے وہ سب آثار تھے جو ماہرین طب نے بتایا ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ معجزہ لائق ڈاکٹر کے لئے باعث مسرت ہوا لیکن شاید اپنی غلط تشخیص پر اس کے دل میں تاسف و ندامت کا بھی اثر تھا۔ ریمنڈ نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا: "اوڈت! کیا یہ اچھا خیال نہیں کہ آج شام کو ڈاکٹر صاحب کو کھانے پر مدعو کیا جائے؟"

مترجمہ

سید محمد نواب

# کلام راسخ عظیم آبادی

ان کے دسے قصر بھی لڑکوں کے گھروندوں کی طرح (۲۱) مٹ گئے یوں کہ نشانِ در و دیوار نہیں
بے خودی ہے تمھیں پر یاد ہو اس کی راسخ — تم کو کس طرح سے ہم جانیں کہ ہشیار نہیں

تا کجا رنج و تعب آرام بھی پائیں کہیں — گزرے ایسی زندگی سے کاش مرجائیں کہیں
خوب خالی کرکے دل جاتا ہوں پاس اس کے ولے — ڈر یہ رہتا ہے کہ پھر آنکھیں نہ بھر آئیں کہیں
گلیوں میں سرگشتہ پھرنا زیست کا باعث ہوا اب — مار ڈالیں وحشتیں گر جی نہ بہلائیں کہیں
داغ کتنے دے کے یوں کہنے لگا وقتِ وداع — دیکھیو ایسا نہ ہو یہ پھول مرجھائیں کہیں

کب ریا سے یہ جو ہیں گوشہ نشیں بہتر ہیں — ان سے صد مرتبہ مے خانہ نشیں بہتر ہیں
ایک پر ایک کو ترجیح چلی آئی ہے — اے غلط فہم یہ مت کہہ کہ ہمیں بہتر ہیں
کب تلک غیر سے سرگوشی تمھاری ہوتی — دیکھو ہم کہتے ہیں یہ باتیں نہیں بہتر ہیں
ٹھیکری سا ہے جگر پاروں کے آگے میرے — لعل کیا چیز ہے اس سے یہ نگیں بہتر ہیں
دے کے دل داغ دیے کتنے مجھے اور کہا — راسخ اس گنجے سے یہ پھول کہیں بہتر ہیں

خیالِ یار میں آوارہ ہیں ہر چند گھر میں ہیں — اگرچہ بیٹھے ہی رہتے ہیں لیکن ہم سفر میں ہیں
عدم کے سے نہیں آسودہ دل ہم شہرِ ہستی میں — کہاں آسایشِ منزل انھیں جو رہگذر میں ہیں
خلش سے اس کی پلکوں کی نہیں کچھ اور ہیں واقف — یہ جانوں ہوں کہ مدت سے کئی کانٹے جگر میں ہیں
نہیں آنکھیں لگیں راسخ تو پھر بیداری کیسی ہو — یہ تیری رات کی بے خوابیاں میری نظر میں ہیں

قمری اس سرو کے ہیں ہم تو ہواداروں میں — سرو آزاد بھی ہے جس کے گرفتاروں میں
چشمِ کم سے نہ ہمیں دیکھیو گو اے زاہد — بے گناہوں میں ہو تو ہم ہیں گنہ گاروں میں
گل نرگس سے مری چادرِ مرقد رکھیو — جانیں تا سب کہ تھا اس چشم کے بیماروں میں
باعثِ الجھاؤ کا ہیں گی یہ تمھاری زلفیں — جی الجھ جائے ہے بل کھائے ہوئے تاروں میں
ہم گراں باروں کی کہہ دیجیو منزل کو دعا — اے وہ کوئی کہ بہت ہے تو سبک باروں میں
چاہنے تھے جو ہمیشہ مری افزونیِ غم — دیکھ کر حال مرا اب ہیں وہ غم خواروں میں
ہم سے آوارہ تو کیا چیز ہیں اس عشق میں آہ — عزتی سیکڑوں رسوا کیے بازاروں میں
دیں نہ مجھ پاس نہ لے غیرتِ یوسف دنیا — بس کہ کم مایہ ہوں میں تیرے خریداروں میں
دیکھ روتا مجھے کہتا ہے وہ سب سے راسخ — اہلِ درد ان کو نہ جانو یہ ہیں مکاروں میں

# بولیوں کا سنگم

سیاسی نعروں کے بحرانی اثرات کی چھوت ہے یا محض طفلانہ خود فریبی کہ ملک کے مختلف گوشوں سے بھانت بھانت عنوان کی آوازیں آرہی ہیں۔ کہیں سے صدا آتی ہے "پنجاب میں اردو" کہیں سے یہ پکار سنائی دیتی ہے کہ "دکن میں اردو" کوئی اردوئے معلی اور اہلِ زبانی کے نعرے لگاتا ہے، کسی گوشے سے یہ لہر اٹھتی ہے کہ گجرات میں اردو، اور کہیں سے دبی ہوئی آواز آتی ہے کہ "بہار میں اردو" یہ قسم قسم کی ندائیں اس دعوے کا اعلان کرتی ہیں کہ اردو سب سے پہلے میرے گھر میں بنی یا پیدا ہوئی ہے۔

یہ صوبائی تنگ نظری محض آرزو پرورده خیال آرائی کی پیداوار ہے۔ ایسی جذباتیت ایک تسکین دہ فریب تو بن سکتی ہے لیکن صداقت اور علم و فن کے لئے یہ کیفیت سخت گمراہ کن اور خطرناک ہے

"ابا جان میرے ہیں، تمہارے نہیں نا! امی جان صرف میری ہیں اور کسی کی نہیں!" "دادا جان میں نہ آپ کا بیٹا ہوں اور کوئی نہیں نہ؟" اس نوع کی آدائیں بچپن میں بھلی لگتی ہیں۔ مگر بالغ بھائی بہنوں کے منہ سے ایسی باتیں احمقانہ چونچلے معلوم ہونگے۔ اہل نظر اور ارباب حکمت کے لئے پنجاب کی اردو دکن کی اردو، اہل زبانوں کی اردو وغیرہ وغیرہ قسم کے من مانے دعوے صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ سخت ناگوار بھی ہیں کیونکہ یہ مسئلہ زبان سے متعلق ایک اہم صداقت کے ایک گوشے کو دکھا کر مکمل صداقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔

اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ یہ ایک وسیع اصلیت کا جزء ہے۔ اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ یہ بھی حقیقت کبریٰ کا ایک حصہ ہے۔ اردو لشکر شاہجہانی میں تولد ہوئی۔ یہ بھی عظیم الشان کل کا ایک ٹکڑا ہے گجرات کی اردو اور بہار کی اردو۔ یہ سب باتیں آفتاب صداقت کے مقابلے میں ذرّے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جزئیم حصہ نقوش پر اگر اتنی روشنی ڈالی جائے کہ وہ دو سرے بارہ ہائے حقیقت کو چھپالیں تو وہ جھوٹ سے زیادہ مہلک بن جاتی ہیں۔ یہی حال مذکورہ بالا دعووں کا ہے۔

سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے قریباً سارے صوبوں میں اردو کی تخلیق اور نشوونما ہوئی ہے۔ جن عناصر و اسباب نے تخلیق اردو میں حصہ لیا ہے وہ تاریخی طور پر ہندوستان گیر وسعت رکھتے تھے۔ ان اسباب و عناصر کو کسی ایک خطے میں محدود کر دینا تاریخی صداقت کو جھٹلانا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان عناصر و اسباب کی موجیں کسی ایک خاص گوشے سے شروع ہو کر آگے نہیں بڑھی ہیں بلکہ چند خطوں میں لہریں لیتی ہوئی پھیلیں، ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئی اور

ایک دوسرے کو متاثر کرتی اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہوئی ہندوستان پر رحمت بنکر چھا گئی ہیں۔
ہاں یہ صحیح ہے کہ ارتقائے زبان و ادب کی منزلوں میں فرقِ مراتب نظر آتا ہے۔ بعض خطوں میں اردو
کے ارتقا کی موج درمیانی منزل ہی میں رہ گئی اور بعض میں فطری اور منطقی تکمیل کو پہنچی۔ جن علاقوں
میں موج زبانِ اُردو اپنی فطری تکمیل کو پہنچ کر قلزمِ زخار بنی ہے وہ علاقے کوئی محدود خطہ نہیں بلکہ ان
علاقوں کا حلقہ بہت وسیع اور بین الصوبائی ہے۔ نیز یہ روانی بھی ساکن نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اندر
ہمہ گیر روانی پائی جاتی ہے۔ دورِ اولیٰ میں جن خطوں میں زبان اردو کی رو تھم گئی تھی۔ اب وہاں بھی
تاثر و تاثیر کا عمل جاری ہے۔ میری مراد ترویج زبان سے نہیں بلکہ اس امر سے ہے کہ آج بھی اُردو مقامی
بولیوں کو بدل رہی ہے یعنی اُس میں پیوند ہو کر اس کی عضوی ترکیب کو منقلب کرتی جاتی ہے۔
مثلاً پنجابی، کشمیری، سندھی وغیرہ بولیاں۔ اردو ایک جاندار کیمیادی مادہ ہے۔ یہ ایک کیسۂ
حیات کی طرح ہے جس کا "مائین" (Protoplasm) ماحول کو متاثر کرتا اور اس سے متاثر
ہوتا ہے۔ بیرونی الفاظ اسکی کیمیادی تحلیل کے ذریعہ عضویاتی کُل بن کر اس کا جاندار حصہ بن جاتے
ہیں مثلاً جدید انگریزی الفاظ اور اصطلاحات۔ اور اس کا زندہ "مائین" جس کے ساتھ چپکا اس کو
بھی شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ مثلاً جدید پنجابی، کشمیری اور سندھی بولیاں۔ ہندی والوں کا اُردو
الفاظ و محاورات سے چھوت چھات کی حد تک گریز اس خوف کی غمازی کرتا ہے جو ایک رجعت پسند
ذہنیت کو حیات پرور انقلاب سے ہوتا ہے۔ وہ اُردو کے زندہ و رواں دواں الفاظ سے متحجر ماضی
میں پناہ لیتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اُردو کے جاندار الفاظ کی کیمیاوی و حیاتیاتی تاثیر مصنوعی ہندی کو اندر
سے بالکل بدل کر دکھ دے۔ اس کے برخلاف اُردو آئے دن ہندی پر یلغار کرتی اور مالِ غنیمت حاصل
کرکے ہضم کرتی جاتی ہے۔ ایک چوتھائی صدی کے اندر اندر ہم ہندی کی ساری سندرتا، اس کا سارا
رَس، اس کا لوچ، اس کی خوبصورت گونج اور اس کی روایات کا وہ سب کچھ جو نئی زندگی پانے کی
صلاحیت رکھتا ہے سارے کا سارا اپنا چکے ہونگے۔ اس وقت ہندی نام ہوگا سنسکرت کی سوکھی
ہوئی ہڈیوں اور بھیانک پنجر کا۔ اس وقت قلزم اُردو بحر ہند سے زیادہ وسیع، بھارت ورش سے
زیادہ رَچی ہوئی اور ہمالے سے زیادہ بلند ہوگی۔ یہ زندگی بداماں دو دھاری تلوار ہے۔ یہ جسے
اپنے اندر جذب کرے گی اُسے بھی اپنا بنالے گی اور جو اس کو جذب کرے گا وہ بھی اس کا ہو جائے گا۔
ہندی والے متعصبین کب تک اُردو سے چھوت کریں گے۔ ہندی یا تو عجائب خانہ کی چیز ہو کر رہ جائیگی
یا اُردو سے گلے مل کر نئی زندگی پائے گی اور اردو ہی بن جائے گی۔ اُردو بہ زبان بائبل "کونے کا
پتھر ہے" جس پر یہ گرا چور چور ہو جائے گا اور جو اس پر گرا وہ بھی چور چور ہو جائے گا"
اردو زبان ہندوستان میں فورڈ موٹر یا سنگر مشین کی حیثیت تو نہیں رکھتی کہ درآمد

برآمد کا سوال پیدا ہوا اور ہم اس امر کا تعین کرنے بیٹھیں کہ یہ پہلے پہل پنجاب کی منڈی میں آئی یا دکن کے بیوپار منڈل سے بکی۔ اور نہ یہ باٹا کے جوتوں اور لال املی کے کمبلوں کی طرح کسی ایک کارخانے میں بنائی گئی ہے کہ ہم اس شہر کا پتہ دریافت کریں جہاں یہ کارخانہ تھا۔ دہلی یا لکھنؤ نے ٹاٹا نگر یا احمد آباد کی مصنوعات کی طرح اُردو کو نہیں بنایا۔ اُردو صدیوں میں بطنِ ہندوستان سے پیدا ہوئی ہے۔ اور استقرار، حمل اور پیدائش انفرادی طور پر تو ہوئی نہیں کہ وقت اور مقام کا تعین ہو۔ زبان وادب تمدن اور کلچر کا شاخسانہ ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کا متحدہ کلچر کس خطے میں، کہاں اور کب پیدا ہوا۔ ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ کس طرح پیدا ہوا۔ اُردو زبان کا بھی اسی طرح جنم ہوا ہے جس طرح ہندوستانی کلچر کا۔ یہ میل جول، امتزاج و ترکیب کا عمل عضویاتی نمو اور حیاتیاتی ارتقا کے اصول کے ماتحت ہوا ہے۔ ارتقا کی یہ منزلیں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ساتھ ساتھ طے ہوئی ہیں۔ اُس جرثومہ کا پتہ چلانا جو علت العلل تھا اور جسکی تحریک سے ارتقا کا کارواں چل نکلا ناممکن ہے۔ پھر بھی مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق وتفتیش سے ہم دور کے ماضی کی طرف پرواز کرسکتے ہیں اور اُردو کی تخلیق کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔ انکشافاتِ تاریخ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ جن زبانوں اور بولیوں کے امتزاج سے زبانِ اُردو پیدا ہوئی ہے انکی عضویاتی ترکیب کسی ایک مخصوص مقام پر نہیں ہوئی بلکہ کم وبیش سارے ہندوستان میں ہوئی ہے۔ زمان ومکان کا قطعی تعین لاحاصل ہی نہیں غیر حقیقی اور گمراہ کن بھی ہے۔ یہ تحلیل وترکیب، نمو وارتقا فروغ وعروج ہندوستان گیر طور پر ہوا ہے۔ اب آئیے ہم اُن اجزاء وعناصر کا جائزہ لیں جنکی ترکیب وامتزاج سے اُردو وجود میں آئی۔ نیز ہم اس طریقہ امتزاج وترکیب پر بھی نظر ڈالیں گے جو مختلف ادوار میں صورت پذیر ہوتا رہا۔ اردو کی تخلیق، نمو، اور ارتقا کی بہت ہی مرکب ومنظم تماشہ ہے۔ یہ عمل اتنا سادہ نہیں جتنا سرسری طور پر نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں آریہ کئی موجوں میں آئے ہیں۔ آریہ قومیں خواہ آرمینیا سے آئی ہوں، خواہ متوسط ایشیا سے۔ یہ امر ثابت ہے کہ یہ قوم ہندوستان کی قدیم قوموں کے مقابلہ میں نیم وحشی اور خانہ بدوش تھی۔ ہندوستان میں آریہ حملہ سے قبل ڈراوڑ قومیں رسی بسی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک خاصا تمدن اور تہذیب تھی۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کے سے شہر آباد تھے۔ علم الاقوام کے ماہروں نے اب یہ بات ثابت کردی ہے کہ ڈراوڑ قوم مہذب قوم تھی اور باہر سے آنے والے آریہ بدویت سے زیادہ قریب تھے۔ ڈراوڑوں کی زبان ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی کہ آریہ فاتحین کے ساتھ قدیم سنسکرت زبان ہندوستان میں آئی۔ زوالِ اُمم کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ڈراوڑی قومیں تعیش وانحطاط کے عالم میں ہوں گی کہ نئی قوت کے ساتھ آریہ ہندوستان میں

داخل ہوئے ۔ یہ حملہ معاشی ضرورتوں کی بنا پر ہوا ہوگا مگر اس ضرورت کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ کوئی مثالی نصب العین بھی ہو ۔ میرا خیال ہے کہ آریہ قبائل میں کوئی نئی جاندار تحریک ضرور پیدا ہوئی تھی اور وہ ایک نئے نصب العین کے ماتحت حیاتِ تازہ کی طرف قدم اٹھا رہے تھے ۔ اُن کے اندر ایک گہرا قومی پندار پیدا ہو چکا تھا ۔ اُن کی حالت اُن تاتاریوں اور مغلوں سے بہتر تھی جنھوں نے بغداد پر حملہ کیا تھا ۔ کیونکہ یہ تاتاری اور مغلوں ممالک اسلامی کو زبان، ثقافت و مذہب کے لحاظ سے اُس طرح متاثر نہ کر سکے جس طرح آریوں نے ہند قدیم کی زبان، ثقافت اور مذہب کو متاثر کیا ۔ تاتاریوں کا مقابلہ بھی ایک بہت جاندار اور اعلیٰ تمدن سے تھا ۔

غرض دراوری زبانوں کے ساتھ آریوں کی زبان سنسکرت قدیم کا میل جول شروع ہوا ۔ آریوں اور ڈراوروں کی آویزشیں صدیوں تک جاری رہیں ۔ اس دوران میں ایک قوم نے دوسری کو ہر لحاظ سے متاثر کیا ۔ پورب اور دکھن ہندوستان میں ڈراوی حکومتیں تھیں اور شمال و مغرب میں آریہ سلطنتیں ۔ جس طرح ڈراوری اور آریہ مذہب کی آمیزش سے ایک مخلوط دھرم پیدا ہوا ، اُسی طرح سنسکرت اور ڈراوری زبانوں کے امتزاج سے "پراکرتیں" پیدا ہوئیں ۔

ہندو دیوتا صرف آریہ دیوتا نہیں بلکہ شاید اکثریت ڈراوری دیوتاؤں کی ہے ۔ عقاید و رسم و رواج میں بھی دونوں قوموں کا حصّہ ہے ۔ "بل دیو" ڈراوری دیوتا ہے اور یہی بابل کا "بعل" ہے ۔ ہند و صنمیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان آریہ اور ڈراوری دیوتاؤں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہی ہیں ۔ ڈراوری قومیں، خصوصاً دریائے سندھ کے ساحل پر آباد قبائل، بابلی، نینوائی اور قدیم مصری قوموں کی شاخیں ہیں ۔ نیل، دجلہ فرات اور سندھ کے سواحل پر پھلتی پھولتی ہوئی قومیں سامی الاصل تھیں ۔ ہندوستان کے جنوبی ساحل پر بسنے والی قومیں بھی اسی خاندان سے تھیں ۔ ملاحظہ ہوں اسلامک کلچر کی جلدیں ۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء ۔

آریہ اور ڈراوری کی جنگ و صلح کی آویزش نے ایک متحدہ زبان کی بنیاد ڈالی ۔ مکان و زمان کے اختلاف کے اثر سے مختلف پراکرتیں ظہور میں آئیں ۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ڈراوری زبانیں جو اپنی انفرادیت قایم رکھ سکیں اُن میں بھی سنسکرت اثر و نفوذ نظر آتا ہے ۔ اسی طرح سنسکرت بھی ابتدائی ویدک سنسکرت سے مختلف ہو گئی ۔ سنسکرت فاتحین کی زبان تھی، لہٰذا یہ درباری اور سرکاری زبان تو بن گئی اور طبقہ اعلیٰ کے لوگوں میں بھی اس کی چلنت ہوئی لیکن یہ مُلک کی زبان کسی دور میں بھی نہ بن سکی ۔ ملک کی زبان "پراکرت" تھی جس نے سنسکرت اور ڈراوری زبانوں کے اتحاد سے جنم لیا ۔ علمائے علم اللسان کے مطالعے کے لئے ابھی بہت میدان خالی ہے ۔ قدیم سنسکرت گرامر اور ڈراوری زبانوں کے گرامر کے مطالعے سے پتہ چلے گا کہ پراکرتوں پر صرف اسمار

اور افعال کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ قواعد کے لحاظ سے بھی آریائی اور ڈراوری ہر دو زبانوں کا اثر ہے
پراکرتوں میں پالی پراکرت نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ اسکی وجہ یہ تھی روح ہندوستان
نے جب برہمنی انسانیت سوز تعلیمات کے خلاف کروٹ لی اور حضرت بودھ نے آواز سروش سُن کر
بھارت کی جنتا کو مساوات کا پیام پہنچایا تو آپ کا ذریعۂ اظہار یہی پالی پراکرت تھی۔ بودھ تہذیب کے
عروج کے زمانہ میں پالی نے بین الملی اہمیت حاصل کر لی اور ظاہر ہے کہ ہندوستان گیر بھی ہوگئی۔

جب بودھ تہذیب کا زوال شروع ہوا تو برہمنوں نے پھر کوشش کی کہ سنسکرت کو زندہ کریں
وہ بودھ دھرم کے خلاف ننگ آدمیت ظلم و جور کرنے میں تو کامیاب ہوئے اور بودھ حکومت کا تختہ
بھی انھوں نے اُلٹ دیا، لیکن وہ سنسکرت کو عوام میں نہ پھیلا سکے۔ پراکرتوں کا ہی زور رہا اور زمانہ
کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی یہ پراکرتیں "اَپبھرنشا" کہلانے لگیں۔ "اپبھرنشا" سے بھاشائیں نکلیں مثلاً
برج بھاشا، کھڑی بولی، مگدھی، سُروسینی، میتھلی، اودھی وغیرہ وغیرہ

ہندوستان میں یہی بھاشائیں بولی جاتی تھیں کہ باہر سے مسلمانوں کی آمد کے ساتھ عربی
فارسی اور ترکی زبانیں ملک میں آئیں۔ رفتہ رفتہ ان کا میل جول دیس کی بھاشاؤں سے ہوا اور
دھیرے دھیرے دونوں جماعتوں کی بولیوں کا جوڑ مل گیا۔ نئے پیوند سے نیا پیڑ اُگا اور ہوتے ہوتے
یہ پیڑ عظیم الشان ہرا بھرا درخت بن گیا۔ اُردو زبان پیدا ہوئی اور پالی کی طرح ہندوستان گیر ہو کر
آفاق گیر ہوتی جاتی ہے۔ جس طرح بودھ تبلیغ نے پالی کو مُلک مُلک پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح تبلیغ اسلام
کی احمدیہ تحریک کے ماتحت اُردو زبان یورپ، امریکہ، انڈونیشیا اور افریقہ میں روشناس ہو رہی ہے۔
یورپ، امریکہ افریقہ اور انڈونیشیا کے نومسلمین مبلغین اسلام سے اُردو پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔
کیونکہ اسلامیات کی تشریح و توضیح کے متعلق احمدیہ لٹریچر سارا اُردو میں ہے۔

باہر سے آنے والی زبانیں ہمیشہ درباری و سرکاری اور طبقہ اعلیٰ کا واسطۂ اظہار بن کر
رہ جاتی ہیں۔ جو حال سنسکرت کا ہوا تھا وہی فارسی اور عربی کا ہوا اور وہی آج انگریزی کا ہے
عربی اور فارسی ہندوستان کی زبان کبھی نہ ہو سکیں۔ جس طرح سنسکرت کے اثر سے ڈراوری
زبانیں بدل کر پراکرتیں بنی تھیں، اُسی طرح عربی و فارسی کے اثرات سے بھاشائیں بدل گئیں
اور ساری بدلی ہوئی بھاشاؤں میں سب سے ترقی یافتہ بھاشا اُردو پالی کی طرح مُلک بھر میں
مرغوب و محبوب ہوئی۔ اُردو ڈراوری زبان، سنسکرت زبان، عربی زبان، فارسی زبان اور
پرتگالی کا سنگم ہے۔ یہ سب کی چہیتی بیٹی ہے۔ یہ بدیسی نہیں، اصلی دیس کی ہے۔ مگر ترقی پسند
قومیت اور بین الملیت کی خوبصورت مفاہمت۔ انسانیت عظمیٰ کے وسیع ہوتے ہوئے
نصب العین کی حامی اور انہیں روایات کی گود میں پلی ہوئی۔

اُردو کو ہیں خالص آریائی زبان نہیں کہہ سکتا۔ یہ سامی اور آریائی زبانوں کے ازدواج سے پیدا ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

| سامی | | | | آریائی |
| --- | --- | --- | --- | --- |
| (۱)* ڈراوری | ⇄ | پراکرت | ⇄ (۱) | سنسکرت |
| (۲) عربی | ⇄ | بھاشا | ⇄ (۲) | فارسی |

↓

اُردو
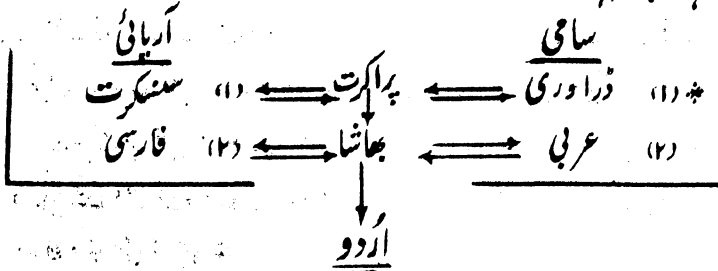
فی الحال تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت کا اثر سب سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسمار اور افعال کی بہت ہی نمایاں اکثریت بھاشا سے آئی ہے اور گرامر کی بُنیاد بھی بھاشا پر ہی زیادہ ہے۔ مگر جب پراکرت گرامر کا مکمل مطالع ہوگا اور اس کا تقابل سنسکرت سے کیا جائے گا تو پتہ چلے گا کہ خود پراکرت اور بھاشا پر ڈراوری اثرات بہت ہیں۔ اُس وقت صحیح فیصلہ ہو سکے گا کہ اُردو پر سامی اثرات زیادہ ہیں یا آریائی۔

اُردو میں مستعمل وہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔ جو خالص ڈراوری ہیں۔ مثلاً

(۱) گوڑ = پاؤں۔ اسی سے نگوڑا، اڑگڑا، گوڑی، لنگڑا [لنگ گوڑا]

(۲) ٹھیس۔ اسی سے ٹھسا ہا۔ (۳) چنگیر۔ چتلا۔ جتیا۔ جتینا

اس وقت ان کی پوری فہرست نہیں دی جا سکتی۔ اِن الفاظ کو "دیسی" کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ الفاظ ہیں جنہیں "تتسم" اور "تدبھاوا" کہتے ہیں۔ "تتسم" وہ الفاظ ہیں جو خالص سنسکرت کے ہیں، بغیر تبدیل آواز کے مثلاً ماتا، دھرم وغیرہ "تدبھاوا" وہ ہیں جنکی آواز بدل گئی ہے۔ مثلاً بھراسٹر سے بھائی۔ ماتا سے ماں۔ پاشان سے پتھر وغیرہ۔ ان تین کے علاوہ محض صوتی الفاظ ہیں۔ یہ بھی دیسی ہی ہیں مثلاً کھٹکھٹانا، سٹپٹانا، ہنہنانا، بلبلانا، بھنبھنانا وغیرہ پھر وہ الفاظ ہیں جو عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے ہیں۔

ہم لوگوں نے اُردو کے اجزائے ترکیبی کا مختصر جائزہ تو لے لیا۔ آئیے اَب ہم اجزا کے طریقۂ امتزاج و ترکیب پر عمومی تبصرہ کریں۔

یہ ظاہر ہے کہ اُردو کی تدریجی تخلیق و تعمیر بھاشاؤں میں عربی و فارسی اور پھر پرتگالی و انگریزی آمیزش سے ہوئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کن ادوار تاریخ میں یہ امتزاج واقع ہوا۔

عرب و ہند کے تعلقات زمانۂ قبل اسلام سے ثابت ہیں۔ یمنی اور حضرالموتی عرب، بحرین کے ساحل پر رہنے والے عرب بڑے ہمت والے ملاح تھے۔ بحیرۂ احمر، بحیرۂ عرب، بحرِ ہند اور بحرِ متوسط

* ڈراوری زبانیں قدیم سامی بابلی اور نینوائی زبانوں کے خاندان سے ہیں جدید تحقیق یہی بتاتی ہے۔

ہیں یہ لوگ کشتی رانی کیا کرتے تھے۔ سلطنت یونان و روم اور مشرق قریب ہندوستان و مشرق بعید کے درمیان تجارتی واسطہ یہی عرب تھے۔ بعض مغربی و مشرقی علمائے تاریخ کا خیال ہے کہ عرب ملاحوں نے امریکہ تک کا سفر کیا تھا۔ حضرت ابن عربی اندلسی کی کتابوں میں بحر ظلمات کے پرے ملکوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ غرض یہ عرب تجارت کے سلسلے سے ہندوستان کے سواحل پر آیا کرتے تھے۔ اسلام کے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی۔ یہی عرب سواحل مالابار اور کانکان پر آکر رس بس گئے۔ موپلا اور سواحل کے چند اور ماہی گیر قبیلے اُن ہی عربوں کی اولاد ہیں۔ ملایا، جاوا، سماترا اور دوسرے جزائر شرق الہند میں اکثریت آبادی عربی نسل کی ہی ہے۔

ان عربوں کے میل جول سے ہندوستان کی زبانوں میں عربی الفاظ داخل ہونا شروع ہوگئے تھے۔ یہ عمل سندھ سے لے کر سیلون تک اور سیلون سے مدراس تک ہوتا رہا تھا۔ الفاظ کا یہ اختلاط کوئی سرسری اختلاط نہ تھا، کیونکہ تجارتی اغراض کے لئے عرب نوآبادیاں سواحل پر اور اندرون ملک قائم تھیں۔ اس دور میں عربی الفاظ آریائی بھاشاؤں سے بھی ملے اور ڈراوری سے بھی۔ سندھی گجراتی اور راجستھانی بھاشاؤں میں عربی الفاظ داخل ہونا شروع ہوئے اور دوسری طرف کنّاریز، تیلگو، ملیالم، اور تامل زبانوں میں۔

ہند و ایران کے تعلقات بھی بہت پرانے ہیں۔ اسلامی عہد سے قبل ایران و ہند کے درمیان تجارتی اور سیاسی روابط قائم تھے۔ اشوکا اور کنشکا کی عظیم سلطنتیں ہندوستان سے لے کر افغانستان و خراسان سے آگے تک تھیں۔ اس طور پر فارسی الفاظ کا میل پراکرتوں اور بھاشاؤں کے ساتھ بہت قدیمی ہے۔ اس میل جول سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انھوں نے جو لسانی صورت پیدا کی اُسے ماہر تاریخ جناب ڈاکٹر اس سی۔ سرکار، صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج "PROTO-URDU" "پروٹو اردو" کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔ اردو کا ابتدائی جرثومہ یا "اردوئے نخستین" کا عہد تحقیق و انکشافات کے لئے وسیع میدان پیش کرتا ہے۔ حضرت بودھ کے بعض کلمات مثلاً "دھرم کرو دھرم کرو....." وغیرہ غور طلب ہیں۔

یہ ابتدائی اثرات شمال اور جنوب ہر دو حصہ ہائے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور اولی کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ پر فوج کشی کی اور عربی سلطنت دو ڈھائی سو سال تک سندھ سے ملتان تک رہی ۷۱۲ء میں سندھ فتح ہوا اور ۷۱۳ء میں ملتان قلمرو اسلامیہ میں شامل ہوگیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنجاب کا دعوے اولیت صحیح نہیں، مگر اسکی بہت بڑی اہمیت سے انکار نہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ہندوستان پر اسلامی اثرات سیاست سے پہلے بذریعہ تجارت پڑے۔ ہندوستانی زبانوں پر عربی اثرات پہلے، سواحل مالابار، کانکان، گجرات اور سندھ پر عربی تاجروں کے ذریعہ پڑے۔ اس کے بعد ملکی

---

حشہ ملاحظہ ہو علامہ سلیمان ندوی کی کتاب ۔ عرب و ہند کے تعلقات قبل اسلام ۔

فتوحات کے ذریعہ سندھ، جنوبی پنجاب، راجستھان وغیرہ پر پڑے۔

اُس دورِ سعادت میں اسلام کی ذہنی و روحانی فتوحات سیاسی فتوحات سے آگے آگے چلتی تھیں۔ اس امر کے بہ کثرت شواہد موجود ہیں۔ عرب مبلغین پہلی صدی ہجری میں ہی چین تک تبلیغ کے لئے نکل گئے تھے۔ تاریخ سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ صحابہ کرام میں سے ہی چند افراد افغانستان اور مغربی چین تک تبلیغ کے لئے تشریف لائے تھے۔ دور و دراز جزیروں تک، آباد ساحلوں، وسیع صحراؤں گہرے سمندروں اور بلند پہاڑوں پر محمد صلعم کا پیام جاں بخش پہنچا یا گیا۔ ایسی پُر ولولہ قوم دو ڈھائی سو سال تک ہندوستان کے ایک وسیع مغربی علاقہ پر حکمران ہو اور اُس کے روحانی برکات صرف سندھ اور ملتان تک ہی محدود ہوں، یہ ناممکن ہے۔ حق یہ ہے کہ صوفیائے کرام تبلیغ اسلام کا فرض ادا کرتے ہوئے دور دراز تک ہندوستان میں پھیل گئے ہونگے۔ اِن بزرگوں کے ذریعہ مُلک کی بھاشاؤں سے عربی الفاظ کا پیوند لگنا شروع ہوا۔ آیندہ بھی ہم دیکھیں گے کہ صوفیائے کرام نے اُردو زبان کی تخلیق و تعمیر میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ اس مذہبی اثر و نفوذ کے علاوہ، تجارتی تعلقات اور سیاسی عملداری و روابط نے بھی ملک میں وہ فضا پیدا کی جس میں بھاشاؤں کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ آمیز ہونے لگے۔

۹۸۶ء سبکتگین نے پنجاب پر حملہ کیا سرحد و پنجاب اسکے قبضہ میں آگئے۔ محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۶ء اپنے حملے جاری رکھے اور حکومت غزنویہ دو سو سال تک، سرحد، پنجاب، کالنجر، قنوج، متھرا اور گجرات پر قائم رہی۔ لاہور دارالسلطنت تھا۔

شہاب الدین محمد غوری نے اسلامی مملکت کو اور وسیع کیا۔ مذکورہ بالا علاقوں کے علاوہ اجمیر دہلی علی گڈھ اور ہانسی کے علاقے زیرنگیں ہوگئے۔ ۱۱۹۲ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔

ابھی دہلی و اجمیر مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں ہوئے تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ پرتھی راج کی سلطنت کے اندر بہر تبلیغ و ہدایت اجمیر تشریف لے گئے۔ ۱۱۹۲ء میں پرتھی راج نے شکست کھائی ہو اور حضرت اس سے سالوں پہلے نور اسلام کی شعائیں اجمیر کی پہاڑیوں سے بکھیر رہے تھے۔ غرض یہ کہ سیاسی فتوحات تخلیق اُردو میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور صوفیائے کرام کبھی بھی صرف مفتوحہ علاقہ میں اپنے کو محدود نہیں رکھتے تھے۔

پرتھی راج کا درباری شاعر چاند بردائی اپنی رزمیہ نظم پرتھی راج راسو میں بکثرت عربی و فارسی الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ۔ بارہ بانس بتیس میں چار انگل پرمان ✢ اتنے پر بادشاہ ہے مت چوکے چوہان

اس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ان علاقوں میں بھی عربی و فارسی الفاظ بھاشاؤں سے مل رہے تھے جو علاقے ہنوز مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں ہوئے تھے۔ غرض جس وقت سندھ اور پنجاب میں اُردو بن رہی تھی راجپوتانہ اور دوسرے علاقوں میں بھی یہ نیا جاندار خمیر تیار ہو رہا تھا۔

(باقی)

سید اختر احمد اورینوی

# انگریزی ادب کے جدید رجحانات کا اثر اُردو ادب پر

انگریزی ادب کے اثر سے اُردو ادب میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئیں، نثر کا ارتقا۔ ناول کی تخلیق اور نیچرل شاعری کی مقبولیت کا باعث اُردو ادب انگریزی کا اثر تھا۔ اور انگریزی ادب کے تتبع کا سلسلہ ہنوز قائم ہے اور اردو ادب کے جدید رجحانات کے صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ خود انگریزی ادب کے جدید رجحانات یورپ کے گذشتہ جنگ کے بعد کی اقتصادی اور سیاسی حالات کا نتیجہ ہیں جنگِ عظیم نے یورپ کے تمدن و تہذیب کی بنیادیں ہلا دیں اور وکٹورین عہد کے جمود سے بُری طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ہر ایک عقیدے کی نیو کھوکھلی کر دی اور پھر یقین اطمینان اور اطاعت کے جذبات کو مٹا ڈالا۔ جنگ کا نتیجہ اس میں ایک بالکل نرالی اقتصادی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس انقلاب کی خواہش پیدا ہوئی۔

اشتراکیت کے فلسفہ میں لوگوں کو اُمید کی کرن نظر آئی اشتراکیت کے لیڈر ان کو اس تاریکی میں سے جو یورپ پر جنگ کے بعد چھائی گئی تھی نکالنے والے نظر آنے لگے۔ ادب معاشرت کا آئینہ ہے۔ اور انسان کے خیالات اور جذبات کرسٹالائزڈ crystalised صورت۔ اس لئے جو ادب بعد از جنگ یورپ میں پیدا ہوئی اس میں یاس و حسرت و نا امیدی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ بعد از جنگ شاعروں کے نغمے (خدا آسمان پر دنیا کا سب کام درست ہے) God is in his heaven, All's right with the world

کی صدا نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے دل کی پکار تو یہ ہے کے

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل ✢ کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

ان کو کسی چیز اور کسی اصول پر بھروسہ نہیں رہا۔ حب الوطنی ان کے لئے دھوکا ثابت ہوئی۔ مذہب آڑے کر ان کو توپوں کے بھینٹ چڑھا یا گیا۔ نیکی ان کے لئے ایک بے معنی لفظ نظر آئی۔ غرض ان کا متاع ایمان اس ذہنی زلزلہ میں بالکل ہی تباہ ہو گیا جو کے جنگ عظیم کے بعد یورپ میں ظاہر ہوا۔

لیکن بغیر کسی آس کسی امید بغیر کسی چیز یا اصول کے جان دینے تک تیار رہنے کے جذبات، کے بغیر انسان کا جینا مشکل ہے۔ اپنے دین و مذہب سے مُنہ موڑے و ثلثیت سے بیزار اخلاق پر طنز کرنے والے نوجوانوں نے اس کو اپنا شکار بنایا لینن کو اپنا پیغمبر اور اشتراکیت کو اپنا مذہب۔ نول کاورڈ۔ آڈن۔ سپین ڈر۔ ڈیوس ہر ایک کی نظم و ڈراما میں خیالات

صاف نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر وہ اصول جو ابتک مانی ہوئی بات تھی غلط ہے جھوٹ ہے۔ فریب ہے اور دنیا کی نجات اگر ہو سکتی ہے تو، اشتراکیت کے ذریعہ۔ یہی بعد از جنگ شاعروں کا کہنا ہے اور یہی بعد از جنگ کے نثر نگاروں کا۔ ھکسلے ورجینیا ولف۔ وکی بام۔ وغیرہ ان سب کے ناولوں میں یہی رجحان پایا جاتا ہے۔

سیگ۔ فریڈ کے نفسیاتی انکشافات نے جدید ادب پر ایک اور نیا رنگ چڑھا دیا اور کردار کا نفسیاتی مطالعہ جدید ادب کے خصوصیات میں سے سمجھا جانے لگا۔

جدید اُردو ادب میں انہی رجحانات کا عکس پایا جاتا ہے۔ جنگِ عظیم نے جہاں یورپ کے نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کیا وہاں ہندوستان کے نوجوانوں کے دل میں وطنیت اور آزادی کے جذبات کی لہر دوڑادی اور جنگ عظیم کے بعد حکومت کی وعدہ شکنی اور ترکوں کی تباہی سے ہندوستانی نوجوانوں میں وہی جذبات نا امیدی و یاس پیدا ہوگئے جیسے کے یورپ کے جوانوں میں۔ جنگ کے بعد جنہوں نے جنگ پر سب کچھ قربان کر دیا تھا انکی حالت کو دیکھکر۔

ہندوستان کے مزدوروں کی کس مپرسی و افلاس کا حل اشتراکیت نظر آنے لگی۔ اور مذہب کے آڑ میں ہر ایک ترقی اور بہبودی کے تحریک کی مخالفت اور فرقہ وارانا جھگڑے نے ہندوستان کے نوجوانوں کو مذہب سے بیگانہ کر دیا۔ نفسیات کے علم نے انسانی کردار کے نقطہ نگاہ کو بدل دیا جدید اردو ادب ان سب رجحانات کا عکس ہے۔ سجاد ظہیر۔ علی سردار جعفری۔ احمد علی۔ حیات اللہ انصاری۔ رشید ظفر عصمت چغتائی۔ ان سب کے تحریر میں اسی ہیجان کا پتہ چلتا ہے جو کے ہندوستانی نوجوانوں کے دل و دماغ میں برپا ہے۔ ان کے قصوں میں بدقسمت انسانوں کے خیالات و رجحانات کی ترجمانی ہے جو کے ایک تہذیب کے غروب اور دوسرے کے طلوع ہونیکے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ جنکو پُرانے اصولوں پر یقین نہیں رہا اور جنہوں نے ان کے اصول ابتک بنائے نہیں اور زندگی کے سمندر میں بغیر کسی قطب نما کے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

رشید ظفر کا قلم محکومیت، ڈسپلین اور مذہب کے آڑ میں طرح طرح کا شکار کھیلنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری اور احمد علی کی تحریر برطانوی تہذیب کے پردے فاش کرتی ہے۔ اور نیاز فتحپوری انسانی تحت الشعور کے رازوں کو دماغ اور جذبات کی کشمکش کو صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں۔

ان میں سے ہر ایک اشتراکیت میں ہندوستان اور دنیا کے مصیبتوں کا حل دیکھتا ہے ہر ایک زمینداروں کارخانہ داروں اور امیروں کے ظلم وستم حرص و لالچ اور ان کے مقابلہ میں غریبوں کی بے بسی عسرت اور کس مپرسی کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

جدید اُردو ادب کے ان علمبرداروں کی تحریریں خلوص ہے۔ اثر ہے۔ اختصار اور اختصار کا حسن ہے انسانی کیرکٹر کی گہرائیوں کا احساس ہو وہ انسانوں کو نیک اور بد دو گروہوں میں منقسم نہیں سمجھتے۔ اس کا احساس رکھتے ہیں کہ شاذ ہی کوئی انسان ایسا ہے جس کو کہ مکمل طور پر نیک کہا جا سکے یا جو کہ بدی مجسم ہو۔ اس لئے انکی تخلیق کردہ کیرکٹر بہت زیادہ واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابتک انہوں نے کوئی شاہکار ایسا نہیں پیدا کیا ہے جو کہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو تاہم سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" رشیدہ ظفر کی "عورت" اور علی سردار جعفری کی "منزل" حیات اللہ انصاری کی "انوکھی معیبت" چغتائی کی "کالیاں" کے فسانے یورپ کے بہترین مختصر فسانوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ادب کے جدید رجحانات نومشقوں کے ہاتھ اور ان کے ہاتھ جو کہ بغیر ادب کا مذاق رکھے ہوئے خواہ مخواہ ادب پر کرم فرمائی کرتے ہیں۔ مضحکہ انگیز صورت اختیار کرتی ہے۔ ادب سے بے بہرہ لیکن جدت پرشیدا یہ سمجھتے ہیں کہ الفاظ کی عُریانی، خیالات کی بے باکی اور شوخی مسلّمہ قوانین کے خلاف صدائے احتجاج، اور اگر نظم کی طرف متوجہ ہوئے تو ردیف قافیہ کے ہر قید سے آزادی۔ ان کو جدید ادب کا درخشندہ ستارہ بنا دینے کو کافی ہے یہ سخت غلطی ہے۔ جدید ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سچائی اور واقعیت کا آئینہ دار ہو۔ خواہ مخواہ کو ان جذبات کا ادعا کرنے والے حضرات جدید ادب کے لکھنے والوں میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ صرف نقالوں میں۔

شائستہ اختر سہروردی

# مطبوعات جدیدہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مصنفہ کارلائل و مترجمہ عبید الرحمٰن صاحب عاقل رحمانی صفحات ۹۴، تقطیع ۷ × ۵ انچ قیمت ۸ ر شایع کردہ کتابستان، بمبئی ۱۸۴۰ء میں کارلائل نے ۶ لکچر دیے تھے جن کا مجموعہ "On Heroes and Hero-worship, and the Heroic in History" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب دوسرے لکچر کا ترجمہ ہے۔ ابتدا میں محمد عبد العزیز صاحب نے ۱۴ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے، لیکن اس سے نہ تو صحیح طور پر کارلائل کے عقائد کا پتا چلتا ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ 'ہیرو' 'ہیرو ورشپ' اور 'پرونٹ' سے کارلائل کی کیا مراد ہے۔ اس لکچر کا ترجمہ اردو میں غالباً اس سے بیشتر بھی ہو چکا ہے، اس لیے توقع تھی کہ اگر مترجم کو دوسرے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، تو انھوں نے صحت کا خاص لحاظ رکھا ہوگا۔ لیکن، اس کے مطالعے سے گمان ہوتا ہے کہ مترجم نے (گو انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا) صرف عربی ترجمے کو پیش نظر رکھا ہے اور اصل کتاب کی طرف رجوع کو فضول سمجھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام نقائص جن سے ایک ترجمے کو مبرّا ہونا چاہیے اس میں موجود ہیں۔ مترجم پر عربیت کا غلبہ ہے اس کتاب میں نامانوس عربی الفاظ کی کثرت ہے اور اکثر مانوس لفظوں کو نامانوس معانی میں استعمال کیا ہے۔ کل مثالوں کی جگہ نہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ص۲۷ ذاکرہ کی ملامت، ص۳ رقت ظرف، ص۳۱ تدین (دین داری)، ص۳۲ تخیر، ص۳۵ دیانت (دین) عربی طرز ادا کے تتبع میں جا بجا قسمیں بھی کھائی ہیں، حالاں کہ کارلائل کے یہاں ایک جگہ بھی اس کی مثال نہیں ملتی؛ ص۴۱ " قسم خدا کی محمدؐ کی امیت بھی عجیب ہے" یہ کارلائل کے اس جملے کا ترجمہ ہے:

"Curious, if we will reflect on it, this of having no books."

سر سلطان احمد اور سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کا یہ خیال کہ مسلمان اردو میں روز بہ روز عربی عنصر کو بڑھاتے جاتے ہیں، غالباً اسی وضع کے اہل قلم کی کتابوں کے مطالعے پر مبنی ہے۔

ترجمہ کس قدر صحیح اور مطابق اصل ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایسی مثالوں سے کتاب بھری ہوئی ہے۔

(۱) ماہ رمضان اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اسلام ہر قسم کی لذتوں اور شہوتوں سے بری اور پاک و صاف ہے، کیوں کہ ماہ رمضان میں انسان ہر قسم کی شہوتوں سے قطعاً رک جاتا ہے، نفس کو اس کے تمام شہوانی مطالب اور مقاصد سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ عقل و حزم کی یہی تو انتہا ہے کیوں کہ

لذتوں کا حصول فی نفسہ کوئی بری بات نہیں بلکہ بری بات یہ ہے کہ جابر شہوت کے سامنے انسانی نفس حد درجہ ذلیل خوار ہو جائے اور خواہشات و رغبات کا بالکل خادم اور غلام ہو جائے۔ سب سے بہترین فضیلت اور شریف عادت یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر غلبہ حاصل ہو اور لذات کو نفس کے لئے زنجیر اور قید نہ بنا دے تاکہ نفس منع نہ کرنے کے باوجود، سرکشی نہ کر سکے بلکہ لذات نفس کے لیے صرف زیور اور زخارف ہوں۔ انسان جب چاہے ان لذتوں کو اپنے نفس سے روک دے۔ یہی رمضان کا حال ہے، خواہ وہ آں حضرت صلعم کا خود ساختہ قانون ہو یا فطرت کی وحی ہو یا الہام الٰہی، بہر حال قسم خدا کی روزے کا قانون بھی بہترین قانون ہے" ص ۵۸ و ۵۹،

In reference to this of the sensual paradise and Mahomet's sensuality, the sorest chapter for all of us, there were many things to be said; which it is not convenient to enter upon here. Two remarks only I shall make and therewith leave it to your candour. The first is furnished by Goethe; it is a casual hint of his which seems well worth taking note of. In one of his Delineations in Meister's Travels, it is, the hero comes upon a Society of men with very strange ways, one of which was this: 'We require' says the Master, 'that each of our people shall restrict himself in one direction shall go right against his desire in one matter and make himself do things he does not wish, should we allow him the greater latitude on all other sides.' There seems to be great justness in this. Enjoying things which are pleasant, that is not the evil; it is the reducing of our moral self to slavery by them that is. Let a man assert withal that he is king over his habitudes; that he could and would shake them off on cause shown: this is an excellent law. The month of Ramazan for

for the Moslems, much in Mahomet's religion, much in his own life, bears in that direction, if not by forethought or clear purpose of moral improvement on his part, then by a certain healthy manful instinct which is as good".

(۲) حقیقت یہ ہے کہ جنت و جہنم در اصل حقیقت ابدیہ کے رمز ہیں' اس کا کبھی بھی ایسا بہترین اور اعلیٰ تذکرہ نہیں کیا گیا جیسا کہ قرآن شریف میں کیا گیا ہے ۔ جنت اور اس کی لذتیں، جہنم اور اس کے عذاب اور اس قیامت کے متعلق کے متعلق تم کیا خیال کرتے ہو جس کی بابت قرآن مجید میں کہا ہے : ... اس روز تم دیکھوگے کہ ہر دودھ پلانے والی اس کو بھول جائے گی جس کو وہ دودھ پلاتی تھی اور ہر حمل والی عورت اپنے حمل وضع کردے گی اور تم لوگوں کو نشے کی حالت میں دیکھوگے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے" صفحہ ۸۹ و ۹۰'

But, there is another thing to be said about the Mahomedan Heaven and Hell. This namely, that, however gross and material they may be, they are an emblem of an everlasting truth, not always so well remembered elsewhere". Yet with every allowance, one feels it difficult to see how any mortal ever could consider this Koran as a book written in Heaven, too good for the Earth.

(یہ اور اس کے بعد کے متعدد جملوں کا مترجم نے ترجمہ ہی نہیں کیا ) صفحہ ۷۵ تا ۷۵ ) ۔

ان کارلائل کی اصل عبارت کا ترجمے سے مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت ناظرین پر واضح ہوگئی ہوگی کہ مصنف نے ترجمے میں فاحش غلطیاں ہی نہیں کی ہیں' بلکہ جابجا عبارتیں اپنی طرف سے بڑھادی ہیں' اور کہیں کہیں جملے کے جملے حذف کردیے ہیں ۔ اس ترجمے سے اسلام اور قرآن مجید کے متعلق کارلائل کے اصلی خیالات کبھی معلوم نہیں ہوسکتے ۔ مترجم کا مقصد اگر اپنے خیالات کا پیش کرنا تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا ۔ لیکن انھیں اس کا کوئی حق نہیں کہ اپنے خیالات کو کارلائل کی طرف منسوب کردیں ۔

... کارلائل کی کتاب اگر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھی تو اس کا ترجمہ ہی ضروری

نہ تھا، یہہ صورت بھی ممکن تھی کہ حواشی میں قابل اعتراض مقامات کی تردید کردی جاتی۔
مترجم نے صحت زبان کا بھی چنداں لحاظ نہیں کیا۔ ص۳۰ ان کا شرف خرہم (ان کی چاہیئے)
ص۳۳ رعد اور کڑک ودیعت کردیا ہے، (ودیعت کردی ہے چاہیئے ص۳۲ برتریت (برتری چاہیئے)

**ابجدی**

کشمش نانی: مصنفہ شجاع احمد صاحب فائز۔ صفحات ۸۰، تقطیع ۷ × ۵ انچ۔ قیمت ۱ر
شائع کردہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن۔ یہہ ایک کہانیوں کی کتاب ہے جو بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے۔ اپنی قسم کی کتابوں میں بری نہیں، اگرچہ بعض کہانیوں کے متعلق شبہہ ہے کہ
وہ بچوں کے لیے موزوں بھی ہیں یا نہیں۔

**ابجدی**

---

## تصحیح

ماہ اگست کے معاصر میں شوق نیموی کا ایک شعر غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح یوں ہے:
"دامن کبھی جھلتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ  اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا"

ماہنامہ

# معاصر

مدیر:- عظیم الدّین احمد

دائرۂ ادب، بانکی پور۔ پٹنہ

# فہرست

| نمبر ۶ (۱) | نومبر و دسمبر ۱۹۴۲ء | جلد ۴ |
|---|---|---|

| مضمون | مضمون نگار | |
|---|---|---|
| اعتذار | س ۔ ا ۔ ۲ | ۱ |
| اردو زبان اور فن داستان گوئی | کلیم الدین احمد | ۳ |
| اسعد الاخبار آگرہ | قاضی عبدالودود | ۱۲ |
| استفسار | روش صدیقی | ۱۷ |
| جھوٹی بھوک | سید محمد محسن | ۱۸ |
| مہیش | رضا مظہری | ۲۶ |
| قصیدہ مصحفی | ق ۔ ع ۔ و | ۳۵ |
| بولیوں کا سنگم | سید اختر احمد اختر اورینوی | ۳۸ |
| دیوان رضا | . . . . . | ۵۷-۶۴ |

چندہ سالانہ للعہ     فی پرچہ ۶ر

# اعتذار

جنگ کی تباہ کاریاں اتنی وسیع ہیں کہ ان کا سرسری طور پر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تہذیب سوزیاں صرف محاذ ہی تک محدود نہیں، اس کا منحوس تاریک سایہ انسانی آبادی کے ہر گوشے، تمدن کے ہر زاویہ پر لعنت کی طرح چھایا ہوا ہے۔ پیکار کے دیوتاؤں کی خوں ریزیوں نے امن و سکون کی بربادی اور موت کی ارزانی کے ساتھ تخلیق و ترویج ادب کا بھی گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر گوئبلز نے ایک دفعہ کہا تھا "جب کوئی کلچر کا نام زبان پر لاتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً پستول کا گھوڑا اٹھا لوں" اس بیسویں صدی سے ڈاکٹر فاؤسٹ کی تمنا ان دنوں کیا کیا پوری ہو رہی ہے۔ شیطان قہقہے لگا رہا ہے اور انسانیت تباہ حال ہے۔

دنیا کا کون سا ملک ایسا رہ گیا ہے۔ جہاں اشیاء کی گرانی ہماں گسل ہو کر نہیں رہ گئی ہے۔ ذوق کی تشنگی کا تو کیا رونا آدمیوں کی اکثریت کی بھوک تک دور نہیں ہو سکتی۔ ادب و نشر ادب کا مسئلہ زندگی کے اور سینکڑوں مسائل کی طرح لاینحل ہو کر رہ گیا ہے۔ کاغذ کی حوصلہ شکن گرانی اب تو عمل کُش نایابی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ مطبع والوں کی پریشانیاں الگ ہیں۔ چھاپے کی روشنائی اور دوسرے سامان نہیں ملتے۔ اکثر پریسوں کی بنیادیں ہل گئیں ہیں۔ کام میں باضابطگی تقریباً ناممکن ہو گئی ہے۔ معاصر کو بھی اسی ناساز گار فضاء کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں قارئین معاصر سے یہ بجا توقع ہے کہ وہ معذرت قبول فرمائیں گے۔ معاصر اپنے وقت کی پابندی برقرار نہیں رکھ سکا اور چھپائی کے انداز میں بھی گراوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم ہماری سعی جاری ہے کہ صورتِ حال بدل کر باضابطگی اور نفاست کے ساتھ معیار کو قایم کیا جائے۔

معاصر کا تعلق نامساعد طور پر جنگ سے روزِ اوّل ہی سے رہا ہے۔ دورانِ جنگ میں اس کا اجرا ہوا اور اسکی توسیعِ اشاعت کی ابتدائی منزلیں عہدِ پیکار میں طے ہو رہی ہیں توقع تھی کہ رفتہ رفتہ معاصر اُردو صحافت میں مالی طور پر بھی اپنی ایک استوار جگہ بنائے گا۔ مگر زمانہ کی سختیوں نے اسے یہ موقع نہ دیا۔ اگر یہ پہلو کامیاب ہو جاتا تو ہم ملک بھر کے اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں اپنے حوصلے کے مطابق معاصر ہدیۃً ارسال کرتے، اور اس مسلسل حاضری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ محفلِ معاصر میں ادبا، اور شعراء کا جمگھٹ نظر آتا۔ ہمیں یہ تلخ احساس ہے کہ معاصر کے لکھنے والوں میں وہ تنوع نہیں پیدا ہو سکا جسکی ہمیں تمنا تھی۔ جدال و قتال کے ایام میں طبیعتیں کچھ ٹھکانے بھی نہیں رہتیں کہ اہلِ قلم سکون سے تخلیقِ ادب کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اس مہیب عالم سوز جنگ کو تو "اعصاب کی جنگ" بھی کہتے ہیں۔ خصوصاً ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء میں آدم کی اولاد جس تشنج و بحران، ہیجان و اضطراب سے گذری ہے وہ بس اپنی مثال آپ ہے۔ کس کے ہوش ٹھکانے تھے کہ دہ یکسوئی کے ساتھ ادب کی دیوی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائے۔ اس عرصے میں ادبی "شیش محل" میں بسنے والے اور فن کے مرمریں میناروں کی سیر کرنے والے بھی بمباروں کے ہوشربا فرّاٹوں اور توپ کی گرج سے لرز لرز اُٹھے۔ کون سا ادیب ہے جو جنگ سے متاثر نہیں ہوا؟

ایسے عہدِ انتشار میں قارئین کی پسندیدگیاں بھی معیارِ ادب کی خوبیوں کی بجائے رسالوں اور کتابوں میں اُن چیزوں کی تلاش زیادہ کرتی ہیں، جنہیں دل بھلاوا یا فریبِ خیال کہا جاتا ہے۔ لوگ اپنے فکر و اضطراب کو افیون دے کر غم غلط کرنا چاہتے ہیں۔ معاصر کی غیر تاجرانہ ذہنیت اس بیوپار میں مانع آئی۔ ہم اس سطح پر اُترنے سے پہلے موت قبول کر لیتے۔ اگر ہمیں ایسا کرنا ہوتا تو پھر رسالوں کی بھیڑ بھاڑ میں معاصر نکالا ہی کیوں جاتا۔ غرض ہر پہلو سے معاصر کو موجودہ جنگ کی سختیاں سہنی پڑیں۔

مگر ان نارسائیوں، ناکامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود معاصر نے ملک کے سُتھرا مذاق اور پرکھنے والی نظر رکھنے والوں کے ایک خاصے وسیع حلقے میں اکرام و محبت حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے لئے یہی چیز کٹھن منزلوں میں بڑی حوصلہ افزا ہے۔

س ۔ ۱۰۱۰

# اردو زبان اور فن داستان گوئی

## (۹) بوستان خیال

"بوستان خیال" کی شان نزول یہہ ہے: "میر تقی خیال متوطن گجرات گردش گردون دوں سے پریشان حال ہوکے عہد سلطنت میں محمد شاہ بادشاہ کے شہر دہلی میں وارد ہوئے۔ ان کی منظور نظر ایک زن مطربہ تھی شب کو اکثر وہ ان سے قصص تازہ کی فرمائش کیا کرتی تھی یہہ بپاس خاطر اپنی محبوبہ کے روز ایک قصہ تازہ اپنی طبیعت سے ایجاد کرکے سنا دیتے۔ ان کے مکان کے عقب میں کچھ لوگ جمع ہوتے تھے اور داستان امیر حمزہ کی بیان کی جاتی تھی۔ میر تقی بھی کبھی کبھی تفریحاً شریک جلسہ ہوتے تھے، ایک روز بعد ختم داستان اہالیان جلسہ نے داستان امیر حمزہ کی نہایت تعریف کی لیکن داستان گو نے میر تقی کو سنا کے کہا کہ جی ہاں داستان کے مرتب کرنے کے واسطے خداوند عالم قابلیت پیدا کرے تو ممکن ہے ورنہ تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے۔ یہہ بات میر تقی کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ کہا کیا کہتے ہو صاحبان علم و فضل کے روبرو ایسے خیالات کی کیا حقیقت ہے... تھوڑے ہی عرصہ میں چند اجزا کتاب کے مرتب کرکے اس جلسہ میں گئے اور بعد ختم داستان امیر حمزہ اہالیان جلسہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ چند اجزا ایک قصہ تازہ کے دستیاب ہوئے ہیں اجازت ہو تو سناؤں۔ سب نے متفق اللفظ کہا بسم اللہ ضرور پڑھئے جب پڑھا تمام حاضرین جلسہ محو ہوگئے اور ہر طرف سے صدائے تحسین بلند تھی اور آپس میں کہتے تھے واقعی اس طرح کا قصہ آج تک نہیں سننے میں آیا۔ یہہ قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا بلکہ واقعہ اصلی ہے..."

یعنی یہ داستان محض ایک اتفاقی واقعہ کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ نامعلوم داستان گو میر تقی کو سناکر یہہ نہ کہتا: "جی ہاں داستان کے مرتب کرنے کے واسطے خداوند عالم قابلیت پیدا کرے تو ممکن ہے ورنہ تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے" تو شاید یہہ داستان عالم وجود میں نہ آتی۔ یہہ بھی ظاہر ہے کہ "بوستان خیال" "داستان امیر حمزہ" کا جواب ہے۔ اور اس میں قصداً ایک بہتر داستان لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ غالب کے الفاظ میں یہہ ہے: "معز الدین فیروز بخت کی کشور کشائیاں، ابوالحسن جوہری کی نیرنگ نمائیاں، عجائبات حکیم قسطاس کی حیرت فزائیاں، ملکہ نوبہار کی رنگیں ادائیاں، جمشید خود پرست کی زور آزمائیاں، ضار منکوس منحوس کی بیحیائیاں سلاطین و کفار کی لڑائیاں مسلمانوں کی بھلائیاں کافروں کی برائیاں"۔ یعنی یہاں بھی وہی چیزیں ہیں جو "داستان امیر حمزہ" میں ملتی ہیں لیکن بھیس کچھ مختلف ہے۔ "بوستان خیال" میں بھی "باغ کی صفت، معشوقوں کا سراپا، صبح و شام کا ہونا عجائبات طلسم کی نیرنگیاں، کوہ و صحرا بحر و بر کی کیفیت، رزم و بزم کی لطافت" غرض انھیں چیزوں سے

ہم دوچار ہوتے ہیں جو "طلسم ہوش ربا" میں ہماری دلچسپی کا سامان ہیں۔
کہتے ہیں کہ نقش ثانی نقش اول سے اچھا ہوتا ہے۔ "بوستان خیال" نقش ثانی کا مرتبہ رکھتی ہے لیکن یہہ نقش اوّل یعنی "داستان امیر حمزہ" خصوصاً "طلسم ہوش ربا" کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی۔ شاید مادی اور مکانکی دنیا میں یہہ مقولہ صحیح ثابت ہو لیکن دنیائے ادب میں تو یہہ نادرست ہے۔ ورنہ آج "اِلیڈ" اور "ڈوائن کومیڈی" جیسی کتنی کتابیں موجود ہوتیں بلکہ ان سے بہتر۔ لیکن واقعہ کچھ اور ہے۔ بہرکیف، "بوستان خیال" میں اتنا ضرور ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کے بعض نقائص سے ہمیں سابقہ نہیں پڑتا۔ وہ تکلیف وہ مبالغہ، وہ مضامین کی پریشان کن تکرار، وہ الفاظ ونقوش کا ناموزوں سیلاب یہاں نہیں۔ نسبتاً یہاں اعتدال۔ انتخاب، اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے پہلی نظر میں داستان زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ دو خصوصیتیں اسے "طلسم ہوش ربا" سے ممیز کرتی ہیں اور ان دونوں خصوصیتوں کا قصداً التزام کیا گیا ہے۔
پہلی مرتبہ جب یہہ داستان سنائی گئی تھی تو "اہالیان جلسہ" نے "صدائے تحسین" بلند کی تھی اور وہ آپس میں کہتے تھے "یہہ قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا بلکہ یہہ کوئی واقعہ اصلی ہے"۔ یہی اس کی پہلی خصوصیت ہے۔ قصد یہہ ہے کہ تمہید و بیان قصہ میں تاریخ گزشتہ کا لطف آئے۔ نیز معلوم ہو کہ داستان گو افیون کی ترنگ میں آسمان زمین کے قلابے ملا رہا ہے۔ بلکہ داستان میں تاریخی واقعیت اور صحت نظر آئے۔ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے، یہہ قصد بڑی تعریف کی بات ہے۔ اس سے داستان گوئی کے ایک بڑے گُر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ عموماً داستانوں میں خام مواد ناقابل یقین اور فوق فطرت ہوتا ہے۔ جسے اس فن کے صحیح اصول سے واقفیت ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ ناقابل یقین چیزیں بدیہی ہو جائیں اور فوق فطرت اشیاء فطری نظر آئیں۔ وہ ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ ساری چیزیں بالکل معمولی اور جانی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ "بوستان خیال" میں اس اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور خصوصاً تمہید میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جسے ہم ناممکن یا مستبعد سمجھیں۔ یہی لحاظ طرز بیان کی بھی نمایاں خصوصیت ہے۔ قصہ اس طرح کہا جاتا ہے کہ گویا کسی اصلی واقعے کا ذکر ہے۔ کہنے والے نے ایسا لب و لہجہ اختیار کیا ہے کہ جیسے اس کے دماغ میں کسی غیر معمولی، تخئیلی، حیرت انگیز داستان کا خیال بھی نہیں گزرا ہے۔ لیکن اس طرز بیان کا پوری داستان میں نباہ نہ ہو سکا۔ جیسے جیسے داستان آگے بڑھتی ہے اور غیر معمولی واقعات عجیب وغریب شعبدے سامنے آنے لگتے ہیں، لب و لہجہ "طلسم ہوش ربا" سے قریب تر ہو جاتا ہے اور زیادہ باثر واقعات ومناظر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس قصد کا ایک اثر ہر جگہ البتہ ملتا ہے اور وہ مبالغے اور زیادتی کی کمی ہے۔ اس لئے داستان میں سادگی زیادہ، فطری حسن زیادہ ہے لیکن ایک نمایاں کمی بھی ہے۔ "طلسم ہوش ربا" ایک بحر ذخار ہے۔ اس کی سطح پر خس و خاشاک شکستہ جہاز، بھدے اور بدنما اُجڑے ہوئے درخت، مردہ جانور نظر آتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حسین بدلنے والے

مناظر بھی ملتے ہیں۔ کہیں کشادہ سبزہ زار ہے تو کہیں سر بفلک پہاڑ، کبھی صبح صادق کا سماں ہے تو کبھی شفق کی رنگینی اور کبھی تاروں بھری رات "بوستان خیال" ایک کشادہ دریا ہے۔ خس و خاشاک سے پاک۔ حسین لیکن ذرا گھریلو قسم کا۔ یہاں وہ خود رفتگی، وہ بیباکیٔ تخیل غرض وہ "لطیف زیادتی" نہیں جو ہمیں "طلسم ہوشربا" میں متعجب و مسرور کرتی ہے اور جو اس کی بڑائی کی ذمہ دار ہے۔

دوسری خصوصیت جو "بوستان خیال" کو ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مصنف کی "قوت دماغی اور اکتساب علم و فضل حرف حرف سے پیدا ہے"۔ میر تقی سے اس داستان گو نے کہا تھا کہ "تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے" اور یہ بات میر تقی کو ناگوار گزری تھی۔ ان کے خیال میں "صاحبان علم و فضل کے روبرو ایسے مزخرفات" کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ انھوں نے ان مزخرفات کے ساتھ قصداً اپنے علم و فضل کی بھی نمایش کی ہے۔ "بوستان خیال" میں ہر جگہ علمیت نمایاں ہے اور پڑھنے والے اس "علمیت" سے مرعوب ہوتے ہیں۔ کم سے کم یہ تو ضرور سمجھتے ہیں کہ معمولی استعداد رکھنے والا ایسی داستان مرتب نہیں کر سکتا۔ "طلسم ہوشربا" میں یہ "علمیت" نہیں۔ اس میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں ملتی ہیں جن کی وجہ "علم و فضل" کی کمی ہے۔ "بوستان خیال" میں اس قسم کی خامیاں اور غلطیاں نہیں ملتیں۔ "معاصر" کی تنگ دامانی مانع آتی ہے ورنہ میں وسعت خیالی اور علمی قابلیت کی چند مثالیں پیش کرتا۔ وہ حصہ ملاحظہ ہو جس میں نادرہ راز دار طلسم کی حقیقت شاہزادہ معز الدین سے بیان کرتی ہے لیکن محض وسعت معلومات کی نمایش داستان میں خوشگوار اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ ملاحظہ ہو:-

"زحل سیاہ مطلق اور نحس اکبر ہے۔ ہندی میں سنیچر کہتے ہیں اور اس کے منسوبات سے دیہات و صحرا و مشائخ و خونی و قزاق و بدکار ہوتے ہیں اور تمام پھل درختوں کے بدمزہ و تلخ پیدا ہوتے ہیں۔ اور مشتری کہ جس کو ہندی میں برھسپت کہتے ہیں یہ سعد اکبر ہے اور رنگ اس کا صندلی و بادامی و جوزی و نخودی قرار دیا گیا ہے اور منسوبات اس کے زاہد و عابد و سادات و علماء فضلا ہیں اور پھل درختوں کے شیریں اور بامزہ ہیں اور مریخ جسے ہندی میں منگل کہتے ہیں سرخ رنگ سیاہی مائل جلاد فلک ہے منسوبات میں اس کے سپاہ پیشہ اور مردمان سنگدل ہیں اور میوہ ہائے ترش و تلخ ہیں..."

اس قسم کی علمی نمائش سے داستان کے حسن میں کمی ہو گئی ہے اور اس کی دلچسپی بے لطفی سے بدل جاتی ہے۔ "بوستان خیال" میں قصداً اور ضرورت سے زیادہ اس قسم کی نمائش کی گئی ہے اور اس وجہ سے یہ "طلسم ہوشربا" سے قدر و قیمت میں زیادہ نہیں کم ہو جاتی ہے۔ اس نمایش کے ساتھ ساتھ یہاں معنی خیزی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" کو مزخرفات، لغو و بے معنی قصہ سمجھ کر علم و فضل کے زور سے اس میں بلند و گہرے معانی داخل کئے گئے ہیں۔ عجائبات طلسم، واقعات و اشخاص قصہ، لوگوں اور چیزوں کے نام سبھی اندرونی معنی رکھتے ہیں۔ اور ان معانی کا بیان بھی ایک طویل داستان ہے۔

یہاں ایک مختصر سی مثال پیش کی جاتی ہے۔ شاہزادہ معز الدین "اغوائے امارہ خاتون" سے ایک مقام پر ایسا خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ "اپنے آغاز و انجام کا کچھ خیال نہ کرکے ملکہ صبح دلکشا سے خلعت ملت" ہو جاتا ہے اور یہہ امر ملکہ نو بہار گلشن افروز کی خفگی کا باعث ہوتا ہے۔ نادرہ رازدار اس واقعہ کی یوں توجیہہ کرتی ہے:۔ "یہہ امر غور طلب ہے کہ جہاں طافی شاہ و راسپ شاہ سلاطین ہوں و سردار روح الملک ان رئیسوں کا بادشاہ ہو پھر نام امارہ حکمت سے کیوں خالی ہوگا کہ طافی و راسپ خلط سودا و صفرا کی صفت ہو تو لفظ امارہ بھی بجائے نفس امارہ سمجھنا چاہئے اور اس کے حکم سے احتراز واجب ہے" اس قسم کے معانی ہر جگہ ملتے ہیں اور یہہ معانی قصداً داستان میں پروئے گئے ہیں۔ اور یہہ معنی خیزی بھی علم و فضل کی نمائش کی ایک صورت ہے۔ یہاں وہ معنی خیزی نہیں جو "داستان امیر حمزہ" میں فطری طور پر پیدا ہوتی ہے اور قصے کی ترقی کے ساتھ ترقی پاتی ہو۔ "بوستان خیال" میں ضرورت سے زیادہ قصد کاوش، علمیت کی کارفرمائی ہے: نتیجہ گرانی، اشکال اور بے لطفی کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

"واقعیت" اور "علمیت" سے قطع نظر، ہر جگہ "بوستان خیال" میں داستان امیر حمزہ" کا فیض نظر آتا ہے۔ اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس تخیل کی بزرگ پیداوار کے بعد اسی رنگ میں لکھنا اور اس سے بالکل الگ رہنا ناممکن تھا۔ جہاں علٰحدہ رہنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں زیادہ تر نتائج خوشگوار نہیں ہوتے۔ البتہ جب اسی کے نقش قدم پر چلا جاتا ہے تو پھر کامیابی ہوتی ہے۔ اگر "داستان امیر حمزہ" نہ ہوتی تو شاید "بوستان خیال" کی ہمارے دلوں میں زیادہ عظمت ہوتی۔ لیکن اُس آفتاب کے آگے اس چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور حقیقت تو یہہ ہے کہ اُس آفتاب کے بغیر اس چاند کا تصور بھی ممکن نہیں۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ "بوستان خیال" میں ہر جگہ "داستان امیر حمزہ" کا فیض نظر آتا ہے۔ اشخاص، واقعات، بیانات غرض ہر جگہ اسی آفتاب کا پرتو ہے۔ ایک امیر حمزہ کے فیض سے یہاں کئی صاحبقران پیدا ہو گئے ہیں لیکن ایک بھی امیر حمزہ سے ہمسری کا دعوٰی نہیں رکھ سکتا۔ صاحبقران اکبر شاہزادہ معز الدین ابو تمیم طلسم اور بیرون طلسم میں قسمت آزمائی اور زور آزمائی کرتے ہیں۔ سرمہ زحل، مراۃ الغیب، ذرع صد تعالی نیمچہ دیوکش، یہہ نادر چیزیں حاصل کرتے ہیں اور صاحبقران اکبر کا لقب پاتے ہیں۔ یہہ بھی جوانمرد، دیوکش فاتح طلسم ہیں، یہہ بھی انسانی اور اخلاقی محاسن سے آراستہ ہیں۔ لیکن امیر حمزہ میں جو بات ہے وہ شاہزادہ معز الدین میں موجود نہیں نقل پھر نقل ہے، اصل کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ صاحبقران اعظم خورشید تاج بخش صاحبقران اصغر شاہزادہ بدر منیر، شاہزادہ اکلیل الملک صاحبقران جزائر کسی میں وہ بزرگی، وہ شوکت وحشمت، وہ "صاحبقرانی" نہیں جو امیر حمزہ کی شخصیت میں نمایاں ہے۔ یہہ ضرور ہے کہ یہہ "صورتیں" بعد میں بنائی گئی ہیں اس لئے ان میں اکثر بظاہر زیادہ شوکت و حشمت معلوم ہوتی ہے اور ان کے ساتھ

جو لوازمات ہیں وہ بھی بعض وقت زیادہ پُر اثر نظر آتے ہیں۔ لیکن جو اصلیت امیر حمزہ کی شخصیت میں ہے وہ اور کسی میں نہیں ملتی۔

جس طرح امیر حمزہ کے ساتھ خواجہ عمرو ہیں اسی طرح شاہزادہ معزالدین کے بھی ایک رفیق و جاں نثار ہیں: سلطان ابوالحسن جوہر۔ خواجہ عمرو کی طرح ابوالحسن جوہر بھی "فن عیاری میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق" ہیں۔ ان کی تعریف" ایک عورت کی زبان سے سُنیئے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ عمرو کا ذکر ہے: "شاید تم نہیں جانتی ہو یہہ میاں نوشاہ بڑے پاک ذات ہیں، شیطان بھی ان سے دور دور بھاگتا ہے۔ صاحبقران اکبر کے عیار ہیں کبھی عورت بنتے ہیں کبھی لونڈی بنتے ہیں کبھی ناچتے ہیں کبھی گاتے ہیں۔ رنگ و روغن ان کے پاس ایسے ہیں کہ کبھی بڈھے بنجاتے ہیں کبھی مانند ساحر کے اپنی صورت بناتے ہیں۔ جہاں شیطان کا بھی گزر نہ ہو یہہ وہاں جاتے ہیں۔ ہزاروں مکر فریب جعل دغا بازیاں ان کو یاد ہیں۔ بڑے بڑے دانایان جہاں کو یہہ خواب دام فریب میں گرفتار کرلیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک زنبیل ہے قارون کی دولت سے بھی سوا اس میں روپیہ وغیرہ ہے۔ ہزارہا آدمی اس میں قید ہیں، شہر آباد ہیں، دریا جاری ہیں۔ ان سے خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ خدا نہ کرے کہ یہہ کسی کے دشمن ہوجائیں پھر اس کی جان کا بچنا محال ہے"۔ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ابوالحسن جوہر میں عمرو عیار کا ناقص چربہ اتارا گیا ہے۔ دوسرے عیاروں اور انکی عیاریوں میں بھی خواجہ عمرو کا فیضان ہے۔ میں دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ خواجہ عمرو نہایت لالچی تھے اور "داستان امیر حمزہ" ان کی اس کمزوری کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مہتر مہتران روزگار، مہتر توفیق کی باتیں سُنیئے۔ خواجہ عمرو کی آواز سے کس قدر مشابہ ہے: "صاحبقران نے فرمایا یہہ فتح تن تنہا مہتر عالی قدر نے کی ہے۔ مہتر بولا انصاف صاحبقران کے قربان اس صورت میں امیدوار ہوں کہ ایک کوڑی سے لگا کے اشرفی جواہر تک جتنا مال ہے سب غلام کو مرحمت ہو کسی کو اس میں سے پھوٹی کوڑی نہ ملے اس لئے کہ آج کل غلام بہت مفلس ہو رہا ہے۔ قرض بھی زیادہ ہوگیا ہے قرضخواہ سخت حیران کرتے ہیں"۔ نقالی کی زیادہ روشن یہہ دوسری مثال ہے۔ زمرد شاہ باختری کی داڑھی کے ہر بال میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ خواجہ عمرو بھلا کب چوکتے ہیں۔ عیاری کر گزرے اور زمرد شاہ کی داڑھی مونڈ کر موتیوں کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ "بوستان خیال" میں جمشید خود پرست نے (جو خداوند لقا کی بگڑی ہوئی صورت ہے) "زمرد شاہ کا قصہ سُن کے اس کی نقل کی یعنی اپنی داڑھی مونچھوں کے بال میں موتی پروئے"۔ نہنگ مصری نے جو خواجہ عمرو کی عیاری سے واقف تھا جمشید خود پرست کی وہی درگت بنائی جو خواجہ عمرو نے زمرد شاہ کی بنائی تھی۔ اور ایک رقعہ لکھ کے مونچھ میں لٹکا دیا۔ مضمون یہ تھا: "اے جمشید ہمنے سنا تھا کہ ابوحاکم نے نقل زمرد شاہ کی تھی یعنی اس احمق نے اپنی ریش نجس میں موتی لگائے تھے لیکن یہہ نہ کہا کہ عیار عمرو نام نے اس کی داڑھی بطمع مروارید خوب مونڈی اور مروارید لے گیا۔ تونے جو اس مردک کی نقل کی اور داڑھی میں موتی پروئے ہم بھی عمرو عیار کی شکل بن کے داڑھی مونڈ لے گئے۔

اس واسطے کہ بدون اس کے نقل پوری نہ ہوتی ناقص رہتی اب وہ نقل پوری ہو گئی"۔ یہاں "داستان امیر حمزہؓ" کی کھلی نقالی ہے اور اس نقالی کا اعتراف بھی ہے نقالی تو ہر جگہ ہے لیکن اعتراف ہر جگہ نہیں۔

جمشید خود پرست اور ضار منکوس کی صورتوں میں لقا اور اس کا شیطان بختیارک نمودار ہوئے ہیں جمشید خود پرست خناز جادو کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔ یہہ "زنگی بچہ" اس طرح اپنی خداوندی کا ثبوت پیش کرتا ہے: "خداوند ہرشئے واقعی طبیعت مجردہ ہے۔ اس نے مجھے اپنا نائب کیا ہے اور خطاب دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ لوگوں کو اپنے سجدے پر راغب کرو"۔ اسکی پیشانی میں ایک داغ تھا جس کے دیکھنے سے سب سجدہ کرتے تھے۔ یہہ علامت بھی "طبیعت مجردہ" نے بخشی تھی۔ لقا کی طرح جمشید احمق بھی ہے اور مضحک بھی۔ لیکن ادبی نقطہ نظر سے اس کی شخصیت زیادہ کامیاب نہیں ضار منکوس، جمشید کا "استاد قرمساق"، ذرا بختیارک سے مختلف ہے۔ اسے سحر و ساحری میں دخل ہے اور بختیارک کو جادو سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ لیکن یہہ فرق اہم نہیں۔ بختیارک اور ضار منکوس دونوں ظریفانہ رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ لیکن بختیارک کی شخصیت زیادہ کامیاب ہے۔ عموماً اسے ہم خواجہ عمرو کی "روشنیٔ طبع" کا تختۂ مشق سمجھتے ہیں۔ خواجہ عمرو اسے دھولیں لگاتے ہیں اور پھر اس سے زرومال وصول کرتے ہیں۔ ہم بختیارک کی ہزیمتوں پر ہنستے ہیں لیکن یہہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بدی کی طاقت ہے اور اُسے جہاں موقع ملتا ہے وہ مسلمانوں کو زک پہنچاتا ہے۔ فطرتاً وہ نہایت چالاک ہے، یہہ اس کی بدقسمتی ہے کہ لقا اور اس کے مددگار بختیارک کی رائے پر نہیں چلتے۔ ورنہ وہ لشکر اسلام کو سخت نقصان پہنچاتا۔ اس کی طبیعت میں غضب کا ابھار ہے۔ کتنی شکستوں کے بعد بھی وہ نہیں ہارتا۔ لقا کی خداوندی اسی کے دم سے قائم رہتی ہے۔ اس کے سارے اخلاقی نقائص کے باوجود بھی ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس میں ظرافت کا مادہ بھی ہے اور ظرافت اس کے بہت سے عیوب پر پردا ڈال دیتی ہے۔ غرض بختیارک نہایت اہم اور دلچسپ کردار ہے اور ضار منکوس اس کی گرد کو نہیں پہونچتا۔ ضار منکوس کی ذہانت، حکمت عملی، ساحری کوئی چیز اعلٰے درجہ کی نہیں۔ یہہ خناز جادو ہے جو جمشید کی خداوندی کا سبب ہے۔

خناز جادو کا ذکر "بوستان خیال" کے ایک دوسرے عنصر کی طرف توجہ کو رجوع کرتا ہے اور وہ جادو ہے اس داستان میں بھی جادو، جادوگر، طلسم، طلسمی اشیا، طلسمی شعبدوں کا ذکر ہے۔ لیکن جہاں تک جادو کا تعلق "بوستان خیال" "داستان امیر حمزہؓ" سے بہت پیچھے ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس مکتری کو "بوستان خیال" کی برتری کا سبب سمجھا جائے کیونکہ یہاں جادو کو زیادہ طمطراق کے ساتھ نہیں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا غلط ہوگا۔ یہاں بھی طلسمی کارخانہ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے حدود کائنات کے حدود کی طرح وسیع ہیں۔ شاہزادہ معز الدین کو بھی طلسمی شعبدوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ وہ ان مرحلوں کو فتح کرتے ہیں اور شعبدوں سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ یہاں بھی جادو کے کرشمے ہیں، جادوگر ہیں، جن دیو، پری، شیطان۔ سبھی کچھ ہے۔ لیکن ان میں وہ آب و تاب نہیں جس سے ہم "داستان امیر حمزہؓ" میں دوچار ہوتے ہیں۔ خصوصاً جادو کا حصہ نسبتاً بہت کمزور

اور پھیکا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ میر تقی اس قسم کی چیزوں کو مزخرفات سمجھتے تھے اور ان چیزوں میں وقت ضایع کرنا اپنے علم و فضل کی شان کے خلاف۔ لیکن "داستان امیر حمزہ" کا جواب اسی وقت ممکن تھا جب جادو اور جادوگروں کی بھی اسی پیمانہ پر تصویر مرتب کی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر داستان امیر حمزہ اور خصوصاً "طلسم ہوش ربا" میں انتہائی قوت ایجاد انتہائی زور تخیل سے کام لیا گیا ہے اور اس پر سبقت لے جانا ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے۔ "بوستان خیال" میں جادوگروں کی شخصیت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کم جادوگر یادگار شخصیت کے حامل ہیں اور جو ہیں ان کی شخصیت بھی زیادہ با اثر نہیں۔ یہاں نہ افراسیاب ہے نہ سہنشاہ لاچین۔ نور افشاں، ہوشمند مہ رسیدہ نور افشاں، کوکب روشن ضمیر، برہمن روئین تن۔ آفات چہار دست، ماہیان زمرد پوش، تاریاب تشکل کش، ملکہ مشتری ماہ طلعت، حیرت، مہرخ، برّاں مجلس، بہار غرض کیسی کیسی رنگین پیتنوع اور یادگار شخصیتیں "طلسم ہوش ربا" میں ملتی ہیں، جن سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پایہ کی شخصیتیں "بوستان خیال" میں موجود نہیں۔ یہاں جادو کے بدلے "حکمت" کی نمائش ہے اور یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں۔ "داستان امیر حمزہ" سے یہ چیز بھی اخذ کی گئی ہے لیکن اس کی نمائش بہت وسیع پیمانہ پر ہے اور "حکمت" نے جادو سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔

"داستان امیر حمزہ" میں بھی ایک "حکیم" ہیں: بزرجمہر، صاحب علم و فضل، علم نجوم و رمل اور دیگر علوم و فنون سے آگاہ۔ بزرجمہر نہایت ہوش مند ہیں۔ امیر حمزہ کے مشیر و مددگار ہیں اور امیر حمزہ کی حیرت انگیز روحانی اور دنیاوی ترقی کے نگہبان۔ فرشتۂ رحمت کی طرح۔ جہاں کوئی مشکل در پیش ہوئی تو امیر حمزہ فوراً بزرجمہر کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہیں۔ پھر وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" کے شروع میں بزرجمہر کی شخصیت برابر پس پردہ موجود رہتی ہے اور امیر حمزہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ بغیر ان کی مدد کے، امیر حمزہ بہت جلد اپنی ناتجربہ کاری کا شکار ہو جاتے اور قبل از وقت ان کی ترقیوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا لیکن جیسے جیسے امیر حمزہ روحانی اور دنیاوی ترقی کے منازل طے کرتے ہیں، جیسے جیسے ان کی شخصیت بلند و بزرگ ہوتی اور انکی دنیاوی طاقت بڑھتی اور پھیلتی ہے، بزرجمہر کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فرزندان بزرجمہر کا مختلف شخصیتوں کی ترقی اور ہونے والے واقعات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ وہ کبھی کبھی ضرورتاً، خصوصاً داستان گو کی آسانی کے لئے، سامنے لائے جاتے ہیں لیکن ان کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

بزرجمہر امیر حمزہ کے مشیر و مددگار، نگران و نگہبان ہیں۔ "بوستان خیال" میں حکیم قسطاس الحکمت شاہزادہ معز الدین کے مشیر و مددگار، نگران و نگہبان ہیں۔ اگر حکیم قسطاس الحکمت نہ ہوتے تو شاید معز الدین صاحبقرانی کا درجہ حاصل نہ کرتے۔ جہاں کوئی مشکل در پیش ہوئی تو شاہزادہ معز الدین فوراً حکیم قسطاس الحکمت کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہیں پھر وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے

"بوستان خیال" میں شروع سے آخر تک حکیم قسطاس الحکمت کی شخصیت کا اثر ہر جگہ نظر آتا ہے وہ ہر جگہ شاہزادہ معزالدین کی رہنمائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ بغیر ان کی مدد کے شاہزادہ معزالدین کامیابی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ "بوستان خیال" میں حکیم صاحب کی شخصیت کو بہت بڑھایا گیا ہے۔ نتیجہ یہہ ہے کہ ان کی شخصیت نے شاہزادہ معزالدین کی شخصیت سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے۔ اسی وجہ سے معزالدین کی صاحبقرانی کا کچھ زیادہ گہرا اثر نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں کہ عمران شاہ کی دختر بیمار ہوئی۔ اطبائے شہر علاج سے ایسے عاجز ہوئے کہ سب نے جواب دیا بادشاہ نے ایک کشتی میں سب کو سوار کرکے مع انکی ذریت کے دریا برد کردینے کا حکم دیا۔ وہ بیچارے فریاد وزاری کرنے لگے۔ اس عرصہ میں ایک جہاز آیا۔ اہل جہاز نے جو گریہ وزاری سُنی حال پوچھا۔ لوگوں نے حال بیان کیا اس میں ایک مرد بزرگ تھا وہ بولا تمہارے بادشاہ کو کیا ہوگیا ہے۔ کوئی شخص ایسا ہے کہ بدون حکم خدا مریض کو اچھا کرے۔ یہہ بیچارے کس طرح اچھا کرسکتے ہیں۔ تم جاؤ بادشاہ سے مریض کے جسم کا پہنا ہوا کپڑا لاؤ ہم مرض تبادیں گے۔ اس کا علاج کرنا اور حکیموں کو رہا کرد۔ ملاحوں نے فوراً بادشاہ سے عرض کی بادشاہ اس دختر کا ملبوس لے کر قریب جہاز آیا اور دست بستہ حال ملکہ عرض کیا... اس مرد بزرگ نے لباس مریضہ کو سونگھا اور فرمایا کہ اس عورت کو تپ دق عارض ہے... اور ایک نسخہ لکھا اور کہا یہہ دوا پلاؤ اور... حکیم نے کہا چہارشنبہ کو یہہ غلام کشتی پر یہاں آوے گا۔ اس کو ملبوس ملکہ دینا میں حال بذریعہ اس پارچہ کے دریافت کرلوں گا۔ بادشاہ نے غلام سے حکیم صاحب کا نام پوچھا غلام نے کہا حکیم قسطاس الحکمت اس کا نام ہے"

یہہ ہے ہماری اس عجیب حکیم سے پہلی ملاقات۔ جس طلسم کے عجائبات کا "بوستان خیال" میں بیان ہے اور جس کی سیر شاہزادہ معزالدین نے کی، وہ طلسم اجرام و اجسام سکندر ذوالقرنین کے حکم سے معلم اوّل حکیم ارسطوئے الٰہی نے ترتیب دیا تھا۔ اور اس کا داروغہ اپنے شاگرد رشید حکیم قسطاس الحکمت کو جو "علم و عمل و تجرد کی صفت میں یکتائے روزگار تھے" مقرر کیا تھا اور کہا تھا کہ "عہدۂ داروغگی اس طلسم کا تمہارے خاندان میں پانچہزار برس تک باقی رہے گا... اور جو داروغہ طلسم تمہاری اولاد سے ہوگا ان سب کا نام ایک ہی ہوگا یعنی خطاب اس کا قسطاس ہی ہوگا"۔

جن حکیم صاحب سے شاہزادہ معزالدین کو سابقہ پڑتا ہے وہ آخری داروغۂ طلسم ہیں اور وہ محض داروغۂ طلسم نہیں۔ "اپنے علم و کمال میں بے مثال" ہیں اور انھوں نے اپنی طرف سے ہر طلسم ارسطوئے الٰہی میں "تصرفات" کئے ہیں اور ان تصرفات کا نام "طلسم جدید" رکھا ہے اور طلسم معلم اوّل کو طلسم قدیم مشہور کرتے ہیں"۔ غرض حکیم قسطاس الحکمت کی عدیم المثال شخصیت ہے۔ وہ عجیب و غریب دانائی

اور روحانی طاقت رکھتے ہیں۔ جن، دیو، پری ان کے تابع ہیں۔ شاہان طلسم ان کے حکم سے روگردانی نہیں کرسکتے۔ وہ بات کی بات میں سرکشوں کو مغلوب کرتے ہیں۔ جو باتیں کہنے میں نہیں آتی ہیں ان سے وہ واقف ہو جاتے ہیں۔ کسی دل کا بھید ان سے پوشیدہ نہیں۔ ماضی، حال و استقبال۔ نزدیک و دُور، ہر قسم کی باتوں، ہر قسم کے واقعات سے انھیں پوری آگاہی ہے۔ وہ انسان کے جذبات کو بھی بدل دے سکتے ہیں۔ جب ملکۂ نوبہار گلشن افروز اور ملکہ صبح دلکشا رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے کی دشمن ہو جاتی ہیں اور شاہزادہ معزّ الدین کی جان ضیق میں ہو جاتی ہے تو حکیم صاحب اس مشکل کو بھی آسان کرتے ہیں اور ملکہ نوبہار گلشن افروز اور ملکہ صبح دلکشا کے دلوں سے رقابت کو دور کرتے ہیں۔ غرض حکیم صاحب کے اوصاف کا احاطہ ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ بزرجمہر ان سب اوصاف کے حامل نہیں انھیں کسی طلسم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں وہ روحانی طاقت نہیں جو حکیم قسطاس الحکمت میں ہے۔ ان کے اوصاف سب فطری ہیں۔ اس لئے ہم ان کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن حکیم قسطاس الحکمت سے ہم زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔ وہ آخر آخر تک اپنا اثر شاہزادہ معزّ الدین پر قائم رکھتے ہیں۔ اور اس اثر کو شاہزادہ معز الدین کی بھلائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جب شاہزادہ معز الدین کی وفات کا زمانہ قریب آتا ہے اس وقت بھی وہ نصیحت کرتے ہیں: "میری نصیحت پر عمل کرو۔ عشق مجازی کو چھوڑ کر عشق حقیقی اختیار کرو کہ کونین میں تم کو سرخروئی حاصل ہو" یہ گویا ان کے آخری الفاظ تھے۔ پھر وہ آخری بار رخصت ہوئے" اور تھوڑی دور جاکر نظر صاحب قران اکبر سے پوشیدہ ہوگئے" اور قارئین کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہو گئے۔

(باقی)

کلیم الدّین احمد

# اسعد الاخبار آگرہ (۶)

میرزا کلب حسین خاں، ڈپٹی کلکٹر نادر تخلص: ۸۵ میں "مرزا غلام زین العابدین رئیس نامور شہر اکبر آباد" کی طرف سے اشتہار مندرج ہے کہ خلاصۂ قانون مال و کلکٹری مصنفہ میرزا کلب حسین خاں، (ان سے مجھے تلمذ سخن بھی حاصل ہے) جسے پہلی بار منشی عبدالرحیم خاں محرر محکمۂ عالیہ کمشنری نے مطبع اسعد الاخبار میں چھپوایا تھا، اور جو تا اختتام طبع دو روپے اور بعد کو تین تین چار چار روپے کو بکی ہے، دوبارہ مطبع اسعد الاخبار میں زیر طبع ہے۔ لیکن اس بار قیمت "تا اختتام طبع عہ؎ اور بعد کو عہ؎ مقرر کی گئی ہے۔"

اس اشتہار سے یہ پتا چلتا ہے کہ منشی عبدالرحیم بھی اس کتاب کو کسی اور مطبع میں چھپوا رہے تھے اور انھوں نے اس کی قیمت تین روپے قرار دی تھی۔ ۱۱۷ میں ایک اشتہار منشی عبدالرحیم خاں کی طرف سے اس مضمون کا درج ہے کہ کتاب توصیف زراعت مصنفہ مرزا کلب حسین خاں جس میں "تمام احوال متعلق دیہہ و حال پیداوار ہر ایک جنس و ترکیب کاشت غلہ و اصطلاحات و محاورہ مردمان سکنۂ دیہہ و خواص اکثر چیز ہائے روئیدگی و احوال بارش و نچھتر و اقسام اراضی وغیرہ اکثر امور متعلقۂ زمینداری و کاشتکاری درج ہیں" مطبع قطب الاخبار آگرہ میں چھپی ہے۔ قیمت دو روپے ہے۔ ۱۲۴ میں نادر کے دو قطعے اختر کے متعلق مرقوم ہیں، جن کا ذکر آیندہ ہوگا۔

۱۵۷ و ۱۵۹۔ فضائل الشہدا مطبع اسعد الاخبار میں چھپ کر (ضخامت قریب ۱۳ جز فی صفحہ ۱۷ سطریں) ۱ جون ۱۸۵۱ء میں شایع ہوئی۔ قیمت آخر جون تک دو روپے بعد کو ۳ روپے قرار دی گئی تھی۔ ۱۵۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹ درخواستیں ۱۷ جون تک آ چکی تھیں۔

قاضی محمد صادق علی خاں اختر ۱۲۳: اگرچہ ضلع اٹاوہ مرزا کلب حسین خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کے اقدام سے رونق بے اندازہ رکھتا تھا۔ مگر اب بہ سبب قدوم میمنت لزوم جناب حشمت و شوکت مآب قاضی محمد صادق علی خاں اختر۔ جو وہاں کی تحصیلداری پر مقرر ہو کر تشریف لائے بہ حکم نور علیٰ نور شہر اٹاوہ کی کچھ اور ہی رونق ہو گئی از آں جا کہ جناب قاضی صاحب کے اوصاف حمیدہ سے ہر دیار کے لوگ خوب واقف و آگاہ ہیں اس شہر کے رہنے والے ان کے تشریف لانے سے ایسے خوش ہوئے ہیں کہ گویا خضر ملا۔ میرزا کلب حسین خاں صاحب نے ان کے تشریف لانے اور عہدۂ تحصیلداری پر مقرر ہونے اور مکان کچہری کے آراستہ کرنے کی تاریخ مستخرج فرمائی اور سخندانوں سے مورد احسنت ہوئے۔ قطعۂ تاریخ در تہنیت ورود:

شدہ جلوہ افروز شہر اٹاوہ ۔۔۔ بود آں کہ اہل سخن را سزد
زہے نو بہار گلستان احساں ۔۔۔ کہ از فیض او در کف گل زر آمد

ہمہ تن لطیف و سراپا مصفّا — کہ آئینۂ آسا پُر از جوہر آمد
حلاوت بود درکلامش بداں ساں — کہ ہر لفظ شیریں تر از شکر آمد
فزونش سرور دل خستہ بادا — کہ گویند احباب او خوشتر آمد
فیوض حضورش ہمی خواست خاطر — پس از مدّتے ایں تمنّا برآمد
چو سال ورودش بہ جستم زنادر — بگفتا باوج ابد اختر آمد ۱۲۶۵ھ

قطعۂ تاریخ مکان کچہری بیت آخر: "تاریخ بناے او بہ فکر نادر ۰ آمد ز سر اوج بناے اثر
قطعۂ تاریخ منظوری عہدۂ تحصیل داری" "منظور حکام" سے تاریخ نکالی ہے۔

مرزا حاتم علی مہر ۱۱۷: تاریخ تقرر عہدۂ منصفی از حافظ بلاقی اکبرآبادی متخلص بہ زر:

انگریز نے حکومت جب مہر کو عطا کی — جو تھے فلک سے عیسیٰ بولے خوشی مبارک
تاریخ زر نے لکھی یہہ آب زر سے اُس دم — اے مہر تجھ کو ہووے یہہ منصفی مبارک ۱۲۶۵ء

امراؤ علی خاں ۱۴۱: ایک شخص امراؤ علی خاں نام عمدہ رئیس سکندرآباد ضلع علی گڈھ جو سید امام علی شاہ اکبرآبادی کے مریدوں میں سے تھے اور ۳۴ برس سے اپنے پیر کے مکان میں رہتے تھے ماہ ربیع الاول کی ۶ تاریخ پیر کے دن رہ گراے عالم بقا ہوئے۔ یہہ شخص بڑے ظرافت پسند تھے اور یاوہ گوئی میں ایک کمال بہم پہنچایا تھا۔ ان کی غزلیں دور دور مشہور ہیں۔ حق تو یہہ ہے کہ اپنے وقت کے جعفر زٹلی تھے۔ سید نثار علی شاہ جو ان کے مرشد زادے ہیں انھیں حسب وصیت ان کے تاج گنج میں مرشد کی پائینتی دفن کیا، اور محفل سوم میں لالا چھوٹے لعل رکنا، کو جو خاں مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اور مزخرفات گوئی میں استاد سے بڑھ کر قدم رکھتے ہیں پگڑی بندھوائی"

سید مدد علی تپش اکبرآبادی: ۹۷ میں ۱۲ شعروں کی ایک فارسی غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

زخوش قدان سیہ چشم مدّعا مطلب — دلا کنارہ ازیں ہا کن و وفا مطلب

۹۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تپش نے فارسی زبان کے قواعد اور عروض و قافیہ پر ایک رسالہ اردو میں "مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت صدر دیوانی" کی نذر کے لیے لکھا تھا اور ان سے اس کی درخواست کی تھی کہ اسے چھپوا دیں۔ ۱۰۸ سے پتا چلتا ہے کہ معیار الشعرا کی ترتیب و تہذیب انھیں کے ذمے تھی۔

---

۵ ۱۲۶۶ھ عدد ۵ اس شخص کی ایک غزل (۱۲ شعر) اسی زمانے کے ایک اخبار میں (جس کے ابتدائی دو ورق غائب ہیں اور جو غالباً قطب الاخبار آگرہ ہے) نظر آئی۔ مقطع میں تخلص کی جگہ نام ہے

ہے ارادہ یہ عشق درگا میں ✤ جا رہوں آگرہ سے متھرا میں
ہم کو کافی ہے چپنی بھر پانی ✤ بے حیا ڈوبتے ہیں دریا میں

عبدالرحمٰن خاں انصاف رئیس اکبرآباد : ۸۸ میں، شعروں کی ایک غزل ہے :

عشق کس کو ہے محبت کا اثر کس کو ہے — حضرت دل کہو اب درد جگر کس کو ہے
عذر بے جا نہ کرو وعدۂ فردا نہ کرو — آج کی بات کہو کل کی خبر کس کو ہے
اس کے نقاد ہیں بازارجنوں کے نقاد — سکۂ داغ جو پرکھے یہ نظر کس کو ہے

لالا بابو لال ذائق رئیس نواح کالپی مقام کدورہ : قدسی کی مشہور نعتیہ غزل پر مخمس ۹ بند :

جو نہ ہوتا ترے اقدام مقدس کا ظہور — کشور دیں مبتین سے سبھی رہتے دور
حضرت حق کو ہوا کفر مٹانا جو ضرور — ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور الخ

قاضی محمد قاسم قلی خاں ناظر جہان آباد قاسم تخلص : ۱۰۲ میں ایک ہی مضمون کی ۴ رباعیاں عربی فارسی اردو اور بھاکھا میں ہیں :

ہے سخی کون زمانے میں بھلا تیرے سوا — تونے تو حاتم طائی کو بھی شرمندہ کیا
ہر کوئی تیری سخاوت سے جہاں میں بے شک — رات دن تیری صفت از تہہ دل ہی کرتا
داتا کو سنسار مان داتا تو ہیں جھوڑ — حاتم مانے لاج کے پڑت ہے تورے گوڑ
دناریں پن کا تورے جگ مان بہت بھکھان — بھرا جیٹھا کرت ہے سیر دو ہرا جوڑ

۱۰۵ میں ایک قصیدہ فارسی اور ۱۲۴ میں ایک غزل فارسی مرقوم ہے۔

شرح قصائد و قطعات انوری مصنفہ ابوالحسن مدرس اول درجۂ فارسی مدرسہ آگرہ ۸۰ و ۸۵ : ۸۰ میں قصائد مع شرح کا اشتہار ہے ۸۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حل طلب مقامات کی شرح تھی۔ اور ۲۰ مئی ۱۸۵۲ء تک اس کا چھپنا شروع نہ ہوا تھا۔ ۱۰ جز' ۱۷ سطریں فی صفحہ، قیمت ۴ روپے۔

شرح مقامات حریری مع متن مصنفہ کریم الدین مدرس دوم درجۂ اردو مدرسہ آگرہ : مصنف نے اعلان کرایا ہے کہ اس کے چھپوانے کا ارادہ ہے۔

افسانۂ رنگین مصنفہ نواب امجد علی خاں رئیس قصبۂ دیوئی فتح پور ہنسوا : پہلا اشتہار اس کا قصۂ رنگین کے نام سے ۱۰۱ میں چھپا تھا' ۱۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپریل ۱۸۵۴ء میں اس کا چھاپا تمام ہوا۔ "جس قدر دانی نے اس کی عبارت نثر اردو اور نظم قصائد کو دیکھا یہ دل جان پسند کیا" فسانۂ عجائب کی طرز کا قصہ تھا ضخامت ۱۰ جز قیمت ایک ماہ تک ایک روپیا۔

مثنوی فارسی مصنفہ منشی واجد علی خاں مہتمم زبدۃ الاخبار ۱۲۶ یہ مثنوی زبدۃ الاخبار میں چھپی تھی موضوع "شکایت گردش فلک" قمرالدین خاں نے اسے معیار الشعرا میں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے

وفات منشی شیخ مصلح الدین' عمدہ روٗسائے فتح پوری سیکری مدرس مدرسہ اکبرآباد : ۱۲۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ کو وفات ہوئی۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور فارسی دانی کی بہت تعریف

کی ہے۔ اسی نمبر میں ایک فارسی مثنوی مہتمم زبدۃ الاخبار کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کے آخری مصرع میں مادۂ تاریخ ہے: "آہ و افسوس و غم" ۔ ۱۳۰ میں مہتمم اسعد الاخبار کی تصنیف سے دو قطعے فارسی میں ہیں پہلے قطعے کے دو شعر یہ ہیں: قمر چوں اوستادم از جہاں رفت ÷ مرا در فرقت خود کرد غمگیں
چہ استادے شفیع جاں نوازے ÷ پدر والے بزرگے شفقت آگیں

وفات شاہ سلیمان صاحب مقیم تونسہ: کوہ نور کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ماہ صفر ۱۲۶۷ھ کی ساتویں تاریخ شب جمعہ کو بعد ادائے نماز تہجد .. رہگرائے عالم قدس ہوئے" ۲۰۱ میں دو قطعات تاریخ وفات فارسی میں ہیں۔ پہلا "مولوی حسین علی صاحب رئیس فتح پور ہنسوہ" کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا "منشی نہال الدین، سرشتہ دار صدر الصدوری" فتح پور کی تصنیف سے ہے۔

وفات حافظ محرم علی خیر آبادی: ۲۰۱ میں منشی نہال الدین کی تصنیف سے ایک فارسی اور ایک اردو قطعہ ہے۔ "ہوا ماہ غروب" سے تاریخ نکلتی ہے۔ ۱۲۶۶ھ۔

وفات شیخ خدا بخش کوتوال لاہور: ۱۸۰ میں بلاقی چند مترجم بورڈ پنجاب کی تصنیف سے ایک قطعۂ تاریخ ہے ۱۲۶۷ھ سال وفات ہے۔

گلزار نسیم: ۱۳۵ میں مطبع اکبری کی طرف سے اس مثنوی کے متعلق یہ اشتہار چھپا ہے کہ ایک مصور نسخہ ولایتی کاغذ پر جس کی ضخامت بارہ جز کے قریب ہوگی ۱۵ر جنوری ۱۸۵۰ء تک طبع ہو جائے گا۔ قیمت ۳۱ دسمبر ۱۸۴۹ء تک ایک روپیا اس کے بعد ڈیڑھ روپیا۔ مثنوی کا نام گل بکاؤلی لکھا ہے۔

فوائد جلالیہ: عربی کے قواعد نحو فارسی نظم میں نہایت اختصار کے ساتھ عبد الشکور ساکن فتح پور ہنسوہ، نے لکھے تھے۔ اس کے متعلق اطلاع ۱۳۲ میں ہے اور کل اشعار بہ اقساط ۱۳۳ تا ۱۳۶ میں چھپے ہیں۔ مصرع اوّل: "بعد تحمید الٰہ العالمین ربّ السما" ۱۸۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے چھپوانے کا ارادہ تھا۔

مثنوی عجیب: "منشی موہن لعل غالب" نے سنگھاسن بتیسی ہندی کے قصوں کو اردو میں نظم کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد رادھا گوبند محافظ دفتر کمشنری آگرہ نے مطبع اسعد الاخبار میں اس کے چھپوانے کا ارادہ کیا تھا۔ ۲۰۳ میں اس کا اشتہار ہے ضخامت ۲۵ جز کے قریب، قیمت قبل انطباع ایک روپیا بارہ آنے، بعد انطباع ڈھائی روپے۔

رامائن ہندی: ۱۹ میں اشتہار ہے کہ رامائن خط ناگری جس کی قیمت ۳ روپے ہے مطبع اسعد الاخبار یا مطبع زبدۃ الاخبار سے مل سکتی ہے۔

محمد رضی الدین خاں بہادر صدر الصدور کول ۱۱۰: "منشی درگا پرشاد نشاط رئیس سکندر آباد" نے جناب .. ممدوح کے ضلع علی گڈھ کی عدالت دیوانی میں اجلاس فرمانے کی تاریخ لکھی ہے۔

فارسی میں ہے، لفظ "خدا ترس" سے تاریخ نکلتی ہے۔

شبر علی خاں عاجز رئیس مراد آباد : عاجز کا کلام فارسی (قصیدہ) ۱۵۳ اور ۱۸۵ میں ہے۔

قمر الدین خاں قمر و سید حسین شاہ بخارائی واصف مقیم کول : ۱۸۶ " ان دونوں جناب .. واصف .. نے اپنی ایک پانچ شعر کی غزل میرے پاس بھیجی .. کہ میں بھی اس زمین میں غزل کہوں ہر چند کہ فکر سخن عالی طبعوں کا کام ہے، مجھے اس کوچے سے کیا آشنائی ہے۔ مگر بہ پاس خاطر .. میں نے بھی غزل کہی" قمر کی غزل کے چند شعر یہہ ہیں :

گنج در ریخت بہ قرباں تو گل از شبنم — یکے از نذر گذاران تو گل از شبنم

گرمی حسن تو تنہا جگر لالہ نہ سوخت — گشت غرق عرق از شان تو گل از شبنم

گل ز شبنم بہ چمن گاہ نہ دست است قمر — خامہ ات ریخت بہ دیوان تو گل از شبنم

استخراج نام حضرت علی ۱۵۶ : سید عباس علی مصنف سنبھل رئیس کول کی ۱۱ شعروں کی ایک اردو مثنوی جس میں "ایک ایسا قاعدہ نکالا ہے کہ اس پر عمل کرکے جس چیز کے نام سے چاہو علی کا نام نکال لو"

مظہر العجائب مصنفہ سید فخر الدین احمد ریٹرن نویس محکمۂ صدر آگرہ : ۸۸ و ۹۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فن طب میں بہ زبان اردو لکھی گئی تھی اور زیر طبع تھی، قیمت دو روپے۔

مشاعرۂ اکبر آباد ۸۰ : ۹ نومبر ۱۸۴۸ء کی شب کو "منشی سید ابوالحسن صاحب مدرس اول درجۂ فارسی مدرسۂ آگرہ کے مکان پر محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ .. کلام شعرا .. معیار الشعرا .. میں مطبوع ہوگا"

مشاعرۂ اکبر آباد و معیار الشعرا : ۱۰۸ (۲۵ جون ۱۸۴۹ء) "پرسوں شب کو مشاعرہ ہوا۔ اکثر شعرائے اکبر آباد اور بعض سخنوران عجم تشریف لائے۔ .. وے شائقان سخن جو مشاعرے میں تشریف نہ رکھتے تھے بہ ملاحظہ معیار الشعرا جو اس مطبع میں چھپتا ہے اور سید مدد علی تپش اس کی تہذیب و ترتیب کا اہتمام کرتے ہیں محظوظ ہوں گے۔ .. ہر شاعر کی غزل منتخب ہو کر لکھی جاتی ہے اور قیمت اس کی چار آنے ماہوار ہے ... سید مدد علی تپش کے پاس بہ محلہ زین خانہ یا بہ مطبع لہذا درخواست بھیجیں"۔

مشاعرۂ اکبر آباد ۱۳۴ : " بہ محلہ پیپل منڈی ایک اور مشاعرہ مقرر ہوا ہے، اور شہر کے نامی شعرا سب اس میں تشریف لے جاتے ہیں، میر مشاعرہ کا ارادہ ہے کہ طرح کی غزلیں پندرھویں دن چھپوا دیا کریں اور چار آنے ماہوار اس کی قیمت رکھیں .. ناظر بنسی دھر کے مکان پر جگن نرائن کے پاس رقعہ بھیج کر منگا لیں"

قاضی عبدالودود

اسے دوبارہ نظر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ گو اس کے پاؤں اضطراری طور پر پھاٹک پر آکر رُک گئے تھے۔ "وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی نظروں کو دھوکہ ہوا" اس کا جی چاہتا تھا کہ دوبارہ نظر اٹھا کر اس کی جانچ کرے۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اور اپنے مکان میں داخل ہوگیا۔

لڑکی کا کوٹھا اس کے مکان کی چھت سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ پہلے کرایہ دار نے کوٹھے کے برآمدہ پر چلمن ڈالکر پردہ کرلیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پنجاب میں یوں بھی کوئی زیادہ پردہ نہیں۔

لڑکی زیادہ وقتوں میں برآمدہ ہی پر بیٹھی رہتی اور وہ چھت پر پہنچ کر اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ گھر والوں کی آنکھیں بچاکر دیوار کی پشت سے لگ کر کھڑا ہوجاتا اور اسے دیکھنے لگتا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کے اندھیارے میں کرن پھوٹ گئی ہو۔ جیسے اس کے من کی آواز فضا میں کھوجانے کے بجائے گونجتی ہوئی اس کے پاس لوٹ آنے لگی ہو۔ رفتہ رفتہ اس کا جی صرف نظروں کی تسکین سے اکتا گیا اور گفتگو کی آرزو اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔

ایک دن داروغہ جی خاص اس سے ملنے اس کے گھر آئے۔ وہ ان کی صورت دیکھ کانپ سا گیا۔ اسے ڈر پیدا ہونے لگا کہ شاید انھوں نے اپنی لڑکی پر نظر ڈالتے اسے دیکھ لیا ہے اور کچھ کڑوی باتیں کرنے آئے ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اُنھیں کرسی پیش کی۔ داروغہ جی پہلے ادھر ادھر کی بے مطلب سی باتیں کرنے لگے۔ اس کا دم الجھنے لگا وہ ان کی باتوں کا مختصر سے مختصر جواب دے رہا تھا۔ داروغہ جی جب اس کی شائستگی کم گوئی اور فلسفیانہ پن سے مطمئن ہوچکے تو اصل مطلب پر آئے "میری لڑکی" اس کا کان کھڑا ہوگیا۔ گویا کسی نے خطرہ کی گھنٹی بجادی ہو۔ "آپ نے تو اُسے دیکھا ہی ہوگا۔ آپ سے کون پردہ ہے۔ اور صاحب یہاں پنجاب میں تو آپ لوگوں کے جیسا پردہ ہے بھی نہیں۔ میں نے سنا آیا تھا کہ بہار جیسے شریف مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ میں نہیں پائے جاتے۔ خدا کی قسم یقین مانئے۔ بہار آکر میں بھی اس کا قائل ہوگیا ہوں۔ ہاں صاحب تو میں میرٹھ میں تھا۔ رانو کی باضابطہ پڑھائی ہو رہی تھی۔ نام تو اس کا رادھیکا ہے لیکن ہم لوگ اُسے پیار سے رانو کہتے ہیں۔ پچھلے سال اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا ہوتا لیکن میں نے یہاں آجانا ہوا اور اس کی پڑھائی ادھوری ہی رہ گئی۔ اب ارادہ ہے کہ اس سال آپ کی یونیورسٹی سے امتحان دلوادوں۔ اسی مقصد سے تو میں آپ کے پاس اس وقت حاضر ہوا ہوں۔" اس کے چہرہ پر دمک سی پیدا ہوگئی، اس کے دل نے انسپکٹر کا مطلب بھانپ لیا تھا، اور اسے انسپکٹر کی بے ربط بے معنی گفتگو میں مزا ملنے لگا تھا۔

"میں نے معلوم ہوا کہ آپ نے اس سال اول درجہ میں ام۔ اے پاس کیا ہے"، انسپکٹر نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بڑا جی خوش ہوا۔ اور وہ بھی فلسفہ جیسے خشک اور مشکل

سبجکٹ ہیں واللہ کمال کیا آپ نے۔ یقین مانیئے آپ دیکھنے میں انٹرمیڈیٹ اسٹوڈنٹ سے زیادہ نہیں معلوم پڑتے۔ اس کمسنی میں آپ نے ام۔ اے پاس کیا ہوا ہے۔ واہ واہ" انسپکٹر کی آنکھیں اس کے چہرہ کا جائزہ لینے لگیں گویا وہ کبرسنی کے علامات ڈھونڈھ کر اپنی حیرت دور کرنا چاہتا ہو۔ وہ بڑبڑایا

"آج کل تو آپ گویا بے شغل ہی ہونگے۔ ام۔ اے کر لیا وکت آنے سے ملازمت مل ہی جائے گی۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ کی دھری ہے۔ کیا ایج ہے آپ کی؟" "بیسواں سال ہوگا ۱۹۱۰ جون کی میری پیدائش ہے۔" "آپ سول سروس کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟ آپ جیسے نہ آئیں گے تو آئیگا کون۔ ہمارا ایک رشتہ دار گذشتہ سال سول سروس میں آیا ہے۔ کوئی خاص بات نہ تھی اسکے اندر۔ ویسے کچھ ایسا محنتی بھی نہ تھا۔ اس کا پڑھنا لکھنا بھی کوئی بہت اچھا نہ تھا۔ آپ ضرور امتحان میں بیٹھیئے۔ کامیابی کی میں شرطئے دیتا ہوں۔ آخر سول سروس کے امتحان میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں تو میں کہنا چاہتا تھا کہ ادھر آپ کا بھی کوئی خاص مشغلہ نہ ہوگا۔ یوں تو آپ کے ہاتھ میں ہر وکت کتابیں ہی دیکھتا ہوں۔ آپ جیسے ہونہار جوان کو دیکھ کر بڑا جی خوش ہوتا ہے میرا" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسکی گھنی سیاہ مونچھوں کے پیچھے اس کے خوبصورت اور چمکیلے دانت اس طرح جھانکتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے گناہگار ارادوں کی تہہ میں نیکی کا جذبہ۔

انسپکٹر کی پیچ در پیچ گفتگو سے اس کا دم پھر الجھنے لگا۔ "شاید وہ اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی کا پیام لے کر آئے تھے" اس کے دماغ پر سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ انسپکٹر نے پھر بولنا شروع کیا" تو میری غرض اتنی ہے کہ آپ اپنے کیمتی وکت کا کچھ حصہ نکالکر ذرا رانو کی پڑھائی کی دیکھ بھال کر لیتے۔ میں تو آپ کا بڑا احسان مند ہونگا۔ آپ کو جون سا وکت مناسب ہو۔ ہفتہ میں بس دو ایک دن۔ میں آپ کا وکت زیادہ نہیں برباد کراؤنگا۔"

"مجھے کوئی عذر نہیں"۔ اس نے اضطراری طور پر جواب دیدیا۔ جیسے وہ اس مسئلہ پر پہلے سے غور کر چکا" ساتھ بجے شام کو آپ کے یہاں آسکتا ہوں"

"ٹھیک ہے۔ جون سا وکت آپ کو مناسب ہو۔ تو کیوں نہیں آپ آج ہی سے آجائیں۔ میں رانو سے کہہ رکھوں گا۔ وہ کتابیں وغیرہ لے کر تیار رہے گی" بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے"۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اسکی تصدیق کر رہا ہے "پڑھنے کی بڑی شوکین۔ کہتی ہے کہ بابو جی مجھے کسی طرح بی۔ اے تک پڑھوا دو۔ خدا اس کی خواہش پوری کرے میں کم حیثیت آدمی اور پھر اتنے بال بچے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل پڑھائی میں کتنا خرچ ہے۔ آخر پہلے زمانہ میں بھی تو لوگ جاہل نہ رہتے تھے۔ کیسے کیسے عالم بدوان اسی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آج کل تو پڑھانا کیا ہے دیوالیہ بننا ہے۔ اور پھر نتیجہ کچھ نہیں۔ سب آپ جیسے تیز اور ذہین تھوڑے

ہی ہیں - بی ۔اے پاس کو آج کل پوچھتا کون ہے ۔آپ کو تعجب ہوگا کہ میرے یہاں ایک ام ۔اے پاس سب انسپکٹر بحال ہوا ہے۔" اس نے انسپکٹر کی گفتگو میں گویا اپنی توہین محسوس کی اور اس کے چہرہ کا رنگ پھیکا ہوگیا "جی ہاں" انسپکٹر نے " ہاں " کو کھینچتے ہوئے اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"درست فرماتے ہیں آپ" اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا

"تو اب اجازت دیجئے" انسپکٹر یہ کہکر چلا گیا اور وہ سات بجے شام کو اس کے گھر پہونچ گیا۔

" رانو سے اسکی آنکھیں پہلے ہی دوچار ہو چکی تھیں ۔ اس نے رسمی صاحب سلامت کے بعد پڑھائی کے متعلق پوچھ گچھ کی اور ایک معمر پیشہ ور ٹیوٹر کی طرح اپنا فرض انجام دے کر گھر لوٹ آیا۔

وہ ہفتہ میں دو دن رانو کے گھر جاتا اور بڑے انہماک سے اُسے پڑھاتا ۔ یہاں تک کہ رانو کا امتحان ختم ہوگیا اور رانو کے گھر جانے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی ۔ لیکن جب امتحان کے بعد رانو کے یہاں جانے والا دن پہنچا تو اُسے بڑی بے چینی سی محسوس ہونے لگی ۔ جیسے اس کی زندگی میں ایک گہرا خلا پیدا ہونے والا تھا ۔ اس کا جی بار بار چاہ رہا تھا کہ اس شام کو بھی رانو کے پاس جائے لیکن اُس نے اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کی اور سنیما جانے کے ارادہ سے گھر سے نکلا۔مگر وہ غیر ارادی طور پر رانو کے مکان میں داخل ہوگیا ۔ جیسے اس کے پاؤں بہک گئے ہوں یا ان پر کسی دوسرے کا قبضہ ہوگیا ہو۔

رانو اُسے دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوئی ۔ اُسے اس احساس سے بڑی لذت ملی ۔"میں آج آپ کی راہ ہی دیکھ رہی تھی" رانو نے اس کے چہرہ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالکر پلکیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں ؟ اب تو تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں" اُس نے تنک کے لہجے میں کہا جیسے وہ رانو کی زبان سے اپنے بیان کو رد کرانے کا آرزومند ہو" آج تو میں تم سے رسمی طور پر رخصت ہونے آگیا ہوں" اسکی نگاہیں زمین کو تکنے لگیں اور اس کے اعضا بے حرکت سے ہوگئے۔ جیسے کوئی دل شکستہ بے روزگار ملازمت کے فیصلہ کا منتظر ہو۔

"کیا کہیں باہر جا رہے ہیں ؟" رانو کے چہرے پر استعجاب و شرارت کی آمیزش سے ایک دلکش رنگ پیدا ہو گیا۔" "نہیں ۔ یعنی اب تم سے ملنے کی مجھے کوئی وجہ تو ہے نہیں ۔ اچھے ہماری ملاقات کا سلسلہ بند ہوجانا ہی چاہئے "۔" واہ ۔ آپ میرے ہمسایہ میں رہ کر ہم سے ملاقات بند کیوں کرنے لگے ۔میرا امتحان ختم ہوگیا تو آپ کے آنے جانے میں کوئی ہرج تھوڑا ہی ہے"

"نہیں ۔ ہرج تو کچھ نہیں" اس کے چہرہ کی ویرانی شگفتگی سے بدل گئی ۔

"تو پھر ؟ آخر میں بھی تو امتحان کے بعد سے بے شغل ہوگئی ہوں ۔ گھر میں کچھ زیادہ کام دھندا میرے لئے رہتا نہیں ہے اور یوں بھی میں گھر کے کام سے اکتاتی ہوں ۔ ترکاریاں بناؤ ۔ چھالیاں کترو۔

نوکرانیوں سے لڑائیاں کرو۔ ان کاموں میں میرا جی کیوں کر لگ سکتا ہے" اس کی آنکھیں شرما کر جھک گئیں اور چہرے پر حجاب نے ایک ریشمی نقاب ڈال دیا۔" آپ آتے رہیں گے تو آپ سے باتیں کر کے طبیعت بہل جائے گی۔ آئیے گا نا؟" رانو نے التجا اور تحکم کی ملی جلی کیفیت سے سوال کیا۔ گویا خاطر خواہ جواب حاصل کرنے پر اُسے ایک گونہ عذرت تھی۔

"آؤں گا" اس کے مُنہ سے یکبارگی نکل گیا۔" ویسے تو میں بھی گویا بے شغل ہی ہوں" اس کے چہرہ پر تمتماہٹ اور بالیدگی سی پیدا ہو کر رفتہ رفتہ مٹ گئی، وہ کچھ اور کہنے کی جرات نہ کر سکا۔

وہ تقریباً ہر ہفتہ رانو کے یہاں جاتا رہا۔ کبھی خود سے اور کبھی رانو کے بلانے پر۔ آج کل رانو کے پاس اس کا جی پڑھائی کے دنوں سے زیادہ لگتا تھا۔ رانو بڑی باتونی تھی۔ پرانے گھریلو قصّے خاندانی جھگڑوں کی داستانیں اپنے والدین کی زندگی ان کے آپس کے تعلقات رانو کی گفتگو کا بیشتر حصّہ ہوا کرتے۔ وہ رانو کی باتیں غائت دلچسپی سے سنتا جیسے وہ فرائڈ کی کسی نئی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہو اور رہ رہ کر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ذریعہ ان میں ترتیب اور سجاوٹ سی پیدا کرتا جاتا۔ رانو بھی ایک ریشمی مسکراہٹ کے نقاب سے اس کی طرف دیکھ لیتی اور زیادہ گرم جوشی کے ساتھ گفتگو کرنے لگتی۔ کبھی کبھی اس کی مسکراہٹ رانو کی گفتگو میں ایک جادو بھری ہنسی کا وقفہ پیدا کر دیتی ایسا معلوم ہوتا جیسے تیلیوں کے اشارہ سے مغربی ساز میں کسی خاص گت کی روح ڈالی جا رہی ہو۔

وہ رفتہ رفتہ رانو سے بے تکلف بنتا جا رہا تھا۔ بیچ کی باتوں کے پردہ میں کبھی کبھی پیار اور محبت کے جملے بھی شامل ہو جاتے۔ کچھ رومانی اشارے کنائے۔" امتحان کی محنت نے تمہاری صحت بگاڑ دی تھی۔ اب تمہارا چہرہ دن بدن نکھرا جا رہا ہے"۔" تم آج کل کتنی اچھی لگتی ہو۔ امتحان کی فکر نے تمہیں لاغر بنا دیا تھا۔" "کچھ دنوں میں تمہارا بیاہ ہو جائے گا، اس کے بعد تو مجھے بالکل بھول جاؤ گی۔ اسی خیال سے تو میں ابھی سے تم سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا ہوں۔ اور زیادہ تعلقات بڑھ جائیں گے۔ تو دُکھ بھی ویسا ہی ہو گا۔" "میں کیوں آپ کو بھولنے لگی؟ آپ البتہ مجھے دھیان سے نکال دیجئے۔ مسز آ جائیں گی تو پھر ہمیں بھولے سے بھی یاد نہ آؤں گی۔" رانو ٹھنڈی سانس لے کر کہتی لجائی لجائی نگاہوں کے ساتھ۔" تم اپنی ایک تصویر مجھے دو گی۔ کون جانے پھر تمہاری صورت بھی دیکھ سکوں! وہ لمبی سانس لے کر کہتا" تصویر سے یاد تو قائم رہے گی"

"یہ سول میرج کیا ہے؟" ایک دن رانو نے اس سے شرماتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سول میرج کے مفہوم سے واقف تھی۔

"دو مختلف مذہب والوں کے درمیان شادی"

"جیسے" رانو نے بناوٹی نادانی سے سوال کیا

"جیسے کسی ہندو مرد اور مسلمان عورت کی شادی" ۔ " اور اگر مسلمان مرد اور ہندو عورت کی شادی ہو تو اسے سول میرج نہ کہا جائیگا" "کیوں نہیں"

"او ۔ اسی سے مسٹر آصف علی کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہوں نے سول میرج کیا ہے ۔ انکی بیوی بھی تو ہندو ہیں نا ۔ بڑے بھاری لیڈر ہیں نا وہ ۔ اور ہمایوں کبیر صاحب جو کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں انہوں نے بھی تو سول میرج کیا ہے ۔ سنتے ہیں بڑے قابل آدمی ہیں ۔ وہ بھی شاید فلسفہ ....."

"ہاں" اس نے بات کاٹ کر کہا ۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ہمایوں کبیر ہو ۔ اس کے چہرہ کی بالیدگی اور سینہ کا ہلکا تناؤ اسے ظاہر کر رہا تھا ۔

"معلوم ہوتا ہے سول میرج اب ہندوستان میں بہت رائج ہوتا جا رہا ہے"

"نہیں ۔ ابھی تو بہت کم ہوتا ہے"

اُس رات وہ گھر لوٹا تو سول میرج کا خیال اس کے دماغ میں دیر تک چکر کاٹتا رہا "شاید رانو مجھ سے سول میرج کرنے کو تیار ہے" ۔ اُس کے چہرہ پر چمک پیدا ہوگئی ۔ وہ پہلے ہی سے رانو کی گفتگو میں پریم کا رس محسوس کر چکا تھا ۔ اسے اب کامل یقین تھا کہ رانو اس سے انتہاء محبت کرنے لگی تھی ۔ وہ اس کی خاطر ہر مشکل جھیلنے کو تیار تھی ۔ خود اس کا دل بھی تو رانو کے لئے بیتاب رہتا تھا ۔ اس کی زندگی کا خلا تو رانو کے وجود سے ہی پُر ہوا تھا ۔ اس کی تڑپتی ہوئی ساحل ناآشنا زندگی رانو ہی کی بدولت تو تغیر ہوئی تھی ۔

"سول میرج ! کتنی انوکھی ترکیب ہے ۔ شادی کا کتنا اچھوتا اور غیر عامیانہ طریقہ" ہمایوں کبیر کا وجود اس وقت اُسے ہندوستان کے لئے مایہ ناز معلوم ہو رہا تھا ۔ اس کی شخصیت اُسے کانٹ اور ہیگل سے کہیں زیادہ ممتاز نظر آرہی تھی ۔ "ایک آزاد اور بلند شخصیت والا ہی تو سول میرج کر سکتا ہے" ۔ اس نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھاتے ہوئے سوچا ۔

رانو ۔ اس کی تخئیل کی دنیا ۔ اس کی بن سکتی تھی ۔ وہ اس خیال کی لذت سے نشہ سا محسوس کر رہا تھا ۔

وہ ایک ہفتہ سے رانو کے گھر نہ جا سکا تھا ۔ وہ عرصہ سے اپنے دوستوں کو بھلائے ہوئے تھا ۔ ان کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ یکلخت بند کر کے اس کے بچپن کے ساتھی ! ان کی صحبت میں اُس نے زندگی کے کتنے سنہرے لمحے گذارے تھے ۔ زمانہ تعلیم کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے آرہے تھے ۔ ماضی کے شاہکار مرقعے ۔ اس وقت وہ زندگی کی ہر فکر سے آزاد تھا ۔ دنیا کے ہر دُکھ درد سے بے نیاز اس کے دوست اس کے لئے سب کچھ تھے ۔ وہ ان سے دل کھول کر ملتا تھا ہر رسمی بندش اور رواجی تکلف سے بے پروا ۔ انہیں بھلا کر وہ ایک بڑی حق تلفی کا مرتکب ہوا تھا ایک ناقابل تلافی گناہ وہ انفعال کی چبھن محسوس کرنے لگا ۔ اس کی شام دوستوں کے یہاں جانے میں گذرنے لگی ۔ ان سے ملنے ملانے میں ۔ وہ کچھ دنوں سے رانو کے یہاں نہ جا سکا تھا ۔ وہ ہر روز جانے کو سوچتا لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت

اسے روک دیتی۔ اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ یہ ایک غیر معمولی مدت تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ نہ جا سکا
ایک شام کو رانو نے اسے بلوا بھی بھیجا اور اس نے جانے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن پھر بھی وہ جا نہ سکا۔
اسی طرح دن گذرتے جا رہے تھے اور اسے رانو سے ملنے کا موقع نہ حاصل ہو سکا تھا۔ اب ہر دوسرے تیسرے رانو اُسے بلوا بھیجتی۔ وہ ہر بار وعدہ بھی کر لیتا لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری حائل ہو جاتی۔
رانو بڑی منت سماجت سے اسے بلواتی۔ پردہ پردہ میں اپنی بے چینی کا اظہار کرتی۔ لیکن پھر بھی وہ نہ جا سکا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے آپ سے شرم سی آنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رانو اس سے نہ آنے کا سبب پوچھی گی۔ تو وہ کیا جواب دے سکے گا۔ یہ احساس بھی اب اسے جانے سے روکنے لگا۔
اس طرف پھر اسے کتابوں سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لائبریری سے وہ نفسیات کی چند نئی کتابیں لے آیا تھا اور صبح شام ان کے مطالعہ میں مصروف ہو رہا تھا۔
وہ سر شام سے بیٹھا رات گئے دیر تک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ بغل کے کمرہ میں کلاک نے بارہ کے گھنٹے بجائے۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے اور اس کی نظر کتاب سے اٹھ گئی۔ سامنے دروازے پر رانو کھڑی تھی! اسے سخت اچنبھا ہو رہا تھا۔ "رانو یہاں کیسے ہو سکتی ہے؟" اسے خیال ہوا کہ شاید کتاب دیکھتے دیکھتے اسے نیند آگئی تھی اور وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا بیٹھا رانو کی طرف تک رہا تھا۔ رانو آہستہ قدموں سے کمرہ میں داخل ہوئی اور اس کے قریب رک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ سے وحشت اور پریشانی برس رہی تھی۔ جیسے وہ خون کر کے آئی ہو۔
"تم اس وقت یہاں کس طرح آگئیں" اس نے ابرو پر شکنیں پیدا کرتے ہوئے سوال کیا۔
رانو بت بنی کھڑی رہی۔
"یہاں تمہیں کوئی دیکھ لے تب"
رانو کے لب نہ ہل سکے۔ جیسے الفاظ اسکی حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے۔
"بولو نا! تم یہاں کس لئے آئی ہو۔ اتنی رات گئے"۔ اس نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔
"آپ سے معافی مانگنے۔ آپ جو مجھ سے خفا ہو گئے ہیں" رانو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بندھ گئے۔
"میں؟ تم سے؟ بے سبب خفگی؟"
"آپ ضرور مجھ سے رنج ہیں۔ تب ہی تو آپ نے مجھ سے ملاقات ترک کر دی ہے"۔
"نہیں! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور اس غلط فہمی میں تم وہ کر گذریں جو تمہیں نہ چاہئے تھا۔ اس وقت لوٹ جاؤ۔ میں تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"
"میں لوٹ جانے کو نہیں آئی ہوں"
"تو پھر"

"آپ سب کچھ جانتے ہیں، آپ ہی نے تو مجھے سب کچھ بتایا ہے" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"

"نہیں۔ آپ سب کچھ سمجھ رہے ہیں" رانو نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اُسے دیکھ کر ڈر گیا۔

"جاؤ ورنہ میں شور کردوں گا جاؤ! جاؤ!"

"کمینے"

رانو چلی گئی۔ 'کمینے' اس کے دماغ میں دیر تک گونجتا رہا جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسے پکار پکار کر کہہ رہا ہو 'کمینے'!

سید محمد محسن

گاؤں کا نام تھا کاشی پور۔ چھوٹی سی بستی تھی۔ زمین دار اور بھی چھوٹے تھے۔ مگر رعب کا یہ عالم تھا کہ خوف سے گاؤں میں کسی کو چوں کرنے کی مجال نہ تھی۔ آج زمیندار صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کی سالگرہ کی پوجا تھی۔ پوجا ختم ہونے کے بعد پنڈت ترک رتن دوپہر کو گھر واپس جارہے تھے۔ بیساکھ ختم ہوچکا تھا مگر بادل کی چھاؤں تک بھی نہ تھی۔ خشک آسمان سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ سامنے دو طرف کھیت جل جل کر جگہ جگہ سے پھوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اور انھیں درازوں سے دھرتی کے جگر کا خون دھواں بنکر اڑا جارہا تھا۔ ادھر نگاہ ڈالتے ہی دماغ یوں جھنجھنا اٹھتا ہے جیسے جلتے ہوئے شعلوں سے آنکھ لڑگئی ہو یا تیز شراب کا نشہ چڑھ گیا ہو۔

میدان ختم ہوتے ہی سڑک کے ایک کنارے غفور جلاہے کا گھر تھا۔ مٹی کی دیوار ایک طرف سے گر کر آنگن میں آپڑی تھی اور وہاں سے ہوتی ہوئی راستہ سے جاملی تھی۔ اور اپنی تمام شرم و غیرت کو دھو پی کر اب راہگیروں کی نظر کرم کا آسرا لگاکے مطمئن ہو بیٹھی تھی۔

سڑک کے کنارے ایک پیپل کے درخت کے سایہ میں کھڑے ہوکر ترک رتن نے زور سے ہانک لگائی" ارے او گپھرا۔ گھر میں ہے رے؟"

کوئی دس برس کی ایک لڑکی دروازہ پر آکر بولی" بابا سے کیا کام ہے؟ انھیں تو بخار ہے"۔

"بخار ہے۔ پکار حرامزادے کو! پاجی! ملیچھ"۔ ہانک پکار سنکے آخر غفور اپنے اجڑے ہوئے گھر سے بخار میں ہانپتا ہوا سامنے آکھڑا ہوا۔ ٹوٹے ہوئے مکان پر سایہ ڈالے ایک پرانا ببول کا پیڑ تھا اسی کے نیچے ایک بیل بندھا ہوا تھا۔ ترک رتن نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا" یہ کیا ہورہا ہے رے سنو تو سہی۔ یہ ہندوؤں کی بستی ہے اور برہمن زمیندار ہے۔ یہ بھی خیال ہے تجھے"۔ غصہ اور دھوپ کے مارے ان کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اس لئے ان کے منھ سے تو گرماگرم باتیں نکلیں ہی گی۔ لیکن غفور کے یہ سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ خاموش کھڑا انکی طرف دیکھتا رہا۔

ترک رتن نے ارشاد فرمایا" صبح کو ادھر سے جب گیا تو اسی طرح درخت کے نیچے بندھا کھڑا تھا۔ اسوقت دوپہر کو واپس جارہا ہوں تو ویسے ہی بندھا کھڑا ہے۔ گؤ ھتیا ہوئی تو مالک تجھے جیتے جی قبر میں گاڑ دیں گے۔ وہ کوئی ایسے ویسے برہمن نہیں"۔

غفور۔ کیا کروں بابا ٹھاکر۔ بہت لاچار ہوگیا ہوں۔ کئی دن سے بخار میں پڑا ہوں۔ ڈوری پکڑ کے کبھیں چرا لانے چلتا ہوں، تو سر میں چکر آجاتا ہے وہیں گر پڑتا ہوں۔

ترک رتن :۔ تو پھر چھوڑ دے اپنے سے چر چگ آئے۔
غفور :۔ کہاں چھوڑ دوں بابا ٹھاکر لوگوں کا دھان ابھی تک پوری طرح بیٹھا نہیں گیا۔ میدان کی گھاس ساری تو جل گئی۔ کہیں ایک مٹھی سونگھنے کو بھی نہیں۔ نہ جانے کس کا دھان کھا جائیگا۔ کس کے کھلیان میں منہ ڈالدے گا۔ کس طرح چھوڑ دوں بابا ٹھاکر؟۔
ترک رتن ایک ذرا نرم ہوکر بولے "نہیں چھوڑتا تو کہیں ٹھنڈے میں باندھ کے دو آنٹی پیال ہی ڈالدے تھوڑی دیر چبائے کم از کم۔ تیری لڑکی نے چاول نہیں ابالے ہیں۔ لا ذرا بیچ لاکے پلا دے۔"
غفور نے جواب نہ دیا۔ مایوسی سے صرف ترک رتن کی طرف دیکھکر اور دل سے ایک گہری آہ کھینچ کر چپ رہا۔
ترک رتن بولے "وہ بھی نہیں ہے شاید۔ پھر کیا ہوا ہے؟ اپنے جو بانٹ میں ملا تھا سب بیچ باچ پیٹ میں۔ بیل کے لئے بھی دو ایک آنٹی نہ رکھی۔ قصائی کہیں کا؟"
اس ارشاد عالیہ کو سنکر غفور کی گویا زبان بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ بولا "تھوڑا سا پھر بانٹ میں ملا تھا سو بھی اگلے برس کے سن کے بقایا میں مالک نے رکوا لیا۔ رو پیٹ کے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کہا" مالک بابو۔ تم حاکم ہو تمہارا راج چھوڑ کے اور جاؤں گا کہاں۔ مجھے دس پانچ بوجھے بھی پیالی دیدو۔ چھپر میں پھوس نہیں۔ ایک ہی تو جھونپڑی ہے۔ باپ بیٹی دونوں اسی میں پڑ رہتے ہیں۔ کسی طرح تاڑ کے پتے دتے باندھ کے اب کے برسات میں کاٹ لونگا۔ لیکن کھانے کو نہ ملا تو میرا مہیش تو مر ہی جائیگا
ترک رتن ہنسکر بولے" اُنھوں! شوق سے نام بھی رکھا گیا ہے مہیش! مارے ہنسی کے دم نکلا جارہا ہے"۔
لیکن پنڈت جی کا یہ مذاق غفور نے سنا نہیں۔ وہ پھر بولنے لگا" لیکن مالک کو رحم نہ آیا۔ کوئی دو مہینے کی خوراک بھر دھان تو ہم لوگوں کو دیا انھوں نے لیکن پھر سارا اپنے یہاں ٹال کرا لیا۔ میرے اس مہیش کے لئے بھی ایک مٹھی نہ چھوڑا" بولتے بولتے اس کا گلا بھر آیا۔ لیکن اس پر بھی ترک رتن کا دل نہ پسیجا۔ بولے" اچھا آدمی ہے تو بے۔ کھا یا ہے تو نے تو دیگا نہیں۔ زمیندار کیا تجھکو اپنے گھر سے کھلائیں گے۔
ارے تیں سب تو رام راج میں بسا ہوا ہے۔ کمینہ ہے اسی لئے ایسے مالک کی برائی کرتا پھرتا ہے"۔
غفور شرماکر بولا" نہیں برائی کیوں کروں گا۔ بابا ٹھاکر ہم لوگ انکی برائی کبھی نہیں کرتے لیکن تمہیں بتاؤ کہاں سے دوں لاکے۔ کوئی چار بیگھے تو زمین ہے وہ بھی ٹبائی پر بوتا ہوں۔ ادھر پورے دو برس تک الکدم سکھائی پڑگئی۔ کھیت کا دھان کھیت ہی میں سوکھ کر رہ گیا۔ باپ بیٹی کو دو وقت کھانے کا بھی سہارا نہیں رہا۔ گھر کی طرف آنکھ اٹھاکے دیکھو نا۔ پانی برستا ہے تو رات بھر لڑکی کو لئے بیٹھا رہتا ہوں۔ پاؤں رکھنے کی جگہ بھی سوکھی نہیں رہتی۔ مہیش کو دیکھو ہڈی پانجر ہوگیا ہے۔ تمہیں دو نہ تھوڑا سا پھر ادھار۔ بیل بیچارے کو دو دن پیٹ بھر کھانے کو تو دیدوں"۔ یہی کہتے کہتے وہ ٹھاکر جی کے پاؤں کے

پاس گر پڑا۔ ترک رتن نے فوراً پاؤں ہٹا لیا اور پیچھے ہٹکر بولے" ارے مجھے چھو دیگا کیا؟"
غفور۔ نہیں بابا ٹھاکر چھوؤں گا کیوں؟ لیکن ایکے بھر مجھے دو بوجھ کھر دیدو۔ تمہارے یہاں اسی دن چار چار ٹال دیکھ آیا ہوں۔ دو بوجھ دے ڈالوگے تو تمہیں پتہ بھی نہ چلے گا۔ اور ہم کو نہ ملے۔ ہم بھوک سے مر بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں مگر یہ بے زبان ـــ منہ سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا ـــ بس تکتا رہتا ہے اور آنکھ سے آنسو ڈھلکتے رہتے ہیں۔
ترک رتن۔ ادھار دے گا۔ سدھائیگا کیسے۔ یہ بھی تو سنوں۔ غفور کو اک ذرا آس بندھی۔ بیچین ہوکر بولا" جیسے بھی ہوگا۔ سدھا دوں گا۔ بابا ٹھاکر۔ تمہیں دھوکا نہ دوں گا"۔
ترک رتن نے منہ بنا کے غفور کے منت بھرے لہجے کی نقل کرکے کہا" دھوکا نہ دونگا! جیسے بھی ہوگا سدھا دونگا۔ لالچی! مکار! جا جا راستہ چھوڑ۔ گھر جاؤں۔ دیر ہوگئی۔ اتنا کہکے وہ ذرا تمسخر کے ساتھ مسکرا قدم بڑھا کے چلے ہی تھے کہ فوراً پیچھے ہٹ گئے اور غصے سے بولے" اوہ یہ تو سینگ تانے چلا آرہا ہے، ارے ہم کو زخمی کرائے گا کیا؟"
غفور اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھاکر کے ہاتھ میں کچھ پھل اور بھیگے ہوئے چاولوں کی ایک ایک پوٹلی تھی۔ اسکی طرف اشارہ کرکے بولا" اس کو بو مل گئی ہے ٹھاکر بابا۔ ایک مٹھی کھانا چاہتا ہے"۔
"کھانا چاہتا ہے۔ کھانا تو چاہے ہی گا۔ جیسا گرہست ویسا بیل۔ کھر جڑتا نہیں۔ چاول دال کھانا چاہتا ہے۔ اٹھ۔ ہٹا یہاں سے راستہ چھوڑکے باندھ۔ یہ سینگ کسی دن کسی کا خون کرکے چھوڑیگا" اتنا کہکے ترک رتن کترا کے غصہ میں بھنّاتے ہوئے چلدیے۔
غفور نے ادھر سے نظر موڑ لی اور تھوڑی دیر سکتہ میں بیٹھا رہا۔ پھر مہیش کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی دونوں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں درد اور بھوک کی تکلیف سے بھری ہوئی تھیں۔ پھر آہستہ بولا " تجھکو ایک مٹھی بھی ندیا۔ خیر ندے ....." کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ قریب آکے بڑی نرمی سے اس کے منہ گلے اور پیٹ کو سہلا سہلا کے کہنے لگا" مہیش تو میرا بیٹا ہے۔ تو میری آٹھ برس خدمت کرکے بوڑھا ہوا ہے تجھے میں پیٹ بھر کھلا بھی نہیں سکتا۔ مہیش نے جواب میں صرف گلا بڑھا کے آرام سے آنکھیں موندلیں۔ غفور نے اپنے آنسو بیل کی پیٹھ پر مل کے خشک کئے اور کہنے لگا" زمیندار نے تیرے منہ کی گھانس بھی چھین لی۔ گاؤں کے کنارے مردہ گھٹیا کے پاس جو تھوڑی سی چری تھی وہ بھی پیسہ کی لالچ میں بندوبست کردی۔ یہ دو برس میں نے تجھے کس کس جتن سے جتیا بچا رکھا ہے۔ چھوڑ دوں تو کسی کا کھلیان کھا جائے۔ کسی کا کیلے کا پیڑ اکھاڑ دے ـــ تجھکو کیسے رکھوں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بدن میں تیرے اب طاقت نہیں۔ گاؤں میں کوئی تجھے لینا چاہتا نہیں سب یہی کہتے ہیں کہ میں تجھے ہاٹ پر لیجاکر بیچ ڈالوں" اور یہ بات زبان پر آتے ہی

پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ہاتھ سے آنسو پونچھ کے ایک بار ادھر اُدھر دیکھا اور جھونپڑے کے پیچھے جاکر پرانا سوکھا ہوا بیرنگ کھرٹی سے نوچ کرلے آیا اور مہیش کے آگے ڈال کر بولا " لے بابا جلدی سے کچھ کھالے دیر ہوگی تو پھر —

" بابا " " کیا ہے بیٹی "! " بھات کھاؤ گے تو آؤ نا — " یہی کہتی ہوئی آمنہ اندر سے دروازے نکل کھڑی ہوئی۔ ایک لمحہ چپ کھڑی رہی پھر بولی " مہیش کو پھر ٹٹی نوچ کے کھر دیدیے نا بابا ؟ "

اسی کا ڈر لگا ہوا تھا اسکو۔ غفور شرما کے بولا " پرانا سوکھا ہوا کھر تھا بیٹی آپ ہی آپ نکلا جارہا تھا — "

" میں تو اندر سے سن رہی تھی بابا۔ تم نے خود سے کھینچ کے نکالا تھا۔" " نہیں نہیں کھینچ کے نکالا نہیں لیکن۔

" لیکن مٹی جو گر پڑیگی بابا " غفور چپ ہوگیا۔ ایک گھر چھوڑ سب کچھ تو جا چکا تھا۔ اور یہی حال رہا تو اب کے برسات میں یہ بھی نہ رہے گا۔ یہ بات اس سے بڑھ کر اور کون سمجھ سکتا تھا۔ اور پھر اس ترکیب سے بھلا کئے دن گذران ہوگی۔

لڑکی بولی " ہاتھ منہ دھو کے بھات تو کھالو آکے۔ میں نے کھانا نکال دیا ہے "۔ " ذرا پیچ تو دیدے بیٹی پلادوں اسکو پہلے۔" " پیچ تو آج نہیں ہے۔ بابا۔ وہ تو ہانڈی ہی میں سوکھ گئی۔"

" نہیں ہے " سنکر غفور سکتے میں آگیا۔ دُکھ کے دنوں میں پیچ بھی پھینکی نہیں جاتی اتنا بھر اس دس برس کی لڑکی کو بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ ہاتھ دھو کے وہ گھر کے اندر آکھڑا ہوا۔ آمنہ پیتل کی ایک تھالی میں باپ کے لئے بھات نکال کر اب اپنے لئے ایک مٹی کی صحنک میں نکال رہی تھی۔ غفور کھڑا دیکھتا رہا پھر بولا " آمنہ! مجھے تو آج پھر جوڑی آئی ہے۔ بخار میں کھانا تو اچھا نہیں ؟ "

" آمنہ رنجیدہ لہجہ میں بولی " مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ بڑی بھوک لگی ہے "

" اسوقت شاید بخار نہو گا بیٹی " " تو پھر اٹھا کے رکھدیتی ہوں شام کو کھانا "

غفور سر جھکا کے بولا " لیکن ٹھنڈا بھات کھانے سے جو بخار اور بڑھجائے گا آمنہ! "

آمنہ :۔ تب! غفور نے جیسے بڑی دیر تک سوچکر یک بیک ایک بات دریافت کرلی بول اٹھا

" ایک کام کر بیٹی! مہیش ہی کو جاکے کھلا آ۔ پھر رات کو میرے لئے تھوڑا چاول ابال لینا۔

جواب میں تھوڑی دیر آمنہ باپ کیطرف غور سے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کے آہستہ آہستہ بولی اچھا بابا!

غفور کے چہرے پر ایک رنگ آگیا۔ باپ بیٹی کے درمیان میں یہ جو ایک تصنع ایک معصوم فریب چل گیا۔ اُس کا احساس ان دونوں کے سوا ایک تیسری ہستی کو بہت بہت دور بیٹھے بھی ہوگیا۔

پانچ سات دن بعد ایک دن بیمار غفور اپنے دروازے پر فکرمند بیٹھا تھا۔ اس کا مہیش کل سے اسوقت تک گھر واپس نہ آیا تھا۔ وہ خود کمزور تھا اس لئے صبح سے آمنہ ڈھونڈھنے نکلی تھی۔ سہ پہر کو

لوٹ کر بولی" سنا بابا! مانک گھوش نے ہمارے مہیش کو تھانے میں ڈالدیا" "غفور۔ ڈر نکلی"

آمنہ۔ ہاں بابا! سچ مچ۔ ان لوگوں کے نوکرنے کہا کہ جا اپنے باپ سے کہدے کہ دریاپور کے کانجی ہاؤس میں جاکے بیل ڈھونڈھ لے" "غفور۔ کیا کیا تھا مہیش نے؟"

"آمنہ۔ انکی پھلواری میں گھس کے پیڑ پودے نوچ ڈالے تھے بابا" غفور سکتے میں بیٹھا رہا۔ مہیش کے متعلق اس نے دل میں بہت سے اندیشے پال لئے تھے۔ لیکن اس حرکت کا گمان بھی نہ تھا۔ وہ تو اتنا نیک اتنا سیدھا تھا۔ کوئی کبھی اسے اتنی سخت سزا دیگا کبھی اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی۔ اور خاص طور سے مانک گھوش۔ اِس اطراف میں وہ برہمنوں اور گایوں کی پرورش کرنے میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔

لڑکی نے کہا" شام ہوئی جارہی ہے بابا۔ مہیش کو لانے نہ جاؤگے؟" "نہیں"

لیکن وہ سب تو کہہ رہے تھے کہ تین دن بعد پولیس والے مہیش کو ہاٹ پر بیچ ڈالیں گے"

"بیچ ڈالیں" ہاٹ کی حالت سے آمنہ بیچاری پوری طرح واقف نہ تھی مگر اس نے بارہا دیکھا تھا کہ ہاٹ کا نام سنتے ہی اس کے باپ پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ لیکن آج وہ بے کچھ کہے سُنے باہر چلدیا۔

اندھیری رات کے پردے میں غفور چھپتا چھپاتا سبنی کی دوکان پر پہونچکر بولا۔ چاچا آج ایک روپیہ دینا ہوگا" اور یہ کہکے اس نے پیتل کی ایک تھالی بنئے کی بیٹھنے کی مچیا کے نیچے کھسکا کر رکھدی اس تھالی کی قدروقیمت وزن سب کچھ سے بنئے پوری طرح واقف تھا۔ دو برس کے اندر کوئی پانچ پانچ بار وہ اُسے بندھک رکھکے غفور کو ایک روپیہ دے چکا تھا۔ اس لئے آج بھی اسنے کوئی عذر نہکیا۔

دوسرے دن مہیش پھر اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہی ببول کا پیڑ وہی ڈور رکھا وہی کھونٹا وہی سوکھا ساکھا بیرنگ گھر سامنے پڑا ہوا۔ وہی بھوک سے جھلکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کی بیچین نگاہ قریب ہی کھڑا ایک بوڑھا مسلمان بڑی تیز نگاہ سے اس کا معائنہ کررہا تھا۔ ذرا دور ہٹ کر غفور ہاتھ پر دھرے سر جھکائے چُپ بیٹھا تھا۔ معائنہ ختم کرکے بڈھے نے اپنی چادر کے کھونٹ سے ایک دس روپیہ کا نوٹ نکالا۔ اسکی تہیں بڑی احتیاط سے کھولیں اور بار بار انگلیوں سے اس کی سلوٹیں برابر کیں پھر غفور کے پاس جاکر بولا" اب کون نوٹ بھُنائے۔ پورا پورا ہی تمہیں دیئے دیتا ہوں"۔

غفور نے ہاتھ بڑھاکے نوٹ لے لیا اور ویسے ہی خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جیوں ہی بڈھے کے دونوں ساتھیوں نے بیل کی ڈوری کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا چیخ کر بولا" ڈوری پہ ہاتھ نہ دینا۔ خبردار۔ کہے دیتا ہوں۔ اچھا نہ ہوگا"

وہ لوگ حیرت سے اس کی طرف منہ پھاڑے دیکھتے رہے پھر بولے "کیوں"۔ غفور نے غصہ میں جواب دیا" کیوں کیا! میری چیز ہے۔ میں نہیں بیچتا۔ میری خوشی" یہ کہہ کے نوٹ پھینک دیا۔

ان لوگوں نے کہا" اور کل جو راستہ میں بیعانہ لیا تھا"

"لو یہ اپنا بیعانہ بھی واپس لے لو"۔ اپنی کمر سے اس نے فوراً دو روپے نکال کے جھن سے زمین پر پھینک دیئے۔ جھگڑے کے آثار دیکھکر بڈھے نے بڑے سکون سے ہنستے ہوئے کہا" واہ کے دو روپے اور لینا چاہتے ہو ہی نا؟ دیدو بھائی لڑکی کو مٹھائی کھانے کے لئے دو روپئے دیدو۔ اب راضی ہوئے نا؟" "نہیں"

لیکن اس سے زیادہ کوئی ایک دھیلا بھی نہ دیگا۔ یہ سمجھ لو" ؟ غفور نے زور سے سر ہلاکر کہا" نہیں" بڈھے نے چڑھ کر کہا" نہیں کیوں ! جو کچھ بھیڑ کا دام ملے گا وہی بس ورنہ اس میں مال ہی کیا نکلے گا"

" تو یہاں تو یہ ا" غفور کے منھ سے یک بیک ایک تلخ بات نکل گئی۔ پھر وہ یک بیک گھر میں گھسکر وہاں سے چیخ کر بولا" اگر تم لوگوں نے فوراً گاؤں چھوڑ کر راستہ نہ لیا تو پھر ابھی زمیندار بابو کے سپاہیوں کو بلاکر جوتے لگوا کے نکال باہر کراؤں گا"۔

یہ ہنگامہ دیکھکر وہ بیچارے چلدیئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی زمیندار کی کچہری سے اس کی بلاہٹ ہوئی۔ غفور سمجھ گیا۔ کہ سارے معاملے کی خبر مالک کو ہوگئی۔

کچہری میں بڑے چھوٹے بھلے برے بھی قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ شبھو بابو نے آنکھیں لال کرکے ارشاد فرمایا" تجھے کیا سزا دوں گھبرا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں بے بھول گیا تو کہ کس گاؤں میں رہتا ہے؟"

غفور نے ہاتھ جوڑ کے کہا" جانتا ہوں سرکار۔ پیٹ کا کھانا جڑتا نہیں مالک نہیں تو اسوقت جو بھی جرمانہ آپ کرتے ہیں دینے میں عذر نہ کرتا"۔

سب لوگ متعجب ہوگئے۔ کیونکہ اب تک ہر شخص اس کو ضدی اور ٹیڑھے مزاج کا آدمی سمجھتا تھا غفور نے رو رو کر کہا" اب ایسا کام کبھی نہ کروں گا مالک بابو" اور یہ کہتے کہتے خود اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان اینٹھے۔ آنگن[۵] کی طرف رُخ کرکے زمین پر ناک رگڑی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شبھو بابو نے بڑی مہربانی کے لہجے میں فرمایا" اچھا جاجا۔ جو ہوا سو ہوا۔ پھر کبھی ایسی بدمعاشی نہ کرنا"

یہ بات سنکر حاضرین میں سبکے سب ناخوش سے ہوگئے۔ سبکو یہ یقین ہوگیا کہ مالک نے یہ کام صرف نیکی کے دم میں اور سختی کرنے کے خوف سے کیا۔ ترک رتن موجود تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ لوگوں کو شاستروں کا فتویٰ سنادیا اور سب کو وہ تمام دلایل بھی سمجھا دیئے جنکی بنا پر ان ناپاک ملچھ مسلمانوں کو گاؤں کے باہر بھی بود و باش کرنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

غفور نے ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔ یوں سنتے سنتے چھٹکارا پاتے ہی اس نے ساری لت ساری دھتکار پھٹکار خوشی خوشی اوڑھ لی اور گھر واپس چلدیا۔ گھر پہونچکر ہمسایوں کے یہاں سے تیج مانگ لایا اور مہیش کو پلاکر بڑی محبت سے اس کی پیٹھ پر دیر تک ہاتھ پھیرتا اور دھیرے دھیرے نہ جانے کیا

---

[۵] آنگن میں ایک طرف عموماً گھر کا مندر ہوتا ہے۔

کیا بات کرتا رہا۔

(۲)

جیٹھ ختم ہونے کو آیا۔ گرمی نے بیساکھ کے ختم ہونے پر جو سر اٹھایا تھا وہ اب کتنے عروج پر آگئی ہے۔ اس کا انداز آج کے تپتے ہوئے آسمان کیطرف نظر کئے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کہیں پر نمی کا نام نشان تک نہ تھا۔ کبھی یہ عالت بدلے گی بھی کسی دن اسی آسمان پر پانی سے بھرے بادل بھی چھائیں گے۔ اس وقت یہ تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ کائنات میں آگ لگی ہے اور یہ آگ اس وقت تک ٹھنڈی ہونے والی نہیں جبتک سب کچھ بھسم نہ ہو جائے۔

ایسے ہی دن میں ٹھیک دوپہر کو غفور گھر واپس آیا۔ دوسروں کے یہاں مزدوری کرنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ اور پھر ابھی چار پانچ ہی دن تو ہوتے تھے کہ اس کا بخار اترا تھا۔ جسم میں نہ طاقت تھی نہ ہمت پھر بھی آج کام کی تلاش میں وہ صبح سے گھر سے نکلا تھا۔ دوپہر تک کڑی دھوپ میں مارا مارا پھرا مگر کہیں کچھ امید نہ ہوئی۔ بھوک پیاس سے آنکھوں تلے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ آنگن ہی سے اس نے پکارا "آمنہ! کھانا پک گیا؟" لڑکی آہستہ آہستہ باہر نکل سائبان میں ایک کھونٹی تھام کر کھڑی ہوگئی۔ جواب نہ ملا تو غفور نے چیخ کر پوچھا "ارے کھانا پک چکا — کیا کہا " نہیں" کیوں رے؟ "چاول نہیں ہے بابا"

"چاول نہیں ہے! صبح کو ہم سے کیوں نہ بولی" "رات ہی تو تم سے کہہ دیا تھا"

غفور نے غصہ میں اسکی نقل کرکے کہا "رات ہی تو تم سے کہہ دیا تھا۔ رات کو کہنے سے کس کو یاد رہتا ہے" اپنے لہجے کی سختی سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ بگڑ کر بولا "چاول رہے گا کیسے؟ بیمار باپ کو ہو نہو مگر بیٹی کو تو دن میں پانچ دفعہ ٹھوسنا ضرور ہے۔ اب سے ہم چاول کو تالہ میں بند کرکے جائیں گے۔ لا ایک لوٹا پانی تو دے۔ پیاس سے کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ کہدے وہ بھی نہیں۔

آمنہ ویسے ہی مُنھ نیائے سر جھکائے کھڑی رہی۔ کئی منٹ انتظار کے بعد غفور کے سمجھ میں آگیا کہ پیاس بجھانے کے لئے گھر میں پانی بھی نہیں۔ وہ اپنے آپے میں نہ رہ سکا۔ لپکا اور آہستہ سے گال پر چٹاخ سے ایک طمانچہ لگا کر بولا "حرامزادی منحوس سارے دن تو کرتی کیا رہتی ہے۔ اتنے لوگ مرے جاتے ہیں تجھے موت بھی نہیں آتی۔

لڑکی کچھ بھی نہ بولی مٹی کا خالی گھڑا اٹھا کر آنسو پونچھتی اسی دھوپ میں باہر نکل گئی اس کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی غفور کا دل تڑپ اٹھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے اِس لڑکی کو کس کس جتن سے پال کر اتنا بڑا کیا تھا وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے سوچا اس نیک بے زبان لڑکی کا کیا قصور۔ یہ تو قسمت کا پھیر ہے کہ انھیں پیٹ بھر اناج بھی میسر نہیں۔ کبھی دن ایک وقت ملا کسی دن وہ بھی نہیں۔ دن بھر میں پانچ چھ بار کھانا تو کبھی خواب میں بھی نصیب نہیں۔ گھر میں پانی نہونے کی وجہ بھی وہ خوب

سمجھتا تھا۔ گاؤں میں جو دو تین صاف پانی کے تالاب تھے وہ سوکھے پڑے تھے۔ شیوچرن بابو کی کھڑکی کے پاس جو تالاب تھا اس کا پانی عام طور سے سبکو تو ملتا نہ تھا۔ اِدھر اُدھر گڑھوں میں جو کچھ پانی جمع تھا وہاں اتنی بھیڑ اور اتنا ہنگامہ رہتا کہ کسی کا پانی لینا مشکل تھا۔ خاص طور سے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس بیچاری لڑکی کو تو پانی کے قریب پہونچنا بھی محال تھا۔ گھنٹوں کھڑے کھڑے اور بڑی منت سماجت کے بعد اگر کسی کو رحم آگیا اور اس نے تھوڑا پانی اس کے گھڑے میں ڈھال دیا تو وہی لےکر چلی آتی۔ آج یا تو گڑھوں میں پانی ہو ہی گا نہیں یا پانی لینے کے ہنگامے میں کسی نے لڑکی پر رحم کرنے کی فرصت ہی نہ پائی۔ یہ سب سوچکر غفور کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ٹھیک اسی وقت زمیندار کا پیادہ ملک الموت کیطرح آکر آنگن میں آکھڑا ہوا اور ڈانٹ کے کے ساتھ پکارنے لگا "

"گھپیرا ہے رے!" غفور نے تیز لہجے میں جواب دیا" ہاں ہوں تو میں کیا ہے؟"

" مالک بابو بلا رہے ہیں چل" "غفور نے کہا! میں نے ابھی کچھ کھایا پیا نہیں ٹھہر کے آؤں گا۔"

" اتنی جرأت بھلا پیادے سے کیوں سہی جاتی ایک ایک فرمائشی گالی کیساتھ غفور کو مخاطب کرکے بولا" بابو کا حکم ہے جوتے لگاتے ہوئے یہاں تک لے آؤ"۔

غفور کو پھر تاؤ آگیا۔ اس نے بھی کڑک کے کہا" مہارانی (وکٹوریہ) کے راج میں کوئی کسی کا غلام نہیں۔ مال گذاری دیتا ہوں گاؤں میں رھتا ہوں۔ جاؤ کہدو میں نہیں آؤں گا۔"

لیکن اس دنیا میں تو اتنے چھوٹے آدمی کا اتنی بڑی بات بولنا" اپنی شامت آپ بلانا ہے۔ خیر گذری کہ یہ ضعیف آواز قوی کانوں تک پوری طرح نہ پہنچی ورنہ پھر اس کا منھ کھانے سے آنکھیں نیند سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتیں۔ اس کے بعد پھر کیا ہوا اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد جب زمیندار کی کچہری سے غفور واپس آکر چپ چاپ بچھاون پر لیٹ گیا تو اس کی آنکھیں اور منھ سب کچھ سوج گیا تھا۔ اس کی اس سخت سزا کا باعث صرف مہیش تھا۔ صبح کو غفور جب گھر سے نکلا تو اس کے جاتے ہی مہیش نے بھی اپنی ڈور تڑا کے اپنا رستہ لیا تھا اور گھومتا پھرتا زمیندار کے صحن میں گھس کے پھولوں کے پودے چرگیا۔ آنگن میں دھان سوکھ رہا تھا اس کو ناس کیا اور پھر جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو زمیندار بابو کی چھوٹی لڑکی کو ڈھکیلتا گراتا بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ پہلی واردات نہ تھی۔ اب سے پہلے بھی یہی ہو چکا تھا مگر صرف غریب سمجھ کے بابو صاحب نے معاف کر دیا تھا۔ اب بھی وہ آکے ہاتھ پاؤں جوڑتا تو شاید معافی مل جاتی۔ لیکن اس نے تو غضب یہ کیا کہ پیادے سے کہا" میں غلام نہیں مال گذاری دے کے گاؤں میں رہتا ہوں۔ ایسی گستاخی بڑا بول، رعیت کی زبان سے شیوچرن بابو زمیندار ہوکر کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ غفور نے ساری صعوبت ساری ذلت چپ چاپ سر جھکا کے سہہ لی۔ عذر میں زبان تک نہ ہلائی۔ گھر واپس آکے بھی ویسے ہی خاموش پڑا رہا۔ بھوک

اور پیاس کا اسے اب دھیان بھی نہ تھا۔ دل کے اندر ٹھیک ویسے ہی آگ لگی ہوئی تھی جیسے باہر آسمان پر۔ اسی طرح وہ کتنی دیر پڑا رہا۔ اسے وقت گذرنے کا ہوش ہی نہ تھا۔ اتنے میں یک بیک آنگن سے آمنہ کی چیخ کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ دوڑتا ہوا آنگن میں پہونچا تو دیکھا کہ وہ آنگن میں گر پڑی ہے اور ایک طرف گھڑا ٹوٹا پڑا ہے۔ اس کا سارا پانی زمین پر بہہ گیا ہے اور مہیش اکدم زمین دوز ہو کر سر جھکائے اسی پانی کو چاٹ رہا ہے۔ چشم زدن میں غفور غصّہ سے بیخود ہو کر مٹی مرمت کرنے کے لئے سامنے ہی بانس پڑا تھا۔ دونوں ہاتھ سے وہی بانس اٹھا اس نے مہیش کے جھکے ہوئے سر پر بجاڑ دیا۔ صرف ایک بار مہیش نے سر اٹھانے کی کوشش کی پھر اس کے بعد ہی اس کا بھوک کا مارا بدن زمین پر گر پڑا۔ آنکھوں سے دو قطرے آنسو اور کانوں سے چند بوند خون بہہ نکلی۔ دو چار بار سارا جسم کانپا اس کے بعد اگلے اور پچھلے پاؤں پھیلا کے مہیش نے آخری سانس لے لی۔

آمنہ رو کے بولی "یہ کیا کیا بابا" "مہیش تو مر گیا"۔ غفور نے نہ سر ہلایا نہ جواب دیا۔ صرف اس کی حیرت زدہ آنکھیں اُن دو پتھرائی ہوئی سیاہ آنکھوں کی طرف جم کر رہ گئیں۔ کوئی دو گھنٹے بعد آس پاس کے گاؤں سے چماروں کا جھنڈ آ پہونچا اور مہیش کو بانس سے باندھ کرلے چلا۔ ان لوگوں کی چمکتی ہوئی تیز چھریاں دیکھ کر غفور کا سارا جسم کانپ اٹھا مگر زبان سے اس نے ایک حرف بھی نہ نکالا۔ گاؤں کے لوگوں نے کہا "مالک نے ترک رتن کو بلوا بھیجا ہے۔ ان سے گئو ہتیا کے متعلق رائے پوچھیں گے۔ پرانسچت کے لئے شاید اُسے ممکن ہے تمہیں اپنی زمین ہی بیچنی ہوگی"۔ غفور نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ گھٹنوں پر منہ رکھے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بہت رات گئے غفور نے لڑکی کو جگا کر کہا "چل بیٹی ہم لوگ چلیں" وہ چوکھٹ ہی پر پڑی سو رہی تھی بیٹھ کر آنکھیں ملتی ہوئی بولی "کہاں بابا" غفور نے جواب دیا "پھلہٹریا جٹکل میں کام کرنے کے لئے"۔

لڑکی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اب سے پہلے ہزار مصیبت پر بھی اس کا باپ جٹکل میں کام کرنے پر راضی نہ ہوا تھا۔ وہاں دین ایمان سلامت نہیں رہتا۔ عورت کی عزت بھی نہیں بچتی" یہ بات وہ بار بار سن چکی تھی۔ غفور نے کہا "چل جلدی بیٹی دیر نہ کر۔ بہت دُور پاؤں پاؤں چلنا ہے"۔

آمنہ پانی پینے کا لوٹا اور کھانا کھانے کی پیتل کی تھالی ساتھ لیجانا چاہتی تھی۔ مگر غفور نے یہ کہہ کے روک دیا "رہنے دے یہ سب۔ اس سے ہمارے مہیش کی پرانسچت ہوگی"۔ اندھیری رات میں لڑکی کا ہاتھ پکڑے وہ باہر نکلا۔ گاؤں بھر میں اس کا اپنا رشتہ مند کوئی بھی نہ تھا۔ اسے کسی سے کچھ کہنا سننا بھی نہ تھا۔ آنگن سے گذر کر جب راستہ پر اسی ببول کے تلے پہنچا تو یک بیک چیخ کے رو پڑا۔ پھر تاروں بھرے سیاہ آسمان کی طرف سر اٹھا کے بولا "اللہ! جتنا جی چاہے میری سزا کر لے مگر میرا مہیش بھوکا پیاسا ہی مرا ہے۔ جس نے تیری دی ہوئی میدان کی گھاس اُسے کھانے نہ دیا۔ تیرا دیا ہوا پانی اسے پینے نہ دیا اس کا گناہ کبھی معاف نہ کرنا!"

سرت چندر چٹرجی

مترجمہ رضا مظہری

# مصحفی کا غیر مطبوعہ قصیدہ

۱ یہہ گوے یہ میداں یہ زباں اور یہ بیاں ہے — دعویٰ ہو جسے شعر میں آئے نہ کہاں ہے

۲ سودا کے تئیں کہتے ہیں تھا شاعرِ مغلق — سو شاعری اس کی بھی[۵] بلیغوں پہ عیاں ہے

۳ مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو — سچ پوچھو تو اُردو کی فقط صاف زباں ہے

۴ سو اُس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا — معنیٰ ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

۵ پر مجھ کو مناسب نہیں اس بات کا کہنا — سودا کے تئیں دوکھوں نہ میرا یہ وہاں ہے

۶ کس واسطے گزرا ہے وہ مقبول طبائع — ویسا بھی اگر ڈھونڈے اگر اب تو کہاں ہے

۷ اک ہیر ہے سو یہہ تو کبھی ہجو و قصیدہ — کہتا نہیں ہرگز کہ مشیخت کا زیاں ہے

۸ ہوتی ہے غزل سے ہی عیاں شاعری اُس کی — جیتا رکھے اللہ عجب سحر بیاں ہے

۹ سچ پوچھو جو مجھ سے تو انھیں لوگوں کی دولت — یہہ ریختہ گوئی کی جہاں میں جو زباں ہے

۱۰ سودا ہی ہر اک شخص سے یاں سینہ سپر تھا — یہہ حملہ اٹھائے یہ کسے تاب و تواں ہے

۱۱ پر جب تئیں میری بھی زباں تر ہے زباں سے (؟) — ہرگز نہ کہوں گلشن معنیٰ میں خزاں ہے

۱۲ اک ہجو کے کہنے ہیں زباں میری ہے قاصر — ورنہ جو قصیدہ ہے مرا کوہ گراں ہے

۱۳ سو اُس کی قباحت جو شناسائے سخن ہیں — محتاج بہ تقریر نہیں، اُن پہ عیاں ہے

۱۴ کچھ اتنا بڑا کام نہیں ہجو کا کہنا — لیکن کوئی[۵۲] ہو اس کے بھی قابل سو کہاں ہے

۱۵ نایاب ہے طالب ہی زمانے میں وگرنہ — سینے میں مرے معدن الماس نہاں ہے

۱۶ اور ہے تو شہنشاہ جہاں خسرو عادل — آباد یہ کچھ جس کی عدالت سے جہاں ہے

۱۷ کہتی ہے اُسے خلق جہاں سب شہہ عالم — شاہی جو کچھ اُس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

۱۸ اطراف میں دِلّی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور — جو آئے ہے باہر سے وہ بشکستہ دہاں ہے

۱۹ اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے — باشندہ جو واں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے

۲۰ اس شہر کا جس دن سے ہوا سیندھیا حاکم — چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر اک نگراں ہے

۲۱ بیداد سے نائب کی یہہ احوال ہے واں کا — ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

۲۲ اتریں ہیں وہاں پگڑیاں بس شام کے ہوتے — چالاکی دستِ ایسی، یہہ اندھیر کہاں ہے

۲۳ دو چار تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں اُن سے — بس قلعے کے نیچے ہی تک اک امن و اماں ہے

۲۴ جز دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں — ناسور ہے سینے کا اگر آب رواں ہے ·

آتا ہے نظر جوں دلِ عشاق شکستہ ۲۵ اس شہر میں جو قصر فلاں ابن فلاں ہے

بیٹھے تھے جہاں کج کلہاں تکیہ لگا کر ۲۶ واں اب جو نظر کیجے تو تکیے کا مکاں ہے

وہ رنگ نزاکت نہیں دروازوں کے منہ پر ۲۷ محراب جو اُن کی ہے سو خم دیدہ کماں ہے

خوں ریزی ہی اس خاک پہ رہتی ہے ہمیشہ ۲۸ اب سنگ بھی واں ہے تو یہی سنگ فساں ہے

روتا ہوا گزرے ہے جو کوئی ابر کا ٹکڑا ۲۹ احوالِ غریباں ہی پہ وہ اشک فشاں ہے

آ کر کے رمے میں ہے دھنسا گرگ حوادث ۳۰ افسوس کہ کیا خواب فراغت میں شباں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جاکر کوئی پوچھے ۳۱ جز خونِ جگر کچھ بھی غذا اے دل و جاں ہے

ملتا ہے بصد رنج انھیں رزق کم و بیش ۳۲ اور چاہیں فراغت سو فراغت تو کہاں ہے

خورشید دکھاتا ہے سحر دور سے گردہ ۳۳ اور شب کو مہِ نو کہے ہے لو لبِ ناں ہے

بت خانہ و مسجد میں جو پھیلی ہے خرابی ۳۴ ناقوس کا نالہ نہ مؤذن کی اذاں ہے

بازار نشیں تھا جو کوئی صاحبِ حرفہ ۳۵ اس شہر میں سو اس کو کہوں کیا دو کہاں ہے

زیں دوز کی صورت نظر آتی نہیں مطلق ۳۶ اور یہ بھی تو جوں سوزنِ گم گشتہ نہاں ہے

کس واسطے اک آن میں حاکم کا پیادہ ۳۷ آتا ہے ابھی پوچھتا زیں دوز کہاں ہے

تہہ کرکے دوشالوں کے تئیں اپنے رفوگر ۳۸ بقچے کے تئیں مار بغل گھر کو رواں ہے

جوں تیر فرار اُس نے بھی بدعت سے کیا ہے ۳۹ دکّان مقفّل ہے کماں گر نہ کماں ہے

زردار سا دیکھے ہے جسے راہ میں جاتے ۴۰ طرّار بھی پیچھے ہی سے جوں سایہ رواں ہے

صراف لیے جائے ہے کاندھے پہ جو تھیلی ۴۱ اتنے میں اُسے پھر کے جو دیکھے تو کہاں ہے

نواب نہ خاں کوئی رہا شہر میں باقی ۴۲ نوّاب جو گوجر ہے تو میواتی بھی خاں ہے

گو گاؤکشی شہر میں موقوف ہوئی ہے ۴۳ اب اُن کی جگہ خونِ رعیت کا رواں ہے

احوالِ سلاطیں کی لکھوں کیا میں خرابی ۴۴ یعنی کہ مہِ عید اب ان کو لبِ ناں ہے

فاقوں کی زبس مار ہے بےچاروں کے اوپر ۴۵ جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے

اک سوچ میں بیٹھا ہے کہ اب آتی ہے روٹی ۴۶ اک در کی طرف دیدۂ دل سے نگراں ہے

اک آتے ہوئے خوان کو یوں دیکھ کہے ہے ۴۷ کچھ نامِ خدا آج تو یہ خوان گراں ہے

اتنے میں اتارے ہے جو سر پر سے کہاری ۴۸ ہیں ڈھیریاں دانوں کی وہاں روٹی کہاں ہے

گل جائے زباں میری کروں ہجو گر ان کی ۴۹ یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کی بیاں ہے

کہتے ہیں جسے سلطنت القصّہ کہ یارو ۵۰ نہ نام ہے اُس چیز کا نہ اب تو نشاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک ۵۱ ہے صاف تو یہ گلشنِ دلّی میں خزاں ہے

حادثۂ غلام قادر (۱۲۰۳ھ) کے بعد شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، کل اختیار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ اُن کے مظالم سے دہلی والے تنگ آ گئے، اور مرہٹوں اور ان کے نائب شاہ نظام الدین سے سخت بیزار تھے۔ مصحفی نے اپنے قصیدے میں اُس زمانے کی دہلی کی تصویر کھینچی ہے۔ قصیدہ ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۱۰ھ کے درمیان وجود میں آیا ہے۔ اس کے ۴ شعر (۲،۳،۲) کلیات سودا نول کشوری ص۷ تا ۹، اُس طویل قصیدہ میں پائے جاتے ہیں جو سودا کے کسی شاگرد نے ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ مصحفی کی ہجو میں لکھا تھا۔ مصحفی کا قصیدہ سودا کے مشہور قصیدۂ شہر آشوب ("اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے") کا جواب ہے اور فخریہ اشعار میں مصحفی نے خودستائی پر قناعت نہ کر کے سودا کو نشانۂ اعتراض بنایا ہے۔ اعتراضات بالکل بے معنی ہیں، مصحفی نے تعصب سے کام لیا ہے، اگر یہ نہیں تو وہ قوّتِ نقد سے بالکل محروم ہیں۔ شاگردِ سودا نے سودا کے کلام کے متعلق اپنے عہد کی رائے کی صحیح ترجمانی ان شعروں میں کی ہے:

سودا کو کوئی "شاعرِ مغلق" نہیں کہتا — یہ خلق پہ ہے از رہِ بہتان تری تقریر

کہتے ہیں وہ خلّاق معانی تھا جہاں میں — مذکور جہاں آئے پہ سودا کا بہ تذکیر

سودا کا شہر آشوب اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور باوجود اس کے کہ اس کی تصنیف کو دو صدیاں گزر گئی ہیں، اس کی تازگی باقی اور اس کا اثر برقرار ہے۔ سودا کا لہجہ ظریفانہ ہے، لیکن، اُس کے لب متبسّم ہوں تو ہوں، اس کا دل رو رہا ہے۔ سودا نے جو تصاویر کھینچی ہیں، وہ واضح اور تشفی بخش ہیں، اُس نے جو کچھ کہا ہے، آنکھوں دیکھی ہے یا آپ بیتی۔ مبالغۂ شاعرانہ سے قطع نظر اُس کا بیان واقعیت پر مبنی ہے۔ مصحفی نے سُنی سنائی باتیں لکھی ہیں، وہ حادثۂ غلام قادر سے کئی سال قبل ہی دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، تباہی دہلی سے وہ بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن، ان کے قصیدے کا اصلی محرک یہ خیال ہے کہ سودا کے قصیدے کا جواب لکھا جائے، اپنے تاثرات کا اظہار ان کے لیے ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ سودا کی شدّتِ احساس، شوخِ طبعی اور تعمیری صلاحیت بھی مصحفی کو نہیں ملی۔ مصحفی کے نقوش سودا کے مقابلے میں بےرنگ اور بے وقعت ہیں۔ سودا کا بیان ہمہ گیر ہے، اُس نے سماج کے کسی اہم طبقے کو باقی نہیں چھوڑا، مصحفی سلاطین کے علاوہ خاص خاص صفت والوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہیں کہیں عام غزل گو شاعروں کی طرح ضروری جزئیات ترک کر دیتے ہیں مثلاً چھتیسویں اور سینتیسویں شعر میں یہ بات کہ حاکم کام لیتا ہے لیکن مزدوری نہیں دیتا، بیان کرنے سے رہ گئی۔ ق۔ع۔و

---

۵ کلیاتِ سودا میں 'بھی' کی جگہ 'تو' ۔ ۱ کلیات میر میں ہجو اور مدح دونوں موجود ہے ۱۲ قابل رشک زمانہ تھا کہ ایک شخص بھی ہجو کے قابل نہ ملا ۱۳ وہ مغل شاہزادے جن کا سلسلۂ نسب دو چار پشت قبل بادشاہِ وقت سے ملتا تھا، 'سلاطین' کہلاتے تھے۔ اس کا واحد 'سلطان' اس مفہوم میں مستعمل نہ تھا۔

(۲)

میں اس امر کی تکرار بغرض وضاحت کرنی چاہتا ہوں کہ اردو کی تخلیق کے سلسلے میں سماجی اثرات کو سیاسی اسباب پر فوقیت و اولیت اوائل ہی سے حاصل رہی ہے۔ اور یہ سماجی اثرات سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ لہٰذا زبان کا نیا خمیر کبھی بھی صرف ایک صوبے یا علاقے میں محدود نہیں رہا۔

ان سماجی اثرات میں مذہبی اثرات کو بہت ہی نمایاں اور غالباً اوّل درجہ حاصل ہے۔ میرے پہلے قول کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ زیادہ تر سیاسی مراکز سے دور دور ہی ہوئی ہے، یا کم از کم دور دراز علاقوں میں زیادہ کامیاب ہوئی ہے۔ زبان کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے۔

پنجاب میں لاہور سے دور سرحد، کشمیر، مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی نمایاں کثرت ہے۔ اور مشرقی پنجاب میں قلت۔ دہلی سے دور اسلام کی تبلیغ زیادہ کامیاب ہوئی۔ مشرقی بنگال میں اسلام زیادہ سرسبز ہوا۔ عظیم آباد سے دُور پُرنیہ کے علاقہ میں مسلم آبادی کو خاص اکثریت حاصل ہے۔ بات یہ تھی کہ سیاسی مراکز میں عمائدین سیاست میں اُلجھے ہوئے رہے اور ملک کے اطراف میں صوفیائے کرام پھیل گئے اور انھوں نے فریضۂ تبلیغ ادا کیا۔

ظاہر ہے کہ ان بزرگوں نے مقامی بھاشائیں سیکھی ہوں گی اور اُسی کے ذریعہ تبلیغ فرماتے ہوں گے۔ اُن کی گفتگو اور وعظ و ارشاد میں فارسی و عربی الفاظ و اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہوں گی اور اس طرح ایک نئی زبان ریختہ کی پیدائش کے سامان کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ اس طرح کی ریختہ زبان پنجاب، سندھ، دکن، صوبۂ متحدہ، بہار، بنگال ہر جگہ بننے لگی ہوگی۔ نومسلمین کی جماعت جب تیار ہوگئی ہوگی تو اس نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا ہوگا اور رفتہ رفتہ عربی و فارسی سے واقفیت بڑھی ہوگی۔ اس صورتِ حال نے لسانی امتزاج کے عمل کو زیادہ تیز کر دیا ہوگا۔ نومسلمین کی جماعت نئی زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئی ہوگی۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں یہ نیا ماحول پیدا ہوا اور اُس نئے ماحول نے جدید زبان کو پروان چڑھایا۔

دوسرا ذریعہ تجارت کا سماجی اثر ہے۔ عہد اولیٰ میں مسلمان بڑے حوصلہ مند تاجر تھے۔ ان کے ذریعہ بھی دور دراز کے علاقوں میں وہ فضا پیدا ہوئی جس نے متحدہ زبان یعنی اردو کی تخلیق میں مدد دی۔

تیسرے درجے پر سیاسی اثرات ہیں۔ ان کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں اور عملوں کا ایک فارسی داں طبقہ ہندوستانیوں میں سے پیدا ہوا اور درباری تہذیب و ثقافت کی ہم آہنگی کی خاطر کچھ عربی آشنا، شرفا و رؤسا ظہور پذیر ہوئے اس طبقے کے ذریعہ بھی شعوری و غیر شعوری طور پر بھاشاؤں میں فارسی و عربی کی آمیزش شروع ہوئی۔ ایسے سیاسی مراکز بھی ہر صوبے میں تھے اور ہندوستان کا ہر صدر مقام دلّی و لاہور کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

یہ تیسرا اثر زیادہ وسیع نہیں ہوسکتا تھا۔ وسعت کے لحاظ سے مذہبی اثر سب سے برتر تھا۔ اسکی جڑیں ملک کے گاؤں گاؤں میں دیس کے رہنے والوں کی ایک بڑی جماعت کے دلوں کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سیاستیں مٹ گئیں۔ مگر یہ نفس و ذہن میں بویا ہوا مذہب اسلام کا بیج ابتک ایک پھلدار درخت ہے۔ اس امر سے اول الذکر اثرات کی زبردست و پائندہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ تجارتیں فنا ہوگئیں مگر اسلام کی پونجی ہنوز نفع رساں ہے۔

اُردو زبان کی تخلیق و تعمیر کو سیاسی اثرات نے فائدہ کے ساتھ نقصان بھی پہنچایا ہے کیونکہ شمالی ہندوستان کے درباروں میں فارسی کا سکہ جاری تھا۔ زبان و ادب کے لحاظ سے فارسی کو فروغ حاصل تھا اور اُردو کس مپرسی کی حالت میں تھی۔

اب آیئے اِن صوفیائے کرام کے لسانی خدمات کا سرسری جائزہ لیا جائے:۔

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (۴۵۶ھ ۱۰۶۳ء) لاہور میں۔ حضرت خواجہ معین الدّین چشتی رح (۵۳۶ھ ۱۱۴۲ء تا ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء) اجمیر میں، ۔ حضرت قطب الدّین بختیار کاکیؒ (۵۸۰ھ ۱۱۸۶ء تا ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء) دہلی میں حضرت مخدوم شرف الدین بن یحییٰ منیریؒ (قرب عظیم آباد، ۶۶۱ھ) بہار میں، ۔ حضرت شیخ عین الدّین گنج العلمؒ (۷۰۶ھ) دکن میں اور ان کے پہلے اور بعد بے شمار معروف و غیر معروف بزرگوں نے سارے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ تخلیق اُردو کے لئے بھی ساز گار فضا پیدا کی۔

یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مخلوط زبان کے ذریعہ دیا و امصار میں ہندیوں کے دلوں کو فتح کیا اور ان کی زبان فیض ترجمان سے بھاشا کے فقرے ادا ہوئے۔

ان کے بعد پھر وہ برگزیدہ جماعت ہے جس نے مُلکی زبان میں مذہبی رسالے لکھے۔ مثلاً حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ۸۰۸ھ ۱۳۰۸ کچھوچھا شریف، اودھ میں "رسالہ اخلاق و تصوف" تحریر فرمایا۔ دکن میں حضرت عین الدّین گنج العلم نے بھی مسائل شرعیہ کے متعلق رسالے لکھے تھے۔ ان کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز نے (۷۲۱-۸۲۵ھ ۱۳۲۱-۱۴۲۲ء) "معراج العاشقین"، "ہدایت نامہ" وغیرہ رسالے لکھے جو ابتک موجود ہیں۔ بہار میں حضرت شاہ عماد الدین قلندر پھلواروی نے "صراط مستقیم المعروف بہ سید معاد راستہ" قلمبند فرمایا۔ یہ رسالہ ۱۱۰۱ھ میں لکھا گیا۔ ان بزرگوں کے علاوہ ان کے بعد اور بھی بہت سے

بزرگوں نے ملکی زبان میں رسالے لکھے ۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان سے پہلے اور کوئی اس نوع کا رسالہ لکھا ہی نہیں گیا ۔ کیونکہ تحقیقات و انکشافات کا دروازہ بند نہیں ہوا ۔ کل کو جو رسالہ اردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا تھا اب وہ بعد کی پیداوار ثابت ہوگیا ہے ۔

**بہار میں اُردو** میں اس موقع پر بہار میں اُردو کے متعلق کچھ اور وضاحت کر دینی ضروری سمجھتا ہوں ۔ میں نے اس سلسلے میں مقالہ "بہار اسکول کی اُردو شاعری اور اسکی تخلیق کے اسباب" از جناب عبدالمالک صاحب آروی نگار جنوری ۳۵ء اور مقالہ "بہار میں اُردو نثر" از جناب مختار الدین احمد آرزو[1] سے استفادہ کیا ہے ۔

بہار میں صوفی خانوادوں کی خانقاہیں چھٹی صدی ہجری ہی سے منیر ، مہدانواں (نزد پٹنہ) ، بہار شریف ، پھلواری شریف وغیرہ میں قائم ہوگئی تھیں ۔ یعنی محمد غوری کے حملہ کے زمانہ میں ۔ اس سے پہلے بھی بہار میں تبلیغ اسلام کا ثبوت ملتا ہے ۔ ساتویں صدی ہجری میں یہ سلسلہ سارے صوبے میں پھیل گیا تھا ۔ پٹنہ ضلع کے علاوہ ، گیا ضلع میں متعدد خانقاہیں قایم ہوگئی تھیں ۔ مثلاً ارول میں حضرت مخدوم شاہ شمس الدین کی خانقاہ ، مونگیر ضلع میں حضرت سید احمد جاجیری کا سلسلۂ رشد و ہدایت وغیرہ ۔

ان بزرگوں نے مخلوط مگدھی زبان میں وعظ و پند شروع کئے اور فارسی و عربی تصانیف کا سلسلہ بھی شروع کیا ۔ مثلاً حضرت شرف الدین منیری "آداب المریدین" کی فارسی شرح لکھی ۔

صوفیا کے علاوہ ایرانی شعراء اور فارسی ادبیات کا اثر بھی افاغنۂ دہلی کے وقت سے ہی بہار پر پڑا ہے ۔ بہار ایک مستقل صوبہ تھا اور عاملین یہاں آتے تھے ۔ ان عاملین کے دربار میں اہل علم و فضل جمع رہتے تھے ۔ مرزا محمد صادق اصفہانی ۱۰۲۹ھ سے ۱۰۳۳ھ تک پٹنہ میں مقیم رہا ۔ اپنی کتاب "صبح صادق" میں اُس نے لکھا ہے کہ پٹنہ کو ایرانی شعراء رشک ایران بنائے ہوئے تھے مثلاً مولانا نادم گیلانی ، کلیم عارف ، مولانا محمد حسین قزوینی وغیرہم ۔

بہار کے فارسی گو شعراء میں شاہ ابوالحسن فرد ، شاہ علی حبیب نصر ، مولانا محمد سعید حسرت ، شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ گذرے ہیں ۔ شیخ علی حزیں راجہ شتاب رائے کے یہاں رہے ۔

**سلسلۂ تالیف و تصنیف** اب تک کے انکشافات سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ بہار میں اُردو کی سب سے پہلی کتاب "صراط المستقیم المعروف بہ سیدھا راستہ" ہے ۔ اسے حضرت شاہ عماد الدین قلندر پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا ۔ یہ دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے ۔ ابتداء ان سطروں سے ہوتی ہے : اما بعد پس جانو اَے مسلمان بہین اور بیٹی سب کے اللہ تعالیٰ ایک ہیں ، اون

---

نوٹ [1] یہ مقالہ بزم ادب پٹنہ کالج میں انعامی مقابلے کے لئے مارچ ۱۹۳۹ء میں پیش کیا گیا تھا اور اوّل رہا آرزو صاحب ایک ہونہار نوجوان ہیں : اختر

کے تئیں دھڑ، بدن، ہاتھ اور پاؤں، ناکھ، کان، پیٹ، پیٹھ کُوچھ نہیں ہے۔ دھڑ بدن مٹی سے بنیں ہیں۔ وے مٹی، پانی، آگ، ہوا سب کے تئیں تو آپی بنائیں ہیں۔ آسمان، زمین، پہاڑ ندّی، دریا سب اون ہی بنائیں ہیں۔ اِن کے تئیں صورت بھی نہیں ہے، صورت بدن کی ہوئے ہے۔ جب اون کے تئیں بدن نہیں تو صورت کیسے ہو سکے ..."

رسالہ کے اختتام پر مصنف کی ہی ایک رباعی ہے ؎

یا رب نگہہ عنایت ادھر کر دو کانٹا ہے عمّاد تم گُل تر کر دو
ہے رنگ گنہ سیتی رُخ اُس کا کالا تم غازۂ عفو سے منوّر کر دو

رباعی کے بعد تاریخ تصنیف ۱۰۸۱ھ درج ہے اور پھر فارسی میں لکھا ہوا ہے کہ "الحمدللہ کہ ایں رسالہ در مدّت دو روز حسب فرمائش اہل خانۂ خود <u>در زبان مروجہ دیار خود</u> نوشتہ شدہ کہ مردمان زنان ناخواندہ را در زبان مادری ایشاں ذریعہ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود۔ ربّنا تقبّل منّا اِنّکَ اَنتَ السَّمِیعُ العَلیمُ۔

یہ رسالہ اور چند دیگر رسالے اور بیاض جناب مولانا تمنّا عمادی پھلواروی کے پاس موجود ہیں۔ مذکورہ بالا رسالہ کی زبان کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بہار اُس عہد کی اردو ہندوستان کے کسی صوبہ کی اُردو سے اپنی تعمیر و تشکیل کے معیار میں پیچھے نہیں اور کسی کی نقل بھی نہیں۔ اس کے اندر اپنے انفرادی مقامی خصوصیات بھی ہیں۔ مصنف نے بھی لکھا ہے "در زبان مروجہ دیار خود"

اس داخلی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ بہار میں اُردو کا ارتقا وسیع بنیادوں پر ہوا ہے یہاں اُردو کہیں سے درآمد نہیں کی گئی بلکہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۸۱ھ سے بہت پہلے سے بہار میں اردو بن رہی تھی اور یہ عرصہ وہی ہے جس میں شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اُردو اپنے مقامی خصوصیات کے ساتھ بنی ہے کیونکہ "صراط مستقیم" کا لسانی معیار اتنا ہی بلند ہے جتنا اُس عہد کے کسی دوسرے رسالے کا۔ ملاحظہ ہو عہد قطب شاہی کی ایک کتاب "احکام الصلوٰۃ" از مولانا عبداللہ دکنی ۱۰۳۳ھ۔

"بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا مانگنے نماز جاتا ہے......"

بہار کی دوسری کتاب "رسالہ نماز" از شاہ محمد ظہورالحق پھلواروی ہے۔ یہ ۱۲۰۰ھ سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی۔ تیسرا رسالہ "فضائل رمضان" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ آپ نے اور بھی کئی رسالے لکھے مثلاً فیض عام، کسب النبی وغیرہ۔ تیرہویں صدی ہجری میں بھی کئی رسالے لکھے گئے۔ مثلاً "ہدایت المسافرین" ۱۲۶۲ھ۔ "القول المحمود..." از شاہ احمد حسین امتھوی ۱۲۸۴ھ۔ "عین الایمان" از امین اللہ عظیم آبادی ۱۲۹۱ھ، سرمہ بینائی از سید شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی داناپوری ۱۲۶۵ھ۔

مولانا عبدالغفار صاحب مہدانوی نے المفرد بخاری کا اُردو میں ترجمہ کیا اور حضرت مولانا عبدالرحیم صادقپوری نے "الدرمنثور" لکھی۔

فورٹ ولیم میں بھی بہار کی نمایندگی سید حمیدالدین بہاری نے کی۔ خوان اِلوان ۱۲۰۹ھ سید حمید ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ غالبًا یہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء سے پہلے یہ کتاب لکھی جا چکی تھی۔ یہ فارسی کا ترجمہ ہے اور ڈاکٹر گلگرائسٹ کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور دوسرا برٹش میوزیم لندن[1] میں ہے۔

آئیے اب بہار میں اُردو شاعری کا جائزہ لیا جائے۔ خود حضرت خواجہ عمادالدین عمادؔ شاعر تھے اور آپ کے اردو کلام کا نمونہ ملتا ہے۔ آپ کا عہد ۱۱۲۴ھ-۱۰۶۵ھ تک ہے۔ ان کے بعد حضرت خواجہ غلام نقشبند سجاد، ۱۱۶۳ھ-۱۱۲۶ھ نے اردو میں شاعری کی۔ عمادؔ اور سجادؔ کا کلام مولانا تمنّا عمادی پھلواروی کے پاس موجود ہے۔ مرزا بیدلؔ متوفی ۱۱۳۳ھ کے اُردو اشعار بہت ضایع ہوئے ہیں۔ نکات الشعرا از میر تقی میرؔ اور تذکرہ میر حسن میں یہ اشعار درج ہیں ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں | اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا… | پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم ہیں

ان کے علاوہ اور بھی اشعار مشہور ہیں۔ مثلاً ۔ ع

"پٹنہ نگری چھاڑ کے بیدلؔ چلے بدیس"

بھلا ان حضرات کے اشعار دہلی کے کس شاعر کے تتبع میں ہو سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نمونوں کے مطالع سے پتہ چلتا ہے کہ بہار میں اردو شاعری اور قبل سے ہوئی تھی، ورنہ یک بہ یک اس پایہ کا کلام زبان کی اس ستھرائی کے ساتھ ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے۔ دکن میں بھی اُردو شاعری کا چرچا قطب شاہی دور میں ہوا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سب سے پہلا مرتّب کلیات ہے۔ اس کا سنہ تخت نشینی ۹۹۰ھ ہے۔ بیدلؔ عظیم آبادی گیارہویں صدی ہجری کے شاعر ہیں۔ اور محمد قلی قطب شاہ گویا اور اس کے بعد نصرتی وکنی وغیرہ بھی گیارہویں صدی کے شعرا ہیں۔ اس طرح بہار کی شاعری اُردو کے دور اولین سے جا ملتی ہے۔ اور ابھی بہار میں محققین نے انکشاف واکتشاف کا کام اس پیمانہ پر شروع بھی نہیں کیا جس معیار پر دکن میں عنایت خسروانہ سے کام ہوا ہے۔ قوی اُمید ہے کہ اگر سلسلۂ تحقیق جاری رکھا جائے تو بہار کی اہمیت زبان اُردو کی تخلیق وارتقا کے لحاظ سے بہت بڑھ جائے۔

---

[1] Catalogue of Hindi, Punjabi and Hindustani Mss. in the Br. Mus. Library London by J. F. Bhunhardt.

دہلی اور بہار اسکول میں مماثلت ضرور ہے لیکن۔ ہر دو نے ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہوئے انفرادی طور پر ترقی کی ہے، اور دونوں اسکول از خود پیدا ہوئے۔

میر حسن کے استاد میر ضیا، دہلی سے عظیم آباد چلے آئے۔ اشکی اور جمالی نے خواجہ میر درد سے اصلاحیں لیں (حیات فریاد ص۱۵۱) مگر اسکو کیا کیجئے کہ خود میر تقی میر جعفر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ راسخ عظیم آبادی اور جوشش عظیم آبادی کی شاعری میر و سوز کی شاعری کا جواب ہے۔ غالب نے بیدل کے کلام کو سامنے رکھ کر مشق سخن کی۔

موجودہ تحقیقات کی بنا پر تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے بعد دہلی اور صوبہ متحدہ میں اردو کو اس وقت تک فروغ نہ ہوا جب تک ولی دکنی نے دہلی کے تخیل کو آکر نہ چھیڑا۔ ہاں۔ دکن اور بہار میں نظم و نثر اردو کو خاصا فروغ رہا۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ دہلی پر فارسی غالب تھی اور دویم یہ کہ سیاسی انقلابات کا محور دہلی ہی تھا۔ پنجاب سے اپنے اثرات چھوڑتی ہوئی تعمیر اردو کی اولین موجیں گذر چکی تھیں اور اب یہ وادی گنگ و جمن میں اور کنار آب گوداوری اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ بنگال کی گود میں بھی یہ موجیں مچلیں، گجرات کی آغوش میں بھی کھیلیں اور نربدا و تاپتی کے سواحل پر بھی خراماں ہوئیں، ایک دوسرے سے مل مل کر جھوم جھوم کر بھی کھیلتی رہیں اور تالیاں بجا بجا کر ناز سے گریزاں اور رقصاں بھی ہوئیں۔ مگر اصل میں ناظورۂ اردو نے گنگا اور جمنا کے تیر ہی پر ڈیرے ڈالے۔ پھر بھی شوق سفر اسے سیماب دار کئے ہوئے ہے آج اسے راوی کا کنارہ اور نظام ساگر کا نظارہ پھر بھا گیا ہے۔ دیکھئے لندن، برلن، روم، قاہرہ انقرہ، ماسکو، سنگاپور اور ٹوکیو سے بھی اردو کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کل کو یہ ساری دنیا کو فتح کرے گی۔ انشاءاللہ!

اوپر کی ساری بحث و نظر سے چند نتائج نکلتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اردو سامی اور آریائی تہذیبوں کا متحدہ ورثہ ہے۔ اردو زبان کی ساخت میں دراوڑی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی زبان کا حصّہ ہے، یعنی اردو بولیوں کا ایک خوبصورت سنگم ہے

دویم یہ کہ زبان اردو سارے ہندوستان میں تخلیق و ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی ہے۔ یہ کسی ایک صوبہ کی چیز نہ اپنی ابتدا میں تھی اور نہ اب ہے۔ اس کی ملک گیر اہمیت ماضی کے لحاظ اور مستقبل کے لحاظ سے بھی ہے، اور حال میں یہ سارے ہندوستان کی رب آشنا اور منظور نظر ہے۔ نیز بین المللی دنیا میں ایسے کیسے پیدا ہوگئے ہیں اور جنم لیتے جاتے ہیں جن میں اردو کے چلتے ہوئے سکّے جمع ہو رہے ہیں اور بازار عالم میں انکی ساکھ بنتی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ اُردو کی تخلیق کے مقامی نظریے نیم صادق باتیں ہیں۔ ملک کے ہر خطے میں کم و بیش ایسا ماحول پیدا ہوگیا تھا جس میں اُردو کا پودا جنم لے رہا تھا۔ ہر جگہ یہ پودا بڑھا۔ کہیں پھول زیادہ آئے، کہیں پھل زیادہ لگا، اور سب نے مل کر باغ اُردو سجایا۔

کام یوں ہوا کہ مقامی بھاشاؤں سے فارسی، عربی الفاظ ہر دیار میں ملنے لگے تھے۔ آج بھی پنجابی، بنگالی، مرہٹی، سندھی، گجراتی، تامل، تلیگو وغیرہ بولیوں میں فارسی و عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پنجاب میں اُردو کا ریختہ بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا، بنگال میں تھوڑی ہی دیر بعد یہ آمیزش شروع ہوئی ریختہ کی گرہست جیسے پنجاب میں ہونے لگی ویسے ہی ہر علاقے میں انفرادی خصوصیات کے ساتھ یہ کام شروع ہوا دکن، بہار، صوبہ متحدہ، دہلی، بنگال اور گجرات میں یہ کارسازی ہونے لگی۔ ہاں مختلف وجوہات کی بنا پر بعض جگہ یہ گرہست ادھوری رہ گئی جیسے بنگال میں، مہاراشٹر اور راجپوتانہ میں، پنجاب اور گجرات میں۔ ان علاقوں کی بولیوں کے مطالعے سے صاف جھلکتا ہے کہ وہاں ریختہ کے جام و مینا تو گڑھ لیے گئے مگر خمہائے میخانہ آرا نہ بن پائے۔ یہ سعادت ہندوستان کے مرکزی دائرے کو نصیب ہوئی جہاں ریختہ کی فنکاری عروج پاکر زبان اُردو کی صنعت جمیل بن گئی۔ اسی حلقۂ رنداں میں بھاشاؤں کا سوم رس مئے شیراز اور خمِ بغداد سے مل کر شراب طہور بن گیا۔ دوسرے خطوں میں یہ نیا خمیر اتنا رسا نہ ہوا۔ ہر دیار کی ملونی الگ الگ تھی پر ہند کے اس دائرۂ خاص میں جو ملونی ہوئی اس کا نشہ ایسا ہو چڑھ کر نہ اترا۔ اسی خاک وسطی کی مٹی سونا اور اکسیر بنی، یہیں کے کنکر ہیرا اور یہیں کے پتھر پارس بن گئے۔ ملاحظہ ہو نقشہ:۔
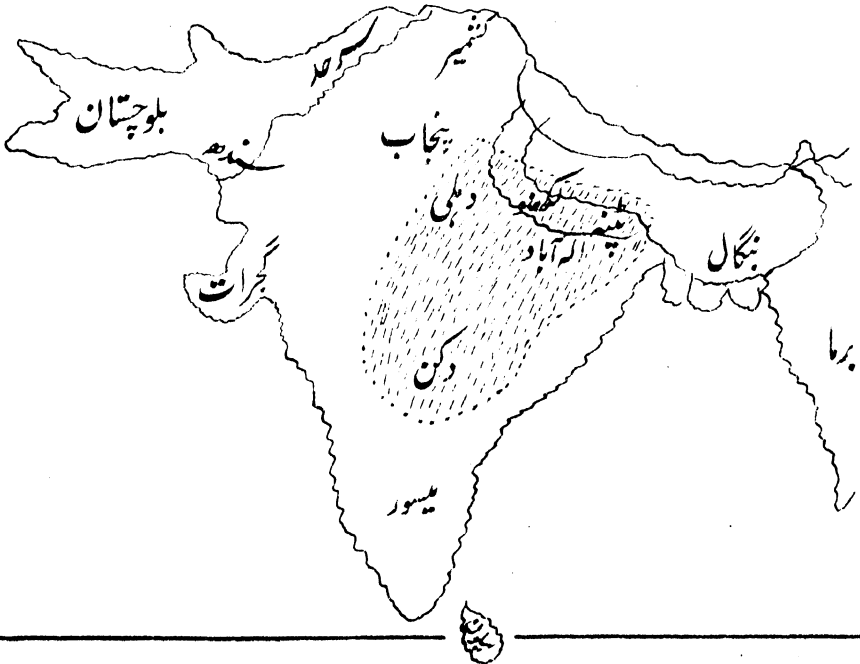
میں اس مختصر مقالے میں اس کے تفصیلی اسبابِ علل سے بحث نہیں کروں گا، بلکہ صرف چند اہم امور پر روشنی ڈال کر اس مسئلہ کو ختم کردوں گا۔

یہ دائرہ جس میں دہلی، صوبہ متحدہ، بہار، دکن اور متوسط ہند داخل ہیں قبل اسلام اور عہد اسلامی میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا۔ یہاں کی ہر شے ملک بھر کے لئے معیار سمجھی جاتی تھی۔ نفسیاتی طور پر سارا ملک اس حلقہ کی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے۔ تیار تھا۔ سیاسی طور پر بھی یہ ذہنی تاثر گہرا تھا اور جذباتی و وجدانی لحاظ سے بھی۔

تین عظیم الشان تحریکیں اسی علاقے سے نکلیں "کرشن تحریک" متھرا اور بندرابن سے "رام تحریک" اجودھیا سے۔ اور "بودھ تحریک" گیا سے۔ برج، اودھ اور مگدھ کے خطے مذکورہ بالا دائرہ کے سرے پر ہیں اور اس دائرہ کا نچلا حصّہ اوپر کے حصّے سے متاثر رہا ہے۔ اور اس نے اوپر کے حصّے کو متاثر بھی کیا ہے۔ رام اور بودھ تحریکات کا اثر تو سیلون تک پہنچ گیا تھا۔

اسوکا کے عہد میں یہ دائرہ ایک سلطنت کے اندر ہی رہا اور اسوکا کے بعد اندھرا ایک مستقل دکنی ریاست بن گیا۔ اسی طرح علاو الدّین خلجی، محمد تغلق، اکبر اور اورنگ زیب کے ماتحت ایک عظیم الشان سلطنت کے اندر یہ دائرہ رہا مگر ان کے علاوہ دکن کی انفرادی حیثیت کو کوئی اور زیر نہ کرسکا۔ قطب شاہی اور عادل شاہی قایم رہی۔ بیجاپور اور گولکنڈا نے سر اٹھایا اور آج بھی نظام دکن کے ہاتھ دکن کی قیادت ہے۔

بہر حال یہ وسطی دائرہ قطب ہندوستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی یہ ماہِ نیم ماہ کی مثال رہا اور گاہ ماہ دونیم کی طرح۔ اس دائرہ کی سیاسی اور ثقافتی سے انکار ناممکن ہے۔ اس کی روایات، کی گہرائی، اس کی تہذیب کا رچاؤ۔ اس کے تمدن کا پھیلاؤ اس کی بولیوں کی ستھرائی مسلم ہے۔

لسانی و ادبی حیثیت سے اسی دائرہ کا ادب اُردو سے قبل بھی ہندوستان گیر اہمیت حاصل کئے ہوئے تھا۔ مہابھارت اور رامائن کے رزمیہ قصے، بودھ کا فلسفۂ عرفان بھگتی تحریک کے شعراء کے گیت سارے ہندوستان میں گونج رہے تھے۔ جب اس حلقہ کی بھاشاؤں سے فارسی اور عربی ملنے لگی تو ریختہ کا وہ پیٹرن پیدا ہوا۔ وہ ترکیب رونما ہوئی جس کے اندر سب "پیٹرن" سے زیادہ ہردل عزیز ہوجانے کی صلاحیت تھی۔ کیونکہ زمین ہی اچھی رچی، سنوری اور ملک بھر میں مقبول تھی۔ جو بیج اس زمین میں بویا گیا

اس سے ایسا درخت پیدا ہوا جس کی چاہت ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر تخمی آم کا پیڑ اچھا اور پسندیدہ ہو تو جو قلم اس میں لگایا جائے گا وہ معمولی تخمی آم میں لگائے ہوئے پیاٹے سے بہتر، مقبول اور اعلیٰ پھل دینے والا ہوگا ۔ فارسی عربی کا پیوند تو ہر دیار کی تخمی بھاشاؤں سے لگا مگر جو قلم برج ، اودھ اور مگدھ میں لگا وہ بہت ہی بارور اور عالمگیر ثابت ہوا ۔

مختصر یہ کہ اُردو کی روایات کی جڑیں ہندوستان کی قدیم ترین ادوار تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ اور اس نے ہر دور میں صحت مندانہ تبدیلیوں کو قبول کیا ہے اور اب جدید ترین مہیجات سے اثر پذیر ہو رہی ہے ۔ اُردو ۔ ڈراوری ، ہند آریائی ، عربی ، ایرانی اور ترکی اقوام کا متحدہ ورثہ اور شراب خانہ ساز ہے ۔ یہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا یعنی ملکی زبان ہے ۔ کسی ایک صوبہ میں یہ پیدا نہیں ہوئی ۔ بلکہ بھارت ماتا کے بطن سے اس کا جنم ہوا ہے ۔

سید اختر احمد اختر اورینوی

ماہنامہ

# معاصر

مدیر: عظیم الدین احمد

دائرۂ ادب، بانکی پور، پٹنہ

# فہرست

| جلد ۴ | دسمبر ۱۹۴۲ء | نمبر ۶ ب |
|---|---|---|




چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ۶/

# اسعد الاخبار آگرہ (۷)

خلاصۂ قانون دیوانی مولفۂ طفیل احمد وکیل محکمۂ صدر دیوانی: ۹۵ میں اس مضمون کا اشتہار ہے کہ مطبع اسعد الاخبار سے اپریل ۱۸۴۹ء تک چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ قیمت قبل انطباع آٹھ اور بعد انطباع دس رُپے۔

خلاصۂ سررشتۂ مال از محمد تقی الٰہ آبادی: ۱۰۴ قیمت جون ۱۸۴۶ء تک عـہ بعد کو عـہ۔

خلاصۂ قوانین دیوانی مسمّی بہ مسائل قوانین مؤلفۂ لالا ایسری پرشاد منصف، لالا چندی پرشاد منصف و لالا نند بہاری نعل وکیل: ۱۳۱ و ۱۳۵ مطبوعۂ مطبع اسعد الاخبار، ضخامت ولایتی کاغذ پر ۲۰ جز قیمت ۵ روپے

۱۴۲: اس مضمون کا اشتہار کہ سید عباس علی منصف سنبھل ضلع مراد آباد نے دو کتابیں فیصلجات صدر کا جو بہ موجب آئین ۱۲ ۱۸۴۳ء لکھے جاتے ہیں ایک خلاصہ .. تیار کیا ہے .. ضخامت .. قریب ۷ جز کے ہوگی اب .. اس کو چھپوایا چاہتے ہیں اور قیمت اس کی ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔"

۱۵۵: مطبع اکبری کی طرف سے اشتہار ہے کہ سید قربان علی وکیل عدالت صدر دیوانی نے قانون دیوانی ترتیب دیا ہے جس میں ڈاک کے قانون کا خلاصہ بھی شامل ہے مطبع مذکور میں چھپے گا۔ ضخامت ۱۲ یا ۱۴ جز قیمت قبل انطباع سے بعد کو للعہ۔

۲۰۴: محمد عبد الکریم کی کتاب بندوبست پرگنہ جات جب مختار ریاست بھوپال کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے مصنف کو سو روپے دیے۔

گلستان: ۱۱۶ و ۱۲۷۔ ایران سے ایک "صاحب جلیل القدر" اس کا ایک صحیح نسخہ مطبوعۂ طہران اپنے ساتھ لائے تھے، مطبع اسعد الاخبار نے اس کی نقل ۱۸۴۷ء میں چھاپنی شروع کی تھی جو نومبر ۱۸۴۹ء میں تمام ہوئی ضخامت بارہ جز، قیمت عـہ ر۔ باوجود اس کے کہ اشتہار میں یہ لکھا تھا کہ قیمت بعد انطباع بڑھ جائے گی، ۱۳۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ جنوری تک یہی قیمت تھی یہ علم نہیں کہ اس کے بعد قیمت میں اضافہ ہوا یا نہیں۔

تفسیر عزیزی مطبوعۂ لکھنؤ ۲۰۵: اس کی قیمت ۱۲ رُپے تھی۔

کتب فارسی مطبوعۂ کلکتہ ۸۹: "اگرچہ سنگین چھاپے کی حسنِ لطافت (کذا) و صفائی واضح ہو مگر خط ان کتابوں کا بھی خوب ہے، اور قیمت ایسی ارزاں ہے کہ چھاپہ سنگین کے نصف سے بھی کم ہے"؛ مجموعۂ نعمت خان عالی مشتمل بر جنگ نامہ و حسن و عشق و وقائع حیدر آباد ۱۲ ر، سہ نثر ظہوری مع مینا بازار و پنج رقعہ ۱۲ ر، توقیعات کسریٰ ۱۲ ر، مجموعہ مشتمل بر میزان منشعب تصریف زبدہ ۸ ر، رقعات عالمگیری ۶ ر، وقائع حیدر آباد ۵ ر، مجموعہ مشتمل بر نحومیر جمل تتمہ خلاصہ مصباح شرح ماۃ عامل ۸ ر۔

تواریخ نبوی: ۹۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر الدین خاں کا ارادہ تھا کہ وہ تاریخ جو اسعد الاخبار میں بہ اقساط شائع ہو رہی تھی۔

بعد اہتمام کتابی شکل میں چھپوائی جائے، اور اس کے دیباچے میں مستقل خریداران اسعد الاخبار کے نام بھی لکھے جائیں تاکہ ان کا نام "ابد الدہر صفحۂ روزگار پر قائم و یادگار رہے" پتا نہیں کہ یہ کتاب چھپی یا نہیں۔ اس تاریخ کی وجہ سے بہت سے لوگ اسعد الاخبار کے پرانے پرچوں کی تلاش میں رہتے تھے، یہاں تک کہ انھیں دوبارہ چھپوانا پڑا تھا۔

پادری جی جی مور مترجم قوانین گورنمنٹ گزٹ آگرہ: ۱۲۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸ ستمبر ۱۸۴۹ء کو ان کی وفات ہوئی انھوں نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ اُن کی جگہ لیڈلی صاحب کے سپرد ہوئی۔ ۱۰۷ میں "جی پی لیڈلی صاحب بہادر مترجم گورنمنٹ گزٹ آگرہ" کی طرف سے اشتہار ہے کہ گورنمنٹ گزٹ کی قیمت ۱۸۵۰ء سے للعہ سالانہ ہے، لیکن یہ تجویز قرار پائی ہے کہ سوائے رخصت اور تقرر عہدہ داران متعہد و غیر متعہد و اشتہارات زائدہ کے نقل گزٹ کی بجنسہ بہ چھاپہ سنگ چھپوا کر فروخت کی جائے اور قیمت فی ماہ آٹھ آنے مقرر کی ہے۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا۔

مولود شریف "مؤلفہ مولوی محمد حیات علی صاحب افضل علمائے فرقۂ امامیہ": ۱۹۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد صفدر علی ولی نے اسے مطبع اسعد الاخبار میں چھپوا کر وقف کر دیا تھا۔

نہر فتح پور سیکری: مسٹر جیکسن کلکٹر و مجسٹریٹ آگرہ نے فتح پور سیکری میں مرزا احسان علی بیگ تحصیل دار کے اہتمام سے ایک نہر جاری کرائی تھی۔ قطعۂ تاریخ نوشتۂ واجد علی خاں ۱۱۴ میں اور مرزا محمد علی منصف فتح پور سیکری اور مرزا غلام زین العابدین عابد اکبر آبادی کے قطعات تاریخ ۱۲۳ میں مندرج ہیں۔ عابد کے قطعۂ تاریخ کی آخری بیت یہ ہے:

"نے سر حرف جیکسن پھر دیکھ     سیل رحمت کی نہر جاری ہے" ۱۲۶۵ھ

قرآن مجید مع ترجمۂ اردو و فارسی: ۱۰۱ اور ۱۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ "عالم العلامہ۔۔ قاضی القضاۃ سید ولایت حسین خاں بہادر" نے مطبع حسینی آگرہ میں قرآن مجید کا ایک نسخہ بڑی تقطیع پر چھپوایا تھا، جس میں "شان نزول" اور "فوائد مولوی عبد القادر" وغیرہ کے علاوہ فارسی اور اردو کے ترجمے شامل تھے۔ اس کی قیمت بعد انطباع صہ مقرر کی گئی تھی۔ اس کا اشتہار فارسی زبان میں "علامۂ زماں مولوی سید محمد بدر الحسن صاحب مسل خواں" کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

اسعد الاخبار میں جو نظمیں شائع ہوئی ہیں، ان میں پنج آہنگ کے منظوم اشتہار کے سوا کوئی قابل اعتنا نہیں اور اس کی اہمیت بھی اس بنا پر نہیں کہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، بلکہ اس سبب سے ہے کہ غالب کی ایک مشہور تصنیف سے اس کا تعلق ہے اور غالباً خود غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ شاعروں سے متعلق جو اطلاعات اس اخبار میں ملتی ہیں وہ محض اتفاقی طور پر ملتی ہیں۔ کتابوں کے بارے میں جو کچھ نقل ہوا ہے وہ زیادہ تر اشتہارات سے ماخوذ ہے۔ یہ خبر نہیں کہ اشتہارات مفت چھپتے تھے یا ان کی اجرت لی جاتی تھی۔ اس زمانے میں پتھر کا چھاپا ٹائپ کے چھاپے سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور لکھنؤ کے مطابع کی فوقیت تسلیم کی جاتی تھی (میرا حوصلہ تو لکھنؤ کے کلام اللہ مطبوعہ کو دیکھ کر پست ہوا جاتا تھا ۱۴۱) کتابوں کی قیمت آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی تھی، لیکن ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں نسبتہً سستی ہوتی تھیں۔ عموماً یہ کوشش کی جاتی تھی کہ قیمت کتاب چھاپے جانے سے قبل ہی وصول کر لی جائے۔ بیشتر کتابوں کے اشتہار میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ بعد انطباع قیمت بڑھا دی جائے گی لیکن ہمیشہ اس پر عمل ہوتا تھا یا نہیں یہ مشتبہ ہے۔

۱۸۵۱-۴۷ء میں آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور اس کی اہمیت آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اس زمانے میں یہاں بہت سے مطابع تھے، اور متعدد اخبار نکلتے تھے؛ جن میں سے کم از کم ایک انگریزی میں تھا۔

قمر الدین خاں ایک لفٹننٹ گورنر کی تعریف میں لکھتے ہیں (۱۲۶) "خصوصاً اہالی مطبع تو ان کے حسن توجہ اور التفات کے ازبس ثنا خواں ہیں اور یہ انھیں کی قدر شناسی کے سبب ہے کہ اس شہر میں کئی مطبع جدید قائم ہوئے ہیں، کیوں کہ ہر ایک مطبع کی چھپی ہوئی کتاب بہ قدر دانی تمام خریدتے ہیں اور اپنے حضور میں طلب فرماتے ہیں، اور جمیع مطابع کے اخبار بھی لیتے اور جناب محمد اسمٰعیل منشی محکمۂ لفٹنٹی سے ان کا خلاصہ کرا کے اپنے حضور منگواتے ہیں"۔

اس زمانے کے آگرہ میں جو مطابع تھے، ان میں سے حسب ذیل کا ذکر اسعد الاخبار میں ہے: مطبع اسعد الاخبار جس میں اسعد الاخبار اور معیار الشعرا چھپتے تھے؛ پہلے پھلتی بازار میں تھا، بعد کو اسی کے متصل دوسری جگہ منتقل ہوا (۱۰۸) اس کی ابتدا ایک کل سے ہوئی تھی، لیکن، اس کی توسیع اس حد تک ہوئی تھی کہ ستمبر ۱۸۴۹ء پانچ کلیں آگئی تھیں (۱۱۹)۔ اس مطبع میں اپنی کتابوں کے علاوہ باہر کی کتابیں بھی چھپتی تھیں اور بقول قمر الدین خاں یہ مطبع "نامور امصار و دیار" اور "دوستوں کو خوشی کا موجب اور دشمنوں کو رشک وحسد کا باعث" تھا۔ مطبع زبدۃ الاخبار، مطبع قطب الاخبار (مطبع قادری کا بھی نام آیا ہے، لیکن غالباً مطبع قطب الاخبار کا دوسرا نام ہے۔ مطبع اکبری، مطبع مصدر النوادر (غالباً آگرہ ہی میں تھا) مطبع جام جمشید غالباً جنوری ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ جاری ہوا، اس کے مالک بابو شیو چند ناتھ تھے جن کا ایک مطبع اسی نام کا میرٹھ میں بھی تھا۔ مطبع حسنی قاضی القضاۃ میر ولایت حسین خان بہادر کے مکان میں تھا۔

ذیل کے اخباروں کے نام تینوں سال کے پرچوں میں ملتے ہیں: اخبار الحقائق وتعلیم الخلائق دہلی اردو اخبار، زبدۃ الاخبار آگرہ، مجمع الاخبار بمبئی، نزہت الارواح و اخبار النواح آگرہ (اوائل ۱۸۴۹ء سے جاری ہوا، مہتمم حکیم جواہر لعل تھے "عجب کیفیت اور لطف وخوبی سے مطبوع ہوتا ہے")، قطب الاخبار آگرہ (اواخر دسمبر ۱۸۴۸ء سے جاری ہوا۔ "اس کے مہتمم منشی محمد امیر خاں ہیں اور وہ بہت شائستگی اور تہذیب سے چھاپا جاتا ہے") آگرہ ۱۸۶۵ء سنیچر، قران السعدین، انگلشمین، جام جمشید میرٹھ ۱۸۶۵ء، دہلی گزٹ۔

۶۵ اور ۱۸۶۶ء کے پرچوں میں: سلطان الاخبار، کلکتہ، عمدۃ الاخبار بریلی، مطلع الاخبار، مفصلات (ایک جگہ معصلیٹ)، انڈین ٹائمس۔

۱۸۶۶ اور ۱۸۶۷ء: کوہ نور لاہور (۲۸ جنوری ۱۸۵۰ء "جنوری... کی چودھویں تاریخ سے... منشی ہرسکھ رائے کے اہتمام سے جو پیشتر جام جمشید میرٹھ کے مہتمم تھے، جاری ہوا ہے۔

از آں جاکہ پنجاب اور کشمیر اور کابل کی خبروں کے اکثر لوگ شائق رہتے ہیں، اب اس اخبار کے ذریعے سے وہاں کے حالات .. بے وقت دریافت ہو جایا کریں گے اور اخبار انگریزی سے ترجمہ نہ کرنا پڑے گا .. مہینے میں چار بار پیر کے روز چھپا کرے گا۔ قیمت ماہ عہ سالیانہ اور بہ رسم اڈوانس (کذا) عہ .. چھ ورق کا اخبار ہوا کرے گا" زبدۃ الاخبار) مالوہ اخبار للعہ ٹیلی گراف اور کوریر بمبئی،

صرف ۱۸۶۵ء : مفتاح الاخبار، فوائد الناظرین، خیر خواہ ہند مرزا پور، رئیس الاخبار مدراس، فرینڈ آف انڈیا، بنارس ریکارڈ، ٹیلی گراف (ایک جگہ تیلیگریف، غالباً بمبئی کا ٹیلی گراف اور کوریر) سپکٹیٹر (اسپکٹیٹرز؟)، اخبار میرٹھ صہ بمبئی ہ اخبار شملہ اخبار

صرف ۱۸۶۶ء : باغ و بہار اعظم الاخبار یعنی، ہندو انٹیلیجنسر، محتشم الاخبار جاورہ (۴ ارجب ۶۶ھ اُن دنوں .. نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر والی جاورہ نے ایک مطبع سنگین قائم اور .. محتشم الاخبار دو ورقہ بہ عبارت فصیح اردو جاری کیا ہے۔ منشی مرزا نصر اللہ بیگ .. مہتمم .. قیمت بارہ روپے سالیانہ) ، ازنگ کرانیکل کلکتہ، انڈین میں ؟ نزہت الاخبار (نزہت الارواح؟) اخبار انگلش؟ ہرکارہ بنگال

۱۸۶۷ء : صادق الاخبار، آفتاب عالم تاب، سٹیزن، دریائے نور لاہور، ہرکارہ، جام جمشید آگرہ (۶ جنوری ۱۸۵۱ء کے پرچے میں اشتہار ہے کہ جنوری ۱۸۵۱ء سے ہر ہفتے سنیچر کے دن زیر اہتمام بابو شیب چندر ناتھ آگرہ سے ۸ صفحوں پر شائع ہوا کریگا۔ قیمت سالانہ پیشگی ۹ روپے)

قاضی عبد الودود

---

ص آگرہ بہ قول دتاسی عہ جس کے نیچے نشان ہے اُس اخبار کے متعلق یا تو علم ہے کہ انگریزی میں تھا یا قیاساً ایسا سمجھا گیا ہے۔ سہ ۲ محرم ۱۲۶۶ھ کے پرچے میں نام آیا ہے۔ یقیناً ۱۲۶۶ھ کے قبل سے وجود میں تھا للعہ سب سے پہلے ۱۰ محرم ۱۲۶۶ھ کو اس کا ذکر آیا ہے۔ یقیناً ۱۲۶۶ھ کے قبل سے وجود میں تھا۔ صہ یہ مشتبہ ہے کہ اس نام کے اخبار تھے، بمبئی اور میرٹھ میں اخبار تھے، لیکن نام کچھ اور ہوگا۔ ہ اسعد الاخبار کے ساتھ اسی تقطیع پر ایک اخبار ۸ صفحوں کا ہے جس کے ابتدائی ۴ صفحے غائب ہیں، اس کے مہتمم کا نام امیر خاں تھا اور یہ مطبع قادری میں طبع ہوا تھا۔ اس کے آخری دو صفحوں میں احمد خاں صوفی کی فارسی غزل، اور ولی اللہ ضیا، رضا علی، ہوش محمد یار خاں، فگار، نایاب، نیاز محمد خاں، شاد وزیر خاں وزیر، ڈاک منشی متخلص بہ حشمتی، لالا چھوٹے لعل کی طرح غزلیں اردو میں ہیں ہ ۱۸۶۷ء میں جو خبر اس اخبار کے حوالے سے درج ہے، اس کے ساتھ یہ تصریح نہیں کہ جام جمشید آگرہ سے ماخوذ ہے یا جام جمشید میرٹھ سے ہ مترجم و محشی قرآن مطبع قادری میں بھی چھپا تھا ۱۵۰۔

# دیوان ہمایوں بادشاہ

(مسلسل)

ہمایوں کی شاعری اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس دور کی فارسی شاعری میں اُسے امتیازی جگہ دی جائے۔ لیکن ان خصوصیتوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمایوں کس مزاج اور طبیعت کا آدمی تھا، اُس نے کن حالات میں تعلیم و تربیت پائی، کن اشغال میں جوانی گذاری، کیسے لوگوں سے اس کی صحبت رہی، اس کے مذہبی عقائد اور روحانی تاثرات کیا تھے، کن حوادث زمانہ سے اُسے واسطہ پڑا اور کس حد تک وہ اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باوجودیکہ اُس دور کے ترک اور مغل امرا اور شہزادے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتے تھے اور اکثر علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے اور بہتوں نے اپنے زمانہ کے حالات پر معتدد تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں، چنانچہ خود تزک بابری اس پر شاہد ہے۔ پھر بھی ہمایوں کی ابتدائی زندگی کے مفصل حالات نہیں ملتے ہیں اور ذوق تلاش تشنہ کام ہی رہتا ہے۔ ہمایوں ۱۵۰۸ء میں کابل میں پیدا ہوا۔ بابر نے ابراہیم لودی پر ۱۵۲۶ء میں فتح پائی اور ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ غرض ہمایوں اپنی پیدائش سے سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک اپنے باپ بابر کی نگرانی میں رہا۔ بابر جیسا تلوار کا دھنی تھا ویسا ہی میدان علم کا شہسوار بھی تھا۔ اس پر لطف یہ ہے کہ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور انکی تعلیم و تربیت میں اسے بڑا اہتمام تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں بیٹھکر ہمایوں کے خطوط کی اصلاحیں دینا اور اس کے لئے غازی خاں میواتی کے کتبخانہ سے کتابیں انتخاب کرنا اور کامران کی تعلیم کے لئے اپنی فقہی تصنیف مثنوی "مبین" بھیجنا اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ ہمایوں بابر کا سب سے بڑا لڑکا اور تخت و تاج کا وارث ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ بابر کو جس قدر محبت ہوتی وہ کم ہو۔ بابر کے حالات زندگی سے اور ہمایوں کے ساتھ اس کے جو تعلقات تھے اُن سے صاف اس بے انتہا محبّت کا اظہار[۵] ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی آخر زندگی کا آخری ناقابل فراموش واقعہ جس میں اس نے ہمایوں کی جان بچانے کے لئے اپنی قربانی پیش کی تاریخ میں شاید اپنی مثال نہیں رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لئے اُس نے کیا کچھ انتظام نہیں کیا ہوگا اور یقین ہے کہ وقت کے

---

[۵] حضرت آکام (بابر) گفتند کہ شما... فرزندان دیگر دارید۔ مرا غم است کہ فرزند یگانہ دارم۔ حضرت (بابر) جواب دادند کہ ماہم اگرچہ فرزندان دیگر دارم اما ہیچ فرزندے برابر ہمایون تو دوست نمی دارم —— ہمایوں نامہ گلبدن بیگم صفحہ ۲۷ - ۲۶ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۹ء۔

بہترین اساتذہ اسکی اتالیقی کے لئے مقرر کئے گئے ہوں گے۔ اور پھر خود بھی اس کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتا ہوگا۔ چونکہ خود صاحب سیف و قلم تھا اس لئے یہ بھی قیاس غلط نہیں ہو سکتا ہے کہ اُس نے جہاں ایک طرف ہمایوں کو علوم و فنون کی تعلیم دلوائی ہوگی وہاں دوسری طرف اُسے فنون سپہگری میں ماہر اور صفات شاہانہ سے متصف بنانے کی بھی کوشش کی ہوگی۔ چنانچہ ہم ہمایوں کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف اسکی ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ اعلیٰ درجہ کا سپہ سالار ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف اعلیٰ درجہ کا شاعر، حکیم فلسفی اور ریاضی نظر آتا ہے۔ ان مسائل سے آئندہ مفصل بحث ہوگی۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمایوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کیسی ہوئی یہ پتا نہیں لگتا ہے کہ ہمایوں نے پہلے کس چیز کی تعلیم پائی اور اس کے ابتدائی اساتذہ کون کون تھے چونکہ اُس زمانہ کی خواتین بھی خاصی تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور خصوصاً ہمایوں کی ماں ماہم بیگم بڑی عالی دماغ عورت تھی ممکن ہے کہ ہمایوں کی ابتدائی تعلیم اُسی کے آغوش سے شروع ہوئی ہو۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ماہم بیگم مذہباً شیعہ تھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر اس کے بنرجی صاحب نے بھی اپنی کتاب ہمایوں بادشاہ[1] میں لکھا ہے کہ ماہم بیگم سلطان حسین باتقرا کی رشتہ دار اور حضرت احمد تربت جام کی نسل سے تھی اور اس لئے وہ شیعہ تھی۔ مگر میرے خیال میں یہ اس کے شیعہ ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس زمانہ میں شیعہ سنیوں میں عام طور پر رشتہ داریاں تھیں۔ پھر حضرت احمد تربت جام ایک مشہور سنی صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ بہرحال اگر وہ شیعہ تھی تو ممکن ہے یہ اسی کا اثر ہو کہ ہمایوں میں بعض لوگوں کو تشیع کے علامات نظر آتے تھے۔ یا کم از کم وہ غالی سنی نہ رہا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بابر گرچہ کھلا سنی تھا مگر اُسے بھی شیعوں سے کوئی تعصب نہیں تھا بلکہ اُس کے تعلقات شیعوں سے بہت اچھے تھے۔ اور اگر کامران کو بھی بابر کا فیض صحبت ہمایوں کی طرح زیادہ دن تک نصیب ہوتا تو شاید اُس کے اندر بھی      میں اتنی عصبیت نہیں پیدا ہوتی۔ ماں کا اثر ہمایوں پر جو کچھ بھی پڑا ہو لیکن باپ کا اثر اس پر بہت نمایاں تھا۔ وہی وسعت مشرب وہی بے تعصبی، وہی روشن خیالی وہی علم دوستی وہی رحمدلی وہی حسن معاشرت، وہی صلۂ رحمی وہی سادگی، وہی آزادہ روی وہی فقر و قناعت وہی شان قلندری اُس کے اندر بھی نظر آتی ہے بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر۔ اگر وہ سپہ گری اور انتظامی صلاحیت میں بابر سے کمتر ہے تو انسانیت اور روحانیت میں اس سے کہیں آگے ہے۔ بابر کو خود اپنے فقر و قلندری پر ناز تھا اور اپنے لئے القاب درویش و قلندر[2] بھی اختیار کئے تھے، لیکن جب اُس نے ہمایوں میں ترک دنیا کی طرف حد سے زیادہ رُجحان دیکھا تو اُسے تنبیہہ[3] کی اور کہا کہ یہ چیز بادشاہوں کے لئے نہیں ہے۔

---

[1] ہمایوں بادشاہ حصہ اول صفحہ ۲ از ایس کے بنرجی [2] تاریخ فرشتہ [3] بابر نامہ

ہمایوں کے دورِ شعور کے اساتذہ میں سے جب وہ عنفوانِ شباب کے پُر بہار ایام کابل کے مرغزاروں میں گذار رہا تھا صرف مولانا مسیح الدین روح اللہ کا نام ملتا ہے[1]۔ اکبر نامہ میں ان کو صرف مولانا روح اللہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں لگتا ہے کہ مولانائے موصوف کس فن کے استاد تھے یا ان کے متعلق عام خدمات اتالیقی سپرد تھیں۔ انھیں ایام میں خبر آئی کہ میرزا خان، والیٔ بدخشاں کا انتقال ہوگیا ہے اور ان کا لڑکا میرزا سلیمان ابھی بچہ ہے۔ اس لئے ہمایوں کو ولایتِ بدخشاں[2] کا نظم و نسق سپرد کرکے اُسے وہاں بھیجدیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کو انتظامِ سلطنت کی تعلیم بھی دی جاچکی تھی اور اسکی عملی مشق بھی اس طرح شروع کرادی گئی۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی مہم میں ہمایوں اپنے باپ کے ساتھ فنون سپہگری و سپہ سالاری کے جوہر دکھا رہا ہے۔ شاہنشاہ ابراہیم لودی کے مقابلہ میں جنگ پانی پت میں ہمایوں بابر کی فوج کے میمنہ کی کمان کر رہا تھا اور رانا سنگا کے مقابلہ میں بھی اس نے اپنی جنگی صلاحیت کا نمایاں ثبوت دیا۔ اس کے بعد اُس نے آگرہ پر قبضہ کیا اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کو مغلوب کرکے اس سے وہ گرانقدر ہیرا حاصل کیا جو بعد کو "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہوا۔ ہمایوں کے دوسرے اساتذہ کے نام شیخ ابوالقاسم استرآبادی مولانا الیاس اور ملا نورالدین ملتے ہیں[3]۔ ان میں سے شیخ ابوالقاسم فن ریاضی کے استاد تھے اور مولانا الیاس فن ہیئت و نجوم کے استاد تھے[4] اور ہمایوں کو ان فنون سے جو ذوق تھا وہ انھی دونوں کے فیضِ نظر کا اثر تھا۔ لیکن ملا نورالدین کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا ہے۔ کہ وہ کس فن کے استاد تھے۔ ملّا کا لفظ اتنا ضرور بتاتا ہے کہ عالم دین ہوں گے۔ اس کا اندازکرنا بھی مشکل ہے کہ ہمایوں کی کس عمر میں وہ اس کے استاد تھے۔ ہاں فنون ہیئت و نجوم چونکہ مشکل فنون ہیں اور ان کے لئے دیگر فنون ریاضی کی کافی مہارت پہلے سے ہونی چاہئے اس لئے مولانا الیاس غالبًا ہمایوں کے سن شعور پر پہنچنے کے بعد معلم ہوئے ہوں گے۔ ہمایوں نے شیخ ابوالقاسم کی شاگردی کافی عُمر میں یعنی اپنی سلطنت کے دوران میں اختیار کی تھی اور انکی خدمات کے صلہ میں انھیں منصب و جاگیر وغیرہ عطا فرمائی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہےکہ وہ زندگی بھر علم کا شائق اور گویا طالب العلم رہا۔ اس مختصر معلومات سے ہمایوں کی تعلیم و تربیت اور اس کی علمی اور ذہنی ارتقا کے متعلق بالکل تشفی نہیں ہوتی ہے۔ مولانا الیاس اور شیخ ابوالقاسم کے تعلق سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ ریاضی علوم و فنون کی طرف اُسے رجحان تھا۔ یہ رجحان کس قدر شدید تھا اور اس میں ہمایوں کو کس قدر غلو تھا۔ اس کی زندگی کے آیندہ

---

[1] قانون ہمایونی از خواندمیر مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص ۲۲ [2] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ص ۱۱ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۹ء ص ۳ [3] تاریخ زبان و ادب فارسی درعہد مغلیہ (انگریزی) جلد ہمایوں ص ۲۹-۲۶ مصنفہ پروفیسر عبدالغنی ناگپور
[4] تاریخ زبان وادب فارسی 〃 〃 〃 〃 ص ۵۳ 〃

واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی بعض نجومی ایجادوں "خرگاہ" اور "بساط نشاط" وغیرہ کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اور چیزیں موقعہ موقعہ سے آیندہ بیان ہوں گی۔

ہمایوں کو جس طرح ظاہری علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کا شوق تھا اسی طرح وہ اپنی روحانی تربیت سے بھی غافل نہیں تھا۔ روحانیت کی طرف اُسے فطری رجحان تھا اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اگر اس کا باپ مانع نہ ہوتا تو شاید وہ ترک سلطنت اور ترک دنیا کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اس کی روحانیت کس نوعیت اور کس درجہ کی تھی اس کے متعلق اُس کے کلام سے کافی مواد ملتا ہے۔ اپنے موقع پر اس کا ذکر کیا جائے گا۔ یہاں صرف ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر اُسے روحانی فیوض وبرکات بزرگان دین سے حاصل ہوئے تو وہ کون کون سے بزرگ تھے اور کس طریقے کے بزرگ تھے۔ تاریخوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے روحانی مقتدا اور ہادی طریقت شیخ بہلول[1] تھے۔ یہ حضرت مشہور شیخ محمد غوث گوالیاری کے بھائی تھے۔ یہ دونوں[2] بھائی شیخ ظہور معروف بہ حاجی حضور کے مرید تھے اور حاجی حضور شیخ ابوالفتح سرمست کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ ابوالفتح سرمست شیخ قاضی منیری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ اور خلیفہ تھے اور شیخ قاضی منیری حضرت شیخ عبداللہ شطار رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ شطار سلسلۂ طیفوریہ سے جو سلسلۂ سہروردیہ کی ایک شاخ ہے تعلق رکھتے تھے۔ شطار کے لفظی معنی تیز رو کے ہیں۔ مگر اصطلاح صوفیہ میں علم الشطار ایک شغل کا نام ہے جس سے فنا فی اللہ کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مغلیہ خاندان کے بادشاہوں اور ان کے متوسلین کو بزرگان منیر سے خاص تعلق رہا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ شیخ بہلول اور شیخ محمد غوث گوالیاری منیر ہی کے سلسلہ میں مرید ہیں۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کا بھی بابر اور ہمایوں پر بہت اثر تھا اور اکبر تو ان کا مرید[3] ہی تھا۔ ابوالفضل نے حضرت مخدوم

---

[1] ہمایوں بادشاہ مرید شیخ بہول (بہلول؟) گشت۔ وتا آنکہ شیخ در قید حیات بود بہ یمن توجہ او ہیچ حادثۂ کونی بہ ہمایوں بادشاہ لاحق نہ گشت۔ چوں در سنہ نہصد وچہل وتنج ہجری مرزا ہندال برادر خورد ہمایوں بادشاہ باغی گشت شیخ را بجہت نصیحت پیش او فرستاد، مرزا مذکور بدلالت بعضے اوباش شیخ بہول (بہلول؟) را شہید گردانید۔ **فقد مات شہیداً** تاریخ اوست۔ از نسخہ خطی مرات الاسرار مصنفہ شیخ عبدالرحمٰن چشتی صفحہ ۴۷۶ حاشیہ یہ نسخہ غالباً قدیم اور معتبر ترین ہے، اس لئے کہ خود مصنف کے ہاتھ کی اصلاح وترمیم سے مزین ہے۔ مصنف شاہجہاں اور اورنگ زیب کے معاصر تھے۔ اس میں شیخ بہلول کو ہر جگہ شیخ بہول لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا نام یا عرف شاید شیخ بہول ہو۔ لیکن دوسرے مصنفین نے انھیں بہلول ہی لکھا ہے۔ مثلاً ہمایوں نامہ گلبدن بیگم مطبوعہ مذکورہ صفحہ ۵۹ میں ہے: "(میرزا ہندال)، ... بندگی شیخ بہلول را بقتل رسانیدند۔

[2] از نسخۂ مرات الاسرار مذکورہ بالا۔

[3] مرات الاسرار مذکورہ صفحہ ۴۷۶۔

شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی نسبت لکھا ہے کہ "باآں خانوادہ نسبت فرزندی دارد" عبدالرحیم خانخاناں اکبر کا مشہور صاحب سیف وقلم سردار حضرت مخدوم شیخ دولت منیری رحمۃ اللہ علیہ کا مرید خاص تھا اور اسی کے ایک متوسل ابراہیم خاں کاکر نے جو حضرت مخدوم مذکور کا خود بھی مرید تھا حضرت کے روضہ کی بے مثل عمارت بنوائی۔ بزرگان منیر کا طریقہ فردوسیہ تھا جو طریقہ سہروردیہ کی ایک شاخ ہے۔ اس سے سلسلۂ طیفوریہ کے متعلق انداز ہوتا ہے کہ اس کا مسلک کیا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ جس سلسلہ نے اکبر اور ابوالفضل جیسے آزاد خیال اہل سیاست اور خانخاناں جیسے سپاہی اور ادیب کو اپنے دامن میں پناہ دی وہ یقیناً تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہمایوں کی نسبت اس سلسلہ سے اسی بنا پر ہوگی کہ وہ خود بھی نہایت فراخ دل وسیع المشرب اور بے تعصب تھا یہاں یہ یاد رکھنا بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ اکبر کی وسیع المشربی کو ہمایوں کی روحانیت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اکبر کی ساری مذہبی تلاش کسی روحانی تزکیہ اور تسکین کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کا واحد مقصد اپنے ذاتی اقتدار کو بڑھانا اور اپنی سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا تھا۔

(باقی)

حافظ شمس الدّین احمد

# بیزاری

اپنے ماحول سے بیزار ہوں میں
کیسی لعنت میں گرفتار ہوں میں

یہ بہاریں، یہ ہوائیں، یہ سرور
یہ جوانی، یہ جوانی کا غرور
ابروؤں میں یہ تبختر کی جھلک
مطمئن آنکھوں میں سویا ہوا نور

پختہ کاروں کا یہ موہوم وقار
نوجوانوں کا یہ بے نام خروش
ان میں ہر ایک کے منہ پر ہے نقاب
جس میں ہیں روح کے دھبے روپوش

یہ محل، عظمتِ رفتہ کے گواہ
گنبد چرخ کو شرماتے ہیں!
کیا یہ ہے میری بصارت کا قصور
اِن میں روزن جو نظر آتے ہیں؟

دل کے رِستے ہوئے زخموں کا علاج
مئے خوں ناب نہیں ہو پاتی
ہونٹ ہلتے ہیں ہنسی میں لیکن
روح شاداب نہیں ہو پاتی

وہی شکوے، وہی نالے، وہی غم
وہی آہیں وہی آہوں کا بھرم
ننھی ننھی سی تمنّاؤں کا جال
تنگ ذہنوں میں وہ محدود خیال

پھول ہیں ہار ہیں تقریریں ہیں
لفظ، چلتی ہوئی شمشیریں ہیں
دیکھنے میں ہے بڑا جوش و خروش
سرد ہیں قلب، نگاہیں خاموش

اپنے ماحول سے بیزار ہوں میں
کیسی لعنت میں گرفتار ہوں میں

آل احمد سُرور

# نئے طرے لقے

جب تک لڑکیوں کا مدرسہ گنجان بستی کے اندر ایک بہت بڑے پھاٹک والے مکان کے اونچے نگر شکستہ حال اسارے پر رہا وہ بڑے اطمینان کا زمانہ تھا پُرانے پھٹے بورے پر چھوٹی بڑی بہت سی لڑکیاں قطار باندھے دیواروں سے پیٹھ لگائے خوب ہل ہل کر گلا پھاڑ پھاڑ کے اپنا سبق یاد کرتیں۔

دو وقت کی پڑھائی، گھر گلزار رہتا کام بھی کتنے نکل جاتے۔ کوئی مصالحہ پیس دیتا، کسی لڑکی سے پانی بھروا لیا اور کوئی کوئی جھاڑو دیدیتیں۔ اور اس کے بدلہ میں دوپہر کو تختی کی لکھائی معاف کردی جاتی پھر کون نہ لکھنے سے جان چُراتا۔ جیم کے دائرے اور شین کے شوشوں کے لئے کتنی ماریں پڑتی تھیں۔

صبح کو تازہ دم مولوی صاحب بڑی قراءت سے قرآن شریف پڑھاتے اور بیچاری لڑکیاں تھپیڑ کھا کھا کر آنسو پونچھتی ہوئی بُدبُداتیں "اللہ کرے ہاتھ سڑے پلو پڑے ے کے میرا کان جھنجھا دیا۔" شام کو بڑا اچھا لگتا گرمیوں میں لڑکیاں صحن میں ٹاٹ پر بیٹھی تختی پر کتابوں کو رکھے جب سارے سبق کو یاد کرلیتیں تو پھر ایک ساتھ چلا چلا کر بڑے مزے میں کہتیں "پورب سے پچھم گیا آفتاب اجازت ملے تو اٹھاؤں کتاب"۔ اور بچارے مولوی ذکی پھر چھٹی دیدیتے۔ مہینے گذرتے سال ختم ہوتا نہ تو کوئی پاس ہوتا اور نہ فیل۔ آٹھ دس روز پر کسی نہ کسی لڑکی کی شروع کرائی ہوتی تو جماعت کی ساری لڑکیوں کو شکر کے لڈو ملتے اور کبھی گڑ کا تلکٹ، اور یہ کسی کا احسان نہ ہوتا سب کے ساتھ یہ تھا۔ جہاں کوئی نئی کتاب آئی یا نیا پارا شروع کیا بس دو چار آنے کی مٹھائی آتی اور چار آٹھ آنے مولوی صاحب کو اور لڑکیاں بڑی خوشی سے مولوی ذکی صاحب کے سامنے سمٹی سمٹی شرمائی ہوئی، اور اوروں کو کنکھیوں سے دیکھتیں۔ ہل ہل کے نئی کتاب کو کھولے مولوی صاحب کے ساتھ آہستہ آہستہ کہتی جاتیں "رب یسر ولا تعسر تمم بالخیر" کتابیں شروع ہو ہو کر ختم ہوتی رہیں مگر لڑکیاں کبھی اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں کہ انھوں نے جو بار بار پڑھا تھا اس کے معنی کیا تھے۔

ہاں تو اسی طرح مولوی صاحب کو ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ مقرر تھا، کہیں سے چاول آجاتے تھے کہیں سے آٹے اور کسی کے یہاں سے گڑ کسی کسی نے ایک روپیہ، آٹھ آنہ مہینہ بھی باندھ دیا تھا اور کہیں سے روزانہ ترکاری ہی آجاتی تھی، ایک تھیں حکیم صاحب کی بیٹی انھوں نے کبھی کچھ نہ دیا بس ہمیشہ مولوی صاحب کے گھر کا قارورہ دکھا کر باپ کے یہاں سے دوا لا دیا کرتیں بچارے

مولوی ذکی کا خاندان بھی کافی بڑا تھا روز ہی کوئی نہ کوئی بیمار رہتا، بیوی اور چھوٹے بچے ہمیشہ کے روگی اور مولوی صاحب کو بھی بڑھاپے میں ہزاروں قسم کی نت نئی شکایتیں لگی رہتیں۔ بچارے اس گاؤں کے اونچے گھرانے سے تھے اور ان کا لڑکپن بڑے آرام سے گذرا تھا جوانی میں فکریں پڑیں مگر بڑی لاپرواہی سے گذاردی گئیں، جب بیوی کے مرنے پر دوسری شادی کی اور بچوں کا خرچ کافی بڑھ گیا، تب چونکے، مگر ساری چیزیں نکل چکی تھیں اُن کے باپ کے بسائے ہوئے کئی گھر آباد تھے، اونچے اور نیچے دونوں ہی گھرانے کے، یہ بچارے سب سے پہلی بیاہتا بیوی کی اولاد تھے۔ ترکہ میں چیزیں تین گھرانوں میں بٹ گئیں، چوتھے گھر کو کسی نے نہ پوچھا، مولوی صاحب کو رہنے کے لئے باہر کا بنگلہ ملا تھا اونچا اسارہ ایک بڑا کمرہ اور ایک کوٹھری بس، اسی میں سارے بچے چھوٹے بڑے سب ہی کسی طرح زندگی گذار رہے تھے، مولوی ذکی بچارے سبق پڑھاتے ہوئے کبھی کبھی لڑکیوں سے اپنے گھر کی باتیں بڑی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بتاتے تھے۔

بس اسی ایک طرح سے مکتب چلتا رہا کتنی لڑکیاں پڑھ پڑھ کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں اور ان کی جگہ ہر روز نئی نئی لڑکیاں آتی رہتیں۔ مولوی صاحب اطمینان سے کبھی سارا سارا دن گھومتے رہتے۔ ان کی لڑکیوں نے سبق دیدیا اور جاؤ چھٹی۔ مولوی صاحب کی خوشامدیں بھی خوب ہوتیں کسی کے گھر سے ذرا سا بگاڑ ہوا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اب اس کی لڑکیاں رہیں سب کی سب جاہل۔ کس کی مجال تھی جو انھیں کچھ کہدے اور مولوی صاحب اکثر یہی کہتے کہ وہ بچیوں کو تعلیم کے ساتھ گھرداری بھی تو سکھا رہے ہیں۔

اتنے بڑے گاؤں میں لڑکیوں کے پڑھنے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا گاؤں کے بلند خیال لوگوں نے اس خیال سے بھی توجہ کی کہ شاید ایک غریب خاندان اس صورت سے جی سکے اور مولوی ذکی کے مکتب کو ضلع کے بورڈ نے منظور کرلیا مولوی صاحب کے خاندان کے ساتھ لڑکیوں کو بھی خوشی تھی انھیں چھوٹے چھوٹے ڈسک ملے تھے اور دیواروں پر کلاسوں کے چٹ لگ گئے تھے اور انھیں یہ بتادیا گیا تھا کہ پہلے کلاس کے بعد جب وہ دوسرے دیوار سے لگے ہوئے چٹ کے نیچے بیٹھینگی تو وہ پہلے سے ایک کلاس اور اونچی ہو جائیں گی۔ پہلے پہل لڑکیاں بڑی باضابطگی سے حاضری بولتی رہیں مگر جب انھوں نے دیکھا کہ بڑی سی بڑی ضرورت سے مجبور ہو کر نہ آنے سے بھی فائن لگتا ہے تو انھیں یہ باتیں اکھرنے لگیں۔ مولوی صاحب کہتے پہلے سے درخواست کیوں نہ دی اور لڑکیاں دل میں کہتیں "جی ہاں۔ ایک ہی دیوار تلے تو رہتے ہیں کیا معلوم نہ تھا"!

بارہ روپیہ مہینہ کے ساتھ بستی سے کچھ پرے دریا کے کنارے ایک خوبصورت سا مدرسہ بھی بن گیا تھا، مولوی ذکی کے دن اب کچھ آرام سے بیت رہے تھے کتنی لڑکیاں ان کے دم

پڑھی لکھی ہوگئی تھیں، وہ کسی کو نہ بھولے تھے سب ہی کو پوچھتے "کون کہاں ہے"؟ کس کس کی شادی ہوئی؟ "کتنے بچے ہیں؟" - اور ان کو اپنے مکتب کی پہلی لڑکیوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی وہ سمجھتے جیسے یہ پودے یہ پھول انہی کی وجہ سے تو لہلہا رہے ہیں، اور اب ان کی اپنی لڑکیاں بھی تو سیانی ہو چکی تھیں ایک تین اتنی لمبی چوڑی دھاکڑ جیسی لڑکیاں، ہر دم ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتیں۔ لیکن جب وہ اپنے تینوں بیٹوں کو دیکھتے تو ایکدم سے ان کی نظر اپنے بڑے لڑکے کے بے طرح بڑھتے ہوئے ہاتھ پاؤں پر پھسلتی وہ خوش ہوتے "اب یہ کمائے گا" اور پھر ان کی نگاہیں اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے بیٹوں پر جاتیں تو ان کا جی چاہتا کہ وہ انھیں کسی طرح جلدی سے کھینچ کر اتنا بڑا کر دیں کہ پھر وہ اپنے بیٹوں کی کمائی اطمینان سے بیٹھ کر کھا سکیں۔ وہ ایک طرح پندرہ برس سے پڑھاتے پڑھاتے تھک گئے تھے، بڑھاپے کی کمزور اور چڑچڑی آنکھیں ایک ہی طرح کی کتابیں پڑھاتے ہوئے بیزار سی ہو گئی تھیں۔ کئی کتابیں تو ایسی تھیں جو انہیں پوری کی پوری زبانی یاد ہو گئی تھیں۔

زندگی میں سب سے کٹھن دن ان کے لئے وہی تھا جب پہلے پہل مدرسہ کے ملاحظہ کے لئے انسپکٹرس آ رہی تھیں۔ دیہات کی لڑکیاں گھر کے دھندے اور چھوٹے بھائی بہنوں کی ساری ذمہ داریاں۔ جب تک مدرسہ بستی میں کچھ نہ تھا، ضرورت پڑی آواز دیکر پکار لیا یا آدمی بھیج کر گھڑی دو گھڑی بھر کے لئے بلا بھیجا۔ ایک دو کام کر کے ننھے کو بغل میں دبائے آ پہونچیں، دم بھر کسی دوسرے کو بچہ تھما کر سبق لینے چلے گئے پھر ساتھ بٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر اب دیہات کی گلیوں میں چلتے چلتے ٹھہر کر سرگوشیاں ہونے لگ گئی تھیں۔ سیانی سیانی لڑکیاں بھلا اتنا دور جائیں گی پڑھنے؟ رفتہ رفتہ مدرسہ کی سیٹیں خالی ہونے لگیں۔ کسی کی ماں بیمار تھی، کہیں مہمان آئے ہوئے تھے، اور کسی کے کام پڑے تھے۔ انسپکٹرس کے آنے کے روز بچارے مولوی ذکی گھر گھر سے لڑکیوں کو جا کر اپنے ساتھ لاتے، ایک دو سبق اپنے اطمینان کے لئے بھی سُن لیا لڑکیاں کافی بھول چکی تھیں مولوی صاحب کی لڑکیوں نے بڑی محنت سے انھیں کچھ یاد کرایا، ہر ہر جگہ کی صفائی کرائی گئی، کرسیاں میز سب جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیے گئے تھے اور رجسٹر میں جگہ جگہ سے حاضری بنا دی گئی۔ شہر سے موٹر میں انسپکٹرس آئی لڑکے دوڑ پڑے "ہوا گاڑی ہوا گاڑی" اور یہاں موٹر کے انجن کی طرح مولوی صاحب کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ رجسٹر کچھ دیکھے اور کچھ پٹکے گئے اور جب لڑکیوں کو امتحان کے لئے پڑھنے کو کہا گیا تو ساری لڑکیاں لیڈی انسپکٹرس کو ٹُک ٹُک تکتی رہیں کتابیں سب کے سامنے کھلی ہوئی پڑی تھیں لیکن معصوم اور متحیر نگاہیں اپنے سے ایک عجیب اُجلی اور لال شکل پر جمی ہوئی تھیں۔ لکھنے کو جب کہا گیا تو قلم جیسے ہاتھوں میں جم کر رہ گئے۔ کنارے بیٹھی ہوئی لڑکیاں ایک دوسری کے کانوں میں جھک جھک کر چپکے چپکے سے

کہہ رہی تھیں" ارے میم ہے رے میم"۔ پہلے کبھی دیکھے بھی تھا کہیں ؟ بچارے ذکی ایک مجرم کی طرح خاموش کھڑے تھے، پندرہ برس میں آج کتنی مصیبتوں کا یہ دن تھا، ان کے لئے۔ انسپکٹرس لڑکیو سے مایوس ہوکر بولی" مفت کے روپے پاتے تم، ساری لڑکیاں تو بستی کی پکڑ کر لائی گئی ہیں"۔ کئی دنوں تک چرچا رہا مدرسہ ٹوٹ رہا ہے اور بچارے ذکی کانپ جاتے کھانے کا یہی تو ایک سہارا ہے۔ پھر کیا ہوگا۔ ؟ مگر کبھی کبھی گھبرا کر ان کا دل بھی چاہتا کہ ٹوٹ بھی جائے یہ مدرسہ۔ آخر پہلے کیا تھا" مگر جب اتنے بچے تو نہ تھے اور پھر وہ چپ ہو جاتے۔

مدرسہ ٹوٹا نہیں لیکن ٹوٹنے کی دھمکی بڈھے ذکی کی زندگی کو اجیرن کئے ہوئے تھی، برس دو برس پر انسپکٹرس کی ڈانٹ اور رجسٹر کے پٹکے جانے کے وہ عادی ہوگئے تھے۔ گاؤں کے بااثر لوگوں نے بچارے ذکی کا مدرسہ ٹوٹنے سے بچا دیا تھا اور انسپکٹرس کو بھی ان کی حالت کا کچھ احساس تھا، مگر سب سے زیادہ بچارے ذکی کو یہ باتیں بڑی اذیت پہنچا رہی تھیں کہ مدرسہ کی سیٹیں روز بہ روز خالی ہوتی جا رہی تھیں آخر اسی گاؤں کی اتنی لڑکیوں کو انہی نے پڑھا لکھا کر آدمی بنایا تھا، پھر اب انھیں ستانے کے لئے یہ گھڑی گھڑی رپورٹ کیوں ہونے لگی تھی کہ پڑھائی ٹھیک سے نہیں ہوتی، وہ ان باتوں سے پہلے ڈر رہے تھے۔ اور یہ انہی کا جی جانتا تھا کہ کمر کے درد سے بھی پریشان رہ کر وہ کتنی مشکلوں سے لاٹھی کے سہارے مدرسہ جاتے رہے، پھر پڑھانے میں بھی کبھی کوتاہی نہ کی۔ ان کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی تھی مگر تب بھی دونوں وقت اپنی کسی لڑکی کے سہارے رک رک کر مگر پڑھاتے ہی رہے۔ لیکن بچارے اپنی مخالفتوں کے آگے کچھ زیادہ دنوں تک ٹھہر نہ سکے، آخر انھیں ٹنا ہی پڑا ضلع کے بورڈ کا یہ حکم تھا۔

اور اب مولوی ذکی کی جگہ ان کی بڑی لڑکی پڑھانے لگی، پہلے پہل لڑکیاں تالی بجا کر خوب ہنسیں" استانی جی استانی جی" لیکن رفتہ رفتہ رہی سہی لڑکیاں بھی اسٹرائک کر گئیں، دو چار تھیں جنہیں مشکلوں سے سمجھا کر روکا گیا تھا، جوان لڑکی اس پر کنواری بستی سے باہر مدرسہ میں جا کر کیسے اکیلی پڑھاتی، بچاری ماں جس کا بچپن پڑھنے لکھنے کی الجھنوں سے دور بڑا معصوم گذرا تھا۔ اپنے بیمار، روتے بلبلاتے بچوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اس کے ساتھ سایہ کی طرح لگی رہتی اسے خیال تھا "غریبوں کی دنیا بڑی خراب اور بے حد تنگ ہے ابھی کیا کچھ ہو، کون جانے"۔ ماں بیٹی کا دن کبھی کبھی ایسا بھی گذر جاتا کہ سنسان مدرسہ کی خالی بنچوں پر پڑی رہتیں۔

بس ایسے ہی مہینے اور سال ختم ہوتے گئے، اور وقت کے ساتھ ساتھ منی آرڈر کا انتظار بھی طول کھینچتا چلا گیا۔ یہ تو ہمیشہ ہی سے تھا کہ روپے کے آنے میں ایک دو مہینے دیر ہوگئی، بستی کے بنیوں سے ادھار لے لیتے، آخر گاؤں کے بنئے تھے بک جھک کر دے ہی دیتے تھے بستی میں

روپے آنے اور نہ آنے کی کیسے خبر نہیں رہتی مگر اب تو جیسے حد ہوگئی تھی، تنخواہ پہلے سے آدھی ہوکر بھی چھ چھ اور آٹھ آٹھ مہینے تک روپے نہ ملتے تھے۔ ضلع کے بورڈ کا انتظام بگڑ چکا تھا غریبوں کے حمایتی دیسی ٹھیکہ داروں کے جب بھوکے بچّوں کے پیٹ بھر چکے تھے تو پھر وہ دوسروں کی بھوک اور نحیف پیٹھوں کو بھول گئے تھے۔ ادھار۔ قرض اور فاقہ۔ یہ تو روز ہی کی باتیں تھیں کپڑوں میں پہلے سے کئی گُنے زیادہ پیوند لگنے لگے تھے، چولھا کبھی جلتا اور کبھی نہیں۔ بچّے بھی سمجھ گئے تھے دنیا میں بس یہی تو ہوتا ہے بھوک لگے مگر کھانا نہ ملے۔"

بڈھے ذکی کے بیکاری کے دن کسی طرح گذر ہی رہے تھے وقتوں پر نمازیں پڑھتے اور اس کے بعد جھلنگی پلنگ پر چت لیٹے ہوئے تسبیح کے دانوں کو گھماتے اور کبھی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے ملاتے اور بجاتے رہتے تھے۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ اب آرام کے دن آرہے ہیں، وہ لیٹے لیٹے سوچتے رہتے اپنے لڑکے کی کمائی سے پہلے ان لڑکیوں کو بیاہ دینگے اس کے بعد گھر بنانا ہے گا" ایسے ہی وہ سارا سارا دن ہوائی قلعہ بناتے رہتے۔ مگر ان کی اُمید ان کی زندگی کی روشنی کا آخری سہارا' جیسے یکا یک وہ ٹھونس گئے جوان بیٹے کی پانی سے پھولی ہوئی لاش دیکھکر وہ مہینوں گھر سے باہر نہ نکلے۔ اور جب مہینوں بعد وہ اپنے منجھلے لڑکے کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں اور سوکھے ہوئے ہاتھوں کے سہارے باہر آنے جانے لگے تو پھر انھیں موہوم سی آس بندھی "مرنا جینا تو ہوتا ہی رہتا ہے"۔ وہ اب پھر زور زور سے بُد بُدا کر تیز تیز تسبیح کے دانوں کو کھٹ کھٹانے لگے۔ انھیں سلیم بہت عزیز ہوگیا تھا وہ اسکی تھوڑی تھوڑی سی باتوں کا خیال رکھتے انھوں نے سوچا تھا" اتنے دنوں سے سلیم کالے پینٹ کے لئے دق کر رہا ہے اس دفعہ روپیہ ملنے پر منگا دینگے۔ مگر بخار میں ۔۔۔"کو دھفتا ہوا" کا لا پینٹ" کرتا ہوا سلیم ہمیشہ کے لئے چپ ہوگیا۔ آندھی جھکڑ اور طوفان میں چند کھوکھلی جڑیں قائم نہ رہ سکیں۔ ان کی راتیں اور دن ویسے ہی رہیں، مگر اب آنکھوں میں گذری ہوئی چند تصویریں' لبوں پر نالے کچھ آنسو بھی تھے اور دلوں میں پُرخوف شکوے۔

بڑھاپے۔ غم۔ آنسو اور روز کے فاقوں نے بچارے ذکی کی آنکھوں کو بیکار کردیا تھا سال بھر میں ایک دو بار دو تین مہینے کی تنخواہیں باقی رکھ کر کچھ روپے مل جاتے تھے مگر کتنے تیز اڑنے والے ہوتے تھے وہ روپے بھی' ادھر آئے اُدھر غائب' قرض ادھار۔ سود سب ہی تھا تھا اور اس پر یہ جنگ کی گرانی۔ روپے کے چار سیر چاول، کیا ہوسکتا تھا' خیر اتنا تو ضرور ہوتا کہ کچھ دنوں تک ادھار لینے میں پریشانی نہ ہوتی تھی،

آخر کئی مہینے پیسہ پیسہ کاٹ کر بڑی مشکلوں سے مولوی ذکی نے جمع کر لیا تھا کہ وہ

شہر جاکر خیراتی ہسپتال میں اپنی آنکھیں بنوا سکیں۔ گھر کی مصیبتیں تو روز کی تھیں اور اب اس بورڈ کا بھی کیا آسرا تھا۔ جانے کب یکدم سے روپیہ دینا بند کر دے۔ بورڈ کو پھر اس کی کیا پڑی تھی؟ کہاں سے وہ بچارے اتنا روپیہ لاتے کہ اس کے حکم سے اپنی لڑکی کو مڈل تک پڑھاتے۔ کنواری لڑکی روپیہ اور مڈل کی سرٹیفکٹ، جب وہ سوچتے تو ان کا سر گھوم جاتا اور اب شاید آنکھیں بنوا کر وہ پہلے کی طرح گھر بیٹھے کچھ کر سکتے تھے۔

ان کا ننھا بیٹا جب ان کی سفید داڑھی سے کھیلتا ہوا زور سے ہنستا تو ذکی کو محسوس ہوتا جیسے وہ ان کی کبھی کے خواب ہائے رنگین پر ہنس رہا ہو اور جب ان کی نگاہوں کے سامنے کبھی کبھی پہاڑ جیسی تینوں لڑکیاں گھومتیں تو ان کا جی چاہتا کہ ان کے ساتھ وہ اپنا سر بھی دیوار سے ٹکرا لیں پھر ان سے زیادہ انھیں دنیا پر غصہ آتا بڑی تہذیب یافتہ بنی ہے دنیا، آٹوں کے میل، چاول چھاننے کے کل، سنگر مشین، ہر چیز کی کلیں، ہر طرح کی مشینیں منٹوں میں کام ختم۔ مگر تم غریب اپنا سر پھوڑ لو۔ مر جاؤ"۔

لمحے گھنٹے روز اور مہینے جونک کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ آنکھیں سردیوں میں بنتی ہیں اور اب جاڑا ختم ہو رہا تھا روز ہی روپے کا انتظار تھا اور گرانی میں کوئی قرض بھی نہ دیتا'۔ گھر رہ کر قرض اور بڑھتا ہی جا رہا تھا آخر مولوی ذکی اپنی بیوی اور چھوٹے لڑکے کو ساتھ لے کر جانے لگے۔ ان کے پاس آنے اور جانے کے کرایوں کے لئے روپے تھے انھیں موٹر، ریل اور رکشوں میں اپنے اتنے مشکلوں سے جمع کئے ہوئے روپے دینے کے خیال سے بڑا افسوس ہونے لگتا، لیکن پھر ان ہی پیسوں سے ان کا مستقبل بھی تو روشن نظر آتا تھا۔

ان کی بیوی جاتے وقت مسلسل آنسو بہا رہی تھیں اور جب مولوی ذکی اپنے بڑے سے پھاٹک کے سامنے موٹر پر سوار ہونے لگے تو انھوں نے گھوم کر پیچھے اپنی تینوں مغموم لڑکیوں کو دیکھا انھیں ایسا لگا جیسے وہ خود غربت اور یاس کے جبڑوں سے نکل کر بھاگتے جا رہے ہیں۔ اور بند ہوتے ہوئے شکستہ حال پھاٹک کے زنگ آلود قلابوں کی زور دار کڑکڑاہٹیں سن کر بڈھے ذکی نے موٹر پر بیٹھے بیٹھے یہ محسوس کیا کہ بھوک اور فاقوں کے نوکیلے خوفناک دانت ان کی تینوں پہاڑ جیسی بیٹیوں کو چبا رہے ہیں کڑ کڑ کڑ ـــــــ! مگر اپنے دل کے تسکین کی خاطر انھوں نے چلتی ہوئی موٹر سے جھک کر پکارتے ہوئے کہا" بس آج کل میں روپے آجائیں گے ہاتھ دبا کر خرچ کرنا"۔

مدرسے کے گھنٹے ختم ہو جاتے پھر خاموش دن اور تاریک راتیں پہلے سے زیادہ بھیانک طور پر گذرنے لگیں کبھی ایک آدھ وقت کچھ کھا کر اور کبھی مسلسل فاقے، ماں نے ان کے لئے جتنا سنجوگ کر رکھا تھا وہ سارا ختم ہو چکا تھا، بستی کے اندر ایک ہی آنگن میں کئی کھڑکیاں کھولتے ہوئے بھی لوگ

جانتے تھے کہ تین بے زبان لڑکیاں بے تھاہ پڑی ہیں، مگر روز روز کون دے سکتا تھا؟ کئی کئی دن ایسے بھی گذر جاتے کہ تینوں بہنیں بھوک سے نڈھال ہو کر بیٹھی ہوئی لحاف میں ایک ہی ساتھ گھس کر سو رہتیں مگر پھر صبح کی کرنیں انکی آنتوں میں تیز تیز نشتر چبھانے لگتیں۔ پانی کے چند گھونٹ اور آنگن کے کچّے پکے بیر۔ انھیں کچھ دیر کے لئے تسکین دے دیتے تھے۔

بھوک میں شرافت کو نباہنا بھی کتنا کٹھن ہے کسی کو کھاتے ہوئے دیکھو اور ہٹ جاؤ مانگنے پر ڈانٹ ڈپٹ کر کہیں تو کچھ مل جاتا ہے مگر شرافت میں نہ مانگنے پر سوکھا ہوا نحیف چہرہ دیکھتے ہوئے بھی کوئی نہ پوچھتا۔ دن گذرتے ہی رہے اور روپیہ کا شدید انتظار ختم نہ ہوا۔ بل کبھی کا بھیجا جا چکا تھا، مسلسل آٹھ مہینوں سے انتظار کی جانگسل گھڑیاں دراز ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈاکئے کی آواز سن کر آخر ایک روز تینوں بہنیں بے تحاشا پھاٹک کی طرف دوڑتی ہوئی گئیں مگر انکی آنکھوں میں اندھیرے چھانے لگے روپیہ کی جگہ ان کے ہاتھوں میں ایک کارڈ تھا۔ بڈھے ذکی نے لکھا تھا" میرے آنکھوں کی سرخیاں کسی صورت سے نہیں جا رہی ہیں ہفتے ہوگئے دواؤں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان سرخیوں کے رہتے ہوئے۔ ڈاکٹر اپریشن کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم ایک دو دنوں میں آ رہے ہیں۔

دو دنوں سے لگاتار فاقے برداشت سے باہر تھے۔ بڑی بہن سے چھوٹوں کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اپنے مکان کے نزدیک قریب قریب ہر گھر سے وہ کچھ نہ کچھ قرض لے چکی تھی مصیبتیں تو روز کی تھیں پھر بھی اس کے قدم انہی گھروں کی طرف بڑھنا چاہ رہے تھے مگر اس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کو زمین میں گاڑ لیا۔ کہاں تک وہ ہر گھڑی بے حیا بنتی۔ اس ناامیدی میں یکایک اپنے موٹی موٹی کھردری انگلیوں میں پھنسی ہوئی انگوٹھی پر اس کی نظر پڑی وہ بے اختیار مسکرا پڑی جیسے یک بیک منی آرڈر سے آئے ہوئے سفید سفید روپے اور چکنے چکنے نوٹوں سے اسکے ہاتھ بھر گئے ہوں۔ اس نے انگلیوں اور اپنے دانتوں سے بُری طرح کھینچ کر مشکلوں سے انگوٹھی اتار دی۔ بڑی بہن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ چولہے میں آگ جلا کر تینوں بہنیں ایک ساتھ بیٹھ رہیں دو دنوں پر گھر میں رونق سی لگ رہی تھی، شعلے لہک رہے تھے اور مٹی کی ہانڈی میں چاول کے اُبلنے کی بھد بھد آواز سے ان کے دلوں میں خوشی ناچ رہی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن دوکان سے آئے ہوئے اخبار کے ردّی ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھتی ہوئی بولی" نوری باجی دیکھو تو پانی کے اندر کشتیوں میں آگ کیسے لگ گئی ہے"؟ بڑی بہن نے کاغذ کو زمین پر بچھاتے ہوئے بتایا" یہ کشتیاں نہیں ہیں، سنو جہاز ہیں جہاز' بہت بڑے بڑے سمجھیں؟ اس گھر سے بھی بڑے، سب بہنیں اس پر جھک پڑیں ... ہو صدد؟ نوری نے منجھلی بہن کو متوجہ دیکھ کر کہا" ارے یہ جنگ ہو رہی ہے، ایک کا

دشمن ایک ہوتا ہے نا۔ بس جہاں اپنے مخالف دشمن کا فوجوں اور سامانوں سے بھرا ہوا جہاز دیکھ لیا اوپر ہوائی جہاز سے آگ لگانے والے گولے برسانے لگتے ہیں" تب ! ثوری باجی پھر کیا ہو جاتا ہے ؟" "پھر ! جہاں کہیں نشانے پر گولے لگے بس آگ لگ جاتی ہے، دیکھو ایسے ہی یہ بیچارہ جہاز جل رہا ہے" وہ غور سے روی اخبار کے ٹکڑے کو دیکھنے لگیں۔ "تو باجی ! سب جل جاتا ہے سب ؟" "ہاں شنو، سارے لوگ اور لاکھوں روپے کی چیزیں، یہی جنگ کی چیزیں بندوق توپ آدمیوں کی فوج اور بولے بولے غلّوں سے لدے ہوئے جہاز"۔ شنو ابلتے ہوئے بھات کو للچاتی نظروں سے دیکھتی اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "کیا کیا رہتے ہونگے بوروں میں ایں ثوری باجی ؟ چاول آٹا سب ہی کچھ ؟" - "یہی ایک چیز رہتی ہے پگلی ! انڈے، گھی، مکھن، گوشت، مچھلی سب ہی چیزیں" ۔ اس وقت شنو کو اسلحوں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے جلتے ہوئے جہازوں کی پرواہ نہ تھی مرنے کی تکلیف سے کہیں زیادہ زندگی میں [illegible] اس کے پیٹ میں اینٹھی جا رہی تھیں۔ "تو یہ کھانے کی چیزیں جلا کیوں دیتے ہیں باجی ؟" "ہاں جیسے دیدیں تمہیں کھانے کو"۔ "تو کھانے کی چیزیں جلا کر انھیں کیا ملتا ہوگا۔ اور وہ جو ان بچارے اتنے آدمیوں کو جان سے مار جو دیتے ہیں"۔ "مگر وہ آدمی سب بھی تو دوسروں کو مارتے ہیں۔ لیکن یہ غلّے بچارے۔ یہ کیا کرتے ہیں ان کا"۔ "ثوری باجی کتنا دن چلتا یہ غلہ سب گھر بھر جاتا نہ اس سے ؟ کبھی بھی نہ گھٹتا، مگر اب سب جل رہا ہے بچارہ۔ شنو کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

"یہ جنگ ہے شنو جنگ" ثوری نے بجھتے ہوئے چولھے کو کاغذ کے اُس ٹکڑے سے سلگاتے ہوئے کہا، کاغذ بھک سے جل کر بجھ گیا، چولھے کے سُرخ شعلوں کے آگے تینوں بہن سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔

شکیلہ اختر

# قیدی

ابتدائے گرما کا یہ ایک حسین دن تھا۔ ہم لندن کے ایک باغ میں بیٹھے تھے۔ طیور نے نغمۂ بہار بند نہیں کئے تھے اور نہ خزاں نے درختوں کی گود سے بہار کے آخری پھول چھینے تھے کہ ہمارے دوست نے اچانک کہنا شروع کیا۔ "ارے! یہ تو فاختہ ہے"

وہاں پرندوں کی کمی نہ تھی، شاما تھی، مینا تھی۔ ابابیل تھی۔ رات کے وقت اُلّو بھی تھا اور رکوملبس کی طرح کوئل اس شاداب جزیرہ کو کنٹ اور سسکر کی سرزمین سمجھ کر ہر سال آجاتی تھی لیکن فاختہ کا تو یہ سسکر سے مسکن ہی نہ تھا۔ "وہ سامنے میں اس کی آواز سن رہا ہوں" اس نے دوبارہ کہا اور سامنے مکان کی طرف چلا۔ پھر وہ واپس آیا اور ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ نے ایک قفس بند چڑیا رکھ چھوڑی ہے"۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑا کہ ہمارے باورچی نے ایک قمری پال رکھی ہے۔ "بیوقوف کہیں کا!" بس اُس نے اتنا ہی کہا۔ اُس کے اندر کچھ شدید جذبات پیدا ہو گئے تھے جنہیں ہم میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ پھر ایک دفعہ ہی وہ ابل پڑا میں کسی کو مقید نہیں دیکھ سکتا، چاہے وہ جانور ہوں، پرند ہوں یا انسان۔ میں انکو دیکھنے یا سننے ہی کے خیال سے نفرت کرتا ہوں"۔ ہم لوگوں کو اس نے تیز نظروں سے دیکھا جیسے ہمیں نے یہ اعتراف کرایا ہو۔ اور فوراً ہی کہنا شروع کیا۔ "کچھ زمانہ کی بات ہے جب میں اپنے ایک دوست کے ساتھ جو سماجی تعلقات پر تحقیقات کر رہے تھے جرمنی کے ایک شہر میں مقیم تھا۔ ایکدن اُس نے مجھے اپنے ساتھ جیل کی طرف چلنے کو کہا۔ اسوقت میں نے کبھی جیل دیکھا نہ تھا اس لئے تیار ہو گیا۔ بس وہ دن ایسا ہی تھا جیسے کہ آج کا ہے آسمان بالکل صاف تھا۔ ہر چیز پر ایک خنک رقصاں دمک طاری تھی جیسا کہ جرمنی کے بعض حصوں کا خاصہ ہے یہ قید خانہ شہر کے بیچ میں تھا اور اس کی شکل اس ستارہ جیسی تھی جو پینٹو ولی کے نقشہ کے مطابق تیار کیا گیا ہو انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ طریقہ وہی تھا جو بہت عرصہ پہلے آپ نے یہاں رائج دیکھا ہو گا۔ اس زمانہ میں جرمن اپنے مجرموں کو مکمل قید تنہائی میں رکھنے پر سختی سے پابند تھے اور ابتک ہیں لیکن اُن دنوں وہ ایک نیا کھلونا تھا اور دیوانگی کی حدتک وہ اُس سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو جرمنوں کی خاص علامت ہے میں اُس قید کی حالت کو بیان کرنے کی تاب نہیں رکھتا اور نہ یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا۔ اتنے خوفناک طریقہ پر جو ادارہ چلایا جا سکتا ہو اس کی خوفناکی کا کیا پوچھنا۔ یہ ضرور ہے کہ انتظامات اچھے تھے اور نگراں نے ہر جگہ ہم پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ میں صرف ایک بات کہوں گا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا اور یہ اس لئے کہ اس قید نے قید ابدی کی ایک عجیب تمثیل پیش کی۔ چاہے یہ قید انسان

کے لئے ہو یا حیوان کے لئے۔ چھوٹے کے لئے ہو یا بڑے کے لئے۔" ہمارا دوست اِک ذرا رُک گیا۔ پھر اُس کی آواز میں کچھ ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی جیسے کہ اُسے اپنی طبعی خامشی کو صدمہ پہونچنے کا احساس ہوا ہو۔ اُس نے اپنی گفتگو جاری رکھی "جب ہملوگ اس عجیب و غریب جگہ کے ہر حصہ کا چکّر لگا چکے تو نگراں نے ہمارے دوست سے دریافت کیا کہ وہ دو ایک دائمی قیدیوں کو بھی دیکھنا پسند کریں گے؟ میں آپ کو ایک ایسا قیدی دکھاؤں گا جو یہاں ستائیس سال سے مقید ہے۔ اس کے الفاظ اچھی طرح مجھے یاد ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ وہ قیدی اپنی مدت قید سے ذرا گھبرایا ہوا ہے۔ سمجھتے آپ؟ ہملوگ اُس قیدی کے محبس کی طرف چل پڑے رستہ میں انھوں نے ہمیں اسکی داستان سنائی۔ وہ ایک الماری کے تاجر کا مددگار تھا اور نفر بیٹا لڑکپن ہی میں اپنے آقا کو لوٹنے کے لئے اُس نے چوروں کی ایک جماعت کا ساتھ پکڑ لیا۔ چوری کرتے ہوئے وہ گھبرا گیا اور اس گھبراہٹ میں اپنے آقا کو ایسی کاری ضرب لگائی جس سے وہ چل بسا۔ اسے سزائے موت ملی پر کسی شاہی ہستی کے ادعا سے یہ سزا دائمی قید کی سزا سے بدل دی گئی کیونکہ یہ معزز ہستی جنگِ شیڈووا کے کشت و خون کو دیکھکر بہت پریشان تھی۔ جب ہم اسکی تنگ کوٹھری میں داخل ہوئے تو وہ چُپ چاپ کھڑا اپنی محنت کے مرکز کو گھور رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں ساٹھ سال کا بڈھا معلوم ہوتا تھا، حالانکہ اس کی عمر صرف چھیالیس سال تھی۔ ایک خمیدہ کانپتا ہوا برباد انسان بدرنگ لباس میں سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ تمام قیدیوں کے چہروں کیطرح اڑا ہوا تھا اور اس کی ساخت بھی اُن ہی لوگوں جیسی تھی۔ اس کی شکل میں کوئی خط و خال ہی نہ تھا۔ گال دھنسے ہوئے تھے۔ اسکی بڑی بڑی آنکھیں ماضی کی طرف لوٹتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اگر کوئی رنگ تھا بھی تو وہ مجھے یاد نہیں۔ آہنی دروازہ سے گذر کر ہملوگ اس کے کمرے میں ایک ایک کرکے پہونچ گئے۔ ہمارے آتے ہی اُس نے اپنی اڑے ہوئے رنگ والی ٹوپی اتار لی۔ اس کے گرد کی ہر چیز بے رنگ تھی۔ اس کا سر گرد آلود اور گنجا تھا اور اس کے آخری حصہ پر صرف چند مختصر بھورے بال تھے۔ وہ چوکس کھڑا ہمیں بیچارگی سے گھور رہا تھا۔ اس کی شکل اسوقت ایک اُلّو کی تھی جو دن کی روشنی سے اچنبھے میں آگیا ہو۔ کیا آپنے کسی بچّے کو پہلی دفعہ بیمار دیکھا ہے اور اپنی بیماری پر اسکی حیرانی و پریشانی بھی دیکھی ہے؟ اس کا چہرہ بالکل اسی طرح کا تھا مگر اس سے غیر معمولی شرافت ٹپک رہی تھی۔ ہملوگوں نے بہت سے قیدیوں کو دیکھا تھا، مگر یہ انتہائی شرافت صرف میں نے اُسی میں پائی۔ اس کی آواز نرم اور مایوسیوں سے پُر تھی۔ اس میں قوت ارادی اب نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ یہ مجھے ابتک یاد ہے۔" ہمارا دوست ذرا ٹھہر گیا اور اس منظر کو دوبارہ بیان کرنے کی جد و جہد کرنے لگا۔ اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فوراً ہی کہا، اس کے ہاتھ میں ایک دبیز کاغذ تھا جس پر وہ نئے صحائف کو اندھوں کی طرز تحریر میں لکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی پتلی انگلیوں کو ابھرے خطوط پر پھیرتے ہوئے بتایا کہ اندھے انھیں کس آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے ہاتھ

چکی چلانے والے کی طرح خاک آلود تھے ۔ اُس قید خانہ میں ایسی کوئی چیز بھی نہ تھی جو گرد پیدا کرتی۔ میرے خیال میں اس کے ہاتھ پر گرد نہ تھی بلکہ اُس کے جسم کا وہ حصہ تھا جو اپنے مخرج سے مل رہا تھا۔

جب اُس نے کاغذ کے ٹکڑے کو اوپر اٹھایا تو اس کے ہاتھ پروانے کے بازو کی طرح کانپ رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے ایک نام لیا اور پوچھا کہ کیا یہ طریقۂ تحریر جس پر وہ مشق کر رہا تھا اس کا ایجاد کردہ تو نہیں ؟ نہیں ! نہیں ! اس نے جواب دیا اور موجد کا نام یاد کرنے کے اشتیاق میں کانپنے لگا ۔ آخر کار اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور بڑبڑانے لگا۔ "آہ جناب ڈائرکٹر صاحب ! میں نہیں کہہ سکتا" پھر یکایک وہ نام اس کی زبان سے ابل پڑا۔ اس گھڑی وہ پہلی دفعہ واقعی ایک انسان جیسا معلوم ہوا۔"

"اس سے پہلے آزادی کی قدر و قیمت ہمیں معلوم نہ تھی اور نہ ہم یہ جانتے تھے کہ دوسرے انسانوں سے ہمارے تعلقات کی اصل بنا کیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اپنے شعور کو جلا دینے کے لئے ہر لحظہ دیکھنا اور سننا کتنا ضروری ہے اور نہ یہ کہ حافظ کی ضرورت اور افادیت کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو بھلا حافظہ کی کیا خاک ضرورت پڑتی ہوگی ۔ وہ ایک ایسے پودے کے مانند تھا جہاں شبنم کے قطرات کی پہونچ ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک جو محض ایک نام کے یاد آ جانے سے پیدا ہو گئی تھی۔ قابل دید تھی ۔ یہ چمک اُس ننھی سی شاداب پتی کے مانند تھی جس پر کسی مرجھائے ہوئے چمن میں نظر پڑ گئی ہو میں کہتا ہوں آدمی بھی عجیب و غریب چیز ہے ۔ کائنات کی یہ انتہائی پائیدار تخلیق ہے"۔ ہمارا دوست اٹھ کھڑا ہوا اور وہیں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا ۔ اس کی دنیا بہت وسیع نہ تھی بلکہ محض چودہ فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی کوٹھری میں اس کی ساری وسعت محدود تھی۔ ستائیس سال سے وہ اس کمرے میں اپنی زندگی گذار رہا تھا حالانکہ اس کی رفاقت کے لئے وہاں ایک چوہا بھی نہ تھا۔ قید میں کام انجام خوب پا جاتے تھے۔ ذرا اُس زبردست حیات آفریں طاقت کا خیال کیجئے جو انسانیت کی ترتیب کرتی ہے اور اس قیدی کے متعلق سوچئے جسے اس دھارے سے گذرنا پڑتا ہے ۔ اچانک مڑتے ہوئے اس نے پوچھا "کیا خیال ہے آپ کا ! کیا اسکی قوت استدلال کا کوئی حصہ بھی باقی رہا ہوگا ! اچھا ! میں آپ کو بتاتا ہوں ۔ ابھی ہم اس کی اندھوں والی تحریر دیکھ ہی رہے تھے کہ دفعتًا ہماری طرف اُس نے ایک چوبی ٹکڑا بڑھایا جو ایک بڑی تصویر کے اتنا بڑا تھا ۔ یہ ایک مست شباب دوشیزہ کی تصویر تھی جو باغ کے وسط میں بیٹھی تھی اور جسکے ہاتھ میں چمکیلے رنگین پھول تھے ۔ پس منظر میں بل کھاتا ہوا ایک پتلا سا چشمہ تھا، جس کے کنارے کوّے کے شکل کی ایک نادر چڑیا بیٹھی تھی ۔ اس دوشیزہ کے پاس ہی ایک درخت تھا جسمیں بڑے بڑے پھل حُسنِ ترتیب کے ساتھ لٹک رہے تھے ۔ یہ درخت عام درختوں سے بالکل ہی جداگانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بھی جان و روح ہے اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ وہ دوشیزہ اپنی خوبصورت گول نیلی آنکھوں سے گھور رہی تھی اور اس کے ہاتھ کے پھول بھی ہمیں گھورتے معلوم

ہوتے تھے۔ یہ ساری تصویر عاجزگی سے پُر معلوم ہوتی تھی۔ اس تصویر میں قدیم اطالوی طرز کے نقش ونگار اور خام رنگ تھے۔ محض خلوص کاری نے تمام مشکلات پر قابو پایا تھا۔

ہم میں سے ایک نے سوال کیا "کیا تم نے یہ نقش کاری قید سے پہلے سیکھی تھی؟" لیکن اُس بیچارے نے اس سوال ہی کو غلط سمجھا اور کہنے لگا "نہیں نہیں! ڈائرکٹر صاحب جانتے ہیں کہ میرے پاس کوئی نمونہ نہ تھا یہ صرف ایک خیالی تصویر ہے" پھر اس کے لبوں پر ایک خاص مسکراہٹ تھرتھرائی۔ ایسی مسکراہٹ جو سنگدل سے سنگدل انسان کو بھی رلا دے۔ اُس نے تصویر میں اُن تمام چیزوں کو یکجا کر دیا تھا جنکے لئے اس کی روح بیتاب تھی۔ عورت، پھول، طیور، نیلا آسمان، آب رواں اور اس کے دل کی وہ تمام حیرانیاں جن سے وہ جُدا کر دیا گیا تھا اس تصویر میں جھلک رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ اس تصویر میں گذشتہ اٹھارہ سالوں سے لگا ہوا تھا۔ بناتا اور بگاڑتا یہاں تک کہ اس کا یہ سوواں نقش تھا اور شاہکار وہ ستائیس سال سے وہاں مقیّد تھا اور اپنی اُس زندگی میں زندہ درگور۔ وہاں نہ سونگھنے کے لئے خوشبو تھی اور نہ دیکھنے کے لئے مناظر فطرت۔ سننے کے لئے کوئی آواز تھی اور نہ چھونے کے لئے کوئی فطری چیز حتیٰ کہ ان چیزوں کی یاد تک اس کے پاس نہ تھی۔ پُر شباب لڑکی کا یہ نقش جسکی آنکھوں میں حیرانی جھلک رہی تھی اور جسکے ہاتھوں میں شگفتہ پھول تھے اس کی ترسی ہوئی روح نے پیش کیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ جذبات انسانی کی سب سے بڑی فتح اور قوت فنکاری کی عظیم ترین شہادت ہے۔"

ہمارے دوست کا ایک ہلکا سا قہقہہ گونجا۔ "انسان کا ذہن اتنا موٹا ہے کہ ہم اس وقت بھی اسکی زندگی کے مصائب کا اندازہ نہ کر سکے گرچہ بعد میں ہمیں اس کا اندازہ ہوگیا۔ نگراں اس کی صحت کے متعلق سوالات کر رہا تھا اور ہم اس کی آنکھوں کی وہ چمک دیکھ رہے تھے جو جواب دینے کی کوشش میں پیدا ہو رہی تھی۔ ہم زندگی کے آخری دن تک ان باتوں کو نہ بھول سکیں گے۔ تنہائی اور خموشی کی طویل مدّت جس سے وہ گذر چکا تھا اور بقیہ مدّتِ لامعلوم جس سے اُسے گذرنا تھا مستقل المیہ کی صورت میں اُسے گھور رہی تھیں اور یہ گھورنا اسوقت تک کے لئے تھا جب تک کہ وہ مر کر اس قید سے نجات نہ پا جائے۔ اس کی آنکھوں میں اندر ہناک مصیبتیں جھلک رہی تھیں .... میں اُن نظروں کی تاب نہ لا سکا اور لپک کر مجلس سے باہر آگیا۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ساری دنیا کو اُس کے سامنے جھک جانا چاہئے تھا۔ گرچہ میں آزاد اور ایماندار تھا لیکن اس زندہ قربانی کی مثال کے سامنے گناہگار اور نیم انسان۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ اس نے کونسا جُرم کیا تھا مگر وہ بیچارہ اتنا ستایا گیا تھا کہ ہم اس کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ وہ ابھی وہیں ہوگا تو میں اپنے اندر ایک جذبۂ دیوانگی اپنے خلاف اُبھرتا ہوا پاتا ہوں۔ اور دنیا میں مقید روحوں کی دردناک کراہ سنائی دیتی ہے۔"

ہمارے دوست نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور کامل ایک منٹ تک کچھ نہ بولا۔ پھر سلسلۂ کلام

شروع کرتے ہوئے اس نے کہا۔" واپسی میں ہم لوگ اسٹاٹ پارک سے گذرے۔ وہاں کھلی ہوا اور چمکتی ہوئی دھوپ تھی چنار۔ صنوبر، آخروٹ، ناریل۔ سرو اور سیب کے درخت پھل پھول سے لدے کھڑے تھے۔ انکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کی ہر شاخ اور ہر پتی پر خوشی ناچ رہی تھی۔ باغ طائران خوش الحان سے جو آزادی کی علامت ہیں پُر تھا۔ یہ چڑیاں ادھر سے ادھر پھدک رہی تھیں۔ اور آفتاب کی روشنی میں چہچہا رہی تھیں۔ وہاں دلربائی ہی دلربائی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ فطرت کی اس وسیع دنیا میں صرف انسان اور عنکبوت ہی دوسری مخلوق کو اس طول اور طویل طریقہ سے اذیت پہونچاتے ہیں۔ اور یہ انسان ہے جو اپنی صنف پر اتنی بیدردی سے مظالم ڈھاتا ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ فطرت کی یہ ایک بیّن حقیقت ہے میں آپ کو مشاہدہ کی دعوت بھی دیتا ہوں۔ میں نے یہ آخری مشاہدہ اس کی آنکھوں میں کیا۔ ان میں ناقابلِ بیان تکالیف جھلک رہی تھیں۔ اس رات میں قہوہ خانہ کے دریچہ میں بیٹھا نغمات موسیقی، گفتگو اور قہقہے سنتا رہا۔ لوگوں کو سڑک پر گذرتے دیکھتا رہا۔ دوکاندار، سپاہی، تاجر، افسر، پادری، غریب، امیر اور پرلطف عورتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ دریچے سے نکلی ہوئی روشنی کی لکیروں کو تکتا اور نیلے آسمان کے نیچے اندھیرے میں پتیوں کے ارتعاش پر نظریں جماتا رہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سُنا۔ میری نظروں کے سامنے فقط اس غریب کا بے رنگ اور شریف چہرہ تھا۔ اُسکی آنکھیں اور اس کا گرد آلود مرتعش ہاتھ میرے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اور میری نگاہ اُس تصویر پر تھی جو اُس نے اُس جہنم میں رہکر بنائی تھی۔ جب کبھی میں کسی تنہا مقید مخلوق کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے فوراً وہ منظر پھر جاتا ہے۔"

ہمارا دوست اپنی گفتگو ختم کر چکا تھا۔ وہ اٹھا معافی مانگی اور فوراً چلا گیا۔

جون گولز وردی　　　　مترجمہ سید علی اکبر قاصد

# کلام منوّر

منوّر، انور علی یاسؔ تلمیذ راسخ عظیم آبادی کے صاحبزادے اور شمس العلما سعید حسرتؔ کے نسبی بھائی تھے۔ تاریخی نام مظہر الدّین ہے اور سال ولادت ۱۲۴۰ھ۔ ۱۲۵۱ھ میں تعلیم عربی کی ابتدا کی، ۱۲۵۶ھ میں شادی ہوئی۔ کلیات یاسؔ کے ایک قطعے سے جس کا عنوان "قطعۂ تاریخ پرہیز منور علی از گوشت وماہی" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ورم طحال کے مریض تھے آخر جاں بر نہ ہو سکے۔ یاسؔ جوان بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے خود بھی اسی سال جنت کو سدھارے۔ صاحب عالم مارہروی کے تعزیتی مکتوب کے جواب کے کسی جملے یہ ہیں: "ہمیں یک فرزند دل بند کہ دیندار و نیک خصلت بود... یک سال کامل علیل ماند آخر الامر داعی حق را لبیک گفت" بندہ را نیز بعض اوقات گریہ مستولی شود با وجود ضبط کمال قطرات اشک نہ خواستہ از دیدہ می چکد ؎

ضبط گریہ تو ہے پر دل میں جو اک چوٹ سی ہے   قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

"این ست غزل استاذی راسخؔ است علیہ الرحمۃ" و فقیر را بہ جز یک دختر از اولاد باقی نیست" مرقومہ ششم رمضان ۱۲۶۲ھ"

پہلے یاسؔ کا قطعۂ تاریخ پھر منوّر کی ایک اور غزل درج کی جاتی ہے:

منور علی نور چشم دریغا   جواں درگذشت از جہانِ پر آفات
پئے سالِ فوتش من خستہ خاطر   پریشاں خیالات و آشفتہ حالات
فراشیدہ رخسار امید لے یاس   نوشتیم، ہیہات ہیہات ہیہات

۶۲   ۶۳
۱
۶۲   ۶۲

---

اس کے مژگاں کہو دل میں مرے کیوں کر نہ چبھے   دل تو پتھر نہیں کس طرح سے نشتر نہ چبھے
رحم مجنوں پہ ترے سب نے کیا صحرا میں   خار پاؤں کے تلے آئے پہ یک سر نہ چبھے
پہنو اس کو نہ صاحب کہ ہے بندے کو گماں   جسم نازک میں کہیں پھولوں کا زیور نہ چبھے
چشم بدور اٹھے سو کے یہ آنکھیں نہ ملو   نوک مژگاں کے کفِ دست کے اندر نہ چبھے
گل کو مت توڑیو زنہار کہ ہے مجھ کو خلش   خار ان ہاتھوں میں لے سرو سمنبر نہ چبھے
کبھی مسطر نہ کرائے گل ورق کاغذ پر   کہیں تو ندیوں میں رشتۂ مسطر نہ چبھے
ہو خفا اٹھ گیا وہ ماہ تھا آج کی شب   خار ساں بستر گل کیوں کہ منوّر نہ چبھے

---

مختار الدین احمد آرزو

# عبرتی مرحوم

(۳)

میرے اس مضمون کی دوسری قسط معاصر جلد ۳ ۵ بابت ماہ مارچ ۴۲ء میں چھپ چکی ہے۔ وہ میری غفلت سے ناتمام رہ گئی تھی۔ کیونکہ عبرتی مرحوم کی ۲۳ عدد تصنیفوں میں سے صرف ۱۸ کتابوں کے متعلق لکھکر عنان قلم روک لی گئی تھی۔ لہذا اس نمبر کی چند سطریں گزشتہ نمبر کا تتمہ ہونگی اسکے بعد وہ سلسلہ شروع ہوگا جس کا اشارہ گزشتہ نمبر کی آخری سطروں میں کیا گیا ہے۔

(۱۹) زاد العقبی ۱۲۸۲ھ اس میں ۲۸۱ رقعے ہیں جن میں سے ۹ حمد خدا، نعت رسولؐ، منقبت آل محمدؐ اور مدح مجتہد وقت پر مشتمل ہیں۔ اور باقی رقعے مذہبی اخلاقیات پر۔ ہر رقعہ کے آخر میں ایک حدیث بھی ارد کی ہے جو مضمون رقعہ کا ماخذ ہے۔ فروع دین، اوامر و نواہی، لباس، اکل و شرب، اعمال محرم وغیرہ ان سب کا ذکر ہے۔ عبارت سلیس لیکن رعایت الفاظ اور براعت استہلال کی خوبیوں کی حامل ہے۔

(۲۰) اعجاز المحبت ۱۲۸۳ھ یوسف زلیخائے جامی کی نثر ہے۔ (۲۱) شبستان ولایت ۱۲۸۴ھ غالبًا یہ کتاب مفقود ہے۔ ممکن ہے کسی کتب خانہ میں بعالم کس مپرسی ہو۔ شکرستان نبوت کے دیباچہ میں اس کا ذکر ہے۔ (۲۲) شکرستان نبوت ۱۲۸۵ھ دیباچہ میں لکھتے ہیں "چوں از نوشتن نسخۂ "شبستان ولایت" من سخن نشناس مؤلف را فراغ دست داد۔ بیشترے بجائے خود تمنا میکردم کہ مختصر کتابے از حال انبیائے کبار ہم در خیر تحریر در آورم"۔ نواب سید محمد حسن خاں کے ایما سے لکھی گئی۔ اس کا ذکر مضمون کی پہلی قسط میں آچکا ہے۔ (۲۳) مراۃ المصادر ناتمام سنہ تالیف لاعلوم اور یہ بھی پتہ نہیں کہ کس کے لئے لکھی گئی۔

**دستگاہ علم** متداول علوم مشرقیہ میں سے صرف دو علم "ادب و دینیات" سے ان کو ربط رہا۔ معقولات کی جھلک تک ان کی تالیفات میں نہیں ہے۔ اور ادب میں بھی جو دستگاہ انھیں فارسی زبان میں حاصل ہے وہ عربی ادب میں نہیں ہے۔ مجھے اُن کے موجودہ سارے تصانیف میں کافی تفحص کے بعد صرف عربی کا ایک فقرہ جو دوسرے شخص کی طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور عربی کے دو شعر ملے۔ مصباح الاخلاق کے دیباچہ کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے۔ واللہ الموفق فی الھدایۃ ومنہ الاستعانۃ فی النھایۃ اور عقد پروین میں مولوی نجف علی صاحب مرحوم کے نام جو رقعہ ہے (۴۲) اسمیں یہ شعر موصوف کی مدح میں ہے
ے الوصف عن احصاء مدحلت عاجز + والفضل عن ادراك قدرك قاصر اور دوسرے رقعہ (۴۳) میں یہ شعر ے یامن بہ فی الشرع مجد کامل + وبعلمہ فی الدین فضل شامل۔ ادبی ذوق

رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دونوں شعر ادب میں کس حیثیت کے اہم کس معنویت کے حامل ہیں۔ مختصر یہ کہ بحالت موجودہ جبکہ عربی ادب میں ان کا کوئی نتیجہ فکر ورشحہ قلم موجود نہیں ہے۔ عربی ادبا کی صف میں انھیں کوئی جگہ نہیں دی جاسکتی۔ ہاں مصباح الاخلاق کے ہر رقعہ کے آخر میں ہر حدیث کی اصل عربی عبارت بھی نقل کردی ہے اور ترجمہ بھی درست کیا ہے جس سے صرف عربی دانی کا ثبوت بین ملتا ہے۔

فارسی ادب میں کافی دستگاہ ہے۔ اس فن میں یہ ایک حد تک استاد مانے جاسکتے ہیں۔ بلکہ استاد مانے گئے۔ اس زمانہ کے وہ حضرات جنھیں عبرتی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل تھا وہ ایسے تھے۔ جن کے متعلق جناب شاد مرحوم اپنے خط (بنام پروفیسر محفوظ الحق) میں تحریر فرماتے ہیں "شک نہیں کہ عبرتی مرحوم کو تعلیم دینے میں عجب سلیقہ وقدرت تھی۔ راقم نے ان کے تھوڑے تھوڑے زمانہ کے بھی شاگردوں کو فائق پایا۔ غرض راجہ ہیبت سنگھ چند عرصہ میں فارسی کے شاعر ونثار بن گئے۔ یہ دیکھکر روسا کو بھی شوق بڑھا۔ چنانچہ فیروز جنگ وسہراب جنگ یادگار خاندان منیر الدولہ و نواب مرزا امراؤ خاں مرحوم یکے از اولاد نواب شجاع الدولہ بہادر والی اودھ ان رئیسوں نے اوقات مختلف مقرر کرکے عبرتی مرحوم سے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ مجکو ان صاحبوں کے مکاتیب دیکھنے کا مکرر اتفاق ہوا ہے۔ میں یقین دلواتا ہوں کہ آج ایک بھی شاید بنگال و بہار بھر میں نہ اس عبارت منشیانہ کا ثانی نکلے گا نہ اس پاکیزہ خط نستعلیق شفیعا آمیز کا۔ یہ مکاتیب معمولی تھے عبارت آرائی مقصود نہ تھی" جب تھوڑے تھوڑے زمانہ کے" شاگردوں کا یہ عالم تھا پھر استاد کس بلند پایہ پر ہوگا۔

**فن انشا** میں ان دو فنوں کی ضرورت ہے **قواعد** اور **بلاغت**۔ قواعد دانی میں عبرتی کا پایہ ان کے ان تصانیف سے معلوم ہوگا جو اس فن میں لکھے گئے ہیں۔ یعنی حدیقۃ الاضافہ ریاض الافعال، ریاض الحروف۔ زبدۃ الانشا، مصباح المرکبات۔ فن بلاغت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ادب فارسی میں بلاغت کے تین فنون معانی۔ بیان اور بدیع میں سے صرف آخر کے دو فن رائج و متداول ہیں۔ اس زبان میں نہ تو فن معانی سے بحث کی جاتی ہے نہ کسی تصنیف میں اشارہ ملتا ہے حدائق البلاغہ میں بھی صرف دو ہی فن ہیں۔ وعلی ہذا القیاس مجمع الصنائع بھی فن معانی سے خالی ہے۔ لیکن یہ فن جس کا خلاصہ "مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنا ہے" ضمناً موجود ہے۔ اس تمہید کے بعد عبرتی مرحوم کی انشا کے خصوصیات پیش کئے جاتے ہیں۔ مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱) اضافت مقلوبی کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن کہیں یہ اضافت مرغوب طبع پڑتی ہے اور کہیں مکروہ و ناپسندیدہ ذیل کی مثالوں سے دونوں کیفیتوں کا اندازہ ہو جائیگا، چشم براہ دوختہ مشتاقاں۔ خلت آمود نمیقہ مہر آگیں۔ بزبان وخاطر از خامہ، بپایۂ صبا تگ قاصد، عالی نمیقہ، سامی صحیفہ سنبلیں حرف ، دل فراق مبتلا، دو صد دوستانہ شکایت، نیاز نامۂ عجز عنوان من حسرت کشتہ،

اس قسم کی اضافت سے ان کے کل تصانیف تقریباً مملو ہیں (۲) مرزا عبدالقادر بیدل کی طرح بعض نادر ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں۔ اور ظہوری و طغرا سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ مثلاً "دل سوختگانِ گلگوں کفنِ کربلائے محبت، ایں خارِ فراق بپا رفتہ، میانِ پرکار کافر ادا، صنم پرستی سامی خیالش مردم بصورتانِ ایں دیار، بندۂ کاسہ متاع عصیاں در بغل، از خفتہ بخت جز دمِ مرگ از غفلت بیدار نگشتہ، برزن نشینِ دیارِ خدمتگذاری اہل و عیال آبلہ پا، رہ نوردِ سرمنزلِ اخلاص پرستی بصومعہ نشینِ قناعت و صبر سوختہ کوکب، تاجر گراں بہا متاع اخلاص در بغل" وغیرہ۔ لیکن جابجا بوئے کچوری می آید اور یہ ان کے استاد کا عطیہ ہے۔ (۳) منشیانِ شاعر مزاج کی طرح کبھی کبھی تعلی بھی کر جاتے ہیں۔ "عالی صد مرتبہ جائے آں دارد کہ رہینِ فراواں منت موج خیزی گہر فروش طبع محیط جوشِ خویش گروم، کہ بنیروے سحر نگار ایں رعنا صحیفۂ نظر افروز را طراز اختتام دادم، تو گوی تازہ بنائے انواع معانی آفرینہا برنہادم وہ چہ رعنا صحیفۂ کہ بہر نورد و شکنش ہزاراں یوسف جلوہ معانیہائے تازہ عیاں، و بہر خم و پیچش دو صد زلیخائے غمزۂ مضمون نو چشم بتاں آسانہاں بر ریحانے حرفش دکاں مصر مصریہ مستی باجہاں جہاں رعنا برکشادہ و ہر مشکیں سطورش داد کنعاں کنعاں اعجاز طرازی و سحر بیانیہا درداده، اگر غلط نہ کنم ہر ورقش خلد آسا نزہتکدہ الیست ہم نزہت سرشت، و ہر صفحہ اش ارم کاشانہ الیست غیرت نظارت ہشت بہشت۔" یہ معراج العشاق نثر لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ کی عبارت ہے (۴) استاذ کی بجائے ہمیشہ آموزگار (مخفف آموزگار) پسر صلبی کی جگہ "صلب زادہ" دو کلمہ یا کلمۂ چند کے عوض حرفے دو اسی طرح خششتے دو وغیرہ بھی لکھا کرتے ہیں "نیاز تہ دل" ان کا گویا خاص محاورہ ہے۔ پس از طرازش جہاں جہاں نیاز تہ دل۔ پس از گزارش نیاز تہ دل"۔ (۵) نئی تخیل بھی پیدا کرتے ہیں "خجے موالفت مشحوں کہ ہر نقرہ نزاکت آمیزش معمائے بود باسم انتعاش جاوداں" و ہر کلمہ سر در انگیزش تاریخ بود در سن انتقال غم جانکاہ ہجراں"۔ (۶) فن بدیع کی صنعت مراعاۃ النظیر کے ماتحت اکثر رقعے موجود ہیں۔ دو رقعے جو خالی از لطافت نہیں ہیں سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔ نواب جلیل الدین کی زوجہ کے انتقال پر اُن کو تعزیت نامہ لکھتے ہیں:

"شانہ کہ صد چاک دل داشت شاید خیال ہمیں روز سیاہش بودہ۔ آئینہ کہ ہمہ تن قرین بہ حیرت می ماند مگر تصور ہمیں صورت غم پیش نظر داشت۔ اگر لب مشاطہ ازیں شام ماتم با دلشگافتہ کبود پوش گشتن ریحانہ خانم مسی چرا، و اگر زبان سوسن ازیں دست بسر زنی آندم بدو شرح نکردہ سراپا خوں شدن فیروزی بیگم حنا از چہ رو، گل کہ بدامن چاک زدہ از نالۂ بلبل زیر خاک شنیدہ باشد کہ روزے زیب مزار آں مریم نژاد گردد، و شمع کہ بجز سوختن کارندار و پروانۂ باد جز دادہ ماشد کہ شبے بر سر لحد آں بلقیس زماں برافروزد۔" نواب سہراب جنگ بہادر نے غالباً قاز مانگ بھیجے تھے اس کے متعلق یوں بلند پروازی کرتے ہیں:

"اوج اقبال راہمائے سعادت پرواز ما سلامت، لبشوق بطمائے چوں برشتہ عبرتی کہ سراپایش از فرط

داغہا مانا بہ پیکر طاؤس ست نخست بآں ناز بسمل گلرخاں نغمۂ بلبل آسا دل از کف سلامے۔ و فاختہ مشیر بانہ یکجہاں نیازے میرسانداز ان پس ہرانچہ بزبان نورتی خامہ دہد اینکہ درزمانیکہ ایں زبوں صید شہباز مہاجرت کار بیارب داشتے دوحشت از خود رمیدنش بس اضطرابہا افزودے، کبک رفتار بریدے ہدہد پیام گرامی نامہ آں سیمرغ قاف محبت وردست از در درآمد، وبدیں قمری مانند طوق نیاز بگردن دراندا‌ختہ درداد، اگر غلط نکند ایں مرغ بے بال و پر شوق را شہپر سید طائراں بدست افتاد، چوں عنوانش چاک زدہ روح افزا عبارتے دید کہ بشاخ سطورش ہزار داستان مہر و محبت آشیاں بستہ۔ المختصر حسب نوشتۂ آں فراخ حوصلہ بامور لفت ایں ریختہ پر قفس ناکامی سہ جفت قاز گرامی کہ بفریب گندم زادے باقازان سرکار فیض آثار دام اقبالہ شبے چند ہم خوشخانہ شدہ بودند جدا ساختہ ہمدست بوتیار شکل خدمتگار سامی دولت خانہ آن تذرو کہسار والاتبار فرستادہ، زیادہ عنقاے گرامی دولت بآں نسر طائر چرخ ہم اوج باد، وبیاد آوری ایں خط کلاغ پا نگار کہ بیش از کنجشک جثہ نیست بآں شاہین اوج محبت توفیق دہاد سے ہائے چہ می شد چو کبوتر اگر + نامۂ من بال و پرے داشتے“

ایک رقعہ خالص فارسی میں بھی لکھا ہے۔ عربی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں دیا۔ اس رقعہ کے لکھنے کا سبب خود اسی رقعہ سے ظاہر ہے۔ مکتوب الیہ خان باوقار جناب علی اکبر خانصاحب ہیں۔ لکھتے ہیں۔ جادو نگار پارسی زبانان را ہنرشناس خدا پیوستہ کامرانش داراد، خاکسار پیشہ بندہ ہیچمداں عبرتی کہ بہ ازو ہرزہ درائے دربزم سخن سنجی نتواں یافت، پس از گزارش یکجہاں نیازمندیہاے گرامی ہرچہ دریں پارۂ کاغذ طرازش دہد اینکہ روزے من بجاشنی سخن نارسیدہ ازہمہ رمیدہ را بزبان یکے از مہرپرستان راست گفتار کہ دروغ بافیدن بساننگ خویش می انداز چنیں بگوش بخوردم کہ آں بجان خواستگار رنگیں تلاشان میفرمود کہ نیرے پارسی زبانان اگاہ توان دریافت کہ دراز فسانہ بپارسی بنگارند وتاپایان آن سخن تبازی زبان نرانند اگرچناں نیست کے آں ہرزہ درایان را زباندان فارسی می تواں گفت“ بندہ از شنیدن ایں سخن دوراز کار تادیر بخود نبودم، ازینکہ اگر کسے درہیچو ناپرسان روزگاری کہ کالائے ہنر سراسر نارواست و خریداران ہم از بازار جہان ناپیدا، برنگے کہ آں مہرپرور میفرماید بہ پیرایۂ نگارش درآورد، یاراینکہ بسیار از خود تراشند چگونہ بردش پارسی آشنایان رواں خواہند خواند، بلکہ گمان است کہ نارسائی اندیشہ ازیں چارہ بیجا زدن برنگ پشیمانی کشیدگاں سرخرو خواہند نشست، اگر از من دلدادۂ نوشابۂ سخن آں مہرشناس پرسد پارسی دانی چیزے دیگرست، نہ چنانچہ آں فرومیدہ روزگار میفرماید، درپارسی زبان ہرکہ روزے چند استخوان ہا شکستہ است وشبہائے دراز دود چراغ خوردہ شکست ونسبت ایں زبان نیکو دانستہ باشد دہرگز درپارسی نگاری درنخواہد ماند، ازیں بیش۔

خامہ فرسائی در ینجا بروں از ہرزہ درائی نمی بینم۔"

میں نے جہاں تک عبرتی مرحوم کے نتائج افکار پر نظر کی ہے اس فیصلہ پر پہونچا ہوں کہ اگر درس وتدریس کے سلسلہ۔ نظارت کے جنجال اور فکر معاش سے سبکدوش ہوتے اور اپنے سمند فکر کو رقعات کے میدان کی محدودیت اور یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور سکندر نامہ کی پابندیوں سے آزاد کردیتے تو انشا پردازوں کی قطار میں ان کی بھی خاص جگہ ہوتی۔ رقعات میں کافی رنگینی اور پیچ در پیچ ترکیبیں اور اضافتیں ہیں۔ لیکن یوسف زلیخا، لیلےٰ مجنوں اور سکندر نامہ کی نثر اعجاز المحبت معراج العشاق اور حملہ اسکندری مقابلۃً بہت سادی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جناب شاد مرحوم نے حیات فریاد ص۱۰۲ میں کیونکر لکھ دیا ہے کہ "نثر کے بڑے شائق تھے۔ یوسف زلیخا وسکندر نامہ کو بھی نثر کرکے اور بھی مغلق کر دیا ہے۔" غالبًا نظم کی شیرینی نے یوسف زلیخا اور سکندر نامہ کے اغلاق کو گھٹا دیا ہے ورنہ جامی و نظامی نے جو زور قلم صرف کیا ہے اور تشبیہ و استعارہ کی قدرت دکھائی ہے۔ اس کا نصف بھی اس نثر میں نہیں ہے۔ موقع ہوتا اور جامی و نظامی کی دونوں مثنویاں اس وقت پیش نظر ہوتیں تو دو ایک مقام سے موازنہ کر دیا جاتا۔ اور یہ چیز ہے بھی اس موقع کی جب عبرتی مرحوم کے تصانیف پر تبصرہ کا قلم اٹھایا جائے۔ اور اس کے لئے خاص فرصت اور الگ عنوان کی ضرورت ہے، ممکن ہے مستقبل قریب میں اس کی صورت پیدا ہو۔

**شاعری**

شاعری کے دو عنصر عروض و قافیہ کے علاوہ باقی اس کے کل عناصر وہی ہیں جو انشا کے عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔ تشبیہ و استعارہ، مجاز و کنایہ، طباق و مقابلہ، لف و نشر جمع و تفریق و تقسیم، تجنیس و تقارب وغیرہ تمام اجزائے بیان و بدیع شاعری میں بھی ملحوظ ہیں اور انشا میں بھی۔ لہذا ایک منشی شاعری سے قریب اور ایک شاعر انشاء سے نزدیک رہتا ہے۔ اگر مبدء فیاض سے طبع موزوں عطا ہوگئی تو شعر و انشا یا شاعر و منشی دونوں ایک ذات میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ جناب شاد مرحوم فرماتے ہیں۔ "عبرتی مرحوم کو فارسی بلکہ اردو زاشعار اس قدر برزبان تھے کہ میں نے اب تک اس یادداشت کا کوئی نہ پایا۔ تعجب یہ ہے کہ مذاق شاعری ان کا اس قدر صحیح و درست تھا۔ مگر بقول انھیں کے جب خود شعر تصنیف کرتے تھے تو وہ بات شعر میں نہیں رہتی تھی۔ تاہم اساتذہ کے کلام سے بروقت مثالیں لانے اور باریک باریک فن معانی و بیان و عروض کے مسائل ایسے مستحضر تھے کہ اس یادداشت کا بھی شخص دیکھنے میں نہ آیا۔" اگر یہ حوالہ میرے پاس نہ بھی ہوتا جب بھی عبرتی مرحوم کی شاعری کے متعلق کافی ثبوت موجود ہے۔ انھوں نے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی قدم اور اس گلستاں کی سیر بھی کی لیکن (۱) غزل اور (۲) مثنوی سے آگے نہ بڑھے۔ (۱) ان کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل میں کافی مشق بہم پہنچائی تھی اور اس صنف کا مجموعہ "غزلیات" کی حد سے

تجاوز کر چکا تھا۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے "ندیم بہار نمبر" میں صرف ایک غزل معراج الخیال سے نقل کرکے لکھی تھی۔ مجھے دو غزلیں اور بھی دستیاب ہوئی ہیں اور "غزلیات" کا پتہ ملا ہے۔ (۱) عقد پروین کے رقعہ ۱۵ میں جناب سید قادر احمد صاحب کو لکھتے ہیں۔ "نظر بران این ہرزہ درا ہم غزلے درجواب قاسم انور گفتہ ارسال خدمت میکند" (۲) مولوی انوری صاحب کے نام جو رقعہ لکھا ہے ۴۹ اس میں لکھتے ہیں: "یکدو غزل بامید اصلاح ہمایون حضور کلیم طبع بندگان ارسال می کند۔" (۳) میر مہدی صاحب چھپرہ کو لکھتے ہیں۔ ۵۸ "لیکن باز ازانجا کہ مخلصانہ پرستی نیز برنگونہ اعجاز نفقر ازبس لب نفرین می کشاد ناچار ازانجملہ غزلہائے (جو میر مہدی نے اُن کے پاس بھیجی تھیں) یکے بہ زمین "عمان نفر دشتم" و دیگرے بزمین "تمنائے کسے" بصد جگر تابی و فراوان جستجو بانتخاب درآوردہ باغزلہائے خود و سعادتمند تلمیذ بمطبع کلکتہ روانہ نمودہ انشاء اللہ تعالیٰ بدرک مہلت مرقع آن غزلہا بچشم عالی درآید۔" (۴) لالہ ٹپن لال کو ڈھاکہ سے لکھتے ہیں ۲۵ "آنجمارہ والا دستگاہاں برآمدہ سرکرسی جا گرفتند ازاں میاں خواجہ حیدر جاں نامی شاعرے کہ ملک الشعرا این شہر بود سر کلادہ سخن بدیں ہیچمداں درکردہ بعد از راندن حکایتے از ہر درے، فرمود صاحب چیزے از افکار خود لطف فرمائید کہ خیلے مشتاقم، این نارسیدہ بزم نافہمیدگی غزلے از افکار خود خدمتش خواندہ مورد تحسین شد۔" سطور بالا بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبرتی مرحوم نے باضابطہ غزلیں لکھیں۔ اور شاعری میں شہرت بھی حاصل کی، افسوس ہے کہ آج ان کا مجموعہ غزلیات نگاہوں سے پنہاں ہے ورنہ ان کی انشا پردازی کی طرح ان کی غزل گوئی پر کافی تبصرہ کیا جاتا۔ وہ دونوں غزلیں جو مجھے دستیاب ہوئی ہیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔ ایک غزل عقد پروین کے رقعہ ۲۲ میں ہے جو مولوی محمد رافق صاحب صدر اعلیٰ کے نام لکھا گیا تھا وہو ہذا:

ز بزم گلرخاں داماں کشیدن آرزو دارم — نہ زینہا بلکہ از خود ہم رمیدن آرزو دارم
دل شوریدۂ من کوکہ گوید با جنوں ازمن — بپا خار مغیلاں را خلیدن آرزو دارم
بصحرائیکہ مجنوں ہمعناں گردید با وحشت — بسان ناقہ لیلی رسیدن آرزو دارم
بہ بزم مے پرستان دل از کف دادہ بیچیدے — لب ساغر چو مدہوشاں مکیدن آرزو دارم
مکن منع من دیوانہ از عشق بتاں ناصح — دلے جیب و گریباں را دریدن آرزو دارم
برواے خضر ز آب چشمۂ حیواں مزن حرفے — من و آب دم تیغش چشیدن آرزو دارم
ببازار محبت عبرتی مارا تواں بردن — متاع درد و ناکامی خریدن آرزو دارم

دوسری غزل جو دیوان الفتی مطبوعہ ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوئی تھی۔ وہو ہذا۔

دوشینہ دلم! عاشق رخسار کہ بودی — بیخود شدۂ شوخی رفتار کہ بودی؟
سوگند بہ مخمور نگہ راست تواں گفت — شب باکہ زدی بادہ و غمخوار کہ بودی؟
مشکیں نفسی بس کہ نسیم سحر امروز — شب شانہ زن طرۂ طرار کہ بودی؟

بلبل ا بچمن شعلہ زد امروز نوایت  دریوزہ گر گرمیٔ رفتار کہ بودی
افغان تو اے عبرتی خستہ جاں سوخت  شب گریہ کناں در پس دیوار کہ بودی

(۲) مثنوی کے زمرہ میں ان کے منظوم رقعات کا مجموعہ "نظم ثریا" پیش کیا جا سکتا ہے جسمیں ۶۲ رقعے ہیں۔ مجموعہ ۸۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ اور ہر صفحہ میں تقریباً ۱۹ شعر ہیں۔ خطوط کی بحریں مختلف ہیں۔ سوائے چاشنی کے شاعری کے قریب قریب اکثر عناصر موجود ہیں۔ باایںہمہ بعض اشعار ایسے بھی قلم سے نکل گئے ہیں جو دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتے۔ میں نمونہ کے طور پر ہر قسم کے کچھ کچھ اشعار پیش کرتا ہوں کہ ان کی شاعری کا انداز بھی معلوم ہو جائے اور بے ضرورت طول بھی نہ ہو۔

حمد خدا ؎
بیا اے خامۂ باسحر دمساز  سر ہر صفحہ را رشک چمن ساز
بحمد قادر روشن گر جاں  ضیا بخش نگاہ پیر کنعاں
زباں از مدح او گوہر بداماں  دہاں از وصف او کان بدخشاں
ز فیض او سخن را ارجمندی  معانی را ز جودش سربلندی
سطور نامہ راز و سنبلستاں  سمن زار ورق زو رشک مہتاب

نعت ؎
عناں اندیشہ چوں زیں دشت گرداند  خرد نعت محمد بر زباں راند
حبیب حق سرافراز دو عالم  خدیو داد گر شاہ مکرّم
شرف بخش عرب ایماں پناہے  سراج دیں نبوت دستگاہے
گرامی گوہر تاج نبوت  درخشاں اختر برج رسالت

منقبت ؎
امام برحق و حیدر بنامی  امیر المومنیں والا مقامی
شفیعم عبرتی نے غیر آں شاہ  من و دو دست و داماں یداللہ

ان خطوط کے سبب ترتیب کے متعلق لکھتے ہیں ؎

بہ ترتیبش میان جہد بستم + طلسم چند معنی بر شکستم  بآب روے لیلی خامہ شستم + بدود آہ مجنوں نقش بستم

ہولی کی تقریب میں مولوی محمد رافق صاحب صدر اعلیٰ کو خط لکھا ہے اس کے دو شعر ؎

کہ چوں رنگیں مہ ہولی رسیدہ + جہاں را شورشے در جاں دمیدہ  فلک خوں تشنہ فرزانگی شد + ملک آمادہ دیوانگی شد

مولوی نعمت علی صدر اعلیٰ منظفر پور نے ان سے ان کے نتائج افکار طلب کئے تھے اس کے جواب میں شکریہ نامہ بھیجا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎ (۱) جنوں پروردہ حسرت سرانجام + سراپا وحشت دغم عبرتی نام (۲) پس از شرح نیاز دیدہ و دل + چہ دل آئینہ دار رقص بسمل (۳) چہ دل یک کربلائے یاس و حرماں چہ دل ماتم سرائے درد ہجراں (۴) چہ دل چوں نافہ آغشتہ بخوں + چہ دل لرزاں تو د چوں بید مجنوں (۵) چہ دل از نالہ صد محشر طرازی + چہ دل از آہ یک عالم گدازی (۶) چہ دل محمل کش صد شوق دیدار

چہ دل نالاں بہر گامے جرس وار (؟) نگارد اندریں حسرت کتابے + ز حال خویش با صد اضطرابے۔
سید محمد حامد خاں بہادر اڈیشنل صدر اعلائے مظفر پور کو خطوں کا جواب نہ دینے پر شکایت نامہ لکھا ہے اس کے چند شعر ؎

یکے شوریدۂ وحشت ہم آغوش ... برنگ صورت تصویر خاموش
بنجد بیخودی جا کردہ چوں قیس ... سراپا حسرت و غم صورت ویس
جنوں را رنگ نو دادہ بہ فریاد ... بسر صد تیشۂ حسرت چو فرہاد
شہید کربلائے درد و ہجراں ... ہمہ غم عبرتی با یاس و حرماں
جدا شد ایں ذبیح دشنۂ غم ... چہ غم کز بار آں طشت فلک خم
چہ غم کز ہیبتش یعقوب اندوہ ... چوں اژدہا در دامن کوہ
چہ غم کز شعلہ اش رانست خورشید ... برآرد دو دش آب از چشم ناہید
دو صد گلدستۂ شوریدہ مضموں ... تحسر نامۂ آغشتۂ خوں
محشی از حدیث شوق دیدار ... مذہب از سرشک چشم خوں بار

شاہ بخشش حسین وحشی کے نام فراق نامہ کے چند شعر ؎

فغاں برلب آوردۂ تیرہ شام ... اسیر الم عبرتی تلخ کام
سلامے رساند چو زلف بتاں ... مسلسل سراپا و عنبر فشاں
تو گوئی سلامے نہ گلدستہ ... بتار نگاہ ملک بستہ
سلامے کہ مجنوں بہ لیلی نوشت ... سلامے کہ وامق بہ عذرا نوشت
سلامے کہ والہ بصد رشک و آہ ... دہد بر حد کہ بدست نگاہ
سلامے کہ بنگاشت سوے دمن ... نل دلفگار اسیر محن
سلامے کہ ہر شب بکنعاں نوشت ... بیوسف زلیخائے حور اسرشت

اس مجموعہ کا کوئی خط اس قسم کی رنگینی و نازک خیالی سے خالی نہیں ہے۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کے کلام میں چاشنی اور نمک نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے دل نے نہ تو عشق مجازی کی چوٹ کھائی اور نہ عشق حقیقی کی خلش پائی۔ ابتدائی زمانہ رنگ رلیوں، یار باشیوں اور دواعی شباب کی تواضع میں گذرا اور بڑھاپے میں "سوکھے تقدس" سے دو چار ہوے۔ اس لئے نہ غزل میں درد ہے نہ مثنوی نما خطوط میں کیف۔

محمد مصطفی

(باقی)

# مطبوعاتِ جدیدہ

**شمیمِ عشرت**: مصنفہ سید احمد علی عشرت مرحوم و مرتبہ سید حسن امام صاحب صفحات ۲۸۲ + تقطیع ۸ ½ × ۵ ½ انچ
حضرت عشرت گیاوی مرحوم (۱۲۷۷ - ۱۳۴۳ھ) شوخی رام پوری تلمیذ غالب کے شاگرد اور اپنے وطن کے نہایت مقبول شاعر تھے۔ اُن کے عزیز شاگرد سید حسن امام صاحب نے ان کے دیوان کا انتخاب بڑی آب و تاب سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا ہے۔ بے غرضانہ استاد پرستی کی ایسی مثال اس عہد میں کم ملے گی۔ دیباچہ طویل نہیں، لیکن اس میں مصنف کے مختصر حالات زندگی آ گئے ہیں اور کلام پر مجمل رائے بھی دی گئی ہے۔
مرتب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ حضرت عشرت کے کلام میں دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کا رنگ زیادہ ہے، لیکن اس رائے سے کہ معمولی سے معمولی شعر میں بھی آورد اور تکلف نہیں پایا جاتا شاید ہی عام طور پر اتفاق کیا جائے۔ لکھنؤ کے رنگ ہی میں آورد اور تکلف ہے۔ حضرت عشرت کے کلام کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ زبان، اسلوب بیان، خیالات، جذبات کا پیرایۂ اظہار کسی لحاظ سے بھی وہ اس زمانے کے شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن انھیں پر موقوف نہیں غزل گو شعرا میں بہ کثرت ایسے ہیں جن کے کلام سے مطلق اس کا پتا نہیں چلتا کہ وہ اپنے عہد کے ذہنی ماحول سے کسی حد تک بھی متاثر ہوئے ہیں۔
دیباچے میں عدَن اور عدْن اور حج کعبہ (بدون تشدید ج) سے متعلق جو بحث ہے اس کی نسبت گذارش ہے کہ 'در عدَن' میں عدن کی دال مفتوح ہی ہونا چاہیے' اور حج کعبہ' (بدون تشدید ج) اُسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ایسی مثالیں پیش کی جا سکیں جن میں لفظ 'حج' حالتِ عطف یا حالت اضافت میں استعمال ہوا ہے۔
ہماری نظر سے حضرت عشرت کا مکمل دیوان نہیں گزرا' اس لیے انتخاب کے متعلق اس کے سوا کچھ اور کہنے سے قاصر ہیں کہ اس سے مختصر ہوتا تو بہتر تھا۔ ذیل میں حضرت عشرت کی دو مکمل غزلیں درج کی جاتی ہیں، یہ اُن کی بہترین غزلیں نہ سمجھی جائیں، لیکن ان کے کلام کی عام سطح کا ان سے پتا چل سکتا ہے:

پھر فصل گل کا دور میانِ چمن ہوا — پھر تازہ ان دنوں گل داغِ کہن ہوا
کاہیدہ اس قدر غم دل سے بدن ہوا — بعد فنا نسیم کا دامن کفن ہوا
جس سے نہ بندھ سکا کوئی مضبوط عہد بھی — حیراں ہوں کس طرح سے وہ پیماں شکن ہوا
پھولی پھلی نہ شاخ تمنّا تمام عمر — پامال یاس حسرت دل کا چمن ہوا
دوڑے حسود سنگِ ملامت لیے ہوئے — گر بارور کسی کا نہالِ سخن ہوا
اُدھر چلے گلے جو زخم تو بسمل نے یہ کہا — لے چھوٹا ہاتھ بھی ترا پیماں شکن ہوا
وحشت چمن میں خاک اڑاتی ہے بےکسی — رخصت جہاں سے کون غریب الوطن ہوا

عشرت سنا جو طعنۂ حاسد تو خوش ہوئے — ہم سمجھے یہہ بہاے متاع سخن ہوا

مر کے بھی چھوٹا نہ دامن ہاتھ سے شمشیر کا — واہ کیا کہنا ہمارے خونِ دامن گیر کا

خنجر بیداد نے جب سے رہائی دی مجھے — میں نے پھر آباد گھر دیکھا نہیں زنجیر کا

غیر کی بھی ہے طلب ہم بھی بلائے جاتے ہیں — امتحاں ہے آج شاید برش شمشیر کا

وہ تو ہیں آمادہ میری حلِّ مشکل پر مگر — بوجھ بھی تو دست نازک سے اٹھے شمشیر کا

ہو دل آوارہ باہر حلقۂ گیسو سے کیا — پیچ کچھ اس میں بھی شامل ہے مری تقدیر کا

تشنۂ خوں وہ ہے یاں دل میں اڑا کرتی ہے خاک — کس طرح ارماں دل نکلے کسی کے تیر کا

کس کو ہوگا رنج ظالم کون بیٹھا ہے مرا — بےکسوں کی لاش کو کیا فائدہ تشہیر کا

تُرش روئی کا بتوں کی یہہ اثر ہے بعدِ مرگ — رنگ پھیکا پڑ گیا ہے خونِ دامن گیر کا

خونِ ناحق کرکے میرا کیوں ہوئے بےخوف تم — گر نہیں پرساں ہے کوئی عاشقِ دل گیر کا ق

بازپرس روزِ محشر سے بچو گے کس طرح — کس طرح چھوٹے گا دعوا خونِ دامن گیر کا

خاک چھنوائی جوانی میں ہمیشہ کو بہ کو — حوصلہ عشرت نہ نکلا پھر بھی چرخ پیر کا

## ابجدی

**سیاستِ ملّیہ:** مصنفہٗ محمد امین زبیری صاحب، صفحات ۵۹۹ + تقطیع ۸ $\frac{3}{4}$ × ۵ $\frac{1}{2}$ انچ، شائع کردۂ مصنف؛ قیمت عہ
مسلمانوں کو دعویٰ ہے کہ تاریخ ان کا خاص علم ہے، لیکن کم از کم عہد حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں کو تو یہہ دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہندوستان کے اسلامی دور پر جو قابل ذکر کتابیں گذشتہ پچاس سال کے اندر لکھی گئی ہیں، ان میں بہت کم ایسی ہیں جو کسی مسلمان کے قلم سے نکلی ہوں۔ مسلمانوں کے لیے یہہ صورت حال شرمناک ہو، لیکن، اگر غیر مسلم مؤرّخ واقعیت پسندی سے کام لیتے تو کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کہ علمی دنیا کو تحقیق سے غرض ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نصب العین نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ان مؤرخین میں بہت کم ہیں جو تعصب سے خالی ہیں۔ ہندوؤں کو صدیوں کی غلامی کا مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور برطانوی ہندوؤں کو یہہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آقاؤں کے بدل جانے سے انھیں کس قدر فائدہ ہوا ہے۔ ان کی تصانیف کے پڑھنے کا نتیجہ یہہ ہوا کہ بقولِ مصنف "مسلمان خود اپنی ہی نظر میں حقیر معلوم ہونے لگے" سیاستِ ملّیہ ۱۸۵۷ء سے لے کر اوائل ۱۹۲۱ء تک کی تاریخ ہے، اور مصنف کا مدّعا یہہ ہے کہ "نوجوان سیاسیاتِ ملکی میں اپنی قومیت اور قومی مفاد کو قائم اور پیش نظر رکھ کر آگے بڑھ سکیں" اس عہد سے متعلق مصنف کی معلومات وسیع ہیں، اور وہ چاہتے تو ایک محققانہ کتاب لکھ سکتے تھے۔ لیکن، انھوں نے تبلیغ کو تحقیق پر ترجیح دی ہے اور خالص علمی نقطۂ نظر سے اُن کی کتاب چنداں قابل اعتنا نہیں۔ اس کے یہہ معنی نہ سمجھے جائیں

کہ ہماری رائے میں انھوں نے دیدہ ودانستہ غلط گوئی سے کام لیا ہے، ہمیں کہیں کہیں اُن کا لہجہ اور واقعات کی تشریح وتعبیر قابل اعتراض نظر آتی ہے۔ واقعات کی غلطیاں بھی اس کتاب میں ہیں لیکن، وہ ایسی نہیں جن سے مصنف کے مرکزی دعوے پر کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف قومیں ہیں۔ کوئی اثر پڑ سکے۔

سرسری مطالعے میں جن اغلاط کا ہمیں احساس ہوا یہ ہیں، آئندہ اشاعت میں تصحیح کردی جائے تو نامناسب نہ ہوگا: (۱) صفحہ ۱۷۱ پر محمد علی کو کانگریس کے اسپیشل سیشن کا جو ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوا تھا صدر لکھا ہے، حالانکہ اس سیشن کی صدارت ابوالکلام صاحب آزاد نے کی تھی۔ (۲) صفحہ ۵ پر لارڈ النبرا کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ان کے زمانے میں مسلمان ہندوستان کی آبادی کا دسواں حصہ تھے یہ ہرگز صحیح نہیں، اور غالباً لارڈ انبرا نے بھی یہ نہ کہا ہوگا (۳) صفحہ ۲۱۴ پر لکھا ہے کہ مارچ کے جلسے میں "کانگریس کمیٹی" نے۔ یہ منظور کیا کہ صوبوں میں وزارتیں قائم کی جائیں۔ یہ درست نہیں، اس کے بعد عارضی وزارتیں قائم ہوئی ہیں اور کانگریس نے کئی مہینوں کے بعد عہدے قبول کیے ہیں (۴) صفحہ ۲۱۶ - یہ بیان کہ ابوالکلام صاحب آزاد مئی ۱۹۳۷ء میں جو جمعیت العلماء کا اجلاس بہ مقام مراد آباد ہوا تھا، خاص طور سے شریک ہوئے، غالباً صحیح نہیں۔ (۵) صفحہ ۲۴۴ پر دیسی عیسائیوں کی تعداد ساڑھے چار کرور کے قریب بتائی گئی ہے، یہ قطعاً غلط ہے۔

آئندہ اشاعت میں یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ مدنی صاحب، آزاد صاحب اور گاندھی جی نے کن موقعوں پر ذیل کے خیالات کا اظہار کیا تھا، اور یہ کہاں سے ماخوذ ہیں۔ کتاب میں یا تو حوالہ دیا ہی نہیں گیا، یا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ ناکافی ہے۔

**حسین احمد مدنی صاحب:** "جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ .. ہندوانی اکثریت نہایت تنگ دل ہے اور پھر ہم سے بہ درجہا منظم اور تعلیم یافتہ ہے۔ تعصب اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ پھر.. مسلم اقلیت کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے؟"

**ابوالکلام صاحب آزاد:** "اسلام اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کے پیرووں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ اُن کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے .. ہیں۔ ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے، یا گورنمنٹ پر اعتماد یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت.. نہ تو گورنمنٹ پر اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیے۔"

**گاندھی جی** : "مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا ہمیں سے جدا کیے ہوئے افراد۔ اگر ہم اپنا وقار رکھنا چاہتے ہیں تو تین علاج ہیں : ایک تو یہ کہ اسلام سے ہٹا کر انہیں اپنے دھرم میں واپس لوٹا یا جائے اور اگر یہ نہیں ہو سکے تو پھر اُن کو اُن کے آبائی وطن میں لوٹا دیا جائے اور اگر یہہ بھی دشوار ہو تو اُن کو ہندوستان میں غلام بنا کر رکھا جائے"

## ابجدی

**جواہر العلوم** :۔ مصنفہ طنطاوی جوہری و مترجمہ عبدالرحیم صاحب (مولوی فاضل، منشی فاضل) صفحات ۲۱۹ تقطیع ۲۹×۲۰/۱۶ انچ شائع کردہ مکتبہ بستان بمبئی طنطاوی جوہری مصر کے اُن مولویوں میں ہیں، جن کی دستار فخر پر اُن کے مداحوں نے 'علامیت' کا طرہ لگا دیا ہے۔ جواہر العلوم بہ قول مقدمہ نگار، جناب عبدالسلام ندوی کتاب عالم کی ایک شرح ہی، جس میں "واضح مطالب کو اور بھی زیادہ واضح" اور "پیچیدہ اور متناقض مباحث کی پیچیدگی اور تضاد" کو دور کر دیا گیا ہے اور یہہ بتایا گیا ہی کہ "خدا کی نشانیوں میں جو برائیاں نظر آتی ہیں وہ بھی درحقیقت بھلائیاں ہیں"۔ لسانی کی مصنف میں کمی نہیں، لیکن، کتاب عالم کی ایسی شرح لکھنے کے لیے جس حدّت ذہن، وسعت علم اور قوت استدلال کی ضرورت ہے اُس سے مصنف یکسر محروم ہیں۔ مصنف کو اپنی اس کتاب پر بڑا ناز ہے، اور وہ بے تکلفی کے ساتھ اسے کبھی "باغ ارم کا نمونہ" بتاتے ہیں اور کبھی "ارباب عقل کے لیے ایک تحفہ"۔ انھیں کامل اعتماد ہے کہ اس سے "ادیب تسکین قلب حاصل کریں گے اور گرامی قدر علما کو ۔۔ دلی سرور حاصل ہوگا" ادبا اور علما کی طرف سے تو ہمیں کچھ کہنے کا حق نہیں، لیکن، ذاتی طور پر ہم یہہ محسوس کرتے ہیں کہ اہل یقین کے لئے یہہ کتاب لاحاصل ہی۔ اس لیے کہ ان کے یقین کا درجہ اس کے مطالعے سے بڑھ نہیں سکتا۔ اور اہل شک کے لیے اس کا مطالعہ مضر، اس لیے کہ اس سے اُن کے شکوک میں اضافہ ہونے کا گمان ہے۔ اس قسم کے مباحث پر ہندوستان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اس سے کہیں بہتر ہیں۔ کتاب مکالمے کی شکل میں ہے۔ مکالمہ ایک پردہ نشیں لڑکی اور ایک نوجوان مرد کے درمیان لڑکی کی بہنوں اور سہیلیوں کے سامنے ہوتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :

خاتون نے کہا "آپنے انسان کے طبقۂ اناث میں حسن و جمال کا ذکر کرکے میرے دل میں ایک شبہہ پیدا کر دیا ہے وہ یہ کہ ۔۔ توالد تناسل کی محبت ذکور و اناث دونوں میں برابر ہے، اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو حسن و جمال کے ساتھ کیوں مخصوص کیا گیا۔ برعکس اس کے مرغیوں میں مرغ کو یہہ مزیت عطا کی گئی"۔

ابراہیم نے کہا عورتوں میں خواہش نفسانی ۔۔ مردوں کے مقابلے میں زائد ہے، اور اکثر دنیاوی دھندوں ۔۔ میں ۔۔ مصروف رہتا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اگر صنف نازک میں خاص کشش نہ ہوتی تو وہ ادھر بہت کم توجہ کرتا مرغیوں میں معاملہ برعکس ہے، اس لیے مرغ کو حسن و جمال کا مظہر پیدا کیا تاکہ مرغی میں اس کی جانب کشش پیدا ہو"۔
اس سے قطع نظر کہ اس قسم کی گفتگو مصنف کے زمانے کی ایک کم سن لڑکی سے جس کا مبلغ علم بھی کچھ زیادہ نہیں، کس قدر نامناسب ہے، مصنف کو یہہ بات نہ معلوم کہاں سے معلوم ہوئی کہ عورتوں میں خواہش نفسانی مردوں سے زیادہ

ہوتی ہے۔ یورپ کے علمائے جنسیات متفقہ طور پر اس کے خلاف ہیں۔
خاتون نے کہا "عجائب المخلوقات میں لکھا ہے کہ بلوچستان میں سرباس نام ایک جانور ہے جس کی ناک کے بانسے میں بارہ سوراخ ہیں اور وہ جب سانس لیتا ہے اور اس کے سوراخوں سے.. ہوا نکلتی ہے تو اس سے ایک عجیب موسیقی پیدا ہوتی ہے.. دوسرے حیوانات.. جمع ہو جاتے ہیں، اور وہ.. جس کو چاہتا ہے شکار کر لیتا ہے اور جب اس کا مطلب پورا ہو چکتا ہے تو انھیں سوراخوں سے ایک ہولناک آواز نکال کر ان کو منتشر کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بانسری اسی.. کی ناک کو دیکھ کر ایجاد کی گئی ہے.." ابراہیم نے کہا.. "ممکن ہے اس قسم کا کوئی جانور زمانۂ قدیم میں موجود ہو لیکن، اب اس کی نسل باقی نہ ہو۔ سرباس.. کو دیکھ کر بانسری ایجاد کرنا بعید از قیاس نہیں"۔ ممکنات کا دائرہ بہت وسیع ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ انسان آگے چل کر شتر مرغ ہو جائے۔
"جب وہ (عقلمند انسان) سورج چاند ستارے دیکھتا ہے اور ان کی نورانیت پر غور کرتا ہے تو اسے وہ یہ سبق اخذ کرتا ہے کہ.. غذا کم کھاتا ہے اور سنت وضو اور غسل کی پوری پوری پابندی کرتا ہے"۔
آج کل سامان خورد و نوش کی جو کمی اور گرانی ہے اسے دیکھتے ہوئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ لوگ اپنا زیادہ وقت اجرام سماوی کے مشاہدے میں صرف کریں؟ حکومت کا فرض ہے کہ اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے۔
"یورپ کے محققین نے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتوں کا موازنہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عورت جس قدر تعلیم میں آگے بڑھتی ہے اسی نسبت سے اس کے قوائے جسمانی و روحانی تنزل پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں"۔
اس پر رائے زنی کی ضرورت نہیں۔
ترجمے میں نامانوس عربی الفاظ کی کثرت ہے، جابجا فارسی اردو کے شعر بھی نظر آتے ہیں، مترجم نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ کہیں کہیں عربی اشعار کا انھوں نے ترجمہ نہیں کیا۔ ترجمے میں کئی جگہ اس قسم کے فقرے نظر آتے ہیں: "علامہ طنطاوی فرماتے ہیں"۔ یہ تو ناممکن ہے کہ خود مصنف نے اس طرح لکھا ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ مترجم نے یہ فقرے کیوں بڑھائے۔

ابجدی

---

۵ا حضرت عشرت کا مصرع ہے: "آدم سے گلستانِ عَدن چھٹتا ہے" یہاں عدْن بہ سکون دال چاہیے۔ عَدَن اور عدْن دو مختلف لفظ ہیں۔

# دیوانِ میر رضا عظیم آبادی

۱

ایمن کی تھی نہ وادی و نہ نخل طور تھا — روشن ہمارے دل میں ترا جب سے نور تھا ۱

کچھ فائدہ نہ تھا اُسے اظہار خلق سے — منظور اس ہی پردے میں اپنا ظہور تھا ۲

یارب نہ کیجو ہم کو خجل روز حشر میں — رحمت پہ تیری اپنے گنہ کا غرور تھا ۳

نزدیک سے جو دیکھا تو دل ہی حق کا گھر — کعبے کو دور جاننا اپنا قصور تھا ۴

لائق نہ کار دین نہ دنیا کے کام کا — اس دل کا پیدا کرنا بھلا کیا ضرور تھا ۵

شورش تھی اپنے اشکوں کی عالم میں جب سے تب — طوفان نوح کا تھا نہ جوشِ تنور تھا ۶

دی دل سی چیز اُس کو رضا اک نگاہ پر — اے بے شعور کچھ بھی بھلا یہ شعور تھا ۷

۲

یہ جا ہے کعبہ جس کا در ہو مسجود عالم کا — محمدؐ نام اس کا ہے محمود عالم کا ۱

جو کچھ چاہے سو لے دل بے حجاب احمدی سے آ تو — سخاوت اُس کی کا ٹکڑا ہے سارا جود عالم کا ۲

حدیثِ احمدِ بے میم سن بے سائگی کو دیکھ — روا ہے اُس کے تئیں کہیے اگر معبود عالم کا ۳

رضا مقبول اگر آل نبی کا ہے تو کیا غم ہے — ہوا محروم عالم کا کہ یا مردود عالم کا ۴

۳

دل اب ویراں ہے کیوں کاشانہ تیرا — ہوا کیا ہائے صاحب خانہ تیرا ۱

بتا لے لالے میری طرح سے ہائے — بھرا ہے خوں سے کیوں پیمانہ تیرا ۲

کہے ہے قیس بھی سودائی اس کو — ہوا ہے جو کوئی دیوانہ تیرا ۳

نہ الجھا اپنی زلفوں کو صبا سے — دل صد چاک ہوگا شانہ تیرا ۴

کبھی ہم سے ادھر آتے ہیں مجنوں — رہے آباد یہ ویرانہ تیرا ۵

یہی اپنے ہیں طالع ہیں کہاں سے — یگانہ غیر ہے بیگانہ تیرا ۶

ترے نالوں سے ہم سائے تو مر گئے — رضا دشمن نہ ہو ہم خانہ تیرا ۷

۴

آج محفل ہی میں آنے سے ترے سکتہ نہ تھا — کل چمن میں کون سا گل منہ ترا تکتا نہ تھا ۱

رات اس کی بزم میں جوں شمع مجھ کو رشک سے — تک جاتے تھے چلے پر پاؤں اُٹھ سکتا نہ تھا ۲

غیر کے گھر جاتے ہو جو اب نہیں اٹھتے قدم — میں کب تک یاں آئے کبھی تھکتا نہ تھا

۴ اپنے حرماں کا سبب ضبطِ نفس کا تھا خلل — ورنہ کس دریا میں یاں کے گوہر یکتا نہ تھا
۵ راتوں کو جانے کا اُس کوچے میں اب دیکھا مزہ — میں اسی دن کے لیے کیوں اے رضا بکتا نہ تھا
۱ سنتے ہیں روؤں سے شاید وہی رضا تھا ۵ بسمل سا تیری رہ میں اک نوجواں پڑا تھا
۲ کیا دیر و کیا حرم ہائے سر سب جگہ پہ پٹکا — حاصل ہوا نہ ہم کو جو اپنا مدعا تھا
۳ اچھا ہوا نہ بےتاب ہو کر موا کہ ہم کو — اس خوں گرفتہ دل نے بے چین کر رکھا تھا
۴ مت لہلہا چمن تو کھلنے پہ گل کے اک وقت — داغوں سے دل بھی اپنا گلزار ہو رہا تھا
۵ کیا جور کیا جفا میں کیا ناز کیا ادا میں — دیکھا زیادہ اس سے جتنا تمھیں سنا تھا
۶ اب ہر کسی کی باتیں سنتا جو ہے رضا تو — کہنا بھلا ہمارا کہنا تو کیا برا تھا
۱ اپنے بیمار سے بتلا تو تجھے کیا کرنا ۶ مرنے دینا اُسے یا اُس کا مداوا کرنا
۲ اشک گرم اس کو نہ کہہ آیا یہ ہے معجز عشق — آتش و آب کو اک کاسے میں یک جا کرنا
۳ رشک آئینے پر آتا ہے کہ بے خوفِ رقیب — سینہ کھولے ہوئے منہ کو ترے دیکھا کرنا
۴ سچ کہو میر رضا کس پہ ہوئے ہو عاشق — بے سبب تو یہ نہیں ہر گھڑی رویا کرنا
۱ سینہ ہمارا غم سے کبھی خالی کم رہا ۷ دردِ جگر گیا ہے تو دل کا الم رہا
۲ غم بھی ترا تو کوئی بلا نوشِ دور تھا — اس سے نہ دل میں خون نہ آنکھوں میں نم رہا
۳ رنگِ حنا ہے اتنا کہاں سرخ سچ بتا — کس بے گنہ کا خوں ترے ہاتھوں میں جم رہا
۴ چاہا تھا ہل کے وصل میں روئیں گے خوب سا — سو اشک آ کے آنکھوں میں حیرت سے تھم رہا
۵ جنت میں پھر خوشی نہیں ممکن ہے اے رضا — دل میں اگر وہاں بھی یہی تیرے غم رہا
۱ کیا جانیے کس طرح کی لے کر خبر آیا ۸ قاصد مرا کچھ آج ہے پھر چشم تر آیا
۲ زلفِ بتِ مغرور میں جب شانہ در آیا — رتبہ ہمیں تب چاکِ جگر کا نظر آیا
۳ اے لالے یہ سوزش تھی ہمارے ہی جگر سے — پر اُس بت بے رحم کے دل سے نہ بر آیا
۴ بادل جو بھرے دیکھے طرف مے کدے کے کل — یاد آتے ہی اُس ساقی کی دل اپنا بھر آیا
۵ خنجر کو ترے دل سے میں اب کہاں تک — اس غم میں تو ظالم مرے منہ تک جگر آیا
۶ ہمسائے کی جاتی رہی نالوں سے ترے نیند — خاموش تو رہ اب بھی کہ وقتِ سحر آیا
۱ جب تک جیا میں عشق میں حیران ہی رہا ۹ اپنے کیے سے آپ پشیمان ہی رہا

آیا نہ وقت نزع بھی بالیں پہ یار ہائے — ہم مر گئے پہ جی میں یہ ارمان ہی رہا ۲

دیکھی تھی ایک رات تری زلف خواب میں — پھر جب تلک جیا میں پریشان ہی رہا ۳

غیروں کے لگ گئے گلے جب چاہا جس گھڑی ——— لیکن رضا سے وعدہ و پیمان ہی رہا ۴

۱۰

رہا گر یہی طور اُس بے وفا کا — نظر پھر نہیں آتا جینا رضا کا ۱

یہاں شوق غالب وہاں رشک مانع — عجب حال ہے اس دل مبتلا کا ۲

وفا پر دل اپنے کی روتا ہوں ظالم — گلہ کچھ نہیں مجھ کو تیری جفا کا ۳

ہوا صفحہ خورشید کا مشق میرا — میں شاگرد جب سے ہوا ہوں ضیا کا ۴

ٹک اک تو ہی کھول آہ اس دل کا غنچہ — نہ احسان ہو ہم پہ بادِ صبا کا ۵

رضا چھوڑ سب خویش و بیگانہ کو تو ——— ہوا آشنا ایسے بے آشنا کا ۶

۱۱

تماشا باغ کا جائے نہ اُس بن ہم کو صحرا کا — تری گردن پہ ہے غیرت یہ خون اپنی تمنا کا ۱

گیا ڈھے بے ستوں بھی اور حرم بھی ہو چکا ویراں — ہوا قضیا نہ آخر آہ پر شیریں و لیلیٰ کا ۲

ہوئی تعمیر دل اپنی خراب اشکوں کے سیلوں سے — نہ تھا جوش تنور اور یہ اُبلنا تھا نہ دریا کا ۳

رفو پھر کیجیو پیراہنِ یوسف کو اے خیاط — سیا جائے تو سی پہلے تو چاک دل زلیخا کا ۴

نہ اس کو ترس حق ہے نہ ترس تیرے پر تر سے ——— رضا عاشق ہوا ظالم تو کس نا ترس ترسا کا ۵

۱۲

کس نے دل کا علاجِ داغ کیا — کیوں مرے گھر کو بے چراغ کیا ۱

کم ملا جو تیری گلی میں گیا — ہم نے دل کا بہت سراغ کیا ۲

جو ہیں گلشن میں گئے کہ غنچے کے — مسکرانے نے اور داغ کیا ۳

گل کی مت کہہ رضا کہ اُس بن ہائے ——— اس کی بو نے تو بے دماغ کیا ۴

۱۳

بھولے سے بھی... ایدھر نہ آ پھرا — ہر چند اس کو میں نے کہا سر پھرا پھرا ۱

تھک بیٹھ آیا اب تو بڑھاپا بھی اے رضا ——— اے خانماں خراب بہت تو چلا پھرا ۲

غیروں کا اس طرف سے گذارہ نہ جائے گا — جب تک کہ ایک دو کہیں مارا نہ جائے گا ۱

نرگس اُگے گی سبزے کی جا خاک سے مری — یاروں کا مرنے پر بھی نظارہ نہ جائے گا ۲

یہہ دل ہے لڑکوں کا نہ گھروندا سمجھ اسے — بگڑا تو پھر کسی سے سنوارا نہ جائے گا ۳

گھر پر رقیب خانہ برانداز کے رضا ——— ہوگا اگر تو یار ہمارا نہ جائے گا ۴

۱ گر گریباں سیا تو کیا ناصح ۱۵ سینے کا چاک بن سیا ہی رہا
۲ مست غم بلبلے سری کہرا کے —— جب تلک میں جیا جفا ہی رہا
۱ محبت سے جب تک سروکار تھا ۱۶ یہ جینا بھی ہم کو تو دشوار تھا
۲ رہا کے نہ ہو مرنے کا کیوں کے غم —— خدا بخشے اُس کو عجب یار تھا
۱ گل مزاج اُس تند خو کا سخت بے رحمانہ تھا ۱۷ جو گلی کوچہ تھا اس بستی کا ماتم خانہ تھا
۱ جب تلک جئیں گے جی سے یہ ماتم نہ جائے گا ۱۸ ہم جائیں گے پر آہ ترا غم نہ جائے گا
۲ جو باعث حیات تھے سو یار مر گئے اب دیکھنا ہے کس طرح یہ غم نہ جائے گا
۳ سو عید اگر زمانے میں لائے فلک ولیک گھر سے ہمارے ماہِ محرم نہ جائے گا
۴ دکھلائیں گے ہم ابر تجھے اشک باریاں خونِ جگر جو پلکوں پر آ جم نہ جائے گا
۵ نت ایسا حادثہ ہوا اٹھا یا کرے گا چرخ —— پھر کوئی جہان سے خوش و خرم نہ جائے گا
۱ دل کی بے تابی سے عشق چھپایا نہ گیا ۱۹ نام کس نے لیا تیرا کہ میں پایا نہ گیا
۲ حسرت لبنے نہ دی جس کے تئیں قتل کیا پھر مسیحا سے بھی وہ کشتہ جلایا نہ گیا
۳ رات کو خواب میں دیکھا جو اُسے کیا کہیے صبح تک جی سے پھر اک لحظہ بھلایا نہ گیا
۴ بعد یک عمر کے احوال جو پوچھا اُس نے آ گیا رونا ہمیں حال سنایا نہ گیا
۵ مر گیا سر کو پٹک کوہ کن آخر غم سے —— عشق کیا سنگ گراں تھا کہ اٹھایا نہ گیا
۱ اک نگاہ مستِ نیسی کی کہ دیوانہ کیا ۲۰ آئینہ خانے کو مجھ دل کے پری خانہ کیا
۲ جلوہ گر جس دم ہوئے نازو نیاز عالم ہیچ تجھ کو شمع بزم خوبی مجھ کو پروانہ کیا
۳ ہم سے کیا تقصیر ایسی ہوئی جو تم برہم ہوئے —— سرمہ آنکھوں میں دیا یا زلف کو شانہ کیا
۱ جب ناز سے وہ کہتا ہے چل جا نہیں آتا ۲۱ اُس وقت مرے دل میں ہے کیا کیا نہیں آتا
۲ تو غیر کنے جاتا ہے حیرت ہے یہ مجھ کو کتا جہاں رہتا ہے فرشتہ نہیں آتا
۳ کچھ آپ ہی تجھے وعدے کی شرم آئے وگرنہ —— مجبور محبت کو تقاضا نہیں آتا
۱ اُس کے سب بات جس نے تئیں کیا نہیں آتا ۲۲ اک درد محبت کا مداوا نہیں آتا
۲ سو جان پہ بھی دیجیے نہیں ایک نگہ کو لڑکا دا ابھی تو تجھے سودا نہیں آتا
۳ اُس دشمن عاشق کو کوئی پوچھو تو جا کر کیا آتا ہے غیروں کو ہمیں کیا نہیں آتا

سو غمزے کے رکھتا ہے نگہبان پس و پیش — آتا ہے اکیلا پر اکیلا نہیں آتا ۱

میں پیر ہوں میخانہ کا اے شیخ و لیکن — جو طور پرستش کا ہے یاں کا نہیں آتا ۵

تو نے تو نکالا نہیں سچ کہنا رضا کو — کہتے ہیں سبھی اس کے تئیں آہ نہیں آتا ۶

۲۳ کون سد ہوئے میرے قاتل کا — دیکھے پھر کر تڑپنا بسمل کا ۱

رہ روؤں سے ادھر نہ کوئی پھرا — کس سے پوچھیں نشان منزل کا ۲

اب کیا کیا خرابی ہم پر ہا سے — خانماں ہو خراب اس دل کا ۳

ف تجھ سے نہ سلجھے گی شانے — ہے یہ عقدہ رضا کی مشکل کا ۴

۲۴ ل یار سیر کرنے جو گلزار کو گیا تھا — نظروں میں بلبلوں کی گل خار ہو گیا تھا ۱

وصل آیا ہائے تو بھی نکلے ہے نالہ گرم — کیا ہجر میرے دل میں انگارے ہو گیا تھا ۲

پنا بھی کوچہ اک دن گریہ ستاں تھا اے ابر — روتا ہی وہ گیا تھا ایدھر سے جو گیا تھا ۳

ب تو ق ے چلا تو پھر اس گلی میں مجھ کو — آگر جہاں میں اک بار دل اپنا کھو گیا تھا ۴

انگارے جا ہے باراں برسا کریں ہیں تب سے — میں دل جلا کسی دن دریا پہ رو گیا تھا ۵

چھڑ آب چشم تر ہے یارب تو صبر کیجو — کل رو کے یہ رضا تو عالم ڈبو گیا تھا ۶

۲۵ کیا کہوں حال دل کی حسرت کا — خانہ ویراں ہو اس محبت کا ۱

گور میں بھی نہ دل کو آیا چین — کیسا ہوں دیوانہ اپنی وحشت کا ۲

دل دیا ایک نگہ پہ بس رضا — کچھ ٹھکانا ہے ایسی ہمت کا ۳

۲۶ جگر کے ٹکڑے چن چن کر بھرے ہیں خوان آنکھوں کے — کیا ہے دل نے اب یہ ٹھاٹھ کس کی میہمانی کا ۱

ی ہے غم سی دردل نہ بجھے گی کیوں کے صحبت ہائے — کبھی دیکھا بھی ہے گا ساتھ رہتا آگ پانی کا ۲

گر ہم سانس بھی لیں ہیں تو زندہ دل ہی نکلے ہے — کچھ اب احوال مت پوچھو ہماری ناتوانی کا ۳

جواں مارا رضا کو تو نے جرم عشق پر ظالم — نہ آیا حیف تجھ کو دھیان اس کی نوجوانی کا ۴

۲۷ دل آوارہ نے ہا ہی مجھے حیران کیا — چشم خوں بار نے اک اور بھی طوفان کیا ۱

عمر نوح اس کے تئیں بار خدایا دیجو — قطرۂ اشک کو جس نے مرے طوفان کیا ۲

عاشقوں کی گئی غیرت ترے جینے سے رضا — اس ترے صبر نے ہم کو بھی پشیمان کیا ۳

۲۸ اس بت عیار نے کچھ تو توہم کیا — روتے جو دیکھا مجھے آج تبسم کیا ۱

۲ تیرے تظلّم کو دوست ......... دشمنوں نے دیکھ کر جس کو تبسّم کیا

۳ کھوج میں اُس شوخ کا پھرتا ہوں ہے اس طرح ــــ اپنے تئیں اے رضا تونے مگر گم کیا

۱ نہ ہم نے سرو نہ شمشاد کا خیال کیا ۲۹ کسی نے قد کو دکھا کر ہمیں نہال کیا

۲ نہ دیکھی خواب میں پھر ہنستے خواب کی صورت میں ایک دن تری صورت کا جو خیال کیا

۳ نظر اٹھا کے جدھر دیکھی کربلا ہے جہاں الٰہی کس کے یہ غمزے نے ہے قتال کیا

۴ قفس سے صوت گئی کس کے نالے کی اُس تک زبانِ مرغِ چمن کو یہ کس نے لال کیا

۵ ہزار حیف ہے اے آہِ بے اثر تجھ سے نہ پہنچی اُس تلک اور مجھ کو خستہ حال کیا

۶ زباں جو بزم میں کاٹیں ہیں شمع کی ہر شب خدا ہی جانے پتنگے سے کیا سوال کیا

۷ کٹے گی کیوں کے رضا کی الٰہی شب ــــ دن ہی کو اُن نے تو روبرو خراب حال کیا

۱ تم نے آباد کسی کا گھر نہ کیا ۳۰ اس طرح پر کبھی گذر نہ کیا

۲ یار کی کچھ نہ دی خبر ہرگز جب تلک ہم کو بے خبر نہ کیا

۳ میرے نالوں سے عرش لرز گیا پر ترے دل میں کچھ اثر نہ کیا

۴ مار ڈالا رضا کو ناحق ہائے ــــ کچھ بھی ظالم خدا کا ڈر نہ کیا

۱ ہر چند حال دل کا میں کہہ کہہ کے تھک گیا ۳۱ اُن نے نہ پوچھا کون تھا اور کیا یہ بک گیا

۲ آخر وفا نے کس پہ نہ بابلیٰ ہے کے آب آہوں سے دل جگر تو ہمارا دہک گیا

۳ تھا لگ رہا رقیب ترے در پہ مجھے دیکھا جو آتے پھر دبے پاؤں کھسک گیا

۴ اک بار اے رضا کہیں دل بھر کے روئیے ــــ مردم کے تیرے رونے سے جی اتنا لگ گیا

۱ جس کو جانا دوست سو دشمن ہی آخر ہو گیا ۳۲ دل مرا آپ آشنائی سے مکدّر ہو گیا

۲ ہجر کا پیغام یا تھی یاس کی کچھ بات ہائے سنتے ہی قاصد جسے دل میرا مضطر ہو گیا

۳ جس کو تونے بھر نظر دیکھا قیامت اُس پہ ہوئی بات جس سے تونے کی اُس پر تو محشر ہو گیا

۴ وقت میں لیلیٰ کے پیارے عشق تو اک بات تھی عہد میں اب آکے تیرے ایک دفتر ہو گیا

۵ میں نے کل پوچھا رضا سے سوز کا دل کے بیاں ــــ شمع ساں اک آہ کی اور وہیں آخر ہو گیا

۱ فلک گر ہم کو تو رسوا کرے گا ۳۳ بھلا ہم ہو چکے پھر کیا کرے گا

۲ منائے گا کوئی تجھ کو کہاں تک اگر ایسا ہی تو روٹھا کرے گا

رضا ہو بے قرار ایسا دن ہی سے ـــــ خدا جانے کہ شب کو کیا کرے گا ۶

ہمیں قاصد خبر اُس کی کرے گا ۳۴ گر اپنے حال کی کچھ سُدھ رکھے گا ۱
ملیں گے داغ ہی اس سینے کو یارب کسی چھاتی سیتی بھی یا لگے گا ۲
نیاز و ناز کب دیویں گے فرصت کہوں گا حال میں اور تو سنے گا ۳
دوانوں کا ترے جب حشر ہوگا قیامت شور محشر میں پڑے گا ۴
ہر گہہ ہم دم رضا کے قتل کا ذکر ـــــ تری اِن باتوں سے لوہو بہے گا ۵

حال جس نے مرا سُنا ہوگا ۳۵ اُن نے سنتے ہی رو دیا ہوگا ۱
یارب رحم مجھ میں صبر نہیں یارب اس کا مآل کیا ہوگا ۲
میں نے جو کچھ سنا ہو تیری کبھی تو نے بھی یہہ کہیں سنا ہوگا ۳
اُس کی مجلس میں کل چلا یہہ ذکر ق کوئی ایسا نہ مبتلا ہوگا ۴
اس طرح کل اُسے میں دیکھا تھا کہ وہ اب تک تو مر گیا ہوگا ۵
وہیں آنکھیں دکھا کے کہنے لگا اس کے مرنے سے میرا کیا ہوگا ۶
یہہ سنا ہوگا جب رضا نے ہائے ـــــ اُس کے کیا دل پر آ گیا ہوگا ۷

بھرے سا اس بے خبر دنیا میں کوئی کیا اپنا پیمانہ ۳۶ حباب آسا کھلی جب آنکھ یاں تب وہیں مر جانا ۱
عجب یہہ آب خور ہم کو ملی ہو تیری فرقت میں گہے خونِ جگر کھانا گہے آنسو کا پی جانا ۲
بھلے ہیں ہم تو اے ساقی تری اس چشم سے گوں سے بلا سے پھوٹ جائے شیشہ اور گر جائے پیمانہ ۳
عجب کچھ نام نکلا ہو ترے کوچے میں اپنا بھی کوئی کہتا ہو سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ ۴
رضا ہو سجدہ گاہ اپنی کسی کی اب تو چوکھٹ ہی ـــــ خدا جانے حرم کیا ہو کسے کہتے ہیں بت خانہ ۵

یہ کیا سچ ہو اس کو پیار سے بتانا ۳۷ ادھر وعدہ کرنا اُدھر بھول جانا ۱
مرے ابر ایہر لیسے تیری گلی میں گیا تو بھی اپنا نہ یہہ آنا جانا ۲
یہ رحم و ستم اکٹھا سیکھے ہو کس سے ادھر گھورنا اور اُدھر مسکراتا ۳
گئی نیند سوتوں کی خواب عدم کے ـــــ رضا کیا قیامت ہے تیرا فسانہ ۴

نہیں معلوم صدمہ کس کے غم کا رات اس پر تھا ۳۸ سحر دیکھا رضا کو تو نہایت ہی وہ مضطر تھا ۱
پلا آبِ حیات اے خضر اپنا اور کو ہی تو پیا ہم نے جو کچھ قسمت میں اپنی آبِ خنجر تھا ۲

۳ عجب راحت سے گزری رات اپنی اور اُس کی کل وہاں تھا زیر سر زانوے غیر یہاں کا پتھر تھا

۴ شب ہجراں تو کچھ دونی بلا اور ہی نظر آئی جدائی کا ترے ہم جانتے تھے دن ہی بدتر تھا

۵ عبث [illegible] اے غم دل پریاں ہم کے سے کیا حاضر تری خاطر ہمیں جو کچھ میسّر تھا

۶ اجل نے آہ سبقت کی ترے آنے کی آگی سے تو جب تک پہنچے پہنچے یاں کہ اپنا کام آخر تھا

۷ طبیب بنا ہپٹ تو مشق کیا جانے کیا سمجھے اگر کہنی . . . . . . . . . ہمارا حال بہتر تھا

۸ رضا پر کیسی کیسی آفتیں تھیں رات تجھ بن ہائے —— شب ہجراں تھی تیری یا کہ ظالم روز محشر تھا

۱ بوسہ ہی لینے پہ ظالم نے نہ جمدھر کھینچا ۳۹ یاں بھی ہم نے چھوا اُن نے تو خنجر کھینچا

۲ بے طلب غیر کے آجاتا تھا واعظ افسوس جذبۂ عشق نہ تو نے اُسے ایدھر کھینچا

۳ دیکھیے حضرت دل کس پہ کرم کرتے ہیں عشق نے کھینچا اِدھر عقل نے اودھر کھینچا

۴ یہ تجلی جگر کے کرا ہے خواب لخت دل چشموں نے اشکوں کی جگہ پر کھینچا

۵ ابروے یار کا باں تک تھا رضا محو خیال —— غیر کی تیغ سے بھی اُن نے نہیں سر کھینچا

۱ ذکر ہر ایک آن ہے تیرا ۴۰ ہر گھڑی دل میں دھیان ہے تیرا

۲ توڑتا آئینے کو رشک سے لیک یار منہ درمیان ہے تیرا

۳ دل کو شانے کے ہاتھ سے کھینچا زلف یہہ میہمان ہے تیرا

۴ ہم نہ کہتے تھے مت مل اُس سے رضا ق اس میں ظالم زیان ہے تیرا

۵ دیکھ تو اب بھلا زمانے میں —— کچھ بھی نام و نشان ہے تیرا

۱ جب میں گل رخاں کا یار ہوا ۴۱ سب کی نظروں میں خوار و زار ہوا

۲ [illegible] جس سے اور بھی دل [illegible] رہا

۳ انتقیار ہی تو ہم کریں گے دور ہم کو گر کچھ بھی اختیار ہوا

۴ کس کا تیر نگاہ یہہ چھوٹا لگتے ہی دل کے وار پار ہوا

۵ کہتے تھے تجھ کو مت مل اُس سے رضا —— اپنے ہاتھوں تو آپ خوار ہوا

۱ جس بلاکش سے یار آ نہ ملا ۴۲ اُس کو جینے کا کچھ مزہ نہ ملا

۲ داغ دل پر جگر پہ زخم اے عشق تیری دولت سے ہم کو کیا نہ ملا

۳ ہائے جز اشک داغ کے ہم سے —— گرم ہو کوئی اے رضا نہ ملا

یار کے رخ نے کبھی اتنا نہ حیراں کیا ۴۳ فکر سرِ زلف نے جیسا پریشاں کیا ۱
ایسا کسی سے جنوں دستِ گریباں نہ ہو چاک گریباں کا بھی چاک گریباں کیا ۲
کرچکا تھا زہر رشک پرشے میں کارا پنا لیک تیغ جدائی نے زور کارِ نمایاں کیا ۳
عشق ترے ہاتھ سے تو ہی بتا کیا کریں وصل میں حیراں کیا ہجر میں گریاں کیا ۴
عیش و غم باغ دہر دہم ہے ٹک گل کو دیکھ چاک کیا تو کہے میں کہوں خنداں کیا ۵
اُس کا چراغِ مراد رہیو فروزاں مدام داغوں سے دل کو میرے جس نے چراغاں کیا ۶
عشق کی کیا تربیت تجھ سے کہوں لے رضا ـــــ آہ کو نالہ کیا نالے کو افغاں کیا ۷
دی غم نے آگ دل کو کہ یارب جگر جلا ۴۴ ان دو گھروں میں کون سا یہ آہ گھر جلا ۱
غم دل سمجھ کے تو نے جلا اس کو آگ دی خانہ خراب دیکھ تو کس کا یہ گھر جلا ۲
سوز و تپش رضا کی نہ کچھ پوچھ مجھ سے آہ ـــــ جوں شمع غم کی آگ میں سر تا بہ سر جلا ۳
آئینہ ہم ہوئے تو وہ مکھ چھپا چلا ۴۵ گرنا کہ راہ کی ہوئے دامن اٹھا چلا ۱
کس نے کہا تھا اس کو کہ تو مریو نامراد ـــــ ناشاد ہی زمانے سے آخر رضا چلا ۲
نہ کہہ یہ کہ گھر یار کل جائے گا ۴۶ مرا آج ہی جی نکل جائے گا ۱
کروں کیوں کے دل خوش فقط یاد سے یہ لڑکا نہیں جو بہل جائے گا ۲
نہ فانوس سے گرمی کرا تنی شمع پتنگے کا جی غم سے جل جائے گا ۳
رضا نوجواں ہے نہ سمجھا اسے ـــــ یہ آخر کو آپ ہی سنبھل جائے گا ۴
رضا کا یار سے ہونا جدا ہی ہم کو اچھا تھا ۴۷ کبھی درد اپنا کہنے کو ہمارے یاں آنا تھا ۱
کٹے یہ دس دن اپنی زندگی کے روتے ہی روتے کبھی ہم نے جو اس کو خواب میں اک رات دیکھا تھا ۲
ہوئی اُس کے مارا ہم کو یہ بھی خوبیِ قسمت ہمارا ہو گیا قاتل جو عالم کا مسیحا تھا ۳
کہوں ہمدم خرابی رات کی کیا جوں گل و شبنم میں رو رو حال دل کہتا تھا وہ سن سن کے ہنستا تھا ۴
سزا اس کی یہی ہے اب گریباں اپنا پھاڑا کر ـــ رضا دامن کو اُس کے ہاتھ کیوں تو نے لگایا تھا ۵
دنیا کا عجب کہ خوب بر دیکھا کہا سنا ۴۸ جوں کوہ ایک ہی نظر آیا کہا سنا ۱
ہنس کر چمن کے تخت پہ کر بیٹھا جیب چاک بادِ صبا کا غنچے نے یہ کیا کہا سنا ۲
کیا یہ نہیں سنا ہے کہ ہم بھی ہیں سن چکے غیروں سے تم نے دل کے جو کچھ تھا کہا سنا ۳

۴ رخصت تمھونسے دوستو لاچار ہوتے ہیں — سب کیجیو معاف ہمارا کہا سُنا

۵ اک دم کے واسطے نہ کیا کیا کیا اے رضا — دیکھا، چھپایا، توڑا، بنایا، کہا سنا

۴۹

۱ جو ترے در پہ میری جاں آیا — مرگیا کہتا میں کہاں آیا

۲ دیکھیں اب کس کا پردہ اٹھے گا — حرف شکوہ سرِ زباں آیا

۳ مت اٹھا اس کو سوجہت سے ہائے — در پہ تیرے یہ ناتواں آیا

۴ تیرے ہاتھوں سے بے قراری دل — جی ہمارا بھی اب بہ جاں آیا

۵ تو تو ایک ہی طرف سے یاں سے گیا — غم ہزاروں طرف سے یاں آیا

۶ مر ہی جانا بھلا ہے میر رضا — یار اب بہر امتحاں آیا

۵۰

۱ کچھ عمر میں نہ پوچھ حال دل کا — مرگئے نہ گیا ملال دل کا

۲ میں خواب میں آہ تجھ کو دیکھوں — ہے یہ ہی مرے خیال دل کا

۳ کچھ ہم سے نہ پوچھ پھول پھل کی — اگتے ہی جلا نہال دل کا

۴ حسرت نہ مٹا دی اس کی تجھ پر — ... کے پڑے وبال دل کا

۵ ویراں ہے رضا کا سینہ کیوں آج — شاید ہوا انتقال دل کا

۵۱

۱ آنکھوں سے جائے اشک گراخوں جلا ہوا — پان و مسی کا کس کی یہ دل مبتلا ہوا

۲ سنبل سے بھاگتا ہوں میں وہ زلف بوجھ کر — رسّی سے ڈرتا سانپ کا ہے کا کٹا ہوا

۳ ہم نے سوا وفا کے سنایا نہ کچھ تجھے — کس کے کہے سے کہہ تو یہ تو بے وفا ہوا

۴ دیکھا رضا کو میں نے عجب طرح ایک دن — ق — سر ننگے پا برہنہ، گریباں پھٹا ہوا

۵ سنتے ہی اس نے ایسا پڑھا مطلع اس گھڑی — مضمون جس کا خون میں تھا لوٹتا ہوا

۶ عاشق ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا — اب اور کیا کہوں میں پوچھو کہ کیا ہوا

۵۲

۱ محبت اس ناآشنا کی اب سبہ کر دل میں — اٹھاتا کیوں ہے مجھ کو یاں سے مت ای آشنا سمجھا

۲ کبھی تو تھا خوش و خرم ہوا آخر وہ کیوں ظالم — میں بد بلا اپنی قسمت پر تیا تو تونے کیا سمجھا

۳ بری رسمیوں کی بھی جوں یوں ہی مجھ دیکھی — وفا جن لئے سکھائی ان کو ہے وہ جفا سمجھا

۴ ہوئی ساری خدائی دشمن اس کی پر نہ باز آیا — خدا جانے بتوں کی دوستی میں کیا رضا سمجھا

۵۳

۱ حقانہ عشق کا جب بزم میں بیان ہوا — رضا کی سن کے خرابی ہمیں بھی کان ہوا

جب اُس کی بزم میں ہم سوزِ دل لگے کہنے — سوائے شمع کے کوئی نہ ہم زباں ہوا ۲

جہاں میں مثلِ مہ و مہر در بدر ہی رہا — فلک کے خوان پہ جو آکے میہمان رہا ۳

خدا کے واسطے تو چھوڑ اپنے جینے کی — نہیں گے سب کوئی ظالم کہ نوجواں ہوا ۴

رضا کے مرنے کا احوال و نزع کی حالت — سُنا جو اُس نے تو ہم سے بھی بدگماں ہوا ۵

سخت جانی نے مجھ کو خوار کیا ۵۴ یار کے مُنہ سے شرمسار کیا ۱

ہم نشیں نام کیوں لیا اُس کا — کیوں مرے دل کو بے قرار کیا ۲

ہم کو روزِ شمار یاد آیا — جب ستم کو ترے شمار کیا ۳

دے کبھی ایک بوسۂ شیریں — سخن تلخ ابس گوار کیا ۴

ہم کو کس مُنہ سے مُنہ دکھائے گا ۵۵ آئینہ جس نے تجھ کو دکھلایا ۱

سامنے بلبلوں کے توڑے گل — ٹوٹیو ہاتھ باغباں تیرا ۲

جی گیا غم میں تیرے اے بے رحم — پر مرے جی سے تیرا غم نہ گیا ۳

ذکر اس کا کہیں ہوا شاید — یک بہ یک دل مرا تڑپ اُٹھا ۴

جائے وقت ہے حالتِ مجنوں — گر پڑا عیبہ جو محمل آگے چلا ۵

ہوتی ہے اب زباں ہماری بند — بیٹھ جا حال دل کا سنتا جا ۶

خنجرِ یار ہے مگر تشنہ — پھر لہو اپنا جوش کرنے لگا ۷

تا مجھے انتظار میں مارے — حشر کو وعدۂ وصال ملا ۸

بے وفا میرا یار کس کا ہے — بوالہوس اُس کی بات پر مت جا ۹

آج کچھ سخت بے قرار ہوں میں — سچ کہو کس سے کیا قرار کیا ۱۰

آہ کیا جانے کیوں ہو تو دشمن — دوست سارا جہاں ہے اپنا ۱۱

کس کا کوچہ یہ ہے کہ اپنا قدم — نقشِ پا کی طرح نہیں اُٹھتا ۱۲

اے ترحم تجھے غضب آئے — قتل سے میرے اُس کو باز رکھا ۱۳

خاکِ رہ اُس کی ہو گیا یہ تن — خوب ہوا کیا کفن کے کام آیا ۱۴

سب سنی ہم نے کل جو کچھ گزری — عشق پھر کیجیے گا میر رضا ۱۵

چوں شمع تا کہ سب تری صرفِ زباں نہ ہوگا ۵۶ یک حرفِ بزمِ جاناں ہم سے بیاں نہ ہوگا ۱

٢ دیتا تو ہوں تسلّی میں اُس کو دیکھ دل کو — مہ سے رفو ولیکن ہرگز کتاں نہ ہوگا
٣ جنّت کے حور و غلماں زاہد کے تئیں مبارک — ہم کیا کریں گے جاکر واں تو جہاں نہ ہوگا
٤ نومشقِ عشق ہیں ہم آہیں کریں عجب کیا — گیلی جلے گی لکڑی کیوں کر دھواں نہ ہوگا
٥ گہہ زلف گاہ خط ہے اب جائے باش اس کی — ویسا ہی مرغ کوئی خوش آشیاں نہ ہوگا
٥ تم داغ دل میں جیسے دیتے تو ہو ولیکن — یہہ آفتاب روشن ہم سے نہاں نہ ہوگا
٧ ہم نے تو کھائی سوگند آنے کی اپنے گھر کے — جب تک رضا کا موقوف آہ و فغاں نہ ہوگا

١ کرو اُس شوخ سے اے غمگسارو ذکر غمگیں کا — ٥٧ دل بے تاب شاید آشنا ہو اس سے تسکیں کا
٢ مرے داغِ جگر کو دیکھ کے فرہاد کہتا ہے — تماشا ہے جو اس تمکیں سے بیٹھے نقشِ شیریں کا
٣ نہ سمجھا ساتھ اس کے استخواں کا مغز بہتا ہے — میں خوش تھا یہہ کہ بارے رنگ بدلا اشکِ خونیں کا
٤ مقابل تیرے قامت کے قیامت بھی نہیں ہوتی — ارادہ ہی میں اس مصرعِ موزوں کی تضمیں کا
٥ ضیا جب تک فروغِ شمعِ بزمِ نکتہ دانی ہے — رضا مشتاق ہے ہرگز نہیں تیری بھی تحسیں کا

١ تو ہی دشمن مرا کچھ اے بتِ پُرفن نہ رہا — ٥٨ جو ترا دوست ہوا کب مرا دشمن نہ رہا
٢ خواریِ عشق نے ایسا مجھے بے قدر کیا — دوست کا ذکر تو کیا کوئی بھی دشمن نہ رہا
٣ خاک رہ اس کا ہوا تن بدن اپنا سو شکر — فکرِ تکفین سے چھوٹے غمِ مدفن نہ رہا
ہے قصور اپنی لیاقت کا وگرنہ محروم — فیضِ خورشید سے اک دیدۂ روزن نہ رہا
٤ دشت پیمائے جنوں ایسے بیاباں کا ہوں — جہاں رہ زن خطرِ جان سے ایمن نہ رہا
٥ رونا آدم کے تئیں ناخوشیِ دوست کا تھا — یہہ نہ تھا ڈر اُسے فردوس میں مسکن نہ رہا
٦ جس طرح ہم ہیں دنیا میں ہیں اس طرح رضا — شیخ بت خانے میں کعبے میں برہمن نہ رہا

١ روزِ ازل ہر ایک نے ایک ایک فن لیا — ٥٩ دل نے ہمارے نالۂ آتش فگن لیا
٢ پھرتے نہیں ہیں طوف سے کوئے بتاں کے شیخ — بدلے ردا کے دوش پہ ہم نے کفن لیا
٣ جلدی چراغ یوں نہیں جلتا چراغ سے — جوں دل کے داغ تازہ نے داغ کہن لیا
٤ دیکھا جو عقل سے نہیں بنتی ہے عشق میں — مجنوں غریب کیا کرے دیوانہ پن لیا
٥ یاں تک کنارِ بزم سے خوگر ہوئے کہ ہم — گلشن میں بھی گئے تو کنارِ چمن لیا
٦ خانہ خراب رہنا تقاضائے عشق ہے — فرہاد نے پہاڑ نہ مجنوں نے بن لیا

کی اُس نے راہ عشق کی طے جس نے اے رضا ـــ رہ بر کو چھوڑ نفس سے راہ زن لیا ۷

یار کو بے باکی میں اپنا سا ہم نے کر دیا ۶۰ یعنی اُس نے ٹھوکروں میں سر ہمارا دھر لیا ۱

عشق رسوا نے دی اوڑنی حجاب حسن کو جو اٹھا پردہ یہاں تو اُس نے دامن منھ پر لیا ۲

اس کو مے خواری نہیں کہتے ہیں غم خواری ہے یہ میرے دل سے لی گزک اور غیر سے ساغر لیا ۳

نام کو دل میں جگہ چھوڑی نہ داغ عشق نے ایک مہماں ایسا آیا جس نے سارا گھر لیا ۴

ذوق دیکھو مجھ سے صید ناتواں کے واسطے تیغ لی اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خنجر لیا ۵

میں ستارہ سوختہ وہ ہوں کہ جس کا زائچہ اُس گھڑی کھینچا گیا جب داغ کا اختر لیا ۶

چشم و دل رکھو ہو یار وجاؤ ٹک دیکھو اُسے مجھ سے کیا کہتے ہو اُس نے دل ترا کیوں کر لیا ۷

اے رضا راہ میں خضر کی مت راہ دیکھ ـــ گھر کے جانے میں کسی نے بھی بھلا رہ پر لیا ۸

شب اپنے دل میں اس کا جلوہ شرر فشاں تھا ۶۱ اے شمع تو کہاں تھی پروانہ تو کہاں تھا ۱

یعقوب کیوں خفا ہے بے جرم ہے زلیخا یوسف کو جو کہ لایا کنعاں کا کارواں تھا ۲

تم چھپ تو بیٹھے گھر میں دیکھو گے راز اپنا اب اتنا ہی عیاں ہو وہ جس قدر نہاں تھا ۳

لوہو حنا کا پیتا کل رات رشک سے میں تیرا قدم پیارے کیا کیجیے درمیاں تھا ۴

اُس سرو قد کے آگے حیرت سے ہیں چمن میں با وصف سو زباں کے جوں غنچہ بے زباں تھا ۵

صیاد اسے قفس میں اتنا بھی خوار مت رکھ کل شاخ گل چمن میں بلبل کا آشیاں تھا ۶

اور حسرتیں رضا کی معلوم نہیں پر اتنا ..... ہم جانتے ہیں جب وہ مرتا ہے نوجواں تھا ۷

پڑا ہے درد و غم سے بس کہ پیارے کام اب اپنا ۶۲ ہوا ہے تیرے یاروں میں لو ورد القب اپنا ۱

یہ کس کا راز ہے ٹکڑے ہوئے پروا نہیں کرتا بہ رنگ غنچہ بر ہرگز زخم لب اپنا ۲

نہ کرتا ہی نظر تو اور نہ آنکھیں ہی سمجھتی ہیں بتا مُے کیا کہوں پوچھے جو رونے کا سبب اپنا ۳

نظر کر جام و مینا پر کہ کیوں کر منھ ملاتے ہیں بھڑا اسے تو بھی تو لب مرے یک بار لب اپنا ۴

مرا اے نام پہلے جام کو مے خوار لیتے ہیں ـــ رضا شکر خدا ہے مے کدے میں یہ ادب اپنا ۵

خاموشی سے یہاں تک تو کار و بار اپنا ۶۳ ہوئے گا سنگ سرمہ سنگ مزار اپنا ۱

کعبے میں شیخ مجھ کو سمجھے ذلیل لیکن ـــ سو شکر مے کدے میں ہے اعتبار اپنا ۲

شب مہتاب میں جو بادۂ گل فام دیوگا ۶۴ اُسے محشر کے دن ساقی کوثر جام دیوگا ۱

۲ وہ دن کیا ہوگئے اور ہائے وہ باتیں کدھر — دعا کرتے تھے ہم کس روز تو دشنام دیوے گا

۳ نپٹ گھبرا کے اب مرتے تو ہیں بے تاب ہو ہو ہم — ولیکن خوف ہے جی میں نہ دل آرام دیوے گا

۴ بھلا دیتی ہے دل کی بات صورت اُس کی تا قامت — اُدھر سب دیکھتا تو جز مرا پیغام دیوے گا

۵ موے فرہاد اور مجنوں تو آغاز محبت میں — رضا اب دیکھنا ہے اس کا تو انجام دیوے گا

۱ حرف بہ گویاں سو فتنہ کیا کہوں کیا کیا اٹھا ۶۵ حسن نے پردہ کیا اور عشق کا پردہ اٹھا

۲ آتش غم نے نہ پوچھو کیا کیا دل سے سلوک — آہ سے نکلا دھواں اور نالے سے شعلہ اٹھا

۳ شمع جس گرمی سے جی چاہے تو مل فانوس سے — بزم سے اب تیری ظالم دل پتنگے کا اٹھا

۴ دل بھر آتا ہے خالی دیکھ اُس ساقی سے بزم — ہم نشیں آگے سے میرے جام اور مینا اٹھا

۵ رات ہنستا کس کا چہرہ خواب میں دیکھا رضا — نیند سے جو تو کیا یک صبح کو روتا اٹھا

۱ میں نہیں اس فکر میں یار جدا ہو گیا ۶۶ سوچ ہے کل کیا تھا اور آج یہ کیا ہو گیا

۲ دوست نے پامال جور میرے تئیں یوں کیا — کون سے دشمن کا ہائے مجھ پہ کہا ہو گیا

۳ کیوں کے ہیں رو رو مناؤں اس کے تئیں کیا کروں — ہنستے ہی ہنستے وہ ہائے مجھ سے خفا ہو گیا

۴ کہنا پھر اب لے رضا ہیں نہیں عاشق کہیں — لیتے ہی نام اس کا رنگ تیرا ہوا ہو گیا

۱ مت نکال اپنی گلی سے کیا رضا گھر جائے گا ۶۷ رہنے دے اس ناتواں کو راہ ہی میں مر جائے گا

۲ بھنے کے ہرگز نہیں عاشق صراط اوپر قدم — ہم تو ادھر جائیں گے وہ شوخ جیدھر جائے گا

۳ وصل تو تریاق سے ہر چند ہو تیرا زیاد — زہر ہجراں لیکن اپنا بھی اثر کر جائے گا

۴ قتل تو کرتا ہے مجھ کو دامن اپنا باندھ لے — خون عاشق جوش کرتا ہے کہیں بھر جائے گا

۵ اپنی آنکھیں بند کر کیا باندھے ہے پٹی مجھے — طفل ہے تو دیکھ کر بسمل مجھے ڈر جائے گا

۶ حیف اہل حق کے جانے پر آتا ہے رضا — یہ بھی جو آتا ہے اک دن مقرر جائے گا

۱ سنگ جفا سے شیشۂ دل چور کر دیا ۶۸ دکھلا کے آنکھ آنکھوں کو ناسور کر دیا

۲ بسمل ہوئے قاتل کے پاؤں پر — ایسا ہی پاس عشق نے مجبور کر دیا

۳ نقش اپنا اُس کے دل سے مٹا دیجیے تو سہی — یوں پاس سے رضا کے تو بے دور کر دیا

۱ جانتے تھے ہم بھی مرنا ہجر میں بہتر نہ تھا ۶۹ پر کریں کیا حال اپنا کچھ اُسے باور نہ تھا

۲ بے جواب آتا ہے شاید نامہ بر اے ہم نشیں — کیا ہوا دل کو مرے اتنا کبھی مضطر نہ تھا

شاید اب کے سال میراث چمن ہو عندلیب — خوب گل آئے تھے تر ہی ایسا کوئی سر نہ تھا ۳
رہ گیا کیا تھک کے صحرا میں کوئی بے خانماں — جوش میں اتنا کبھی ابر جہاں پرور نہ تھا ۴
دل مرا یوسف کو مٹے پھر دیکھ وہ زنداں ہو گیا — جب کہے گا تو گماں اس کے تپے کا اس پہ نہ تھا ۵
غیر گر ہے آشنا ہم بھی تو بیگانہ نہیں — اس کی آنکھوں میں بسے یہ دل تمھارا گھر نہ تھا ۶
عشق نے ہر ایک کے اک صنع کی ہے نمود — کوہکن کے سر پہ تیشہ تھا اگر افسر نہ تھا ۷
ایک پر صیاد نے چھوڑا نہ اس نخچیر کا — پھر دیا بالیں میں لائق تیر کے جو پر نہ تھا ۸
کل وہاں گل سر پہ تھا یاں سر پہ تھا داغ جنوں — کب ہمارا عشق تیرے حسن کے ہمسر نہ تھا ۹
اے رضا کیا خشکیِ طالع کہوں اک عمر تک —— جوں گہر دریا میں تھا تو بھی لب اپنا تر نہ تھا ۱۰

دیکھنے میں تو قضا نے عشق ہی تنہا دیا ۷۰ پر غم و رنج و الم جو تھا سبھی اک جا دیا ۱
اس کا کچھ انجام بھی سمجھا کہ تو نے اے فلک — حسن روز افزوں وہاں یاں عشق شور افزا دیا ۲
درد و غم جو سو بلی اس قدر پروا نہیں — دل کے تئیں میرے ہجوم یاس نے گھبرا دیا ۳
اس قدر نومید رکھنا غم زدوں کا خوب نہیں — وصل کا مژدہ نہیں تو قتل کا وعدہ دیا ۴
دور کھینچ لے پرتو خورشید اپنے تئیں کہ اب — اس کے سائے کا فلک نے تجھ کو ہمسایہ دیا ۵
شوق ہے دل کھول کر اب جور اور بیداد کر — سب تری چشم سخن گو نے ہمیں سمجھا دیا ۶
ناز کم کر بے دلوں پر قدر نعمت کی سمجھ — شکر کر تجھ کو خدا نے یہ رخ زیبا دیا ۷
میں نے پوچھا اس قدر فتنے کہاں سے اٹھتے ہیں — اس کے چہرے سے قضا نے برقع کو سرکا دیا ۸
دین و دل تاب و توان و صبر کا کچھ غم نہیں ق چشم و ابرو زلف و خال و خط نے جو مانگا دیا ۹
پر یہ ہے افسوس ایسا دیکھ اُسے گھبرا گئے —— یہ نہیں اب یاد آتا ہے کہ کس کو کیا دیا ۱۰
سادہ رویوں سے رضا ماتا نہ تھا یہ کیا ہوا —— نوخطوں نے کیسا باغ سبز اسے دکھلا دیا ۱۱

شرمندہ نہیں کون تری عشوہ گری کا ۷۱ بے وجہ نہیں منہ کا چھپانا ہے پری کا ۱
جو لب کو ترے دیکھ کے بے ہوش نہ ہوئے — دعویٰ اسی کو بھاتا ہے صاحب جگری کا ۲
تم دل ہی میں پلتے رہے ہو سیکھا کہاں سے — اے اشک یہ شیوہ جو لیا پردہ دری کا ۳
جس طرح سے مجھ سے کہے یار سے جا کر — یہ ڈھب کسی کو آتا ہے پیغام بری کا ۴
پتھر سے ہوں دل یک نگہ گرم میں پانی — ہے عشق سے ایجاد ہنر شیشہ گری کا ۵

۶ چل آئینہ خانے میں کہ ہے زور تماشا — جس طرف نظر کیجیے عالم ہے پری کا
۷ افسوس شبِ ہجر کی شام آتے ہی مر گئے — کیا کیا تھا بھروسا تھا ہمیں آہِ سحری کا
۸ کر قتل مجھے شوق سے بدنامی سے مت ڈر — دستور نہیں کشتہ پہ یاں نوحہ گری کا
۹ حیران ہوں آئی نظر میں کمر اس کو — دعویٰ تھا مجھے اپنی رضا دیدہ دری کا

۱ اُس چشم نے کہ طوطیوں کو نکتہ داں کیا ۷۲ ایسی کہ اک نگہ کہ مجھے بے زباں کیا
۲ گھبراؤں کس طرح دلِ پُر آہ سے نہیں — اس سوختہ نے اب تو نہایت دھواں کیا
۳ حال اس نے پوچھا جب نہ رہی طاقتِ بیاں — اس پوچھنے نے اور مجھے بے زباں کیا
۴ یارب تو اُس کے دل سے سدا رکھیو غم کو دور — جس نے کسی کے دل کو کبھی شادماں کیا
۵ نیرنگ بے ثباتی کا ہے اس چمن کا رنگ — بلبل نے کیا سمجھ کے یہاں آشیاں کیا
۶ مضمونِ خط اسی سے ہے ظاہر کہ ہو گا کیا — قاصد کی جا جو اشک کو ہم نے رواں کیا
۷ گہ عشوہ گہ کرشمہ گہے ناز گہ ادا — کس کس طرح سے اُس نے مجھے امتحاں کیا
۸ خوبوں کو ہم نشیں تو کبھی دل نہ دیجیو — میں اس معاملے میں بہت سا زیاں کیا
۹ مجنوں کا عشق سچ ہے پہ موزونوں نے رضا — ذرہ سی بات تھی اُسے اک داستاں کیا

۱ ذوق اپنے دل کو تلخیٔ غم کا سدا رہا ۷۳ مُنہ میں ہمارے بدمزگی کا مزہ رہا
۲ کیا وار تھا کہ دیدۂ قربانی کی طرح — تحسیں کو اُس کی یاں لبِ ہر زخم وا رہا
۳ قسمت تو دیکھو روز و شب اک عمر اُس کے ساتھ — مانندِ نور و سایہ رہا پر جدا رہا
۴ خاطر گرفتہ اور ہوئے سیرِ باغ سے — لالے کو دیکھتے ہی دل اُس گل میں جا رہا
۵ کب تک رکھے گا میرے ستانے کا تو خیال — گالی تلک تو دے چکا اب اور کیا رہا
۶ یہہ کس کے دیکھنے کی ........ — سارے بدن سے جی نکل آنکھوں میں آ رہا

۱ برقع جو اُس کے مُنہ سے ذرا دور ہو گیا ۷۴ دیکھا تو رنگ شمع کا کافور ہو گیا
۲ کیا دل نے میرے بختِ زبوں کو دیا فریب — جو زخم اُس کے تیر کا ناسور ہو گیا
۳ اُس کی مژہ کا آ گیا تھا ایک دن خیال — سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا
۴ وہ بے حجاب آیا کہ ہوئی صبح کیا ہوا — کیوں چہرہ ایسا شمع کا بے نور ہو گیا

۱ نکال لے لیا جی کارواں سے سالے ۷۵ یوں کہنے میں تو زلیخا نے اک غلام لیا

کہو تو کیوں کے نہ ہوں میں کباب اس غم سے — نشے میں کیتے نہ مجھی سے اُس نے جام لیا ۲

جز اک کفن کے ترے ساتھ کچھ نہ جائے گا — اگرچہ تو نے یہاں ملک روم و شام لیا ۳

گیے جو غم سے ہوا خوش ہو کوئی اس کا بھی — فلک نے عشق مجھے دے کے انتقام لیا ۴

۷۷

طبیب دیکھ کے مجھ کو دوا نہ کچھ بولا — خدا کو سونپ دوا اس کے سوا نہ کچھ بولا ۱

رقیب حجت مرا? اس کے آگے کرتا ہے — سنو تو یارو کوئی آشنا نہ کچھ بولا ۲

میں جس سے پوچھا نشاں اُس پری کی منزل کا — وہ میرے مُنہ کے تئیں تاک رہا نہ کچھ بولا ۳

میں عرض کی نہیں تم مجھ سے بولتے ہو کیوں — وہ اتنا کہتے ہی سُن ہو گیا نہ کچھ بولا ۴

۷۷

مجھے حیرت ہے یارب اس کا کیا انجام ہوئے گا — وہاں ہو حسن روز افزوں یہاں ہو عشق شور افزا ۱

ہماری چشم سے سیلاب خوں جاری ہوئی تو ہو — کیا تو نے یہہ ظالم اک نگہہ کرنے میں دل دریا ۲

شکستہ دل کے اپنے آہ و نالہ پر میں حیراں ہوں — کہ چینی میں صدا ہوتی نہیں جس وقت بال آیا ۳

ہمارا کشت ہے اور برق لے ابر دریا دل — تو اب ہی کے جا مزرع کے اوپر اپنے تئیں برسا ۴

نہ پوچھو شام میری شام ہے ماہ محرّم کی — کہوں کیا آہ اپنی صبح کی ہو صبح عاشورا ۵

کہا حالِ مصیبت جس سے وہ طعنے لگا کرنے — توقع جس سے مرہم کی رکھی اُس نے نمک چھڑکا ۶

ہماری تربیت میں باغباں یہہ کیا تساہل ہے — بہ رنگ لالہ ہم بھی داغ دل رکھتے ہیں او زرا ۷

دکھو تیر و کماں مشہد پہ میرے جائے شمع و گل — کسی کی ہیں نگہہ کا کشتہ ہوں قربان ابرو کا ۸

تری سنگیں دلی اے خود نما ثابت ہوئی ہم پر — گیا تو آئینہ خانے میں اور ہنستا ہوا نکلا ۹

جگہ دروازے پر بھی بیٹھنے کو اب نہیں ملتی — کریں کے دل میں اُس کے گھر ہمارے جی میں یوں تھا ۱۰

تری گر چشم بینا ہے نظر کر دیدۂ دل سے — کہ ہے اس آئینہ خانے میں کوئی آئینہ سیما ۱۱

خدا جانے کہ کیا ہے درد بیمار محبت کو — نہ مرتا ہے نہ اچھا ہوتا ہے بے تاب ہو رہتا ۱۲

۷۸

اپنا چُپ ہونا عجب ماتم کا شور افگن ہوا — باتوں سے چپ ہم رہے غم خواروں میں شیون ہوا ۱

کوئی یارب یوں کسی کی جان کے درپے نہ ہو — دل ہوا گر سنگ سختی میں تو تم آہن ہوا ۲

اُس کے آتے ہٹ گیا آنکھوں کے آگے سے غبار — جیسے روشن جلوۂ خورشید سے روشن ہوا ۳

دل کے جلنے کا نہیں افسوس یہہ غم ہے مجھے — جو عطش خانہ تھا دل کا داغ کا مسکن ہوا ۴

چاک پیراہن ہو اُس کو عیب جو عاشق نہیں — مُردے کی رسوائی ہے جب گور میں روزن ہوا ۵

۶ حسن رو ... ادکانگی بے بنالے لیلی کئے — دیکھتے خط کا سواد اپنا سبق روشن ہوا
۷ ایا ... حال ہے یہاں کھویا گیا تقلید سے — جس طرح شارع پہ چلنا مور کا رہ زن ہوا
۸ دوستی بھی ایک ... حد رکھتی ہے اے خانہ خراب — آپ اپنی جان کا تو تو رضا دشمن ہوا
۱ جو ستم اُس نے کیا اب تئیں دشوار نہ تھا ۷۹ یہہ سبب تمھاری طاقت سے خبردار نہ تھا
۲ آرزو وصل کی دل سے نہیں جاتی یک بار — ورنہ مرجانا مجھے ہجر میں دشوار نہ تھا
۳ سایۂ بال ہما سے جو کیا مجھ کو تباہ — اے فلک اُس کا مگر سایۂ دیوار نہ تھا
۴ زخم کے لگتے ہی کیا کھل گئے چھاتی کے کواڑ — آگے یہہ خانۂ دل چسپ ہوا دار نہ تھا
۵ اُس کے آتے ہی چمن میں ہوا جوں گل بے قدر — خار اس طرح گلشن میں کبھی خوار نہ تھا
۶ کس گھڑی بزم تری عالم تصویر نہ تھی — کب میں حسرت سے وہاں صورت دیوار نہ تھا
۷ پوچھنا تھا تجھے بے درد ترحم سے ضرور — کیا ہوا حال مرا قابل اظہار نہ تھا
۸ یارو دیکھو مرے دل کی طرح اب تڑپے ہے — جو کہے آئینہ حسرت کش دیوار نہ تھا
۹ مژدۂ وصل کے سنتے ہی بہ حال آیا — تھا یہ رنجور ہوس عشق کا بیمار نہ تھا
۱ مرا مدت سے دل رنجور ہے اچھا نہیں ہوتا ۸۰ یہ داغ عشق کیا ناسور ہے اچھا نہیں ہوتا
۲ مریض عشق سے کب جہاں تک دم میں طاقت تھی — مسیحا کیا کرے مجبور ہے اچھا نہیں ہوتا
۳ نہ جانو کیا مزہ پاتا ہے جس دن سے — ترا بیمار غم مسرور ہے اچھا نہیں ہوتا
۴ وہ آخر مر گیا جس کو نگہ کے تیر نے مارا — کچھ اس کے زخم کا دستور ہے اچھا نہیں ہوتا
۵ عبث میری دوا کی جستجو کرتے ہو غم خوارو — مریض عشق تو مشہور ہے اچھا نہیں ہوتا
۶ ہزاروں دم کی اُمید ایک دم میں ہے دوا لے — رضا یہہ کون سا مذکور ہے اچھا نہیں ہوتا
۱ خون سے میرے زیادہ رنگ ہے لاتی حنا ۸۱ جو تجھے اس ... لے قاتل یہ ہے بھاتی حنا
۲ جی میں ہے پامال کر ڈالوں اسے جوں نقش پا — بے ادب کیا تیرے تلووں کو ہے سہلاتی حنا
۴ جا کے اُس کے پاؤں سے لپٹی ہے یارب کس طرح — دیکھیے آخر کو ہے کیا رنگ دکھلاتی حنا
۱ دیکھتے ہی اُس کی صورت کو میں دیوانہ ہوا ۸۲ آئینہ خانہ مرے دل کا پری خانہ ہوا
۲ تیرہ روزی میری اُس کی آنکھوں میں ... — نامہ بر لاچار اپنا آپ ہی پروانہ ہوا
۳ شمع سے طاقت کسی کو ہم زبانی کی نہ تھی — یہہ دل صد چاک اُس کی زلف کا شانہ ہوا

ہم نشینوں سے مرے رونے پہ یوں کہنے لگا — گھر نہیں میرا ہوا یہ تعزیت خانہ ہوا ۴

واے بے کم فرصتی جب تک بھرے جامِ نشاط — زندگانی کا یہاں لبریز پیمانہ ہوا ۵

بچ گیا کیا مفت دردِ جاں ستاں ہجر سے — یار کے جانے کے ساتھ ہی اپنا مر جانا ہوا ۶

حسرت اپنی کیا کہوں محرومیِ طالع سے میں — رات کو بلبل ہوا اور دن کو پروانہ ہوا ۷

دیکھ اپنے در پہ مجھکو یوں تجاہل سے کہا — کس طرف سے اس مسافر کا ادھر آنا ہوا ۸

تم جو کہتے تھے رضا ہے عشق میں جی کا زیاں — سچ ہے اے مشفق مرے آپ ہی کا فرمانا ہوا ۹

جیتے جی گر یہاں سے جائیے گا ۴۳ — پھر کسے جا کے منہ دکھائیے گا ۱

زخم سینہ سے یہ ہوا معلوم — کوئی دن اور باؤ کھائیے گا ۲

اگر آنکھیں نہ مند گئیں اپنی — زخم ایک ایک اسے دکھائیے گا ۳

جان گر اب کے بچ گئی غم سے — دل کسی سے نہ پھر لگائیے گا ۴

نہ کہا کچھ بھی میرے مرنے پر — کچھ تو یہ بات منہ پہ لائیے گا ۵

دمِ آخر ہے میں بھی چلتا ہوں — بیٹھ تو جائیے گا جائیے گا ۶

آہ و نالہ سے گر ملی فرصت — حال دل کا اسے سنائیے گا ۷

اتنے ملنے پر اے بتاں یہ ناز — کیا خدا سے ہمیں ملائیے گا ۸

اس کو ہے تیغ آزمائی کا شوق ق — جی میں آتا ہے دل جلائیے گا ۹

کام ہوگا جو لڑ گئی قسمت — ورنہ لالچ تو آزمائیے گا ۱۰

لاش پر کشتۂ محبت کی ق — عیسیٰ کے آنے پر نہ جائیے گا ۱۱

گو ہیں جاں بخش اس کے لب لیکن — آپ بھی ٹک زباں ہلائیے گا ۱۲

مے کدے سے چلے تو ہو مسجد — کیوں رضا پھر بھی ادھر آئیے گا ۱۳

مت کر تلاش دل کو مرے پارہ پے شوخ ۴۴ — گر آسماں پھٹا تو سلایا نہ جائے گا ۱

آنا گلوں کا تجھ کو مبارک ہو عندلیب — بن یار ہم سے باغ میں جایا نہ جائے گا ۲

کچھ فکر جلد کر لے کہ تازہ ہوا ہے عشق — بھڑکا اگر یہ شعلہ بجھایا نہ جائے گا ۳

مت جا تو اس کے کوچے میں کہتے ہیں — پھر تجھ سے اپنے گھر تلک آیا نہ جائے گا ۴

یاد سے خواستگار نور ہوا ۴۵ — شیخ ناداں سے یہ تصور ہوا ۱

۲ مر گئے ہم شراب کے غم میں — اب تو ساقی تجھے سرور ہوا

۳ شقۂ وصل کیوں دیا قاصد — اور بھی دل تو نا صبور ہوا

۴ اُن نے تلوار غیر پر کھینچی — مجھ کو مرجانا اب ضرور ہوا

۸۶

۱ بر میں وہ سیم بر نہیں آتا — میں غرض غم سے بر نہیں آتا

۲ اس میں ہوتا ہے وہ تو خوش لیکن — کیا کریں ہم کو مر نہیں آتا

۳ ہم تجھے اپنی قدر دکھلائیں — ہاتھ کچھ اس قدر نہیں آتا

۴ دل کی بے تابی نے خبر کی ہے — نامہ بر بے خبر نہیں آتا

۵ دیر و کعبہ میں کون سر پٹکے — ہم کو یہہ دردِ سر نہیں آتا

۶ ہستی کی ہے دکان شیشے کی — کوئی پتھر ادھر نہیں آتا

۷ اُس شجر کے لگائے ہم نے تخم — جس میں گل اور ثمر نہیں آتا

۸ کون آنکھوں سے ہو گیا اوجھل — ہائے اب کچھ نظر نہیں آتا

۹ سوزشِ دل کو آہ مت پوچھو — اشک بھی بے شرر نہیں آتا

۱۰ دیکھی اُس کی گلی رضا نے مگر — ان دنوں پھر وہ گھر نہیں آتا

۸۷

۱ میرے نالے پر نہیں تجھ کو تغافل کے سوا — گل نہیں سنتا کسی کا شورِ بلبل کے سوا

۲ تم جو کچھ چاہو کرو جور و عتاب و خشم و ناز — کچھ نہیں بنتا ہے عاشق سے تحمل کے سوا

۳ جو سخن رس آشنا ہیں زلف و کاکل کے تری — اُن کو مضمون بھی نہیں ملتا ہے سنبل کے سوا

۴ کس طرح مجھ سے جدائی تجھ کو آتی ہے پسند — قافیہ گل کا نہیں ٹھہرے ہے بلبل کے سوا

۵ واسطے موسیٰ کے سرمہ طور کا ہے لے رضا — میں نہ دوں آنکھوں میں خاکِ پائے دلدل کے سوا

۸۸

۱ گور کے مُنہ سے نہ پھر آئے تم نے کبھی بھی آ دیکھا — دیکھو تو ادھر آنکھ ملا کے تم کو بس دیکھا دیکھا

۲ کس کی الفت کیسی محبت کیا پھر مُنہ دیکھیں گے ہم — جاؤ چلے تم یہہ بھی گویا ایک تماشا تھا دیکھا

۳ میں جو کہا اب مرتا ہوں نہیں ہنس کر بولا جھوٹ نہ بول — ار نہ مریے پھر کیا کیجے طور جواب اُس کا دیکھا

۴ آنے جانے میں اُس کوچے کے کیا دل بھر بھر آتا — رونے لگتے تھے ساتھ اُس کے جب کے تمہیں رو تا دیکھا

۵ کوئی نہ دیکھے ہم کو دکھایا جو کچھ اُن کے دیکھنے نے — دل کو دیکھا آتش خانہ چشموں کو دریا دیکھا

۶ مرتا نہیں بن موت کوئی کیا کہیے رات جدائی کی — مر بھی چھوڑا چھری بھی ماری زہر بھی ہم نے کھا دیکھا

کل کیا کیا انداز کی باتیں اِن اُن میں چلتی تھیں ـــ میر رضا تو بے مزہ اُٹھے ہم نے زور مزہ دیکھا ۷
بزم افروز وہ اک شب ستم ایجاد ہوا ۸۹ شمع سال روز کا جلنا مجھے معتاد ہوا ۱
گر ہما دام میں آئے تو اڑا دیتا ہے طائرِ وصل کے جو شوق میں صیّاد ہوا ۲
بھولا دینا کو ہے زاہد ہوس جنت سے طفل کو ذوق ہے بازی کے سبق یاد ہوا ۳
آہ اس عشق کی آہن جگری مت پوچھو تیغ شیر و بہ بنا تیشۂ فرہاد ہوا ۴
حسرت قد کا تری خستہ چمن میں جو گیا سایۂ گلبن اُسے سایۂ جلّاد ہوا ۵
مدّتوں سے جو چلا آتا تھا دستور وفا سو ترے عہد میں یک بار بر افتاد ہوا ۶
اے رضا تجھ ہی پر استادی نہیں ہے موقوف ـــ جو کہ شاگرد ضیا کا ہوا استاد ہوا ۷
اب بیٹھے پچھتایا کیجے پہلے اس کو نہ جانا تھا ۹۰ مر جانا بہتر تھا، لیکن اُس کی گلی نہ جانا تھا ۱
دیکھو تو کس کس طرحوں سے غیر لگاوٹ کرتا ہے بات بھی تم کو آتی نہیں ہے دل کیا تم کو لگانا تھا ۲
کچھ جو ہوتی عقل تو وہ لیلےٰ ہی کے در پر مر جاتا ـــ دشت جانا کیا تھا مجنوں سچ مچ کا دیوانہ تھا ۳
کیا کہوں میں کس طرح سے دل مرا جاتا رہا ۹۱ اک چھلاوا تھا آیا چھل گیا جاتا رہا ۱
اُس کے جانے کی نہ کچھ پوچھو جوانی کی طرح اور تو کیا زندگانی کا مزہ جاتا رہا ۲
آئے تھے مستی میں ہم کرنے کو اُس سے گفتگو ـــ ایک ہی اُس نے سنی سارا نشا جاتا رہا ۳
نہ دل ہی عشق کے شعلے نے کچھ تمام لیا ۹۲ زبان جل گئی اس آگ کا جو نام لیا ۱
نشے میں دیر سے مسجد کی تاک باندھی تھی پہ شکر لغزش پا کا کہ جس نے تھام لیا ۲
نہ پوچھو مجھ سے رضا فائدہ محبّت کا ـــ کبھی کسی نے بھی ناکامیوں سے کام لیا ۳
کہتے ہیں آپ جو کچھ سو سب سہی ہے صاحب ۹۳ اِن جاں فشانیوں کا بدلا یہی ہے صاحب ۱
مجنوں کے مرنے کا ذکر پہنچا تو ہوگا ماتم بیماری میرے تئیں بھی سن لو وہی ہے صاحب ۲
جاتا نہیں بہانہ کس کام کا یہہ آنا دیکھو تو رات کتنی باقی رہی ہے صاحب ۳
اگ جائے جیب میری گر ہو نٹ بھی ہلا ہو یہہ بات قہر تم سے کس نے کہی ہے صاحب ۴
گلشن کا پتّا پتّا کھاتا ہے زہر اُس پر سبزی تمھارے خط کی کیا لہلہی ہے صاحب ۵
مرتے ہوا رضا پر منہ سے زرا نہ بولا ـــ اس راز سے تمھیں بھی کچھ آگہی ہے صاحب ۶
جور و ستم کسی پہ کرے کوئی کیا سبب ۹۴ اُس کی جفا کا ہے یہ ہماری وفا سبب

۲ ارمان اُسے اٹھا ہے مرا اشکِ سُرخ دیکھ — شوق حنا کا اُس کے یہ رونا ہوا سبب

۳ ہردم بُرا کہے ہو میاں مجھ کو کس لیے — آخر ہر ایک بات کا ہوگا بھلا سبب

۴ قاصد سوائے آہ کے عاشق کا کوئی نہیں — یوسف کی بوئے لانے کی ہو کے صبا سبب

۵ دیکھیں کہے ہے کون غزل اس ردیف میں — کہنے کو ان میں کے ہوا ہے رضا سبب

۱ نہ اُس کی خو ہے اور نہ کہا غیر کا سبب ۹۵ ان گالیوں کا تیری ہو ہیگا رضا سبب

۲ نہ عشوہ نہ کرشمہ نہ غمزہ تھا نہ ادا — جانے کا اپنے دل کے کچھ اور ہی ہوا سبب

۳ آہِ سحر کرے ہے ہمارا شگفتہ دل — غنچوں کے ہوئے کھلنے کا بادِ صبا سبب

۴ نہ برق ہو نہ شعلہ نہ خورشید ہو نہ شمع — یارب ہمارے دل کی تپش کا ہو کیا سبب

۵ جلوے نے اُس کے حسن کے دل ہم سے لے لیا — ہے کاہ کی کشش کا رضا کہربا سبب

۱ بزم خوبوں سے تاب ناک ہے سب ۹۶ بن ترے اپنی بھاؤں خاک ہو سب

۲ حالِ دل اُس کی زلف میں مت پوچھ — شانے کی طرح چاک چاک ہے سب

۳ آہ کس صدمے کی یہ چوٹ لگی — دل جگر جان دردناک ہے سب

۴ عشق کی راہ کیا ہی اوہٹ ہے — دل و جاں لے رضا ہلاک ہے سب

۱ ابر ہے ابر ہے شراب شراب ۹۷ ساقیا ساقیا شتاب شتاب

۲ نامہ لکھتا ہوں اور کہے ہے شوق — قاصدا قاصدا جواب جواب

۳ ہم جیسے ہیں جو ٹک تو بولو — لیجے لیجے ثواب ثواب

۴ یار بن اپنی زندگی اے خضر — موت ہے موت ہے عذاب عذاب

۵ یہہ رضا نے غزل کہی اس کا — شاعراں شاعراں جواب جواب

۱ ٹک تو محمل کا نشاں دے جلد لے صورت زرا ۹۸ کب تلک بھٹکے پھریں اب ہم ترے دیوانے خراب

۲ یہہ بھی کچھ اندھیر ہے اب زلف تیرے درمیاں — گھر بسے شانے کا اور ہوں دل کے کاشانے خراب

۳ دل تو خوں ہو بہہ گیا اور ہے جگر باقی سو اب — اس کی بھی حالت لگی ہم کو نظر آنے خراب

۴ گھر بسیے تو گھر ہیں کس کے جا بسا ہے بول اُٹھ — مسجدیں ویراں ہیں تجھ بن اور صنم خانے خراب

۵ شمع بھڑکا شعلہ اپنا آگ دے فانوس کو — کب تلک پھرتے رہیں گرد اس کے پروانے خراب

۶ چپ ہو اب تو اے رضا ان خاکیوں پر رحم کر — رونے سے تیرے ہوئے سب شہر ویرانے خراب

| | | | |
|---|---|---|---|
| کچھ نہیں بن تیرے ہم جوں گرد جیتے جی خراب | ۹۹ | مر گئے کے بعد بھی عاشق کی ہو مٹی خراب | ۱ |
| ناقۂ لیلیٰ کو روکو جس طرح ہواے غزال | — | شہر ویراں ہو چکا اب ہوتی ہو وادی خراب | ۲ |
| پوچھتے کیا ہو رضا کا مجھ سے تم حالِ خراب | ۱۰۰ | ایک تو تھا ہی دوانا تس پر اب پی ہو شراب | ۱ |
| دل دینا بھلا میرا ایسا تھا بُرا صاحب | ۱۰۱ | دن رات برا مجھ کو کہتے ہو بھلا صاحب | ۱ |
| اک دیکھنے کی خاطر یہہ باتیں جو سُنتے ہو | — | تم اپنی طرف دیکھو اے میر رضا صاحب | ۲ |
| ہم مر گئے پہ شکوے کی مُنہ پر نہ آئی بات | ۱۰۲ | کیوں بے زبان عاشقوں کی آزمائی بات | ۱ |
| دعواے عشق کرنے کا کیا مُنہ کسی کا تھا | | کم بولنے نے تیرے یہ ساری بڑھائی بات | ۲ |
| ہم پیشگی کی مجھ سے کرے گفتگو رقیب | | مُنہ اُس کا دیکھو ہو یہ تمھاری سکھائی بات | ۳ |
| سب کچھ پڑھایا ہم کو مدرّس نے عشق کے | | ملتا ہو جس سے یار نہ ایسی پڑھائی بات | ۴ |
| اپنا کسے کہوں نہ کہوں کس کو ہے غضب | | جس وقت مُنہ سے نکلی ہوئی پھر پرائی بات | ۵ |
| کیا غیر نے کہا کہ لگے بُد بُدانے تم | | میں نے بھی چھیڑنے کی نئی اب تو پائی بات | ۶ |
| مذکور گل کا جانے دو ہو جاؤ گے خفا | | تھمتی نہیں زبان پہ جس وقت آئی بات | ۷ |
| مجنوں کے نام سے مرا حال اُس نے تب سُنا | | شکرِ خدا کہ خوب بن آئی بنائی بات | ۸ |
| بلبل کا نالہ آگے مرے اس طرح سے ہے | | جس طرح شہریوں سے کرے روستائی بات | ۹ |
| تقریر صاف پر جو رضا کی کرے نظر | — | اندھے کے تئیں عجب نہیں دیوے دکھائی بات | ۱۰ |
| سنتے ہو تم تو دل سے میاں ہر کسی کی بات | ۱۰۳ | گر حکم ہو تو ہم بھی کہیں اپنے جی کی بات | ۱ |
| مذکور دل کا ہو اسے ٹک کان دھر کے سُن | | نہ ذکر جنگ کا ہو نہ ہو آشتی کی بات | ۲ |
| اک بوسے کے سوال پر اتنا عتاب کیا | | کیا جی میں دھر رکھی ہو ذرا سی ہنسی کی بات | ۳ |
| غیروں کا طنز و طعن کہاں اور میں کہاں | | سب ہے ہمارے دل کی یہ ناچارگی کی بات | ۴ |
| کب تک سنا کرو گے میاں دشمنوں کی بات | | ٹک دوستوں سے بھی تو سنو دوستی کی بات | ۵ |
| تجھ بن رضا کے مرنے کا کچھ غم نہیں پر آہ | — | جی ہی میں اُس کے رہ گئی افسوس جی کی بات | ۶ |
| زلف کھولے تھا کہاں اپنی وہ پھر بے باک رات | ۱۰۴ | خود بخود ہوتا تھا جوں شانہ دل اپنا چاک رات | ۱ |
| برگِ گل شبنم سے تر مت جانیو اے باغباں | | گل نے دامن سے کیے بلبل کے آنسو پاک رات | ۲ |
| شمع روشن جوں کہ آتی ہو نظر فانوس میں | | برقع میں تھا جلوہ گر وہ روے آتشناک رات | ۳ |

۴ مُغ بچے کے چوکنے سے ہوگیا سارا خلل — تھے لگائے ورنہ رنداں دخترِ رز سے تاک رات

۵ تو نے بھریاں شعلہ افشاں ایسی ہی آہیں رضا — یار کے کوچے کے جل گئے سب خس و خاشاک رات

۱ مت پوچھ دل جلا کہ جگر تھا کباب رات — ۱۰۵ فرقت میں حال اپنا تھا یک سر خراب رات

۲ کوئی تو ہوئے دونوں سے جو غم سے چھوٹیں ہم — یا جلد آئے موت کہ جائے شتاب رات

۳ اوروں کی سرگذشت سنے ہے وہ جاگ جاگ — میرے ہی حال سے اُسے آتا ہے خواب رات

۴ کیا حالِ دل کا کہیے کسی بن نہ پوچھو ہائے — نہ دن کو چین آئے اسے اور نہ خواب رات

۵ نہ رات ہی ہو رات ہمیں تیرے ہجر میں — بن تیرے دن بھی ہے ہمیں اے آفتاب رات

۶ محشر کے دن سے کس کو ڈراتے ہو واعظا — ہجراں کی اسکی ہے ہمیں ہوئے عذاب رات

۷ کیا گزری دل جگر پہ رضا غم کی آگ سے — آتی تھی تیری آہ سے بوئے کباب رات

۱ گرم مت ہو جو میں کھینچوں نفسِ سرد بہت — ۱۰۶ کیا کروں صبر بہت کم ہے مرا درد بہت

۲ یارب آوارہ ملا کون اب خاک کے بیچ — آہ کچھ دشت میں آج اڑتی ہے پھر گرد بہت

۳ غیر کا کیا ہوا درماں دو لبِ عیسیٰ دم — آج تڑپے ہے مرا کچھ دل پُر درد بہت

۴ تو کسی شوخ پہ مرنے کا ہوا ہے عاشق — ان دنوں پھر ہے رضا رنگ ترا زرد بہت

۱ یہ کہتا نہیں ہوں مان لو بات — ۱۰۷ پر مری پیار سے ٹک سنو بات

۲ کچھ اس کے نہ قرب و بُعد کی پوچھ — میں کیا کہوں ہے یہ کو بہ کو بات

۳ اور عشق کی کیا کہوں میں یارو — ق اک طرفہ مزے کی ہے سنو بات

۴ عار آتی تھی جس سے بات مجھ کو — کہہ جاتا ہے اب تو وہ بھی دو بات

۵ سونے بھی دو ہونے آتی ہے صبح — اب میر رضا جی بس کرو بات

۱ تیرے ہی واسطے سب جھانکیں ہیں کوے آفت — ۱۰۸ اے آفت آرزو کی اور آرزوے آفت

۲ اُس فتنہ ساز کا کچھ مُنہ پھیرنا نہ پوچھو — ہونا پڑا ہے ہم کو اب روبہ روے آفت

۱ بھر عمر کی ریا کی مٹ جاتی ہے ملامت — ۱۰۹ زاہد کی بت جو میرا اک دن کرے امامت

۲ تا حشر تو ملا جائے تو بھی نہ ہو برابر — جو کچھ کہ مجھ پہ کی ہے اس رات نے قیامت

۳ جُز مشتِ استخواں کے تجھ میں نہیں رہا ہے — ق اک شخص نے یہ جا کر مجنوں کو کی ملامت

۴ رو کر کہا یہ اُس نے سچ ہے نہ میر صاحب — کیا غم ہے جب تلک ہے لیلیٰ کا سگ سلامت

نرگس کی شمع شبستاں تھا یار آج کی رات ۱۱۰ کہ صبح تک میں رہا بے قرار آج کی رات ۱
ہجوم یاس ہوا اب روز وعدے کا گزرا — تو لے اجل ہو مری غمگسار آج کی رات ۲

زلف شب رنگ کی چلی کچھ بات ۱۱۱ ہم نے آنکھوں میں رات کاٹی رات ۱
نہیں ممکن کہ پھر قرار آئے گر یہی دل ہے گور میں بھی ساتھ ۲
رات دن بے قرار رہتا ہے — دل بھی اپنا ہے زور خوش حرکات ۳

سچ کہہ رضا یہ کس سے لگائی ہے سانٹ بانٹ ۱۱۲ کچھ پھر ہے ان دنوں میں ترا جی نپٹ اُچاٹ ۱
دیکھیں گے کیوں کے چشموں سے جاتے رہے گے تم لخت جگر کی جو کی تھمائی ہے گھاٹ گھاٹ ۲
ٹکڑے چنے ہیں دل کے جو آنکھوں کے خوان میں ہے کس کے میہمانی کا لے مردماں یہ ٹھاٹ ۳
اپنی گلی کے آنے سے مجھ کو نہ منع کر بدنام ہو گئے بند کرے گا جو راہ باٹ ۴
اس چشم و دل نے کہنا نہ مانا تمام عمر ہم پر خرابی لائی یہ گھر ہی کی پھوٹ پھاٹ ۵
رہنے دے اپنی بزم میں کچھ بولوں میں اگر مانند شمع پھر دے میری زباں کو کاٹ ۶
اب اس گلی میں آتا جو ہے ہر گھڑی رضا — کچھ تو ملی ہے دال کہ تجھے میری باٹ باٹ ۷

کہتے ہیں ہم غیروں سے بے فائدہ مت مل عبث ۱۱۳ دل شکستوں کو نہ کر لے دل ربا بے دل عبث ۱
خندہ زن نہ گل نمط نہ مثل شبنم اشک ریز اپنی قسمت میں ملا ہے اس طرح کا دل عبث ۲
جوں صدف ہم سینہ چاک اک قطرے کی خاطر ہیں بس ترا یہ شور ہو لے ابر دریا دل عبث ۳
پھیر عناں وادی مجنوں کو وگرنہ ہے یہ سب بادیہ گردی تری لے صاحب محمل عبث ۴
اتنا ہی کہنا تجھے بس ہو کہ عاشق تھا رضا — قتل کو میرے بہانہ ڈھونڈنا قاتل عبث ۵

کیا نہ دیدوں سے زمانے کو سروکار ہے آج ۱۱۴ ایک درہم جو رکھے مالک دینار ہے آج ۱
کل تو معمورۂ عالم کو ڈبایا لے چشم کیا خرابی ہے تو پھر رونے کو تیار ہے آج ۲
دیکھنا دیکھنا کیا دل میں لگی آتش عشق کیوں مرا نالۂ خوں بار شرر بار ہے آج ۳
گردش چشم سے تیری جو بنا گل کا حریف سیر و دو بار دو سب کشتیِ خانۂ خمار ہے آج ۴
لے رضا خط سیہ اس کے نہیں چہرے پر — حسن کے واقعے کا یار عزادار ہے آج ۵

نہ لیجے راز محبت دل نالاں کے بیچ ۱۱۵ آگ کس طرح سے ہو بند نیستان کے بیچ ۱

وہاں کیا ہو مسرت اور شمع سحرگاہ کے بیچ ۱۱۶ دونوں کا کام تمام ہوتا ہے اک آہ کے بیچ ۱

۲ خط کے دھوکے سے گرا اُس کے زنخ دان میں دل — کس نے خس پوش کیا چاہ مری راہ کے بیچ

۳ اپنے تئیں حق نے چھپایا کیا ظاہر مجھ کو — ایک عالم ہوا گم راہ اس اشباہ کے بیچ

۱ کرتا ہے تن پہ نالۂ دل ہر نفس کے بیچ ۱۱۷ شعلہ کرے ہے جیسے کہیں خار و خس کے بیچ

۲ پرواز ہم بھی کرتے ہیں لیکن نہ دل کو کھول — مانند مرغ قبلہ نما کے قفس کے بیچ

۳ تم ایک بار گی نہ ہوئے ہم سے ہم کنار — پہنچے کنار گور کے ہم اس ہوس کے بیچ

۴ محمل نشیں نے کچھ نہ کیا فرق حیف ہے — نالے میں دل کے اور صدائے جرس کے بیچ

۵ حسرت رضا کی اُس کی گلی میں تو کچھ نہ پوچھ — دیکھا تو ہوگا باغ میں بلبل قفس کے بیچ

۱ زلفوں کی کسی کی کہیں دیکھی ہے مگر موج ۱۱۸ بے جبین رہے ہے عرق شرم سے ہر موج

۲ کل جوش نے دل کے تو لہو پانی کیا تھا — کیا آج کریں دیکھیں تری خون جگر موج

۳ جب آب دم تیغ تری یاد کروں ہوں — ہر زخم کہن مارے ہے اک تازہ و تر موج

۴ بے تابی دل مرنے پہ بھی دیوے جب آرام — اب زخم جو ہے تن پہ سو آتا ہے نظر موج

۱ بے پردہ ہو جو وہ رخ حیرت فزائے صبح ۱۱۹ خجلت سے حشر کو بھی نہ پھر منہ دکھائے صبح

۲ دیکھا نہیں ہے چاک گریبانِ یار کا — زاہد تو اتنا کرتا ہے فخر صفائے صبح

۳ اک دن بھی کچھ اثر نہ کیا اُس کے دل میں آہ — لے وائے وائے نیم شب ہائے ہائے صبح

۴ آہ حسرت وا نہ ہوا دل تو ہے عجب — غنچہ کرے ہے کیوں کے شگفتہ ہوائے صبح

۵ دم بھر کی زندگی ہے چراغ سحر رضا — کچھ فکر جلد کر لے مبادا کہ آئے صبح

۱ جی دے ہے تیرے عشق میں بیمار بے طرح ۱۲۰ بدنامی تجھ پہ آئی مرے یار بے طرح

۲ کس بے گنہ کی آئی ہے اب دیکھیے قضا — تم ان دنوں میں کھینچتے ہو تلوار بے طرح

۱ سب ہی قاصد جواب نامہ نہ پیغام تلخ ۱۲۱ اُس لب شیریں سے نکلی کس طرح دشنام تلخ

۲ مے کدے سے تو جو گزرے اس طرف مت دیکھیو — عیش مستاں تلخ کر دیں گے ترے بادام تلخ

۳ ہے بلا سخت اپنے دل کے حق میں ناکام زلف — جس طرح غربت زدوں کے آگے ذکر شام تلخ

۴ ٹک ٹھہر خنجر سے خون اور رو نکلا اس کو بہنے دے — زندگی میری نہ کر لے جان بے آرام تلخ

۱ مجھ ناتواں سے نام ہو تجھ غم کا یاں بلند ۱۲۲ نذر اس ہما کی کرتا ہے یہ استخواں بلند

۲ سارا جلا جہاں کا دھواں دھار ہو گیا — یارب ہوا ہے آہ کا کس کی دھواں بلند

پھر پھر کے آگ وہ ہیں سارے تو در نہیں — ایسا نہ ہو کہ آہ ہماری ہو یاں بلند ۳
ٹک دیکھنا رضا کی کہیں ہو نہ مشتِ خاک — یہہ گرد سی جو ہے گی پے کارواں بلند ۴

نازکا مارا ہوا ہوں میں ادا کی سوگند ۱۲۳ کشتۂ جور و جفا ہوں میں وفا کی سوگند ۱
خواہ کافر مجھے کہہ خواہ مسلمان اے شیخ — بت کے ہاتھوں میں بکا یا ہوں خدا کی سوگند ۲
کچھ خبر راہِ فنا کی بھی رکھے ہے ہم سے — کہہ دے اے خضر تجھے آبِ بقا کی سوگند ۳
یار سے خواری و رسوائی ہمیں بہتر ہے — غیر کی عزت و حرمت سے وفا کی سوگند ۴
شمع کی روشنی سر کٹنے سے ہوتی ہے دو چند — دردِ دل ہی تو مجھے حاصل ہے دوا کی سوگند ۵
اُس کی گر جان سے مطلب نہیں تجھ کو میاں — چھوڑ کیوں کھاتا ہے ہر دم تو رضا کی سوگند ۶

نکل مت گھر سے تو اے خانہ آباد ۱۲۴ کیا اب ہم نے بھی ویرانہ آباد ۱
قبول ہوگا کہیں تو سجدہ اپنا — رہیں یہہ کعبہ و بتخانہ آباد ۲
ہمارا ہی رہے اک جام خالی — مغاں رہیو ترا میخانہ آباد ۳
رہے اُس زلف سے یہہ دل پریشاں — ترا گھر ہوئے یوں اے شانہ آباد ۴
رضا لوٹا ہے کس سفاک نے آہ — کبھی دل کو ترے دیکھا نہ آباد ۵

جب ترحم کو وہ کرتا ہے نظر سے پیوند ۱۲۵ دل کے ٹکڑے مرے ہوتے ہیں نظر سے پیوند ۱
کیوں کہ میں اب نہ کروں غم سے تہی قالب کو — ہائے جلد ہی ہوا اُس کی کمر سے پیوند ۲
زلفوں کو چہرے پہ بکھرا کے کہہ اے مایۂ ناز — اس طرح شام کو دیتے ہیں سحر سے پیوند ۳

حسن کے گل کی ہوت کرتی ہی بلبل تجھی ۱۲۶ کیا تماشا ہی جو ہو جاوے مرا یار نمود ۱

ہائے لے زندگانی فرہاد ۱۲۷ وائے رے جاں فشانی فرہاد ۱
غم کا بوجھ اور بے ستوں کا کام — وائے رے ناتوانی فرہاد ۲
سر کٹے پر بھی آہ کیا کہیے — نہ گئی سرگرانی فرہاد ۳
اے مرید رضا تو شیریں سے — ق اتنا کہیو زبانی فرہاد ۴
ایک تیشے سے خاک میں مل گئی — کوہ سی سخت جانی فرہاد ۵
عشق شیریں لباں کے مرنے میں — ہے رضا ایک ثانی فرہاد ۶

قید کر ہم کو یہ ہے عین کرم اے صیاد ۱۲۸ دیکھا جاتا نہیں گل چیں کا ستم اے صیاد ۱

۲ گل سے رہیں قفس کرتا ہی تو ہاے نصیب — دور کیوں دام سی تیرے رہے ہم اے صیّاد
۳ یا کر آزاد کہ کر بند قفس کے روزن — یہہ ہوا باغ کی کرتی ہے ستم اے صیّاد
۴ اپنے گرنے کا زمیں پر مجھے افسوس نہیں — شاخ گل اس کی کشاکش سی ہو خم اے صیّاد
۱ زبانی کہیو لکھ سکتا نہیں اے نامہ بر کاغذ ۱۲۹ مجھے آتا ہی رونا اور ہوا جاتا ہے تر کاغذ
۲ نہ کچھ پوچھ عشق میں اپنے ہمارے دل کی حالت کو — کبھی دیکھا تو ہوگا تونے بھی ایجا لے سر کاغذ
۳ یہاں تک بدگماں ہی میرے نامے کے تو تم سی — نہیں چھوتا ہی مصحف کا بھی وہ کافر پسر کاغذ
۴ کسی کے عشق کی باتیں لکھیں اے یار سچ کہنا — رضا کیوں دیکھتا رہتا ہی تو آٹھوں پہر کاغذ
۱ نہ کہیو نکہت گل ہاے باغ نازک تر ۱۳۰ کسی کا اس سے بھی ہوگا دماغ نازک تر
۲ ہواے آہ کے چلنے سے بکھرے جاتے ہیں — گل چمن سے ہیں گل ہاے داغ نازک تر
۳ تمھارا چلنا نہیں خالی از نزاکت کیا — ہی اپنا آہ دماغ سراغ نازک تر
۴ الٰہی چشم بد اس سی تو دور ہی رکھیو — کہ مست سخت ہوں میں اور ایاغ نازک تر
۵ رضا کو یاد رکھو اے فراموشی کار ال — کہ دوستی ہے بہ شرط جناغ نازک تر
۱ اس کے لبوں کے مقابل ہرگز اے خضر آب حیات کر ۱۳۱ مرنا ہی اک روز میاں اپنے سے ظلمات نہ کر
۲ صبح ہی جی ڈہا جاتا ہے دل گھبرا گھبرا آتا ہی — تجھ کو قسم میرے مرنے کی وعدے کا دن رات نہ کر
۳ ہم سے بھلے مانس نہیں آخر ہم ہی نس رلوں نہیں — بیٹھ یہاں ہی دو اک دم کچھ جی میں پانچ اور سات نہ کر
۴ اپنے آنے جانے کی مت کہہ یار کہ ہم مرجائیں گے — غیر ہی بے غیرت ہے اتنا ہم سے یہہ حرکات نہ کر
۵ جب ہمنے کہا کیتے نہیں ہم عاشق تھی پھر بات ہی — کچھ کہہ کے جو کوئی منکر ہو اس بات کے تئیں اثبات کر
۶ میر رضا کی بات ہی کچھ ہو جس کو جی میں لائے کوئی — کیسے پر جب جائے ہیں وہ دن گئے ایسی بات نہ کر
۱ بہت ہی ان دنوں دل عشق کے افسانوں پر ۱۳۲ مجھے یہہ ڈر ہے کہیں رو نہ بیٹھ جانوں پہ
۲ نہ ان کو شیخ سے الفت نہ برہمن سے نزاع — قسم ہے پیر کی مرتا ہوں نوجوانوں پہ
۱ مان کہنا ذرا آ بیٹھ سر منظر پر ۱۳۳ ورنہ جاری ہوا سیلاب لہو کا در پر
۲ آب حیواں کو کہاں ڈھونڈیے دل کے ہوتے — حیف ہی کوشش بے حاصل اسکندر پر
۳ دل کی الفت نہ گئی خط کے بھی آنے سے رضا — شام کو بھی یہ سیہ روز نہ آیا گھر پر
۱ کر نظر اپنی ٹک کشاری پر ۱۳۴ رحم کر میرے زخم کاری پر

| | | | |
|---|---|---|---|
| شمع روتی تھی رات مجلس میں | | بن نزے میری آہ و زاری پر | ۲ |
| دل جگر جان سب تباہ ہوئے | | رؤوں کس کی میں سوگواری پر | ۳ |
| ٹک قرار اپنا یاد کر پھر تو | | طعن کر میری بے قراری پر | ۴ |
| پھر بہت یاد کرکے روئے گا | — | ہنس لے اب میری اشک باری پر | ۵ |
| تیری گلی بغیر رضا کو نہیں قرار | ۱۳۵ | جز سمت کعبہ قبلہ نما کو نہیں قرار | ۱ |
| آئے گا جب سے دل نالاں کو گو ہیں | — | منزل بغیر پہنچے درا کو نہیں قرار | ۲ |
| روز تو ہم کو ملے ہیں زور پر | ۱۳۶ | زور مت کرنا کسی کم زور پر | ۱ |
| کیا تماشا ہا تھ میں ٹک دیکھنا | | آنکھ جھپکی جائے ہے ہر پور پر | ۲ |
| کس پر و نار پر کھائے ہیں گل | | کیوں مرے دل سے ہیں تیرے نور پر | ۳ |
| روشنی بزم معنی تھا رضا | — | نور برسے یارب اس کی گور پر | ۴ |
| جان دینے پہ ملے ہے جاناں | ۱۳۷ | عشق کا سود و زیاں ہے کچھ اور | ۱ |
| گو تو دامن کو اور خنجر کو دھو | | خون عاشق کا نشاں ہے کچھ اور | ۲ |
| اس محبت تری دیکھی تاثیر | | یہاں کچھ اور وہاں ہے کچھ اور | ۳ |
| سرو کو قد سے نہ دو اس کے مثال | | نوجواں میرا جواں ہے کچھ اور | ۴ |
| بدگماں یار ہوا غیروں سے | | ان میں بھی ہم کو گماں ہے کچھ اور | ۵ |
| اے رضا جلد خبر لے دل کی | — | اب کے حسم ہے کچھ اور | ۶ |
| اب رضا کا ملال ہے کچھ اور | ۱۳۸ | اب دوانے کا حال ہے کچھ اور | ۱ |
| سرو کو اس کے قد سے کیا نسبت | | وہ مرا نو نہال ہے کچھ اور | ۲ |
| کبک چلتا ہے وضع سے لیکن | | خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور | ۳ |
| خون دل سے بھرا ہے شیشۂ چشم | | شیخ جی کا خیال ہے کچھ اور | ۴ |
| ایک دم ہجر یا مت ہے | — | عشق کا ماہ و سال ہے کچھ اور | ۵ |
| ہوں نقش پا ست راہ میں اس کی فتادہ تر | ۱۳۹ | تو ہے ہوں ناتوانی کی یارب زیادہ تر | ۱ |
| کس طرح نو خطوں کے نہ کھائے بھلا فریب | | ہے روے سادگاں کو [illegible] دل اپنا سادہ تر | ۲ |
| کیوں کر نہ آنکھیں ٹھنڈی کرے خیال کر دسب | | . . . . . . . . . . . | ۳ |

۴ چاہا تھا اُس کو بھولیں جفا کے خیال سے — اس سے تو یاد اور بھی ہوئے ہی زیادہ تر

۱ نہ رکھ فانوس اے فرّاش محفل شمع روشن پر ۱۴۰ نہ پروانے بچارے کا تو لے خون اپنی گردن پر

۲ سمجھ کر رکھیو پھاہا داغ سینہ پر مرے جرّاح — نہیں رکھتا ہے ہرگز پنبہ کوئی سوراخ گلخن پر

۳ زہے تسلیم زیر تیغ بھی تڑپے نہ اس ڈر سے — مبادا چھینٹ لوہو کی پڑے قاتل کے دامن پر

۴ نہ چھوڑا آرزو کا ایک دانہ بھی جو پھر تو نے — گری بجلی کہاں سو ایسی اپنے آہ خرمن پر

۵ رضا لشکر جگر کا غم نہ رو چپ رہ کہ ہم کو بھی — ہے اپنے دل کا ماتم یاد آتا تیرے شیون پر

۱ بھر نظر دیکھیں گے ہم اُس کو بلا جاناں اگر ۱۴۱ دیویں گے رونے سے فرصت دیدۂ گریاں اگر

۲ حشر میں انصاف تو ہوگا ولیکن اس کو دیکھ — حال اپنا کہہ سکے گا عاشق حیراں اگر

۳ اے مسلماناں کریں گے ہم سلام اُس دم تمھیں — آگیا ایدھر کو وہ غارت گر ایماں اگر

۴ دل کو کرتے ہو تو منع جیسے اس غم سو ہائے — عشق کے آغاز کا ہوتا کہیں پایاں اگر

۵ اے رضا وعدے سے اُس کے آج کیوں ہوتا خراب — کل ہی کر لیتا وفا کا اُس کی تو پیماں اگر

۱ رضا اس آہ و فغاں سے تو جائے مر بہتر ۱۴۲ فسانۂ غم دل دار مختصر بہتر

۲ کبھی یہ کاوش غم ہائے اپنے جی سے نہ گئی — خراب تر ہوا دل گر ہوا جگر بہتر

۳ جو چشم و دل نہ رہیں اختیار میں اپنے — دل ایسا خوب ہے بہتر و چشم تر بہتر

۱ چاندنی ہے آگ سی اے ماہ ہمارے تجھ بغیر ۱۴۳ لگتے ہیں اخگر سے آنکھوں میں ستارے تجھ بغیر

۲ حسرتوں سے دل کی اپنا جلد جی نکلا نہیں — دیر گر مرنے میں تھی لاچار پیارے تجھ بغیر

۱ ہاتھ اُس کے نہ آیا دامن ناز ۱۴۴ عشق کو سنتے ہی تھے دست دراز

۲ بیت ابرو ہے مخزن اسرار — خط ہے چہرے کا شرح گلشن راز

۳ دیکھ کر چشم خون دل رونا — کہیں افشا نہ ہو کسی کا راز

۴ کیوں نہ بدنام ہوں جہان میں میں — دل ہے بدخواہ چشم ہے غمّاز

۵ ایک دل کے لیے یہ فوج کشی — عشوہ و ناز غمزہ و انداز

۶ جب بلاتا ایاز کو محمود — کچھ نہ کہتا سوائے بندہ نواز

۷ جب تک اُس سے نیاز دل نہ کہوں — نہیں پڑھنے کا اے رضا میں نماز

۱ بجھ گیا دل غم سے اور خو اُس کی سرکش ہے ہنوز ۱۴۵ جل گیا یہ گھاس اور وہ شعلہ سرکش ہے ہنوز

مرگئے تو بھی گیا جی سے نہ زلفوں کا خیال　　گور میں بھی آہ اس دل پر کشاکش ہے ہنوز ۲

ناخوشی تیری سے رضا کی یہ کہے آہ　　تو خوش آمد سے رقیبوں کی میاں خوش ہے ہنوز ۳

۱۴۶

مری خبر نہیں تجھ کو ستم شعار افسوس　　کرے گا پھر تو پشیماں ہو بار بار افسوس ۱

خدا نہ کردہ ہوں شاکی ہجوم غم کا ترے　　ہیں اپنی تنگ دلی پر کروں ہوں یار افسوس ۲

اُسے تو دل پر مرے داغ کا خیال نہیں　　بہار پر نہیں آتی یہ لالہ زار افسوس ۳

غبار آگیا آنکھوں میں راہ تکنے سے　　پر اُس کی راہ کا پایا نہیں غبار افسوس ۴

چمن کی سیر سے اُس بن شگفتگی معلوم　　پر اسا ہی بناو بجاتی ہے بہار افسوس ۵

حریف خوب ملا تھا وہ طفل بازی گوش　　پہ عشق بازی میں ہے سخت یہ قمار افسوس ۶

کیا ہے ایسا مجھے مبتلا نے نومیدی　　ق　ہزار حیف ہے اے عشق اور ہزار افسوس ۷

کہ میرے جانے پر آتا ہے اضطراب کو حیف　　کرے ہے رہنے پہ وعدے کے انتظار افسوس ۸

مگر طبیب نے میرے دیا جواب رضا　　کریں ہیں آج پرستار یار یار افسوس ۹

۱۴۷

دم ہے آتا دیر دیر اور نکلے ہے کم کم نفس　　جی کی کچھ کہنے جو پاتے اب کوئی ہم نفس ۱

ایک دم آرام سے گزرے تو ممکن یہ نہیں　　کہہ کے آئے ہم وہاں یہ ہم ہے آخر دم نفس ۲

کیا کہیں اب ناتوانی سے بہ قول اپنے رضا　　"دم ہے آتا دیر دیر اور نکلے ہے کم کم نفس" ۳

۱۴۸

فسوں تیرا کرے گا مختلط سیماب اور آتش　　کہ لب پر تیرے یک جا جلوہ گر ہے آب اور آتش ۱

مجھے ہر دم کی اشک آہ سے دل کی بہت ڈر ہے　　جلا دیویں مبادا میرے تئیں یہ آب اور آتش ۲

بہت سا میں نے ٹھہرایا نہ ٹھہری یک نفس ہرگز　　نگاہ اپنی ترا پھرتا ہے جوں سیماب اور آتش ۳

نہ کہہ اے زاہد کج فہم خون اور ہے شیشے میں　　مغاں اس کے خلق سے باہم ہوئے ہیں آب اور آتش ۴

جب آیا عشق دل میں صبر کو لازم ہوا جانا　　نہیں رہ سکتے ہیں باہم کہیں سیماب اور آتش ۵

تو اشک گرم مت آنکھوں میں اپنی جا نہ دے ہرگز　　کیا ہے عشق نے صنعت سے یک جا آب اور آتش ۶

اُسے جب دیکھتا ہوں آپ سے جاتا رہوں ہوں میں　　مقابل کس طرح ہو کر رہیں سیماب اور آتش ۷

تری نیرنگی نے یک رنگ کر آدم کو دکھلایا　　جو چاروں مختلف تھے باد اور خاک آب اور آتش ۸

ایا کھینچ اپنا زانو ہائے کنج ہم نشیں سچ کہہ　　کہ اب سر میرا اور بالیں ہے جوں سیماب اور آتش ۹

کسی کو اشک و آہ اپنی پہ رحم آتا نہیں ذرہ　　الٰہی شہر بیدادوں کو لیوے آب اور آتش ۱۰

۱۱ گیا جو کوچے سے تیرے گیا وہ سارے عالم سے — مثل عاشق کی پھر دنیا سے ہے سیماب اور آتش
۱۲ سلوک غم ہمارے دل سے مت پوچھو تم اے یارو — کبھی دیکھا تو ہوگا تم نے ملتے آب اور آتش
۱۳ اٹھا مت برقع اپنے منہ سے آگے بے قراروں کے — مری جاں اور تری صورت ہے جوں سیماب اور آتش
۱۴ کوئی سیراب عشرت سے کوئی جلتا ہے حسرت سے — مگر ظالم تری تلوار میں ہے آب اور آتش
۱۵ رضا دو قافیے پر میں لکھی ساری غزل آخر — کہیں ہے آب اور آتش کہیں سیماب اور آتش

۱ دل شکستہ کو ہے اب شراب کی خواہش ۱۴۹ کہاں تلک نہ ہو زخمی کو آب کی خواہش
۲ میں کیا کروں گا ہوا دل بھی جل کے اب بھسمنت — اگر کرے وہ شرابی کباب کی خواہش
۳ رضا کو تیری خوشی سب طرح سے ہے منظور — نہ غم عذاب کا ہے نہ ثواب کی خواہش

۱ ہوتے ہیں جب شراب سے مستانہ وقت رقص ۱۵۰ کیا کیا ادا بناتے ہیں جانانہ وقت رقص
۲ طاؤس اپنی شورش مستی کو بھول جائے — دیکھے اگر وہ جلوۂ مستانہ وقت رقص

۱ چشم سے تیری بر آئی جو تھی آفت کی غرض ۱۵۱ تیرے قامت سے ہوئی حاصل قیامت کی غرض
۲ جاں نے بھی کر دیا مطلب وفا کا سب تمام — دل ہی نے میرے نہ کی پوری محبت کی غرض

۱ ہو روشنی بزم مری بے خطر اے شمع ۱۵۲ پروانگی ملتا نہیں تھا یاں پہ اے شمع
۲ پروانے کو تو شام ہی کو تو نے جلایا — کچھ اپنی سحر کی بھی تجھے ہے خبر اے شمع
۳ یہ سچ ہے کہ چہرہ ترا چندا ہے ولیکن — پھر کس لیے رکھتا ہے لگن چشم تر اے شمع
۴ یوں صبح کے تئیں اپنی کیا شام رضا نے — جس طرح تری شام ہوئی سحر اے شمع

۱ دل میں اب باقی نہیں ہے جائے داغ ۱۵۳ ہیں گے از بس داغ بر بالائے داغ
۲ لالے کو اک داغ تازہ اور ہو — دل کا اپنے گر رضا دکھلائے داغ

۱ ہم اپنی دینے میں تم کو کریں نہ جان دریغ ۱۵۴ تم ایک بوسہ نہیں دیتے مہربان دریغ
۲ مجھے نہ جانا کبھی تو نے اپنا دشمن بھی — دریغ میری محبت ترا گمان دریغ

۱ ذرا تو ناز کرے شوخ سے وفا موقوف ۱۵۵ نیاز فرض ہے اب ملنا ہو گیا موقوف
۲ ترا تو اب کہیں مطلب کھلا کہ ہم نے عشق — کیا تھا پہلے ہی سے اپنا مدعا موقوف
۳ حساب میں بھلا دیکھیں زیادہ نکلے کون — خطا نہ کم کریں ہم اور نہ تو عطا موقوف
۴ کبھی جو بات نہ کہتا تھا اس نے دی گالی — اثر جو دیکھا نہ کچھ ہم نے کی دعا موقوف

| مصرع اول | غزل | مصرع ثانی | شعر |
|---|---|---|---|
| یہ عقل ہے کہ خدائی اُسے ملے لیکن | — | بتوں کا عشق کرے اب بھی گر رضا موقوف | ۵ |
| کیا درد ہے عشق کا مخالف | ۱۵۶ | ہے اس کی سبھی دوا مخالف | ۱ |
| کیوں کر ملے مجھ سے یار ہنس کے | — | آپس ہیں شہ و گدا مخالف | ۲ |
| شورِ بلبل ہے فغانِ دلِ زارِ عاشق | ۱۵۷ | سر گریبان میں کرتا ہے بہارِ عاشق | ۱ |
| دیکھ کیدھر گیا تک قول و قرار اپنے کو | | کیا ہوا پوچھ نہ کچھ صبر و قرارِ عاشق | ۲ |
| جن نے عالم میں فنا ہی کے ...... | | کچھ نہ لے اہلِ جہاں پہ چھوڑ دیارِ عاشق | ۳ |
| داغِ دل گنتا ہوں گہہ گاہ فلک کے تارے | | ہے شبِ ہجر تری روز شمارِ عاشق | ۴ |
| ہاتھ سے دیدۂ تر کے مری حالت مت پوچھ | | بحرِ عماں کا کنارہ ہے کنارِ عاشق | ۵ |
| پہلے تک قلب دل بوالہوساں ہاتھ میں لے | | ہوگا ظاہر تجھے تب صافِ عیارِ عاشق | ۶ |
| خاک پر گو کہ ہماری نہ رکھے کوئی چراغ | | ہوتا ہے داغ جگر شمع مزارِ عاشق | ۷ |
| دوستو ہم سفری مجھ سے نہ چاہو ہرگز | | کہ سرِ راہ فنا پر ہے گذارِ عاشق | ۸ |
| ہر گھڑی آنے پہ مت جا تو رضا کے اے شوخ | — | بے قراری ہوئی ملزومِ شعارِ عاشق | ۹ |
| گنتے ہی ہوئے گھڑیاں دن کرتے ہیں سب عاشق | ۱۵۸ | تھی کون گھڑی یارب ہم ہوگئے جب عاشق | ۱ |
| جوں نقشِ قدم در پر بیٹھا جو رضا اُس کے | — | لے خاک ترے سر پہ آرام طلب عاشق | ۲ |
| عجب نصیب ہیں اپنے اگر ہو یار موافق | ۱۵۹ | تو ایک دم نہیں رہتا ہے روزگار موافق | ۱ |
| چمن میں چاک جگر گل ہیں نالہ زن سبھی بلبل | — | ہوا کسی کو نہیں تیری لے بہار موافق | ۲ |
| ایسا ہے تجھ پیرہن میں یوسف چالاک چاک | ۱۶۰ | دیکھا دل کو زلیخا کے کر ہے سب چاک چاک | ۱ |
| اپنا تو منہ بند کر سکتا نہیں ہے ناصحا | | مجھ گریباں کا سیا جائے گا تجھ سے خاک چاک | ۲ |
| گر گریباں کو ادھر تار نگہہ سے سیجیے | — | دل کو کرتا ہے اُدھر وہ غمزۂ بے باک چاک | ۳ |
| گو نہ ہوا دست رس یار کے داماں تلک | ۱۶۱ | کاش پہنچے یہ ہاتھ اپنے گریباں تلک | ۱ |
| کس کی پڑی در کی خاک دیدۂ گریاں میں آ | | اشک ہوا آ نہیں اب سر مژگاں تلک | ۲ |
| وصل ہی کے دن مرے قتل کے درپے ہو رشک | | زیست کی کس کو اُمید ہے شبِ ہجراں تلک | ۳ |
| کہیو رضا مر گیا جو ہیں قفس میں گیا | — | گر ہو گذر اے صبا تیرا گلستاں تلک | ۴ |
| پہنچی ہے ناتوانی مری اب یہاں تلک | ۱۶۲ | نکلے ہے جان حرف جو لاؤں زباں تلک | ۱ |

٢ تھا تیر تیر نالہ کا عمل لامکاں تلک  آگے خدا ہی جانے کہ گزرا کہاں تلک
٣ ظاہر کرے گا سب مری افتادگی کا حال  جس کو رسائی ہو گی ترے آستاں تلک
٤ کیجے جفا کسی پہ تو اک حد سے کیجیے  طاقت وفا کی دیکھیے ظالم جہاں تلک
٥ ہم ہی نہ تو ہم کو بھی کچھ اس میں سود ہے  راضی جو تم ہمارے ہو جی کے زیاں تلک
٦ اک بار بس تو مجھ سے بھی آگے رقیب کے  رکھتا ہے وہ خوشی تری دیکھو کہاں تلک
٧ سو بار اُن کو کہہ چکے باز آؤ عشق سے  ق  اس میں خرابی آئے ہو جائے ہو جاں تلک
٨ مجنوں کا بھی فسانہ سنایا انھیں تمام  فرہاد کا بھی قصہ کہا تھا جہاں تلک
٩ وے تو کسی طرح سے نہیں مانتے ہیں آہ — سمجھائے کوئی میر رضا کو کہاں تلک
١ دکھلا چکی یاں تک تو مری جلوہ گری رنگ ١٦٣ آنکھوں سے نکلتے ہیں اب اشکِ جگری رنگ
٢ خاک ہونے دے جاروب درِ مے کدہ کی خاک  پھر دیکھنا ہے یہ ترا آب خضری رنگ
٣ اُس سروِ خراماں کو ذرا آنے دے باہر  تب دیکھیں گے جلوے کا ترے کبک دری رنگ
٤ وابستہ مرے دم سے ترا راز ہے ورنہ  دکھلائے گی ظالم یہ مری جاں سپری رنگ
٥ اے شیخ تجھے دیو ریا کا جو نہ لگتا  اپنا بھی دکھاتی مرے شیشے کی پری رنگ
٦ بس دیکھ چکے نالۂ شب تیرا تو جلوہ  اب دیکھیے کیا کرتی ہے آہ سحری رنگ
٧ ل منہ میں رضا خاک ہم اُس کوچے کی مر گئے — عاشق یوہیں کرتے ہیں لباس سفری رنگ
١ تجھ سے یوں مل گیا ہمارا دل ١٦٤ ہم سے نا آشنا تھا گویا دل
٢ جیسا خانہ خراب مجھ کو کیا  گھر ہو ایسا خراب تیرا دل
٣ تم تو پاؤں اپنے سرخ کر بیٹھے  گو کہ پامال ہو کسی کا دل
٤ دشمن اک عالم اس کا کیوں ہوتا  بات گر دوستوں کی سنتا دل
٥ یار اغیار کا اک طرف  دشمن اپنی بغل میں ہے گا دل
٦ کیوں نہ کہتے تھے بات ہماری سن  ویسی ہی اب تو تو نے دیکھا دل
٧ آہیں ایسی بھریں رضا نے رات — جس سے ٹھہر گیا ہمارا دل
١ بات [illegible] دل جسے سب کہتے تھے افلاک کے مول ١٦٥ دولتِ عشق سے بکتا نہیں اب خاک کے مول
٢ جامِ جمشید کہاں جامِ مے ناب کہاں  آبِ حیواں ہی نہیں مے کدے کی خاک کے مول

بس کہ زلفوں کے بنانے کا اُسے سودا ہے | شانے کو لیتے ہیں اب ہم دل صد چاک کے مول ۳

خوں چکاں لاش نہیں کیوں نکہ لگاتے صیاد — یعنی یہہ صید نہیں اُس کی جو فتراک کے مول ۴

نہ نامہ بھیج سکتے ہیں نہ پیغام زبانی ہم ١٦٦ کریں یا کس سے تری فریاد لے رازِ نہانی ہم ١

یہ کس کے عشق کا شعلہ ہے بھڑکا تن بدن میں ہائے | کرے جائے آب ریزی کرتے ہیں روغن فشانی ہم ۲

نہیں آتا سہی پر جھوٹ ہی کہیے کہ آئے گا | کریں گے یہ توقع صرف کیوں کر زندگانی ہم ۳

سبک سب کی نظر میں ہو گئے ہیں خاک ساری سے | رکھیں ہیں آتش پنہاں تہ دل میں گرانی ہم ۴

غم ہجراں میں مرنے کی نہیں حسرت پہ یہہ غم ہے | کہ اُس کے روبرو کرنے نہ پائے جاں فشانی ہم ۵

نہ سمجھے تھے کہ ہو گی حسب حال آخر کو اپنے ہی | نہایت شوق سے سنتے تھے مجنوں کی کہانی ہم ۶

اب آیا وقت پیری کا ذرا تو رحم کر ظالم | کہ صرف درد و غم تو کر چکے ساری جوانی ہم ۷

گرے جو اُس گلی میں تھے نہ اٹھے نقش پا کی طرح | کریں اب کس زباں سے شکر تیرا ناتوانی ہم ۸

رضا یاروں میں معنی رس نظر آتا نہیں کوئی — ضیا استاد کے آگے کریں اب شعر خوانی ہم ۹

دیکھیں ہماری ہوتی ہے کب شام غم تمام ١٦٧ پروانے کا تو قصہ ہوا صبح دم تمام ١

وعدے کی رات آئے ہے وہ حیلہ جو کبھی | یعنی کہ اس ہی شوق میں ہو جائیں ہم تمام ۲

رندوں کے ہو جیے متعرض نہ شیخ جی | جائے نکل مباد تمہارا بھرم تمام ۳

بندہ وہی خدا کا ہے جو بندگی کرے | ورنہ یہی زمانے میں عبد الصنم تمام ۴

وہ تو بلا کشوں کو کہیں ہیں رکھے ہے دوست — میرے ہی ہو نصیب رضا درد و غم تمام ۵

جوں شرر ہستی میں کہنے کو تو یاں آتے ہیں ہم ١٦٨ کھولتے ہی آنکھ کے پھر راکھ ہو جاتے ہیں ہم ١

کس طرف ہے گھر ترا اے عشق بتلا دے ہمیں | نہ تجھے کعبے میں نہ بت خانے میں پاتے ہیں ہم ۲

جب سے مہمان غم کے ہیں ہم کیا کہیں اپنی معاش | خونِ دل پیتے ہیں اور لخت جگر کھاتے ہیں ہم ۳

دوستو ٹک اُس ستم گر کو نصیحت تو کرو — یہہ دوانا ہے رضا اب اس کو سمجھاتے ہیں ہم ۴

وسعتِ مشرب سے ہیں ہر نیک و بد کے یار ہم ١٦٩ گاہ تار سبحہ ہیں گہہ رشتۂ زنار ہم ١

کیا طبیبوں سے کہیں ہم حال اپنے درد کا | نرگس بیمار تیری دیکھ ہوئے بیمار ہم ۲

چشم گریاں، سینہ بریاں، دل تپاں، غیروں کے ہاتھ | اٹھ چلے جوں شمع تیری بزم سے اے یار ہم ۳

شمع و گل تو ہم نہیں پر زخم و داغوں سے ترے | روشنی بزم ہیں اور رونق گلزار ہم ۴

۵ تیغ ابرو ہر طرف اپنی دکھاتے ہو میاں — ہیں سپاہی ہم بھی دیکھیں آپ کی تروار ہم
۶ کم کریں گے آہ و نالہ تیری خاطر سے رضا — چشم تر سے لیک ہیں اے مہرباں لاچار ہم

۱۷۰

۱ آخر تو میاں تجھ سے ہو نومید چلے ہم — آجا کہ ذرا دل میں ترے لگ کے گلے ہم
۲ کیا اشک سے اور آہ سے اپنا کہیں احوال — اس آب میں ڈوبے اور اس آتش میں جلے ہم
۳ کیا ہم کو سناتے ہو کہ کل جاؤں گا میں آہ — ہے دیر بہت کل میں لو یاں آج ہی چلے ہم
۴ سینہ ہے سبھی داغ، جگر زخم ہے سارا — اے عشق ترے ہاتھ سے کیا پھولے پھلے ہم
۵ کیا سوختگی آہ رضا دل میں ہے تیرے — سننے سے ترے حال کے جاتے ہیں جلے ہم

۱۷۱

۱ اثر گر ایک پاتے نالہ سو بنیاد کرتے ہم — جو ملتا سننے والا کوئی تو فریاد کرتے ہم
۲ رضا اب کیا کیجے کہ آنسو بھی نہیں آتے — کبھی رو رو دلِ ناشاد کو بھی شاد کرتے ہم

۱۷۲

۱ اے بت ناآشنا کب تجھ سے بیگانے ہیں ہم — تو اگر اس بزم میں مے ہو تو پیمانے ہیں ہم
۲ بوسہ لیویں یا گلے لگ جائیں آزردہ نہ ہو — چاہنے والے ہیں اور دیوانے مستانے ہیں ہم
۳ کیا الم اور حسرتیں اپنی کہیں اے دوستاں — رات کو بلبل ہیں ہم اور دن کو پروانے ہیں ہم
۴ گھورنے سے کیا تمھاری آنکھوں کے ہم ڈر گئے — وے اگر ہیں مست اے پیارے تو دیوانے ہیں ہم
۵ اے رضا ہم مل گئے اس سے گلے پی کر شراب — گو ہیں دیوانے پر اپنے کام کے سیانے ہیں ہم

۱۷۳

۱ گرچہ ہیں لاچار اپنے اس دلِ مضطر سے ہم — پر جو کچھ ہونی ہو ہو جاتے ہیں تیرے ڈر سے ہم
۲ بے وفا دستِ ستم اپنا ذرا موقوف رکھ — داغ سینے کے مقابل کر لیں ٹک اختر سے ہم
۳ کیا کہیں سوزِ دروں سے پہنچے ہیں اس حال کو — واسطے تسکین کے اب بدلیں ہیں دل اخگر سے ہم
۴ اس کے صاحب خانہ کے اب دیکھنے کا شوق ہے — کعبے کو باہیب پاتے ہیں تیرے گھر سے ہم
۵ جب میں رو کی راہ غصے ہو یہ کہہ کر پھر گیا — کم نکلتے ہیں اسی باعث رضا اب گھر سے ہم

۱۷۴

۱ ہر نفس موردِ سفر ہیں ہم — گویا دکانِ شیشہ گر ہیں ہم
۲ شمع سے گاہ تاج سر میں ہم — گہہ پتنگے کے بال و پر ہیں ہم
۳ عشق نے جب سے کی ہے دل گرمی — برق ہیں شعلہ ہیں شرر ہیں ہم
۴ رنگِ رخسار خوب رویاں ہیں — آہ عشاق کے اثر ہیں ہم
۵ ہم ہیں نیرنگی بہار کے رنگ — نخل و برگ و گل و ثمر ہیں ہم

سجدہ گہہ ہیں تمام عالم کی — کس کی یہہ خاک رہ گذر ہیں ہم ۶

اہل دل اپنے رہتے ہیں مشتاق — گویا وصل کی خبر ہیں ہم ۷

حال خطِ شکستہ میں لکھا — یعنی اس سے شکستہ تر ہیں ہم ۸

دشمنی ہم سے ہو نہیں سکتی — تجھ سے شرمندہ کینہ ور ہیں ہم ۹

جب سے دیکھی ہے اُس کے گھر کی راہ — اور خانہ خراب تر ہیں ہم ۱۰

رشک میں شور و شر سے ہیں لاچار — کچھ فرشتے نہیں بشر ہیں ہم ۱۱

اُس نے احوال پوچھا ہم مرگئے — کس قدر قصہ مختصر ہیں ہم ۱۲

کیا کریں دل نہیں ہے پاس رضا — صبر ہیں ورنہ بے جگر ہیں ہم ۱۳

۱۷۵

اب تو تم بھی جواں ہوئے ہو دیکھیں گے دل کو بچاؤ گے تم — دل جو گیا ہم چشم کوئی پھر آنکھ اُسی سے لڑاؤ گے تم ۱

اب جو ہم تم سے کہتے ہیں تم بھی کسی سے کروگے وفا — ہم سے تمھارا سلوک ہو جیسا ویسا ہی بدلا پاؤ گے تم ۲

بے تابی سے روؤ گے کیا کیا لگی کسی کی مجلس میں — آؤ گے تم بیٹھو گے تم پھر آؤ گے تم اٹھ جاؤ گے تم ۳

رعشہ تھی زباں میں لکنت پاؤں بیڑی بھرا دینگے — منہ سے کچھ کا کچھ نکلے گا دل میں جو ٹھہراؤ گے تم ۴

وہ تمھاری سیکھ تمھیں سے بات میں بات نکالے گا — میری صورت اپنا سا منہ تاک کے بھر رہ جاؤ گے تم ۵

نام کو دانہ دو دو دن تک میری طرح دیکھو گے نہیں — جب میں بہت سمجھاؤں گا تو تھوڑا سا کھانا کھاؤ گے تم ۶

نئی نئی چوٹیں کھا کھا کر جب بے کل ہو جاؤ گے — مجھ کو ہمدرد اپنا سمجھ کہنے کو غم کے آؤ گے تم ۷

ہر ہر بات میں رو رو کے گھبرا گھبرا کر بولو گے — کیسے غریب غریب سے ہوکر دل کی باتیں سناؤ گے تم ۸

میرے حالی شعروں کے مضمون بہت یاد آئیں گے — دس دس بار ایک ایک غزل کو مجھ سے پھر پڑھواؤ گے تم ۹

ہم نے ویسا آئینہ دے کر ہمیں دکھلا ہے — یہہ تو کہو معشوق کو اپنے ہم کو بھی دکھلاؤ گے تم ۱۰

دل میں تم اپنے مت لانا جیتے رہے گر میر رضا — دے دل اُس کا ہاتھ میں لے کے جیسے دل کو لگاؤ گے تم ۱۱

۱۷۶

رہیں ہیں دل لگا پروازِ مرغ نامہ پر ہم — نہ کہہ اے شیخ کافر رکھتے ہیں دین پیمبر ہم ۱

پیام دوست ہی ایک ہی جدا گو اصطلاحیں ہیں — جسے لکھتے ہیں جبریل اہل دل اُس کو کبوتر ہم ۲

۱۷۷

سینہ نشانہ گاہِ تیر و سناں کریں ہم — اس دل کے واسطے کیوں کر خاطر نشاں کریں ہم ۱

گزر کرِ غم سے اب کے بچ جائیں یا الٰہی — کافر ہوں گر کبھی پھر عشق بتاں کریں ہم ۲

کب گل کو درد آیا نالے پہ بلبلوں کے — کیا اس کے بھاؤں ہر چند آہ و فغاں کریں ہم ۳

۴ ہر دم کہو ہو کس کا بیمارِ عشق ہے تو — ہے شرط درد اپنا پیارے بیاں کریں ہم

۵ کہہ اے رضا تو ہم کو کیا دے گا مژدگانی — اُس بے وفا کو تجھ پر گر مہرباں کریں ہم

۱ نہ کھلا ہوں لالہ ساں نہ مثلِ گل خندیدہ ہوں ۱۷۸ باغ میں دنیا کے میں تو بلبلِ نالیدہ ہوں

۲ کیا الم اور حسرتیں اپنی کہوں اے دوستاں — ہجر کا کشتہ ہوں میں اور وصل کا نادیدہ ہوں

۳ گھر بسے تو ہے کہاں میں تیری خاطر جوں صبا — کو بہ کو خانہ بہ خانہ در بہ در گردیدہ ہوں

۴ رو ہوں نہ غازہ ملا نہ ہاتھ ہوں مہندی بھرا — مثلِ مرجاں آپ ہی اپنے خون میں غلتیدہ ہوں

۵ نہ اُبلنا بحر کا دیکھا ہے نہ جوشش تنور — اپنے ہی آنکھوں کے اشکوں سے میں طوفاں دیدہ ہوں

۶ آرزو کیا جانے کیا تجھ سے ہے اس کے دل تئیں — دو جہاں سے ورنہ میں دامانِ خواہش چیدہ ہوں

۷ داغِ دل زخمی جگر سینہ مشبک چشم تر — ہر طرح سے تجھ سے میں اے عشق آفت دیدہ ہوں

۸ عشق کا نام و نشاں عنواں پہ ہو میرے رضا — میں کسی کے دل کا شاید نامۂ پیچیدہ ہوں

۱ دل کا لینا تمھیں اے یار جو منظور نہیں ۱۷۹ پھیر دو جلد کہ سودے کا یہ دستور نہیں

۲ دستِ شفقت نہ اٹھایا یاں سے نہیں جائے ہراس — دل صد چاک ہے یہ خانۂ زنبور نہیں

۳ اک ہمیں مے کدۂ دہر سے ناکام گئے — ورنہ یاں کون ہے جو اس بادہ سے مخمور نہیں

۴ لے گئے بھر کے سبو بحر جہاں سب یاں سے — اک ہمارا ہی پیالہ ہے کہ معمور نہیں

۵ تیری فرقت میں وہ حالت ہے مرے دل کی آہ ق خامے کو لکھنے کا جس کے ذرا مقدور نہیں

۶ کون سا روز ہے جو وہ نہیں ہے حشر کا دن — کون سی رات ہے جو ہجر میں دیجور نہیں

۷ ٹک سمجھ کر کے رضا جام محبت پیجو — یہ مے عشق ہے ظالم مے انگور نہیں

۱ تنہا گھڑی کا سرخ یہ دیوار و در نہیں ۱۸۰ اس چشم خوں فشاں سے گلستاں کدھر نہیں

۲ قاصد نہ کہہ کہ اُن نے خبر بھی نہ پوچھی ہائے — اتنا بھی میرے حال سے وہ بے خبر نہیں

۳ دل کو تو جوں توں کر کے میں سمجھایا ناصحو — بن دیکھے اُس کے مانتی یہ چشم تر نہیں

۴ روشن ہمارے گھر کو کر اے شمع بزم حسن — خوش رہ کہ ہے پتنگے کے تئیں بال و پر نہیں

۵ قسمت تو دیکھ اپنے نصیبوں میں ہے ملا — اک نالہ ہائے اُس میں ذرا بھی اثر نہیں

۶ میں نے کہا رضا سے کہ اے بے شعور ہائے ق کچھ بھی تجھے تو حال پر اپنے نظر نہیں

۷ یہ وضع کیسی ہو گئی کہاں کا یہ طور ہے — جب آ کے تجھ کو دیکھتے ہیں اپنے گھر نہیں

جس کوچے میں گزرتے ہیں اُس کی زبان پر — تجھ ذکر کے سوا کوئی حرفِ دگر نہیں ۸
کوئی کہے ہے اس کو تو سودے کا زور ہے — اُستاد شہر میں نہیں یا نیشتر نہیں ۹
کہتا ہے کوئی یہ مرض صرع کا ہوا — شہر یانوں کی جو اس کو ذرا بھی خبر نہیں ۱۰
خبطی کہے ہے کوئی کوئی کہتا ہے سڑی — کوئی کہے جو عقل کا اس میں اثر نہیں ۱۱
وہ کون دن کہ آہوں سے تیری نہیں ہے شام — وہ کون شب کہ نالوں سے روزِ حشر نہیں ۱۲
یہہات ہاتھ ملتا ہی رہتا ہے رات دن — رسوائی کا تجھے میاں کچھ اپنی ڈر نہیں ۱۳
یہہ سن کے آہ بھر کے تب اُس نے پڑھا یہ شعر — جس سے غرض رہی مجھے تاب جگر نہیں ۱۴
ناموس و ننگ و ہوش و خرد و جان و دین و دل — سب جاؤ اپنے پاس سے وہ ہی اگر نہیں ۱۵
لاچار ہوں جو عرضِ غم بے کراں کروں ۱۸۱ ہر چند شکوہ ہوتا ہے لے بد زباں نہ ہوں ۱
دیوانگاں کی بات کے مت پڑ خیال میں — ہے اُس کی فہم . . . . . . . . . ۲
کہتی ہے ناتوانی مری مثلِ نقشِ پا — ہر اک قدم پہ اب یہیں لے ہم رہاں رہوں ۳
اک دن زباں اٹھے گا یہ سمجھے تھے ہم بھی — کرتے تھے پیارے عہد میں جب تم اغاں اغوں ۴
اے کہہ تو کیا کروں میں بہ قولِ حسن رضا — "سن سن وہ میرا حال کہے ہو نہ ہاں نہ ہوں" ۵
خواب میں صورتِ خیال آ کر دکھاتا ہے ہمیں ۱۸۲ جاگتے ہیں بخت تب جب خواب آتا ہی ہمیں ۱
وہ جدا رہتا ہے تا مر جائیں ہم غم سے کہیں — اور ہمیں ہو یہہ خوشی یاد آزماتا ہے ہمیں ۲
گر خفا اک بار ہو غیر اُس سے ہنسنے کے لیے — سو طرح کی ناخوشی کر کے رلاتا ہے ہمیں ۳
تو زبس بیٹھا ہے ہم کیوں کر چھپائیں اپنے تئیں — نام تیرا جو کوئی لیتا ہے پاتا ہے ہمیں ۴
تیرے کوچے میں کبھی آ کر جو ہو جاتے ہیں ہم — کعبے کے باشندوں پر افسوس آتا ہے ہمیں ۵
تجھ سے بے غیرت نہیں ہم لے رضا محذور رکھ — غیر سے ملنے کی اُس کے کیوں سناتا ہے ہمیں ۶
میں سوائے سوزِ دل جوں شمع کچھ کہتا نہیں ۱۸۳ رقص بھی میرا کٹھن یار تو رہتا نہیں ۱
ناصحا کہتے ہو ہو بت دیکھے اُس کے تک تو رہ — میں تو رہ بھی جاؤں لیکن آہ دل رہتا نہیں ۲
تب نیا فتنہ ہی تجھ پر ایک اٹھتا ہے نیا — کون دن ہے جس میں اُس کا ستم سہتا نہیں ۳
لے خبر جلد تو رضا سینے میں دل کو کیا ہوا — اشک سرخ آنکھوں سے تیری ان دنوں بہتا نہیں ۴
صبر کرنا دل اگر ہوئے تو مشکل بھی نہیں ۱۸۴ یہہ بڑی مشکل ہے اپنے پاس اب دل بھی نہیں ۱

۲ ہے تعجب بوالہوس سے تم کرو ہو اختلاط — وہ کسی کے پاس بٹھلانے کے بھی قابل نہیں
۳ کون ہے یاں ہم سوا اب جو دل جلوں کا ساتھ دے — اس قدر سوز و تپش میں شمع محفل بھی نہیں
۴ کیا ہوا تیرا رضا ننگ اور گئی غیرت کدھر — کیوں خراب اس پر ہے تو وہ تیرا مائل بھی نہیں

۱ جام دو اوروں کو بھر اس طرف خالی بھی نہیں ۱۸۵ غیر کو بوسہ ملے اور ہم کو گالی بھی نہیں
۲ کیا کہیں اپنی سیہ بختی ہی کا اندھیر ہے — ورنہ سب کی ہجر کی رات ایسی کالی بھی نہیں
۳ ہو چلا بسمل رضا آگے ہی تو تو اور ابھی — میان سے تروار قاتل نے نکالی بھی نہیں

۱ کب تلک ہم گھر کے آنے جانے سے مضطر رہیں ۱۸۶ اب یہی بہتر ہے اس کے در ہی پر ہم مر رہیں
۲ ہم سوا سب چھوٹے اے صیاد کیا انصاف ہے — موسم گل میں بندھے اپنے ہی بال و پر رہیں
۳ آب خنجر ہی سے اس کی یاں ہوئے سیراب ہم — بس ادھر اے شیخ میرے زمزم و کوثر رہیں
۴ ٹک تو آ جا امتحان پر خنجر بیداد کھینچ — بوالہوس سب جانتے ہیں عاشقوں سے دور رہیں
۵ دیکھی بس تاثیر تیری ہم نے اے گرمی عشق — اشک اپنے واں ہوں پانی اور یہاں اخگر رہیں
۶ قیس نے گھر لیا جنگل کوہ کن نے کوہ کو — ہم دوانے اے رضا اب کس طرف جا کر رہیں

۱ ٹک بیٹھ تو اے شوخ دل آرام بغل میں ۱۸۷ آئے نہیں اس دل کو بھی آرام بغل میں
۲ کیوں کر کے نہ گلخن کی طرح آہ جلیں ہم — اک آگ ہے یاں جس کا ہے دل نام بغل میں
۳ سر رکھ کے گریبان میں کر سیر جہاں کی — آئینہ ترے جیب میں ہے جام بغل میں
۴ کس طرح رضا تو نہ ہو رسوائے زمانہ — جب دل سا ترے بیٹھا ہو بدنام بغل میں

۱ نہ کعبہ ہے یہاں میرے نہ ہے بت خانہ پہلو میں ۱۸۸ لیا کس گھر بسے نے آہ آ کر خانہ پہلو میں
۲ فقط دل ہی سمجھ کر عشق دل کو آگ مت دیجو — کسی کے غم کا بھی ظالم ہے یاں کاشانہ پہلو میں
۳ ترے اک جانے سے اے دل کہوں کیا آہ اب میرے — تپش اور درد اور بے تابی ہے کیا کیا نہ پہلو میں
۴ خبر کس کی سنی ہے کل یہاں سے آہ جانے کی — تڑپتا ہے مرا دل آج بے تابانہ پہلو میں
۵ کسی کے عشق کی باتیں رضا آہستہ ٹک کہنا — کہ دل ہے دشمن جانی کا ہے گا خانہ پہلو میں

۱ نہ تجھی بدگماں سے بگڑے ہیں ۱۸۹ ہم تو سارے جہاں سے بگڑے ہیں
۲ آپ آئے بھی خواب میں میرے — کس لیے پاس یاں سے بگڑے ہیں
۳ ہم سے بگڑا ہے گر یہ سپہر رضا — ہم بھی اس آسماں سے بگڑے ہیں

ہم اتنا ہی سمجھے ہیں اس زندگی میں ۱۹۰ عجب صاحبی ہے تری بندگی میں ۱
کہے ہے یہی آمد و شد نفس کی نہ دیکھا کسی کو بھی پایندگی میں ۲
رضا کو بھلا کیا خدائی ملے گی — بتوں کی جو ہے اس قدر بندگی میں ۳

کوئی کشمکش سے زاہد کی کیوں کر بچائے جان ۱۹۱ میرے کہاں سی پیچھے پڑی یہہ بلائے جان ۱
جامہ مزیب اتنا ترا گلبدن نہ تھا خلعت کسی کے دل کی ہو یا یہہ قبائے جان ۲
گر اس کو پیا چاہو نہ رکھو زندگی عزیز یہہ سینہ جائے یار ہے غافل نہ جائے جان ۳
مردے کو ہیں نکالتے بیگانے کی طرح تن پروری نہ کر تو جو ہے آشنائے جان ۴
یاں آنا یار رفتہ کا عقلاً بعید ہے ممکن نہیں گیا ہوا پھر تن میں آئے جاں ۵
اس ہر گھڑی کے مرنے سے آیا ہو جی بہ تنگ یا مجھ سے عشق ہاتھ اٹھائے کہ جائے جاں ۶
کیا آرزو تھی دل میں رضا کے کہ وقت مرگ — روتا تھا اور کہتا یہی تھا کہ ہائے جاں ۷

روزِ محشر کی مت کرو باتیں ۱۹۲ ہم نے دیکھی ہیں ہجر کی راتیں ۱
کس کی ٹھوکر نے اس کو چونکایا برہمن بت کو مانے ہے لاتیں ۲
ہو گیا تھا دو چار چشم پر آہ چلنے پائیں نہ وہ دو سمکھاتیں ۳
دل کو جب اُس سے مانگتا ہوں میں کرتا ہے بھینک بھیانک کی باتیں ۴
کیوں رضا چپکا ہو گیا ایسا — کیا ہوئیں یار تیری وہ باتیں ۵

ایسے خرام ناز سے جیدھر وہ رو کریں ۱۹۳ مردے بھی اُس نگہ سے حیات آرزو کریں ۱
دنیا میں ہوئے حشر سے آگے ہی رستخیز تیری نگہ کے مست جہاں ہاؤ ہو کریں ۲
مانگیں ہیں دل کو زلف جدا انکھڑیاں جدا حیراں ہیں ہم اسی میں کہ کس کس کا رد کریں ۳
جو داد خواہ نا نوشتے ہے حشر کو اٹھا کاش اُس کے یا الٰہی تجھے رو بہ رو کریں ۴
دل جیسے تو ملا ہے تو ملا ہمیں رضا — پھٹ جائے آسمان تو کیوں کر رفو کریں ۵

رونے کی ناصحا نہ خو ہے ہمیں ۱۹۴ کیا کریں اس میں آبرو ہے ہمیں ۱
نت ہیں جو مہر و ماہ سرگرداں آیا یہہ کس کی جستجو ہے ہمیں ۲
دین و دنیا کی سب طلب مٹ گئی کس کی یارب یہہ آرزو ہے ہمیں ۳
دیدے خوب روئیوں کی ناصح — ہم ہیں لاچار اس کی خو ہے ہمیں ۴

۱ سیرِ گلشن کی نہ دو تکلیف دیوانوں کے تئیں ۱۹۵ پھر کرے گا کون آباد آہ ویرانوں کے تئیں
۲ شمع اک صبحِ قیامت تجھ کو بھی درپیش ہے — گو کہ اذیت میں کٹے یہ رات پروانوں کے تئیں
۳ باغ میں ماتم ہے کس بلبل کا کچھ بے طرح آج — چاک کر بیٹھے ہیں سارے گل گریبانوں کے تئیں
۴ پھر رضا ہے توڑتا توبہ کو کہہ دے ساقیا — مغبچوں سو کر رکھیں جاروب خانوں کے تئیں
۱ کس گرم خو کے ہاے پڑا دل تو ہاتھ میں ۱۹۶ بھرتا ہے ٹھنڈی سانس جواب بات بات میں
۲ مت وعدہ صبح کا کر اب اے آفتاب رو — جوں شمع یاں ہے کام تمام اپنا رات میں
۳ گر پا پیادہ راہ حرم میں چلا تو کیا — جب تک نہیں کسی کا لیا دل یہ ہاتھ میں
۴ کیوں کر نگاہِ قہر کا اُس کی بیاں کروں — ہے جس کی بوے خوں نظرِ التفات میں
۵ اس دل کی ہمرہی نے مجھے بھی کیا خراب — یارب کوئی نہ رہیو دوانے کے ساتھ میں
۶ یہ خوں فشاں غزل جو پڑھوں باغ میں رضا — بلبل کو فصلِ گل میں کردوں بند بات میں
۱ اُس بن وہ کون دل ہے جو اکبار غم نہیں ۱۹۷ یاں صبحِ عید بھی شبِ ماتم سے کم نہیں
۲ اس کے دہن کی گالی ہی کے شوق میں رہے — ہستی میں آہ پر ہمیں بھولا عدم نہیں
۳ غیروں کے ساتھ پھریے کہ اب گھر میں بیٹھیے — یکساں ہے اپنے آگے ہوئے جب کہ ہم نہیں
۴ شام ہی سے آہ بھرتا تھا دم لے کے رضا — دیکھا جو صبح آکے تو یاں کچھ بھی دم نہیں
۱ سن صاحبِ معنی سے دلِ زار کی باتیں ۱۹۸ استاد سے پڑھ مخزنِ اسرار کی باتیں
۲ فریاد ہے یارب نہ زباں محرم و نہ گوش — اور جوش زباں دل میں ہے دلدار کی باتیں
۳ پھر خانہ خرابی بنا ڈالے اے منعم — تو سمجھے اگر صورتِ دیوار کی باتیں
۴ یہ آنکھ دکھانی تری کب مانتے ہیں ہم — خاطر میں کوئی لاتا ہے بیمار کی باتیں
۵ ہر نالۂ خونیں سے کیا دل کو مرے خون — بلبل سے جو پوچھی میں چمن زار کی باتیں
۶ سن میر رضا سے تو شبِ زلف کا قصہ — کافر سے بیاں جو نہ ہو زنار کی باتیں
۱ ہم جو اک آہ سرد کرتے ہیں ۱۹۹ دل جگر دونوں درد کرتے ہیں
۲ سرمگیں چشم خوش نگاہوں کے — ہم کو دنبالہ گرد کرتے ہیں
۳ کیا رضا کا تھا درد دل جو مرے — اب تلک کان درد کرتے ہیں
۱ اس طرح بزم میں صفتِ رخِ جاناں نہ کروں ۲۰۰ آتشِ شوق سے تا شمع کو پروانہ کروں

عقل کا طعن نہ کر مجھ پہ ابھی اے ناصح — اک سخن عشق کا کہہ تجھ کو بھی دیوانہ کروں ۲
اشک حسرت کی اگر ہوئے مدد اے زاہد — دل صد چاک کو میں سبحۂ صد دانہ کروں ۳
درد دل پوچھ نہ مجھ سے کہ دو باتونی ہوں — حرف ہو ایک تو سو طرح سے افسانہ کروں ۴
اپنے سودا نے کیا شہر کا بازار تو گرم — اے رضا دل میں ہے آباد ہیں ویرانہ کروں ۵

یہ ہوئی ہے زندگانی مجھے تو عذاب تجھ بن — ۲۰۱ نہ ہے دن کو چین تجھ بن نہ ہے شب کو خواب تجھ بن ۱
تو ہی کہہ تو اے ستم گر یہ کوئی بھی منصفی ہے — تجھے مجھ بغیر آرام مجھے اضطراب تجھ بن ۲
تو پھرا جو خانقہ سے کہا پیٹ سر کو زاہد — بھلا کیوں نہ عاشقوں کے رہیں گھر خراب تجھ بن ۳
نہ رضا کی پوچھ حالت کہ ہے کیوں کے شب گزرتی — وہی درد و آہ و زاری وہی پیچ و تاب تجھ بن ۴

دل میرا چاک چکا ہے اک بوسے کے بدل میں — ۲۰۲ ورنہ یہ منہ پہ سن لو سودا پڑا خلل میں ۱
کل کا کیا تھا وعدہ کل تم نے میرے صاحب — کلمہ کوں کے کلے دل ہوئے اپنا کل میں ۲
غمزوں کی یہ تعدی عشووں کی یہ جفائیں — ویراں ہے شہر دل کا اس حسن کے عمل میں ۳
بے دوستی حیدر ایماں نہیں ہے ثابت — پڑھتے ہیں اے عزیزو توتے بھی در نہ کلمے ۴
طفلوں کے سنگ نے پھر گل بوٹے وہ ہیں کیرے — نخل جنوں ہمارا آیا جو کچھ بھی پھل میں ۵
سودا کے کیا ہے ایسا مبتلا قصیدے ہیں تو — جو کچھ رضا ہماری ہے گا نہیں غزل میں ۶

عشق کی بیماری ہے جن کو دل ہی دل میں گلتے ہیں — ۲۰۳ مُردے ہیں وہ حقیقت میں ظاہر میں پھرتے چلتے ہیں ۱
جب راہ میں مل گئے کہنے لگے تیرے ہی گھر میں جاتا تھا — جاؤ چلے لڑکا تو نہیں میں مجھ کو آپ مچلتے ہیں ۲
اوروں کے لگانے بجھانے اتنا جلاتے ہو مجھ کو — ڈریے ہماری آہوں سے ہم لوگ بھی جلتے بلتے ہیں ۳
سب کہتے ہیں اُن کے منہ میں تو آب حیات بھرا ہے اب — ہم سے جو کرتے ہیں باتیں پھر کیوں زہر اُگلتے ہیں ۴
کیسے ہی درد کا شعر پڑھیے یوں بھی پوچھے کیا بک گئے — جن کے دل پتھر ہیں سو کب ان باتوں سے پگھلتے ہیں ۵
بس کریے چپ بیٹے اب کھلوانا رازوں کا خوب نہیں — ملتے ہیں ہم ہاتھ پڑے کوئی اور کچھ اور ہی ملتے ہیں ۶
میرے اشک سرخ سے تم یوں غافل ہو افسوس افسوس — دیکھو تو یہ لعل کے ٹکڑے کیسے خاک میں رلتے ہیں ۷
شاید آتے جاتے پھر اُس خانہ جنگ سے بگڑی ہے — گھر سے بہت کم میر رضا جی اب ان روزوں نکلتے ہیں ۸

عاشق ہیں تمھارے میر رضا صاحب کیسے غلام انھیں — ۲۰۴ اپنے قبلہ و کعبہ سب کہتے ہیں سید امام اُنھیں ۱
پیاری پیاری لگتی ہیں آغاز محبت کی باتیں — یارب اس کی حد سب کریں معلوم جو ہو انجام انھیں ۲

۳ ہم سائے مجھ نالہ کش کو شفقت سے لیے جاتے ہیں — ایسا نہ ہو کہیں راتوں کو نیند حرام انھیں

۴ میں جس کے لیے بدنام ہوا مطعون زبان انام ہوا — سینہ ہو ننگ آناہ لینے سے میرا نام انھیں

۵ حال تو ہے تقریر سے باہر کیوں کے اسے تحریر کریں — خط جو لکھیں کس طرح لکھیں ہم کیا کچھ بھیجیں پیغام انھیں

۶ مسجد میں یہ نمازی تو اسلام کا دعوی کرتے ہیں — گر دو بت ادھر کو آنکلا ہم جھک کے کریں گے سلام انھیں

۷ سن کر مرنا میر رضا کا پہلے تو گھبرایا کچھ — پھر سوچ کے بولا خوب ہوا آیا اب آرام انھیں

۲۰۵

۱ تجھ کو کیا جو کہتے ہو میاں تم ہو کہاں تم ہو کہاں — دل کہاں ہے پاس میرے میری جان تم ہو کہاں

۲ وہ گلی ہے یا پری خانہ ہے یا فردوس ہے — سچ کہو اے ہمدمو میں ہوں کہاں تم ہو کہاں

۳ اپنے سے اپنا نہ ہو کام اور دوسے رکھے امید — کیا وصیت کرتے ہو اے دوستاں تم ہو کہاں

۴ گل کھلیں گے بار بار اور آئے گی ہر پھر بہار — ہے ہمیشہ سیر گلزار جہاں تم ہو کہاں

۵ جب جوانی گئی، رہا کیا آنا جانا سب گیا — آؤ جانے دو دو باتیں اے میاں تم ہو کہاں

۶ دیکھنے کا چاؤ یہ عینک اترتی ہی نہیں — دیکھو تم اپنی طرف اے مہرباں تم ہو کہاں

۷ پوچھتے ہیں حال تو منہ دیکھ لیتے ہو رضا — دل کہیں اور ہی ہے سنتے ہو میاں تم ہو کہاں

۲۰۶

۱ وبال جان ہر اک بال ہے میاں — تعلق دل کا کیا جنجال ہے میاں

۲ طلب میں کون دنیا کی ہو پامال — یہ بیت المال کچھ بھی مال ہے میاں

۳ یہ کالے سے جہاں کا منہ ہو کالا — اگر سمجھو تو جی کا کال ہے میاں

۴ سنا ہوگا جو کچھ مجنوں کا احوال — وہی اپنے بھی حسب حال ہے میاں

۵ تڑپ کر رو بہ رو ہم اس کے مر گئے — نہ پوچھو کیا مرا احوال ہے میاں

۶ قدم رکھتے تمہارے دل تڑپ گئے — یہ کوئی چال ہے بھونچال ہے میاں

۷ نہیں جاتا ڈنالی پن کا سودا — عجب سر پر مرے دھمال ہے میاں

۸ کھلا کب مولوی سے عقدۂ دل — بہت یہ مسئلہ اشکال ہے میاں

۹ اگر سچ قول تو معصوم کا ہے — سوا اس کے تو قیل و قال ہے میاں

۱۰ رضا کیا مل گئے اس شوخ سے — تمہارا آج چہرہ لال ہے میاں

۲۰۷

۱ دشمنوں کو نہیں چاہتا مسرور کروں — ورنہ ہیں عشق تو فرہاد کے دستور کروں

۲ نہ محبت نہ مروت نہ صفائی نہ وفا — کون سا اپنے جفا کار کا مذکور کروں

| | | | |
|---|---|---|---|
| دل کے میں روکنے پر عشق کے مجبور نہیں | | کیا اُسے آئینہ دے ہاتھ میں مغرور کروں | ۳ |
| عشق میں ہوتی ہے ہر چیز کی الٹی تاثیر | | آہ میں کیوں کے علاج دل رنجور کروں | ۴ |
| جذبہ حسن سے دل نے کیا کیا خوب ہوا | | چاہتا تھا میں اس آوا سے کے تئیں دور کروں | ۵ |
| خشکی لب تری دیدہ پریشانی رنگ | | کون سی چیز کو میں عشق کی مستور کروں | ۶ |
| اور اک تازہ تعلق کا گرفتار رہوا | | جس نے چاہا کہ تعلق کے تئیں دور کروں | ۷ |
| اے رضا اپنا پڑا یار تھا تنہائی کا — | | کیوں کے ہر وقت نہ یاد دل مغفور کروں | ۸ |
| کیا ہو گر ایک نگہ تجھ پہ اے مہ پارہ کروں | ۲۰۸ | چارۂ کار کتان دل بے چارہ کروں | ۱ |
| دل سنگیں ترا فولاد بنے لے ظالم | | میں اگر شیشۂ دل اپنے کے تئیں خارا کروں | ۲ |
| کیا گل و شمع سے تسکین ہو تجھ بن مجھ کو | | رونا آتا ہے جو خورشید پہ نظارہ کروں | ۳ |
| تو کبھی قول پہ ثابت نہ رہا اپنے ہائے | | کب تلک میں گلۂ ثابت و سیارہ کروں | ۴ |
| کچھ بہا اشک میں اور کچھ ہے سر مژگاں پر — | | اے رضا کیوں کے علاج دل صد پارہ کروں | ۵ |
| سوئے کعبہ و دیر اگر دیکھتا ہوں | ۲۰۹ | کہوں میں تجھے جلوہ گر دیکھتا ہوں | ۱ |
| خدا یاد آتا ہے اس دم پیارے | | تجھے جس گھڑی بھر نظر دیکھتا ہوں | ۲ |
| اٹھانا ستم اس کا اور جیتے رہنا — | | رضا تیرا ہی یہ جگر دیکھتا ہوں | ۳ |
| جو ہستی کو اپنی عدم جانتے ہیں | ۲۱۰ | حیات خضر کو بھی کم جانتے ہیں | ۱ |
| خوشی میں رہیں گے قیامت تلک وہ | | جو دنیا کی شادی کو غم جانتے ہیں | ۲ |
| عبث وعدہ آنے کا ہم سے کرو ہو | | تمہیں اے میاں خوب ہم جانتے ہیں | ۳ |
| نہ مسجد نہ بت خانہ نہ مدرسہ ہے | ق | نہ اس دل کو دیر و حرم جانتے ہیں | ۴ |
| پیارے تری خاک پا کی قسم ہے — | | یہ گھر تیرے رہنے کا ہم جانتے ہیں | ۵ |
| رضا ہم کو کیا کام جنت سے اب تو — | | گلی ہی کو اس کی ارم جانتے ہیں | ۶ |
| ایک ہی سمجھے ہے وہ تو شکر و شکوہ کیا کریں | ۲۱۱ | نامہ بر تو بھیجیں پر حیراں میں کیا انشا کریں | ۱ |
| سایۂ خورشید کا دیکھا سلوک اب دیکھیے | | تیرہ روزوں کی تباں مہر سیما کیا کریں | ۲ |
| زندگی اپنی تو ہے جوں شمع جلنے کے لیے | | چشمۂ خضر و دم عیسیٰ تمنا کیا کریں | ۳ |
| نالے پر بلبل کے گل خنداں ہیں گلشن کے تمام | | ہم کو رونا بھی نہیں آتا وہاں جا کیا کریں | ۴ |

۵ خضر عمر جاوداں پر گھر نہیں لکھتا یہاں — اور ہم اتنی زندگی پر چاہیں ہیں کیا کریں
۶ ہم نہیں آسودہ از بس چھت فلک کی پست ہے — آیا اونچی کر نہیں سکتے ہیں مالا کیا کریں
۷ کام سے اپنے جو کچھ نکلے تو کچھ کیجیے نمود — مثل تیرے لسان لوں کر دسحا کیا کریں
۸ درد تیرا کم ہوا ظاہر ہمارا کیا قصور — بھر چکے جتنے تھے عضو اپنے سراپا کیا کریں
۹ جس گھڑی سے دیکھی ہے اُس کی نگاہ اے ہمنشیں — تیر سا رہتا ہے کچھ دل میں کھٹکتا کیا کریں
۱۰ اور نازاں زور پر ہوتا ہے اپنے لے رضا — اُس ستم گر سے بیاں احوال اپنا کیا کریں
۱ نہ باغ ہی ہے یہاں نہ بہار رکھتے ہیں ۲۱۲ یہہ ایک دل ہے وہ بھی داغ دار رکھتے ہیں
۲ ہمارے مرنے میں اب غم سے کچھ نہیں باقی — مگر یہی کہ ترا انتظار رکھتے ہیں
۳ رہے ہیں ہم تو ہمیشہ سے عشق کے مجبور — وہ کون لوگ ہیں جو اختیار رکھتے ہیں
۴ ادا و ناز کی مت پوچھ ان بتوں کی جان — ہر ایک طرح سے عاشق کو مار رکھتے ہیں
۵ وہ گل عذار یہ کہتا تھا ہم غلام اپنے — یہہ ایک کیا ہے رضا سے ہزار رکھتے ہیں
۱ بتوں ہکو فائدہ کیا ہے جو ہم سے جنگ کرتے ہیں ۲۱۳ خفا جو زندگی سے ہوں اُنھیں کیوں تنگ کرتے ہیں
۲ ادھر اودھر سے پھر تیری گلی میں دل لے آتا ہے — طرف دیر و حرم کے جب کبھی آہنگ کرتے ہیں
۳ کسی اور ہی کے گھر کو کیجیو صیاد تو تزئیں — ہم اپنے خون ہی سے اس قفس پر رنگ کرتے ہیں
۴ یہ تنگ آ کر کے عالم نے گریباں چاک کر ڈالا — تباں پھر کس لیے جامے کو اپنے تنگ کرتے ہیں
۵ اسے تو تاب دم کی بھی نہیں جوں آئینہ خوباں — رضا کی طرف سے کیوں اپنے تنگ کرتے ہیں
۱ خستہ جگر ہیں غم زدہ ہیں دل فگار ہیں ۲۱۴ جو یار تیرے واسطے آپس میں یار ہیں
۲ نہ لالہ ہیں نہ گل ہیں چمن میں زمانے کے — ٹکڑے ہوئے جگر ہیں دلِ داغ دار ہیں
۳ کس کو یہاں ہے شوق ترے باغ کا خلیل — آپ ہی جگر کے داغوں سے ہم لالہ زار ہیں
۴ اس عشق نے تمام ہنر عیب کر دیے — گل ہیں و لیک نظروں میں ہم سب کی خار ہیں
۵ صیاد کوئی گھات نہیں ہم پہ باندھتا — معلوم یہہ نہیں ہے کہ کس کے شکار ہیں
۶ افلاک تجھ پہ گر نہیں ظالم فریفتہ — پھر کیا سبب جو میری طرح بے قرار ہیں
۷ پامالی پر نہ اپنی ہی نازاں ہو تو رضا — ہم بھی کسی کے در پہ میاں خاکسار ہیں
۱ نہ خاطر خوش نہ دل آرمیدہ ہوں ۲۲۵ جان ستم کشیدہ و محنت رسیدہ ہوں

نہ آشنا رکھوں ہوں نہ کوئی میں اپنا ہاے — جب سے ملا ہوں تجھ سے سبھوں سے بریدہ ہوں ۲
ہر دست و جیب جب سے جنوں مجھ کو تب سے میں — دونوں جہاں کے عیش سے دامن کشیدہ ہوں ۳
ممکن نہیں کہ سی سکے تو اس کو ناصحا — دست جنوں سے جامہ رفتہ دریدہ ہوں ۴
جانے کا میں تمھارے تو مانع نہیں ہوں جاؤ — پر جلد آئیو کہ جدائی نہ دیدہ ہوں ۵
مت جانیو رضا کہ بڑھاپے سے ہوں جھکا — میں بار غم سے آہ کسی کے خمیدہ ہوں ۶

۲۱۶ نالے کا ڈھنڈورا نہ دے اے آہ نگر میں — دل جس نے چرایا ہے سو ہے میری نظر میں ۱
میں آمد و شد میں کسی کوچے کے موا ہوں — اے یارو مری قبر کرو راہ گذر میں ۲
از خود شدگاں عشق کے جوں شمع جگہ سے — ملتے نہیں کہنے کو پہ رہتے ہیں سفر میں ۳
تہمت نہ ہو راحت طلبی کی مجھے ڈر ہے — نہ اشک رہا آنکھوں میں نہ آہ جگر میں ۴
تو آپ سے کب آئے مگر وقت دعا کے — معلوم یہ ہوتا ہے کہ اختر تھا کذر میں ۵
رحم آیا اسے چہرہ پہ میرے — پایا میں شکست اپنی میں جو سب نے ظفر میں ۶
تو جب سے گیا پوچھ نہ بیمار کی اس نے — اک بار کبھی آنکھ کھلی آٹھ پہر میں ۷
اب چاہے جہاں تک یہ قیامت کرے برپا — سمجھیں گے شب ہجر سے ہم روز حشر میں ۸
احوال اسیروں میں رضا کا نہیں معلوم — ہر ایک قفس خالی ہے صیاد کے گھر میں ۹

۲۱۷ مت رکھ رضا تو خوبوں سے صاحب سلامتیں — کھینچے گا ایسی باتوں سے آخر ندامتیں ۱
دل ہاتھ سے گیا نہیں آنے کا ناصحو — اب تم سبھی کیا کرو مجھ کو ملامتیں ۲
واعظ کسے ڈرائے ہے تو روز حشر سے — ہیں ہمسر و نہیں ہوتی ہیں سو سو قیامتیں ۳
ہم بات بھی نہ کہہ سکیں غیروں سے ربط ہو — تقصیر نہیں تمھاری یہہ اپنی ہیں شامتیں ۴
کب برا چھلتے مریدوں کو ساتھ لے — بس شیخ جی کی دیکھ لیں ہم نے کرامتیں ۵

۲۱۸ دل میں اب خوں نظر آتا ہے نہ تم چشموں میں — آبرو کیوں کے رہے گی مری ہم چشموں میں ۱
بے گنہ قتل کرے گا کسے یہہ ڈر ہے مجھے — آج ظالم تری سرخی ہے ستم چشموں میں ۲
جا پڑی جس پہ نظر پھر وو وہیں لوٹ ہوا — ہے نگہہ یا کہ بھرا ہے تری سم چشموں میں ۳
دوستو خاک ہو آرام کہ وہ کافر ہاے — رام ہر چند ہوا ہے وہی رم چشموں میں ۴
کس کی پھر حسرت دیدار میں مرتا ہے رضا — اب تلک باقی رہا ہے تری دم چشموں میں ۵

۱ دل ہے یہہ غم نہ رہیو تو اس میں ۲۱۹ کہ کسی کی ہے آرزو اس میں
۲ اشک تو پونچھیں لیکن اے ناصح اپنی جاتی ہے آبرو اس میں
۳ گل سے کیا کام تھا مجھے پر ہائے پاتا ہوں میں کسی کی بو اس میں
۴ ہم کو کچھ گالیوں کا ننگ نہیں پر بگڑتی ہے تیری خو اس میں
۵ مت خفا ہو رضا ہوا خاموش — کیا ہے اب اتنی گفتگو اس میں

۱ عشق کے جاں نثار جیتے ہیں ۲۲۰ بعد مرنے کے یار جیتے ہیں
۲ زہر حسرت چشیدگانِ فراق ہیں موؤں میں ہزار جیتے ہیں
۳ دشمنوں پر تو تیغ یار نہ کھینچ ابھی تو دوست دار جیتے ہیں
۴ تو جہاں جائے مثل آبِ حیات مرے اب ایک بار جیتے ہیں
۵ ایک دن داؤ ہے ہمارا بھی یہاں بازی تو یار جیتے ہیں
۶ بن اجل کوئی مر نہیں سکتا جی کو ہم مار مار جیتے ہیں
۷ غم ہجراں کی کچھ نہ پوچھ رضا — شکر پروردگار جیتے ہیں

۱ کون دم ہے ترا ملال نہیں ۲۲۱ پر تجھے کچھ مرا خیال نہیں
۲ اُس کی زلفیں ہیں جان کا سودا سر مو میرے تئیں خیال نہیں
۳ اُن لبوں کا تو ذکر آنے دو کس کے منہ سے بہتی رال نہیں
۴ کیا کہوں آہ سخت حیراں ہوں دل تو اپنا کبھی بحال نہیں
۵ عاشقوں کا وصال ہوتا ہے پر جسے کہتے ہیں وصال نہیں
۶ نازِ موسٰی یہ منّ و سلوا پر کسی کے منہ کا تو اُگال نہیں
۷ جان بوجھ آسمان کے نیچے ق رہنا غافل یہہ اچھی چال نہیں
۸ اک زمانے سے یہہ پرانی چھت — جھک رہی ہے کچھ اس میں حال نہیں
۹ طبع موزوں سے ہوں رضا لاچار — شاعری اپنا کچھ کمال نہیں

۱ بے قراری وہاں منظور نہیں ۲۲۲ اور یہاں صبر کا دستور نہیں
۲ کارفرمائی کو ہے عشق ولیک کوئی فرہاد سا مزدور نہیں
۳ مے کدہ بھی کیا ہی آئے پسند یہاں اٹھتا کوئی.... نہیں

ہے قصور اپنی نگہہ کا ورنہ — وہ کسی پردے میں مستور نہیں ۴

اس قدر مت ہو آخر تم کو — چشم سب کہتے ہیں ناسور نہیں ۵

ماروں اپنے تئیں یا جاؤں نکل — ق — میں ان حیروں میں مجبور نہیں ۶

پر اسے کیا کروں لے وائے رضا — عشق میں اکس کا دستور نہیں ۷

یہ کس کے غم میں یارب آنکھیں بھر آئیاں ہیں ۲۲۳ داماں و آستیں میں کل سے لڑائیاں ہیں ۱

مرجائے گر برہمن تو بھی یہ بت نہ بولیں — اللہ ری تیری قدرت کیا کبریائیاں ہیں ۲

کہتے ہو اک سخن پر ہم ماریں اور جلائیں — کیا کیا تمہارے جی میں باتیں سمائیاں ہیں ۳

دل کی ہم سے حیر دنیا میں کوئی ہوتی نہیں ۲۲۴ ہوئے ہر دریا سے جو حاصل سو یہ موتی نہیں ۱

. . . . . . . . . . . . — . . . . . . احتیاج غسل بھی ہوتی نہیں ۲

. . . . . . . . . . . . — . . . . . . آنسو نہ ہست سے اگر روتی نہیں ۳

. . . . . . . . . . . . — گر خیال اس کا نہ ہوتا زندگی ہوتی نہیں ۴

حسرت ہوا تھا دل تباہ — سیل اشک عبرت باراں اگر دھوتی نہیں ۵

نہیں بوئے وفا ہرگز چمن کے غنچہ و گل میں ۲۲۵ مگر کچھ تھوڑی سی باتیں ہیں سو فریاد بلبل ہیں ۱

جو کچھ ہے رحم جز عشاق کے کیا کوئی سمجھے گا — جفا و ناز ہیں اس کے مرے صبر و تحمل ہیں ۲

رضا کس گل بدن کے عشق میں مارا گیا ہے — پھرے ہے خاک بھی اس کی دوانی موسم گل ہیں ۳

تو کرے ہو گا حجاب اور بے حجاب ہوتا ہوں میں ۲۲۶ گھر میں تو بیٹھے ہو اور در در خراب ہوتا ہوں میں ۱

. . . . . . مت ساتھ لے دریا میں جا — پائے چھینٹے غیر پر تو غم سے آب ہوتا ہوں میں ۲

غیر کے ساتھ اس کے مے پینے کی مت کہہ اے رضا — رشک کے یاں غصہ و غم سے کباب ہوتا ہوں میں ۳

میں تو گیا تھا کب کا ترے کوچے سے پر آہ ۲۲۷ اس دل کو جو قرار نہ آئے تو کیا کروں ۱

سو یار اب تو آپ سے جاتا رہا ہوں میں — آنے پہ بھی جو یار نہ آئے تو کیا کروں ۲

بے ہوش ہوں جس گھڑی پردے میں دیکھ کر — حیراں ہوں جب وہ پردہ اٹھائے تو کیا کروں ۳

سارے جہاں سے میں نے ہیں ٹھانی لڑائیاں — غیروں سے . . . . . . . . . . ۴

مرنے کا بھی بہانہ کیا میں نے اے رضا — اس کو جو اعتبار نہ آئے تو کیا کروں ۵

آرزوئے وصال میں سب ہیں ۲۲۸ جستجوئے محال میں سب ہیں ۱

۲ ہجر اپنی طرف سے ہے ورنہ — اُس طرف سے وصال میں سب ہیں
۳ وائے غفلت اُدھر کی کہتے نہیں — اپنی ہی قیل و قال میں سب ہیں
۴ اے رضا تجھ کو کچھ خیال نہیں — اپنے اپنے خیال میں سب ہیں

۲۲۹
۱ یہہ تن بدن سے شمع زباں ہے تمام ہو — پروانے کی خموشی کہیں ہم کلام ہو
۲ یارب قدم نہ آئیو گل چیں کا باغ میں — جب تک نہ عندلیب گرفتار دام ہو
۳ یہہ طعن بے ستوں کا ہے خسرو کے طاق پر — کب زر سے ہو جو زور محبت سے کام ہو
۴ ہم تیرے نالہ بھرنے کے مانع نہیں ہیں دل — پر یہہ نہ ہو جو نیند کسی کی حرام ہو
۵ میں تا کجا خراب ہوں بدنام تو ہے — تروار ایک مار کہ قصہ تمام ہو
۶ کلمہ کون رضا تجھے استاد جانوں میں — جس دن ضیا کی وضع کا تیرا کلام ہو

۲۳۰
۱ ہجر ایسی بد بلا کا کوئی مبتلا نہ ہو — دشمن بھی اپنے دوست سے یارب جدا نہ ہو
۲ ... ہے کون کاوشِ ناخن سے عشق کی — زخمہ لگے نہ تار پہ جب تک صدا نہ ہو
۳ ....... ہے مجھے .. صدا — اس وقت دیکھیو نامہ کوئی دوسرا نہ ہو
۴ ........... ہو تمام تن — یک حرف بزم یار کا ہم سے ادا نہ ہو
۵ جانے اُس سے ملنے کا کیا شوق ہے مجھے — مانند برگ گل کبھی مجھ سے جدا نہ ہو
۶ اک چیخ نکلی بند قبا وا کیے جو تو — وہ خرقہ ہی نہ ہوئی کہ عالم قبا نہ ہو
۷ مجھ سے گرفتگی تری واقف ہو گر نسیم — بلبل کے مُنہ پہ بند قبا گل کا وا نہ ہو
۸ بالفرض تیرے لب میں ہو اعجاز عیسوی — کیا فائدہ جو درد کی میرے دوا نہ ہو
۹ کہتے ہیں اک ستم زدہ رو رو کے مر گیا — تو بھی تو چل کے دیکھتا پیارے رضا نہ ہو

۲۳۱
۱ دل گرفتار دیکھیے کیا ہو — وہ ستم گار دیکھیے کیا ہو
۲ قتل پر میرے پھر ہوئے ہیں بہم — یار و اغیار دیکھیے کیا ہو
۳ ہم نشیں آہ پھر مرے دل کی — ہے شرر بار دیکھیے کیا ہو
۴ اوّل عشق بے خودی آ گئی — آخر کار دیکھیے کیا ہو
۵ ابھی بوسے پر اتنی حجت ہے — آگے تکرار دیکھیے کیا ہو
۶ پھر رضا غیر اُس سے ملتے ہیں — اب کے اے یار دیکھیے کیا ہو

یہہ جی پہ گوارا ہی کہ سر تن سے جدا ہو ۲۳۲ پر ہاتھ نہ میرا ترے دامن سے جدا ہو ۱
نت ہم سے جدا رہتا ہے وہ دوست الٰہی ایسا بھی کبھی ہوئے کہ دشمن سے جدا ہو ۲
کب میر رضا چھوڑتے ہیں اُس کی گلی کو — بلبل بھی کبھی آپ سے گلشن سے جدا ہو ۳
سوز دل پر ہے رشک گلخن کو ۲۳۳ آگ دی اُس نے میرے خرمن کو ۱
گر گریباں سے اپنا چھوٹتا ہاتھ تو پکڑتا کسی کے دامن کو ۲
دوستوں سے یہ ہے تو پھر تجھ سے کیا توقع رہے گی دشمن کو ۳
دیکھ کر میرے دل کا حال رضا — بھولے اپنے جگر کے شیوں کو ۴
کیا عداوت تھی چشم تر تجھ کو ۲۳۴ دل ہی پر میرے ہے نظر تجھ کو ۱
رات تو کٹ گئی پتنگے کی شمع درپیش ہے سحر تجھ کو ۲
ہم تو گھبرا گئے بس اب اے آہ کیا یہیں کرنا تھا اثر تجھ کو ۳
اس طرح سے نہ ہم کو بے دل کر دل سے نسبت ہے کچھ بھی گر تجھ کو ۴
نارسا آہ و ناتواں نالہ کیوں کے پہنچے مری خبر تجھ کو ۵
راتوں کو اُس کے در پہ پھرتا ہے — دن لگے ہیں رضا مگر تجھ کو ۶
نہ کفر کی ہوس ہی نہ ایماں کی آرزو ۲۳۵ اس دل کو ہی محبت جاناں کی آرزو ۱
پھر پھر جو ہاتھ اپنا گریباں کرے ہی چاک ہے اس کو کس کے گوشۂ داماں کی آرزو ۲
روتے ہی روتے عمر کٹی اپنی پر کبھی حاصل ہوئی نہ دیدۂ گریاں کی آرزو ۳
صد شکر اُس کی تیغ کے لگتے ہی.. گئی جو کچھ کہ اپنے دل میں تھی ساماں کی آرزو ۴
خار و خس ہوس کو دی آگ عشق نے باقی ہی تیری جنبش داماں کی آرزو ۵
اک بار بھی نہ پہنچا ہماری تو داد کو ہم مر گئے لیے ہوئے درماں کی آرزو ۶
لگ جاؤ ٹک رضا کی بھی چھاتی سے میاں کبھی — اُس کے بھی نکلے سینۂ سوزاں کی آرزو ۷
بھولے سے تو وہ دیار آئے کبھو ۲۳۶ دل کو یارب قرار آئے کبھو ۱
داغ دل ہم دکھائیں گے، لالے اس برس میں بہار آئے کبھو ۲
غیر آتے ہیں تیرے یہاں کبھو — یہہ بھی اُمیدوار آئے کبھو ۳
آہ مت پوچھو آہ مت پوچھو ۲۳۷ بری ہوتی ہے چاہ مت پوچھو ۱

۲ واجب القتل ہر طرح ہیں گے — عاشقوں کا گناہ مت پوچھو
۳ دیکھو انجام کار مجنوں کو — دوستی کا نباہ مت پوچھو
۴ عشق بازی رضا نے پھر کی ہے — اُس کا حال تباہ مت پوچھو

۱ دہن مثل اس رخ سے گل کو ریشہ اس میں جو نہ ہو ۲۳۸ کہہ سکیں غنچہ دہن کو بھی اگر اس میں بو نہ ہو
۲ اُس کی ابرو کی محبت کیوں کے اپنے دل سے جائے — گوشت ناخن سے جدا ممکن ہے کوئی ہو نہ ہو
۳ ناز بے جا خشم بے موقع نہ رحم چشم لطف — تم جو کچھ چاہو سو ہو اور ہم جو چاہیں سو نہ ہو
۴ دیکھ وقت نزع مجھ کو ہنس کے یوں کہنے لگا — ہم جو سنتے تھے رضا عاشق یہی ہے ہو نہ ہو

۱ نسبت ہمارے دل سے ہے اس درجہ داغ کو ۲۳۹ دیتی ہے بوے لالہ طراوت دماغ کو
۲ منت کش مغاں نہیں ہونے کے مست عشق — بھرتے ہیں خون دل سے ہم اپنے اباغ کو
۳ احسان صرصر اپنی تو ہمت کا ننگ ہے — گل کردے باد یاس ہمارے چراغ کو
۴ چہرہ کسی کا دیکھے سکندر جو زلف میں — اپنے چھپا رکھے کہیں شب چراغ کو
۵ پہلے قدم میں اپنے تئیں بھول گئے رضا — ہم بھی کہیں گئے تھے کسی کے سراغ کو

۱ لازم ہے بلند آہ کی رابیت نہ کرے تو ۲۴۰ تسخیر اگر دل کی ولایت نہ کرے تو
۲ آنکھوں کا بہے جانا سہا گریے پر افسوس — اب بھی اگر اُس دل میں سرایت نہ کرے تو
۳ میں موڑوں نہ منہ اُس کی جفا سے یہ کردن کیا — اس وقت وفا پھر جو کفایت نہ کرے تو
۴ جمعیت اغیار سے ڈرتے نہیں عاشق — پر خوف یہ ہے اُن کی حمایت نہ کرے تو
۵ اے قاصد اگر نامہ مرا چاک کرے یار — بہتر ہے کہ مجھ سے بھی روایت نہ کرے تو
۶ پھر کہہ تو چپٹ کر نہ لیں ہم بوسہ سو کیوں کر — جب آپ سے گالی بھی عنایت نہ کرے تو
۷ اے میر رضا تجھ کو ابھی اس سے ملادیں — گر شک کی پھر ہم سے شکایت نہ کرے تو

۱ نالہ شرر فشاں ہو یا آہ شعلہ ور ہو ۲۴۱ بے فائدہ ہے اے دل جب تک نہ کچھ اثر ہو
۲ رحم اے فلک کہ کب تک یہ مشت خاک اپنی — رسوائے کو بہ کو ہو پامال در بہ در ہو
۳ شمشیر ہی کسی کی سایہ فگن ہو یارب — کب تک یہ زندگانی آنند میں بسر ہو
۴ شب وصل کی ہو کر بند دیوار و در کے روزن — گو صبح جلد آئے پر دیر کر خبر ہو

۱ جس میں دل خوش ہو ترا خوشی جان مجھ کو ۲۴۲ نہ غم درد ہے نہ خواہش درماں مجھ کو

شوخ چشمی تری نے گئی مرا جی سو آرام ایک سا ہو گیا ہے شہر و بیاباں مجھ کو ۲
آئینہ ساں مری آنکھیں نہیں مندتی ہیں کبھی کس کے ہے رخ نے کیا آہ یہ حیراں مجھ کو ۳
کیا دیا ہے گل و شبنم کی طرح ہائے نصیب لب خنداں اُسے اور دیدۂ گریاں مجھ کو ۴
رات و دن زور ہی طرح بانٹے ہیں قسمت تو نے غیر کو روز وصال اور شب ہجراں مجھ کو ۵
عشق کی بھیڑ پڑی جب سے ترے دل پہ رضا اور مشکل ہوئی جو جو کہ تھی آساں مجھ کو ۶

تو نے رضا کیا کیا خانہ خراب اس کو ۲۴۳ جو نام سے بھی تیرے اب ہے حجاب اس کو ۱
بیمار ہجر تیرا کیوں کر ہے نہ مضطر جائے نہ رات ہی اور آئے نہ خواب اس کو ۲
بے پردہ حال میرا اُس شوخ سے کہے ہے پر دیکھیو نہ ہمدم آئے حجاب اُس کو ۳
اے دوستو چلو ٹک دیکھیں رضا کا احوال کچھ رات بے طرح تھا کل اضطراب اُس کو ۴

بار ہے گردن کا سر گر ترا سودا نہ ہو ۲۴۴ آبلہ دل ہے اگر تیری تمنا نہ ہو ۱
چہرے پر اپنے نشاں داغ کا پاتا ہوں میں چشم کو منظور اگر دیکھنا تیرا نہ ہو ۲
کیوں کے دکھاؤں تجھے تجھ کو میں حیراں ہوں آئینہ کا آئینہ عکس پذیرا نہ ہو ۳
اُس کو شہادت حلال معرکۂ عشق میں سول کا تو ذکر کیا زخم لب وا نہ ہو ۴
زر یہ ہے لوہو سوا صورت دیبا طرح گر نہیں قسمت میں تو حاصل دنیا نہ ہو ۵

بہت سے یاد تھے فریاد کے انداز عاشق کو ۲۴۵ تری چشم سیہ ہوئی سرمہ آواز عاشق کو ۱
تجھے ظاہر ہو یہ دامن چھڑانا ہاتھ سے میرے جو پاس عشق اے ظالم نہ رکھے باز عاشق کو ۲
کرے گر یا لک قسمت مجھے اللہ تو دوں میں نیاز و عجز خوبوں کو غرور و ناز عاشق کو ۳
نہ طاقت ضبط کی دل کو نہ کوئی ہمزباں اپنا محبت ایک دن مارے گا تیر انداز عاشق کو ۴
مرے نالے کے شعلے سے نیستاں میں لگی آتش فغاں اے بےکسی نے بھی نہیں ہمراز عاشق کو ۵
رضا جی دینے بیٹھا تیری ابرو کے اشارے پر کوئی کرتا ہے قتل اس طرح کے جانباز عاشق کو ۶

ابر کے بن دیکھے ہرگز خوش دل مستاں نہ ہو ۲۴۶ تیر باراں ہوئے مجھ پر جب کہ باراں نہ ہو ۱
میری رسوائی نے تیرے حسن کی کی ہے نمود جب تلک شبنم نہیں روتے تو گل خنداں نہ ہو ۲
طرز تیری گفتگو کی ہے گواہ مے کشی بوسے گل اور نشہ صہبا کبھی پنہاں نہ ہو ۳
شیخ کو وہ جہل ہے سو بار کعبے کے تئیں جائے اور آئے ولیکن پھر گدھا انساں نہ ہو ۴

۵ ذکر ابروے بتاں سے کیوں برانے ہو شیخ | کیا ہوا کافر تجھے قبلے سے روگرداں ہو
۶ سچ بتا اے جان عشق و عشق بازاں کیا ہے تو | بن ترے میں اس بدن سا ہوں کہ جس میں جاں نہ ہو
۷ یاں سے جا شیطان زلف یار کو ہم دے چکے | عاشقوں کا دین ہے یہ شیخ کا ایماں نہ ہو
۸ ترک تاز غمزہ کا اس کی یہی ڈر ہے رضا —— یہ غم آباد اپنا شہر دل کہیں ویراں نہ ہو

۱ صندلی جبیں کا جس کی تری خاک کو نہ ہو ۲۴۷ یارب جہاں وہ جائے اسے آبرو نہ ہو
۲ کل سے رضا ہے نزع میں چل تو بھی دیکھ آ —— شاید کہ اس کے جی میں تری آرزو نہ ہو

۱ خوشا وہ دن کہ میں تھا مست بیدا و مست صہبا تو ۲۴۸ تماشا دیکھتا تھا میں ترا میرا تماشا تو
۲ کسی کی ہے یہ قسمت میں کسی کا ہوگا دیوانہ | خدا ایسا کرے دیوانہ میں ہوں نام ترا تو
۳ جدا ہو کر تیا یار اب عاشقوں کو یاد کرتے ہیں —— رضا حیراں ہوں میں کس بات پر ہے اتنا بھولا تو

۱ نہ ہوں تیغ و برہمن کیوں کے تجھ پر مبتلا دونوں ۲۴۹ کہ زلف و رخ ہیں کفر و دیں ترے لے دلربا دونوں
۲ گریباں پھاڑتا تھا یہ وہ سر پر خاک اڑاتا تھا | ترے بن کرتے تھے ماتم چمن میں گل صبا دونوں
۳ خدا ہی جانے یہ کس کو لگا تیر نگہ تیرا —— تڑپتے تھے گلی میں تیری کل دل اور رضا دونوں

۱ کہاں اب ما جنوں جو لے چلے راہ بیاباں کو ۲۵۰ ادھر ناصح سیے اور ہم ادھر پھاڑیں گریباں کو
۲ تری عصمت کے پردے میں کہیں رخنہ نہ پڑ جائے | زلیخا ٹک سمجھ کر کھینچیو یوسف کے داماں کو
۳ پھرا ہے آبلہ پاؤں نے ہے رہ دشت غربت کی | یہ مژدہ ہم سے جا دینا کوئی خار مغیلاں کو
۴ یہی آوارگی پر دل کی ہے آتا مجھے رونا | بغل میں میں نے کیوں دی ہے جگہ اس دشمن جاں کو
۵ ہماری خاک پر مت نام اس قاتل کا لے ہمدم | عبث تو جوش میں لاتا ہے کیوں خون شہیداں کو
۶ رضا تو اس غزل کو در غزل کہنا مرے مشفق —— تری ظاہر ہو خوبی طبع کی میر سخنداں کو

۱ دم خنجر لو رحمت آفریں ہے آب پیکاں کو ۲۵۱ اٹھایا خضر کی منت کو اور عیسیٰ کے احساں کو
۲ اکیلا میں اور اتنے کام سب کیا کیا کروں یارب | دل بے تاب کو تھاموں کہ روؤں چشم گریاں کو
۳ محبت نفرت میں ظاہر اور ناحق مجھے مارا —— میں رکھتا جی میں تھا ظالم ترے اس راز پنہاں کو

۱ یہ نہیں کہتا ہوں میں بوسہ ہے یا دشنام ہو ۲۵۲ وہ دے اے پیارے مجھے جس میں کہ تیرا نام ہو
۲ حسرتوں سے دل تو سارا ہو گیا ہے داغ داغ | دیکھیے اس عشق سے اب آگے کیا انعام ہو
۳ دل شکنج زلف میں بے تاب ہے موجب نہیں | کس طرح سے شست میں ماہی کے تئیں آرام ہو

خوب ہے تجھ کو رضا گر منہ نہیں دیتا ہے یار ــــ کون مل کر ایسے رسوا سے بھلا بد نام ہو ۴

پڑا ہے وعدے سے اب کاروبار مت پوچھو ۲۵۳ ملال ہجر غم انتظار مت پوچھو ۱
جو ایک ہو تو نہ کہیے یہاں ہیں لاکھوں بات کہے ہی جاؤں گا میں وہ ہزار مت پوچھو ۲
بگڑ تا رہتا تھا میں یار سے سو اب کیوں کر ہوا ہوں غیر سے صحبت بر آر مت پوچھو ۳
چراغ خانۂ مفلس نے صبح کب دیکھی ہم عاشقوں سے غم روزگار مت پوچھو ۴
یہ کیا ہے دوستوں اک بار مار ڈالو مجھے کسی کے جانے کی تم بار بار مت پوچھو ۵
کسی کی نرگس مخمور ہو ئی ہے ساقی ــــ رضا کا اب کوئی رنج خمار مت پوچھو ۶

عاشق پہ جو کہ کرتے ہیں ثابت گناہ کو ۲۵۴ کاش اس کی دیکھ لیں کہیں طرز نگاہ کو ۱
آتے جو دیکھا اس کو تو بے خود ہو گر پڑے رکھتے تھے ہم ارادہ کہ روکیں گے راہ کو ۲
جو عشق کا بیان نہیں جانتے ہیں راست کر دیویں ان کے آگے مرے کج کلاہ کو ۳
بے وجہ دل مرا نہیں طالب ہے عشق کا شعلے سے نت معاملہ رہتا ہے کاہ کو ۴
مجھ روسیہ کا روز اسی سے سیاہ ہے مت رکھ لگائے زانو پر چشم سیاہ کو ۵
یوسف کی چاہ ہو دکے طالب کو چاہیے عاشق زباں کیے ڈھونڈیں ہیں رستم کے چاہ کو ۶
اندھا بھی اپنے گھر میں جلا بیٹھے ہے چراغ موقوف رکھ نہ عشق پہ بید اداہ کو ۷
مجھ کو بلا میں ڈال دیا آپ چل بسے ــــ کیا کہیے اے رضا دل عفر ان پناہ کو ۸

کہتا ہے مجھ سے وو خبردار ہو ۲۵۵ زرد ہوئے جاتے ہو بیمار ہو ۱
رکھتے ہیں ہم سوختہ جاں کو عزیز لالہ ہمارا گل دستار ہو ۲
شکوے سے ہے پر دل پر حوصلہ آہ اگر طاقت گفتار ہو ۳
شرع محبّت کے ہیں احکام اور نام وفا لے سو گنہگار ہو ۴
یار ہے سب چیز سے ظاہر رضا ــــ دیدہ اگر قابل دیدار ہو ۵

اس تند خو سے کیوں نہ مرا تلخ کام ہو ۲۵۶ اب زہر جسم بھی نہ رہے مجھ پہ عام ہو ۱
سیر چمن سے جائے نہ خاطر گرفتگی کیا رنگ و بو سے آرزوے دل تمام ہو ۲
اب تک تو گل ہیں چاک جگر غنچے تنگ دل آیندہ دیکھیں باغ کا کیا انتظام ہو ۳
منزل پہ خاک پہنچے گا جس کو کہ ضعف ہو ــــ جوں نقش پا ہر ایک قدم پر مقام ہو ۴

۱ کرتا ہی کج روی نئی ہر ایک آن تو ۲۵۷ پیوند ہو زمین کا اے آسمان تو
۲ کینے سی میرے دشمنوں نے بھی اٹھایا ہاتھ — اے بدگمان پر نہ ہوا مہربان تو
۳ جانے کی کہہ نہ اپنے، نہ مرنا کسی کا چاہ — کیا جانتا نہیں ہے کہ ہے میری جان تو
۴ بوسہ لبوں کا مانگا ہی اور میں نے کیا کہا — اتنی زباں درازی نہ کر کہنا مان تو
۵ دل گم ہوا کسی نے بھی پایا ہی اے رضا — اب اس گلی کی بیٹھا ہوا خاک چھان تو

۱ موت بھی آتی نہیں ہجر کے بیماروں کو ۲۵۸ کیا مصیبت ہی ذرا دیکھنا بے چاروں کو
۲ نالۂ دل نے ہمارے تو اثر کم نہ کیا — اور معذوری زیادہ ہوئی دل داروں کو
۳ گو ہیں جنت میں مزے لیک نہیں بھولنے کا — ہونٹ کا چاٹنا تجھ لب کے نمک خواروں کو
۴ اس سے بہتر نہیں کوئی چیز سوا بوسے کے — رونمائی میں جو دیویں ترے رخساروں کو
۵ کبھی رونا کبھی سر دھنا کبھی چپ رہنا — کام کرنے ہیں بہت سے ترے بے کاروں کو
۶ میں نے کاغذ تری تصویر کا عیسیٰ کو دیا — نسخہ جوں دیتے ہیں بیمار سب عطاروں کو
۷ پتھروں ہی پر جو تجلّی ہو تو ہم غیرت سے — آنکھوں ہی میں لیے مر جائیں کے نظاروں کو
۸ سب نمونہ ہے حقیقت کا جہاں تک ہی مجاز — نقش جو کرتے ہیں گلزار کی دیواروں کو
۹ یہہ غزل خدمت نوّاب کی ہی میر رضا — اور ایک دوسری کہہ دیجیے ہم کاروں کو

۱ جس طرح خواب سے آرام ہے بیماروں کو ۲۵۹ رہنا غفلت ہی میں بہتر ہے گنہ گاروں کو
۲ گوشہ گیری میں ہی اک اور بھی عالم کی سیر — دن کو جو اہل رصد دیکھتے ہیں تاروں کو
۳ رکھا نام اس کا مرے دل نے تمنائے وصال — کتنے اک جمع کیے عشق میں دشواروں کو
۴ دم عیسیٰ سے ہوں بیمار محبت کے ہلاک — خضر گم راہ کرے عشق کے آواروں کو
۵ اشک محجوب کا ... نہیں جیب و دامن — جانیں کیا لڑکے یہہ اشراف کے بازاروں کو
۶ اور ٹکڑا ہوا مانند کتاں دل اپنا — جتنا پیوند کیا اس سے میں مہ پاروں کو
۷ اٹھ گیا ہو نہ مرا ہاتھ کہیں دل پر سے — ہاتھ کیوں ملتے ہیں دیکھو ہوں پرستاروں کو
۸ کاش ہو وصف تری زلف کے .. کا نمود — نامہ دیں حشر میں جب ہم سے سیہ کاروں کو
۹ اب بھی دیکھو تسلّی تو مرے قتل کے بعد — صبر یوں آئے مرے مرے غم خواروں کو
۱۰ دن گیا وعدے کا تو مر نہ گیا حیف رضا — منہ دکھانا ہے پھر اے یار کے تو یاروں کو

۶ کھلے سر پا برہنہ جیب چاک آہ و فغاں کرتا — پھرے ہے در بدر اب عشق میں کس کے رضا یہ کہہ

۱ یہہ نہیں کہتا ہوں حق صحبت دیرینہ دیکھ ۲۶۴ کر نظر تقصیر پر میری اور اپنا کینہ دیکھ

۲ رات بے رات آنے سے بدنام یوں مجھ کو نہ کر پہلے اے صاحب لعب اپنا سر گنجینہ دیکھ

۳ لالہ و گل ہی پر اتنے حوس مت کھا زینہار زخم و داغوں سے کسی کے آ ہمارا سینہ دیکھ

۴ گر رضا کی ہو نہ حیرانی کا تجھ کو اعتبار — رو بہ رو بلوا کے اپنے اُس کو تو آئینہ دیکھ

۱ کیا قتل ایک دم میں اپنے خنجر کا تماشا دیکھ ۲۶۵ نہ موڑا میں نے بھی مُنہ میرے جوہر کا تماشا دیکھ

۲ بھرا ہے عشق سے جا کر نظر ڈالی مرے دل پر چڑھا خورشید کے مُنہ پر اس اخگر کا تماشا دیکھ

۳ اٹھا برقع کو مُنہ سے اور لگا دے آگ تخشب کو نکل ٹک گھر سے باہر دین آذر کا تماشا دیکھ

۴ زمیں پر ناز سے چل زلزلہ عالم میں پیدا کر نظر کر آسماں پر ماہ و اختر کا تماشا دیکھ

۵ ہمیں اک بوسہ دے تا ذوق مستی سے ہو کف جاری — پھرا اے حور بہشتی موج کوثر کا تماشا دیکھ

۱ ہر نفس آہ و ہر زماں نالہ ۲۶۶ شعلہ در آہ و خوں چکاں نالہ

۲ دیکھنا پرورش محبت کی نالہ ہے آہ اور فغاں نالہ

۳ سانس لینا بھی اب تو مشکل ہے وہ کہاں آہ اور کہاں نالہ

۴ کیوں کے پہنچے مری خبر تجھ کو — نارسا آہ و ناتواں نالہ

۱ اس رخ پہ نظر کر خط شب رنگ کا جلوہ ۲۶۷ کیا کھلتا ہے اس آئینے میں زنگ کا جلوہ

۲ لگتی ہے نگہ اپنی بہت بوقلموں آج ہے سامنے ان آنکھوں کے کس رنگ کا جلوہ

۳ پھر بند ہو غنچے کی طرح وقت تبسم گر دیکھے گل اُس کے دہن تنگ کا جلوہ

۴ اس آئینہ خانے میں جہاں جو نظر کی — آیا نظر اپنے ہی رضا رنگ کا جلوہ

۱ دل جا پڑا نہ اُس بت نا آشنا کے ہاتھ ۲۶۸ اے کافر اب تو پھرنا ترا ہے خدا کے ہاتھ

۲ کس طرح سے یہ لیتی ہے بوسہ چٹ چٹ کیا اُس کا پاؤں مفت لگا ہے حنا کے ہاتھ

۳ برباد دے ہے خاک دریا رنت صبا یارب یہ تخت سلطنت آئے گدا کے ہاتھ

۴ بلبل یہ شاخ گل بڑی نازک سہی ولیک جو ہم نے دیکھے ہیں سو کہاں اُس ادا کے ہاتھ

۵ اک بار بھی نہ دامن یار آیا ہاتھ میں تھک کر کے رہ گئے مرے آخر دعا کے ہاتھ

۶ کچھ فکر بیسرے اس دل حیراں کا بھی کرے جس نے دیا ہے آئینہ اُس خود نما کے ہاتھ

کرتا چمن کے تختے کو پامال عندلیب — گر اختیار باغ کا ہوتا رضا کے ہاتھ ۷

پھرتے کیا ہو ہر دم میری اب چشم خوں بار پہ ہاتھ ۲۶۹ کاش اک بار بھی شفقت سے تم رکھتے دل افگار پہ ہاتھ ۱

قطع امید نہ کیجے کیوں کر برسوں کی وعدہ خلافی پر الی جو قسم ملنے کے لیے تو اس نے رکھا تردار پہ ہاتھ ۲

روتے روتے آنکھیں بیٹھیں خوف سے تھراتے ہیں پاؤں اب آتے ہیں کسی کی گلی میں رکھ رکھ ہم دیوار پہ ہاتھ ۳

دل نے ملنے کی مت پوچھو قہر کیا نزاکت نے — انگلیاں پانچوں اکھڑ آئیں لگتے ہی اس رخسار پہ ہاتھ ۴

دل لگانے کا چاؤ ہوتا ہے ۲۷۰ پر کلیجے میں گھاؤ ہوتا ہے ۱

پہنچا قاصد پہ مشل شانے کے دل کے تئیں پیچ تاؤ ہوتا ہے ۲

ظلم یاں بے حساب ہے دیکھیں حشر میں کیا بناؤ ہوتا ہے ۳

اب تو ہم ہار بیٹھے ہیں لیکن جیت کا ایک داو ہوتا ہے ۴

شکوہ کرتے ہیں اں جدائی کا جہاں کچھ بھی لگاؤ ہوتا ہے ۵

بگڑی صورت ٹک اس کی دیکھ رضا — کس سے اُس کو بناؤ ہوتا ہے ۶

دل جو کہنے میں نہ ہو کیا حاصل اُسکے پاس سی ۲۷۱ زخم زخم اس کو کر اور ہر زخم بھر الماس سے ۱

اس کو نسبت اُس کی زلفوں سی سراسر ہی خطا ہوش کس کا اڑ گیا ہی مشک کی بو باس سے ۲

اب نمازوں میں جاتا ہی نہیں اُس کا خیال میں نہ ملتا تھا بتوں سی کم اسی وسواس سے ۳

بوسہ لب کا غیر کو دیجے ہمیں ترسائیے — آب حیواں اُس کی قسمت ہو مریں ہم پیاس سے ۴

کیوں کے وہ عاشق دل سوختہ سے ساز کرے ۲۷۲ جس کا یہ حسن ہو جبریل نہ وہ ناز کرے ۱

نظر خاص رقیبوں کے تئیں ارزانی اس طرف کاش نگاہ غلط انداز کرے ۲

میرا جی دینا تو کیا مرتا تھا اس رخ پر میں یک نظر جس کی جھمک خضر کو جاں باز کرے ۳

ہے عجب راہ محبت کا طریق اے یارو پہنچے منزل کو جو انجام کو آغاز کرے ۴

کیا تماشا ہے وہاں معرکہ آرا ہے عشق جس جگہ کام نہ کچھ سحر نہ اعجاز کرے ۵

جتنے شہباز ہیں اس صید کے ہوتے ہیں شکار جو پر تیر کو اپنا پر پرواز کرے ۶

رشک پروانہ سے جلتا ہوں شب و روز رضا — کوئی مقراض اب اُس کا پر پرواز کرے ۷

دل شیخ و برہمن کا مرے ہاتھ گرو ہے ۲۷۳ نہ رہ مجھے کعبے میں نہ بت خانے میں رو ہے

یاں دیدۂ پرنم دل پر خون ہے کس بن نہ جام نہ مینا ہے نہ خم ہے نہ سبو ہے ۲

۳ کیوں کر دل صد چاک کو اب سیجیے رضا آہ — نہ بخیہ ہی ہو سکتا ہے نہ جائے رفو ہے

۱ رضا کس طرح کا یہ دیوانہ پن ہے ۲۷۴ ترا چاک چاک آہ سب پیرہن ہے

۲ کرو مت تردد ہمارے کفن کا — فقیروں کی کفنی ہی اس کا کفن ہے

۳ شب ہی تک ہے یہ ماجرا دیکھیو کل — نہ یہ یار ہیں گے نہ یہ انجمن ہے

۴ رضا کو گلی سے نہ اپنی نکالو — یہ عاشق قدیمی ہے یار کہن ہے

۱ روتا پھرتا ہے نالہ بھرتا ہے ۲۷۵ کہہ رضا سچ تو کس پہ مرتا ہے

۲ کس نے پھر تیغ کی ہے آج علم — پھر لہو اپنا جوش کرتا ہے

۳ قتل کیجے رضا سے مفلس کو — کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے

۱ گر چشم تری جام صہبا کے برابر ہے ۲۷۶ اپنا دل پر خوں بھی مینا کے برابر ہے

۲ کہہ دینا سکندر سے کیوں پھرتا ہے بیہودہ — اک گوشۂ دل ساری دنیا کے برابر ہے

۳ کیوں خضر سے جدا ہوں سمجھے [illegible] — جب دل کو ہوئی وسعت صحرا کے برابر ہے

۴ کر سیر ذرا دل کی وادی مقدس کی — ہر ایک شباں یاں کا موسیٰ کے برابر ہے

۵ آ عشق کے مکتب میں سی پارۂ دل کو پڑھ — یاں طفل دبستانی ملّا کے برابر ہے

۶ حرماں زدگان عشق مستغنی ہیں جنت سے — یاں کا شجر بے بر طوبیٰ کے برابر ہے

۷ اے میر رضا شکوہ مت اس کی جفا کا کر — معشوق جفا پیشہ عنقا کے برابر ہے

۱ چشم و زلف اس کی کیا دل کو پسند آئی ہے ۲۷۷ مست زیبا ہے کہیں اور کہیں سودائی ہے

۲ اگلی باری کا گیا شور نہیں سر سے ہا — [illegible] خدا خیر کرے پھر یہ بہار آئی ہے

۳ کعبہ و دیر جدھر دیکھا ادھر کثرت ہے — [illegible] گوشۂ تنہائی ہے

۴ شہر آباد ہے سودے سے رضا [illegible] — [illegible] صحرائی ہے

جھ خاک سے جو لالہ اگا کیا عجب [illegible] ۲۷۸ داغ جگر [illegible] کا سبب یہ ہے

۲ گر میرا دردِ دل نہ سنا اس کا غم نہیں — باتیں لگا ہے غیر کی سنے غضب یہ ہے

۳ ظاہر ہیں سب پہ عشق کی تیری خرابیاں — بتلا دوں کیا سبھی کے اب اپنے حبیب یہ ہے

۴ دشمن کو کیا رہے گی توقع بتا تو ہائے — تیرا سلوک دوستوں سے یار جب یہ ہے

۵ دیکھا جو وقت مرگ مجھے ہنس کے یہ کہا — سنتے جو تھے رضا کے تئیں جاں بہ لب یہ ہے

ہوئے گا محبت کا سرانجام ہمیں سے ۲۷۹ اوروں کو دعا ہوئے یہ دشنام ہمیں سے ۱
سمجھانے کو اک میر رضا ٹھہرے تھے اُس کے — وے بھی جو نظر آئے سو بدنام ہمیں سے ۲
کیا جانے کس کی صورت دل سے دوچار ہے اب ۲۸۰ بے خود بہ سان تصویر حیرت سے ہو رہا ہے ۱
انجم نہ سمجھو اس کو تیر نگہہ کی اُس کے — یہہ زرہ پوش گردوں ہیبت سے ہو رہا ہے ۲
کھینچو ہو تیغ کس پر کہنے سے غیر کے آہ — آگے ہے دل یہ بسمل غیرت سے ہو رہا ہے ۳
گر چاہیے صفائی وحدت گزیں ہو اے دل — یہہ عکس آئینے میں کثرت سے ہو رہا ہے ۴
دیتا ہے دل سی شے بھی کوئی رضا کسی کو — اب تو خراب اپنی ہمت سے ہو رہا ہے ۵
غیر کے گھر وہ ہائے جاتا ہے ۲۸۱ کس طرح سر گڑائے جاتا ہے ۱
یار دیکھو تو میری خاک سے بھی — دامن اپنا اٹھائے جاتا ہے ۲
خاک سے ہو گئے ہیں ہم یکساں — پر وہ گھوڑا کدائے جاتا ہے ۳
رازداری کہاں تلک اے عشق — غم بھی جاں کھائے جاتا ہے ۴
آہ گور آ لگے ہیں تس پر بھی — وہ ہمیں آزمائے جاتا ہے ۵
مجھ کو سیدھا سمجھ کے وہ کج باز — اینڈی بینڈی سنائے جاتا ہے ۶
تیرے بازار حسن میں یوسف — شرم سے مُنہ چھپائے جاتا ہے ۷
جاتا ہے اُس کے در سے جو کوئی — راہ سے مُنہ پھرائے جاتا ہے ۸
کیا ہی دل کش ہے یہہ جہاں خراب — بن موئے یاں سے جائے جاتا ہے ۹
ایک تو آپ ہی مروں ہوں میں فق — درد جی کو کھپائے جاتا ہے ۱۰
پوچھنا تس پہ دوست داروں کا — اور بھی جان کھائے جاتا ہے ۱۱
میں ہوں اس سے بھی تیرہ روز رضا — وہ جو سرمہ لگائے جاتا ہے ۱۲
اٹھے ہیں گہہ زمیں سے گہہ آسمان سے ۲۸۲ عاشق کہاں ہوئے کہ گئے ہم جہان سے ۱
آئندہ دیکھیں کرتا ہے کیا کیا ادائیں عشق — کی صرف میں نے زندگی اب تک تو آن سے ۲
دیکھا نگاہ تیز سے کس شوخ چشم نے — آتے نظر ہیں منہ پہ تمھارے نشان سے ۳
سچ کہنا بوالہوس سے خفا تو نہیں ہوئے — کچھ ان دنوں ہو مجھ پہ بہت مہربان سے ۴
جس دن سے اُس نے اپنی سروہی کو باڑھ دی — میں دم بہ دم سکے کو رگڑتا ہوں سان سے ۵

۶ ہر شے میں جلوہ گر ہے ولیکن یہ لطف ہے — باہر ہے وہم و فہم و قیاس و گمان سے
۷ جس دل میں داغ ہو رکھ اسے جان سے عزیز — یوسف نہیں نکلتا ہے ہر کاروان سے
۸ قاصد چلا ہے چھوڑ اسیران عشق کو — لے نام عاشقوں کا ہر اک دل ستان سے
۹ بہتر تو ہے گر اپنے گرفتار کے تئیں — کہہ دیجیے کچھ آپ بھی اپنی زبان سے
۱۰ اک عمر میں بھی شعر کی خدمت کی اے رضا — پر حیف ہے ملا نہ کسی نکتہ دان سے
۱ اس خستہ جاں کو کون سی یارب دوا لگے ۲۸۳ جس کو کہ سانس لینے میں اک تیر سا لگے
۲ تا شیر ہے وہاں سے زیاد اس کے نام کو — بیمار عشق کی نہ کسی کو ہوا لگے
۳ سو عمر خضر سے ہو تری زندگی زیاد — گر ایک دن کی بھی مری تجھ کو دعا لگے
۴ جوں سایہ تیرے ساتھ لگا پھرتا ہے رقیب — اس بد بلا کو سخت کوئی بد بلا لگے
۵ مت منہ لگا نا بوالہوس چاپلوس کو — جب لگ چلے زیادہ وہیں کہہ دو پا لگے
۶ یوں شعر میں تلاش سبھی کرتے ہیں رضا — اتنا تو ہو جو چوٹ بھی دل کو ذرا لگے
۱ ترے خیال میں کل زور خواب دیکھا ہے ۲۸۴ تمام سرو میں پھولا گلاب دیکھا ہے
۲ کمر کی زلف کی کاکل کی ہم سے مت پوچھو — تمام عمر یہی پیچ و تاب دیکھا ہے
۳ تو اور ہی کو ڈرا روز حشر سے واعظ — شب فراق میں ہم نے عذاب دیکھا ہے
۴ چلا ہے کعبے کو بت خانے سے رضا یارو — کسی نے ایسا خدائی خراب دیکھا ہے
۱ میں ہی نہیں ہوں برہم اُس زلف کج ادا سے ۲۸۵ ٹک منہ ترا جو پائیں الجھیں ابھی ہوا سے
۲ تم نے نگا لینے میں کچھ کم نہ کیں جفائیں — اب تک جو تھم رہے ہیں ہم اپنی ہی وفا سے
۳ پہلی نگہ میں دل پر برچھی سے لگ گئی ہے — پہنچے تھے انتہا کو ہم اس کی ابتدا سے
۴ رکھنا قدم زمیں پر ٹک دیکھ کر پیارے — دل راہ میں پڑے ہیں لاکھوں کے نقش پا سے
۵ جا اے طبیب یاں سے اتنا نہیں سمجھتا — بیماری محبت کس کی گئی دوا سے
۶ میں عاشق بلا ہوں کرتا ہوں اُس کو سجدہ — خاک قدم کو اس کی جو آوے کربلا سے
۷ مشہور تھی بزرگی اُن کی سبھوں سے لیکن — ق اپنے تئیں تعارف چنداں نہ تھا ضیا سے
۸ اکثر گلی سے اُس کی دیکھا تھا میں نے جاتے — ہو گئے تھے اس سبب سے کچھ صورت آشنا سے
۹ کل اُن کو میں نے دیکھا سر ننگے پا برہنہ — جامہ جو ہے گلے میں سو ٹکڑے جا بجا سے

در پردہ یوں میں اُن سے پوچھا کہ قبلۂ من ۔ کیوں آج اس قدر ہیں آزردہ و خفا سے ۱۰
محجوب سے وہ ہو کر کہنے لگے نہ پوچھو ۔ مر جائیں یا الٰہی چھوٹیں کہیں بلا سے ۱۱
یہ طرفہ ماجرا ہے اک جا پہ دل دیا ہے ۔ پر ٹھہر ہیں وہاں کے لونڈے ذرا ذرا سے ۱۲
اتنی سی عمر میں یہ عیاریاں ہیں کرتے ۔ لیتے ہیں دل کو پہلے دے دے بہت دلاسے ۱۳
جب دیکھتے ہیں آیا اب اختیار میں دل ۔ جو دیکھیو تو پھر پیش آتے ہیں اس ادا سے ۱۴
میں نے کہا کہ حضرت آپ اپنی طرف دیکھیں ۔ جو ان بتوں سے ہوگا سو ہوگا وہ خدا سے ۱۵
بے اختیار ہو کر بولے کہ سچ ہے صاحب ۔ واقف نہیں ہوئے ہو عشق و ہوس فزا سے ۱۶
دریا کے رہنے والے کیا جانیں اس اثر کو ۔ پانی کی قدر پوچھو اُن سے جو ہیں پیاسے ۱۷

۲۸۶ انسان ہی یہ یا ملک یا حور ہے یہ یا پری ۔ اعجاز عیسیٰ لب میں ہو آنکھوں میں سحر سامری ۱
صنعت نمائی تھی غرض یا قتل عالم مدعا ۔ یہ کیا کیا حیران ہوں میں تیری جو کی صورت گری ۲
گر تو نہیں مستور ہے کس نے مجھے رسوا کیا ۔ دیوانہ ساں پھر کیوں ہوں میں گر تو نہیں شکل پری ۳
ہے حسن سے ایجاد عشق اور عشق سے اُس کی نمود ۔ ہیں تجھ سے ہوں تو مجھ سے ہے اے داغ عشق دلبری ۴
دیکھا رضا کو بعد مرگ اک عمر بھر جو خواب میں ۔ ہونٹوں میں خشکی ہے وہی آنکھوں میں ویسی ہی تری ۵

۲۸۷ محرومی کا کوئی مجھ سا گرفتار نہ ہوئے ۔ ملتا رہے اور لذت دیدار نہ ہوئے ۱
پوچھے ہے مرا حال وہ بے درد و لیکن ۔ جس وقت مجھے طاقت گفتار نہ ہوئے ۲
اب جاتے تو ہو میر رضا اُس کی گلی میں ۔ ڈرتا ہوں یہ آنا تمہیں دشوار نہ ہوئے ۳

۲۸۸ نہ ہم کو یاد کرتا ہے نہ تو یاں آپ آتا ہے ۔ خیال اپنے کو باولے عبث یہ کیوں ستاتا ہے ۱
نہ کہتے حال دل کو اپنے اس کہنے سے بہتر تھا ۔ تمہیں تو نیند آتی ہے ہمیں تو رونا آتا ہے ۲
نہ سودے کا مرض ہے گا کہ جس سے یوں ہو دیوانہ ۔ ذرا چھپ بیٹھنا گھر میں مجھے در در پھراتا ہے ۳
رضا کے جان دینے پر دل اک عالم کا کڑھتا ہے ۔ تو جیتا رہو تیرے بھی کبھی کچھ جی میں آتا ہے ۴

۲۸۹ مری چشموں سے یوں سیلاب آنسو کا نکلتا ہے ۔ بھری بھادوں میں جیسے جوش سے دریا ابلتا ہے ۱
رضا اپنے پہ تجھ کو رحم کچھ آتا نہیں ظالم ۔ تری تو خستہ حالی دیکھ جی غیروں کا جلتا ہے ۲

۲۹۰ جوں توں کے روز ہجر تو وہ دھوکے کر چکے ۔ پر چھاتی پہ پہاڑ سی یہ رات رہ گئی ۱
اک دم نہ اور بیٹھے کہ ہو چکا میں تمام ۔ جی ہی میں آہ جی کی مرے بات رہ گئی ۲

۳ وعدہ کیا تھا صبح کا سو وہ بھی آئے ہائے — لے پیارے دن گزر گیا پر بات رہ گئی

۴ واں دیر راہ کی ہوئی یاں جلد ہی اجل — ہوتے ہی ہوتے ایسی ملاقات رہ گئی

۲۹۱

۱ قصور دوستی افشا ہوا کیا مہرباں ہم سے — نہ ہو دشمن سے کوئی جیسے تم ہو بدگماں ہم سے

۲ غنیمت ہی سمجھ تو ہم کو اپنے عشق بجاں فرما — گئے فرہاد و مجنوں پر ترا نام و نشاں ہم سے

۳ رضا سے دل جلے کی سوزشیں سیکھے بیاں کرنے — سمجھ کر جی میں ہونا شمع محفل ہم زباں ہم سے

۲۹۲

۱ کہہ دل نہ اُسے عشق میں جو زار نہ ہوئے — وہ آنکھ نہیں غم سے جو خوں بار نہ ہوئے

۲ وہ دوست جو کچھ میری اذیت میں ہو مصروف — دشمن کے بھی کوئی درپے آزار نہ ہوئے

۳ [illegible] تا انداز نگہ مست نہ تیرا — کیا دار ہے وہ سینے کے جو پار نہ ہوئے

۲۹۳

۱ ہوگئے ہم جو تھے نپٹ سیانے — رخ ترا دیکھتے ہی دیوانے

۲ ہم تجھے چشم یار گھوریں گے — مست تو ہے تو ہم ہیں دیوانے

۳ ... تیشہ کوہ کن سے پوچھ — جس کے سر پر پڑے وہی جانے

۲۹۴

۱ ہمیں مر جائیں اب کہ یار آئے — دیکھیے کب ہمیں قرار آئے

۲ ایک اُس سے کہی نہیں جاتی — بات جی میں اگر ہزار آئے

۳ جیتے جی گالی بھی نہ دی لے کاش — [illegible] کو سر مزار آئے

۴ میرے مرنے کی آپ لے تا صدر — جس طرح اُس کو اعتبار آئے

۵ یہہ وصیت ہے خاک پر میری — جو کوئی آئے اشکبار آئے

۶ تم تو لاؤ رضا کو کر یک بار — آپ سے پھر ہزار بار آئے

۲۹۵

۱ کہاں کا پیغام اور نامہ غرض یہہ احوال نامہ بر ہے — خبر کو بھیجا تھا اُس کی ہم نے سو آپ ہی آیا تو خبر ہے

۲ نیاز نے ہم کو مار ڈالا یہ ناز بے جا تیا تو کب تک — بہانہ کرتا ہے نیند کا کیا ہمارا قصہ تو مختصر ہے

۳ جفا سے اُس کی وفا زیادہ یہ کس کی قدرت یہ کس کی طاقت — نہ نبھائی ہم سے تو یہہ نہ ہوگا ترا لہو بھرا [illegible] ہے

۴ اگر نہیں ہے کیا کسی سے تو اس سے ہوتا ہے کیا ہیاں — کسی کا پھیرا ہو سرخ شاید کہ خون میرا کسی کے سر ہے

۵ دہن کسی کا کمر کسی کی نظر میں آئے کہو سو کیونکر — عدم کی ہیں گی یہ سب نشانی نہ کچھ دہن ہے نہ کچھ کمر ہے

۲۹۶

۱ دل [illegible] پر یہہ بار غم لے یار بھاری ہے — بہت ہم نے اٹھایا پر بہت اس بار بھاری ہے

۲ نہ جا بالیں سے میرے ٹک ترحم کر کہتے ہیں — شب ہجراں ترے بیمار پر لے یار بھاری ہے

منڈائی اُس نے جب بردہ میں بولا کیا کیا ظالم     لگا کہنے مرے قبضے پہ یہ تلوار بھاری ہے ۳

رضا دہشت نہیں محشر کی حیدر کی محب کی — ہمارا پلۂ میزاں جنوں کہار بھاری ہے ۴

یوہیں مری جان لیا چاہیے ۲۹۷ یا بھی کبھی دل ہی دیا چاہیے ۱

کیسی قیامت ہے وعدہ بنے کے     کتنے دن اب اور جیا چاہیے ۲

جامۂ مجنوں کا مرے بن سیے     چاک گریباں کا سیا چاہیے ۳

لے گیا لیلیٰ کو وو مجنوں کے پاس     ناقے کے قدموں کو لیا چاہیے ۴

غیرِ مے ناب کے قابل نہیں     اُس کے تئیں زہر دیا چاہیے ۵

عشق کا بیمار اگر مر بھی جائے     تو بھی دوا اُس کی کیا چاہیے ۶

ساقیِ دوراں کے رضا ہاتھ سے — صاف ہو یا دُرد پیا چاہیے ۷

تجھ کو ہرجائی کوئی کیا چاہے ۲۹۸ موت عالم کی تا کجا چاہے ۱

اُس سے کیا دعویٰ کیجیے جو ظالم     قتل کر آپ ہی خوں بہا چاہے ۲

اُس کو بے دردو ماریو یارب     درد کی میرے جو دوا چاہے ۳

ترکِ عشقِ بتاں رضا ہم تو — چاہتے ہیں اگر خدا چاہے ۴

یا فقیری ہے یا کہ شاہی ہے ۲۹۹ عشق میں دونوں روسیاہی ہے ۱

اس طرح اُس کو موت دے یارب     زندگی میری جس نے چاہی ہے ۲

اپنا دکھلا دے گوشۂ دستار     گل کو دعوائے کج کلاہی ہے ۳

کیوں کے اس پر نہ لے رضا مر یے — خوب صورت ہے اور سپاہی ہے ۴

گل عشاق رنگ باختہ ہے ۳۰۰ سرو اپنے چمن کا فاختہ ہے ۱

آتشِ غم سے آب سنگ ہوئے     اشک آئینۂ گداختہ ہے ۲

عشق بالا ہے حسن سرکش سے     سایۂ سرو بال فاختہ ہے ۳

کوئی کہتا اسیر ساغر کو     ہند میں بھی ہوا مراختہ ہے ۴

دیکھ سودا رضا کا دیوانے — تیرا مجنوں جنوں ساختہ ہے ۵

سب یار ملتے ہیں گلے یہ کہہ کہہ کے عید ہے ۳۰۱ تو مجھ سے دور بھاگے نہایت بعید ہے ۱

مت دیکھ چشم سے یہ روز کی ہلال     قفلِ درِ مراد کے حق میں کلید ہے ۲

۳ ہم جانتے ہیں اُس کے تئیں پیارے رضا      طفلی سے نوجوانوں کا جو کوئی مرید ہے

۱ نہ ہو خوش وصل سے بھی خاطر اندوہ گیں اپنی ۲۰۲ کہ اول دیکھنے میں ہے نگاہ واپسیں اپنی

۲ شب ہجراں میں نت لے اشک سوزاں تیری دوری سے      بہ سانِ شمع آتش در بغل ہے آستیں اپنی

۳ رضا گر مدعی کی فکر ہو سحر آفریں کیا غم — کہ ہے تفضل خدا سے طبع اعجاز آفریں اپنی

۱ درد کا مبتلا کیا تو نے ۲۰۳ عشق بے درد کیا کیا تو نے

۲ کیا ہوا گل کھلے چمن کے نسیم      کسی کا دل بھی وا کیا تو نے

۳ دل دیا ایسے بے وفا کو رضا — کیا کیا تو نے کیا کیا تو نے

۱ جب اٹھے تیرے آستانے سے ۲۰۴ جانیو اُٹھ گئے زمانے سے

۲ دن بھلا انتظار میں گزرا      رات کاٹیں گے کس بہانے سے

۳ جان بھی کچھ ہے جو نہ کیجے نثار      مر نہ جائیں گے اُس کے جانے سے

۴ ایک اس لُطف سے اٹھایا ہاتھ      چھٹ گئے لاکھوں شاخسانے سے

۵ کوئی مر جاؤ کام ہے اُس کو      اپنی تروار آزمانے سے

۶ اُس کے تیر نگاہ کے آگے      کچھ ہمیں بن گئے نشانے سے

۷ ناتوانی تجھے غضب آئے      گئے اُس کی گلی کے جانے سے

۸ کہاں بنگالہ اور کہاں میں رضا — بس نہیں چلتا آب و دانے سے

۱ کس طرح چھپائیں محبت ہم نالوں سے کہ چاہ نکلتی ہے ۲۰۵ جب ذکر کسی کا آجاتا ہے دل سے آہ نکلتی ہے

۲ یہہ کس کی آنکھوں کے سُرمے نے کیا گھر ہے میری آنکھوں میں      آنسو ہی نہیں نکلیں ہیں سیاہ نگہہ بھی سیاہ نکلتی ہے

۳ کیا جانے کیسی آگ پڑی کیوں ہم سے آہ کو لاگ پڑی      جب جاتے ہیں اُس کی مجلس میں یہہ خواہ نخواہ نکلتی ہے

۴ راتوں کو فشکوہ میں سود نہیں چوری کی نمود نہیں      ہو صبح تو اُس کو نکلنے دے تری نیشینی ناہ نکلتی ہے

۵ رکھتے ہیں پاؤں پر ہیں ہیں کہیں جاتے ہیں ہوئے بے ہوش ہیں      ہر ایک قدم پر گرتے ہیں کس گھر کو یہ راہ نکلتی ہے

۶ جو شعر شناس یہاں کے ہیں کیا جانے رضا یہ کہاں کے ہیں — مذکور تو کیا ہے آہ کریں نہیں مُنہ سے واہ نکلتی ہے

۱ خط آیا اُس پر بھی اُس میں کیا ہی آن نکلتی ہے ۲۰۶ بن ٹھن کر جب نکلے ہے وہ اپنی جان نکلتی ہے

۲ . . . . . . . . . . . . . . . . .      منہ کے کھلنے کی ہے نشانی جب کہ کمان نکلتی ہے

۲ غیرت ہوئی گلوگیر اپنی یوں نکلے اس بزم سے ہم      جیسے پھانسی دینے میں گھبرا کے جان نکلتی ہے

تیر ہے یا یہہ برچھی ہے جو دل کو چھید ڈالے ہے — سنتا زاہد مطرب کی کس ادا سے تان نکلتی ہے ۴
کس کا دارا کون سکندر کیسا خسرو ہم تو رضا — بندے ہیں اُن کے جن میں خدائی کی شان نکلتی ہے ۵

یعقوب خوش نہ ہوگا بوے گل و سمن سے — ۲۰۷ آئے صبا پلٹ کر یوسف کے پیرہن سے ۱
کس سے کہوں کرے گا کون اعتبار اس کو — ہے مجھ کو تلخ کامی اُس شکریں دہن سے ۲
کیا غم ہے تجھ کو لے دل کچھ کہہ تو اپنے جی کی — پرچے نہ انجمن سے خوش ہو نہ تو چمن سے ۳
کیوں لالہ بے ستوں کا کرتا ہے داغ دل کو — پانی اُسے دیا ہے کیا خون کوہ کن سے ۴
ہوتا ہے کوئی پیوند اب آئنے شیشہ — کب زخم دل ہو بہتر ناصح ترے سخن سے ۵
یوں میرے گھر سے نکلا وہ شوخ شاد خرم — جس طرح عارفوں کا نکلے ہے جان تن سے ۶
اس دشت پُر خطر میں جاتا ہوں میں اکیلا — ریگ رواں کو جس کے ہے خوف راہ زن سے ۷
کھلاتا ہی ہوا سے اک جنبش مژہ کی — کیا برگ گل کو نسبت اُس نازنیں بدن سے ۸
بیماری بوالہوس کی سن کر بہت کڑھا وہ — بیمار میں ہوا ہوں یار واسی کڑھن سے ۹
سنتے تو تھے رضا ہیں سب میں بڑے مسلماں — پر کفر میں زیادہ نکلے دو برہمن سے ۱۰

عاشق کو زندگی شب ہجراں نہ چاہیے — ۲۰۸ اے مرگ اتنی دیر مری جان نہ چاہیے ۱
دل کا مرے یہ حال ہے دشمن بھی رحم سے — کہتے ہیں اتنی دشمنی جان نہ چاہیے ۲
سینے کا زخم مجھ کو چھپانا ہے اور ہاے — ہے چاک عاشقی میں گریباں نہ چاہیے ۳
نہ شمع ٹھہرے اور نہ اُگے سبزہ گور پر — اتنی بھی گرمی اے دل سوزاں نہ چاہیے ۴
جس زہر سے کہ ہوتے ہیں آسودگان تمام — اُس سے ہلاک خستہ درونان نہ چاہیے ۵
وقت وداع مانع نظارہ تو نہ ہو — ہر وقت جوش دیدۂ گریاں نہ چاہیے ۶
مرگ رقیب سننے کی مجھ کو خوشی ہے لیک — کہتا ہے رشک ذکر بھی یہہ یاں نہ چاہیے ۷
آشفتہ کیوں ہو آئینہ خانے میں کیا گئے — یاروں کا راز یاروں سے پنہاں نہ چاہیے ۸
جو دل کہ کوے یار کے جانے سے وا نہ ہو — واشد کو اُس کی سیر گلستاں نہ چاہیے ۹
اے دل جو شرمگیں کبھی دیکھے تری طرف — یوں بےخودی سے کرنا پشیمان نہ چاہیے ۱۰
خود عشق سر کے دینے کا سامان ہے رضا — کہتے ہیں عشق میں سر و سامان نہ چاہیے ۱۱

میں جان دیتا ہوں مژۂ یار کے لیے — ۲۰۹ گل سے کسی نے توڑا نہیں خار کے لیے ۱

۲ میرے لیے خدا نے دیا ہے تجھے یہ حسن — خلقت دوا کی ہوئے ہے بیمار کے لیے

۳ ہم کو دیا قضا نے ہو اک خوں گرفتہ دل — سو ہائے وہ بھی دیدۂ خوں بار کے لیے

۴ ہم کو ملی ہو عشق سے اک آہ سوزناک — وہ بھی اُسی کی گرمیِ بازار کے لیے

۵ حربا کی طرح تکتے ہیں خورشید کی طرف — ہم سے غریب سایۂ دیوار کے لیے

۶ لازم ہے خاک سے بھی کبھی کیجیے بسر — سر کو فقط نہ چاہیے دستار کے لیے

۷ لے وائے خونِ دل سے ہو آسودہ میری آنکھ — اور چشم پاک چاہیے دیدار کے لیے

۸ دل کو گلِ بہشت کا داغی نہ کر رضا — یہہ آئینہ بنا ہے رُخِ یار کے لیے

۲۱۰

۱ روئیے کس کے لیے اور کس کا ماتم کیجیے — عمر جاتی ہو چلی کچھ اپنا ہی غم کیجیے

۲ کم نہیں اپنی جمعیت پر بہت لاچار ہیں — درد کچھ بھی کم ہو تو نالہ بہت کم کیجیے

۳ اُس کے جلوے نے کیا طاقت تمام اے ہم نشیں — سخت حیرانی ہے کیونکر چشم پُرنم کیجیے

۴ عشق سو محنت ہے کیا کہیے دلِ بے تاب کو — ایک دو ملزم نہیں کس طرح ملزم کیجیے

۵ قتل کا وعدہ تمھاری چشم دیتی ہے ولیک — مست ہیں وے آپ یہہ پیمان محکم کیجیے

۶ خاک میں ہم راہ آخر لے گیا سب رازِ عشق — اپنی غیرت نے نہ چاہا کوئی محرم کیجیے

۷ چشم رکھنا ابرِ تر پر دوں ہم سے ہے رضا — روئیے اور کشت اپنا سبز خرم کیجیے

۲۱۱

۱ کشش دل کی کوئی مرنے سے بے تاثیر ہوتی ہو — جو عاشق خاک ہو تو خاک دامن گیر ہوتی ہے

۲ کروں کیا کیونکے لکھوں حالِ دل حیران ہوں اے قاتل — جو کہنے میں نہ آئے بات سو تحریر ہوتی ہے

۳ دلِ بے تاب مرنے پر بھی خاک اپنے نہ کام آیا — غلط ہے کشتۂ سیماب کی اکسیر ہوتی ہے

۴ یہ طوقِ گردنِ دل ہے وہ ہو گر پاؤں کی بیڑی — مقابل اُس کی زلفوں کے کوئی زنجیر ہوتی ہے

۵ کبھی اک بوسہ مانگا تھا سو یہہ خفگیاں رکھتا ہیں — فرشتے ہم نہیں انسان سے تقصیر ہوتی ہے

۶ عمارت دیر و مسجد کی بنی ہے اینٹ و پتھر سے — دلِ ویرانہ کی کس چیز سے تعمیر ہوتی ہے

۷ کہا ہنسنے کو میں سو بات ہی موقوف کی اُس نے — غرض تقصیر کی دونی یہاں تعزیر ہوتی ہے

۸ جوانی ہی میں دخترِ رز نہیں ہو اپنی مستانی — قیامت حالتِ پیری میں یہہ بے پیر ہوتی ہے

۹ شب اُس کی زلف دیکھی خواب میں اور صبح کیا دیکھا — مرے زنجیر کرنے کی رضا تدبیر ہوتی ہے

۲۱۲

۱ نالہ نہ کہیے اُس کو جو شعلہ ور نہ ہوئے — وہ اشک کیا ہے جس میں لختِ جگر نہ ہوئے

اے آہ گرم تجھ کو کچھ بھی ہے شرم آتی    یاں جل کے راکھ ہوں میں واں کچھ اثر نہ ہووے ۲
بے تیرے زندگانی دشواری میں تو کاٹی    آجا نظر کہ مرنا دشوار تر نہ ہووے ۳
ہر دم شگفتہ رنگی کرتی ہے بہار بن    کیا غم اگر چمن میں مجھ کو گذر نہ ہووے ۴
تجھ بن اگر ہنر ہے ٹک دیکھ عیب اپنا    دشمن کے عیب سے ہرگز ہنر نہ ہووے ۵
آئینہ ساں بنا ہے تو جسم تو سر اپنا    پر دیکھنا تعین جائے نظر نہ ہووے ۶
اب کام تو رضا کا جی دینے سے بھی گزرا —    بہتر ہے اس قدر عشق ہووے نہ ہووے ۷
کس لیے صحرا کے محتاج تماشا ہوجیے ۲۱۳    چاک کیجیے سینے کو اور آپ ہی صحرا ہوجیے ۱
کشتۂ لب ہوکے کیجیے جاوداں اب زندگی    کیوں عبث منت کش خضر و مسیحا ہوجیے ۲
چشم احول سب کو دیکھے ہے زیادہ آپ سے    عین بینائی ہو گر اس طرح بینا ہوجیے ۳
کب تلک سرگشتہ رہیے دن کو مثل گرد باد    رات کو جوں شمع جلنے کو مہیا ہوجیے ۴
اس قدر ہم دل گرفتہ ہیں کہ مشکل ہے بہت    اس کے بند جامہ وا ہونے پہ بھی وا ہوجیے ۵
مجھ سے یہ محجوبی اور دشمن سے ایسا اختلاط    شرم کیجے بے وفائی میں نہ رسوا ہوجیے ۶
آنا یوں تیوری چڑھائے منہ بنائے فائدہ    گر یہی صورت ہو مت تشریف فرما ہوجیے ۷
بوالہوس کا یوں ہدف کیجیے نشانہ تیر کا    غافل اپنی قدر سے بے درد اتنا ہوجیے ۸
جوں جرس بام و در ہر خانہ سے اٹھے گا شور    مت سفر سے حشر برپا ساز سحا ہوجیے ۹
خانہ ویراں کرکے دیوانے نے بس ہے رضا —    کچھ نہ ہووے پھر بھلا کیا کیجیے کیا ہوجیے ۱۰
ہر اک کا حوصلہ چاہے ہے بحر و بر لیوے ۲۱۴    پہ مرد وہ جو لب خشک و چشم تر لیوے ۱
فلک عمارتوں کا اس پر رکھے ہے احساں    جو اس خرابے میں اک اینٹ زیر سر لیوے ۲
سوائے آہ شرر بار کوئی ایسا نہیں    چراغ کی مرے بالیں پہ جو خبر لیوے ۳
سوائے نفس سے راہ زن نہیں بہتر    جو راہ عشق میں چاہے کہ راہ بر لیوے ۴
کہاں سے پائی جہنم نے اس قدر سوزش    مگر وہ آہ گنہگاروں سے اثر لیوے ۵
یہ میری چشم کو ہے ذوق خوں فشانی کا    جو دل تمام ہو خونابۂ جگر لیوے ۶
یہ کیا تماشا ہے قاصد مت اتنا ہو بے درد    ٹھک جا کہتا ہوں ٹک دل مرا ٹھہر لیوے ۷
رضا نہ مانگ فلک سے کہ خو ہے سفلے کی —    ذرا بھی دیوے ادھر پھر وہیں ادھر لیوے ۸

۱ غرور حسن سے تم کب ہماری داد کو پہنچے ۲۱۵ پر اتنا تو کہو تیری خدا فریاد کو پہنچے

۲ نکلنا جان پر حسرت کا میری سخت مشکل ہے اجل اے درد نومیدی مگر امداد کو پہنچے

۳ ملا شیریں سے گو خسرو پہ غیرت عشق کی دیکھو یہ کہتا تھا مبادا یہہ خبر فرہاد کو پہنچے

۴ اجل کرتی ہی غم خواری سی اب بیمار پرستاری ہم اس حالت کو کہنا اُس ستم ایجاد کو پہنچے

۵ نہ گفتار اور نہ رفتار اک فقط رعنائی قد پر ترا کب سر اے قمری، مرے شمشاد کو پہنچے

۶ رضا استاد ہے لیکن ضیا سے اُس کو کیا نسبت — خدا کو پہلے پہنچے تب مرے استاد کو پہنچے

۱ افسوس مرے درد کی تدبیر نہیں ہے ۲۱۶ فریاد کہ فریاد میں تاثیر نہیں ہے

۲ خاکستر پروانہ ابھی گرم ہے متغیر غفلت کو مری کیا ہوا تغیر نہیں ہے

۳ تقصیر میں افراط جو کی بندے نے کیا غم رحمت میں خداوند کی تقصیر نہیں ہے

۴ کیا دیکھا ہے معلوم نہیں کل سے رضا نے — حیرت زدہ ایسی کوئی تصویر نہیں ہے

۱ زخم جگر شگفتہ ہوں سینے کے داغ دیکھیے ۲۱۷ کہنے پر آئی بہار اپنا ہی باغ دیکھیے

۲ دل کا نشان زلف میں شانے سے تو نہ پایا ہے باقی رہا ہی خط میں اب اس کا سراغ دیکھیے

۳ تیشے نے تیرا کوہ کن دور کیا ہے درد سر پاتے ہیں اس بلا سے یار ہم بھی فراغ دیکھیے

۴ ہوتا ہی یہہ فروغ بزم تا کہ جلے مزار پر کرتے ہیں ہم بھی روشن اب اپنا چراغ دیکھیے

۵ تو تو چمن کی سیر کا وعدہ کرے ہی کل رضا — شام تلک رہے بحال اپنا دماغ دیکھیے

۱ یاد ہے اُن روزوں کی جب تم ہم سی محبت رکھتے تھے ۲۱۸ یار نہ تھے واں محرم کوئی ایسی خلوت رکھتے تھے

۲ غم کے مارے ضعف سے اب تو قدرت ہلنے کی بھی نہیں کوچے میں تیرے آتے تھے جب پاؤں میں طاقت رکھتے تھے

۳ مت ہو خفا گر آپ کو مارا دیکھ کے غیر کو تیرے پاس اس میں ہم لاچار بہت ہیں کیا کریں غیرت رکھتے تھے

۴ تجھ کو دیکھ جنھوں نے ظالم دل نہ دیا کیا خوب کیا ہم سے یوں ناداں تھے وے لوگ کرامت رکھتے تھے

۵ اب جو تم تلوار بہت ان روزوں ہاتھ میں رکھتے ہو تیر نگہہ اور خنجر مژگاں کیا کم آفت رکھتے تھے

۶ بھول نہ بیٹھ اُس غنچہ دہن کی بات پہ دشمن ہرگز خوار پھرے ہیں جیسے اب ہم ویسی عزت رکھتے تھے

۷ سیر چمن کی دید گلوں کا حجت یاروں سی ہر وقت قید محبت بھی نہیں جب تک کیا ہی فراغت رکھتے تھے

۸ کیا کہیے اپنے تو جیتے شہر و بیاباں ایک کیا کوہ کن اور مجنوں اور وامق سے تو وحشت رکھتے تھے

۹ گر پڑا اس کے در پر جب تابوت ہمارا بولے لوگ — میر رضا معلوم ہوا اب جی میں محبت رکھتے تھے

ہم کو یارب ایسے کہاں ہے چشم ملے طوفاں بھرے ۳۱۹ دل کے ٹکڑے جو نکلے وہیں پرنے جگر کے آن بھرے ۱

تیر لیا جب ہاتھ میں اس نے خوف اذیت عشق سے ہائے سوکھ گیا وہیں لہو اپنا ایسا نہ ہو پیکان بھرے ۲

کس کا ساتھ ملا ایسا جو بیٹھے میرے پاس نہیں اب جو مری کچھ سنتے نہیں تم کس نے تمھارے کان بھرے ۳

وائے فریب اس گلشن کا ہائے نصیبہ عاشق کا کوئی گریباں گل سے بھرے کوئی حسرت سے دامان بھرے ۴

سچ ہو اگر تو اس کے در سے دشمن ہے جائے رہا — کیوں روٹھے ہو میر رضا ہم بھی چلے ارمان بھرے ۵

ہوں چشم تیری مے فروش اور عشوہ اوباشی کرے ۳۲۰ پھر اختیار اب دل مرا کیوں کر نہ قلاشی نہ کرے ۱

جمعیت صبر و قرار اپنی گئی تھوڑی نہیں کہہ دے میاں دل کھول کر غم تیرا عیاشی کرے ۲

اتنی تو فرصت دے فلک بعد اپنے جو کوئی سنے — میری رضا اس کی جفا وہ تیری شاباشی کرے ۳

تری تو بوئے پیراہن نے یعقوب آنکھ روشن کی ۳۲۱ زلیخا نے نہ پائی گرد بھی یوسف کے دامن کی ۱

میں وہ کافر ہوں اندھا دیر میں بوڑھا ہوا لیکن نہ دیکھی بت کی صورت اور نہ خدمت کی برہمن کی ۲

میں جو نکلا سگاں کو اس کے غل مچایا یہ صدا موتی کے خانے میں اٹھے ہو جیسے شیون کی ۳

نہیں تیرا توجہ تیرا لطف محدسب پہ روشن ہے کہ ہوتا ہے چراغ آخر جو ہوا افراط روغن کی ۴

خبر ہے جب کو درد عشق کی بلبل کی خاطر کو خزاں میں کرتے ہیں زینت گل کاغذ سے گلشن کی ۵

ہوئے ہم دیر واقف حسن جاں افروز سے تیرے رہی جب رات باقی تھوڑی سی تب شمع روشن کی ۶

نصیبہ اس کا سا اب لے رضا لاؤں کہاں سے میں — اگرچہ اور باتوں میں کروں تقلید دشمن کی ۷

کلمۃ الحق جو کیا عشق نے ارشاد مجھے ۳۲۲ نہ رہا سوا سورۂ اخلاص سوا یاد مجھے ۱

کیا تعلق ہی نکلی کا تعلق کم ہے یہ غلط فہم عبث کہتے ہیں آزاد مجھے ۲

تیز کرتا ہے مرے قتل پہ خنجر لے وائے کچھ بھی لذت نہ رہے ذبح کی تا یاد مجھے ۳

یاں جگر کاوی ہو واں ہو گی اگر کوہ کنی چوم لے ہاتھ مرا دیکھے جو فرہاد مجھے ۴

کیوں کے نامحرموں میں لوگ ترے نام کو ہائے گو ملے حشر کے دن رخصت فریاد مجھے ۵

میں تو شاگرد کے قابل بھی نہیں میر رضا — خوبی یاروں کی ہو جو کہتے ہیں استاد مجھے ۶

گالی بھی تو جو دے اسے ہائے اسا نہ دے ۳۲۳ پھر کیا کرے کہ عاشق مسکیں دعا نہ دے ۱

بے دست و پا ہیں خوف سے ہم ہائے کیا کریں باد سحر کسی کا جو برقع اٹھا نہ دے ۲

تم ہر کسی کو اپنا تماشا دکھاتے ہو غیرت کہیں ہمارا تماشا دکھا نہ دے ۳

۴ اپنے لیے وفا اُسے سکھلاتا ہے رقیب — یارب جفا کہیں مرے حق کی بھلا نہ دے
۵ یاروں کو ہے امید مری آہ گرم پر — ہے مجھ کو ڈر اثر کہیں اپنا جلا نہ دے
۶ پہلو میں تیرے بیٹھیں سو ایسے کہاں نصیب — یہ بس ہو سامنے سے ہی مجھ کو اٹھا نہ دے
۷ لذت نہ ملیو اُس کو شہادت کے جام کی — قاتل کو دیکھتے جو سر اپنا جھکا نہ دے
۸ دوزخ سے میں جو ڈرتا ہوں اتنے لیے رضا — ہم سایہ شیخ کا کہیں مجھ کو خدا نہ دے

۱ غیر ہی سے نہیں شاکی ہوں میں دل بر سے بھی ۳۲۴ یہی تنہا نہیں اپنے دل مضطر سے بھی
۲ آسماں ٹوٹ پڑے کاش ترے سر پر عشق — دل کے تو داغ زیادہ ہوئے اختر سے بھی
۳ اُس کی صورت کا کھلا گل کوئی ایسا بلبل — اپنے نالے ترے مؤثر ہیں نپٹ پر سی بھی
۴ جام میں حسرت کو شربت دیدار بھریں — تشنگی عشق کی جاتی نہیں کوثر سے بھی
۵ ہائے تو بھی نہ مٹا اُس رخ گل فام کا داغ — دل کو پرچایا بہت لالۂ احمر سے بھی
۶ جی میں تھا دل میں جگہ تیرے کریں گے سو ہائے — غیر کے ہاتھ سے اٹھنا پڑا اب در سے بھی
۷ گر یہی جلوہ ترا ہے تو میں اپنی داد — درد دل کہہ چکے ہم داور محشر سے بھی
۸ آپ سے وعدہ خلافی کی ادا آزردہ ہوا — بات رنجش کی ہوئی کہہ کوئی ادھر سے بھی
۹ ڈر خدا سے نہ کرے شیخ رضا کی تکفیر — رہ گیا دل تو نہ کنعاں کے پیمبر سے بھی

۱ عرض ہے وقت سفر اُس ظالم بیداد سے ۳۲۵ اترنے کا ڈرہ کے ٹک بے طاقتوں کی یاد سے
۲ نقش شیریں کا مٹے پتھر سے پر اس کا خیال — یہ نہیں ممکن کہ جائے خاطر فرہاد سے
۳ کر دیا نالوں نے ٹکڑے ٹکڑے جس کو — کیوں جرس بیٹھا نہیں تیرا گلا فریاد سے
۴ شعلے نے خس سے نہ پانی نے کیا اخگر سے آہ — آرزو نے جو کیا اپنے دل ناشاد سے
۵ مت صنوبر ولسے نمک پاشی گرفتار دیر کر — اے رضا کہیو چمن میں طائر آزاد سے
۶ تیرے شعروں میں رضا استاد کی سی بات ہے — ہم بھی لیویں گے صلاح اب تیرے ہی استاد سے

۱ نہ تم سمجھے نہ طاقت دل میں درد رشک سہنے کی ۳۲۶ ہم اب لاچار کہتے ہیں نہیں جو بات کہنے کی
۲ نہ تنگ آیا ہے دل اپنا طبیب اس داغ ہجراں سے — دوا کوئی دے مجھے دل کے لہو ہو کر کے بہنے کی
۳ اُسے مجبوبی ہو وعدہ خلافی کی تماشا ہے — مجھے شرمندگی ہے اب تک اپنے جینے رہنے کی
۴ سخن سازی میں سب قاصد کی جو ہو وصل کا مژدہ — دگر نہ اُس کے آگے کس کو طاقت بات کہنے کی

پرنٹر و پبلشر سید امیر الحسن
برقی مشین پریس مراد پور، بانکی پور، پٹنہ